صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد دوم

شمارہ نمبر ۱۳۰

دسمبر ۱۹۸۲ء

مدیر:

محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۰۰ روپے

ترتیب

طلوع

رسولؐ اللہ ایک نظر میں

سیرت نبویؐ کی توقیت

الرّسالات النّبویہؐ

مکتوب الیہ:

حقیقتِ توحید

حقیقتِ وحی

سیرۃ النبی [جلد ہفتم]

مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ

فخرِ موجودات کی مکی اور مدنی زندگی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

میں نے متعدد دن اور راتیں اِس انتظار میں گزاریں کہ وُہ لمحۂ عالیہ آئے کہ مَیں اپنے تئیں سیرتِ سرورِ کونین ؐ پیش کر سکوں۔ وہ لمحہ آیا۔ میرے جذبات و احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

خدا نے مجھے لکھنے کی صلاحیت دی ہے۔ ہزاروں صفحات کالے کیے ہیں۔ مگر آج لکھنے بیٹھا ہُوں تو قلم رُک رہا ہے۔ یا الٰہی! ماجرا؟

ذہن نے بات سُجھائی، جس کی تعریف خدائے ذوالجلال نے کی ہو، اُن کے بارے میں تیرا قلم کیا لکھے گا؟ مَیں سوچ میں پڑ گیا۔

مقابلہ عشق اور قلم کے درمیان آن ٹھہرا۔ دونوں امتحان سخت اور مَیں ناتوان، حواس بے ٹھکانہ ہونے لگے۔

قدرے سنبھلا تو ہاتف نے کہا: "حدِ ادب کا مقام ہے۔"

"ہُوں!"

"حدِ ادب کا مقام ہے۔"

"یا الٰہی! مَیں کیا کروں؟ حضورؐ! مَیں کیا کروں؟"

میری التجا پر دوبارہ غیبی آواز آئی: "آج تک کوئی انسان، ایسا پیدا نہیں ہُوا جس نے رسولِ خداؐ کے بارے میں لکھا ہو اور اُن کا حق ادا کیا ہو!"

مَیں ایک بار پھر سناٹے میں آ گیا۔ جُھرجُھری لی تو مَیں کہہ رہا تھا "مَیں حضورؐ کا اُمّتی ہُوں۔ مَیں اِس کام کے لیے خود حضورؐ سے اجازت لے کر آیا ہُوں۔"

اِس پر ہاتف نے کہا: "تو پھر لکھ!"

جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

تب مَیں نے گھر والوں سے کہا: "مجھے چادر اُڑھا دو کہ یہ سنّت میرے رسولؐ کی ہے۔"

محمد طفیل

اس شمارے میں

پہلی جلد تکنیک اور مصادر کے بارے میں تھی۔ یہ جلد بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس جلد میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ واقعات کو چھُوا اور چھوڑ دیا والا قصہ نہیں بلکہ حق ادا کرنے والا معاملہ ہے۔

اس جلد میں مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ پر تفصیلی مضامین ہیں۔ جو بڑی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ سیرت کی دُوسری کتابوں میں اتنی تفصیل نہ ملے گی۔ اسی طرح سیرۃ النبی (سیّد سلیمان ندوی) کی ساتویں جلد کے بھی تین اہم مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے جناب سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ سے لاہور تشریف لائے تھے۔ میں نے اُن سے گزارش کی تھی کہ وُہ مجھے سیرت پر ایسا مواد دیں جو نایاب ہو۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے فرمایا تھا کہ "کراچی جا رہا ہُوں، وہاں سیّد سلیمان ندوی کے گھر میں سیرۃ النبی کی ساتویں جلد کا مواد ہے وُہ لا کر آپ کو دُوں گا۔"

چنانچہ مسوّدہ کراچی سے آیا۔ مولانا نے فرمایا: اعظم گڑھ جا کر اس کی فوٹو کاپیاں بھجوا دُوں گا۔ بقول مولانا موصوف یہ معاملہ مجلس عاملہ میں گیا۔ عاملہ نے فیصلہ کیا کہ پہلے یہ سب کچھ معارف میں چھپے گا، اس کے بعد نقوش میں۔ چنانچہ دونوں صورتیں تکمیل پذیر ہوئیں۔ میں ادارہ معارف کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہُوں کہ اہلِ علم کو یُوں نوازا گیا۔

اس نمبر میں ایک اور اہم مضمون سیرۃ النبی میں توقیتی تضادات اور اُن کے حل پر ہے۔ ایسے مضامین کہ جن کی افادیت دائمی ہو، خال خال نظر آتے ہیں۔ یہ سلسلہ مضامین رسالہ "بُرہان" میں چلا اور اہلِ علم سے تحسین کے کلمات سے نوازا گیا۔

اس نمبر میں ڈاکٹر حمید اللہ کی انگریزی کتاب "محمدؐ رسول اللہ" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی سیرتِ رسولؐ کے لیے وقف ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا وہ سیرت کا آبرومندانہ سرمایہ ہے۔ ہم نے سیرت پر پوری کتاب اس لیے چھاپ دی کہ مربوط حالات بھی سامنے آسکیں۔

الرسالات پر جو مضمون ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے یا مولانا امین احسن اصلاحی کا جو مضمون توحید پر ہے یا مولانا محمود حسن کا جو مضمون "وحی" پر ہے۔ یہ سب ایسے مضامین ہیں جو ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے اور لکھنے والوں کے لیے خیر و برکت کا باعث بنیں گے۔

یہ جلد اپنے موضوعات کے اعتبار سے بے حد اہم ہے۔

[محمد نقوش]

رسول اللہؐ ——— ایک نظر میں

نعیم صدیقی

وَإِذَا نَظَرْتَ إِلَى أَسِرَّةِ وَجْهِهِ
بَرَقَتْ كَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ (ابوکبیر ہذلی)

جب میں نے اس کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی، تو اس کی
شانِ درخشندگی ایسی تھی جیسے کہ کسی لکۂ ابر میں بجلی کوند رہی ہو۔

"یہ چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا" ——— عبداللہ بن سلام

ایک جھلک[1]

دنیا میں عظیم کارنامے انجام دینے والی ہستیاں (خصوصاً انبیا علیہم السلام) ہمیشہ غیر معمولی درجے کی شخصیتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اصلاح کے کام، تحریکوں کی رہنمائی، تہذیبوں کی تعمیرِ نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خاص طرح کے افکار و کردار سے بنتی ہے۔ سیرتِ پاک کے مطالعہ کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ محسنِ انسانیتؐ کی شخصیت کو سمجھا جائے۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت بڑی مدد دیتی ہے۔ آدمی کا سراپا، اس کے بدن کی ساخت، اس کے اعضا کا تناسبِ خاص، اس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً چہرہ ایک ایسا قرطاس ہوتا ہے جس پر انسانی کردار اور کارناموں کی ساری داستان لکھی ہوتی ہے اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہم کسی کے مقام کا تصور کر سکتے ہیں۔

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہیِ قسمت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کا رُخِ زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہم عالمِ واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضورؐ کے حُسن و جمال کی جو کچھ بھی جھلک پا سکتے ہیں، وہ حضور کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی پا سکتے ہیں۔

حضورؐ کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر موجود نہیں ہے۔ خود ہی حضورؐ نے اُمت کو اس سے باز رکھا کیونکہ تصویر کا فتنہ شرک سے

---

[1] دوسری کتابیں بھی سامنے ہیں لیکن اس موضوع کے لیے مولف زیادہ تر شمائل ترمذی کا منت کش رہا۔

دیے دیے نہ رک سکتا۔ حضورؐ کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے۔ اور اس کے اعزاز کے لیے کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار ہو چکی ہوتیں بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ میں حضورؐ کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں لیکن کون سا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضورؐ کے عالمِ خیال اور کردار کا شوشہ بہ شوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں ہوتیں جس کا اسمِ مبارک محمدؐ تھا بلکہ کسی موہوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اس کو حضورؐ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کمزور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لیے رنگ انہی متعصبانہ تصانیف اور تذکروں سے لیا جاتا ہے جو عناد اور کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کی مظہر ہیں۔ انبیا اور صلحا کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے نہ رہ جاتیں۔

لیکن حضورؐ کے صحابیوں نے کم سے کم پردۂ الفاظ میں حضورؐ کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ حالت میں اصحابِ روایت نے ہم تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں ہم اس کی لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین حضورؐ کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے ——— ایک تعارف!!

حضورؐ کے چہرۂ اقدس، قد و قامت، خد و خال، چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچا ہے وہ بہرحال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت، شجاعت، صبر و استقامت، راستی و دیانت، عالی ظرفی، سخاوت، فرض شناسی، وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصافِ حمیدہ کا جامع تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ کے جسمانی نقشے میں روحِ نبوت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے اور آپؐ کی وجاہت خود آپ کے مقدس مرتبہ کی ایک دلیل تھی۔ اس موقع پر آپؐ کا ایک ارشاد یاد آیا، فرمایا:

ان تقوی الله تبیض الوجوہ۔

خدا کا تقویٰ ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔

نبوت تو ایمان و تقویٰ کی معراج ہے۔ نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہیے۔

سو یہ ہے اس آفتابِ حق کی ایک جھلک!

وجاہت ———

"میں نے جونہی حضورؐ کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپؐ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔"[1] (عبداللہ بن سلام)

"میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ ہیں رسولِ خدا! دیکھتے ہی میں نے کہا واقعی یہ اللہ

---

[1] یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حُصَین تھا۔ سرورِ عالم کے مدینہ آنے پر یہ دیکھنے کو گئے، دیکھتے ہی ان کو جو تاثر ہوا، بعد میں اسے انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لائے اور عبداللہ نام تجویز ہوا۔ (سیرۃ المصطفیٰ۔ مولانا ادریس کاندھلوی ج ۱ ص ۳۴۹-۳۵۰)

کے نبی ہیں"[1] (ابو رمثہ تیمی)

"مطمئن رہو، میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی تمہارے ساتھ بد معاملگی کرنے والا شخص نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا آدمی (اونٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی۔"[2] (ایک معزز خاتون)

"ہم نے ایسا خوب رُو شخص اور نہیں دیکھا، ہم نے اس کے منہ سے روشنی سی نکلتی دیکھی ہے۔"[3] (ابو قرصافہ کی والدہ اور خالہ)

"حضورؐ سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا گویا آفتاب چمک رہا ہے۔" (ابو ہریرہؓ)

"اگر تم حضورؐ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہوگیا ہے۔" (ربیع بنتِ معوذ)

"دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہوجاتا۔" (حضرت علیؓ)

"میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورؐ کو دیکھ رہا تھا، آپؐ اس وقت سُرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھے۔ مَیں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کو، بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔"

(حضرت جابر بن سمرہ)

"خوشی میں حضور کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑہ ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے۔" (کعب بن مالک)

"چہرے پر چاند کی سی چمک تھی۔" (ہند بن ابی ہالہ)

چہرہ

"بدر کی طرح گولائی لیے ہوئے۔" (براء بن عازب)

"چہرہ بالکل گول نہیں تھا، ہلکی گولائی لیے ہوئے۔" (حضرت علیؓ)

"پیشانی کشادہ۔ ابرو خمدار، باریک اور گنجان، دونوں جُدا جُدا، دونوں کے درمیان میں ایک رگ کا ابھار جو غصہ آنے پر نمایاں ہوجاتا۔" (ہند بن ابی ہالہ)

"مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی۔" (کعب بن مالک)

---

[1] شمائل ترمذی [2] مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ وارد ہوا اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضورؐ کا اتفاقاً اس طرف گزر ہوا ایک اونٹ کا سودا کر لیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوائے دیتا ہوں، بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہُوئی کہ بغیر جان پہچان کے معاملہ کر لیا۔ اس پر سردار قافلہ کی خاتون نے مذکورہ فقرہ کہا۔ یہ واقعہ طارق بن عبداللہ نے بیان کیا جو خود شریکِ قافلہ تھے۔ بعد میں حضور نے طے شدہ قیمت سے زیادہ مقدار میں کھجوریں بھجوادیں۔ (سیرت النبیؐ مولانا شبلی مرحوم جلد دوم صفحہ ۲۸۰۔ المواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۲۴۴) [3] یہ خواتین حضورؐ کی خدمت میں ابو قرصافہ کے ساتھ بیعتِ اسلام کے لیے گئی تھیں اور لوٹتے ہوئے اُنھوں نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ (المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۵۵)

رنگت ———

"نہ چُونے کی طرح سفیدی، نہ سانولا پن۔ گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی۔" (حضرت انسؓ)

"سفید سُرخی مائل۔" (حضرت علیؓ)

"سفید مگر ملاحت دار۔" (ابو الطفیل)

"سفید، چمک دار۔" (ہند بن ابی ہالہ)

"گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا۔" (حضرت ابو ہریرہؓ)

آنکھیں ———

"آنکھیں سیاہ — پلکیں دراز۔" (حضرت علیؓ)

"پتلیاں سیاہ، نظریں نیچی، گوشۂ چشم سے دیکھنے کا حیادارانہ انداز۔" (ہند بن ابی ہالہ)

"سفید حصے میں سُرخ ڈورے — آنکھوں کا خانہ لمبا — قدرتی سُرگیں۔" (جابر بن سمرہ)

ناک ———

"بلندی مائل — اس پر نورانی چمک — جس کی وجہ سے ابتدائی نظر میں بڑی معلوم ہوتی۔" (ہند بن ابی ہالہ)

رخسار ———

"ہموار اور ہلکے — نیچے کو ذرا سا گوشت ڈھلکا ہوا۔" (ہند بن ابی ہالہ)

دہن ———

"فراخ۔" (جابر بن سمرہ)

"بہ اعتدال فراخ۔" (ہند بن ابی ہالہ)

دندانِ مبارک ———

"باریک — آبدار — سامنے کے دانتوں میں خوشنما ریخیں۔" (حضرت ابنِ عباسؓ)

"تکلّم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی ہوتی۔" (حضرت انسؓ)

ریش ———

"بھرپور اور گنجان بال۔" (ہند بن ابی ہالہ)

گردن ———

"پتلی، لمبی — جیسے مورتی کی طرح خوب صورتی سے تراشی گئی ہو۔"

"گردن کی رنگت چاندی جیسی اُجلی اور خوشنما۔" (ہند بن ابی ہالہ)

سر ———

"بڑا — مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

بال ———

"قدرے خمدار"۔ (حضرت ابوہریرہؓ)

"نہ بالکل سیدھے تنے ہوتے — نہ زیادہ پیچدار"۔ (قتادہؓ)

"ہلکا خم لیے ہوتے"۔ (حضرت انسؓ)

"گنجان — کبھی کبھی کانوں کی لَو تک لمبے، کبھی شانوں تک"۔ (براد بن عازب)

"درمیان سے نکلی ہوئی مانگ"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

"بدن پر بال زیادہ نہ تھے — سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر"۔ (حضرت علیؓ۔ ہند بن ابی ہالہ)

"کندھوں، بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصے پر تھوڑے سے بال تھے"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

مجموعی ڈھانچہ

"بدن گٹھا ہوا — اعضا کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

"بدن موٹا نہیں تھا"۔ (حضرت علیؓ)

"قد — نہ زیادہ لمبا تھا، نہ پست! — میانہ"۔ (حضرت انسؓ)

"قامت مائل بہ درازی — مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا"۔ (برآ بن عازب)

"پیٹ باہر کو نکلا ہوا نہ تھا"۔ (اُمِ معبد)

"دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضورؐ کا جسم (باوجود فقر و فاقہ کے) زیادہ تر و تازہ اور توانا تھا"۱ (المواہب ج ۱ ص ۳۱۰)۔

"میں نے رسول اللہؐ سے بڑھ کر کوئی بہادر اور زور آور نہیں دیکھا"۲ (ابن عمر)

---

۱ مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے حج کیا تو سَو اونٹ بہ نفسِ نفیس ہانکے اور ان میں سے ۶۳ کو بدستِ خود نحر کیا اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔

۲ مکہ میں رکانہ نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کُشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضورؐ کسی مکہ وادی میں اس سے ملے اور اپنی دعوت دی۔ اس نے دعوت کے لیے کوئی معیارِ صدق طلب کیا۔ اس کے ذوق کے پیشِ نظر حضورؐ نے کشتی کرنا پسند کرلیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپ نے اسے پچھاڑ لیا۔ اسی رکانہ پہلوان کے بیٹے ابوجعفر محمد کی یہ روایت حاکم نے مستدرک میں سے لی ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے اسے پیش کیا ہے اور بیہقی نے سعید بن جُبیر کی دوسری روایت کی ہے جس میں آتا ہے کہ حضورؐ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابوالاسود جمحی بھی ہے۔

(المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳ - ۳۰۲)

کندھے اور سینہ ———

"سینہ چوڑا ——— سینہ اور پیٹ ہموار۔" (ھند بن ابی ہالہ)

"سینہ چوڑا۔" (براء بن عازب)

"مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے زیادہ۔" (ھند بن ابی ہالہ۔ براء بن عازب)

"کندھوں کا درمیانی حصہ پُرگوشت۔" (حضرت علیؓ)

بازو اور ہاتھ ———

"کلائیاں دراز ——— ہتھیلیاں فراخ ——— انگلیاں موزوں حد تک دراز۔" (ھند بن ابی ہالہ)

"ریشم کا دبیز یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں جسے مَیں نے چھُوا ہو اور وہ حضورؐ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم و گداز ہو۔" (حضرت انسؓ)

قدم ———

"پنڈلیاں پُرگوشت نہ تھیں ——— ہلکی ہلکی سُتی ہوئی۔" (جابر بن سمرہ)

"ہتھیلیاں اور پاؤں پُرگوشت ——— تلوے قدرے گہرے ——— قدم چکنے کہ پانی نہ ٹھہرے۔" (ھند بن ابی ہالہ)

"ایڑیوں پر گوشت بہت کم۔" (جابر بن سمرہ)

ایک جامع لفظی تصویر

یوں تو حضورؐ کے متعدد رفقا نے حضورؐ کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش کیے ہیں لیکن امِ معبدؓ نے جو تصویر مرتب کی ہے اس کا جواب نہیں۔ وادیِ ہجرت کا سفر طے کرتے ہُوئے مسافرِ حق جب اپنی منزلِ اوّل (غارِ ثور) سے چلا تو پہلے ہی روز قومِ خزاعہ کی اس نیک نہاد بڑھیا کا خیمہ راہ میں پڑا۔ حضورؐ اور آپ کے ہمراہی پیاسے تھے فیضانِ خاص تھا کہ مریل سی بھُوکی بکری نے اس لحمہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضورؐ نے بھی پیا، ہمراہیوں نے بھی، اور کچھ بچ رہا۔ امِ معبد کے شوہر نے گھر آکر دُودھ دیکھا تو اچنبھے سے پُوچھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ امِ معبد نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پُوچھنے لگا کہ اچھا اس قریشی نوجوان کا نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنا ہے۔ اس پر امِ معبد نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ امِ معبد کو نہ تو کوئی تعارف تھا، نہ کسی طرح کا تعصب، بلکہ جو کچھ دیکھا من و عن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے[۱]۔ اس کا جو ترجمہ مولفِ "رحمۃ للعٰلمین" نے کیا ہے اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰۷

"پاکیزہ رُو، کُشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ پیٹ باہر نکلا ہوا نہ سر کے بال گرے ہوئے، زیبا، صاحبِ جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموشی وقار کے ساتھ، گویا دلبستگی لیے ہوتے، دُور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب، قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین، شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشیٔ الفاظ سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی، میانہ قد کہ کوتاہیِ نظر سے حقیر نظر نہیں آتے، نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی۔ زیبندہ نہال کی تازہ شاخ، زیبندہ منظر والا قد، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وُہ کچھ کہتا ہے تو چُپ چاپ سنتے ہیں، جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو[1]"

لباس

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے اس کی وضع قطع، قصر و طول، رنگت، معیار، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرمؐ کے لباس کے بارے میں حضورؐ کے رفقاؐ نے جو معلومات دی ہیں وُہ بڑی حد تک حضورؐ کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضورؐ نے لباس کے معاملہ میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی ہے:

يٰبَنِىٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔ (اعراف ۲۶)

اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس تمہارے لیے مقرر کیا ہے۔ اور لباس تقوٰی بہترین لباس ہے۔

دُوسرا پہلو لباس کا "سرابیل تقیکم الحر و سرابیل تقیکم بأسکم" (تمہیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لیے قمیصیں اور زرہیں فراہم کیں — النحل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

سو حضورؐ کا لباس ساتر تھا، زینت بخش تھا۔ اور بایں ہمہ لباس تقوٰی تھا۔ اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا، وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا اور ذوقِ سلیم کا ترجمان بھی۔ حضور کو کبر و ریا سے بُعد تھا اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا ناپسند تھا۔ فرمایا:

انما انا عبدٌ البس کما یلبسُ العبدُ[2]۔

میں تو بس خدا کا ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں۔

---

[1] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰۷ [2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۲۸

ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لیے آپ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی۔ (مشکوٰة) تہ بند، قمیص اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامتِ کبر تھی اور یہ طریقِ لباس متکبرین میں رائج تھا اس لیے اس سے سخت تنفر تھا۔[1] دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضورؐ نے ممنوع ٹھہرایا[2] تاکہ اُمّت میں اپنی خودی اور عزتِ نفس برقرار رہے، نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات و کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔ چنانچہ حضورؐ نے اسلامی تمدن کے تحت فیشن، آداب اور ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ، ستر، سادگی، نظافت و نفاست اور وقار کا حضورؐ کو خاص لحاظ تھا۔ اگر ہم حضورؐ کے لباس کو وقت کے تمدنی دور، عرب کی موسمی اور جغرافی اور تمدنی ضروریات و مروجات کے نقشے میں رکھ کر دیکھیں تو وہ بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آئیے حضورؐ کے لباس پر ایک نگاہ ڈالیں۔[3]

کُرتا (قمیص) بہت پسند تھا۔ کُرتے کی آستین نہ زیادہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی، درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی۔ سفر (خصوصاً جہاد) کے لیے جو کُرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا۔ قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کُھلا بھی رکھتے اور اسی حالت میں نماز پڑھتے، کُرتا پہنتے ہوئے سیدھا ہاتھ ڈالتے، پھر اُلٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے (داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کا استعمال حضورؐ کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے)

عمر بھر تہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) سامنے کا حصہ قدرے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپؐ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنا یا نہیں) اور وہ آپؐ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کو ساتھ لیے ہوئے حضورؐ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پر پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لیے ایک خاص وزان مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے تولو (اتو زن وارجح)۔ وزان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سُنے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے توجہ دلائی الا تعرف نبیك؟ (تم اپنے نبی پاک کو پہچانتے نہیں) وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا تو آپ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے۔ بہرحال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ

---

[1] بہت سی روایات ہیں مثلاً سالم کی روایت اپنے والد سے، مندرجہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔ لباسِ شہرت پر وعید از ابن عمر مندرجہ ترمذی، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ۔

[2] مثلاً روایتِ ابنِ عمر مندرجہ احمد و ابوداؤد۔

[3] تفاصیل کے حوالے نہیں دیے جا رہے۔ مآخذ کے طور پر زیادہ تر شمائلِ ترمذی، زاد المعاد اور المواہب اللدنیہ سامنے ہیں۔

کیا آپ اسے پہنیں گا؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہو گا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی ۔ دوسرے پاجامہ اہلِ فارس کا لباس تھا اور تشبہ سے حضورؐ کا اجتناب (حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزا کو حضورؐ قبول فرماتے تھے) آپؐ نے جواب دیا : ہاں پہنوں گا سفر میں بھی، حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی، کیونکہ مجھے حفظِ ستر کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی اور نہیں۔[۱]

سر پر عمامہ باندھنا پسندِ خاص تھا، نہ بہت بھاری ہوتا تھا نہ چھوٹا ۔ ایک روایت کے لحاظ سے ، گز لمبائی ہوتی تھی ۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان اڑس لیتے ۔ تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے شملہ کو پھیلا کر سر پہ ڈال لیتے ۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے ۔ کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے[۲] بر بنائے نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے لیے ایک خاص کپڑا (عربی نام "قناع") بالوں پر استعمال کرتے، جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ ٹکڑا رکھ لیتے ہیں ۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا حال یہ تھا کہ (روایات میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا ۔ سفید کے علاوہ زرد (غالباً مٹیالا، خاکستری مائل یا شتری) رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے ۔ اور فتح مکّہ کے موقع پر سیاہ بھی استعمال فرمایا ۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی ۔ اور اسے پسند فرمایا ۔ نیز روایات کے بموجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا ۔ اور اسے آپؐ نے مشرکین کے مقابلے پر امتیازی فیشن قرار دیا ۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے ۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی ہوتی ۔ سفر پہ نکلتے تو اٹھتی ہوئی باڑ دار ٹوپی استعمال فرماتے ۔ سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے ۔

اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی، ۲½ گز چوڑی ہوتی تھی ۔ کبھی لپیٹ لیتے، کبھی ایک پلّو سیدھے بغل سے نکال کر اُلٹے کندھے پر ڈال لیتے ۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے اور بعض مواقع پر اسے تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے ۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لیے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے ۔ یمن کی چادر جسے حِبَرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی، اس میں سُرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں ۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے لیے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اُسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بُو دینے لگی ۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے پھر اسے نہیں اوڑھا ۔

نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے ۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے ۔ کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے ۔ ان کی مرمت کرتے ، احتیاطاً گھر میں دیکھ لیتے کہ مجمع میں بیٹھنے کی وجہ سے (مجالس اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی

---

[۱] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۷-۳۳۶
[۲] ایک رائے یہ ہے کہ ایسا بیماری (خصوصاً دردِ سر) کی حالت میں ہوا ۔

آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپؐ ہی نے مسلسل تربیت کر کر کے برسوں میں بلند کیا) کوئی جُوں وغیرہ نہ آگھسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپؐ کو رہبانیت کا سدِ باب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو"[1] سو حضورؐ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیبِ تن فرمایا۔ آپ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے اُمّت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ آستین کا رومی جُبّہ بھی پہنا (بخاری و مسلم)۔ سُرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیبِ بدن کیا۔ طیلسانی قسم کا کسروانی جُبّہ بھی کبھی کبھی پہنا (المواہب اللدنیہ)[2] جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ ایک بار ۲۷ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اِس قولِ قرآنی کی کہ " پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا" بس یہ ہے کہ معمولِ عام سادگی تھا۔

کپڑوں کے لیے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوبِ خاطر تھا۔ فرمایا : "حق یہ ہے کہ تمہارے لیے مسجدوں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے"[3] فرمایا : "سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مُردوں کو کفن دو، کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں"[4]

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خالص شوخ سُرخ رنگ بہت ہی ناپسند تھا (لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض صورتوں میں ممنوع فرمایا، لیکن ہلکے سُرخ رنگ کی دھاریوں والے کپڑے آپؐ نے پہنے ، ہلکا زرد (مٹیالا یا شُتری) رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضورؐ کا جُوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپّل یا کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا جس کے دو تسمے تھے ، ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا، دُوسرا چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں۔ جُوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت دو انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا، اور دونوں تسموں کے درمیان پنجے پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے، کبھی بیٹھ کر بھی ، پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بایاں، اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے۔ سادہ اور معمولی بھی ، اور اعلیٰ قسم کے بھی۔ شاہِ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے ، انھیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ اسی طرح دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کیے تھے ان کو

---

[1] عن عمرابن شعیب عن ابیہ (ترمذی) وعن ابی الاحوص عن ابیہ (نسائی)

[2] روایت اسماء بنت ابی بکر (مسلم)

[3] ابو داؤد ، ابن ماجہ

[4] عن سمرہ (احمد ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجہ)

آپؐ نے پھٹنے تک استعمال فرمایا۔

چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا، کبھی حبشی پتھر کا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پترا یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی (اور زیور) سے آپ نے کراہت فرمائی ہے۔ انگوٹھی بالعموم داہنے ہی ہاتھ میں پہنی، کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضورؐ خطوط پر مُہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرینِ صحت ہے کہ انگوٹھی مُہر کی ضرورت سے بنوائی تھی۔ اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

وضع قطع اور آرائش

حضورؐ اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے۔ ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے، کنگھا کرتے، مانگ نکالتے، لبوں کے زاید بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ ڈاڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے۔ اس معاملہ میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مُو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابیؓ کی ڈاڑھی کے زاید بال بہ نفسِ نفیس تراشے۔ فرمایا کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے۔ مثلاً ابو قتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اَکْرِمْھا" (ان کو سنوار کے رکھو)[۱]

یہ تاکیدیں حضورؐ نے اس لیے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں خصوصاً رنگِ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت اُبھرتی ہے تو غلیظ رہنا علوِ مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس خطرے کا سدِباب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور بستر کے قریب:

۱۔ تیل کی شیشی

۲۔ کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی)

۳۔ سُرمہ دانی (سیاہ رنگ کی)

۴۔ قینچی

۵۔ مسواک

۶۔ آئینہ

۷۔ لکڑی کی ایک پتلی کھپچی

---

[۱] روایت ابو ہریرہ و ابو داؤد

سُرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں لگاتے۔ آخر رات میں حاجات سے فارغ ہو کر وضو کرتے، لباس طلب کرتے، اور خوشبو لگاتے، ریحان کی خوشبو پسند تھی۔ مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مُشک اور عُود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبودار دُھونی لیا کرتے۔ ایک عطردان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہ اپنے دستِ مبارک سے خوشبو لگاتیں) مشہور بات یہ ہے کہ آپؐ جس کُوچے سے گزر جاتے تھے دیر تک اس میں مہک رہتی تھی اور فضائیں بتاتی تھیں کہ:

"گزر گیا ہے ادھر سے وہ کاروانِ بہار"

خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے ماتحت آپ نے مردوں کے لیے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے اور مہک پھیلے، اور عورتوں کے لیے وُہ جس کا رنگ نمایاں ہو، مہک مخفی رہے۔

رفتار

حضورؐ کی چال عظمت، وقار، شرافت اور احساسِ ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا رہتا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے۔ قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اونچائی سے نیچے کو اُتر رہے ہیں۔ ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں گویا زمین آپؐ کی رفتار کے ساتھ ساتھ لپٹتی جا رہی ہے۔" رفتار تیز ہوتی، قدم کُھلے کُھلے رکھتے۔ آپ معمولی رفتار سے چلتے مگر بقول حضرت ابوہریرہؓ "ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے۔" حضورؐ کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ "زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو۔" (سورۂ لقمان)

تکلم

تکلم انسان کے ایمان، کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ موضوعات اور الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت، آواز کا اُتار چڑھاؤ، لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور۔ یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علمبردار ہے۔

حضورؐ کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈُوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضورؐ کے کمالاتِ خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپؐ تفکرات اور مسائلِ مہمہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے۔ لیکن دُوسری طرف لوگوں میں خُوب گھلنا ملنا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دَور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ۔ اضداد میں

عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضورؐ کی ذات تھی۔ ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری، ایک سلطنت کے مسائل، ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنھیں حضورؐ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے۔ ہمیشہ مسائل پر غور کرتے، کبھی آپ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا۔ دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات چیت نہ کرتے۔"[۱]

لیکن آپؐ ایک داعی تھے، اور ایک تحریک کے سربراہ، اس لیے تبلیغ و تعلیم او تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لیے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہٰذا دوسری صورتِ حال حضرت زیدؓ بن ثابت کے الفاظ میں یوں رہتی کہ "جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضورؐ بھی اس ذکر میں حصہ لیتے، جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضورؐ بھی اس میں شامل رہتے۔"[۲] اس کے باوجود آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی۔ قرآن نے بھی وما ینطق عن الھوٰی کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ اُمِ معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ "گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی"۔ "الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ۔ نہ کوتاہ سخن نہ طویل گو"۔ تاکید، تفہیم اور تسہیلِ حفظ کے لیے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دُہراتے بھی تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے، مکروہ اور فحش اور غیر حیادارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبد اللہ بن حارث کا بیان ہے کہ "میں نے حضورؐ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا"۔ یہ مسکراہٹ حضورؐ کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی۔ اور رفقاء کے لیے وجہ جاذبیت ہوتی، بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لیے ٹیک سے اُٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دُہراتے۔ حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے۔ بات کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات (GESTURES) سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لیے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے، کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آر پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے، کسی شئے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے، کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو اُلٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو اُلٹ دیتے کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اُلٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے، کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے، کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

---

[۱] شمائل ترمذی باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
[۲] شمائل ترمذی باب ماجاء فی خُلقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قریشِ مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی' وحی کی لسانِ مبین نے حُسنِ گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ حق ہے کہ حضورؐ افصح العرب تھے۔ حضورؐ کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی، ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے ایک قول (الحرب خدعة) پر بحث کرتے ہُوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "ھی لغة النبیؐ"۔[1] یہ نبی اکرمؐ کی مخصوص زبان تھی، بے شمار اصطلاحات بنائیں، تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں، خطابت کا نیا انداز نکالا اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو نہد کے لوگ آئے تو گفتگو ہوتی رہی۔ جس کے دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا: "اے اللہ کے نبی! ہم آپؐ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ آپؐ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؟" فرمایا اور خوب فرمایا: "ان اللہ عزّ وجل ادّبنی فاحسن ادبی ونشاتُ فی بنی سعد بن بکر"۔ (میری لسانی تربیت خود اللہ عزّ وجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوقِ ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے) ایک موقعے پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ تعجب سے سُن رہے تھے۔ پُوچھا اس شخص نے آپ سے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا؛ حضورؐ نے وضاحت کی۔ اس پر جنابِ صدیقؓ کہنے لگے "میں عرب میں گھوما پھرا ہُوں اور فصحائے عرب کا کلام سُنا ہے لیکن آپؐ سے بڑھ کر کلامِ فصیح کسی اور سے نہیں سُنا"۔ یہاں بھی وہی بات حضورؐ فرماتے ہیں: "ادبنی ربی ونشأت فی بنی سعد"۔ اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے: "اے اللہ کے رسولؐ! کیا بات ہے کہ آپؐ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں، حالانکہ آپؐ ہم سے کبھی الگ نہیں ہُوتے"۔ فرمایا: "کانت لغت اسمٰعیل، قد درست فجاء فی بہا جبریل فسفظینہا"۔ (میری زبان اسمٰعیل علیہ السّلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے اسے جبریل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی)[1] مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی زبان معمولی عربی نہ تھی بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑ اسمٰعیلی زبان سے ملتا تھا، اور جبریل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے کہ اکابرِ تاریخ خصوصاً انبیا جو ایک مشن لے کر ماحول سے کش مکش کرتے ہیں۔ اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اُٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے، مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

حضورؐ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپؐ کو "جوامع الکلم" عطا کیے گئے تھے۔ خود فرمایا کہ "اعطیت بجوامع الکلم"۔[2]

---

[1] تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۵۶

[2] روایت ابوہریرہ (مسلم)

جوامع الکلم حضورؐ کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالمؐ اپنی مثال آپ تھے۔ اور اسے خصوصی عطیاتِ رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے:

۱۔ "المرء مع من احب"۔ آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو۔

۲۔ "اَسْلِمْ تَسْلِم"۔ تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے[۱]

۳۔ "انما الاعمال بالنیات"۔ اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

۴۔ "لیس للعامل من عمله الا مانواہ"۔ کسی عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں سے بجز اس کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ کہ اس نے نیت کی ہے۔

۵۔ "الولد للفراش وللعاھر الحجر"۔ بیٹا اس کا جس کے بستر پر (گھر میں) ولادت پائے اور زانی کے لیے پتھر۔

۶۔ "الحرب خدعة"۔ جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔

۷۔ "لیس الخبر کالمُعَایَنَة"۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

۸۔ "المجالس بالامانة"۔ مجالس کے لیے امانت (رازداری) لازم ہے۔

۹۔ "ترك الشر صدقة"۔ بُرائی سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

۱۰۔ "سیّد القوم خادمهم"۔ قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

۱۱۔ "کل ذی نعمة محسوداً"۔ ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ "الکلمة الطیبة صدقة"۔ حُسنِ گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

۱۳۔ "من لا یرحم لا یُرحم"۔ جو (مخلوق پر، خصوصاً انسانوں پر) رحم نہیں کرتا اس پر (خدا کی بارگاہ سے) رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشاداتِ رسالتمآب بلحاظ الفاظ، بلحاظِ اسلوب، بلحاظِ رُوح بالعموم پہچانے جاتے ہیں۔ اور احادیث اور سیرت کے ریکارڈ میں حضورؐ کے جواجزائے کلام ہیں، وہ موتیوں کی سی لمعانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ، ان کا خوش آئند گٹھاؤ، ان میں معنوی گہرائی، دل پر اثر کرنے والی رُوحِ اخلاص کلامِ نبویؐ کے امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ دو تین پارہ ہائے فصاحت یہاں درج کیے جائیں۔

"میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں، نظامِ اجتماعی کے لیے سمع و طاعت کی تاکید کرتا ہوں، خواہ (اسے چلانے کے لیے) کوئی حبشی غلام ہی (برسرِ قیادت) کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ

---

[۱] نامۂ دعوت بنام ہرقلِ روم

رہیں گے وہ بہت سے اختلافات سے دوچار ہوں گے۔ پس (ایسے حالات میں) تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو۔ اس کو مضبوطی سے تھامو، اسے ڈاڑھوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیونکہ ہر نیا شگوفہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔[1]

عمرو بن عَبَسہؓ نے حضورؐ سے کچھ باتیں کیں، جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضورؐ نے دیئے۔ اس چھوٹے سے مکالمہ کو ملاحظہ کیجیے:

"اس (دعوت و تحریک کے) کام میں ابتداءً کون کون آپؐ کے ساتھ تھا؟"

"ایک مردِ آزاد (مراد حضرت ابوبکرؓ) اور ایک غلام (مراد حضرت بلالؓ)۔"

"اسلام (کی اخلاقی حقیقت) کیا ہے؟"

"پاکیزہ گفتار اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانا۔"

"ایمان (کا جوہر) کیا ہے؟"

"صبر اور سخاوت"۔

"کیسا اسلام افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے؟

"جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔"

"کیسی نماز افضل (معیاری) ہے؟"

"جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے۔"

"کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟"

"ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں۔"

"کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے۔"

"کون سی گھڑی (عبادت کے لیے) سب سے بڑھ کر ہے؟"

"رات کا پچھلا پہر۔"[2]

ایک بار دریافت کیا گیا کہ انسانوں کو دوزخ تک پہنچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں؟ فرمایا، "الفم والفرج"۔[3]

---

[1] مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ [2] مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان

[3] روایتِ ابوہریرہؓ (ترمذی)

یعنی دہن اور شرمگاہ۔ دہن سے اشارہ ہے کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف۔ شرم گاہ سے اشارہ ہے جنسی داعیات کی طرف۔ یعنی کلام کا فاسد ہونا، روزی کا ناپاک ہونا، اور جنسی جذبات کا بے راہ رَو ہونا انسانوں کی عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیشتر جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں اور ظلم بھی انھی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک بار سوال کیا کہ آپؐ اپنے مسلک کی وضاحت کریں۔ آپؐ نے مختصراً جس فصیح انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرزِ فکر، اپنے کردار اور اپنی روحانیت کی جامع تصویر کھینچ دی وُہ بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے۔ ملاحظہ ہو:

"المعرفۃُ راس مالی، والعقل اصل دینی، والحب اساسی، والشوق مرکبی، وذکر اللہ انیسی، والثقۃُ کنزی، والحزنُ رفیقی، والعلم سلاحی، والصبر ردائی، والرضا غنیمتی، والعجز فخری، والزُّھد حرفتی، والیقین قوّتی، والصدقُ شفیعی، والطاعۃُ حسبی، والجہاد خُلقی، وقُرّۃُ عینی فی الصّلوٰۃ۔"[1]

ترجمہ: "عرفان میرا سرمایہ ہے عقل میرے دین کی اصل ہے، محبّت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکرِ الٰہی میرا مونس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، حُزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لیے وجہِ اعزاز ہے، زُہد میرا پیشہ ہے، یقین میری طاقت ہے (لفظ قُوّت ہو تو غذا ہے)، صدق میرا سفارشی ہے، طاعت میرا بچاؤ ہے، جہاد میرا کردار ہے، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

حسن تمثیل کی بے شمار زرّیں مثالیں آپ کے کلام میں محفوظ ہیں جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپؐ نے بدوؤں کے ذہن نشین کرا دیئے۔ ان میں یہاں ایک ہی کو لیجئے:

"مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دے کر اٹھایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر مُوسلا دھار بارش ہو، پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پُوری طرح جذب کیا اور مُرجھایا ہوا سبزہ اس سے ترو تازہ ہو گیا اور نئی بُوٹیاں کثرت سے اُگ آئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصّہ ایسا بھی تھا جس نے پانی کو اپنے اندر جمع کر رکھا اور اللہ نے اسے لوگوں کے لیے مفید بنایا۔ انھوں نے اس کو پیا پلایا اور کھیتیوں کو اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور قطعہ پر برسا جو چٹیل میدان تھا اور نہ اس نے پانی جمع کر کے رکھا، نہ جذب کر کے روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے علم دین میں سُوجھ بُوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے دے کر اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس سے

---

[1] ملاحظہ ہو: روایت حضرت علیؓ، مندرجہ "الشفا" از قاضی عیاض

اسے فائدہ پہنچا۔ اس نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا۔ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس دعوت کو سُن کر سر نہیں اُٹھایا۔ اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جو میرے ذریعے بھیجی گئی ہے۔"

آپؐ کے اندازِ گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جا سکتا ہے تو قرآن کے اس جملے سے کہ:

"قُولُوا لِلنَّاسِ حسناً۔"

(لوگوں کو حُسنِ تکلم سے خطاب کرو)

آپ کا حُسنِ کلام سادگی کی شان لیے ہُوئے تھا۔ بناوٹی کلام سے آپؐ کو بُعد تھا۔ فرمایا:

ابعدُکم منی یوم القیٰمۃ الثرثارون المتشدقون المتفیھقون۔	تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دُوری پر ہوں گے جو بڑے بول بولنے والے باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں۔

اسی طرح آپؐ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی۔ حضورؐ کے چمن زارِ تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم لعل فشانی دکھاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ رُوئی سے آپؐ ہی کا چہرہ آراستہ رہتا تھا باوجودیکہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب ہر آن کی پریشانیوں کے خارزار درپیش تھے۔

خطابت

تکلم ہی کا ایک اہم جز خطابت ہے۔ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم پیغام کے حامل تھے۔ اور اس کے لیے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یُوں بھی عربوں کی دولت تھی۔ پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے حضورؐ بہت بلند رہے، فریضۂ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا آپؐ کی زبان کبھی نسیمِ سحر کی طرح، کبھی آبِ جُو کی طرح اور کبھی تیغِ برق دم کی طرح متحرک ہو جاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپؐ نے پرہیز کیا اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر اعتدال سے قوتِ خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطابت فرماتے تو اپنی چھڑی پر سہارا لیتے اور میدانِ جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھار سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دائیں بائیں جُھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسبِ ضرورت حرکت دیتے۔ تقریر میں بعض مواقع پر والذی نفسی بیدہٖ یا والذی نفس محمد بیدہٖ۔ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یا محمدؐ کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے، لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس انسانِ اعظمؐ کے خطابات دلوں کو ہلا دیتے تھے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حُنین و طائف کے معرکہ کے بعد حضورؐ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا تو مؤلفۃ القلوب کی قرآنی مد کے تحت نو مسلم رؤسائے مکہ کو اس میں بہت سا حصہ دیا تاکہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط تر ہو جائیں انصار میں کچھ لوگوں نے

عجیب سے احساسات کی رَو دوڑا دی، کہا گیا کہ :

"رسول اللہؐ نے قریش کو خوب انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خُون کی بُوندیں ٹپک رہی ہیں۔"

"مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصلِ غنیمت دُوسرے لوگ لے جاتے ہیں۔"

یہ چرچے حضورؐ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا اور اس میں انصار کا اجتماع بلایا گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں؟ جواب ملا کہ آپؐ نے جو سُنا وہ صحیح ہے۔ مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کہیں، کچھ نوجوانوں نے ایسے فقرے کہے ہیں۔" واقعہ کی تحقیق کے بعد آپؐ نے یہ تقریر کی :

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی؛ تم منتشر اور پراگندہ تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم کو متحد اور متفق کیا؛ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم کو آسودہ حال کیا؟ (ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور رسولؐ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے) ——— "نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی؛ تم کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ، اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے گروہِ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔" [1]

کلام کا اتار چڑھاؤ دیکھیے، خنجرِ خطابت کی اس دھار کو دیکھیے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی، پھر اس کی روانی دیکھیے، مطالب کے موڑ دیکھیے، پھر یہ غور کیجیے کہ کس طرح خطیبؐ نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پُوری طرح اُبھار دی۔ انصار بے اختیار چیخ اُٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں۔"

ابتدائی دورِ دعوت میں کوہِ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپؐ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور سے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہٗ وَ اللہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ وَ لَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ وَ اللہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَ اِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً وَ اللہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ وَ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ وَ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَ لَتُجْزَوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْٓءِ سُوْٓءًا وَ اِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا۔" [2]

---

[1] بخاری، جلد دوم، ص ۶۲۰

[2] جمہرۃ الخطب ص ۵

ترجمہ: "قافلے کا دیدبان اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بالفرضِ محال) میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا۔ اگر (بالفرضِ محال) میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ سے دوچار کر دیتا تو بھی تم کو کبھی خطرہ میں مبتلا نہ کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں میں تمھاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور سے خدا کا مقرر کردہ رسول ہوں۔ بخدا تم کو لازماً مرنا ہے جیسے کہ تم سو جاتے ہو، اور پھر مرنے کے بعد تم کو جی اُٹھنا ہے، جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہو جاتے ہو، تم سے لازماً تمھارے کاموں کا حساب لیا جانا ہے اور تمھیں بھلے کا بدلہ بھلا اور بُرے کا بدلہ بُرا ضرور ملنا ہے۔ پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہو گی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ۔"

کیا ہی سادہ اندازِ بیان ہے، کتنا عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر یقین کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پُوری طرح سموئی ہُوئی ہے۔

حضورؐ کے معرکۃ الآرا خطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکّہ کے موقع پر اور دُوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان، اخلاق اور اقتدار تینوں کی گونج سُنائی دیتی ہے۔ حجۃ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دَورِ نَو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

عام سماجی رابطہ

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطۂ عام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکیِ مزاج پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ کبر کا شکار ہو کر اپنے لیے ایک عالمِ بالا بنا لیتے ہیں مگر حضورؐ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رُخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پُوری طرح مربُوط تھے۔ اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے۔ علٰحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا۔ درحقیقت آپؐ نے جس نظامِ اخوت کی تاسیس فرمائی تھی، یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں۔ ایک دُوسرے کے کام آئیں اور ایک دُوسرے کے حقوق پہچانیں بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشوونما پا گیا ہے۔ اس میں "کسے را باکسے کارے نباشد" کی فضا بڑی انسانیت کُش ہو گئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رہنمائی میں اس فضا کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم حضورؐ کو عام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپؐ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جُدا جُدا سلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا۔ عورتوں کی جماعت کے قریب سے ہو کر نکلے تو ان کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے

اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معانقہ بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دُوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جاتے۔ کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا:

"اَجْلِسُ کما یجلس العبد" (اسی طرح اُٹھتا بیٹھتا ہوں، جس طرح خدا کا ایک بندہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ (روایت عائشہؓ)

اپنے زانو ساتھیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے، کوئی آتا تو اعزاز کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اُٹھتا آپ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہلِ مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلۂ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نمازِ صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہ سے خوب باتیں ہوتیں۔ جاہلیت کے قصے چھڑ جاتے اور ان پر خُوب ہنسی بھی ہوتی[1] صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس موضوع سے اہلِ مجلس کے چہروں سے اکتانے کا اثر محسوس ہوتا اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فردِ مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپؐ نے فوقیت دی ہے۔ دورانِ تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کر کے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پُورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اُس وقت تک رُخ نہ پھیرتے جب تک وُہ خود منہ نہ پھیر لیتا۔ کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پُوری کر کے مُنہ نہ ہٹا لیتا آپؐ برابر اپنا سر اسی کی طرف جُھکائے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے، اِلّا یہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک دیتے یا چہرے پر ناگواری آجاتی یا اُٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے ناپسندیدہ باتوں سے یا تو اعراض فرماتے ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ براہِ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے، بلکہ عوامی انداز میں اشارہ کرتے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ انتہائی تکدر کی صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ طریقِ اظہار تھا کہ یا تو شخصِ متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدمِ التفات دکھاتے۔ ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ چنانچہ ایک بار کوئی آیا جسے آپؐ بئس اخو العشیرۃ یا بئس ابن العشیرۃ (اپنے گروہ کا بُرا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے بے تکلفی سے بات چیت کی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین آدمی کا مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔"[2]

---

[1] روایت جابرؓ بن سمرہ (مسلم)

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۱ (بخاری)

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دیتے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کہتے ۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساسِ تکدر کے واپس چلے آتے ۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سُن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے ۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ ہٹاتا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے مَسَحَ اللّٰہُ عَنْكَ مَا تَكْرَہُ (خدا تم سے ہر اس شے کو دُور کرے جو تمھیں بُری لگے) ہدیہ قبول کرتے اور جواباً ہدیہ دینے کا خیال رکھتے ۔ کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں کوئی ہدیہ دیتے ۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے : حَسَنَۃٌ حسنۃ ، ابلِ و اخلِق (یعنی خوب ہے خوب دیر تک پہنو ، بوسیدہ کرو) بدسلوکی کا بدلہ بُرے سلوک سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے ۔ دُوسرے کے قصور معاف کر دیتے تو اطلاع کے ساتھ اپنا عمامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے ۔ کوئی پکارتا تو خواہ وہ گھر کا آدمی ہو یا رفقا میں سے ہمیشہ " لبیک " (حاضر ہُوں) کہتے ۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے ۔ سرہانے بیٹھ کر پُوچھتے " کَیْفَ تَجِدُكَ ؟ " (تمھاری طبیعت کیسی ہے ؟) بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے ۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر ۔ کھانے کو پُوچھتے ۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوا دیتے ۔ تسلّی دیتے اور فرماتے : " لَا بَأْسَ ! اِنْشَاءَ اللّٰہُ طَهُوْرٌ " (فکر کی کوئی بات نہیں خدا نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو گے) شفا کے لیے دعا فرماتے ۔ حضرت سعدؓ کے لیے تین بار دُعا کی ۔ مشرک چچاؤں کی بیمار پُرسی بھی کی ۔ ایک یہودی بچّے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا) اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا ۔ جب بھی اطلاع ملی اور وقت ملا تشریف لے جاتے ۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے ۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیے ہُوئے پیدل خاصی دُوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہُوئی تھی) حضرت جابرؓ بے ہوش پڑے تھے ۔ آپؐ نے دیکھا ۔ پھر وضو کیا ، پانی کے چھینٹے دیئے ، دُعا کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی ۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پُوچھے ۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی ۔

جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے ، عالمِ نزع میں بلایا جاتا یا از خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توجہ الی اللہ کی تلقین کرتے ۔ میّت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے ، صبر کی نصیحت کرتے اور چلّانے اور بُکا کرنے سے روکتے ۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے ۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے ۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لیے دُعا کرتے ۔ کوئی جنازہ گزرتا ——— تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو ——— کھڑے ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا ۔ ملاحظہ ہو زاد المعاد ، ج ۱ ، ص ۱۴۵ ۔) تلقین فرماتے کہ میّت کے گھر والوں کے لیے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں (کجا آج یہ الٹی رسمیت مسلّط ہے کہ میّت والے گھر میں دُوسروں کی ضیافت ہوتی ہے) ناپسند تھا کہ باقاعدہ مجلسِ تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی روز جاری رہے ۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے، بعض اوقات پیشانی چوم لیتے۔ کسی کو سفر کے لیے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے، جیسے یا ابا ہریرہ کے بجائے "ابا ہر"۔ حضرت عائشہ کو کبھی کبھار "عائش" کہہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرتے، پیار کرتے، دعا فرماتے، ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ ان کو بہلانے کے لیے عجیب سے کلمے فرماتے یعنی خرقۃ خرقۃ فی عین کل بقۃ[1] ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا، اِنَّھُمْ لَمِنْ رَّیْحَانِ اللّٰہِ (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں) بچوں کے نام تجویز کرتے بچوں کو قطار میں جمع کر کے انعامی دوڑ لگواتے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھولیتا ہے بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا، کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے کہا: "یَا ذَا الْاُذُنَیْنِ"۔ (او، دو کانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابوعمیر کا پالا ہوا ممولا مر گیا۔ تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ حضورؐ آئے تو پکار کر کہا "یا ابا عمیر! ما فعل النُّغَیر (ابوعمیر! تمھارے ممولے کو کیا ہوا) عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے صاحبزادے میاں راستہ میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپؐ پیار سے عبداللہ کے کان پکڑ کر کہتے "یاغدر! یاغدر!" (او دھوکے باز، او دھوکے باز) سفر سے آرہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے، بڑا ہوتا تو پیچھے۔ فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچے کو دے دیتے۔ آپؐ کے پیشِ نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریکِ اسلامی کی علمبردار ہوگی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اپنے ضعیف العمر والد کو (جو بینائی سے بھی محروم ہو چکے تھے) بیعتِ اسلام کے لیے آپؐ کی خدمت میں لائے۔ فرمایا: انھیں کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مروت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے آپؐ اسے فرماتے ہیں کہ تم چلو، کسی کوچے میں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی اور اس کا کام کر کے دیا[2]

ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم نے دیکھا تھا اور حضورؐ کی مروت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپؐ کے حسنِ کردار کی تصویر حضرت انسؓ نے خوب کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں:

---

[1] بعض لوگوں نے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے (ہر مچھر کی آنکھ میں ٹڈی کا جبڑہ ہے) مگر بظاہر یہ ویسے ہی کلمات ہیں جیسے ہر ملک میں بچوں کو بہلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۵

"میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہا اور آپؐ نے مجھے کبھی اُف تک نہ کہی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا، نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا، اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ یہی معاملہ آپؐ کا خادموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا۔ آپؐ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا۔"

اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا، نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا ——— بجز اس کے کہ آپؐ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانونِ الٰہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

خالص نجی زندگی

اکثر بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں جو پبلک لائف کے لیے ایک مصنوعی کردار کا چغہ پہنے رکھتے ہیں جو نجی زندگی میں اُتر جاتا ہے۔ باہر دیکھیے تو بڑی آن بان ہے، گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جا گرے۔ باہر سادگی اور تواضع دکھائی دی، گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ ادنیٰ ہوتا ہے۔ حضور کو دیکھیے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے اور گھر سے باہر بھی۔

حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ "رسولِ خداؐ اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟" انھوں نے جواب میں فرمایا: آپؐ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے (کہ ان میں کوئی جُوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو) بکری کا دُودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پُوری کر لیتے[1] نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے، اپنے جُوتے کی مرمت کر لیتے اور یہ کہ اپنے ڈول کو ٹانکے لگا لیتے، بوجھ اٹھاتے، جانوروں کو چارہ ڈالتے، کوئی خادم ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر کام کرا دیتے۔ (مثلاً) اسے آٹا پسوا دیتے، کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے[2] بازار جانے میں عار نہ تھی، خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔

لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسولِ خدا جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا؟ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں: "الین الناس بساماً ضاحکاً۔ (سب سے زیادہ نرم خُو، متبسم، خندہ جبین) اور اس لینت کی شان یہ تھی کہ "کبھی کسی خادم کو جھڑکا نہیں۔" حق یہ ہے کہ رسولِ خدا سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل وعیال کے لیے شفیق نہ تھا۔ (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؓ کے پُوچھنے پر حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ رسولِ خدا گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا، کچھ وقت اہل وعیال کے لیے تھا اور کچھ وقت اپنے آرام کے لیے پھر انھی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لیے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے احباب یا مہمان آ آ کر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات وحاجات لے کر آتے[3]۔ دیکھا جائے تو آرام کے لیے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱، ص ۲۹۳

[3] ایضاً ج ۱، ص ۲۹۳

ازواجِ مطہرات کے نان و نفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپؐ کو کرنا ہوتا۔ پھر ان کی تعلیم و تربیت بھی آپؐ کے ذمے تھی۔ پھر انہی کے ذریعے طبقۂ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا۔ عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواجِ مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضا کو آپؐ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا۔ اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا۔ گھر ایک انسانی گھر کی طرح تھا جس کی فضا میں فطری جذبات کا مدوجزر رہتا۔ اس میں آنسوؤں کی چمک بھی ہوتی، اور تبسموں کی لمعانی بھی، محبتیں بھی کارفرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ بھی پیدا ہوتا۔ پریشانیاں بھی رہتیں۔ اور تفریح کے لمحات بھی آتے۔ حضورؐ اس باغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے کی طرح آتے اور ایک عجیب شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی، کبھی کبھار قصہ گوئی بھی ہوتی، اور دلچسپ لطائف بھی وقوع میں آتے۔ مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہ (گوشت کا قیمہ کر کے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا) تیار کیا۔ حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں اور رسولِ خدا دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلفی کی فضا تھی۔ میں نے سودہؓ سے کہا کہ کھاؤ۔ انھوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ کھاؤ۔ انھوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ تمھیں ضرور کھانا ہوگا۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ اُدھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ میں اٹھا کر تمھارے مُنہ پر مل دوں گی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ہٹ دکھائی۔ حضرت عائشہؓ نے خزیرہ میں ہاتھ ڈالا اور واقعی حضرت سودہؓ کے چہرے پر لیپ دیا۔ اس بے تکلفی پر حضورؐ خوب ہنسے اور سودہؓ سے کہا کہ تم اس کے مُنہ پر ملو تاکہ حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ سودہؓ نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ مکرر ہنسے۔[1]

ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ آئے تو حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا، غضبناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضورؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اسی غصے میں جناب صدیقؓ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے تیکھے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا: دیکھا! ہم نے تمھیں اس شخص سے کیسے بچا لیا۔

گھریلو زندگی کے اس فطری اتار چڑھاؤ کو بعض لوگ اسلامیت کے تصور سے فروتر پاتے ہیں، اور خصوصاً نبی کریمؐ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی پُتلے رہتے تھے جن میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ خواہش۔ حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا۔ اور اس میں سارے انسانی جذبات کام کرتے تھے۔ مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضورؐ بستر پہ ہوتے تو اہل و عیال سے عام باتیں ہوتیں۔ کبھی گھریلو امور پر، کبھی عام مسلمانوں کے مسائل پہ۔ یہاں تک کہ کبھی قصہ کہانی بھی سُناتے۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے امِ زرع کی کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں گیارہ عورتیں اپنے اپنے خاوندوں کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت امِ زرع اپنے خاوند ابوزرع کا من موہنا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ خاتمے پر حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمھارے حق میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ ابوزرع امِ زرع کے لیے تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے موقع پر کوئی قصہ

۱؎ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲؎ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۷-۲۹۶

سُنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصوں جیسا ہے (عرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے) حضورؐ نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی۔ پھر آپؐ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عذرہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے۔[1]

عمر بھر معمول رہا کہ رات کے دُوسرے نصف حصے کے اوائل میں بیدار ہو کر مسواک اور وضو کے بعد تہجد ادا فرماتے[2]۔ قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متورم ہو جاتے۔[3] صحابہؓ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپؐ کو غفرانِ خاص سے نوازا ہے قَدْ غَفَرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ پھر اس قدر حضورؐ جان کیوں گھلاتے ہیں۔ فرمایا: اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ (کیا میں خدا کا احسان شناس اور شکر گزار بندہ نہ بنوں)[4]

گھر اور اس کے ساز و سامان کے متعلق آپؐ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گزاری جائے جیسے مسافر گزارتا ہے۔ فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو منتہا بنائیں اور دُنیوی زندگی کو ادائے فرض یا امتحان کے طور پر گزاریں۔ اور جنھیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی ہو ان کے لیے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجہ کے مسکن بنائیں اور ان کو ساز و سامان سے آراستہ کریں، اور پھر ان میں مگن رہ کر لطف اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجہ کی عمارتیں بنائیں اور نہ ان میں اسباب جمع کیے اور نہ ان کی زینت و آرائش کی۔ ان کے گھر بس "بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں"[5]۔ ان میں گرمی سردی سے بچنے کا اہتمام تھا، جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا، پردہ داری (PRIVACY) کا بندوبست تھا اور حفظانِ صحت کے ضروری پہلو ملحوظ تھے۔[6] حضورؐ نے مسجد کے ساتھ ازواج کے لیے حجرات (چھوٹے چھوٹے کمرے) بنوا لیے تھے۔ بجز صفائی کے اور کسی طرح کی آرائش نہ تھی۔ صفائی میں ذوقِ نبوت یہاں تک تھا کہ صحابہؓ کو تاکید فرمائی: "گھروں کے آنگن صاف رکھو"[7]

ساز و سامان میں چند برتن نہایت سادہ قسم کے تھے۔ مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا، جس پر لوہے کے پتر لگے تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک کا سامان جمع تو کیا ہوتا، روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ ہوا۔ بستر چمڑے کے گدے پر مشتمل تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی رکھتے۔ ٹاٹ کا بستر

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السمر

[2] زاد المعاد

[3] شمائل ترمذی باب ما جاء فی عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[4] ایضاً

[5] زاد المعاد فی تدبیر لامر المسکن ج ۳ ص ۱۴۲۔ [6] ایضاً

[7] روایت ابن المسیب (ترمذی)

بھی استعمال میں رہا، جو دوہرا کر کے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کر کے بچھایا گیا تو صبح دریافت فرمایا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ مجھے گہری نیند آئی اور تہجد چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقائے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعود) رو دیئے[1]

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لایئے۔ واقعۂ ایلاؔ کے زمانے میں اُنھوں نے حضورؐ کو اس عالم میں دیکھا کہ آپؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک طرف مُٹھی بھر جَو رکھے ہیں، ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے، یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پُوچھا تو عرض کی کہ "قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپؐ کا یہ حال رہے۔" فرمایا: "عمر! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وُہ لوگ دُنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے۔"[2]

اکل و شرب

کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا۔ گوشت سے خاص رغبت تھی۔ زیادہ ترجیح دست، گردن اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے۔ نیز پہلو کی ہڈی پسند تھی، ثرید (گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر یہ مخصوص عربی کھانا تیار کیا جاتا تھا) تناول فرمانا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد، سرکہ، خربوزہ، ککڑی، لوکی، کھچڑی، مکھن وغیرہ اشیا شامل تھیں۔ دُودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھرچن (تہ بگی) سے بھی انس تھا۔ ککڑی نمک لگا کر اور خربُوزہ شکر لگا کر بھی کھاتے۔ مریضوں کی پرہیزی غذا کے طور پر حریرہ کو اچھا سمجھتے اور تجویز بھی فرماتے۔ میٹھا پکوان بھی مرغوب خاص تھا۔ اکثر جَو کے ستّو بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے ستّو پیش کیے گئے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ امراء کی غذا ہے۔ گھر میں شوربا پکتا تو کہتے کہ ہمسائے کے لیے ذرا زیادہ بنایا جائے۔

پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر میٹھا پانی تھا۔ اور بطورِ خاص دَو روز کی مسافت سے منگوایا جاتا۔ دودھ، پانی مِلا دُودھ (جسے کچّی لسی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے۔ غیر نشہ دار نبیذ بھی قرینِ ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھر استعمال کرتے۔ لیکن وقت زیادہ ہونے پر چونکہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا لہٰذا پھنکوا دیتے۔ بہ روایت ابو مالک اشعری یہ بھی فرمایا کہ میری اُمت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ دیں گے (چنانچہ سلاطینِ مابعد نے نبیذ کے نام سے منشیات کا استعمال کیا)

---

[1] ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی، باب ماجاء فی فراش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۴۰ نیز صحیح مسلم باب فی الرجل یطلق امرأتہ۔ روایت عبداللہ ابن عباس۔

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا، اکٹھے ہو کر کھانے کی تلقین فرمائی۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شانِ فقر کے خلاف سمجھتے، اسی طرح دسترخوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلافِ مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرما دیا تھا۔ کانچ، مٹی، تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دسترخوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جُوتا اتار کر بیٹھتے۔ سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے۔ برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلافِ معمول تھا' دو زانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے۔ کبھی کبھار چُھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے۔ مگر یہ پُر تکلف طریقہ مرغوب نہ تھا[1]۔ کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور ان کو لتھڑنے نہ دیتے۔ کبھی کبھار میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھا لیا۔ دو پھل اکٹھے بھی کھاتے۔ مثلاً ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دُوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی اُلٹے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دُوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہُوئے یا کسی اور سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے جاتے مگر صاحبِ خانہ سے اس کے لیے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بہ تقاضائے مروت سب سے آخر میں اُٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپؐ بھی اُٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے۔ دُعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لیے ادائے شکر کے کلمات ہوتے، نیز طلبِ رزق فرماتے اور صاحبِ خانہ کے لیے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ رکھ دیتے۔ پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی تربیت آپؐ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور بالعموم تین بار پیالہ منہ سے الگ کر کے سانس لیتے اور ہر بار آغاز "بسم اللہ" سے اور اختتام "الحمد للہ والشکر للہ" پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی کھڑے ہو کر بھی پیا ہے۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم داہنی جانب سے دَور چلاتے اور جہاں ایک دَور ختم ہوتا دوسرا وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے، مگر داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بنا پر ان سے اجازت لے کر ہی ترتیب توڑتے۔ احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب سے آخر میں پیتے اور فرماتے کہ "ساقی آخر میں پیا کرتا ہے"۔ کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا ان کو سُونگھنا ناپسند تھا۔ سانس میں بُو کا ہونا چونکہ خلافِ مزاج تھا اس لیے کچی پیاز اور لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے پہلے اس کا نام معلوم فرماتے۔ زہر خورانی کے واقعہ کے بعد معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص کھانا کھلاتا تو پہلے ایک آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے[2]۔

---

[1] روایت عمر بن امیہ (بخاری و مسلم) نیز روایتِ عائشہؓ (ابوداؤد و بیہقی)
[2] ملاحظہ ہو شمائل ترمذی (ابواب متعلقہ)

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دُوسری طرف اکثر اوقات فقر و فاقہ کا عالم درپیش رہا۔ جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ دیں گے۔ فرمایا:

"اٰکل کما یا کل العبد۔"

(میرا کھانا پینا ایسا ہے جیسے (خدا کے) کسی بندے کا ہونا چاہیے)

نشست و برخاست

کبھی اُکڑوں بیٹھتے، کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ زن کر لیتے، کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا (چادر وغیرہ) لپیٹ لیتے۔ بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم اُلٹے ہاتھ پر۔ فکر یا سوچ کے وقت بیٹھے ہوئے زمین کو لکڑی سے کریدتے۔ سونے کے لیے سیدھی کروٹ سوتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لیتے۔ کبھی چت بھی لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے۔ مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔ پیٹ کے بل اوندھا لیٹنا سخت ناپسند تھا۔ اور اس سے منع فرماتے تھے۔ ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ جلایا گیا۔ کھلی چھت پر جس کی پردے کی دیوار نہ ہو سونا اچھا نہ سمجھتے، وضو کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سُورتیں (سورۂ اخلاص اور معوّذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے۔ سوتے ہوئے ہلکی آواز سے خرّاٹے لیتے۔ رات میں قضائے حاجت کے لیے اُٹھتے تو فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے[1] سونے کے لیے ایک تہ بند علحدہ تھا۔ کُرتہ اتار کر ٹانگ دیتے۔

بشری حاجات

ضرورت کے لیے چونکہ اُس دَور میں گھروں میں بیت الخلانہ تھے اِس لیے حضورؐ جنگل جاتے۔ عموماً اتنی دُور تک جاتے (دُو، دُو میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اُڑیں۔

غسل کے لیے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔ گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔ کبھی بارش میں نہاتے تو تہ بند باندھ لیتے۔

چھینک پست آواز سے لیتے اور ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے۔

سفر

سفر کے لیے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔ سواری کو تیز چلاتے، پڑاؤ سے صبح کے وقت کُوچ کرنا معمول رہا۔ سفر (CAMP LIFE) میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں ضرور حصّہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی مہم تھی

---

[1] شمائل ترمذی

سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کیے۔ آپؐ نے بھی لکڑیاں چننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپؐ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کے لیے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں[6] سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے سفر سے رات میں واپس آنا پسند نہ تھا۔ آتے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

جذبات

انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضورؐ میں بھی انسانی جذبات بہترین اسلوب پر کار فرما تھے آپؐ بہت ہی صاحب احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور غم میں غم سے متاثر ہوتے۔

حضورؐ ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے جو دنیا جہان کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے لیے سنگدل اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پُر ہنگامہ ہوتی ہے گھر کی پھیکی اور بدمزہ۔ آپؐ کو ازواج کے ساتھ سچی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پیتے۔ اور جہاں وہ منہ لگاتیں وہیں مُنہ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں۔ حبشیوں کے ورزشی کرتب اس انداز سے دکھائے کہ حضرت عائشہؓ کی ٹھوڑی آپؐ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پُوچھتے کہ "کیا تم سیر ہو گئی ہو؟" وہ کہتیں: "ابھی نہیں۔" دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔[1] حضرت صفیہؓ کو اونٹ پر سوار کرانے کے لیے آپؐ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجنابؓ اپنا پیر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں ناقہ کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور جناب صفیہؓ دونوں گر پڑے۔ ابُو طلحہ ساتھ تھے۔ دوڑتے ہُوئے آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے فرمایا: پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو۔ ایک بار ساربان نے اُونٹوں کو تیز چلایا تو فرمانے لگے: "دیکھو، آبگینے ہیں آبگینے! ذرا احتیاط سے!"[2] اِسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر عتاب آیا کہ حلال شے کو حرام نہ کرو۔[3]

اپنے بچّوں کے لیے بھی حضورؐ کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کو رضاعت کے لیے ایک لوہار کے گھر میں مدینہ کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا ان کو دیکھنے کے لیے خاصہ فاصلہ چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دُھواں بھرا ہوتا مگر وہاں بیٹھتے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔[5]

---

[1] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۴ [2] ایضاً ص ۲۹۶ [3] مسلم و بخاری

[4] مغربی اہلِ قلم نے حضورؐ کی اس صاف ستھری ازدواجی زندگی کو مخالفت کا ہدف بنایا ہے، حالانکہ خود ان کے تمدن نے جو بلند ترین اور ذمہ دار ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں وہ نہ صرف گھر کے دائرے میں رکاکت تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ اس دائرے سے باہر بھی انھیں نفسانیت گھناؤنی پستیوں میں گراتی رہتی ہے۔ حضورؐ کا حال یہ تھا کہ ساری دلچسپیاں دائرۂ ازدواج تک محدود تھیں اور ان میں بھی رنگِ پاکیزگی نمایاں تھا۔ آپؐ نے فطرت کے تقاضوں کو شائستگی کی حدود میں رکھ کر با حسن طریق پُورا کیا، اور ازدواجی محبت کا ایک مہذب اسلوب پیدا کیا۔

[5] بروایت انسؓ

حضرت فاطمہؓ آتیں تو اُٹھ کر استقبال کرتے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے۔ ان کے صاحبزادوں امام حسنؓ و امام حسینؓ سے بہت ہی پیار تھا۔ ان کو گود میں لیتے، ان کو کندھوں پر سوار کرتے، ان کے لیے گھوڑا بنتے۔ حالتِ نماز میں بھی ان کو کندھوں پر بیٹھنے دیتے۔ ایک بار اقرع بن حابس نے آپؐ کو جنابِ حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا مگر آپؐ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

انہی ابراہیم صاحبزادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحبزادی کی وفات آپؐ کی موجودگی میں ہوئی ام ایمن (کنیز) چلا چلا کے رونے لگیں۔ حضورؐ نے منع فرمایا، تو وہ کہنے لگیں کہ آپؐ خود بھی تو رو رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا جس رقت کی وجہ سے ہے وہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحبزادی ام کلثوم کی قبر پر کھڑے ہوئے تو اس وقت بھی آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمان بن مظعون کی میت کے سامنے بھی آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا[1]۔ اپنے رونے کی کیفیت کو خود بیان فرمایا "آنکھیں اشک آلود ہیں، دل غم زدہ ہے، مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔" غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے:

حسبی اللہ نعم الوکیل۔

رونے میں اُونچی آواز نہ نکلتی بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے اور ہانڈی کے اُبلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔

یہ دلِ حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن وردِ زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بسا اوقات پلکوں پر موتی چمکنے لگتے۔ ایک بار عبد اللہ ابن مسعودؓ سے فرمائش کر کے قرآن سنا۔ وہ جب سورۂ نساء کی اس آیت پر پہنچے "فکیف اذا جئنا۔۔۔" (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کر کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ بنا کے لائیں گے)، تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا[2]۔

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذباتِ ہمدردی و شفقت کا جو حضورؐ کو ساری انسانیت سے تھی اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے۔ باحیرت ہے کہ اس نزاکتِ احساس کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

ذوقِ مزاح

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسولِ خدا خندہ رُوئی کی صفت سے متصف تھے۔ بلکہ فرمایا:

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی بکاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۷

"تبسمك فی وجه اخيك صدقة۔"

(تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کارِ خیر ہے)

آپؐ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے کہ کان بساماً ضاحکاً۔ عظیم کارنامے انجام دینے والی شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائضِ حیات کے بوجھ کو اپنے تبسّم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ آپؐ کا یہ حال تھا کہ "قد كان يباسط اصحابه بمايولج جنته فی القلوب"[1] یعنی آپؐ ایسے بے تکلفانہ انداز مزاح سے پیش آتے تھے کہ رفقا کے دلوں میں آپؐ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپؐ ہنسی، دل لگی کی باتیں کرتے۔ اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلافِ حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی نہ کسی کی دلآزاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسا معمول تھا۔ غنچوں کا سا تبسّم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے۔ حلق نظر نہ آتا۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ "آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟" ارشاد فرمایا: "ہاں! مگر خلافِ حق کوئی بات نہیں کہتا۔"

یہاں ہم حضور پاکؐ کے مزاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنّت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں[2]:

○ کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا۔ فرمایا: ہم تمھیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے۔ سائل نے حیرت سے کہا کہ میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ فرمایا: ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

○ ایک بڑھیا نے آ کر عرض کی کہ میرے لیے دُعا کیجیے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے۔ حضورؐ نے مزاحاً کہا: "اے امِ فلاں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جا سکتی۔ وہ روتی ہوئی اُٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا: اسے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جانے گا، بلکہ اس کا ارشاد ہے۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۞ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۞ عُرُبًا اَتْرَابًا مراد یہ کہ جنت میں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

○ زاہر (یا زہیر) نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپؐ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضورؐ کے کام کرلاتا۔ نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا (جن کی قیمت حضورؐ باصرار ادا فرماتے) چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا کچھ سودا بیچ رہے تھے حضورؐ نے پیچھے سے جا کر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھے پھر جب معلوم ہوا تو فرطِ اشتیاق میں حضورؐ کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضورؐ نے مزاحاً کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے: یا رسول اللہؐ! مجھ جیسے ناکارہ غلام کو جو خریدے گا، گھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا: تم خدا کی نگاہ میں

---

[1] المواهب اللدنيه ج ۱ ص ۲۹۷

[2] بیشتر واقعات شمائل ترمذی سے لیے گئے ہیں۔ باب ماجاء فی صفة مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ناکارہ نہیں ہو۔

○ ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپؐ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال نکال کر علیؓ کے آگے ڈالتے رہے آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھالیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

○ غزوۂ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضورؐ خوب ہنسے اور آپؐ کے دانت (نواجذ) تک دکھائی دیے۔ ہوا یہ کہ عامر کے والد سعد تیر پھینک رہے تھے ایک دشمن فرد زد پر تھا، وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا۔ سعد کے تیر کاری نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعد نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں۔ اس نے جونہی ڈھال سے سر نکالا، تیر سیدھا پیشانی میں پیوست ہوگیا۔ اس بُری طرح چکرا کر گرا کہ ٹانگیں اُوپر کو اُٹھ گئیں۔

بعد کے لوگوں کو اِس رنگِ مزاح کا حال سُن کر تعجب ہوتا تھا، کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشّف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور خدا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ رونی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں، دوسرے حضورؐ کی عبادتِ رب، حضورؐ کی خشیت، حضورؐ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضورؐ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس نمونۂ انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لیے زندگی کے نقشے میں کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابنِ عمرؓ سے پُوچھا گیا کہ "کیا رسول اللہؐ کے رفقا بھی ہنسا کرتے تھے؟" انھوں نے فرمایا: "ہاں ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا۔ (یعنی ہنسی دل لگی ایمان و تقویٰ کی نقیض نہیں ہے) تیروں کا نشانہ (بطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے۔" (روایت قتادہ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نمازِ صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دَور کی باتیں بھی چھڑتیں اور صحابہؓ کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپؐ کی دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

تفریحات

متوازن زندگی کا ایک لازمی جزء تفریحات (جائز حدود میں) بھی ہیں۔ مزاح کی طرح یہ جزء ساقط ہوجائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظامِ حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ دیر تک اُٹھا نہیں سکتا۔ حضورؐ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لیے راستے نکالے۔

شخصی طور پر آپؐ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا، کبھی تنہا اور کبھی رفقا کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تَیرنے کا مشغلہ بھی تھا اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے۔ دو دو ساتھیوں کے جوڑ بنائے جاتے

اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دُور سے تیر کر ایک دُوسرے کی طرف آتے۔ ایک موقع پر اپنا ساتھی حضورؐ نے جناب ابوبکر صدیقؓ کو پسند کیا۔

۔ وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہ بند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنویں میں پاؤں لٹکا کے اس کے دہانے پر بیٹھتے۔[۱]

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دلچسپی سے شریک رہتے۔ ایسے موقعوں پر ہنسی بھی ہوتی۔

مسرت کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گالیں۔ چنانچہ عید کی تقریب پر حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گا رہی تھیں حضورؐ قریب ہی لیٹے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ آئے تو غصّے میں ڈانٹا کہ خدا کے رسولؐ کے گھر میں یہ کیا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ انھیں گانے دو۔[۲]

شادی بیاہ کے لیے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے۔ (روایت عائشہ و محمد بن الحاطب الجمحی) حضرت عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی میں نے اس کا نکاح کر کے دیا تو حضورؐ نے فرمایا: "عائشہؓ! تم گانے کا انتظام نہیں کراتیں حالانکہ قبیلۂ انصار گانے کو پسند کرتا ہے"۔ ایک دُوسری روایت میں (غالباً اسی موقعے سے متعلق) یہ آتا ہے کہ "تم لوگ کسی گانے والے کو لڑکی کے ساتھ بھیجتے جو کہتا "اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فَحَیَّانَا وَ حَیَّاکُمْ" (ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے۔ پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں)۔ ایسی ہی ایک بزم عروسی میں بچیاں کچھ گا رہی تھیں حضرت عامر بن سعد نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ "اے صحابیانِ رسولؐ! اے شرکائے بدر! تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے!" جواب ملا، جی چاہے تو بیٹھ کر سُنو ورنہ چلے جاؤ، ہمیں رسول اللہؐ نے اس کی اجازت دی ہے۔[۳]

از انجملہ حضورؐ نے شعر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی، اس سے تو آپؐ کو بُعد تھا۔ آپؐ کو نغمۂ الہام کی جاذبیتیں اتنا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دُوسری طرف ذوقِ شعر سے قدرت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظِ مقصد) کی قدر فرماتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے ایک نیا ذوق معاشرے کو دیا۔ اور ایک نیا معیارِ نقد مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک سو سے زیادہ مجالس میں شریک ہوا ہوں جن میں جاہلیت کے قصّے بھی ہوتے تھے۔ اور صحابہ شعر بھی سُنایا کرتے۔ شاعرانِ عرب کے

---

[۱] شمائل ترمذی مختلف ابواب

[۲] روایت عائشہؓ (مسلم۔ باب مایقول الجواری فی العید)

[۳] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب اعلان نکاح۔

کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرع پسندیدگی سے پڑھا:

"اَلَا کُلَّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ"

(آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے)

دُوسرا مصرع ہے:

"وَکُلَّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ"

(دُنیا کی ساری نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں)

حضرت شرید سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کر کر کے اُمیہ بن ابی صلت کے سَو شعر سُنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدانِ جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرمائے ہیں۔ حضرت حسان اور کعب بن مالک سے دشمنانِ اسلام کے ہجویہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسان کو اپنے منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ "یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں"۔ یہ بھی فرمایا کہ:

"مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی"۔

چند متفرق ذوقیات

آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات واطوار کا ذکر کرتے ہیں جنہیں کسی دُوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جا سکا۔

- کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے۔ اور کوئی چیز دیتے تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔
- خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مُہر لگواتے۔
- حضورؐ اوہام پسندی سے پاک تھے اور شگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے اچھے نام پسند آتے۔ بُرے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لیے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں لڑائی جھگڑے یا نقصان کا معنی شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے ناموں میں خوشی یا کامیابی کا مفہوم پایا جائے۔ بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔
- سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فرماتے: گھوڑے کے ایال میں قیامت تک کے لیے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ، منہ، ناک کو اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے۔

○ شور، ہنگامہ اور ہڑبونگ اچھی نہ لگتی۔ ہر کام میں سکون و وقار اور نظم و ترتیب چاہتے۔ نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ "علیکم بالسکینۃ"۔ (تمہارے لیے سکون و وقار لازم ہے)۔ یومِ عرفہ کو ہجوم تھا بڑا شور و ہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم و سکون کا حکم دیا اور فرمایا: "فان البر لیس بالایضاع"۔ (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے)[1]

اخلاق

حضور پاکؐ کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جا سکتا۔ وہاں تو پوری زندگی حسنِ خلق ہی کی تفسیر ہے۔ جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا: "کان خلقہ القرآن"۔ انس بن مالک کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ "کان احسن الناس وکان اجود الناس وکان اشجع الناس"[2]۔ احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی (ماسوا ان باتوں کے جو حکمِ الٰہی کے تحت تھیں) اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہر کسی سے عفو فرمایا۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بیداگروں کو معاف کیا اور منافقین و اشرار سے درگزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا کہ جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا آپ نے کبھی نہ نہیں کی[3]۔ (موجود ہوا تو دے دیا، کبھی قرض لے کر دیا، نہیں موجود ہوا تو دوسرے وقت آنے کو کہا، یا سکوت اختیار کیا) اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریۂ حق کو لے کر تنِ تنہا اُٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جمے کھڑے رہے۔ کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوف یا کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ غارِ ثور ہو یا اُحد و حنین کے معرکے، ہر موقع پر یقینِ محکم کا مظاہرہ کیا۔

---

[1] بخاری و مسلم [2] مسلم باب فی شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم [3] باب ماسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسالتؐ نامہ ——— دریا بہ حباب اندر

ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم اے پی ایچ ڈی

ابو الفرج عبدالرحمٰن بن علی القرشی البغدادی (۵۱۱ھ۔ ۵۹۷ھ) اپنے زمانے کے بہت بڑے فقیہہ، ادیب، مورخ، مفسر اور محدث تھے۔ آپ کی ساری زندگی تالیف و تدریس میں بسر ہوئی۔ آپ کی تصانیف ایک سو میں کے قریب ہیں، ان میں سے ایک "تلقیح" ہے جس میں آپ نے حیاتِ رسولؐ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ۴۸۴ صفحات کی اس کتاب میں اس قسم کے سیکڑوں عنوان ہیں۔ یعنی، حضورؐ کی دادیوں کے نام، حضورؐ کی دائیوں کے نام، حضورؐ کی کنیزوں کے نام، حضورؐ کی پھوپھیوں کے نام، حضورؐ کی ازواج کے نام، حضورؐ کی تلواروں کے نام، حضورؐ کی ڈھالوں کے نام، حضورؐ کی مہمات کے نام ——
وقس علیٰ ھذا

ذیل کے عنوانات و تفصیلات ابن جوزی کی محولہ کتاب سے ماخوذ ہیں:

۲۲ اپریل ۵۷۱ء ——— ولادت (۹ ربیع الاول ۱ھ) عام الفیل (مطابق یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ بکرمی) بعد از صبح صادق قبل از طلوع، بروز سوموار

تقریباً ایک ہفتہ بعد ——— حلیمہ سعدیہؓ کی آغوش رضاعت میں

پانچ سال کی عمر میں ——— پھر آغوشِ مادر میں

چھ سال کی عمر میں ——— والدہ ماجدہ کا انتقال

آٹھ سال کی عمر میں ——— دادا (عبدالمطلب) کی وفات

بارہ سال کی عمر میں ——— شام کا پہلا تجارتی سفر

۲۵ سال کی عمر میں ——— حضرت خدیجہؓ سے نکاح

۳۰ سال کی عمر میں ——— قوم کی طرف سے الامین کا خطاب

۳۵ سال کی عمر میں ——— تمام قبائل کی طرف سے حکم (ثالث) دیوارِ کعبہ میں حجرِ اسود نصب کرنے کے وقت

۳۷ سال کی عمر میں ——— غارِ حرا میں خلوت اور عبادت و تفکر

——— حضرت علیؓ کی کفالت

۴۰ سال کی عمر میں ——— نزولِ وحی

۳ سنہ نبوی ۴۳ سال کی عمر میں ——— چالیس زن و مرد کا اسلام قبول کرنا۔

۵ سنہ نبوی ۴۵ سال کی عمر میں ——— حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے صحابہؓ کو حکم

سنہ ۶ نبوی ۴۶ سال کی عمر میں ——— حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام قبول کرنا۔

سنہ ۷ نبوی ۴۷ سال کی عمر میں ——— کفار قریش کی جانب سے بائیکاٹ اور شعب ابی طالب میں محصور ہونا

سنہ ۱۰ نبوی ۵۰ سال کی عمر میں ——— معاشرتی مقاطعہ (بائیکاٹ) کا خاتمہ،

چچا ابوطالب کا انتقال، حضرت خدیجہؓ کی وفات، تبلیغ اسلام کے لیے طائف کا سفر حضرت
عائشہؓ سے نکاح۔ رخصتی چار سال کے بعد ہوئی تھی معراج کا واقعہ

سنہ ۱۱ نبوی ۵۱ سال کی عمر میں ——— یثرب (مدینے) کے چھ آدمیوں کا قبول اسلام

سنہ ۱۲ نبوی ۵۲ سال کی عمر میں ——— یثرب (مدینے) کے بارہ آدمیوں کا قبول اسلام

سنہ ۱۳ نبوی ۵۳ سال کی عمر میں ——— (یثرب (مدینے) کے ۷۲ آدمیوں کا قبول اسلام

سنہ ۱ ہجری ۵۴ سال کی عمر میں ——— مدینے کے شہری نظم و نسق کی دیکھ بھال۔

ہجرتِ مدینہ

سنہ ۲ ہجری ۵۵ سال کی عمر میں ——— کفار کا پہلا حملہ (واقعۂ بدر) کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار اور مسلمان ۳۱۳ تھے۔

سنہ ۳ " ۵۶ سال کی عمر میں ——— کفار کا دوسرا حملہ (واقعۂ اُحد)

سنہ ۴ ھ ۵۷ سال کی عمر میں ——— بنی عامر کی چالبازی اور قاریوں کی شہادت

سنہ ۵ ھ ۵۸ سال کی عمر میں ——— کفار کا تیسرا حملہ (واقعۂ خندق) حملہ آوروں کی تعداد ۱۲ اور ۱۵ ہزار کے درمیان تھی۔

سنہ ۶ ھ ۵۹ سال کی عمر میں ——— صلح حدیبیہ حضورؐ کے ہمراہ ۱۸۰۰ صحابہ تھے۔

سنہ ۷ ھ ۶۰ سال کی عمر میں ——— فتح خیبر بادشاہوں کو دعوت نامے

سنہ ۸ ھ ۶۱ سال کی عمر میں ——— موتہ کا واقعہ، فتح مکہ اور حنین کا واقعہ

سنہ ۹ ھ ۶۲ سال کی عمر میں ——— واقعۂ تبوک مسلمانوں کا حج ادا کرنا۔ وفود کی آمد

سنہ ۱۰ ھ ۶۳ سال کی عمر میں ——— حج الوداع اور مشہور آخری خطبہ

سنہ ۱۱ ھ ۶۳ سال کی عمر میں ——— علالت و رحلت

نبی کریمؐ کی ازواجِ مطہرات

ازواجِ مطہرات کی تعداد میں مؤرخین میں بڑا اختلاف ہے مگر ۱۲ امہات المومنین میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے دو کا حضورؐ کے سامنے انتقال ہو گیا تھا یعنی حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنت خزیمہ اور ۱۰ حضورؐ کی وفات کے وقت موجود تھیں

تمام ازواج مطہرات :-

۱۔ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ ——— قریش کے قبیلہ بنو اسد سے تعلق رکھتی تھیں۔ وفات سنہ ۱۰ نبوی میں

۲۔ حضرت سودہ بنت زمعہؓ ——— قریش سے تھیں۔

۳- حضرت عائشہ صدیقہؓ ——— قریش کے قبیلہ بنو تیم سے تھیں ان کے والد حضرت ابوبکرؓ تھے۔
۴- حضرت حفصہ بنت عمرؓ ——— حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی تھیں۔ ۴۵ھ میں وفات پائی۔
۵- حضرت زینبؓ بنت خزیمہؓ ——— بنو بکر بن ہوازن سے تھیں۔ ام المساکین کے لقب سے مشہور ہوئیں۔
۶- حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہؓ ——— قریش کے مشہور قبیلے بنو مخزوم سے ان کا تعلق تھا۔
۷- حضرت جویریہ بنت حارثؓ ——— بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔
۸- حضرت زینب بنت جحشؓ ——— بنو اسد بن خزیمہ سے تھیں۔
۹- حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ ——— قریش کے مشہور قبیلہ بنو امیہ کے رئیس ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔
۱۰- حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطبؓ ——— ان کا تعلق یثرب کے یہودی قبیلہ بنی نضیر سے تھا۔
۱۱- حضرت میمونہ بنت حارثؓ ——— ان کا انتقال ۶۱ھ میں ہوا۔
۱۲- حضرت ماریہ قبطیہؓ ——— انھیں مقوقس شاہ مصر نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ کی صاحبزادیاں اور صاحبزادے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں اور تین صاحبزادے تھے :۔

سیدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی ان کی ماں حضرت خدیجہؓ نے اپنی خالہ کے لڑکے ابوالعاص بن ربیعؓ الاموی کے ساتھ کر دی۔ ان کا انتقال ۸ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔ ان کے بطن سے ایک فرزند اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

سیدہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ سیدہ زینب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی قبل از اسلام ابولہب کے لڑکے عتیبہ کے ساتھ ہوئی۔ ظہور اسلام کے بعد ابولہب نے اپنے بیٹے سے طلاق دلوا دی اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عثمان بن عفانؓ سے ہو گئی۔ ۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا۔

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سیدہ رقیہؓ سے چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتبہ کے ساتھ قبل از اسلام ہوئی تھی اور انھیں بھی ابولہب نے عتبہ سے طلاق دلوا دی تھی۔ سیدہ رقیہؓ کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شادی بھی حضرت عثمان غنیؓ کے ساتھ کر دی۔ اس لیے عثمان غنیؓ کو ذوالنورین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۹ھ میں بمقام مدینہ منورہ انتقال فرمایا۔

سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ان کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوا۔ انہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ ماہ بعد ۳ رمضان ۱۱ھ کو انتقال فرمایا۔ ان کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت امام حسنؓ، حضرت حسینؓ اور دو لڑکیاں حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ پیدا ہوئیں۔ حضرت ام کلثومؓ کی شادی فاروق اعظمؓ سے ہوئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین صاحبزادے تھے، جن کے نام ابراہیم، طاہر اور قاسم تھے۔ انہوں نے عالم طفولیت ہی میں انتقال فرمایا۔ طاہر اور قاسم حضرت خدیجہؓ کے بطن سے۔ اور ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے۔

آپؐ کا لباس

آپؐ سفید لباس بے حد پسند فرماتے۔ زیادہ تر روئی کا لباس پہنتے تھے، صوف اور کتان کا لباس بھی کبھی کبھی پہن لیتے تھے، جبّہ، قبا، قمیص، ازار، عمامہ، ٹوپی، چادر، حلہ، موزہ یہ سب آپؐ نے پہنے ہیں، سبز رنگ کی یمنی چادر آپؐ کو بہت پسند تھی۔ جو بُرد یمانی کے نام سے مشہور تھی۔ سُرخ لباس کو منع فرماتے تھے کبھی کبھی سیاہ عمامہ آپؐ نے باندھا ہے۔ ٹوپی بھی پہنا کرتے اور اسے عمامہ کے نیچے پہننے کی تاکید کرتے تھے۔

حضورؐ کا اسلحہ

تلواریں : آپؐ کے پاس ۹ تلواریں تھیں، جن کے نام یہ ہیں: ماثور، العضب قلعی، البتار، الحتف، الرسُوب، المخزم اور ذوالفقار۔

زرہیں : اُن کی تعداد سات تھی، ذات الفضول لوہے کی زرہ تھی، جسے آپؐ نے ایک یہودی کے پاس گروی رکھا تھا اور اس سے تین صاع غلہ اپنے عیال کے لیے قرض لیے تھے۔ اسکے علاوہ ذات الوشاح، السوریہ، ذاتِ الحواشی، فِضّہ، البترا، الخرنق تھیں۔

کمانیں : چھ تھیں، جن کے نام یہ ہیں: الزوراً، الروحاً، الصفراً، البیضاً، الکتوم اور شوخط۔

ڈھالیں: دو تھیں : الزُلوق، الفتق۔

عہد نبویؐ کی مساجد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد کی تعمیر پر بھی زور دیا تھا اور اس امر کی تاکید فرمائی کہ جو مسلم ہو، وہ اپنے مقام پر عبادت کے لیے ایک مسجد فوراً تیار کرے۔ آپؐ کے مبارک عہد میں بڑی بڑی آبادیوں میں کئی مساجد تھیں صرف مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے علاوہ ۹ مساجد تیار ہو چکی تھیں۔ جن میں علیٰحدہ علیٰحدہ پانچوں وقت نماز ہوتی تھی : مسجد بنو عمروؓ، مسجد بنو ساعدہ، مسجد بنو عبید، مسجد بنو زریق، مسجد بنو سلمہ، مسجد بنو غفار، مسجد بنو اسلم، مسجد بنو جہینہ، مسجد بنو بیاضہ۔

آنحضرت کے مؤذنین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار مؤذن تھے دو مدینہ طیبہ میں، بلال بن رباحؓ اور عمرو بن ام مکتوم قرشی العامریؓ نابینا۔ ایک قبا میں سعد القراظؓ اور ابو محذورہ اوس بن مغیرہ بن حجیؓ مکہ میں۔

آپؐ کی سواری کے جانور

گھوڑے : آپؐ کے سات گھوڑے تھے اور کسی صفت خاص کی وجہ سے ان کے مختلف نام تھے سکب، لُحیف، شحا، ظرب، لزاز، مرتجز اور الورد۔

خچر : پانچ خچر تھے، ایک دلدل نامی جو مقوقس شاہ مصر نے، دوسرا الفضہ نامی فروۃ الجذامی نے، تیسرا صاحب ایلہ نے، چوتھا دومۃ الجندل کے حکمران نے اور پانچواں نجاشی شاہ حبش نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

گدھے : تین تھے، ایک یعفور جو مقوقس شاہ مصر نے بھیجا تھا، دوسرا فروۃ الجذامی نے اور تیسرا حضرت سعد بن عبادہ الخزرجی رض نے ہدیۃً پیش کیا تھا۔

اونٹ : ان کی تعداد تین بتائی جاتی ہے جن میں سے ایک کا نام القصویٰ تھا، جس پر آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔

بکریاں : آپؐ کی ملک میں ایک سو بکریاں تھیں جو سو سے زیادہ ہوتیں تو ان کو ذبح کر دیتے اور پوری ایک سو رکھتے۔

سرورِ کونین صلعم کے قاصد

۱۔ حضرت عثمان بن عفان رض الاموی	قریش مکہ کی جانب	۲۔ حضرت عمرو بن اُمیہ الضمری رض	نجاشی شاہ حبش کے پاس بھیجے گئے۔
۳۔ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رض	ہرقل قیصر روم	۴۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رض	خسرو پرویز شاہ ایران
۵۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اللخمی رض	مقوقس شاہ مصر	۶۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدی رض	حارث ابی شمر شاہ غسان
۷۔ حضرت سلیط بن عمرو رض	ہوذہ بن علی اور ثمامہ بن اثال کی جانب	۸۔ حضرت عمرو بن العاص السہمی رض	جیفر بن الجلندی اور عبد بن الجلندی الازدی رئیسان عمان
۹۔ حضرت علاء بن الحضرمی رض	منذر بن ساوی حاکم بحرین	۱۰۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی رض	حارث بن کلال حمیری
۱۱۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رض	یمن	۱۲۔ حضرت معاذ بن جبل رض	یمن
۱۳۔ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رض	ذوالکلاع الحمیری	۱۴۔ حضرت عیاش بن ربیعہ المخزومی رض۔	حارث، مسروح اور نعیم بن عبدالکلال کی طرف
۱۵۔ حضرت حارث بن عمیر رض	بصریٰ کے حاکم		

مقرر کردہ محصلین

وہ صحابہ کرام رض جنھیں آنحضرت نے مختلف قبائل اور علاقوں کا انتظام سونپ دیا تھا، جو جزیہ، صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ وصول کرتے۔

۱۔ حضرت صفوان بن صفوان رض	بنو عمرو پر	۲۔ حضرت عدی بن حاتم رض	بنو طے و بنو اسد پر	۳۔ حضرت عمر فاروق رض	مدینہ منورہ پر
۴۔ حضرت ابوجہم بن حذیفہ رض	بنو لیث ″	۵۔ حضرت بریدہ بن حصیب السلمی رض	بنو غفار و اسلم ″	۶۔ حضرت عباد بن بشیر رض	بنو سلیم و مزینہ ″
۷۔ حضرت ضحاک بن سفیان رض	بنو کلاب ″	۸۔ حضرت رافع رض	بنو جہینہ ″	۹۔ حضرت قیس بن عاصم رض	بنو سعد ″
۱۰۔ عمرو بن العاص رض	بنو خزارہ ″	۱۱۔ حضرت بشر بن سفیان رض	بنو کعب ″	۱۲۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رض	نجران ″
۱۳۔ عبداللہ بن رواحہ رض	خیبر ″	۱۴۔ زیاد بن لبید رض	حضرموت ″	۱۵۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رض	یمن ″
۱۶۔ عمرو بن سعید بن العاص رض	تیماء ″	۱۷۔ ابان بن سعید رض	بحرین ″	۱۸۔ حضرت عبداللہ بن لیث رض	بنو ذبیان ″

مدینہ میں نائبین

وہ صحابہ کرامؓ جنھوں نے مدینہ میں آپؐ کی نیابت کی :

۱۔ حضرت سعد بن عبادہ الخزرجیؓ	غزوۂ ابواء کے موقع پر	۲۔ حضرت سعد بن معاذ الاوسیؓ	غزوۂ بواط کے موقع پر
۳۔ حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ	غزوۂ عشیرہ کے موقع پر	۴۔ حضرت زید بن حارثؓ	غزوۂ سفوان کے موقع پر
۵۔ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوۂ بدر کے موقع پر	۶۔ حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوۂ بنوسلیم کے موقع پر
۷۔ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوۂ بنو قینقاع کے موقع پر	۸ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوۂ سویق کے موقع پر
۹۔ حضرت عثمان بن عفانؓ	غزوۂ بنو غطفان کے موقع پر	۱۰۔ حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوۂ بحران کے موقع پر
۱۱۔ حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوۂ احد کے موقع پر	۱۲۔ حضرت عثمان بن عفانؓ	غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر
۱۳۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہؓ	غزوۂ بدر الصغریٰ کے موقع پر	۱۴۔ حضرت سباع بن عرفطہ الغفاریؓ	غزوۂ دومۃ الجندل کے موقع پر
۱۵۔ حضرت ابوذر غفاریؓ	غزوۂ بنو مصطلق ″	۱۶۔ حضرت نمیلہ بن عبداللہؓ	غزوۂ خیبر کے موقع پر
۱۷۔ حضرت ابورہم کلثوم بن حصین غفاریؓ	فتح مکہ کے وقت	۱۸۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ	غزوۂ تبوک کے موقع پر

عمال نبویؐ (گورنر)

حضرت باذان بن ساسانؓ	والیٔ یمن	حضرت ابوسفیان بن حربؓ	والیٔ نجران
حضرت شہر باذانؓ	والیٔ صنعا	حضرت یزید بن ابوسفیانؓ	والیٔ تیما
حضرت علاء بن الحضرمیؓ	والیٔ بحرین	حضرت عتاب بن اُسیدؓ	والیٔ مکہ
حضرت علی بن ابوطالبؓ	والیٔ اخماس یمن	حضرت معاذ بن جبلؓ	والیٔ جند
حضرت خالد بن سعیدؓ	والیٔ صنعا	حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	والیٔ مآرب
حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومیؓ	والیٔ کندہ	حضرت زیاد بن لبیدؓ	والیٔ حضرموت
حضرت عمرو بن العاصؓ	والیٔ عمان		

بیعت عقبہ اولیٰ کے چھ افراد

عقبہ کے مقام پر یثرب کے ان چھ افراد نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام لائے۔

۱۔ ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ۔ ۲۔ عوف بن حارثؓ۔ ۳۔ رافع بن مالکؓ۔ ۴۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہؓ۔ ۵۔ عقبہ بن عامر بن نابیؓ۔ ۶۔ جابر بن عبداللہؓ

رسولِ اکرمؐ کے مدنی نقیب

ہجرت سے پہلے مدینے کے جن بارہ اصحاب کو حضورؐ نے نقیب بنایا تھا، ان میں نو خزرج کے تھے اور تین اوس کے اور یہ سب قبائل، مدینہ کے رؤسا تھے:

۱۔ اسید بن حضیرؓ۔ ۲۔ ابوالہیثم بن التیہانؓ۔ ۳۔ سعد بن خیثمہؓ۔ ۴۔ سعد بن زرارہؓ۔ ۵۔ سعد بن الربیع۔ ۶۔ عبداللہ بن رواحہؓ۔ ۷۔ سعد بن عبادہؓ۔

۸۔ منذر بن عمرو رضؓ ۔ ۹۔ براء بن معرور رضؓ ۔ ۱۰۔ عبداللہ بن عمرو رضؓ ۔ ۱۱۔ عبادہ بن الصامت رضؓ ۔ ۱۲۔ رافع بن مالک رضؓ ۔

حضورؐ کے آزاد کردہ غلام

زید بن حارث، ابورافع اسلم، ثوبان، ابوکبشہ، شقران، رباح، یسا، مذعم، ذکوان، انجشہ، ابومویہبہ، آنسہ، ضیرہ بن ابی ضیرہ، عبیداللہ بن اسلم، عبید بن عبدالغفار، فضالۃ الیمانی، ابوعسیب احمر، اسامہ بن زید، افلح، ایمن بن ام ایمن، زید بن بولا، سابق، سالم، سلمان فارسی، مہران۔ ابوعبدالرحمن نافع، واقد، ابوالثیلہ، ابوالحمراء، ابوالسمح، ابوعبید، حنین، بذر، حاتم، باذام، ودس، رویفع، سعد، سعید، غیلان، کریب، محمد، نابیہ، کحول، نہیک، نفیع وردان، ابوصفیہ، ابوقیلہ، ابوالقیط، وغیرہ وغیرہ کل ۶۲ ۔ (ابن الجوزی = تلقیح ص۱)

حضورؐ کے کاتبانِ وحی

ابوبکر رضؓ، عمر رضؓ، عثمان رضؓ، علی رضؓ، اُبی بن کعب رضؓ، زید بن ثابت انصاری رضؓ، معاویہ رضؓ، حنظلہ بن الربیع الاسیدی رضؓ، ابان بن سعید رضؓ، خالد بن سعید بن العاص رضؓ، علاء بن حضرمی، رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔ (تلقیح ص۳۷)

حضورؐ کے محافظ

سعد بن ابی وقاص، سعد بن معاذ، عبّاد بن بشر، ابوایوب انصاری، ذکوان بن عبد قیس انصاری، محمد بن مسلمہ انصاری بلال رضی اللہ عنہم (تلقیح ص۳۸)

وہ لوگ جن کی شکل وصورت حضورؐ سے ملتی تھی

۱۔ جعفر بن ابی طالب رضؓ ۔ ۲۔ حسین بن علی رضؓ ۔ ۳۔ قثم بن عباس رضؓ ۔ ۴۔ ابوسفیان بن حارث رضؓ ۔ ۵۔ سائب بن عُبید رضؓ ۔
۶۔ مسلم بن مُعتب رضؓ ۔ ۷۔ کابس بن ربیعہ بن مالک السامی رضؓ ۔ (تلقیح ص۳۸)

حضورؐ کے خُدام

۱۔ انس رضؓ آپ کے گھر میں کام کرتا۔ ۲۔ ربیعہ بن کعب رضؓ وضو کراتا۔ ۳۔ ابن مسعود رضؓ جوتے پہناتا۔
۴۔ عقبہ بن عمرو رضؓ خچر کی دیکھ بھال کرتا ۵۔ بلال رضؓ ۶۔ سعد۔ ۷۔ عامر ۸۔ بکیر رضؓ ۹۔ اسود بن مالک رضؓ۔
۱۰۔ ایمن رضؓ ۱۱۔ ثعلبہ رضؓ ۱۲۔ سالم رضؓ ۱۳۔ سابق رضؓ ۱۴۔ ہلال بن حارث رضؓ اور ۲۵ دیگر مختلف کام کرتے تھے۔
(کل ۳۹ ۔ تلقیح ص۱)

عہدِ رسولؐ کے مفتی

خلفائے اربعہ رضؓ۔ عبدالرحمن بن عوف رضؓ، اُبی بن کعب رضؓ ۔ عبداللہ بن مسعود رضؓ ۔ مُعاذ بن جبل رضؓ ۔ عمار بن یاسر رضؓ ۔ حذیفہ رضؓ ۔ زید بن ثابت رضؓ ابوالدرداء رضؓ ۔ سلمان رضؓ ابوموسیٰ اشعری رضؓ ۔ (ایضاً ص۲۲۵)

ہجرت

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلعم ہجرت کے لئے مکّے سے بارہ ربیع الاوّل کو سوموار کی شام کو نکلے تھے اور اگلے سوموار کو قبل از دوپہر مدینہ میں وارد ہوئے تھے۔ پہلے قبا میں کلثوم بن الہدم کے ہاں ٹھہرے۔ اس کی جلد وفات ہو گئی اور آپ سعد بن خثیمہ کے ہاں منتقل ہو گئے۔ تین دن کے بعد مدینہ میں بنی سالم کے ہاں چلے گئے۔ وہاں اپنی زندگی کا پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ یہ مدنی زندگی کا بھی پہلا جمعہ تھا۔

بعد از جمعہ حضور صلعم ناقہ پہ سوار ہو گئے اور ناقہ چل پڑی۔ بنو نجار کے مساکن میں حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے جا بیٹھی۔ حضورؐ اتر کر ابو ایوبؓ کے گھر چلے گئے۔ مسجد نبوی اور حضورؐ کے حجرے تیار ہونے تک وہیں رہے۔

بعد از ہجرت پہلے سال حضورؐ نے انصار و مہاجرین کے درمیان سلسلۂ مواخات قائم کیا۔ دوسرے سال کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔۔ تبدیلِ قبلہ کا حکم ۱۵ رمضان کو نمازِ ظہر کے دوران دوسری رکعت میں آیا تھا۔ اسی سال حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ غزوۂ بدر ہوا۔ تیسرے سال حضرت حفصہؓ اور زینبؓ بنتِ خزیمہ حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت حسن بن علیؓ پیدا ہوئے۔ چوتھے سال حسینؓ بن علیؓ کی ولادت ہوئی۔ حضرت عائشہ کے ہار ٹوٹنے کا واقعہ پیش آیا۔ پانچویں سال دومۃ الجندل۔ خندق اور بنو قریظہ کے غزوات ہوئے۔ اسی سال زینبؓ بنتِ جحش حضورؐ کے نکاح میں آئی۔ چھٹے سال معاہدۂ حدیبیہ ہوا۔ ساتویں سال غزوۂ خیبر ہوا۔ اسی سال سلام بن مشکمؓ کی بیوی زینبؓ نے حضورؐ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلایا نیز امِ حبیبہ، میمونہ بنتِ حارث اور صفیہ بنتِ حیی حضورؐ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ اسی سال ابوہریرہؓ اسلام لائے اور شاہِ مقوقس سے تین تحائف دُلدُل۔ یعفور (گدھا) اور حضرت ماریہ قبطیہؓ موصول ہوئے۔

آٹھویں سال میں جنگِ موتہ ہوئی۔ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن عاصؓ اسلام لائے۔ مکہ فتح ہوا۔ غزوۂ حنین پیش آیا۔ ماریہ سے ابراہیم کی ولادت اور حضورؐ کی دختر زینبؓ کی وفات ہوئی۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کو اسلام لانے کی سعادت نصیب ہوئی۔

نویں برس میں غزوۂ تبوک ہوا۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیرِ حج بنا کر حج کے لئے بھیجا۔ حضورؐ کی بیٹی امِ کلثوم کی وفات ہو گئی۔ اس میں قبائل کے وفود اسلام و متابعت کا پیغام لے کر مدینہ پہنچے۔ اسی سال مسجدِ ضرار گرائی گئی۔

دسویں سال میں حضورؐ نے حجۃ الوداع کیا۔ مشہور خطبہ ارشاد فرمایا۔ بعد ازاں ۱۲ ربیع الاوّل کو پیر کے دن حضورؐ کو اللہ نے بلا لیا۔

سیرتِ نبویؐ کی توقیت

(CHRONOLOGY)

سیرتِ نبویؐ (توقیت کی روشنی میں)

مولوی اسحٰق النبی علوی

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یاد رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب و غریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی، جس کے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب و تعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے۔ عرفِ عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آناً فاناً مقبولیت نے ثابت کر دیا کہ یہ وقت کی آواز تھی، جو کہیں سے بھی اٹھتی ضرور سنی جاتی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرقِ وسطیٰ پر چھا گئی، جہاں سے اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ "جزیرہ نما" سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس تحریک کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی تھی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت خیز کام انجام دیئے، اور جو آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعثِ کشش اور جاذبِ توجہ ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدا، پیغمبر اسلام کی سیرۃ یا بالفاظِ دیگر آپ کے اُن احکام و افعال سے ہوتی ہے جو اس تحریک کو منظم کرنے، چلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کئے گئے تھے، اس اعتبار سے، اسلامی تاریخ کا یہ ابتدائی حصہ حد درجہ اہم ہے اور تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصلِ تحریک کو سمجھنے کے لیے اس حصے کا بغور مطالعہ کرے، کیونکہ بلا اِس کے اسلام کی اصل رُوح سمجھنا دشوار ہے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے عظیم پیغمبر کی تعلیمات اور حالاتِ زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جدّ و جہد کی، اور جو جو طریقے اختیار کئے، خود ان کی نظیر تاریخِ عالم میں ڈھونڈھے نہ ملے گی، یہ دعویٰ بڑی حد تک بجا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط اور تلاش و تنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابلِ داد ہے، اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح و تنقید کے کچھ اور اصول بھی رائج ہو چکے ہیں لیکن یہ پُرانے اصول اور طریقے ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبرِ اسلام کی سرگذشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی:

(۱) عہد ما قبلِ نبوت (۲) مکی عہد (۳) مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطہ سے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا

ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور ”پُرامن“ تھی شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپ کی نظریاتی تعلیم کا، کیونکہ یہ آپ کی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ تنظیمی اور سیاسی ترقیاں نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام، مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرہ اور مضبوط سیاسی طاقت میں نمایاں ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ انصرامی قابلیت اور پھر رہنمائی کا جوہر، کارخانۂ قدرت میں سب سے زیادہ نادر الوقوع عجوبہ ہے[1]۔

اس نظر سے دیکھئے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسولِ عربیؐ کی ذات میں قدرت نے ودیعت کئے تھے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظریات و تصورات پیش کر کے دنیا سے منوا لئے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی عظیم اور مائل بہ عروج ریاست اور ترقی پذیر سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل و تاسیس بھی کی جس نے اگلے آٹھ دس سال کے اندر ہی برّاعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیتوں کو نیست کر ڈالا[2]۔

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اٹھی ہوئی عارضی آندھی نہ تھی جو فوراً اتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں وادیٔ سندھ سے لے کر بحرِ ارل (ARAL) تک اور ارل سے لے کر اٹلانٹک ATLANTIC تک ایک ہی پرچم

---

[1] MY STRUGGLE. XI

[2] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:

"IN ANY CASE, WHATEVER VIEW WE MAY TAKE OF THE CLAIMS OF MOHAMMAD NO ONE CAN DENY THAT HE WAS A GREAT MAN".

"A MAN WHO PUT AN END IN LESS THAN 10 YEARS TO TWO FORMIDABLE KINGDOMS THE KINGDOM OF THE OLD ACHIMENIDES REPRESENTED BY THE CLASSIC SASSANIDES AND THAT OF ROMAN CAESARS OF EASTERN COUNTRIES BY MEANS OF SOME CAMEL DRIVERS OF ARABIA, MUST BE AT ANY RATE TAKEN INTO CONSIDERATION. A CONTROLLER OF CONSCIENCE AND SOUL TO SO MANY MILLIONS AND IN THE PLAIN LIGHT OF CIVILIZATION, IS INDEED GREATER THAN ALEXANDER AND BOUNAPARTE KNOWN ONLY TODAY IN HISTORICAL BOOKS..: A. MINGANA LEAVES P XXIV.

کو سربلند کر دیا، جو بڑی مدت تک اسی شان و شکوہ سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں، دنیا کے ایک بڑے حصے پر سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتدا ان چھوٹی چھوٹی مہموں اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں "غزوات و سرایا" کہا جاتا تھا اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخِ سیاست کا پہلا باب انہیں سے شروع ہوتا ہے۔

سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات و سرایا کے جو دلچسپ حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقامِ جنگ، اس کا مدینے یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیر جیش، یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکاء کی پوری تعداد مع اسمائے مشاہیر، بایں صراحت کہ مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفاء اور دوستوں کی نام بنام نشان دہی، موافق اور مخالف سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام، نیز یہ کہ کون کس شخص کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا؟ اور کس آلے سے؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفوں کی جنگی طاقت، اسیرانِ جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا مہینہ، تاریخ اور دن تک متعین کیا گیا ہے۔ اور کسی وجہ سے تاریخ و یوم کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات اُس وقت تک بیان نہیں کی جا سکتیں جب تک ان کو فوراً ہی قلم بند نہ کر لیا جائے بالخصوص تاریخ اور دن کا صحیح تعین بلا لکھے ممکن نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں تو اُن کے "رُواۃ" کے سامنے براہِ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں جس کا تعلق عہدِ رسالت، بلکہ عہدِ غزوات سے تھا۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں روایاتِ سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے اور اصولی طور پر ہماری نظریں کتبِ سیرۃ کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اُٹھتی ہیں کیونکہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے۔

اس سلسلے میں عمومی تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبطِ تحریر میں نہیں آسکی تھیں[1] چنانچہ اکثر علماء تاریخ کا خیال ہے کہ ابن اسحٰق (المتوفی ۱۵۰ھ) اسلام کے پہلے مؤرخ ہیں[2] جنھوں نے پیغمبرِ اسلام کی سیرت کو سب سے پہلے لکھا اور ان منتشر زبانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں مُتداول تھیں، گویا اسلام کی یہ ابتدائی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جبکہ ظہورِ اسلام کو تقریباً سوا سو، ڈیڑھ سو سال گزر چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا یہ ابتدائی حصہ محض چند شکوک اور مشتبہ روایات کا مجموعہ رہ جاتا ہے، جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت باقی رہتی ہے، نہ تاریخی اخادیت، یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گزر جانے کے بعد بھی واقعاتی تفصیلات جوں کی توں اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں، یا یہ کہ ان کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے جس کے خلاً

[1] سرسید، خطبات/۳۱۵ [2] (A HISTORY OF HISTORICAL WRITINGS VOL. IP 335)

کو ترک کرنے کے لیے ان میں رائج الوقت روایات، عقائد اور تصورات شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، ہیئت اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ واقعاتی تسلسل تک نظر نہیں آتا، جگہ جگہ روائتیں تشنہ رہ جاتی ہیں۔ درمیان سے ٹوٹ جاتی ہیں اور کسی جوڑنے والے کا پتہ نہیں چلتا، عباسی عہد کے عقائد اور مزعومات اتنی کم روائتوں میں محسوس ہوتے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ اس دور سے پہلے ضبطِ تحریر میں آچکا تھا۔

اس صورت میں اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ روائتیں، ابتدائی مدوّنینِ سیرۃ کو بعض قدیم تر ماخذوں سے مکتوبی صورت میں پہنچی تھیں جن کا تعلق عہدِ رسالت یا عہدِ صحابہ سے تھا[1]۔ تو اس خیال کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کئے جاسکتے ہیں بلکہ مثبت دلائل کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ عہدِ رسالت کے یہ ریکارڈ عبداللہ بن عباس۔ ابان بن عثمان۔ عروہ بن زبیر وغیرہ قرنِ اول کے مصنفین کو پہنچا یقینی تھے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ روایاتِ سیرت کا ایک قابلِ لحاظ حصہ پھر بھی سائنٹفک تنقید کا متحمل نہیں ہوتا اور نتیجے میں تمام روائتوں کو مشکوک بنا دیتا ہے، خاص طور پر توقیتی CHRONOLOGICAL حصہ پر نہ صرف واقعاتی ترتیب کا مدار ہے بلکہ رُواۃ اور مُدوّنینِ سیرت کے ذہنی رجحانات، مثلاً صداقت، یا وضّاعی، جانچنے کے لیے سب سے اہم کلید کا کام دے سکتا ہے۔ کیونکہ صرف اسی حصّے کی جانچ علوم ریاضیہ کی مدد سے بآسانی ممکن ہے، جس کے جوابات کبھی غیر یقینی نہیں ہوتے۔

سیرت کی کتابوں کو دیکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی قدیم تاریخ میں مؤرخین اسلام کا یہ ایک بے مثال کارنامہ تھا کیونکہ جس عہد میں اصولاً یہ توقیتی صراحتیں ریکارڈ ہو جانا چاہئیں، اس میں دنیا کا بڑا حصہ اس درجہ تاریخی شعور سے خالی نظر آتا ہے کہ ہر اہم واقعے کو مؤقت بتاریخ و یوم اور ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا ٹھیک ٹھیک زمانہ متعین کیا جائے جیسا کہ کتبِ سیرت کا عام دستور ہے۔

سیرت کی کتابوں میں یوں تو سینکڑوں واقعات کو موقت کیا گیا ہے اور یہ تاریخیں اگرچہ بلا کسی ادنیٰ شبہ کے اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ گویا سب کی سب دستاویزی تھیں مگر جب ان کی جانچ ریاضی کے اصولوں پر کی جاتی ہے تو حیرتناک نتائج نکلتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اسلام کی اس ابتدائی تاریخ میں سچائی کے عناصر کم اور تبلیغی تصور زیادہ ہے، کیونکہ تقریباً تمام اہم واقعات کی توقیتی صراحتوں میں بظاہر اس درجہ تضاد اور تناقض نظر آتے ہیں کہ ان روایات کو تاریخ کا مرتبہ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ نہ دن تاریخوں سے مطابقت کرتے ہیں نہ مہینے موسموں سے، اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ جملہ صراحتیں محض جعلی اور قدیم واعظینِ اسلام کی محض وقتی ذہانت کی پیداوار تھیں جن کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ان کی جانچ کسی طرح ممکن ہے۔

یہ تاریخی تضادات اتنے گوناگوں ہیں (کہ کتابتی سہو اور تصحیفی غلطیوں کو چھوڑ کر) مندرجہ ذیل پانچ قسموں پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

اوّلاً:۔ ایسی تاریخیں ملتی ہیں، جو روائتی ایام سے مطابقت نہیں کرتیں۔

---

[1] اس بحث کے لیے دیکھئے میرا مقالہ "تدوینِ سیرت پر ایک نظر"، جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے

ثانیاً :- ایسی تاریخیں موجود ہیں جو روایتی موسموں کا ساتھ نہیں دیتیں۔

ثالثاً :- ایسی تاریخیں نظر آتی ہیں جن کی تکذیب دوسرے علمی ذرائع سے ہو جاتی ہے۔

رابعاً :- ایک ہی واقعہ کے متعلق دو مختلف اور متضاد تاریخیں نظر آتی ہیں جن میں وجہ ترجیح مشکل ہے۔

خامساً :- واقعات کی ترتیب زمانی میں مورخوں کے اختلاف موجود ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ عجیب بات ہے کہ بہت سی تاریخیں ہر اعتبار سے صحیح اور قابل اعتماد بھی نظر آتی ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد اور تناسب کم ہے، تاہم اسی یقین دہانی کے لیے کافی ہیں کہ واقعاتِ سیرت کے جمع کرنے میں ابتدائی مُدوّنین کے سامنے کوئی بنیادی مراد ضرور موجود تھا ورنہ اصولاً یہ بھی غلط ثابت ہوتیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سیرت کے ابتدائی مصنفین یا وقائع نگاروں کا سلسلہ اگرچہ عہدِ صحابہ بلکہ ایک طرح خود عہدِ رسالت سے جا ملتا ہے، لیکن اس عہد کی کتابیں چونکہ آج موجود نہیں اسی لیے قدیم مُدوّنینِ سیرت میں صرف دوسری اور تیسری صدی کے مصنفین رہ جاتے ہیں جن کی تصنیفات پر اگر امتحانی نظر ڈالی جائے تو تقریباً دو تہائی واقعات مشتبہ ہو جاتے ہیں، ایک تہائی تاریخیں جو صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ وہ نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے واقعات سے تعلق ظاہر کرکے اس معمہ کو اور پیچیدہ کر دیتی ہیں کہ اہم واقعات کے ریکارڈ کہاں گئے؟ اور موجودہ ریکارڈ کہاں سے آگئے؟

واقعہ کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ تمام اصناف کے توقیتی تضادات کا قسم وار جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ صحیح اور غلط توقیتی صراحتوں کا تناسب کیا ہے؟

ذیل میں قسم اول یعنی تاریخ و ایام کی عدم مطابقتیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ابن اسحٰق نے ہجرت کے ذیل میں ایک طویل اور دلچسپ قصہ سنانے کے بعد آنحضرتؐ کی "قبا" میں آمد کی تاریخ دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول سلہ بیان کی ہے۔[۱] یہ تاریخ مجمع علیہ ہے اور صدرِ اول کے تمام مورخوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے مستشرقین بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ کر سکے۔[۲] مگر اس تاریخ کو جب ریاضی کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ سیرت کی کتابوں میں اتنے اہم واقعہ کی تاریخ بھی صحیح محفوظ نہیں، چنانچہ تقویمی حساب سے ۱۲ ربیع الاول سلہ کو بجائے دو شنبہ کے جمعہ کا دن پڑتا ہے۔

اس غلطی کو سب سے پہلے شاید البیرونی نے پکڑا، اور حسابی قاعدوں سے ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے اور تاریخ ہجرت حقیقتاً ۱۲ ربیع الاول نہیں، بلکہ ۸ ربیع الاول تھی۔[۳] کیونکہ دو شنبہ آٹھ ربیع الاول کو پڑتا ہے چونکہ یہ مسئلہ خالص حسابی تھا اس لیے عہدِ حاضرہ کے کئی بڑے بڑے مستشرقین[۴] حتیٰ کہ بعض علمائے اسلام نے بھی ہتھیار ڈال دیئے[۵] اور معّار روایت کی تغلیط کر دی، مگر شاید یہ نہ سوچا کہ

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

---

[۱] ابن ہشام ۲/۱۳۰-۱۰۰، نیز دیکھیے واقدی ۲/۲، ابن سعد ۲/۲، مسعودی التنبیہ والاشراف ۲۳۳، البدء والتاریخ ۴/۲۷۷

[۲] MUIR - LIFE [۳] MONTGOMRY آثار الباقیہ، سخاؤ، ۲۲۷

[۴] MARGOLIOUTH RISE P XX 212 [۵] مولانا شبلی، سیرۃ، ۲۷۰

چنانچہ دوسری مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

۲ - سنہ ۲ھ میں پیغمبرِ اسلام نے قریش کی تجارتی ناکہ بندی کرنا چاہی تو اس سلسلے میں کئی اقدامات کیے گئے اور مختلف اوقات میں چھوٹی بڑی مہمیں روانہ ہوتی رہیں، "غزوۂ ینبع" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مہم ۲ شعبان سنہ ۲ھ کو پنجشنبہ کے دن روانہ ہوئی تھی[1] حساب کے موجب ۲ شعبان کو پنجشنبہ ممکن نہیں بلکہ یکشنبہ تھا۔

۳ - اسی سنہ ۲ھ میں آنحضرتؐ نے حجاز کے ساحلی علاقے کے متعدد قبائل سے سیاسی اور تجارتی اغراض کے تحت کئی معاہدے کئے تھے، بنو اسلم اور غفار سے جو معاہدے ہوئے تھے ان کے لیے ایک روایت کے موجب سہ شنبہ ۱۴ شعبان سنہ ۲ھ کو پیغمبرِ اسلام تشریف لے گئے تھے۔[2] اصولِ تقویم کے حساب سے یہ تاریخ بھی صحیح نہیں اور ۱۴ شعبان سنہ ۲ھ کو جمعہ پڑتا ہے۔

۴ - یہ واقعات اگرچہ کم مشہور اور چھوٹے چھوٹے ہیں، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن حبیب سیرت کے معاملے میں کوئی سند نہیں، مگر بدر کی عظمت سے کسے انکار ہوگا؟ اسلام کی پوری تاریخِ محاربات میں، اس سے اہم واقعہ شاید کوئی دوسرا نہیں، علمائے سیرت نے بھی اس کی تفصیلات محفوظ رکھنے کی جس درجہ کوششیں کی ہیں، وہ کسی دوسرے واقعہ کو نصیب نہ ہو سکیں، اس لیے یہ امید بالکل بجا تھی کہ کتب سیرۃ میں کم سے کم اس واقعہ کی صحیح تاریخ ضرور محفوظ ملے گی، چنانچہ نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی بلکہ دوسرے علمائے سیر بھی متفق ہیں کہ یہ معرکہ ۱۷ رمضان سنہ ۲ھ کو جمعہ کے دن پیش آیا تھا[3]

مُستدرک حاکم میں عامر بن ربیعہ بدری سے جو روایت منقول ہے، اس سے اگرچہ ایک ہلکے سے اختلاف کا پتہ چلتا ہے جو قمری مہینوں میں نیا نہیں، یعنی یہ معرکۂ بدر بجائے ۱۷ کے ۱۶ رمضان کا واقعہ ہے[4] تاہم جمعہ کے دن، اور ۱۶ یا ۱۷ رمضان پر سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ سب سے قدیم سیرت نگار عروہ بن زُبیر نے بھی جمعہ کا دن اور ۱۶ یا ۱۷، دو تاریخیں بیان کی ہیں[5] مگر جب اس تاریخ کا مقابلہ تقویمی جدولوں سے کیا جاتا ہے تو از روئے حساب ۱۶ رمضان ۲ ہجری کو بجائے جمعے کے دوشنبہ اور ۱۷ کو سہ شنبہ پڑتا ہے۔

اسی سنہ کے ایک اور بڑے واقعہ کی تاریخ کا امتحان کیجیے۔

۵ - غزوہ بنو قینقاع معرکۂ بدر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کا واقعہ ہے، اور جس طرح معرکۂ بدر مشرکین قریش کے مقابلے میں پہلا کامیاب محاربہ تھا، ٹھیک اسی طرح یہ غزوہ یہودیوں کے خلاف پہلی کامیاب آویزش تھی۔

سیرت نگار پورے وثوق سے اس مہم کی تاریخ شنبہ ۱۵ شوال[6] بیان کرتے ہیں۔ مگر اس کے مقابلے میں ہجری تقویم ۱۵ شوال سنہ ۲ھ کو سہ شنبہ بتاتی ہے۔

اسی طرح غزوۂ سُویق کی تاریخ ملاحظہ ہو۔

---

[1] ابن حبیب/۱۱۱ [2] ایضاً [3] ابن سعد ۲/۱۳، واقدی ۳/، ابن ہشام ۱/۲۵۶، طبری ۲/۲۸۰ [4] مستدرک ۳/۳۵۸
[5] الدر المنثور ۳/۱۸۸ [6] واقدی/۱۷۷ - ابن سعد ۲/ نیز دیکھیے زرقانی ۱/۵۵۰

٦ - بیان کیا جاتا ہے کہ معرکۂ بدر میں شکست کے بعد قریش کو جو شدید نقصانات پہنچے تھے، اُن کا انتقام لینے رئیسِ مکہ ابوسفیان نے ذوالحجہ ۲ھ میں عین مدینہ پہنچ کر شب خون مارنا چاہا۔ چنانچہ قریش کا لشکر حوالیٔ مدینہ میں داخل ہوگیا، اس واقعہ کی تاریخ یکشنبہ ۵ ذوالحجہ[1] مذکور ہے۔ مگر تقویمی شہادت یہ ہے کہ ۵ ذوالحجہ ۲ھ کو بجائے یکشنبہ کے سہ شنبہ تھا۔

تاریخ و ایام کی یہ نامطابقتیں صرف ۱ھ و ۲ھ تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ آخر تک یوں ہی چلا گیا ہے اور خاص طور پر اہم واقعات کی تاریخیں روایتی ایام سے مطابقت نہیں کرتیں۔ چنانچہ ۳ھ کا سب سے اہم واقعہ ملاحظہ ہو۔

٧ - معرکۂ اُحد سے زیادہ ناقابلِ فراموش مہم شاید کوئی دوسری نہیں، کیونکہ اس میں ایک طرف مسلمانوں کا کثیر اتلافِ جان ہوا تھا تو دوسری طرف خود پیغمبر اسلام بھی شدید زخمی ہوئے تھے، اس غزوہ کی مستند ترین اور مجتمع علیہ تاریخ ۱۱ شوال ۳ھ بیان کی جاتی ہے اور ہفتے کے دن پر سب کا اتفاق ہے۔

تقویمی حسابات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھی غلط ہے اور ۱۱ شوال کو ہفتہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا۔[2]

٨ - اُحد کے بعد ۴ھ کا سب سے مشہور واقعہ غزوۂ بنو نضیر ہے، جس کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۴ھ متعین ہے[3]۔ مگر تقویمی حسابات سے یہ تاریخ بھی مطابقت نہیں کرتی۔ کیونکہ از روئے حساب ۱۲ ربیع الاول ۴ھ کو سہ شنبہ کی جگہ پنجشنبہ آتا ہے۔

٩ - اسی ۴ھ کی ایک دوسری مہم غزوہ بدر موعد کے نام سے مشہور ہے، جس کی تاریخ پنجشنبہ مستہل شعبان بیان کی گئی ہے[4]۔ یہ تاریخ بھی حسابی رُو سے غلط ہے اور مستہل شعبان کو یکشنبہ یا دوشنبہ کا دن آنا چاہیے۔

١٠ - ۶ھ کا سب سے اہم واقعہ جو اسلامی تاریخ پر حد درجہ مؤثر ہوا، خسرو پرویز (شاہِ ایران) کا قتل ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ بیان کی گئی ہے[5]۔ (اس میں شاید ۷ھ سہو کتابت ہے) تاہم یہ تاریخ نہ ۶ھ میں درست بیٹھتی ہے نہ ۷ھ میں؛ کیونکہ حسابی قاعدہ سے ۱۰ جمادی الاولیٰ ۶ھ کو سہ شنبہ نہیں پڑتا بلکہ یکشنبہ آتا ہے اور ۷ ہجری میں پنجشنبہ۔

سب سے آخر میں مجھے دو واقعات کی تاریخیں اور پیش کرنا ہیں جن کا تعلق ۸ھ سے ہے یعنی فتحِ مکہ اور غزوۂ حُنین کی، جو اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

١١ - بیان کیا جاتا ہے کہ فتحِ مکہ کے سلسلے میں مسلمان فوجیں چہار شنبہ ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو نکلی تھیں[6]۔ اور یوم فتح جمعہ ۲۰ رمضان ۸ھ متعین ہے[7]۔ مگر حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ ۱۰ کو چہار شنبہ ممکن ہے نہ ۲۰ کو جمعہ بلکہ ۱۰ رمضان ۸ھ کو دوشنبہ آتا ہے۔

---

[1] واقدی ۳/ ۱۸۲، ابن سعد ۲/ ۲، مواہب ۱/ ۱۱۵، عیون الاثر ۲/ ۳۹۶، دیار بکری ۱/ ۴۱۰، زرقانی ۱/ ۵۵۲۔ [2] البدایہ والنہایہ ۴/ ۹، مواہب ۱/ ۱۱۶، عیون الاثر ۲/ ۱، دیار بکری ۱/ ۴۱۹۔ [3] ابن حبیب/ ۱۱۳۔ [4] ایضاً۔ [5] طبری ۲/ ۹۱، نیز دیکھئے ابن خلدون ۲/ ۳۸۔ [6] ابن سعد ۲/ ۹۷، نیز دیکھئے ابن ہشام ۴/ ۴۳، طبری ۳/ ۱۱۴، البدایہ ۴/ ۲۸۵۔ [7] ابن سعد ۲/ ۹۹، دیار بکری ۲/ ۸۷۔

اسی طرح غزوۂ حنین کی تاریخ بھی تقویمی حسابات پر پوری نہیں اترتی، کیونکہ از روئے روایت ۶ر شوال ۸ھ کو ہفتہ کے دن مسلمان فوجیں[1] مکے سے روانہ ہوئی تھیں، مگر حسابی قاعدے سے ۶ر شوال ۸ھ کو ہفتہ ممکن نہیں بلکہ پنجشنبہ کا دن تھا۔

سطور بالا میں جو روایتی تاریخیں پیش کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ جملہ صراحتیں قطعی جعلی ہیں اور صرف اس لیے وضع کی گئی ہیں کہ ان کے ذریعہ واقعات سیرت کو وزن دار کیا جائے اور ان زبان زد کہانیوں کو تاریخی مرتبہ دے دیا جائے جو دوسری صدی میں مروج تھیں یا جیسا کہ بعض مستشرقین کا خیال ہے، ہمارے متداولہ حسابات میں کہیں ایسا جھول ہے جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں، مگر اس تصور کے امکانات یوں کم ہو جاتے ہیں کہ انھیں حسابات سے بعض تاریخیں بالکل صحیح بھی ثابت ہوتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ غلطیاں مروجہ حسابی طریقے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ اگر یہ حسابات غلط ہوتے تو مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخیں بھی غلط ہو جاتیں، حالانکہ یہ تاریخیں بالکل صحیح ہیں، ملاحظہ ہوں۔

درست تاریخیں

(۱) ۲ھ کے ابتدائی واقعات میں ایک غزوہ طلب کرز بن جابر فہری کے نام سے مشہور ہے۔ ابن حبیب نے اس کی تاریخ دوشنبہ ۱۲ر جمادی الاخریٰ بیان کی ہے[2]۔ ہجری تقویم کے بموجب یکم جمادی الاخریٰ کو چہارشنبہ تھا، اس اعتبار سے ۱۲ر جمادی الاخریٰ کو یک شنبہ آتا ہے مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں، قمری مہینوں میں اس یک روزہ فرق کی کوئی اہمیت نہیں اور ابن حبیب کی صراحت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(۲) سیرت کی کتابوں میں ایک چھوٹا سا واقعہ سریّۂ عبداللہ ابن اُنیس کہلاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے محرم ۴ھ میں عبداللہ کو بنو ہذیل کے سردار سفیان بن خالد کو قتل کرنے کے لیے متعین کیا تھا۔ اس واقعہ کی تاریخ خود عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ "میں مدینے سے دوشنبہ کے دن ۵ر محرم کو نکلا۔"[3] حسابی رُو سے یہ تاریخ بالکل صحیح ہے اور ۵ر محرم کو دوشنبہ ہی کا دن پڑتا ہے۔

(۳) ۵ھ کے مشہور غزوۂ خندق کی تاریخی صراحت کا ابتدائی حصہ بھی تقریباً صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ابن حبیب کا بیان ہے کہ پیغمبرِ اسلام اس غزوہ کے لیے پنجشنبہ ۸ر شوال کو نکلے تھے[5]۔ ہجری تقویم کے بموجب یکم شوال ۵ھ کو دوشنبہ تھا، اس حساب سے پنجشنبہ کی ۱۰ر کے بجائے ۱۱ر شوال ہوتی ہے، گویا صرف ایک دن کا فرق پڑتا ہے، جو قابلِ التفات نہیں۔

(۴) اسی طرح عمرۂ حدیبیہ کی تاریخ بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ابن سعد نے صراحت کی ہے کہ آنحضرتؐ حدیبیہ کے لیے دوشنبہ کے دن یکم ذیقعدہ کو عازمِ مکہ ہوئے تھے[5]۔ ہجری تقویم کے مطابق یکم ذیقعدہ ۶ھ کو (۲۹ر کا چاند مان کر) اگرچہ یک شنبہ پڑتا ہے، لیکن ایک دن کا یہ فرق ایسا نہیں کہ تاریخ کو غلط قرار دیا جا سکے اور اگر ۳۰ کا چاند مان لیا جائے تو پھر دوشنبہ ہی کی پہلی ہوگی۔

(۵) ۵ ہجری کا سب سے مشہور واقعہ عُمرۃ القضا ہے۔ ابن حبیب نے اس کی تاریخ بھی دوشنبہ ۶ر ذیقعدہ بیان کی ہے[6]۔ حسابی رُو سے ذیقعدہ ۷ھ کی پہلی تاریخ کو (۲۹ر کا چاند مان کر) پنجشنبہ تھا، اس لیے دوشنبہ کا دن بجائے ۶ر کے ۵ر کو پڑتا ہے، لیکن "۳۰ر

---

[1] ابن سعد ۲/ ۱۰۸۔ [2] ابن حبیب / ۱۱۱ [3] واقدی / ۳۳۱، نیز دیکھئے ابن سعد ۲/ ۳۱، دیار بکری ۱/ ۴۵۰ [4] ابن حبیب / ۱۱۳ [5] ابن سعد ۲/ ۶۹، قسطلانی ۱/ ۱۶۳

[6] ابن حبیب / ۱۱۵۔

کا چاند مان لیا جائے تو یہ تفاوت بھی نہیں رہتا۔

(۶) سب سے آخر میں پیغمبرِ اسلام کی رحلت کا ریکارڈ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، ابن سعد نے اس کی تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بیان کی ہے[1] یہ تاریخ اس اعتبار سے متفق علیہ ہے کہ کلینی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے[2]۔ تقویمی قاعدے سے (۲۹ کا چاند مان کر) یکم ربیع الاول چہار شنبہ کو تھی، لیکن اگر ۳۰ کا چاند مان لیا جائے تو ۱۲ ربیع الاول کو ٹھیک دوشنبہ پڑتا ہے۔

متذکرہ بالا سرسری تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ منجملہ (۱۸) توقیتی صراحتوں کے کم از کم چھ [۶] صحیح اور بارہ غلط ہیں، گویا ⅓ حصہ صحیح اور ⅔ غلط پھر جو صحیح بھی ہیں، اُن میں سوائے پیغمبرِ اسلام کی رحلت اور غزوۂ خندق کے اور کوئی واقعہ ایسا اہم نہیں جو بدر و اُحد یا فتح مکہ اور حُنین کا مقابلہ کر سکے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مصنفین اس قسم کی توقیتی صراحتوں کے شجرِ ممنوعہ تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، اور ان کی کتابوں میں وہ ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں، تاہم حیرت ہے کہ مہینوں اور سالوں کو ابھی تک ترک نہیں کیا گیا۔ حالانکہ موسمی شواہد ان کے خلاف بھی صف آرا ہیں۔ میں یہاں اُن کے کچھ نمونے اور مثالیں پیش کرتا ہوں:-

مہینوں اور موسموں میں اختلاف

(۱) سب سے پہلے غزوۂ بدر کو لیجیے مختلف تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق خاص موسمِ گرما سے تھا۔ جب کہ موسم پورے شباب پر آچکا تھا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے دن شدید گرمی تھی، اور تمازتِ آفتاب کا یہ عالم تھا کہ مقتولینِ بدر کی لاشیں اُسی دن (شام سے پہلے) سڑ گئی تھیں[3]۔ خود قرآن سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ موسم کافی سخت تھا، اور مسلمان بارش کی دعائیں مانگنے پر مجبور رہتے۔ (اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ)[4] جن کو شرفِ قبولیت بخشا گیا، قرآن میں اس غیر متوقع بارش کا ذکر اس تفصیل اور انداز سے کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرمائی بارش نہ تھی، بلکہ موسمِ گرما کی شدت دُور کرنے کے لیے ایک کرشمۂ قدرت تھا، مگر حسابی قاعدے سے رمضان ۲ھ فروری اور مارچ ۶۲۳ء سے مطابق ہوتا ہے جب کہ حجاز میں گرمی نہیں ہوتی۔

(۲) ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیے جو عین بدر کے بعد کا ہے، اور جس سے خود غزوۂ بدر کے صحیح موسم کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اہلِ سِیر کہتے ہیں کہ شوال ۲ھ میں (بدر سے واپسی کے بعد) ایک شاتمِ رسولؐ یہودی کو جس کا نام ابوعفک تھا کسی مسلمان نے قتل کر دیا، روایت میں صراحت ہے کہ یہ زمانہ موسمِ گرما کا تھا اور یہودی گرمی کی شدت کی وجہ سے کھلے آسمان کے نیچے صحن میں سو رہا تھا[5]۔ یہ واقعہ خاص مدینے کا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اس واقعہ کا بلکہ معرکۂ بدر کا تعلق بھی موسمِ گرما سے تھا، کیونکہ ایک وسطِ رمضان کا واقعہ ہے تو دوسرا اوائلِ شوال کا، تاہم ان دونوں واقعات کی توقیت بظاہر غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس طرح حجاز میں فروری اور مارچ کے مہینے موسمِ گرما میں شامل نہیں اسی طرح مدینہ میں اپریل کا موسم اتنا گرم نہیں ہوتا کہ لوگ کھلے آسمان کے نیچے سو سکیں، حسابی رُو سے شوال ۲ھ مارچ اپریل ۶۲۳ء سے مطابق ہوتا ہے۔

---

۱ ابن سعد ۱/ ۳۷ ۲ کلینی الباب التاریخ ۳ مسلم ۹/ ۹۲ مصر ابن سعد ۲/ ۱۵ ۴ قرآن ۸/ ۱۱
۵ واقدی ۱/ ۱۷۵، ابن سعد ۲/ ۱۹۔

(۳) اسی طرح غزوۂ اُحد کا مہینہ شوال ۳ھ بیان کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں صراحت موجود ہے۔ اس لڑائی کے دنوں میں تازہ اور نوَرس کھجوریں (رطب) بہ افراط موجود تھیں[۱] مدینہ میں تازہ کھجوروں کا موسم ویسے تو وسطِ جولائی سے پہلے شروع نہیں ہوتا، لیکن بعض قسمیں مثلاً حُلیہ وغیرہ جلد آجاتی ہیں، اور آخر جون میں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس غزوہ کا موسم کم سے کم آخر جون ہونا چاہیے۔

مگر ہجری تقویم کے بموجب شوال ۳ھ، مارچ اپریل ۶۲۴ء سے مطابق ہوتا ہے جب کہ مدینے میں کھجوروں کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا، اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو اس لڑائی کا صحیح مہینہ رواۃ کے ذہن سے اُتر گیا، یا پھر مندکرہ بالا تفصیلات صحیح نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اُحد کی ان تفصیلات سے بدر کے موسم کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ غزوۂ اُحد بدر سے ٹھیک ایک سال بعد کا واقعہ ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر معرکۂ اُحد کے زمانے میں تازہ کھجوریں موجود تھیں تو بدر کا موسم بھی اس کے لگ بھگ ہو گا۔

اس قسم کی توقیتی نامطابقتیں ایک دو واقعات تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ کافی طویل ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو :

(۴) مورخین کہتے ہیں کہ غزوہ موتہ کے بعد جمادی الآخری ۸ھ میں پیغمبرِ اسلام نے شامی سرحد کے عرب قبائل کو ہموار کرنے کے لیے عمرو بن عاص کو روانہ کیا تھا[۲] سیرت نگاروں کی اصطلاح میں اس مہم کو "سریۂ ذاتِ سلاسل" کہتے ہیں، روایتی صراحتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سریہ موسم سرما میں روانہ ہوا تھا۔ مُستدرک حاکم میں ایک روایت خود عمرو بن عاص سے مروی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں اس بلا کی سردی تھی کہ وہ ایک بار صبح کو غسل تک نہ کر سکے، اور نماز تیمّم سے پڑھنا پڑی تھی[۳]

مگر ہجری تقویم کے مطابق یہ جمادی الآخری ستمبر، اکتوبر ۶۲۹ء کا متوازی مہینہ ثابت ہوتا ہے۔ جو عرب میں عین بہار کا زمانہ ہے، یاد رہے کہ مورخین کے قول کے بموجب اس واقعہ سے صرف ایک ماہ پہلے غزوۂ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) کا موسم کافی گرم تھا۔ (وَذٰلِكَ فِیْ حَرٍّ شَدِیْدٍ[۴]) جس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مندکرہ بالا موسمی تصریحات غلط ہیں یا پھر اس سَریّہ کا صحیح مہینہ محفوظ نہیں رہا۔

(۵) اس سلسلے میں مجھے چند مثالیں اور پیش کرنا ہیں، جن میں پہلے فتحِ مکہ کی مثال پر غور فرمایئے۔

اس غزوہ کے متعلق مورخینِ اسلام کا عام بیان یہ ہے کہ "یہ رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، نیز یہ کہ مسلمان فوجیں جب مدینہ سے نکلی تھیں تو صائم تھیں، خود پیغمبرِ اسلامؐ کا بھی روزہ تھا، اور سب مسلمان بھی روزہ دار تھے۔ گرمی کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اس غزوہ میں آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھے، کہتے ہیں "میں نے رسول اللہؐ کو عرج میں دیکھا کہ آپؐ گرمی کی وجہ سے سر پر پانی بہا رہے تھے،

۱؎ MUIR LIFE P. 267 واقدی ۳۲۱/۱ ۲؎ طبری ۱۰۴/۳، ابن ہشام ۲۷۲/۴ ۳؎ مستدرک ۱۷۷/۱ نیز دیکھئے البدایہ والنہایہ ۲۷۴/۴ ۴؎ طبری ۱۱۰/۳ -

کیونکہ آپ روزہ دار تھے[۱]، مگر اس کو کیا کیجئے کہ حسابی رُو سے رمضان ۸ھ کا متبادل مہینہ دسمبر اور جنوری ثابت ہوتا ہے اور ہم انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ خاص موسم سرما میں آنحضرتؐ کو سر پر پانی بہانے کی نوبت کس طرح آئی ؟

(۶) اس بات کا اندازہ کہ فتح مکہ کے زمانہ میں موسم گرما پورے شباب پر تھا، غزوۂ حنین کی تفصیلات سے بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں غزوے تقریباً ایک ہی پندرھواڑے کے ہیں۔

ایک مجاہد کا بیان ہے کہ "ہم رسول اللہؐ کے ہمراہ غزوۂ حنین میں شریک تھے، تو ایک سخت اور شدید گرم دن میں (فی یوم قائظ شدید الحر) روانہ ہوئے اور ایک درخت کے سایہ میں قیام کیا۔ جب سورج ڈھل گیا تو میں نے اپنی زرہ پہنی اور گھوڑے پر سوار ہوا[۲]"

یہ واقعہ ۱۰ شوال ۸ھ کا ہے جو اندوئے حساب ۲۷ جنوری ۶۳۰ء کو پیش آنا چاہیئے اس لیے ظاہر ہے کہ یا تو یہ موسمی تفصیلات غلط ہیں یا ان دونوں غزووں کی مبیّنہ تاریخوں کو غلط قرار دینا پڑے گا۔

اب میں صرف دو مثالیں اور پیش کر کے قارئین سے التجا کروں گا کہ وہ ان متضاد روایات کی روشنی میں واقعاتِ سیرت کی توقیتی اُلجھنیں ملاحظہ کریں، ان میں سے پہلی مثال سَریّہ علقمہ بن مُجزز کی ہے اور دوسری غزوۂ تبوک کی جو پیغمبرِ اسلام کا آخری غزوہ ہے

(۷) کہتے ہیں کہ فتح مکہ سے تقریباً ۶ ماہ بعد ربیع الآخر ۹ھ میں آنحضرتؐ نے ایک فوجی دستہ علقمہ بن مُجزز کی سرکردگی میں جدّہ روانہ کیا تھا۔ اس دستے کی واپسی کے متعلق یہ تفصیل ملتی ہے کہ سپاہی الاؤ لگا لیتے، جن پر کھانا بھی پکتا اور وہ تاپتے بھی[۳] (یصطلون علیھا ویصطنعون) اس صراحت سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس سَریّہ کا موسم فی الجملہ سرد تھا اور سپاہی آگ تاپنے پر مجبور تھے، بیان کیا جا چکا ہے کہ از روئے روایات، فتح مکہ اور غزوہ حنین کا موسم انتہائی گرم تھا اس لیے ربیع الآخر ۹ھ میں (ان واقعات سے چھ مہینے بعد) قدرتی طور پر سردی کا زمانہ ہونا چاہیئے جس سے یہ الاؤ لگانے کا قصّہ صحیح معلوم ہوتا ہے مگر ہجری حساب سے، ربیع الآخر ۹ھ ۱۸ جولائی ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے یعنی شدید موسمِ گرما سے، اس لیے یا تو ربیع الآخر کی صراحت غلط قرار دینا پڑے گی یا الاؤ، پر تاپنے کی کہانی ؟

(۸) اسی طرح غزوۂ تبوک کا موسم بھی روائتی مہینے سے مطابقت نہیں کرتا جو رجب ۹ ہجری کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ نے مسلمانوں کو اس غزوہ پر چلنے کی ترغیب دی تو منافقین نے بہکانا شروع کیا اور کہا اتنی شدید گرمی میں نہ نکلو (لا تنفروا فی الحرّ[۴]) اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جہنم کی آگ سب سے زیادہ گرم ہے (قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا[۴])

مگر ان موسمی صراحتوں کا مقابلہ جب ہجری تقویم سے کیجئے تو رجب ۹ھ اکتوبر، نومبر ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے اور رمضان شوال کے مہینے جن میں مسلمان فوج تبوک سے واپس آئی تھی۔ دسمبر، جنوری اور فروری سے مطابقت کرتے ہیں۔

ان موسمی نامطابقتوں کو دیکھتے ہوئے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ روایات سیرت اور خاص طور پر ان کی توقیتی صراحتوں کی بظاہر کیا

---

[۱] مستدرک ۱/۴۳۲ نیز دیکھئے موطا: ماجاء فی الصیام فی السفر۔ [۲] ابن سعد ۲/۱۱۲ [۳] ابن سعد ۲/۱۱۸
[۴] ایضاً ۹۔

وقعت رہ جاتی ہے ؟ اور ہم کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ یہ روایات ہم تک معتبر ذرائع سے پہنچی ہیں ؛ تاہم بعض خوش عقیدہ مستشرقین کی رائے میں اس قسم کے موسمی تفاوت صرف اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت جو عربی کلینڈر رائج تھا ، وہ موجودہ ہجری کلینڈر سے بہت کچھ مختلف تھا ، مگر اس خیال کو قبول کرنے میں بھی چند در چند دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں ، کیونکہ کتب سیرت میں متعدد واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن کی موسمی تفصیلات موجودہ کلینڈر سے پوری طرح مطابقت کرتی ہیں اور یہ کسی عنوان نہیں کہا جا سکتا کہ واقعات کی توقیت کے سلسلے میں مروجہ کلینڈر بیکار ہے ، یہاں ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

موسمی مطابقت کی مثالیں

(۱) ۳ھ کا ایک مشہور واقعہ کعب بن اشرف کے قتل کی رُوداد ہے ، کہتے ہیں کہ ربیع الاوّل کے مہینے کی ۱۴ تاریخ تھی اور چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے فضا کو منوّر کئے ہوئے تھا۔ کعب کے قاتل جب اُس کے دروازے پر پہنچے تو وہ اندر تھا ، اُن کی آواز سے باہر نکلا اور گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ یہ لوگ کچھ دیر چاندنی میں ٹہلتے رہے ، پھر ایک جھرنے ( ) کے قریب بیٹھ گئے[1] ۔ اور شب ماہتاب کی رعنائیوں کا لطف لینے لگے ، کعب کا سر مُعطّر تھا - اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو نے پوری فضا کو مُعطّر کر دیا تھا ، قاتل بار بار اُس کے بالوں کی لٹیں سونگھتے اور چھوڑ دیتے ، مگر ایک بار انھیں لٹوں کو کسی نے پکڑ کر کھینچ لیا اور سر تن سے جُدا کر دیا۔

یہ پوری داستان موسمِ بہار کی ایک سُتھری چاندنی کو یاد دلاتی ہے ۔ اور واقعہ بھی یہی ہے ، کیونکہ ربیع الاوّل ۳ھ کی ۱۴ تاریخ ، ستمبر ۶۲۴ء سے مطابق ہوتی ہے ، جو حجاز میں آغازِ بہار کا زمانہ ہے ۔

اس واقعہ کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا موجودہ کلینڈر بیکار نہیں ، ایک دوسرا واقعہ اور ملاحظہ ہو جو اسی ۳ھ کا ہے۔

(۲) غزوۂ "بدر" کے بعد جب قریش نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کی تجارتِ شام غیر محفوظ ہو گئی اور خطرے سے خالی نہیں تو انھوں نے عراق سے تجارتی تعلقات قائم کرنا چاہے۔ تجویز کیا گیا کہ موسمِ سرما (شتاء) میں ایک قافلہ "عراق" بھیجا جائے ، چنانچہ یہ قافلہ روانہ ہوا ، مگر مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہو گئی ، قافلہ جب "قردۃ" کے پاس پہنچا تو زید بن حارثہ نے اس کو جا لیا - اس سریّہ کی تاریخ جمادی الاخریٰ ۳ھ[2] بیان کی جاتی ہے اور تمام سیرت نگار اس پر متفق ہیں ، کہ یہ واقعہ (شتاء) یعنی موسمِ سرما کا ہے ۔

یہ تاریخ بھی بالکل درست معلوم ہوتی ہے ، کیونکہ از روئے حساب جمادی الاخریٰ ۳ھ نومبر و دسمبر ۶۲۴ء سے مطابق ہوتا ہے ؛ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ مروجہ کلینڈر ناقابلِ اعتبار ہے ۔

(۳) اسی طرح غزوۂ خندق کا موسم بھی روائتی تاریخ سے مطابقت کرتا ہے ۔ کتبِ سیرت میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ جنگ موسمِ سرما ہی میں ہوئی تھی[3] ۔ سردی اور بادو باران کی یہ کیفیت تھی کہ محاصرین کے خیموں اور راؤٹیوں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ جاتی تھیں ، کھانا پکانے کے ظروف الٹ پلٹ جاتے ،

---

[1] ۲۷۴ ۔ [2] واقدی/۱۹۵ ، ابن سعد ۲/۲۴ - ابن سید الناس ۳۰۵/ قسطلانی /
۱۱۹ دیار بکری ۱/۴۱۶ [3] ابن ہشام ۳/۲۴۲ طبری ۳/۵۱ -

آگ نے جلنے کی قسم کھائی تھی، ان پریشانیوں سے تنگ آکر جب قریش نے محاصرہ اُٹھایا تو آنحضرتؐ نے کچھ آدمی مقرر کرنا چاہے کہ وہ دشمن کی فوج کی خبریں پہنچائیں، مگر یہاں بھی خوف، بھوک اور سردی کی شدت کی وجہ سے کوئی کھڑا نہ ہوا۔[۱]

اس غزوے کی تاریخ شوال ۵ھ بیان کی جاتی ہے جو حسابی قاعدے سے فروری، مارچ ۶۲۶ء کے مطابق ہوتی ہے، چونکہ مدینے میں یہ زمانہ سخت سردی کا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ بھی موسم سے مطابق ہے۔

(۴) اس سلسلے میں مجھے صرف ایک اور مثال پیش کرنا ہے جو غزوۂ "موتہ" کی ہے، اس غزوے کا روائتی موسم تاریخ سے مطابقت کرتا ہے۔ کیونکہ "طبری" میں یہ صراحت ہے کہ یہ واقعہ موسم گرما کا تھا۔ (وَ ذٰلِکَ فِی حَرٍّ شَدِیدٍ)[۲]

مؤرخین اس کی تاریخ جمادی الاولیٰ ۸ھ بیان کرتے ہیں، جو ہجری تقویم کے بموجب اگست و ستمبر ۶۲۹ء سے مطابقت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مہینے سردی کے نہیں۔

ان مثالوں سے جہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا واقعات مروجہ کلینڈر کے حساب سے درست ہیں، وہیں یہ شبہ بھی ممکن نہیں کہ عہدِ رسالت میں ہمارا یہ کلینڈر رائج نہ تھا، یا اس کلینڈر کے بموجب واقعات ریکارڈ نہیں کیے گئے۔ یہ سچ ہے کہ اس سرسری جائزے میں منجملہ بارہ[۱۲] واقعات کے آٹھ واقعے اس حساب پر پورے نہیں اُترے لیکن چار[۴] واقعے جو پورے اُترتے ہیں، ان کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

تیسری قسم کی نامطابقتیں

تیسری قسم ایسے واقعات کی ہے، جن کی توقیتی جانچ عمری تاریخ یا فلکی حسابات سے ممکن ہے۔ ان میں منجملہ پانچ واقعات کے تین بظاہر غلط اور دو صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے اہم "صوم عاشورہ" کی روائتیں ہیں، جو بیشتر حدیث کی کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ عاشورے کا روزہ دسویں محرم کو مسنون ہے اور آنحضرتؐ ہمیشہ اسی تاریخ کو یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔

احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ مدینے پہنچے تو ایک دن آپ نے دیکھا، کہ مدینے کے یہودیوں میں "صوم عاشورہ" کی رسم منائی جا رہی ہے، اس پر آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور جملہ مسلمانوں کو اس کی تاکید فرمائی[۳] اس دن سے یہ سنّت عام ہو گئی اور آج تک چلی آ رہی ہے، ہر سال بہت سے مسلمان دسویں محرم کو یہ روزہ رکھ رہے ہیں۔

یہودیوں میں یہ روزہ ماہِ تشری کی دس تاریخ کو رکھا جاتا تھا، جو اُن کے مذہبی سال کا ساتواں مہینہ تھا[۴]۔ اس اعتبار سے اصولاً اس سال عربی ماہِ محرم اور یہودی ماہِ تشری کو بالکل متوازی ہونا چاہیئے تاکہ دونوں مہینوں کی دسویں تاریخ ایک ہی دن پڑے، مگر تعجب ہے کہ تقویمی حسابات کی روشنی میں ہماری روائتیں صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ "البیرونی" نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ ان روایات پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ "یہ جملہ روایات از روئے حساب غلط اور بالکل بے اصل ہیں" میں یہاں اس کی اصل عبارت پیش کرتا ہوں۔

۱؎ طبری ۳/۵۲ ۲؎ طبری ۳/۱۱۰ ۳؎ بخاری عاشورہ

۴؎ BIBLE DISTRESSING FEAST

"لوگوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ رسول اللہؐ نے مدینہ پہنچ کر یہودیوں کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا جب آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس روز خدا نے فرعون کو غرق اور حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو نجات دی تھی، یہ سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا "کہ یہودیوں کے مقابلے میں ہم موسیٰؑ سے زیادہ قریب ہیں" چنانچہ اسی روز آپؐ نے روزہ رکھا، اور صحابہ کو بھی تاکید کی کہ وہ یہ روزہ رکھیں، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورے کے روزے کا نہ آپؐ نے حکم دیا نہ ممانعت کی۔"

"علمی تحقیقات سے یہ روایت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ جس سال ہجرت ہوئی اس کے محرم کی پہلی تاریخ کو جمعے کا دن اور ۱۶ر تموز ۹۳۳ سکندری تھی، لیکن اس روز کا یہودی تقویم سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سال کا پہلا دن یکشنبہ ۱۲ ایلول مطابق ۲۹ر صفر تھا، لہٰذا عاشورے کا روزہ سہ شنبہ ۹ ربیع الاوّل کو ہونا چاہیئے اور آنحضرتؐ کی ہجرت ربیع الاوّل کے نصف اوّل میں ہوئی تھی۔"[1]

اس کے بعد آگے چل کر لکھتا ہے :۔

"اور عاشورہ کسی طرح محرم میں واقع نہیں ہوا (کیونکہ از روئے حساب) ہجرت سے ۲ - ۱۰ سال پہلے اور بیس ۔ تیس سال بعد ایسا ہو سکتا ہے، اس لیے یہ دعوےٰ بالکل غلط ہے کہ رسول اللہؐ نے عاشورے کے دن اس بنیاد پر روزہ رکھا تھا کہ وہ اس سال (قمری) کے پہلے مہینے (محرّم) کی دسویں تاریخ تھی۔ اور دونوں تاریخیں یعنی دسویں تشری اور دسویں محرم ایک دن واقع ہوئی تھیں۔"[2]

ظاہر ہے کہ اگر البیرونی کا یہ حسابی اعتراض صحیح ہے تو روایاتِ عاشورہ کی کوئی قیمت نہیں رہتی اور کتبِ حدیث کا کم سے کم ایک باب بند ہو جاتا ہے۔

(۲) یہ روایتیں ۱ھ یا ۲ھ سے متعلق تھیں اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اب ۶ھ کی ایک اور روایت پر غور فرمایئے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ میدانِ حدیبیہ میں تھے کہ شاہِ ایران خسرو پرویز کے قتل کی اطلاع پہنچی[3] بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ یہ اطلاع تاریخ و یوم کی صراحت کے ساتھ بذریعہ وحی آئی تھی۔[4] اور بتایا گیا تھا کہ کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے سہ شنبہ ۱۰ جمادی ۷ھ کو قتل کر دیا، اسی روایت میں ۷ھ تو بالبداہت سہو کتابت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عمرۂ حدیبیہ متفقہ طور پر ۶ھ کا واقعہ ہے تاہم کئی اور غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو قابلِ گرفت ہیں، مثلاً :۔

(الف) اگر ۷ھ کے بجائے ۶ھ بھی مان لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ آنحضرتؐ تک اس قتل کی اطلاع کم سے کم چھ ماہ بعد پہنچی کیونکہ حدیبیہ ذیقعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے، اور یہ جمادی الاولیٰ کا۔

---

[1] آثار الباقیہ (سخاؤ) THEY CHRONOLOGY OF ANCIENT NATIONS C. E. SACHAU P. 327

[2] ایضاً [3] طبری ۲/۱۴۳ [4] ابن خلدون ۲/۳۸ نیز دیکھئے طبری ۳/۹۱

(ب) ۱۰ھ اور ۳ھ دونوں میں تاریخ و ایام کی مطابقتیں مفقود ہیں (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)

(ج) سب سے بڑھ کر یہ کہ کسریٰ کے قتل کی تاریخ یورپی مؤرخوں[1] کے یہاں بھی محفوظ ہے جس کی رُو سے یہ واقعہ ۲۷ یا ۲۹ فروری ۶۲۸ء کا قرار پاتا ہے، اس کے مقابلے میں جمادی الاولیٰ ۶ھ ۱۸ ستمبر ۶۲۷ء سے مطابق ہوتا ہے اور ۷ھ میں جمادی الاولیٰ ۶ ستمبر ۶۲۸ء کو شروع ہوا تھا۔

چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے پوری متانت سے اس روایت کی تغلیط کی ہے[2]۔

(۳) اسی طرح آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم کی تاریخِ رحلت حسابی قاعدوں سے بالبداہت غلط ثابت ہوتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی رحلت کا واقعہ ربیع الاوّل یا ربیع الآخر ۱۰ھ کا ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش ذوالحجہ ۸ھ[3] میں کسی تاریخ کو ہوئی تھی۔ صحاح کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سترہ[4] یا اٹھارہ[5] مہینے زندہ رہے[6]۔ اس حساب سے متذکرہ بالا تاریخ بظاہر صحیح اور قابلِ اعتماد نظر آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس روز اُن کا انتقال ہوا تھا، اُسی روز سورج کو گہن لگا تھا، جس پر آنحضرت ﷺ کو ایک یادگار خطبہ دینا پڑا[5]۔

ازروئے حسابِ ہیئت یہ سورج گرہن ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو ہوا تھا[6] جس کا متوازی ہجری مہینہ شوال ۱۰ھ آتا ہے۔ گویا یہ واقعہ ۲۹ شوال کا تھا، اس طرح ظاہر ہے کہ ربیع الاوّل یا ربیع الآخر کی روایات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

متذکرہ بالا تینوں مثالوں سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روایاتِ سیرت کی جانچ اگر دوسرے علمی ذرائع سے کی جاتی ہے تو یہ اس کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں، مگر میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے اور کتبِ سیرت میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کو علمِ ہیئت اور عصری تاریخ کی پوری تائید حاصل ہے۔ میں یہاں دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

صحیح توقیت کی مثالیں

(۱) بیان کیا جاتا ہے کہ جمادی الاخریٰ ۵ھ میں ایک چاند گرہن ہوا تو مدینے کے یہودیوں نے تھالیاں[7] بجانا شروع کیں[8]۔ اُن کا خیال تھا کہ چاند پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

ازروئے ہیئت یہ چاند گرہن ۹ نومبر ۶۲۶ء کو ہوا تھا، جو ۱۴ جمادی الاخریٰ ۵ھ سے مطابق ہوتا ہے[8]۔ اس وقت بنو قریظہ کے یہودی مدینے میں موجود تھے۔

(۲) اسی طرح اہلِ سیر کا متفقہ بیان ہے کہ حدیبیہ کے فوراً بعد ذوالحجہ ۶ھ (مطابق اپریل مئی ۶۲۸ء) میں آنحضرت ﷺ نے قیصر و کسریٰ کے پاس سفارتیں روانہ کی تھیں[9]۔ ان میں قیصر کو جو سفارت بھیجی گئی تھی، اس کی تاریخ یونانی مصنفین کے یہاں محفوظ

---

[1] E. G. BBON - DECLINE - VOL III P. 315 نیز دیکھیے روداد معارفِ اسلامیہ اجلاس دوم ۱۹۳۲ء انگریزی حصہ

[2] معارف ۱۹۴۲ء [3] ابن سعد ۱/۹۱ [4] دیکھیے بخاری، نیز دیکھیے دیار بکری ۱/۴۲۶۔

[5] MARGOLIOUTH RISO P XX [6] MUIR LIFE 430 [7] دیار بکری ۱/۴۶۹

[8] التنبیہ والاشراف ۲/۴/۲۷ [9] دیار بکری ۲/۲۹ ابن سعد ۲/

ہے، مارگولیتھ MARGOLIOUTH کہتے ہیں کہ "عرب اور یونانی مصنفین کے نزدیک اس سفارت کی تاریخ متفق علیہ ہے اور یہ قصہ خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو مگر اس میں توقیتی (CHRONOLOGICAL) غلطی نہیں[1]"۔

بعض قدیم یورپی مؤرخین نے یہ تاریخ اپریل ۶۲۸ء متعین کی ہے جو سیرت نگاروں کی تاریخ یعنی ذوالحجہ ۶ھ سے عین مطابق ہے کیونکہ ہجری تقویم کے بموجب ذوالحجہ ۶ھ سہ شنبہ ۱۲ اپریل کو شروع ہوا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کتب سیرت میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کی تصدیق موجودہ علمی ذرائع بھی کرتے ہیں، اور اگرچہ بظاہر ان کتابوں میں قدم قدم پر تقویمی اغلاط اور تضاد نظر آتے ہیں لیکن ان کا ایک حصہ پھر بھی نقادانِ فن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ دوسرے حصہ کے تقویمی اغلاط اور تضادات کی بنیادی اور مادی وجہ کیا ہے؟ اور اس میں مدونین سیرۃ کی بے احتیاطی یا بعائتی بھول چوک کو دخل ہے، یا کوئی اور بات ہے؟

توقیتی تضادات کی چوتھی قسم

اب میں قارئین کے سامنے سیرت کے توقیتی تضادات کی چوتھی قسم پیش کرتا ہوں جو سب سے زیادہ واضح اور ایک عرصۂ دراز سے معرضِ بحث میں آچکی ہے، مگر اس کا حل علمائے اسلام کی سمجھ میں بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایک روایت کو کسی نہ کسی طرح ترجیح دے دی جائے اور دوسری کو راوی کی بھول یا مختصر لفظوں میں کذب پر محمول کر کے رد کر دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ قدیم کتبِ سیرت میں اکثر واقعات کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں مثلاً:۔ (۱) ایک مصنف (ابن اسحٰق نے) "بدرِ اولیٰ" یا غزوہ کرز بن جابر فہری کی تاریخ جمادی الاخریٰ ۲ھ بیان کی ہے[2]۔ تو دوسرے مؤرخ (واقدی) نے یہی واقعہ ربیع الاول ۲ھ کا قرار دیا ہے[3]۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں کتبِ سیرت میں موجود ہیں، اور خاص طور پر ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان ایسے اختلافات اور تضادات سب سے زیادہ نمایاں ہیں، جس کی وجہ سے شروع ہی میں تاریخ کے کم سے کم دو مکاتبِ خیال پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ کئی مشہور مصنفین اگر ابن اسحٰق کے ساتھ ہیں، تو اسی درجے اور مرتبے کے متعدد علمائے تاریخ واقدی کے ہمنوا ہیں، بہرصورت ان تضادات کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۲) ابنِ اسحٰق کے بیان کے بموجب آنحضرتؐ جب بدر سے مدینے تشریف لے آئے تو سات آٹھ دن کے اندر ہی بنو سلیم کی جنگی تیاریوں کی اطلاع ملی جس پر آپؐ نے فوراً ہی دیارِ بنو سلیم کی طرف کوچ کر دیا[4]۔ طبری اور ابن حبیب نے جو ابن اسحٰق کے مکتب خیال کے مصنفین ہیں، اس غزوے کی تاریخ شوال ۲ھ بیان کی ہے[5]۔ جن کے تتبع میں ابنِ خلدون[6] وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد وغیرہ کے نزدیک یہ واقعہ محرم ۳ھ کا ہے[7]۔ چنانچہ مقدسی[8] اور مسعودی[9] وغیرہ

---

[1] MARGOLIOUTH RISE P. 365 [2] ابنِ ہشام ۲/۲۵۱ [3] واقدی / ۳ ابن سعد ۲/۲

[4] ابن ہشام ۲/۴۶، [5] طبری ۲/۲۹۸۔ ابن حبیب / ۱۱۱ [6] ابن خلدون ۲/۲۱ [7] واقدی / ۱۸۳ ابن سعد ۲/۲۱،

[8] مقدسی / ۱۹۷ [9] التنبیہ والاشراف / ۲۴۳۔

وغیرہ کی مہریں اسی تاریخ پر ثبت ہیں، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ابن اسحٰق کے مکتبِ خیال کے نزدیک یہ واقعہ غزوۂ سویق (ذوالحجہ ۲ھ) سے بہت پہلے کا ہے، اور واقدی کے مکتبِ تاریخ کی رائے میں غزوۂ سویق کے بعد کا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اختلافات کا سب سے نمایاں اثر واقعاتی ترتیب اور اس کے ساتھ ہی اسباب و علل پر پڑتا ہے چنانچہ قرونِ وسطیٰ کی تقریباً تمام کتابیں اسی قسم کے اختلافات سے حد درجہ متاثر ہیں۔

(۳) ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:-

سیرت کی کتابوں میں ایک واقعہ "غزوۂ ذی امر" کے نام سے موسوم ہے، ابن اسحٰق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ذوالحجہ ۲ھ کی آخری تاریخوں میں شروع ہوئی تھی[1] اس کے مقابلے میں واقدی نے اس کی تاریخ ربیع الاول ۳ھ بیان کی ہے[2] ابنِ کثیر نے ان دونوں بیانات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ سویق سے واپس ہوئے تو مدینے میں ذوالحجہ کا بقیہ مہینہ یا اس کے لگ بھگ قیام کیا، اس کے بعد نجد پر غطفان کے ارادے سے لشکر کشی کی اور یہی غزوۂ ذی امر ہے اور واقدی کا قول ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ ذی امر میں غطفان کی ایک جماعت جو بنی ثعلبہ بن محارب کی شاخ ہے، جمع ہوئی ہے اور اس کا ارادہ تخریب کا ہے۔ تو آپ مدینے سے پنجشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول کو نکلے"[3]

گویا ابن اسحٰق اور واقدی کی تاریخوں میں تقریباً ڈھائی تین مہینے کا فرق ہے، جو توقیتی اعتبار سے کم نہیں۔ یہی دو ڈھائی مہینے کا فرق ایک اور مثال سے واضح ہوتا ہے۔

(۴) ابنِ اسحٰق نے سریہ زید بن حارثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو قردہ کی طرف روانہ کیا گیا تھا (اور جس کا تذکرہ اُوپر آچکا ہے) بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے چھ ماہ بعد کا ہے[4] جس کے حساب سے اس کی تاریخ ربیع الاول ۳ھ متعین ہوتی ہے لیکن واقدی نے صراحت کی ہے کہ یہ سریہ جمادی الاولیٰ[5] ۳ھ میں روانہ کیا گیا تھا، گویا وہی دو ڈھائی مہینے کا فرق یہاں بھی نظر آرہا ہے اور تقریباً یہی فرق غزوۂ بدر موعد کی توقیتی صراحتوں میں ہے۔

(۵) ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ شعبان ۴ھ میں پوری تیاری[6] سے اسی غزوے کے لیے نکلے تھے مگر واقدی کے نزدیک یہ واقعہ ذیقعدہ ۵ھ[7] کا ہے، تاہم اسی سنہ کے ایک واقعہ میں توقیتی اختلاف نسبتاً بہت طویل ہے۔

(۶) ابن اسحٰق نے غزوۂ بدر موعد سے پہلے اور غزوۂ بنو نضیر کے بعد جمادی ۴ھ میں ایک اور غزوے کا تذکرہ کیا ہے جو ذوامر کی

---

[1] ابن ہشام ۳/۴۸، ۴۹ نیز دیکھیے طبری ۲/۴۹۹ — ابن خلدون ۲/۲۲ (ابن خلدون نے محرم کی تاریخ بیان کی ہے۔)

[2] واقدی/۱۹۲ ابن سعد ۲/۲۳ مقدسی ۴/۱۹۷۔ [3] البدایہ والنہایہ ۴/۲ نیز دیکھیے دیار بکری ۱/۴۱۴ [4] البدایہ ۴/۴ [5] واقدی/۱۹۵ نیز دیکھیے ابن سعد ۲/۲۴ مقدسی ۴/۱۹۸ [6] ابن ہشام ۳/۲۲۰، نیز دیکھیے طبری ۳/۴۱ ابن سیدالناس ۲/۵۳ [7] واقدی/ابن سعد ۲/۴۲۔

طرح غطفان اور ثعلبہ کے خلاف اقدام تھا، مغازی کی اصطلاح میں اسے غزوۂ ذات الرقاع[1] کہا جاتا ہے لیکن واقدی کے نزدیک یہ واقعہ محرم ۵ھ کا ہے[2] یعنی ابن اسحٰق اور واقدی کی توقیت میں تقریباً آٹھ ماہ کا فرق ہے!

(۷) ۷ھ میں بھی یہ فرق نمایاں ہے، چنانچہ ابن اسحٰق نے غزوۂ خیبر کی تاریخ محرم ۷ھ بیان کی ہے[3] مگر واقدی کے نزدیک اس کی صحیح تاریخ جمادی الاولیٰ ۷ھ ہے[4] یعنی تقریباً ۴ ماہ کا فرق۔

اس قسم کے توقیتی اختلافات اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی کی روایات میں زیادہ ہیں تاہم دوسرے مؤرخین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور متعدد اکابر کی روایتیں آپس میں متصادم ہیں، میں یہاں ان کے بھی دو ایک نمونے پیش کرتا ہوں۔

(۸) تحویل قبلہ کے متعلق عام روایت یہ ہے کہ شعبان[5] ۲ھ کا واقعہ تھا، مگر امام زہری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قبلے کی تبدیلی جمادی ۲ھ[6] میں ہوئی تھی۔

(۹) اسی سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ روایتی اختلاف معرکۂ اُحد کی توقیت کے سلسلے میں ہے، نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی بلکہ جملہ مؤرخینِ اسلام کا سو فی صدی اتفاق ہے کہ معرکۂ اُحد کا تعلق شوال ۳ھ سے تھا۔

واقدی نے ابن اسحٰق کی طرح پوری آب و تاب اور بڑی صراحت سے اس واقعہ کو شوال ۳ھ ہی کے ذیل میں بیان کیا ہے: لیکن بیان کرتے کرتے ایک ایسی روایت بھی لکھ گئے ہیں جس سے دھوکہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں نگاہوں کی شہادت تو غلط نہیں! یہ روایت عبدالحمید بن جعفر کی ہے، جو انھوں نے اپنے والد سے نقل کی تھی، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ اُحد (شوال کا نہیں بلکہ محرم ۳ھ کا واقعہ تھا[7]۔

کتبِ سیرت میں اس نوعیت کی اور بھی کئی روایتیں ہیں، تاہم میں ایک اور مثال پیش کرکے قارئین کی توجہ پانچویں قسم کے تضادات کی طرف منعطف کروں گا۔

(۱۰) ۶ھ کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عُرینہ کے کچھ لوگ آنحضرتؐ کے مہمان تھے مگر کچھ عرصہ بعد انھیں جہالوں نے میزبان کی اُونٹنیاں چُرائیں اور بھاگ نکلے جس پر کرز بن جابر فہری کو اُن کے تعاقب میں بھیجا گیا، اس واقعہ کی تاریخ قسطلانی کی زبان سے سُنیئے، وہ کہتے ہیں:۔

> "یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۶ھ کا ہے اور بخاری نے اس کا تذکرہ حدیبیہ کے بعد کیا ہے، جو ذوالقعدہ کا واقعہ تھا، اور واقدی کے نزدیک یہ شوال میں ہوا، جس سے ابنِ سعد اور ابن حبان بھی متفق ہیں[8]۔"

امثلہ بالا سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کتبِ سیر میں واقعاتی ترتیب تو کجا صحیح مہینے بھی متعین نہیں، تاہم واقعاتی ترتیب کے سلسلے

---

[1] ابن ہشام ۳/۲۴۴ نیز دیکھیے ابن سید الناس ۲/۵۲ [2] واقدی ۲/۴ ابن سعد ۲/ [3] ابن ہشام ۴/ [4] واقدی ۲/۴ [5] طبری ۲/۲۶۵ مقدسی ۴/۱۸۴، تلقیح ابن جوزی/۲۰ [6] عیون الاثر/۲۳۱ [7] واقدی/۳۱۷، ۳۱۸! [8] مواہب/۱۶۰، البدایہ ۴/۱۶۹ نیز دیکھیے دیار بکری ۲/۱۰،

میں کچھ بعض دلچسپ نمونے ملاحظہ فرمایئے جو خود قدمائے کے لیے باعثِ حیرانی رہے ۔

واقعاتی ترتیب میں تضاد

(۱) ابن اسحٰق اور واقدی دونوں اساطینِ سیرت نے سلسلۂ غزوات کی ابتداء "غزوۂ الواء" سے کی ہے، جو متفقہ طور پر صفر سنہ ۲ھ کا واقعہ ہے[1] لیکن امام بخاری نے اپنی کتاب "المغازی" کی ابتداء میں زید بن ارقم کی ایک روایت بیان کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بالکل ابتدائی مہم غزوۂ ذات العشیرہ تھی ۔

امام بخاری نے روایت نقل تو کر دی، لیکن شروع ہی میں ایک نوٹ لگانا پڑا کہ ابن اسحاق کی رائے میں "غزوہ الوا" پہلا غزوہ ہے[2] اسی طرح واقدی نے بھی سلسلۂ غزوات کی ابتداء اگرچہ "غزوۂ الوا" ہی سے کی ہے لیکن ان کو یہ صراحت کرنا پڑی کہ زید بن ارقم کی روایت کے بموجب غزوۂ ذات العَشِیرہ پہلا غزوہ ہے[3]

(۲) اسی سلسلے میں سب سے زیادہ حیران کن مثال "غزوۂ تبُوک" اور حجِ ابوبکر کی ہے جو دونوں سنہ ۹ھ کے واقعات ہیں، علمائے سِیَر کا اتفاق ہے کہ غزوۂ تبوک سنہ ۹ھ کا واقعہ ہے[4] اور حجِ ابوبکر ذوالحجہ سنہ ۹ھ لیکن عکرمہ بن زبیر جو سیرت کے سلسلے میں سب سے بڑی سند سمجھے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر حج سے فارغ ہو کر مدینے پہنچے تو آنحضرت "غزوۂ تبوک کے لیے نکلے گویا[5] "غزوہ تبوک" ذی قعدہ سنہ ۹ھ کے بعد کا واقعہ ہے ۔

یہ ہیں نمونے ان تقویمی اشکال اور توقیتی تضادات کے جن سے باعث واقعاتِ سیرت کی بہت سی تفصیلات واقعی ایک معمہ بن گئی ہیں اور حیران ہی نہیں بلکہ واقعی مجھے شکوہ ہے کہ مسلمان مصنفین نے اب تک اس طرف کیوں پوری توجہ نہیں کی، کیونکہ میری رائے میں یہ توقیتی صراحتیں جو بظاہر غلط نظر آ رہی ہیں، کسی طرح جعلی یا فرضی نہیں بلکہ حقیقت کی نظر سے دیکھیے تو یہ غلطیاں ہی خود اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہیں کہ مدوّنین سیرت نے انتہائی دیانتداری کا ثبوت دیا ہے اور بلا اس بات کا لحاظ کیئے کہ یہ روائتیں بادی النظر میں صحیح ہیں یا غلط ان کو درج واقعات کرنے میں گریز نہیں کیا اور قدیم ریکارڈوں میں جو کچھ بھی ملا سپردِ قلم کر دیا ۔

علمائے مغرب نے اس معمے کو حل کرنے کی واقعی طرح طرح کی کوششیں کیں، مگر تعجب ہوتا ہے کہ جو لوگ بیکانی اور مصری خطوط کو پڑھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے، وہ اس سلسلے میں کیوں ناکام رہے، بہر حال یہ علمائے مغرب ہی تھے جنھوں نے غالباً سب سے پہلے ان غلطیوں کو اس بات پر محمول کیا کہ یہ عربوں کے قدیم نظامِ تقویم کا نتیجہ ہیں جس کو مسلمانوں نے سنہ ۱۰ھ کے بعد عملاً ناشروع کر دیا تھا ۔

سر ولیم میور (W. MUIR) نے اپنی مشہور کتاب LIFE OF MOHAMED کی توقیتی بنیاد پر سیوال (PERC EVAL) کے نظریۂ تقویم پر رکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اہلِ مکہ کا سنہ ابتداءً خالص قمری تھا، پانچویں صدی کے آغاز میں یہودیانِ عرب کی تقلید کے طور پر اس قمری سنہ کو شمسی سنہ میں (LUNI SOLAR) تبدیل کر دیا گیا، اس سلسلے میں جاہل عربوں کے پیشِ نظر یہ موٹا اصول رہا کہ ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر دیا جائے، جس وقت یہ طریقہ اختیار کیا جا رہا تھا، تو یہ

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۹۰، واقدی/۳ [2] دیکھیے بخاری کتاب المغازی [3] دیکھیے واقدی/۴ [4] ابن حبیب/۱۱۵
[5] الدرالمنثور ۳/۱۰۸ -

لحاظ رکھا گیا تھا کہ ایامِ حج میں حاجیوں اور زائرین مکہ کو خوراک کی کمی سے دوچار ہونا نہ پڑے اس لیے زمانۂ حج خریف AUTUMN میں مقرر کیا گیا تھا، مگر سال شمسی حسابات کے مقابلے میں پھر بھی ایک دن چھوٹا رہا، اس لیے دو سو سال بعد رفتہ رفتہ ایامِ حج بجائے اکتوبر کے مارچ میں آنے لگے تا آنکہ حجۃ الوداع میں آنحضرت ؐ نے اس طریقے کو بھی ختم کر دیا[۱]

پرسیوال کی جدولِ مطابقت ذیل میں دی جاتی ہے [۲]

انگریزی مہینے	عربی مہینے
اپریل	محرّم
مئی	صفر
جون	ربیع ۱
جولائی	ربیع ۲
اگست	جمادیٰ
ستمبر	جمادی ۲
اکتوبر	رجب
نومبر	شعبان
دسمبر	رمضان
جنوری	شوال
فروری	ذلیقعدہ
مارچ	ذوالحجہ

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عہدِ رسالت ؐ میں مکی سنہ قمری شمسی (LUNI SOLAR) تھا قطعی طور پر درست اور ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، مگر میور یا پرسیوال کا یہ تصور کہ عربوں نے یہ طریقہ یہودیوں سے حاصل کیا تھا یا اُن کے حسابات میں کوئی خاص کوتاہی تھی، صحیح نہیں، بلکہ میرے خیال میں ان علمائے کے تصور کی اسی غلطی نے اُن کو صحیح نتائج پر پہنچنے سے روک دیا (جیسا کہ آپ آئندہ محسوس کریں گے) یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ پرسیوال کے حسابات بنیادی طور پر غلط ہیں اور اس درجہ غلط ہیں کہ اس قسم کی غلطیاں کم سے کم علمائے مغرب سے کمتر ہوتی ہیں۔

اس نظریئے سے صرف ہجرت اور غزوۂ بدر وغیرہ کے کچھ ایام و تاریخ بظاہر درست معلوم ہونے لگتے ہیں یعنی ۱۲ ربیع الاوّل سلہ کو

---

[۱] MUIR LIFE P. C. II

[۲] MUIR LIFE P. X

دوشنبے ہی کا دن پڑتا ہے، جو تاریخ ہجرت ہے، اسی طرح غزوۂ بدر کی تاریخ یعنی ۱۷ رمضان سنہ ۲ ھ کو جمعہ ہی آتا ہے مگر ان دو ایک تاریخوں کی ظاہری مطابقت سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اور اُلجھ جاتا ہے اور اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واقعات کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں، خاص طور پر موسمی تصریحات ہیں اس درجہ بُعد ہو جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان علمائے کتب سیرت کا بغائر نظر مطالعہ بھی کیا تھا یا نہیں؟

پرسیوال اور میور کے نظریئے میں کئی خامیاں ہیں، اول تو یہی کہ اگر (بحث کی خاطر) اس کو قبول بھی کر لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ عہدِ رسالتؐ میں بھی ایک کلینڈر تھا، جیسا کہ "میورؒ" کا خیال ہے، تو جن واقعات کی توثیقی تصدیق ہمارا موجودہ کلینڈر کر چکا ہے سب کے سب غلط ہو جائیں گے اور تقریباً ایک تہائی (⅓) واقعات کی صحیح تاریخوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اس نقصان کو برداشت کیا جا سکتا تھا، بشرطیکہ بقیہ دو تہائی (⅔) واقعات کی توثیقی صراحتیں درست ہو جاتیں، مگر یہاں کیفیت یہ ہے کہ دو ایک تاریخوں کے علاوہ جو محض اتفاقی طور پر بظاہر درست نظر آتی ہیں سب کی سب غلط ہیں۔ ان اغلاط کی بھی کچھ نہ کچھ توجیہہ کر لی جاتی، بشرطیکہ واقعاتِ سیرت کی موسمی اور فلکی تصریحات کے تضاد ختم ہوتے نظر آتے جو حقیقتاً کتبِ سیرت کا سب سے کمزور پہلو اور تاریخی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا عیب معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے واقعی تعجب ہے کہ میورؒ جیسے متبحر عالم اور نقاد نے اس ناکارہ تقویم کو بلا پرکھے کس طرح قبول کر لیا اور صرف قبول ہی نہیں کیا، بلکہ اپنی اعلیٰ تصنیف کی بنیاد بھی اسی پر ڈال دی جو توثیقی اعتبار سے اس درجہ گمراہ کن ہے کہ واقعاتِ سیرت کے موسم بالکل اُلٹے ہو جاتے ہیں اور جو واقعہ گرما کا تھا، وہ ٹھیک ٹھیک سرما میں پہنچ جاتا ہے، یہاں اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) سب سے پہلے واقعۂ ہجرت کو لیجیے جس کی تاریخ و یوم کی صراحت دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول[1] اس تقویم کے حساب سے صحیح بیٹھتی ہے، اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ پرسیوال کا حساب غلط نہیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ یہ ۱۲ ربیع الاول ۲۸ مئی سنہ ۶۲۲ء[2] سے مطابق ہوتی ہے، یعنی عین موسم گرما سے جب کہ خاص طور پر مکہ کا موسم شدید تر ہوتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمام تاریخوں میں یہ روایت متواتر چلی آ رہی ہے، اور خود میورؒ نے بھی اس کو پوری آب و تاب کے ساتھ لکھا ہے کہ ہجرت کی رات میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سونے کا حکم دیا تھا، اور اپنی چادر عطا فرمائی تھی، کہ وہ اس کو اوڑھ کر آرام فرمائیں، حالانکہ مکہ کا موسم مئی میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ کوئی شخص معمولاً کسی قسم کا کپڑا اوڑھ کر سو سکے، اور وہ بھی بند مکان میں، علاوہ ازیں جب پیغمبر اسلامؐ مدینے پہنچتے ہیں تو روایتوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اس وقت فصلِ خریف سمیٹی جا رہی تھی[3] جو مدینے میں عام طور پر آخر ستمبر سے نومبر تک سمٹتی ہے مئی جون میں اور فصل خریف کا تصور کس درجہ دلچسپ ہے۔؟

ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے:

(۲) اوراقِ گزشتہ میں آپ کسی جگہ پڑھ چکے ہیں کہ بدر کا موسم روایتی اعتبار سے گرم تھا، اور اتنا گرم تھا کہ مسلمان بارش کی

---

[1] MUIR - LIFE P. 168 [2] MUIR LIFE P. 138 [3] بخاری باب ہجرت النبیؐ، نیز دیکھیے ابن سعد ۱/ ۱۶۰

دُعائیں کرنے پر مجبور تھے، پھر جب یہ بارش ہوئی تو خود قرآن نے اس کو احسانِ الٰہی کے طور پر پیش کیا "میور" کی تقویم کے بموجب یہ بارش جنوری کی ایک[۱] رات میں ہوئی تھی او رمسلمانوں کے لیے اس درجہ لذت آفریں تھی کہ انھیں رات بھر گہری نیند آتی رہی[۲]۔

(۳) اسی طرح ابوعفک کے قتل کے واقعے کو "میور" نے فروری ۶۲۲ء[۳] کا قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جس رات وہ قتل ہوا مکان سے باہر صحن COURT[۴] YARD میں سو رہا تھا۔ مگر فروری کے مہینے میں بوڑھے ابوعفک کا باہر سونا کس قدر تعجب خیز ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ خود "میور" کی صراحتوں کے بموجب مدینے کا سرمائی موسم انتہائی شدید ہوتا ہے[۵]۔

(۴) اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ مثال غزوۂ اُحد کی ہے، جس کی تاریخ میور نے جنوری ۶۲۵ء قرار دی ہے اور اس کے ساتھ ہی تازہ کھجوروں (رطب) FRESH DATES کی موجودگی کے واقعات بھی پوری تفصیل سے بیان کئے ہیں[۶]۔ جبکہ یہ بات "میور" کے علم سے باہر نہ ہونا چاہیے کہ مدینے میں تازہ کھجوروں کا موسم آخر جون یا جولائی سے پہلے ممکن نہیں،

اسی طرح تمام واقعاتِ سیرت کے موسم (جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں) اس تقویم کی زد میں آنے کے بعد اُلٹے ہو جاتے ہیں حتّٰی کہ اس سورج گرہن کی تاریخ جو ۲۸ جنوری ۶۳۲ء کو ہوا تھا، خود میور نے جون و جولائی ۶۳۱ء[۷] قرار دی ہے، جو فلکی حسابات کی روشنی میں قطعاً ممکن نہیں، اس لیے میری رائے میں اس پر مزید تبصرہ غیر ضروری ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی جاہلی تقویم کی بازیافت کے سلسلے میں یہ کوشش بالکل ابتدائی نوعیت کی تھی، اور اس میں زیادہ دقتِ نظر سے واقعات کو نہیں چھانا گیا تھا تاہم علمائے مغرب کی نظر میں یہ مسئلہ ہمیشہ کھٹکتا رہا اور نئے نئے نظریات پیش کیے گئے۔ جس میں مشہور مستشرق، ولہاوزن J. WELHAUSEN نے بھی دلچسپی لی، اور انھوں نے متعدد واقعات کی موسمی شہادتوں کو اکٹھا کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ "بعض حالتوں میں" اگر ان تاریخی روایتوں کو ڈھائی مہینے آگے بڑھا دیا جائے تو موسموں سے مناسب تطبیق[۸] ہو جاتی ہے،

اس سلسلہ میں سب سے اہم نظریہ شاید ونکلر WINCELER نے پیش کیا تھا جس کی تفصیلات بدقسمتی سے میرے پیشِ نظر نہیں، صرف مارگولیتھ کا یہ بیان ہے کہ:۔

> "اور ونکلر کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی ہے کہ مدینے کی تقویم (CALANDERS) مکے کی تقویم سے غالباً مختلف تھی، دونوں شہروں میں ایک ہی نام کے مہینے مختلف اقدارِ زمانی رکھتے تھے، اس کی عربی تقویم کی اصلیت کے متعلق تحقیقات جن کو (NIELSEN) نے اور وسعت دی، ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتی۔"

اِس بیان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ونکلر کی رائے میں واقعاتِ سیرت پر دو تقویموں کی کارفرمائی تھی، جو میری رائے میں

---

۱ MUIR LIFE P 222 — ۲ MUIR LIFE P 222 — ۳ MUIR LIFE 240

۴ MUIR LIFE P 240 — ۵ MUIR LIFE 243 — ۶ MUIR LIFE P. 267

۷ — ۸ MARGO LIOUTH XX

قطعاً قابلِ قبول ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مارگولیتھ نے ایسی کوئی تشریح نہیں کی۔ ونکلر کی رائے میں ان دو تقویموں کی ابتداء وانتہا کس نقطہ سے ہوئی تھی۔ صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ "ونکلر کا نظریہ ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا"۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس مستشرق کے نظریہ کو قبولِ عام نہ ہو سکا، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ شاید بعض پیچیدہ حسابات پر مبنی تھا، تاہم مجھے انتہائی ممنونیت سے اس کا اعتراف کرنا ہے کہ میرا دو تقویمی نظریہ ونکلر کے اس تصوّر کا نتیجہ ہے جس کی اگرچہ ادنیٰ ترین تفصیل بھی میرے پیشِ نظر نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ اس مستشرق کے تصوّرات کی گزرگاہ میری تفہیمات سے بالکل جدا ہو، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ دو تقویمی نظریہ واقعاتِ سیرۃ کی باقاعدہ جانچ کا منطقی نتیجہ ہے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً ایک تہائی واقعات سیرت نے جن میں ایام و تواریخ کی تفصیلات بھی شامل ہیں، ہوسکی صراحتیں بھی موجود ہیں اور فلکی حسابات کے ساتھ عصری تاریخ کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ وسٹنفیلڈ کی عام قمری تقویم سے مطابقت کر کے یہ ثابت کر دیا ہے، کہ عہدِ رسالت میں کوئی اور کلینڈر موجود ہو یا نہ ہو، لیکن ہمارا مروّجہ کلینڈر ضرور رائج تھا اور اگرچہ اس سے کتنا ہی کم کام لیا جاتا ہو، مگر اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں، اب رہیں دو تہائی واقعات کی توقیتی صراحتیں تو میرے نزدیک یہ مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی ہیں جو عہدِ رسالت میں سنہ ۱۰ھ تک رائج رہی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک قیمتی مقالے کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو انہوں نے سنہ ۴۲ء میں عہدِ نبوی کے عربی ایرانی تعلقات کے ذیل میں لکھا تھا مگر اس میں ضمنی طور پر مکے کی جاہلی تقویم بھی زیرِ بحث آگئی ہے اور فاضل مقالہ نگار نے صرف صلح حدیبیہ کے متعلق کچھ تاریخی اختلافات پیش کر کے ان کی توجیہ اصولِ نسئی کے تحت کرنا چاہی ہے۔

اس مقالے میں انہوں نے دو تقویموں کا تصوّر ایک خاص زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کا اقدام کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقالہ محض سرسری طور پر لکھا گیا تھا، اس لیے نتائج قابلِ اطمینان نہ نکل سکے۔ میں یہاں ان کی جدول تقویم پیش کرتا ہوں جو اگرچہ صرف سنہ ۶ھ سے لے کر سنہ ۱۰ھ تک کی مکی اور مدنی تقویم کے تطابق کی کوشش پر مبنی ہے، لیکن اس کے ذریعہ فاضل مقالہ نگار کا پورا اصولِ تقویم سمجھ میں آ سکتا ہے جو میری رائے میں بالکل اُلٹا ہے اور جس پر میں آئندہ تبصرہ کروں گا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میور کے نظریۂ تقویم کے پہلو میں موجودہ ہجری

AND IT HAS BEEN POINTED OUT BY WINCKLER THAT THE CALANDAR OF MEDENAH MAY WELL HAVE BEEN DIFFERENT FROM THAT OF MECCAK, THE SAME MONTHS HAVING QUITE DIFFERENT VALUES AT TWO CITIES. HIS INVESTIGATION INTO THE ORIGIN OF THE ARABIC CALENDER, WHICH HAVE BEEN AMPLIFIDE BY D. NEELSEN ARE OF NO PRACTICAL IMPORTANCE FOR FIXING THE DAILS OF EVENTS DURING THE EARLY YEARS OF THE HIJRAT (MARGOLOUTH RISE XX)

تقویم کو درکھنے کی کوشش کی گئی۔

"جدول"

مدنی	مکی	سنہ ۶ھ	مدنی	مکی
محرم	ربیع ۱		رجب	رمضان
صفر	ربیع ۲		شعبان	شوال
ربیع الاول	جمادی ۱		رمضان	ذیقعدہ
ربیع الثانی	جمادی ۲		شوال	ذوالحجہ
جمادی ۱	رجب		ذلیقعدہ	X
جمادی ۲	شعبان		ذوالحجہ	محرم

سنہ ۷ھ			سنہ ۸ھ			سنہ ۹ھ			سنہ ۱۰ھ	
مکی	مدنی		مکی	مدنی		مکی	مدنی		مکی	مدنی
محرم	صفر		محرم	صفر		محرم	صفر		محرم	محرم
صفر	ربیع ۱		صفر	ربیع الاول		صفر	ربیع الاول		صفر	صفر
ربیع الاول	ربیع ۲		ربیع الاول	ربیع الثانی		ربیع الاول	ربیع الثانی		ربیع الاول	ربیع الاول
ربیع الثانی	جمادی ۱		ربیع الثانی	جمادی ۱		ربیع الثانی	جمادی ۱		ربیع الثانی	ربیع الثانی
جمادی ۱	جمادی ۲		جمادی ۱	جمادی ۲		جمادی ۱	جمادی ۲		جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	رجب		جمادی ۲	رجب		جمادی ۲	رجب		جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	شعبان		رجب	شعبان		رجب	شعبان		رجب	رجب
شعبان	رمضان		شعبان	رمضان		شعبان	رمضان		شعبان	شعبان
رمضان	شوال		رمضان	شوال		رمضان	شوال		رمضان	رمضان
شوال	ذیقعدہ		شوال	ذیقعدہ		شوال	ذلیقعدہ		شوال	شوال
ذلیقعدہ	ذوالحجہ		ذیقعدہ	ذوالحجہ		ذلیقعدہ	ذوالحجہ		ذلیقعدہ	ذلیقعدہ
ذوالحجہ	محرم		ذوالحجہ	محرم		ذوالحجہ	X		ذوالحجہ	ذوالحجہ

اس جدول پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ واقعاتِ سیرت کی توقیتی تشریحات ممکن نہیں۔

اس سلسلے میں راقم الحروف کے سامنے بھی ایک نظریہ ہے جس کو علمائے تاریخ کے رُوبرو اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ ان کے غور و فکر کی کسوٹی پر اس کی آزمائش ہو سکے، اس نظریہ کا مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ ہے :۔

"ظہورِ اسلام کے وقت جزیرہ نمائے عرب میں کئی تقویمیں رائج تھیں جن میں ایک مکے میں رائج تھی، یہ تقویم قمری شمسی تھی اور ایک خاص نقطہ فصلی سے شروع ہو کر اسی نقطے پر ختم ہوتی۔ اس تقویم میں وقتاً فوقتاً کبیسہ مہینے اضافہ ہوتے رہتے۔ اس کے مقابلہ میں مدینہ میں ایک دوسری تقویم رائج تھی جو خالص قمری تھی، مگر دونوں تقویموں کے مہینے ہم نام تھے، مہاجرینِ مکہ جب مدینہ پہنچے تو اپنے ساتھ مکی تقویم بھی لے گئے۔ اس طرح ہجرت کے بعد مدینے میں بیک وقت دو تقویمیں رائج ہو گئیں، جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں نے مکی تقویم کے بموجب یادداشتیں مرتب کیں اور بعض نے مدنی کلینڈر کے مطابق، اس بناء پر ابتدائی مدونینِ سیرت یا اُن کے رواۃ کی جو تاریخیں مل سکیں وہ دونوں تقویموں پر مبنی تھیں، ان میں سے مکی تقویم اس وقت ناپید ہے جس کی وجہ سے واقعاتِ سیرۃ کی مکمل توقیتی تشریح ممکن نہیں، اگر مکی تقویم کی بازیافت کر لی جائے تو ہر قسم کی توقیتی اُلجھنیں ختم ہو جائیں گی۔"

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے تحت ہمیں اولاً ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے مختلف توقیتی معیاروں پر ایک سرسری نظر ڈالنا پڑے گی، مگر خاص طور پر مکی نظامِ تقویم کی بازیافت اور مدنی کلینڈر کی ضروری بناوٹ پر غور کرنا ہو گا، اس کے بعد یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ دونوں تقویمیں واقعاتِ سیرۃ پر کس درجہ مؤثر ہیں۔

اس ذیل میں مجھے افسوس ہے کہ میں مارگولیتھ (MARGOLOWTH) کے اس ہمت شکن خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ موجودہ زمانے میں۔

"جاہلی تقویم کا بنانا بہر حال ناممکن ہے جو وسٹنفیلڈ کی پوری تفصیلات کا بدل ہو سکے[1]"

اس لیے کہ اوّل تو اسلام کی ابتدائی تاریخ بڑی حد تک ہمارے سامنے ہے جس میں جاہلی عہد کے بہت سے اشارے ملتے ہیں، دوسرے خود روایاتِ سیرت ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں اور صحیح راستہ متعین کرنے میں مدد دے سکتی ہیں، بنا بریں مجھے مایوسی نہیں بلکہ پوری اُمید ہے کہ مکی نظامِ تقویم کی بازیافت قطعاً ممکن ہے۔

(۲)

اوراقِ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے بہت پہلے عربوں میں توقیتی تصوّرات موجود تھے، اور اگرچہ قدیم عربی کتبات و آثار

---

[1] IT IS NOT HOWEVER POSSIBLE TO MAKE OUT ENOUGH OF THE PRE-ISLAMIC CALANDER TO SUBSTITUTE A DETAILED SCHEME FOR WUSTENFELDS. (MARGOLEATH RISE - P. XIX)

[2] یہ مضمون رسالہ برہان میں مئی ۱۹۶۱ء سے لے کر دسمبر ۱۹۶۱ء تک مسلسل چھپتا رہا ہے۔ اُسے یہاں یکجا کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

میں عام طور پر سنین وشہور نظر نہیں آتے، تاہم جنوبی عرب میں کچھ کتبے ایسے ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی کی ابتدا سے پہلے یہ دستور شروع ہو گیا تھا، چنانچہ یمن میں "مبحوض بن ابحض" (MABHUD BIN ABHAD) کا سنہ جو غالباً ۱۱۵ ق م میں جاری کیا گیا تھا ابرہہ کے زمانے تک رائج رہا اور اس کے ایک کتبے پر موجود ہے۔[1]

مسعودی اور دوسرے علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں میں بڑی کثرت سے سنین رائج تھے، اور ہر قبیلے میں جدا جدا مشہور واقعات یا اکابر کے نام سے شمارِ ایام کیا جاتا تھا[2] حتیٰ کہ غیر ملکی سنہ تک رائج ہو گئے تھے، مثلاً یہودی سنہ یا سنہ سکندری[3] جو اگرچہ یہود و نصاریٰ تک محدود تھے مگر عربی تاریخ پر مؤثر ہیں، میں دوسرے سنوں کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سمجھتا ہوں، مگر ان دونوں سنوں کا تذکرہ چونکہ کئی جگہ آئے گا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے مہینوں کے نام بیان کر دیئے جائیں۔

یہودی سنہ کی ابتداء مذہبی طور پر تو "ماہ نیسان" سے ہوتی تھی، لیکن عام کاروبار میں عرصۂ دراز سے ماہِ تشری پہلا مہینہ شمار کر لیا گیا تھا، اس اعتبار سے مہینوں کی ترتیب حسب ذیل تھی۔[4]

۱۔ تشری ۔ ۷	۵۔ شباط ۔ ۱۱	۹۔ سیوان ۔ ۳
۲۔ حسوان ۔ ۸	۶۔ ادار ۔ ۱۲	۱۰۔ تموز ۔ ۴
۳۔ کسلیو ۔ ۹	۷۔ نیسان ۔ ۱	۱۱۔ آب ۔ ۵
۴۔ تبت ۔ ۱۰	۸۔ ایار ۔ ۲	۱۲۔ ایلول ۔ ۶

یہودی مہینے اگرچہ قمری تھے، لیکن ہر دوسرے تیسرے سال مخصوص عددے دار سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کر دیا کرتے تھے[5] یہ اضافہ جس سال ہوتا، اس میں ماہِ "آدار" کے بعد ایک مہینہ بڑھا دیا جاتا جس کو "وادار" کہتے تھے (دوسرا آدار)[6]

ماہِ تشری کی ابتدا آج کل اُسی رویتِ قمر سے تسلیم کی جاتی ہے جو ۵ ستمبر سے لے کر ۵ اکتوبر تک ہوتی ہے[7] گویا تشری ہمیشا اعتدالِ خریفی میں رہتا ہے۔

یہودیوں کی طرح عرب کے مسیحی قبائل میں بھی ایک علیحدہ سنہ رائج تھا[8] جو خالص شمسی تھا، اُس سن کے مہینوں کے نام اگرچہ

---

[1] ENCYCLOPIADIA OF ISLAM VOL. I 377

[2] مسعودی التنبیہ والاشراف/ ۲۰۲، ۲۰۴، نیز دیکھئے طبری ۲/ ۲۵۳، طبری ۱/ ۹۸

[3] طبری ۱/ ۹۸

[4] BIBLE DICTIONARY BY SMITH VOL II 416.

[5] TALMUD TRACT SANHADRIN نیز دیکھیے ENCY OF ISLAM VOL. III 8561

[6] BIBLE DICTIONARY VOL. II P. 416 [7] دیکھئے (CHAMBERS' ENCYCLOPADIA

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

یہودی تقویم سے حاصل کئے گئے تھے، لیکن طریقۂ تقویم رُومی (JULIUN) اختیار کرلیا گیا تھا، اور مہینے بجائے رویت قمر کے جُو لین حسابات سے شروع ہوتے۔ سنہ کی ابتدا بجائے جنوری کے اکتوبر سے کی جاتی تھی، ذیل میں اس سنہ کے مہینوں کے نام دیئے جاتے ہیں، جو مصر و شام میں آج تک رائج ہیں۔

۱ - تشرین اول - اکتوبر	۵ - شباط - فروری	۹ - حزیراں جون
۲ - تشرین آخر - نومبر	۶ - آدار - - مارچ	۱۰ - تمّوز جلائی
۳ - کانون اول - دسمبر	۷ - نیسان - اپریل	۱۱ - آب اگست
۴ - کانون آخر - جنوری	۸ - ایار - مئی	۱۲ - ایلول ستمبر

ان کے علاوہ متعدد قبائل میں کچھ اور سنین بھی رائج تھے، جن کے نہ صرف مہینوں بلکہ دنوں تک کے نام جُدا جُدا تھے[۱]، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت ملکِ عرب میں کوئی ایک ایسا مرکزی سنہ موجود نہ تھا، جس پر سب کا مَدار ہو۔ پھر جن مقامات پر مخصوص سنہ رائج تھے، وہاں بھی جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

مثلاً ایک زمانے میں اہلِ مکہ بنائے کعبہ سے شمارِ ایام کیا کرتے تھے، پھر بخت نصر کے حملے سے حساب لگایا جانے لگا جس کو عام التفرق کہا جاتا تھا، اس کے بعد عام الغدر جاری کیا گیا[۲]۔ اور سب سے آخر میں "عام الفیل" کی بنیاد ڈالی گئی، چنانچہ سنہ ہجری کی ابتدا تک[۳] مکہ میں یہی سنہ رائج تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سنہ محض مکے یا اس کے قرب و جوار کے لیے مخصوص تھے اور صرف مقامی دینی حیثیت رکھتے تھے، اور

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لیکن البیرونی نے آثار الباقیہ/۱۴۱ (انخاؤ) میں بیان کیا ہے کہ یہودی سال کی ابتدا ایسے چاند سے ہوتی جس کی رویت ۲۷ آب (اگست) سے لیکر ۲۴ ایلول (ستمبر) ممکن ہوتی، تاریخی نقطۂ نظر سے البیرونی کی یہ شہادت بظاہر نہایت اہم ہے اور اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم البیرونی کے زمانے میں یہودی سال ۲۷ اگست سے شروع ہو سکتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ شاید ایران اور عراق کے یہودیوں تک محدود تھا۔ جہاں فصلیں پہلے تیار ہو جاتی ہیں۔ ورنہ شام اور فلسطین کے یہودی اس تاریخ سے ابتداء نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ فلسطین میں جَو کی فصل وسط اپریل سے پہلے تیار نہیں ہوتی جس کی وجہ سے عید فسح کا تیوہار جو ساتویں مہینے (یعنی نیسان) کی ۱۴ تاریخ کو ہمیشہ منایا جاتا اپریل کے ٹھیک ٹھیک ہونا چاہیے، چنانچہ جوزیفس (JOSIPHOS) نے یہودی ماہِ نیسان کو مقدونی مہینے "X ANTHECUS" اور مصری مہینے "PHARMUTII" سے مطابقت دی ہے۔

دیکھیے 5 : III 10 JOSIPHOS ANT --

مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے SMITH BIBLE DIC VOL II P 417 طبری ۹۸/۱

۱ البیرونی آثار/۴۲، ۷۵، نیز دیکھیے ابن سعد ۴۲/۹، طبری ۹۸/۱ ۲ ابن حبیب ۶/، ۷

۳ طبری ۲۵۴/۱۱

کم از کم مدینے میں مہاجرین کے آنے سے پہلے رائج نہ تھے، چنانچہ مسعودی کے بقول اہلِ مدینہ میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے اطام سے — یعنی ان قلعوں یا گڑھیوں سے جو جنگ کی غرض سے بنائی جاتیں[1]، شمارِ ایام کرتے تھے۔

مسعودی کی شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مکے اور مدینے میں قطعی طور پر دو سنہ رائج تھے، اور دونوں شہروں میں شمارِ ایام کے طریقوں میں بیّن فرق تھا۔ بنابریں میں پہلے مکی، تقویم کی بازیافت کی کوشش کروں گا اور بعد ازاں مدنی کلینڈر کی ضروری بناوٹ پر غور کیا جائے گا۔

اہلِ مکہ کا نظامِ سنی

تمام قدیم قوموں میں ماہ و سال کا انحصار محض چاند کی گردشوں پر تھا، یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام زبانوں میں مہینے کے لیے جو لفظ ملتے ہیں اُن سب کا تعلق چاند سے ہے، مثلاً فارسی لفظ "ماہ" اور ہندی مہینہ چاند کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اسی طرح انگریزی لفظ (MONTH) لاطینی (MENSIS) جرمن (MOND) اور (MONAT) اور سنسکرت کے ماسہ (मास) کا تعلق چاند ہی سے ہے[2]۔

یہ خصوصیت آریائی زبانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ سامی زبانیں بھی اس سے مستثنیٰ نظر نہیں آتیں، چنانچہ سال کے لیے عربی لفظ سنہ غالباً "سِن" (SIN) دیوتا کی یادگار ہے، جو تمام سامی قوموں میں چاند کا دیوتا شمار ہوتا تھا[3]۔ اور قدیم بابلیوں میں اس کا لقب الٰہ الثلاثین THE GOD THIRTY تھا[4]۔ جنوبی عرب میں سِن دیوتا کے نام کے حامل متعدد کتبے نکلے ہیں[5]۔

عربی زبان میں سال کے لیے دوسرا لفظ "عام" ہے، اس لفظ کا تعلق بھی چاند سے معلوم ہوتا ہے۔ قدیم عرب چندرماں دیوتا کو "عم" بھی کہتے تھے[6]۔ اسی طرح لفظ تاریخ شاید یرخ سے بنا ہے۔ جو فلسطین میں چاند کو کہا جاتا تھا[7]۔ سب سے بڑھ کر عربی لفظ "شہر" جس کے معنی آج بھی مہینے کے ہیں، قدیم آرامیوں میں، چندرماں دیوتا کا نام تھا جنوبی عرب میں چاند کے لیے عام طور سے استعمال ہوتا تھا[8]۔

---

[1] التنبیہ والاشراف/۲۰۶ [2] DICTIONARY OF THE BIBLE W SMITH VOL II P 415

[3] THE RELIGION OF THE SEMITES - W. R. SMITH P. 532, 659
THE RELIGION OF THE ANCIENT WORLD G. RAWLINSON P. 59, 61
ENCYCLOPAIDIA OF THE RELIGION AND ETHICS VOL P.

خاص طور پر اس کے لیے دیکھیے : ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL. I. P. 379

[4] CHALIDIA RAGAZIN P. 240 [5] ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL I 379

[6] IBIDEP. 379, 380

[7] DIC OF THE BIBLE. 415 طبری اور البیرونی نے لفظ "تاریخ" کا رشتہ فارسی لفظ "ماہ روز" سے جوڑنے کی کوشش کی ہے
اُن کا بیان ہے کہ "ماہ روز" سے مورخ بنا اور "مورخ" سے تاریخ وغیرہ ۔ طبری۔

[8] ARTHUR JEFFERY (FOREIGN VACABULARY, P. 187
نیز دیکھیے مخصص ابن سیدہ ۹/۱۰۶

حقیقت یہ ہے کہ قدیم انسان کو زمانے کا ادراک ہوا تو اس کو سورج کے طلوع اور غروب کے بعد وقت کی سب سے بڑی اکائی جو ملی، وہ صرف چاند کی مقررہ اوقات پر رویت ہی تھی، جو ایک مدّت یا وقفے کے گذرنے اور دوسرے کے شروع ہو جانے کا، گویا ایک قدرتی اعلان تھا، ابتداءً یہی چھوٹا سا وقفہ تمام انسانی ضروریات کے لیے کافی تھا، لیکن انسانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ وقت کا یہ دائرہ تنگ تر ہوتا چلا گیا۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ اب انسان کو شمارِ ایام کے لیے اس سے بڑے وقفے کی ضرورت تھی۔

مسلسل تجربات نے ہمارے اجداد پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ چاند جب بارہ[۱] مرتبہ نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے تو موسم پھر عود کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے بارہ[۱] قمری مہینوں کا یہ وقفہ ایک سال فرض کر لیا گیا اور اس طرح شمارِ ایام میں ایک سہولت پیدا ہو گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سال کو بارہ ماہ[۱] اور ہر مہینے کو چار ہفتوں پر سب سے پہلے وادیٔ فرات کے سامی باشندوں یعنی کلدی بابلیوں (CHALDS BABYLONIANS) نے تقسیم کیا تھا۔[۲] اور ان ہی لوگوں نے ہفتے کے دنوں اور بروج شمسی کے نام رکھے تھے، ہفتے کے سات دن شاید اس لیے مقرر کئے گئے تھے[۳] کہ یہ وقفہ چاند کی ماہانہ گردش کا ایک چوتھائی حصّہ ہے، یعنی (28 = 4×7) اور شاید اسی حساب کے رُو سے عربوں نے منازلِ قمر کی تعداد بھی اٹھائیس قرار دی تھی۔

چونکہ ایک قمری مہینہ از روئے حساب (29.53) دن کا ہوتا ہے اس لیے بارہ قمری مہینے یا ایک قمری سال (29.53×12 = 354.36) دن کا ہوا، لیکن فصلوں اور موسموں کا انحصار گردشِ قمر پر نہیں بلکہ سورج کی اُس ظاہری گردش پر ہے جو (365.24) دن میں تمام ہوتی ہے، اس بنا پر موسمی اعتبار سے، سورج اور چاند کی سالانہ گردشوں میں (10.88) یعنی تقریباً گیارہ دن کا فرق رہتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کمی ایام کے باعث قمری مہینے موسموں کا ساتھ نہیں دے سکتے جس کو پورا کرنا قدیم قوموں کے لیے اشد ضروری تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ قدیم میں ہر قوم کے مذہبی تیوہار اگر ایک طرف مخصوص مہینوں میں مقرر کئے جا چکے تھے تو دوسری طرف یہ بات بھی فرائض دینی میں داخل تھی کہ نائرین جب دیوتاؤں کے پاس حاضر ہوں تو اپنی زرعی اور حیوانی پیداواروں کے اوّلین حاصل بھی پیش کریں۔[۴] اس بنا پر تیوہاروں کے متعین کرنے میں یہ خیال ناگزیر تھا کہ وہ ہمیشہ فصلوں اور موسموں سے مطابقت کرتے رہیں تاکہ

---

[۱] تعجب ہے کہ رومیوں میں ابتداءً صرف ۱۰ قمری مہینوں کا سال ہوتا، یعنی مارچ سے لے کر دسمبر تک (دیکھئے CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL II 641) اس بات کا اندازہ ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے ناموں سے بھی ہوتا ہے "SEPT" سات "OCT" آٹھ "NOV" نو "DEC" دس۔

[۲] RAGOZIN -,CHALIDIA P. 230. 256 [۳] بعض علماء کا خیال ہے کہ ہفتے کے سات دن سبع سیارگان کی مناسبت سے مقرر کئے گئے، یہ خیال اس حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام بلاشبہ سیاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں مگر جہاں تک تعداد کا تعلق ہے یہ خیال شاید صحیح نہیں کیونکہ قدماء نے کرۂ فلک کو ٹھیک اٹھائیس منازلِ قمر پر تقسیم کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہفتہ دائرۂ فلکی کا ٹھیک ¼ ہے۔

[۴] مثلاً یہودیوں میں آج تک دستور ہے کہ ماہِ نیسان میں یعنی پہلے مہینے کی چودھویں تاریخ زوالِ آفتاب اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

یاتری بہ آسانی نذرانے لاسکیں۔

اس سلسلہ میں ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا جاسکتا تھا کہ محض فصلی مشاہدات کے ذریعہ تعیین ماہ کر دیا جائے اور کاہنیت یا پروہت کچھ عرصہ پہلے اعلان کر دیں کہ تیوہار کا مقدس مہینہ کب آنے والا ہے؟ تاکہ اس کے مراسم اجتماعی طور پر ادا ہو سکیں، چنانچہ یہ بالکل ابتدائی اور سادہ طریقہ کار بھی بڑے عرصہ تک جاری رہا۔

البیرونی نے یہودیوں کے ایک فرقے کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان میں عید فسح کا تیوہار منانے کے لیے یہ دستور تھا کہ ایک متدین عالم ۲۳ رشباط کو شہر سے باہر جاتا اور جَو کے کھیتوں کا معائنہ کرتا، اگر جَو کی بالوں میں نوکیں نکل آتیں تو اس تاریخ سے پچاس دن شمار کر کے عید فسح کا تیوہار مقرر کر دیتا۔ ورنہ سالِ رواں میں ایک ماہ کا اضافہ ضروری تھا۔[۱]

ظاہر ہے کہ یہ بالکل ابتدائی اور سادہ طریقہ کار جیسا کہ خود البیرونی کا خیال ہے مقامی اور غیر مرکزی معبدوں کے لیے جتنا آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے مرکزی معبدوں کے لیے جہاں دُور دُور سے یاتری آتے، اتنا ہی دشوار اور ناقابلِ عمل بھی تھا، کیونکہ ہر سال پجاریوں اور پروہتوں کو دُور دراز مقامات تک اعلان کرانا اور اطلاعیں بھیجنا کچھ سہل کام نہ تھا، ضرورت یہ تھی کہ ایک سال قبل عین مندر یاترا کے وقت جبکہ جملہ زائرین موجود ہوں اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ اگلے سال تیوہار کا مقدس مہینہ کب آنے والا ہے؟ تاکہ یاتری ٹھیک وقت پر یاترا کے لیے آسکیں۔

اس مقصد کے لیے ایک دوسرا طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاسکتا تھا کہ ہر تیسرے سال مستقل طور پر ایک ماہ کا اضافہ ہوتا رہے کیونکہ تین شمسی سالوں کے دن (1096) ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں تین قمری سال اور ایک ماہ کے دن 1093 ہوں گے، گویا سال میں صرف ایک دن کا فرق پڑے گا، جو ابتداءً قطعی طور پر غیر محسوس ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرق بڑھتے بڑھتے کچھ ہی عرصہ میں مہینوں اور سالوں کا ہو جائے گا اور صرف تیس سال میں پورے ایک مہینے کا فرق موسموں کو منحرف کر دے گا، جس کے لیے نئے سرے سے اقدامات کی ضرورت ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) غروب آفتاب کے درمیان عید فسح منائی جاتی ہے جس کے لیے بائبل میں یہ حکم ہے "تم اپنے غلّے کے پہلے حاصل میں سے ایک پولا کاہن کے پاس لاؤ اور وہ اپنے خداوند کے حضور ہلائے تاکہ وہ تمہاری طرف سے قبول ہو (احبار ۲۳ : ۴ تا ۱۰، ۱۲)

خود عربوں میں چند رمن دیوتا (عمی انس یا عمیانس) کو ظہورِ اسلام کے وقت تک بھینٹیں دی جاتی تھیں۔ ابن کلبی نے صراحت کی ہے کہ قرآن مجید کی آیات..... "وجعلوا للّٰہ مما ذرأ من الحرث والانعام نصیباً فقالوا ھٰذا للّٰہ بزعمھم و ھٰذا لشرکآئنا" سے مقصد عمیانس کے لیے بھینٹیں ہیں، یقسمون لہ من انعامھم وحروثھم قسماً بینہ وبین اللّٰہ "کتاب الاصنام/ ۴۳ نیز دیکھیے یاقوت ۶/ ۲۲۷

[۱] آثار الباقیہ البیرونی / ۶۹ -

نیز دیکھیے DIC OF BIBLE (SMITH) VOL II P. 416

میور[۱] (MUIR) کا خیال ہے کہ اہلِ مکہ میں یہی طریقہ رائج تھا اور اسی وجہ سے ظہورِ اسلام کے وقت تک موسموں میں تقریباً چھ ماہ کا فرق پڑ چکا تھا۔[۱]

اس کے مقابلے میں ایک تیسرا طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ ہر آٹھ قمری سالوں میں تین ماہ کا اضافہ کر دیا جائے جس سے نتائج میں کم فرق پڑتا ہے کیونکہ آٹھ قمری سال اور تین قمری ماہ کے دن (2923) ہوتے ہیں اور آٹھ شمسی سالوں کے دن تقریباً (2922) ہوں گے۔ گویا آٹھ سال میں تقریباً ڈیڑھ دن کا فرق (1.55) رہتا ہے۔ "البیرونی" کا خیال تھا کہ اہلِ مکہ اسی طریقے پر کاربند تھے۔[۲]

اس سلسلے میں سب سے صحیح طریقہ وہ تھا جو اہلِ یونان نے دریافت کیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۴۳۲ق م میں ایک یونانی ریاضی دان میٹون (METON) نے علمی طور پر یہ اکتشاف کیا کہ قمری مہینے یعنی ۱۹ قمری سال اور سات ماہ، پورے اُنیس شمسی سالوں کے برابر ہوتے ہیں۔[۳] اس لیے اگر اُنیس قمری سالوں میں سات قمری مہینوں کا انضمام کر دیا جائے، تو شمسی اور قمری سالوں کی تعدادِ ایام میں صرف برائے نام فرق رہے گا۔

اس ۱۹ سالہ دور کو جس میں (235) قمری مہینے ہوتے ہیں اصطلاحاً میٹنی دَور (METONIC CYCLE) کہا جاتا ہے۔ یہ اصول چونکہ عملاً سادہ اور فلکی مشاہدات کے اعتبار سے بڑی حد تک غیر تقی تھا، اس لیے خوب مقبول ہوا، اور نہ صرف یونان بلکہ تمام مشرقِ وسطیٰ میں جہاں جہاں بھی قمری سنہ رائج تھے، بحیثیتِ اصول تقویمی تسلیم کر لیا گیا حتیٰ کہ یہود جیسی قدامت پسند قوم نے بھی اپنا لیا چنانچہ البیرونی کے بقول شام و عراق کے یہودی اسی طریقے پر کاربند تھے۔[۴]

ان حسابی اصولوں کے علاوہ زمانۂ قدیم میں ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ محض فلکی مشاہدات پر تقادیم کی بنیاد رکھی جاتی، اور شمارِ ایام میں بروجِ شمسی اور منازلِ قمر (نچھتروں) سے مدد لی جاتی تھی جیسا کہ ہندوستان میں آج تک دستور ہے، لیکن یہ طریقہ غالباً صرف ستارہ شناس قوموں تک محدود تھا کیونکہ اس میں پورے نجومی ادراک کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ طریقے ابتداءً صرف اس لیے اختیار کئے گئے تھے کہ مندروں کی مذہبی حکومتیں اپنی سالانہ آمدنی کو جو زرعی بھینٹوں اور چڑھاووں کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی، بہر صورت برقرار رکھنا چاہتی تھیں اور اس بات پر مجبور تھیں کہ ہر دوسرے تیسرے سال تیوہاروں کو تعویق یا تاخیر میں ڈال دیا جاتے، تاکہ فصلیں تیار ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے انھیں، ہر دوسرے تیسرے ایک "لوند" کا مہینہ بڑھانا پڑتا تاکہ قمری سال فصولِ شمسیہ سے تجاوز نہ کرنے پائیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ "کبیسہ" سالوں کے تعین یا سال

---

[۱] MUIR - LIFE P. CII

[۲] البیرونی کا بیان ہے کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس سال میں نو ماہ کا انضمام کرتے تھے۔ جس کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ($24 = 3 \times 8$) اور ($9 = 3 \times 3$) دیکھیے آثار الباقیہ ۱۲/

[۳] CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL = III P. 226
IBID VOL X 285

[۴] آثار الباقیہ سخاؤ/۱۴۲ - منیز دیکھیے SMITH BIBLE DIC VOL II. P. 416 یہودیوں نے یہ طریقہ ۳۶۰ء میں قبول کیا تھا)

اعلان میں عوام الناس کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا، بلکہ اس مقصد کے لیے مندروں کی مذہبی حکومتوں نے علاحدہ محکمے قائم کر رکھے تھے، جن کے فیصلے اٹل ہوتے۔

رُومیوں میں جُولیَس سیزر (JULIUS CAESER) کے عہد تک یہ اختیار چند ہاتھوں تک محدود رہا جو اکثر و بیشتر اپنے عہدے اور اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور بالعموم ایسا ہوتا کہ کسی خاص شخص سے انتقام لینے کے لیے یا کسی دوست کے فائدے کو مدِ نظر رکھ کر سال کو گھٹا بڑھا دیا جاتا۔ ان بے عنوانیوں کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے کے بعد موسموں اور مہینوں میں سرے سے کوئی مطابقت نہ رہی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جولیَس (JULIUS) کے زمانے میں ایک بار موسمِ بہار کے تیوہار، موسم گرما میں جا پڑے جس کی بنیاد پر قیصر نے اس تقویم پارینہ کو روم سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیا[۱] اور نئی تقویم کے اجراء کا اعلان کیا جس کا قمری مہینوں سے کوئی تعلق نہ تھا، موجودہ مسیحی سنہ اسی جولین سنہ کی یادگار ہے، اور جولائی کا مہینہ قیصر کے نام پر آج تک چلا آ رہا ہے۔

یہودیوں میں بھی سالوں کو کبیسہ قرار دینے یا نہ دینے کا کام ہمیشہ مخصوص ہاتھوں میں رہا اور بجز ناشی (NASHI)[۲] کے جو اُن کا سب سے بڑا عالمِ دین ہوتا، کسی بھی دوسرے شخص کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ کبیسہ سالوں کے تعین کے متعلق کوئی رائے زنی کر سکے۔ صرف ناشِی (NASHI) ہی کو تمام تر اختیارات تھے کہ اعلان کبیسہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، واضح رہے کہ بائبل (BIBLE) میں کبیسہ کا کوئی ذکر نہیں، اور سال کے صرف بارہ ۱۲ مہینے مذکور ہوئے ہیں[۳]۔

عربوں میں ظہورِ اسلام تک تعینِ کبیسہ کا محکمہ بنو کنانہ کے ایک خاندان میں موروثی چلا آ رہا تھا جس عالم کے سپرد یہ خدمت ہوتی، اُسے "قلمّس" یا "ناسی" کہا جاتا تھا[۴]۔ یہ لوگ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے تھے[۵]، اور ان کے تمام فیصلے بالکل اٹل ہوتے، کسی بھی شخص میں یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کے قضایا کو رَد کر سکے۔ "نُساۃ" عرب کی بے عنوانیوں اور اپنے اختیارات تمیزی کے غلط استعمال کا گِلہ نہ صرف اوراقِ تاریخ میں آج تک محفوظ ہے بلکہ قرآن نے اس شکوہ کو حیاتِ دوام عطا کر دی ہے، "یحلونہ عاماً و یحرمونہ عاماً"[۶]

یہی وہ "نُساۃ" تھے جن کے ہاتھ میں اہلِ مکہ کا پورا نظامِ تقویم تھا اور یہی قمری ایّام کو شمسی ایّام میں تبدیل کر کے، ایّامِ حج اور زیارتِ بیت اللہ کا زمانہ متعین کرتے تھے۔

قمری شمسی تقویم کی بالکل ابتدائی غرض یہ ظاہر کی جا چکی ہے کہ مرکزی معبدوں پر ہدایا اور فصلی نذرانوں کی آمد میں دشواریاں نہ

۱؎ CHAMBLRS ENCYCLOPAIDIA VOL ii P.641

۲؎ TALMUD TRACT SAMHEDRIN P. II ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL. III P. 586

۳؎ BIBLE DICTIONARY SMITH MOUTH

۴؎ ...... ویتولی ذالک النساۃ من کنانۃ المعروفون بالقلامیس واحد ھو قلمس وھو البحر العزم ابو ثمامہ جنادہ بن عوف بن امیہ بن قلع بن عباد بن قلع بن حذیفہ وکانوا کلھم نساۃ ۔ آثار الباقیہ/۱۲

۵؎ دیکھیے ابن حبیب

۶؎ قرآن ۹ : ۳۸ -

ہوں، اور تمام اہم تیوہار فصلوں اور موسموں سے مطابقت کرتے رہیں تاکہ مندروں کی سالانہ آمدنی بحال رہے۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ مکے کا معبد دنیا کے قدیم ترین معبدوں میں سے ایک تھا۔ عربوں کا دعویٰ تھا کہ اس کی بنیاد (تقریباً دو ہزار قبل مسیح میں) حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہاتھوں ڈالی تھی، اس دعوے کی تائید قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی ہوتی ہے[۱]۔ اور اگرچہ اس تصور سے بعض یورپی علماء کو انکار ہے[۲]۔

تاہم کچھ صدائیں اس کی موافقت میں بھی بلند ہوتی ہیں، راڈویل (RODWELL) نے آیات (۲ : ۱۲۷ وغیرہ) کی تشریح کرتے ہوئے ایک مستند مصنف کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ "اس بات میں شبہ کرنے کی کوئی بھی معقول وجہ نہیں کہ کعبے کی بنیاد اس طرح پڑی تھی جس طرح قرآن نے بیان کی ہے[۳]" اس دعوے سے قطع نظر، مختلف شہادتوں سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مکے کے معبد کی تاریخ سنہ عیسوی سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی، ہیروڈوٹس HERODOTS نے جو چوتھی صدی قبل مسیح کا مصنف ہے "کعبے" کے معبد کا تذکرہ کیا ہے[۴]۔ ڈائڈورس (DIODORUS SICULUS) نے سنہ عیسوی سے تقریباً پچاس سال پہلے اس عظیم مرکزی معبد کا پتہ دیا ہے[۵]۔ جس کی بنیاد پر میور MUIR اور پالمر (PALMER)[۶] وغیرہ کعبے کی قدامت پر استدلال کرتے ہیں، بہرصورت یہ سب کو تسلیم ہے کہ مکے کا یہ مشہور معبد ظہورِ اسلام سے بہت پہلے پورے عرب کا مرکزی مندر بن چکا تھا اور جن ایام میں یہاں سالانہ اجتماع ہوتے تو پورا عرب ان کے احترام میں ہتھیار رکھ دیتا، مسلسل تین مہینے ہر قسم کی خونریزیاں رک جاتیں[۷]، اور عرب کے گوشے گوشے سے حاجی یہاں پہنچنا شروع ہو جاتے۔

اُپی فینس (EPIPHENAS) نے تقویم کے ایک مہینے کا نام (AGGATHUL "BAITH")[۸] بیان کیا ہے جو غالباً ذوالحجہ[۹] کی ایک شکل ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہاں اطراف و اکناف سے زائرین آتے اور تحائف لاتے، جن کے لیے سازگار موسموں کی ضرورت تھی۔ بلکہ میور (MUIR) کے خیال کے موجب خود ان زائرین کی غذائی ضروریات[۱۰] کے لیے فصلوں اور موسموں کا لحاظ ناگزیر تھا، اس بنا پر ظاہر ہے کہ یہاں شمسی تقویم کے بغیر چارہ نہ تھا، جو معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اجرامی پرستش میں تبدیل ہوتی چلی گئی اور جس کو بالآخر قرآن نے کفر میں زیادتی کا موجب قرار دے کر ختم کر دیا۔ قرآن مجید میں ہے :۔

---

۱ قرآن : ۲ : ۱۲۰ ۲ MUIR-LIFE P.Cii ۳ RODWELL-QURAN P.351

۴ 351 MUIR LIFE P.Cii,Ciii

۵ IBID Ciii ۶ – PALMER QURAN P XVI

۷ MARGOLIOUTH RISE P. 5 ۸ ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM "HAJJ" P. 200

اگرچہ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ مہینہ کسی شمالی معبد کے حج سے متعلق ہوگا۔

۹ حجۃ البیت کی شکل ہے۔

۱۰ MUIR LIFE P. CII

"بیشک مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں "یوم خلق السمٰوٰتِ والارض" کے مطابق ۱۲ مذکور ہوئی ہے، جس میں سے چار[۴] حرام مہینے ہیں۔
یہی قائم رہنے والا دین ہے، سو ان مہینوں میں آپس میں ظلم نہ کرو ...... بلاشبہ "نسی" کا مہینہ کفر میں زیادتی کا موجب ہے، اس سے کافر گمراہ ہوتے ہیں، علاوہ ازیں کسی سال اس کو حرام مہینہ قرار دیتے ہیں اور کسی سال اس کو حلال کر دیتے ہیں تاکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حرام مہینوں کی تعداد میں موافقت پیدا کریں، سو اِس مہینے کو حلال قرار دیتے ہیں، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔"

اِن آیات کی تشریح میں اگرچہ بعض علمائے اسلام نے جو شاید اصولِ کبیسہ سے واقف نہ تھے، لفظ "نسی" کی ایسی تشریحات کی ہیں، جن سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ صرف حرام مہینوں کے حلال کر دینے کا ایک عجیب و غریب طریقہ تھا جو جاہل اور وحشی عربوں نے محض غارت گری کے لیے نکال لیا تھا، لیکن امام رازی نے آیاتِ بالا کی تشریح کرتے ہوئے جو اقوال لکھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قریب الفہم یہ ہے:۔

......لوگوں نے یہ بات جان لی، کہ وہ اپنا حساب قمری سنہ پر مرتب کریں گے، تو حج کبھی گرمی میں جا پڑے گا اور کبھی سردی میں اور حاجیوں کے لیے سفر باعثِ مشقت تھے، اور وہ اُن سے کاروبار اور تجارت میں اس لیے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے، کہ دوسرے شہروں کے لوگ ایسے ہی اوقات میں آسکتے تھے، جو ان کے لائق اور موافق ہوں، اس لیے اُنھوں نے یہ سمجھ کر کہ معاملے کی بنیاد قمری سنہ پر رکھی جائے تو یہ دُنیوی مصالح کے خلاف ہو گا، اس کو ترک کر دیا اور سالِ شمسی کا اعتبار کرنے لگے، چونکہ شمسی سال قمری سال سے ایک معیّن مُدت کے بقدر زائد ہوتا ہے، اس بناء پر "لوند" کی ضرورت پڑی، اس لوند کے باعث اُنھیں دو باتیں حاصل ہوئیں۔

(۱) یہ کہ اُنھوں نے بعض سالوں کو اس بڑھوتری کو کھپانے کے لیے "۱۳" ماہ قرار دیا۔

(۲) یہ کہ حج بعض قمری مہینوں سے دوسرے مہینوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ (تفسیر کبیر ص ۴۳۴-۴۳۵)

اِس تشریح سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اِن آیات کے نزول کے وقت تک (یعنی ۹ھ تک) اہلِ مکہ میں یہ طریقہ رائج رہا، کہ وہ حسبِ ضرورت سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے اپنی قمری تقویم کو شمسی حسابات کے مطابق کر لیا کرتے تھے، جس سال یہ اضافہ ہوتا، وہ سال بجائے بارہ مہینے کے تیرہ[۱۳] مہینے کا شمار کیا جاتا جس کی ممانعت کا اعلان بعد میں قرآن مجید نے ان الفاظ میں ضروری سمجھا:۔

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں مہینوں کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔[۱]"

البیرونی نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عربوں کا یہ طریقہ بعض ایسے حساباتِ فلکی پر مبنی تھا کہ جب قمری سال شمسی سال سے بقدر ایک ماہ چھوٹا ہونے کو آتا تو اس میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے پھر شمسی بنا لیا جاتا۔

---

[۱] ۹: ۳۶

"اور زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ ان کے سال اور شمسی سال میں کیا فرق ہے؟ جو از روئے حساب دس دن اکیس گھڑی اور پانچ پل کا ہوتا اور جب وہ اپنے سنہ میں ایک ماہ کے بقدر ہو جاتا تو وہ اپنے سنہ میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیتے، لیکن یہ عمل اس مفروضے پر کرتے تھے کہ فرق دس دن اور بیس گھڑی کا ہے، اس کام کی انجام دہی قبیلہ کنانہ کے "نساۃ" جن کو قلامس کہا جاتا تھا، کرتے تھے"[1]

البیرونی کے علاوہ دوسرے مؤرخین اور علمائے اسلام نے بھی عربوں کے طریقۂ نسی کی بہت کچھ وضاحتیں کی ہیں، جن کا تذکرہ میں بعد میں کروں گا، یہاں مجھے البیرونی اور البیرونی کے بعض متبعین کی ایک خاص تاریخی غلطی کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ البیرونی کا خیال تھا کہ اہل مکہ نے ظہورِ اسلام سے تقریباً دو سو سال پہلے یہ طریقہ یہودیوں سے سیکھا تھا۔[2] چنانچہ میور MUIR نے شاید اسی خیال کو قبول کر کے اس پر اتنا اور اضافہ کر دیا کہ اہل مکہ بالالتزام ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر کے قمری ایام کی کمی پوری کر لیا کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کا سال شمسی سال کے مقابلہ میں بقدر ایک یوم چھوٹا رہتا۔[3]

یہ دونوں خیال تاریخی نقطۂ نظر سے بالبداہت غلط معلوم ہوتے ہیں۔ البیرونی کا قول تو خود آثار الباقیہ کی تصریحات سے غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربوں نے یہ طریقہ یہودیوں سے حاصل کیا تھا تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان دونوں کے طریقۂ حساب میں بھی مشابہت تھی، اور یہ دونوں ایک ہی اصول پر مبنی تھے۔ حالانکہ خود البیرونی نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اہل مکہ ہر چوبیس سال میں نو ماہ کا اضافہ کرتے تھے۔[4] جب کہ یہودیوں میں ہر انیس سال میں سات ماہ کے اضافے کا دستور تھا۔[5]

رہا میور (MUIR) کا خیال کہ عرب ہر تیسرے سال (بلا کسی حسابی اُلجھاؤ کے) ایک ماہ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے، تاریخی اعتبار سے بالکل بے سند ہے، بلکہ اوراقِ تاریخ میں اس کے خلاف پیہم شہادتیں ملتی ہیں (جن کو آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے) یہاں البیرونی کی یہی شہادت کہ اہل مکہ ہر چوبیس ۲۴ سال میں نو ماہ کا اضافہ کرتے تھے، پیش کی جا سکتی ہے۔[6]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ENCYYCLOPAEDIA OF ISLAM) میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عربوں نے اپنا طریقۂ نسی یہودیوں سے حاصل کیا تھا جو نہ صرف عربوں میں بلکہ خود یہودیوں میں بھی ظہورِ اسلام کے وقت تک بے قاعدہ

---

[1] آثار الباقیہ /۱۲

[2] البیرونی کا قول ہے :- وکان اخذ ذالک من الیہود قبل ظہور الاسلام تقریب من مائتی سنۃ آثار الباقیہ /۱۲ نیز دیکھئے قانون مسعودی /۹۲

[3] MUIR - LIEF C II

[4] ...... کانوا یکبسون کل اربع وعشرین سنۃ قمریۃ بتسعۃ اشھر" آثار الباقیہ /۱۲

[5] آثار الباقیہ نسخۂ (SACHAW) /۱۳ [6] آثار الباقیہ /۱۲

حسابات پر مبنی تھا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے متعلق ہمارے بعض علماء کا یہ تصور کہ وہ قطعاً جاہل اور ابتدائی علوم تک سے بے بہرہ تھے۔ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تاریخی مسائل کو حل کرتے وقت بھی اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ مستشرقین سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی اور عرب جاہلیت کے تمام تر نجومی تصورات جن کے حوالے اوراقِ تاریخ میں جگہ جگہ بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہیں[2] محض اس مفروضے پر نظر انداز کر دیئے گئے، کہ ان میں ذاتی طور پر صلاحیتِ تقویم موجود نہ تھی۔

یہ اسی ابتدائی غلطی کا نتیجہ تھا کہ علمائے یورپ اس معمولی مسئلہ (مسئلۂ تقویم کو) حل نہیں کر سکے، حالانکہ جاہلی روایات و آثار کی مدد سے یہ بات اس وقت بھی ممکن تھی اور آج بھی ممکن ہے۔ اس بات کی تردید کہ عربوں کا طریقۂ نسی محض یہودیوں کی بے ضرر تتبع و تقلید پر مبنی تھا، خود قرآن مجید کے ان الفاظ سے ہو جاتی ہے:۔

"بلاشبہ نسی کفر میں زیادتی کا موجب ہے، ایک سال اس کو حلال کر دیتے ہیں اور ایک سال حرام"[3]

جس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسی کا یہ طریقہ کفر و شرک میں زیادتی کا موجب تھا اور اس میں یہودیت کی بجائے اجرام پرستی کے عناصر اور مشرکانہ خیالات کو بڑا دخل تھا، جو اس وقت پورے عرب پر چھائے ہوئے تھے۔

جاہلی عربوں کی دینی تاریخ کے ابتدائی اوراق سے لے کر آخری سطور تک اس بات کی شاہد ہیں کہ تمام سامی قوموں کی طرح ان میں اجرام سماوی کی پرستش کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل رہا ہے[4] کتبات اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب چاند، سورج، عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل، شعریٰ (عشتار) نسر[5] حتیٰ کہ منازل[6] قمر تک کی پرستش کرتے۔ ان کی عیدیں مناتے اور زرعی و حیوانی پیداواروں میں اُن کے حصے مقرر کرتے تھے۔[7] تقریباً تمام بڑے بڑے معبود، آسمانی معبود تھے۔ لات[8]، مناۃ اور عزیٰ کی تثلیث غالباً اجرامی تثلیث تھی، ہبل شمسی دیوتا تھا۔[9] سورج کی پرستش بڑے قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی، جس کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح تقریباً سب کے سب مندر اجرامِ فلکیہ کے ہیکل ثابت ہوتے ہیں۔ بیتِ غمدان کو زہرہ کا ہیکل بتایا

---

[1] ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL III P. 856

[2] ENCYCLOPAEDIA OF RELEGION AND ETHICS P. 660

[3] قرآن ۹ : ۳۷ [4] خود سر ولیم میور کا بھی خیال ہے کہ عربوں میں صابیت یا ستارہ پرستی کا رواج نہایت قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی رائے میں کعبہ کا سات بار طواف اسی ستارہ پرستی کی سنّت ہے۔ نیز ملاحظہ ہو۔

ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS P. P. 660 ARABS ANCIENT.

[5] ان سب کے لیے دیکھئے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL I ARABS.

[6] کتاب الاصنام تکملہ احمد زکی پاشا [7] ایضاً ذکر عمیانس / ۴۳ [8] ROBERTSAN SMITH 56.

[9] ROBERTSAN SMITH RELIGION OF SMITIS

جاتا ہے[۱]

"ذوالخلصہ" اور طائف کا بیت اللات شمسی ماتا دیوی لات کا مندر تھا۔[۲] خود بنائے ابراہیمؑ یعنی کعبے کے متعلق یہ تصورات تھے کہ یہ حقیقتاً زحل کا ہیکل تھا جس کو بانی اوّل نے مخصوص طوالع میں تعمیر کیا تھا۔[۳]

قطع نظر اس سے نہایت ہی قدیم زمانے سے لے کر ظہورِ اسلام تک عربوں میں ادیانِ شمسیہ کے آثار جگہ جگہ پائے جاتے ہیں، قرآن مجید کی شہادت کے بموجب ملکۂ سبا "آفتاب پرست تھی"[۴] مورخینِ عرب قوم سبا کے مورث کا نام عبدالشمس بتاتے ہیں[۵] عہدِ رسالت تک بنو تمیم سب کے سب آفتاب پرست تھے[۶] اور ان کے یہاں آفتاب کا ایک علیحدہ مندر بھی موجود تھا۔ "بنو اُدّ، بنو ضبّہ" عُم، عدی، عکل اور ثور سب کی پرستش کرتے تھے[۷] اور شاید بنو اُدّ کا سلسلۂ نسب بھی سورج دیوتا سے ملتا تھا کیونکہ زمانۂ قدیم میں اُدّ (UD)[۸] سورج کو کہا جاتا تھا، خود قریش کے مشاہیر اور اجداد میں اُدّ اور عبدالشمس جیسے نام ملتے ہیں۔

یونانیوں کا مشہور دیوتا "اپالو" (APOLO) تھا جو سورج کا مظہر خیال کیا جاتا تھا، اس کی ماں کا نام "لیٹو" (LETO) یا لیٹونا (LETONA) مشہور ہے، موجودہ زمانے کے علماء کا فیصلہ ہے کہ ان دونوں دیوتاؤں کی اصلیت عرب ہے، جو ریگستانِ عرب سے سفر کر کے یونان پہنچے تھے۔[۹] ان علما کی رائے میں اپالو (APOLO) "ہبل" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور لیٹو (LETO) لات کا یونانی تلفظ، کہتے ہیں اسی سورج دیوتا کی قیمتی مورتی جو عقیق[۱۰] سُرخ کی بنی ہوئی تھی، عین خانۂ کعبہ میں سب سے بلند مقام پر رکھی تھی، اور اس کے جلو میں لات، منات، عزّیٰ کی اجرامی مورتیاں نصب تھیں[۱۱] ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت خود کعبہ "بیت اللہ"

---

[۱] ...... "ومنها بيت عندان الذى بمدينة صنعا اليمن بناه ضحاك على اسم الزهره" شہرستانی/۲۳۲۔

[۲] لات کے لیے دیکھئے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL. III P. 18-RELIGION OF SMITES P. 520, 56

[۳] ...... "وبهذا الغرض كذب من قال ان بيت الله الحرام انما هو بيت زحل بناه البانى الاول على طوالع معلومة واتصالات مقبولة وساع مبيت زحل" شہرستانی ۱/۳۱م

[۴] قرآن: [۵] ابن حبیب/۳۶۲

[۶] ابن حبیب/۳۱۶   [۷] M. RAGOZIN CHALIDIA P-171   [۸] دیکھئے ابن خلدون ۱/۳۲۳

[۹] BUT WE MAY POINT OUT IN CONCLUSION THAT IN ALL PRORATUS THE GREEKS BORROWED FROM ARABIA AT AN CARLY PERIOD THRONGH SOUTH ARABIAN IN CENCE MERCHENTS THERI APOLLO AND HIS MOTHER LETO (LATINFORM) LONTONA- (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL I P. 380

[۱۰] یاقوت ۸/۴۳۳م، نیز دیکھئے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL ii 327

[۱۱] ابوعبیدہ کا بیان ہے "كانت اللات والعزى ومناة اصناما من حجارة فى جوف الكعبة"

مثیر العزم ابن جوزی/۱۱۳

سے زیادہ "بیت الاجرام" بنا ہوا تھا۔

بخاری میں ہے کہ فتح مکہ سے پہلے کعبے کے گرد (۳۶۰) مورتیاں نصب تھیں[1] ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عین مُطاف کے اندر بتیں اور سیسہ پلا کر جما دی گئی تھیں[2]۔ جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ مورتیاں پتھر کی نہ تھیں بلکہ فلزی چھوٹے چھوٹے اصنام تھے جن کو کعبے کے گرد نصب کیا گیا تھا، اوّل تو یہ "۳۶۰" کا عدد جس سے خود بخود ہمارا ذہن، ایک دائرہ یا کرۂ فلکی کے (۳۶۰) درجات کی طرف منتقل ہوتا ہے (جس میں سُورج کی گردش ہوتی ہے) دوسرے یہ کہ ان مورتیوں کے عین وسط میں "ہُبل" یعنی سورج دیوتا کی مُورتی کا ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ غالباً ان سب کا تعلق دائرۂ فلکی ہی سے تھا، جو اجرام پرستوں کے طواف کے لیے ایک مقدّس "نشانِ راہ" کا کام دیتے تھے،

ظہورِ اسلام کے وقت عربوں میں فلکیات کا درک اچھا خاصا نظر آتا ہے، چنانچہ ان کتابوں سے قطع نظر جن میں خاص طور پر اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے، خود قرآن مجید سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ جاہلی عربوں میں نجومی اِدراکات بہ ہمہ وجوہ موجود تھے اگرچہ اس مقدس کتاب نے جاہلی عربوں کے علوم و فنون اور ارتقائے تہذیب و تمدن کے موضوع کو نہیں چھوا ہے، تاہم جس طرح ہر کتاب میں اپنے عہد اور ماحول کی کچھ نہ کچھ عکاسی ہوتی ہے اور ایسی باتیں آجاتی ہیں جو اس زمانے میں بیشتر رائج اور متداول ہوتی ہیں، اسی طرح قرآن میں بھی، بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں، جن کا تعلق جاہلی سماج کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے تھا چنانچہ اپنے عہد کے علومِ فلکیہ کے متعدد حوالے قرآن میں موجود ہیں۔

مثلاً قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ عرب نہ صرف منطقۃ البُروج سے واقف تھے[3] بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سُورج اور چاند کس طرح حرکت کرتے ہیں[4]؟ اور مُستقر الشمس کہاں ہے[5]۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ منجمین عرب سورج کے دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں[6] یعنی سرمائی اور گرمائی مطلع سے واقف تھے، (گویا خطوط جدی اور سرطان کا انھیں علم تھا) سیاروں کی اُلٹی اور سیدھی[7] رفتار (استقامت اور رجعت) سمجھنا مشکل ہے، مگر وہ سمجھتے تھے، آسمان پر سبع سیارگان کے مدار الگ الگ ہیں، ان مداروں سے عربوں کو پوری واقفیت تھی، اور غالباً اسی وجہ سے انھوں نے افلاک کی تعداد سات قرار دی تھی جس کو "سبع[8] طرائق" یعنی (سات راستے یا مدار) بھی کہا

---

[1] بخاری / تجرید بیان فتحِ مکہ — [2] ابن ہشام ۵۹/۴

[3] قرآن: ۱۵:۱۶، ۲۵:۶۱، ۸۵:۱، علمائے لغت کے نزدیک لفظ "بروج" بَرَج سے مشتق ہے جس کے معنی "ظاہر ہونا" ہیں۔ (دیکھئے بیضاوی نیز لسان العرب ۳/۳۳) لیکن بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اس کی اصل یونانی یا لاطینی (BURGUS) ہے جو فصیلِ شہر کے منارہ کو کہتے تھے۔ (JEFFRY) اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی جاہلی علم ہیئت و نجوم پر یونانی اثرات موجود تھے۔

[4] ۲۵ : ۶۱ — [5] ۳۶ : ۳۸ - نیز دیکھیے کتاب للانوار — [6] ۵۵ : ۱۷، نیز دیکھیے کتاب الانوار / ۱۴۱ -

[7] قرآن ۸۱ : ۱۶ — [8] ۲۳ : ۱۷ ؍

جاتا تھا، ان آسمانوں میں سے ایک کو ہماری زمین سے متعلق قرار دیتے تھے[1] غالباً یہ بات بھی اُن کے علم میں تھی کہ "کسوفِ شمسی" اجتماعِ نیرین[2] کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مواقع النجوم[3] یا دوسرے الفاظ میں اُن عقدوں سے بھی واقف تھے جن سے خاص خاص ستارے شناخت کئے جاتے ہیں، علم نجوم کا آخری یا شاید پہلا شاہکار جنم کنڈلیاں[4] اور زائچہ سازی ہے، عرب اس معاملے میں بھی پیش پیش تھے اور انسانی قسمتوں کو گردشِ افلاک سے وابستہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، سمندر میں جہاز رانی اور صحرا میں شتربانی دونوں یکساں حیثیت رکھتی ہیں اہلِ عرب ان دونوں کو سر کرنے میں "قطب" اور دوسرے ستاروں سے مدد لیتے[5]۔ منازلِ قمر یا الزائے فلکیہ کا علم تو شاید بہت ہی صحیح تھا، کیونکہ ہر شخص کی ضروریات اُن سے وابستہ تھیں اور تقویم کا کلیۃً مدار انھیں پر تھا[6]۔

خود قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کی تقویم پورے طور پر، بروج اور منازلِ قمر سے وابستہ تھی اور کیوں نہ ہوتی، اس لیے کہ ان کی تمام تر عبادات کا انحصار مخصوص طوالع، صحیح اوقات اور مقررہ ساعتوں پر تھا، قرآن مجید میں ہے:۔

"مبارک ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بُرج بنائے، اور ان میں سراج یعنی سورج، اور نورانی چاند کو مقرر کیا۔" (۲۵ : ۶)

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کے نزدیک سورج اور چاند بروجِ فلکی میں مقررہ حرکتیں کرتے رہتے تھے، ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:۔

"اور چاند کے لیے ہم نے ٹھیک اندازہ کے مطابق منازل مقرر کر دیں، حتّٰی کہ وہ سوکھی ٹہنی کی شکل میں عود کرتا رہتا ہے" (ہلال کی شکل اختیار کر لیتا ہے) (۳۶ : ۳۹)

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک چاند کی مختلف شکلیں (ہلال سے لے کر بدر تک اور بدر سے لے کر دوسرے ہلال تک) انھیں منازل کے اندر مقررہ حسابات کے تحت تبدیل ہوتی رہتی تھیں، تیسری جگہ ان منازل سے سنین اور شہور کا تعلق نہایت ہی واضح طور پر ظاہر کیا گیا ہے:۔

"(اللہ کی ذات) وہ ہے، جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا، اور اس کی منزلیں ٹھیک اندازے کے مطابق مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان سکو۔" (۱۰ : ۵)

جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ عربوں میں ماہ و سال نہ تو میٹونی دور (MOTONIE CYCLE) کے پابند تھے، اور نہ ان میں یہودیوں کے طریقۂ کبیسہ کی کوئی منزلت تھی، بلکہ عربی سنین و شہور کا تعلق صرف بروج اور منازلِ قمر کے صحیح حسابات پر تھا، یعنی ہندوؤں کی طرح راسوں اور نچھتروں پر جس کی وجہ سے ان کے حسابات کو زیادہ صحیح ہونا چاہیئے۔

دنیا کی مشرک قوموں میں اجرامِ سماوی کی پرستش کرنے والوں کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل ہے، جو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگر دیکھا جائے تو ان کے عجیب و غریب توہمات نے ہمارے موجودہ علم ہیئت کی بنیاد آج سے ہزاروں سال پہلے

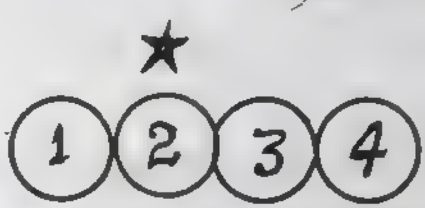
۱؎ ۶:۳۷ ۲؎ ۸؛۷۵ ۳؎ ۶:۷۵ ۴؎ ۵:۵۵، ۶:۴۸ ۵؎ ۶:۹۷ ۶؎ ۵:۱۰

رکھ دی تھی، نہ صرف یہ کہ سورج اور چاند کی سالانہ رفتار، منازلِ قمر کا پورا پورا البُعد، بروج میں نیّرین کے ٹھیک ٹھیک مقام دریافت کرنے کے اصول، کسوف و خسوف دریافت کرنے کے قاعدے، سیاروں اور ستاروں کے سالانہ اُتار چڑھاؤ انھیں لوگوں نے دریافت کئے، بلکہ موجودہ علمِ ہیئت کے ۸۰ فی صدی اصول آج بھی وہی ہیں جو ہزاروں سال پہلے رائج کر دیئے گئے تھے۔

"بروج" اور "منازل" کی تقویمی افادیت سمجھنا کچھ زیادہ پیچیدہ یا مشکل مسئلہ نہیں، اور اگر ہم طلوعِ فجر سے کچھ پہلے یا غروبِ آفتاب کے کچھ بعد (ایک خاص وقت مقرر کر کے) اس بات کا مشاہدہ شروع کر دیں کہ اُفقین اور سمت الراس پر کون کون ستارے موجود ہیں اور ان ستاروں کو اچھی طرح شناخت کر لیا جائے تو چند ہی روز میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان ستاروں کے ارتفاع میں مسلسل فرق پڑ رہا ہے اور ان کے مقامات بہم تبدیل ہو رہے ہیں، مشرق سے کچھ نئے ستارے طلوع ہوتے معلوم ہوں گے اور مغرب میں ان کے متقابل ستارے دیکھتے دیکھتے غروب ہو جائیں گے، سمت الراس پر آج جو ستارے تھے، وہ چند ہی روز میں مغرب کی جانب جھکے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ مشاہدہ اگر مسلسل جاری رہے تو اُفقین اور سمت الراس پر ستارے بالکل بدل جاتے ہیں، اور جن ستاروں سے مشاہدہ شروع کیا گیا تھا وہ کہیں سے کہیں نکل چکتے ہیں اور ساتھ ہی موسم بھی بدلتا محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً موسمِ بہار میں جو ستارے غروبِ آفتاب کے وقت اُفقِ مشرق کے قریب نظر آتے ہیں وہ موسمِ گرما میں شام کے وقت سمت الراس میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کی جگہ کچھ نئے ستارے طلوع ہونے لگتے ہیں۔ اُفقِ مغرب میں جو ستارے تھے، وہ بالکل نظر نہیں آتے بلکہ ان کی جگہ وہ ستارے لے لیتے ہیں جو سمت الراس میں مشاہدہ کئے گئے تھے، اس سے اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سورج ستاروں میں اپنا مقام بدلتا رہتا ہے تو دوسری جانب یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسی تبدیلی کا اثر موسموں اور فصلوں پر بھی پڑتا ہے۔

اگر دن کے وقت ستارے نظر آ سکتے تو سورج کی یہ حرکتِ مجازی ایک ہی دن میں نظر آ جاتی، فرض کیجئے کہ ۲۰ اگست کی صبح کو ہمیں قلب الاسد (REGULUS) نظر آ سکتا تو ہم دیکھتے کہ سورج تارے سے تھوڑا جنوب و مغرب کو ہے، یہ مشاہدہ اگر تمام دن جاری رہتا تو شام کو ستارہ سورج سے شمال میں نظر آتا۔



دوسرے دن صبح کو سورج ہمیں ③ پر نظر آتا اور شام ہوتے ہوتے ④ پر پہنچ جاتا[1] اس طرح کچھ ہی دن میں سورج اور ستارے کا بُعد بڑھتے بڑھتے کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا۔

چونکہ سورج دن بھر میں اپنے قطرِ مرئی کے برابر فاصلہ طے کر لیتا ہے اس لیے سورج کی ستاروں میں یہ رفتار آسانی سے نظر آ سکتی

---

[1] ہیئتِ جدید ۱/۱۵

تھی، ایک مشکل یہ ہے کہ دن کے وقت ستارے نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے سورج کا صحیح مقام دریافت کرنے کے لیے دوسرے وسائل اختیار کرنا پڑتے ہیں تاکہ فصلی پیش بینی سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔

قدیم قوموں نے اس سلسلے میں متعدد طریقے اختیار کئے تھے جن میں سب سے زیادہ سہل طریقہ یہ تھا کہ چاند کی مختلف رویتوں کے ذریعہ سورج کا صحیح مقام دریافت کیا جائے کیونکہ ان دونوں میں ایک خاص اور قریبی تعلق ہے۔

ستاروں میں سورج جس راستے سے گزرتا نظر آتا ہے اُسے اصطلاحاً طریق الشمس یا مدارِ شمسی (ECLIPTIC) کہا جاتا ہے، یہ راستہ کرۂ فلکی میں ایک "دائرۂ عظیمہ" (GREAT CIRCLE) بناتا ہے جس کو سورج پورے ایک سال یعنی (¼ 24-365) دن میں طے کرتا ہے، مدارِ شمسی کے اردگرد جو "مجامع النجوم" ہیں ان کو بروج" کہا جاتا ہے، جاہلی منجمین نے منطقۃ البروج ZODIACAL BELT کو ۱۲ مہینوں کی مناسبت سے ۱۲ حصوں میں تقسیم کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ سورج ہر "برج" میں ایک ماہ رہتا ہے، ان بروج کے نام حسب ذیل تجویز کئے گئے تھے :-

(۱) حمل (۲) ثور (۳) جوزا (۴) سرطان (۵) اسد (۶) سنبلہ (۷) میزان (۸) عقرب (۹) قوس (رامی) (۱۰) جدی (۱۱) دلو (۱۲) حوت[۱]۔

چونکہ چاند کا مدار، مدارِ شمسی سے تھوڑا مختلف ہے اور کچھ اس طرح واقع ہے کہ یہ دونوں مدار ایک دوسرے پر پانچ درجے کا زاویہ بناتے ہیں، اس لیے مدارِ قمری، مدارِ شمسی کو دو مقامات پر قطع کرتا ہے یہ دونوں مقام عقدتین (NODS) کہلاتے ہیں، عرب ان میں سے ایک عقدے کو "راس" اور دوسرے کو "ذنب" کہتے تھے، جس نقطے پر چاند "منطقۃ البروج" کے جنوب سے شمال کو گذرتا ہے۔ اس کو "راس" کہا جاتا ہے اور دوسرے کو "ذنب" چاند اپنی ماہانہ گردش میں ۱۴ دن منطقۃ البروج سے شمال کی جانب رہتا ہے، اور ۱۴ دن جنوب کی طرف، علاوہ ازیں سورج اور چاند کی رفتار میں بھی بیّن فرق ہے، یعنی سورج جتنا فاصلہ ۱۳ دن میں طے کرتا ہے چاند اسی فاصلے کو تقریباً ایک دن میں ختم کرلیتا ہے۔ اس لیے منجمینِ عرب نے چاند کی یومیہ رفتار کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی منزلیں علیحدہ مقرر کی تھیں۔ یہ منزلیں بھی اگرچہ منطقۃ البروج ہی کے بعض مخصوص ستاروں کو انتخاب کرکے مقرر کی گئی تھیں، لیکن عربوں نے ان کی تعداد ۲۸ قرار دی تھی، گویا ہر برج میں ⅓۲ منزلیں شمار کی جاتی تھیں، ان منازل کے نام حسب ذیل ہیں :-

(۱) شرطان (۲) بطین (۳) ثریا (۴) دُبران (۵) ہقعہ (۶) ہنعہ (۷) ذارع (۸) نثرہ (۹) الطرف (۱۰) جبھہ (۱۱) زبرا، (۱۲) صَرفہ (۱۳) اعوا (۱۴) سماک (۱۵) غفراء (۱۶) زبانی (۱۷) اکلیل (۱۸) قلب (۱۹) شولہ (۲۰) نعائم (۲۱) بلدہ (۲۲) سعدذابح (۲۳) سعدبلع، (۲۴) سعدالسعود (۲۵) سعدالاخبیہ (۲۶) فرغ مقدم (۲۷) فرغ موخر (۲۸) رشا[۲]

جاہلی منجمین کی تصریحات کے بموجب سورج سال بھر میں ان منازل کو اس طرح طے کرتا کہ سوائے "جبھہ" کے ہر منزل میں ۱۳ دن لگتے،

---

[۱] کتاب الانواء/ ۱۲۱ کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/ ۷۰ نیز دیکھیے مخصص ابن سیدہ ۹/ ۱۲، ۱۴ :

[۲] کتب الانواء/ ۱۲، آثار الباقیہ (سخاؤ) / ۳۵۱، ۳۵۲ - الازمنہ والامکنہ ۱/ ۱۸۶ مخصص ۹/ ۹ ؛

صرف "جبھہ" میں ۱۴ دن شمار کئے جاتے تھے[1]۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک شمسی سال عمومی طور پر ۳۶۵ (تین سو پینسٹھ) دن کا تسلیم کیا جاتا تھا[2]۔ کیونکہ ۲۸ منازل کو اگر ۱۳ دن سے ضرب دی جائے اور جبھہ کا ایک دن بڑھا دیا جائے تو جواب تین سو پینسٹھ (28 X 13 + 1 = 365) آئے گا۔

یہ گویا منجمین جاہلیت کا نجومی سال تھا جس کا تعلق رویتِ ہلال سے نہ تھا؛ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ان کے سالانہ حسابات کا مدار محض سورج کی گردشوں پر تھا اور قمری مہینے رائج نہ تھے بلکہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ منجمینِ جاہلیت خود سورج کے صحیح مقام کا اندازہ چاند کی مختلف رویتوں کے مشاہدے سے کرتے تھے کیونکہ چاند کے منور حصے کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس تاریخ کا چاند ہے؟ اور سورج اور چاند میں اس وقت کتنے درجے کا بُعد ہو چکا ہے۔

مثال کے طور پر چاند بحالتِ بدر سورج کے عین بالمقابل تقریباً ۱۸۰ درجے کا زاویہ مستقیم بناتا ہے۔ سات یا آٹھ تاریخ کو اس کی شکل "دونیم" ہو جاتی ہے جس کو اصطلاحاً "تربیع" کہتے ہیں اور سورج، چاند اور زمین کا زاویہ تقریباً ۹۰ درجے کا ہوتا ہے، اسی طرح ۳ تاریخ کو سورج اور چاند کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۴۰ درجے کا ہوتا ہے، اس لیے چاند جب کسی تاریخ کو ان منازل میں نظر آئے گا تو ہم چاند کے صرف منور حصے اور اس کے گرد و پیش کے ستاروں کو دیکھ کر سورج کا صحیح مقام دریافت کر سکتے ہیں اور پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت سورج کس بُرج یا منزل میں موجود ہے جس کے نتیجے میں موسمی اور فصلی کیفیات کیا ہونا چاہئیں، چنانچہ ابن قتیبہ، مرزوقی اور البیرونی وغیرہ نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ منجمینِ عرب ان نچھتروں کی مدد سے موسمی حالات اور فصلی تبدیلیوں کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے تھے اور ان کی تمام تر فصلی اور موسمی پیشین گوئیوں کا انحصار انہیں منازل یا انواء فلکیہ کے مشاہدات پر تھا۔

مثلاً اعتدالین (EQUINOXES) کا اندازہ وہ منزل شرطان کے طلوع اور سکوت سے لگاتے تھے جو ان کے نزدیک پہلی نو تھی، جب سورج اس نوء میں داخل ہوتا تو یہ اعتدالِ ربیعی VERNAL EQUINOX کا زمانہ سمجھا جاتا، اور جب چاند بحالتِ بدر اس منزل میں قدم رکھتا تو اعتدالِ خریفی AUTUMNAL EQOINOX کا، — دونوں حالتوں میں دن رات برابر تسلیم کیے جاتے۔

چنانچہ ایک منجم کہتا ہے :-

"اور جب سورج شرطان میں داخل ہوتا ہے تو زمانہ اعتدال ہوتا ہے، اور دن رات برابر ہو جاتے ہیں"[3]

ایک اور جاہلی منجم کا قول ہے :-

"جب شرطان طلوع ہوتی ہے تو زمانہ مساوی ہو جاتا ہے"[4]

---

[1] کتاب الانواء/۷، قزوینی عجائب/۴۲، [2] ..... قال ابو اسحٰق الزجاجی ان السنة اربع اجزاء کل جزء منها سبعة انواء، کل نوء منها ثلاثة عشر یوماً و یزداد واحد فیها یوماً لتتم السنة ثلثمائة وخمسة وستين يوماً وهو المقدار قطع الشمس فلک البروج۔ قزوینی/۵۱ (4 × 7 × 13 + 1 = 365)

[3] ..... فاذا حلت الشمس بینهما اعتدال الزمان واستوی اللیل والنهار قزوینی/۴۲ ؛

[4] "اذا طلع الشرطان استوی الزمان" ابن قتیبہ/۱۸

عربوں کے نزدیک "شرطان" برجِ حمل" کے ابتدائی تاروں کا نام ہے، بلکہ یوں کہئیے کہ برجِ حمل" کی ابتدا اسی "شرطان" سے ہوتی تھی، ہیئت دان کہتے ہیں کہ یکشنبہ ۲۲ مارچ ۲۸۵ء کو ۲۳ بجکر ۱۸ منٹ پر (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے بموجب) "نقطۂ اعتدالِ ربیعی" (VERNALE QUINOX) اور "راس الحمل" (FIRST POINT OF AROIS) یعنی "شرطان" ایک دوسرے سے بالکل مطابق تھے[1]۔

اس پر اتنا اور اضافہ کیجئے کہ موجودہ حسابات کی روشنی میں بھی سورج ۲۱ مارچ کو نقطۂ اعتدالِ ربیعی پر ہوتا ہے اور ابن قتیبہ نے سورج کے شرطان میں داخلے کی تاریخ بھی یہی بیان کی ہے:

"اور آفتاب کا شرطان میں داخلہ ماہ آزار (یعنی مارچ) کی بیس راتیں گزار کر ہوتا ہے[2]"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربوں کا مندرجہ بالا اصول کہ سورج جب "شرطان" میں داخل ہوتا ہے تو دن رات برابر ہو جاتے ہیں، شاید ۲۸۵ء کی یادگار ہے، جب کہ نقطۂ اعتدالِ ربیعی اور منزلِ شرطان میں بُعد نہ تھا[3] اس خیال کی تصدیق خود البیرونی کی اس شہادت سے ہوتی ہے کہ شرطان سے منازلِ قمر کی ابتدا صرف عرب کرتے تھے ورنہ دوسری قوموں میں ثریا سے ابتداء کی جاتی ہے[4]۔

عرب طلوع اور سقوط "شرطان" دونوں سے حساب لگاتے تھے کیونکہ جب چاند بحالتِ بدر اس منزل میں داخل ہوتا تو پھر دن رات برابر ہو جاتے، اس وقت سورج، چاند کے عین بالمقابل برجِ میزان میں ہوتا یعنی ۲۲ ستمبر کو جو "اعتدالِ خریفی (AUTUMNAL EQUINOX) کا زمانہ ہوتا ہے اور یہی سقوط "شرطان کا زمانہ سمجھا جاتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان منازل کی ترتیب اور تعیین میں جاہلی عربوں نے نہایت ہی صحیح فلکی حسابات کو پیشِ نظر رکھا تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے یہاں منطقۃ البروج کو دائرے کی شکل میں پیش کیا جائے جس میں سورج اور چاند گردش کرتے ہیں۔

اور جو ابن قتیبہ اور مرزوقی وغیرہ کی صراحتوں کے بموجب بروج اور منازلِ قمر دونوں پر مشتمل ہوتا کہ آنے والے مباحث کے سمجھنے اور تقویم سازی میں آسانی ہو سکے، اور ہم سورج اور چاند کے مختلف زاویوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اندازہ لگا سکیں کہ جاہلی منجمین ان الزا

---

[1] THE INITAL POINT OF NIRAYANA OR SIDEREAL ZODIAE COINCIDED WITH THE MEAN EQUINOCTIAL POINT (VIZ THE FIROR POINT OF AREIS) OF THE MEAN VERNAL EQUINOX DAY OF 285 A.D. WHICH OCCURRED ON SUNDAY MARCH 22, 23 - 18 I.S.T. OF THAT YEAR ALMANAE 1962 -PREFACE PAGE 2-

[2] ..... وحلول الشمس بینهما العشرین لیلة تخلو من اذار" ابن قتیبہ ۱۸ / نیز دیکھئے قزوینی ۴۲ / مرزوقی ۱ / ۱۷۷

[3] آجکل ان بروج کے مقامات تبدیل ہو چکے ہیں اور برج حمل نے "حوت" کی اور "حوت" نے دلو کی جگہ لے لی ہے، علیٰ ہذا القیاس ہر برج اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے۔ [4] آثار الباقیہ (سخاؤ) ۳۴۲۔

کے طلوع وسقوط سے موسموں اور فصلوں کا ادراک کس طرح کر لیا کرتے تھے۔

ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ ہر برج میں حسبِ ترتیب ذیل ۲ ۱/۳ منزلیں تسلیم کی جاتی تھیں:۔

۱۔ برج حمل میں: ——— شرطان، البطین، اور ۱/۳ ثریا

۲۔ " ثور ": ——— ۲/۳ ثریا، دبران " ۲/۳ ہقعہ

۳۔ " جوزا ": ——— ۱/۳ ہقعہ، ہنعہ " ذراع

۴۔ " سرطان ": ——— نثرہ، الطرف " ۱/۳ جبہہ

۵۔ " اسد ": ——— ۲/۳ جبہہ، زبرہ، اور ۲/۳ صرفہ۔

۶۔ " سنبلہ ": ——— ۱/۳ صرفہ، عواء، اور سماک

۷۔ " میزان ": ——— غفراء، زبانی اور ۱/۳ اکلیل

۸۔ " عقرب ": ——— ۲/۳ اکلیل، قلب اور ۲/۳ شولہ

۹۔ " قوس ": ——— ۱/۳ شولہ، نعائم اور بلدہ

۱۰۔ " جدی ": ——— سعد ذابح، سعد بلع اور ۱/۳ سعد السعود

۱۱۔ " دلو ": ——— ۲/۳ سعد السعود، سعد الاخبیہ اور ۲/۳ فرغ مقدم

۱۲۔ " حوت ": ——— ۱/۳ فرغ مقدم، فرغ مؤخر اور رشا[1]

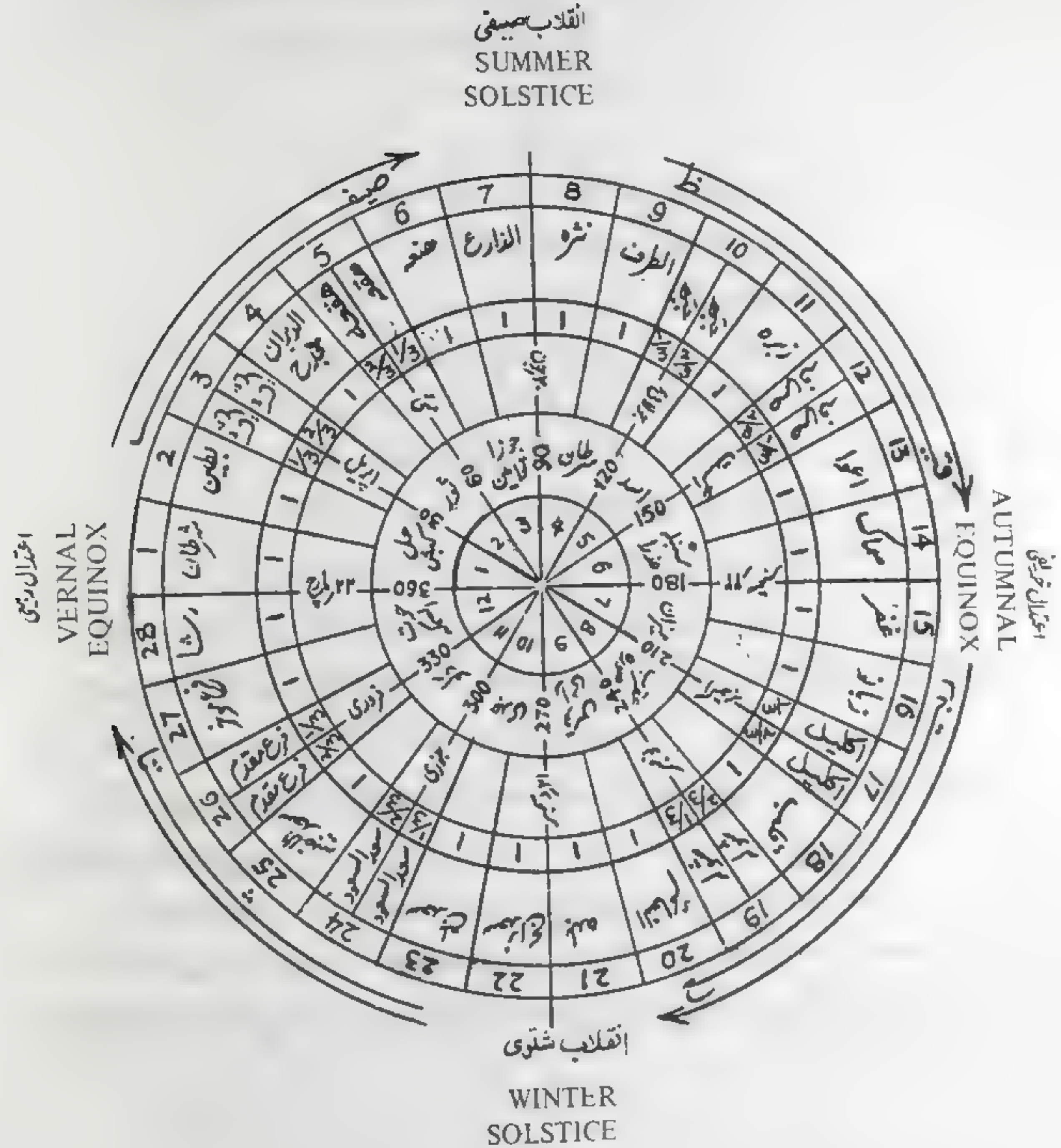
اس صراحت کی روشنی میں اگر ہم برج حمل سے لے کر برج حوت تک ان انواء کو دائرے کی شکل میں پیش کریں تاکہ ہر برج اور ہر نوء کے متقابل ستارے دریافت کئے جا سکیں تو اس کی صورت یہ ہوگی (دیکھئے صفحہ)

چونکہ سرطان میں سورج کا داخلہ عرب منجمین کے نزدیک ۲۱ مارچ کو ہوتا تھا اس لیے میں نے دوسرے بروج میں سورج کے داخلے کی تاریخیں بھی لکھ دی ہیں:۔

اس دائرے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاہل عربوں کو علم نجوم میں کافی ادراک تھا۔ چنانچہ ابن قتیبہ، مرزوقی، قزوینی، اور خود البیرونی نے بھی ان انواء کے طلوع اور سقوط کے موسمی اور فصلی اثرات اور ان کے ذیل میں جاہل منجمین کے دلچسپ مسجعات اور مختلف فارمولے نقل کر کے صفحے کے صفحے رنگین کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کے حسابات اور فارمولے کس درجہ صحیح تھے، میں یہاں ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں:۔

---

[1] کتاب الانواء/۱۲۱


انقلاب صیفی
SUMMER
SOLSTICE
اعتدال ربیعی
VERNAL
EQUINOX
اعتدال خریفی
AUTUMNAL
EQUINOX
انقلاب شتوی
WINTER
SOLSTICE

البیرونی نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے، کہ جاہلی عرب ان انواء سے موسموں کا اندازہ کس طرح لگاتے تھے۔ ایک جاہلی منجم کا قول اس طرح پیش کیا ہے:۔

"جب چاند بحالتِ بدر ثریا میں ہو تو "شتا" کی ابتدا ہوتی ہے[1]"

اس کی تشریح کرتے ہوئے خود البیرونی نے لکھا ہے کہ جب چاند ثریا میں بحالت بدر ہوگا، اس وقت سورج سمت مخالف میں برج عقرب میں ہوگا۔ (یعنی آخر اکتوبر میں، جو سردیوں کی ابتداء کا زمانہ ہے)

البیرونی نے ایک اور قول اس طرح نقل کیا ہے:۔

"جب چودہ تاریخ کا چاند دبران کے پاس پہنچے تو موسم سرما کل زمین کو لپیٹ لیتا ہے[2]۔"

اس کی تشریح یوں کی ہے کہ چاند بحالتِ بدر دبران میں ہوگا تو سورج اس وقت برج عقرب میں اٹھارہویں منزل یعنی قلب عقرب کے پاس ہوگا، اور پوری دنیا میں موسم سرما کی آمد آمد ہو جائے گی، یعنی ابتداء نومبر میں (دیکھئے دائرہ فلکی ص—)

یہی نہیں کہ عرب چاند کو صرف بحالتِ بدر دیکھنے سے موسم کا اندازہ لگاتے تھے، بلکہ ہر منزل میں چاند کی مختلف دیتوں کے اصول مقرر تھے، جس سے صحیح صحیح موسمی پیشینگوئیاں کی جا سکتی تھیں، چنانچہ البیرونی نے ایک قول اس طرح نقل کیا ہے:۔

"جب تیسری رات کا چاند ثریا میں ہو تو موسم سرما ختم ہوتا ہے[3]۔"

گویا جاہلی منجمین کے سامنے سورج اور چاند کا مرزاویہ موجود تھا، جس کا مفہوم وہ بخوبی سمجھتے تھے، اور ان انواء کے ذریعہ موسموں اور فصلوں کا صحیح صحیح ادراک رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے جب کہ یہ انواء ان کے دین کا ایک جزو تھیں، اور ان کی عبادت داخلِ مذہب تھی۔

احمد زکی پاشا نے کتاب الاصنام (ابن کلبی) کے تکملہ میں "جبھہ" کی پرستش کا ذکر کیا ہے[4]۔ جو دسویں نوء ہے۔ ابن قتیبہ نے دبران (چوتھی نوء) کے متعلق یہ حدیث نقل کی ہے:۔

"اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے سات سال تک بارش روکے رکھے اور اس کے بعد پانی پڑے تو منکرین کا ایک گروہ یہی کہے گا کہ یہ بارش "نوء مجدح" نے کی ہے (مجدح دبران کو کہتے ہیں)[5]"

---

[1] اذا ما البدر تتوم مع الثریا اتاک البرد اوله شتاء۔ البیرونی / ۳۳۷

[2] اذا ما کان الدبران یوماً لاربع عشرۃ قمر التمام فقد حف الشتا لکل ارض۔ البیرونی / ۳۳۷

[3] آثار الباقیہ / ۳۳۷۔

[4] دیکھئے کتاب الاصنام جبھہ بسب طلوع ہوتی ہے تو عرب میں تازہ کھجوروں (رطب) کی افراط (اور تقریباً تمام اقسام کے پھلوں کے پکنے) کا زمانہ ہوتا ہے (دیکھئے مخصص ابن سیدہ اور جب اس کا سقوط ہوتا ہے تو یہ اونٹوں (اور اونٹوں کے ساتھ تمام چھوٹے بڑے جانوروں کا) تولیدی وقت ہوتا ہے۔

[5] ابن قتیبہ / ۳۷۔ نیز دیکھئے مسند ۳ / ۷ ؛

دبران قلب عقرب کے بالکل مقابلے میں واقع ہے، سورج جب قلبِ عقرب میں ہوتا ہے تو یہ سرِ شام مشرق سے طلوع ہوتی نظر آتی ہے، یعنی آخر اکتوبر اور شروع نومبر میں جو حجاز میں عین برسات کا زمانہ ہے غالباً اسی لیے عربوں نے بارشوں کو اسی نوء سے متعلق کیا تھا، (دیکھیے دائرۂ فلکی صد)

ایک اور حدیث اس طرح ہے :۔

"جو کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بارش ہوئی تو وہ میرا مومن اور کواکب کا کافر ہے اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں نوء نے پانی برسایا، وہ میرا منکر اور مومنِ کواکب ہے"[1]

ان احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اندازہ مشکل نہیں کہ جاہلی عربوں کی موسمی تعبیرات کا تعلق بیشتر ان انواء ہی سے تھا، اور وہ سورج اور چاند کے مختلف زاویوں کا پتہ بھی ان انواء کے طلوع و غروب سے لگا سکتے تھے۔

ان نتائج کی روشنی میں یہ بات نسبتاً آسان ہو جاتی ہے کہ جاہلی تقویم کا سراغ لگانے کے لیے ہم اپنے قدم اور آگے بڑھائیں اور قیاسات کو مزید وسعت دیں۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ عربوں کے نزدیک پہلی نوء شرطان تھی، جس میں سورج ۲۱ مارچ کو داخل ہوتا تھا، جو ٹھیک اعتدالِ ربیعی کا زمانہ ہوتا ہے، اس بناء پر اگر یہ فرض کر لیا جاتا کہ عربوں کی تقویم کی ابتداء بھی اسی نقطہ سے ہوتی تھی تو غالباً بیجا نہ تھا۔ کیونکہ بعض دوسری قوموں کی تقویمیں بھی یہیں سے شروع ہوتی تھیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کی تائید تو واقعاتی شہادتوں سے ہوتی ہے اور نہ منجمینِ عرب اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ عربوں میں فصلوں کی ابتداء اعتدالِ خریفی سے کی جاتی تھی، جو اس کا بالکل متضاد نقطہ ہے۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے :۔

"اور عرب زمانوں کے اوقات کی حد بندی میں بجز مندرجہ ذیل طریقوں کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے، اور نہ سال کا آغاز ربیع سے کرتے تھے بلکہ وہ تحدیدِ اوقاتِ فصول میں اپنے وطن کی جانی پہچانی آمد گرما و سرما اور ان کے اختتام اور نباتات کے پھوٹنے اور بڑھنے اور گھاس پات کے نکلنے اور خشک ہونے کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور زمانوں کے شمار میں فصل خریف سے ابتدا کرتے اور وہ اس کا نام ربیع رکھتے ہیں کیونکہ ربیع کا آغاز برسات میں ہوتا ہے اس کے بعد جاڑے کی فصل آتی ہے پھر جاڑے کے بعد صیف کا موسم ہوتا ہے اور یہی موسم ہے جس کو لوگ ربیع کہتے ہیں اور اس فصل میں درختوں میں کونپلیں نکلتی ہیں اور اسے صیف اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں وہاں پانی کم ہو جاتا ہے، اور گھاس سوکھ جاتی ہے۔ اور کچھ لوگ اسے ربیع الثانی کہتے ہیں"[2]

---

[1] بخاری نیز دیکھیے موطا الاستمطار بالنجوم

[2] کتاب الانواء ۱۰۳/ نیز دیکھیے کتاب الازمنہ ۱۷۴/۱

تاج العروس میں ابویحییٰ بن کناسہ کا قول ابنِ قتیبہ کے بیان سے بھی زیادہ واضح ہے :۔

"ازہری نے ابو یحییٰ بن کناسہ سے جو اس معاملے میں علامہ تھا، سال کے زمانوں اور اس کی فصلوں کے بارے میں نقل کیا ہے کہ سال کے چار زمانے ہوتے ہیں، "ربیع الاوّل" اور یہی عام لوگوں کے نزدیک خریف کہلاتا ہے، اس کے بعد شتاء (موسم سرما) پھر صیف" اور یہ "ربیع الآخر" ہے اور پھر قیظ (موسم گرما) اور یہ سب عرب بادیہ کا قول ہے، نیز وہ کہتا ہے کہ جو ربیع ایرانیوں کے نزدیک خریف ہے وہ ایلول کی ۳ تاریخ کو شروع ہوتی ہے اور شتا "کانونِ اوّل" کی ۳ تاریخ کو، اور صیف جو ایرانیوں کے نزدیک ربیع ہے "آذار" کے پانچ دن گزرنے پر شروع ہوتی ہے اور قیظ جو ایرانیوں کے نزدیک "سیف" ہے، ۵ حزیران کو شروع ہوتی ہے[1]"

ان صراحتوں سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ عربوں کے نزدیک موسم بہار یا فصلِ ربیع کا آغاز اعتدالِ خریفی سے ہوتا تھا۔ ابنِ کناسہ نے ہر فصل کی ابتدا ہونے کی سُریانی تاریخیں بھی لکھ دی ہیں۔

ابنِ قتیبہ نے بھی بالکل یہی صراحت کی ہے :۔

"ربیع الاوّل کا آغاز جو خریف ہے، "ایلول" کے تین دن گزرنے کے بعد ہوتا ہے اور جاڑے کا آغاز "کانون اوّل" کے تین دن گزار کر، "صیف" کی ابتداء جو "ربیع الثانی" ہے۔ آذار کے پانچ دن گزرنے کے بعد اور قیظ کا آغاز حزیران کے چار دن گزار کر[2]"

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عرب طلوعِ شرطان سے حساب نہیں لگاتے تھے بلکہ سقوطِ شرطان پر ان کے حسابات کا مدار تھا، یعنی جب شرطان صبح کو مغرب میں غروب اور شام کے وقت مشرق سے طلوع ہوتی تو نظر آتی یا بالفاظِ دیگر جب چاند بحالتِ بدر اس نوء میں نظر آسکتا، یہ زمانہ ٹھیک اعتدالِ خریفی کا سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابنِ قتیبہ نے نوء کے معنیٰ ہی "سقوطِ نجم" بیان کئے ہیں[3]

---

[1] تاج العروس ۵/۳۴۰، ۳۴۱ نیز دیکھئے کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/۴۷۴، ۴۷۵، اور لسان العرب /۴۶۰، ۴۶۱

[2] کتاب الانواء /۱۰۴۔ نیز دیکھئے الازمنہ ۱/۱۷۶۔ آثار الباقیہ /۳۲۵

[3] کتاب الانواء میں نوء کے معنیٰ اس طرح بیان کئے گئے ہیں "معنی النوء" سقوط النجم منها المغرب مع الفجر (کتاب الانواء /۶) یعنی صبح کے وقت جب نجوم الاخذ مغرب کی سمت غروب ہوتے نظر آتے ہیں اس کو نوء کہا جاتا تھا کیونکہ پھر یہی ستارے شام کو مشرق سے طلوع ہوتے معلوم ہوں گے۔ سقوطِ نجم کا صحیح اور آسان اندازہ چاند کی ۱۳ یا ۱۴ تاریخ کو ہوتا ہے۔ جب کہ چاند بحالتِ بدر مشرق سے نمودار ہو کر صبح کو مغرب میں غروب ہوتا ہے، اس وقت جو تارے چاند کے متصل ہوتے ہیں ان کے سقوط کے صحیح وقت کو ایک عام نظر بھی پہچان سکتی ہے، دیکھئے کتاب الانواء /۱۱، نیز دیکھئے مخصص ابن سیدہ ۹/۱۳

میرا خیال ہے کہ عربوں کے فلکی حسابات چونکہ بیشتر مشاہداتِ عینی پر مبنی تھے اس لیے شام کے وقت جب ستارے مشرق سے طلوع ہوتے تو ان کے فلکی حسابات کی ابتدا بھی اسی نقطے سے ہوتی۔ بہر صورت ابن قتیبہ اور ابن کناسہ کی نشان دہی کے بموجب عربوں کی فصول چہارگانہ کو اگر ترتیب وار رکھا جائے اور سُریانی مہینوں کو اُن کے پہلو میں رکھ کر دیکھا جائے، تو نتیجہ حسب ذیل ہو گا :-

۱- ربیع الاوّل	۳ر ایلول	۳ر ستمبر
۲- شتا	۳ر کانون اوّل	۳ر دسمبر
۳- صیف (ربیع الثانی)	۵ر آذار	۵ر مارچ
۴- قیظ	۴ر حزیران	۴ر جون

گویا عربوں کے موسمِ بہار کی ابتدا جس کو وہ ربیع الاوّل کہتے تھے "ستمبر" سے تسلیم کی جاتی تھی، اب اگر یہ فرض کر لیا جائے، کہ جاہلی تقویم کی ابتدا بھی اسی نقطہ سے ہوئی تھی اور ان کی تقویم کے تمام مہینے انھیں چار فصلوں پر بعینہٖ اسی ترتیب کے ساتھ بٹے ہوئے تھے، جیسا کہ البیرونی کا خیال ہے تو گویا ہمیں جاہلی تقویم کا ایک سرا ہاتھ آ گیا۔

البیرونی کا بیان ہے کہ :-

"عربوں کے مہینے چار فصلوں پر تقسیم تھے، جو فصلِ خریف سے شروع ہوتے تھے جس کو (اہلِ عرب) فصل ربیع کہتے تھے، اس کے بعد موسمِ سرما آتا، بعد ازاں بہار کا موسم، جس کو صیف اور بعض لوگ ربیع الآخر کہتے تھے، اس کے بعد موسمِ گرما آتا جو قیظ کہلاتا تھا۔[۱]"

البیرونی کی اس اہم شہادت کے مطابق اگر بطور تجربہ عربی مہینوں کو محرم سے شروع کر کے ترتیب وار ان چار فصلوں پر تقسیم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ حسب ذیل ہو گا اور میرے نزدیک اس قیاس سے حیرت خیز نتائج نکل سکتے ہیں جو تاریخ کی بہت سی گتھیاں سلجھانے کو کافی ہیں، میں نے جدول ذیل میں سُریانی مہینوں کے ساتھ ساتھ اُن کے متبادل انگریزی مہینے بھی لکھ دیئے ہیں :-

اعتدالِ خریفی ۲۲ر ستمبر	۱- محرم	ربیع الاوّل	۳ر ایلول	ستمبر
	۲ صفر		تشرین اوّل	اکتوبر
	۳- ربیع۱		تشرین آخر	نومبر
انقلاب شتوی ۲۱ر دسمبر	۴- ربیع۲	شتا۲	۳ر کانون اوّل	دسمبر
	۵- جمادی۱		کانون آخر	جنوری
	۶- جمادی۲		شباط	فروری
اعتدالِ ربیعی ۲۱ر مارچ	۷- رجب	صیف۳	۵ر آذار	مارچ
	۸- شعبان		نیسان	اپریل
	۹- رمضان		ایار	مئی
انقلاب صیفی ۲۱ر جون	۱۰- شوال	قیظ	۴ر حزیران	جون
	۱۱- ذوالقعدہ		تموز	جولائی
	۱۲- ذوالحجۃ		آب	اگست

[۱] آثار الباقیہ / ۳۲۵ - انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ عرب برسات کے موسم کو ربیع کہتے ہیں ؛ ۱/۱۱۷۳ (عرب میں برسات سرما میں ہوتی ہے)

یہ فرض کرنے کے بعد کہ عربی تقویم کا پہلا مہینہ محرم ہمیشہ نقطۂ اعتدالِ خریفی یا سقوطِ سرطان کے متصل چاندوں سے شروع ہوتا اور مابقی مہینے اس کے پیچھے پیچھے علی الترتیب نقشۂ بالا کے مطابق چکر کاٹتے رہتے، ہمیں اس نظریئے کو مختلف کسوٹیوں پر جانچنا چاہیئے۔ سب سے پہلے عربی مہینوں کے ناموں پر غور فرمائیے مثلاً ربیع کے بعد جس کے معنی بہار کے ہیں اور جو عربوں کے نزدیک برسات سے شروع ہوتی، جمادی کا نام نظر آتا ہے، جو خواہ مخواہ ہمارے ذہنوں کو موسمِ سرما کی طرف لے جاتا ہے مرزوقی کا بیان ہے کہ جمادی کے ذیل میں موسمِ گرما کا ذکر اشعارِ عرب میں نہیں ملتا، بلکہ اس کا ذکر ہمیشہ موسمِ سرما کے ساتھ ہوا ہے۔ سرمائی راتیں سخت اندھیری ہوتی ہیں، ایک شاعر کہتا ہے :

فِی لَیلَۃٍ مِن جمادی ذاتِ اندیۃ
لایبصر الکلب من ظلمائھا الطنبا[1]

جمادی کے بعد رجب اور شعبان کے مہینے آتے ہیں، اور پھر رمضان جس سے گرمی کے جلتے ہوئے موسم کا تصور یقینی ہے، عربی مہینوں کے ناموں کی موسمی ساخت پر البیرونی اور مرزوقی وغیرہ نے لغوی بحث بھی کی ہے[2] اور البیرونی نے بتایا ہے کہ جس زمانے میں یہ نام رکھے جا رہے تھے، اس وقت موسموں کا پورا لحاظ رکھا گیا تھا، نقشۂ بالا کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمادی، دسمبر اور جنوری سے مطابقت رکھتا تھا اور رمضان مئی جون سے۔

(۲)

ان لغوی شہادتوں کے علاوہ جو اگرچہ انتہائی اہم ہیں اور واقعاتی تاریخ سے زیادہ مرتبہ رکھتی ہیں، مارگولیتھ (MARGOLIOUTH) نے قدیم یونانی مصنفین کی شہادت سے بیان کیا ہے کہ عرب جاہلی دور میں تین خریف (AUTUMN) کے مہینے اور ایک مہینہ فصل بہار کا حرام قرار دیا جاتا تھا[3] جس میں جنگجو قبائل ہتھیار اُتار دیتے تھے اور ہر قسم کی خونریزیاں رک جاتی تھیں چنانچہ نانوسس

---

[1] الازمنہ ۱۲۸ [2] مرزوقی کا قول ملاحظہ ہو:...... ان کثیراً من علماء الرواۃ یزعمون ان شھری ربیع انما سمیا للربیع، وان جمادین انما سمیتا للشتاء ووجود الماء۔ وان شعبان انما سمی شعبان لاشتعاب الظعن ایاھو عن المرابع للمحاضر، وان شھر رمضان لشدۃ الحر والرمض وان الصفر النسب الی الزمان الذی یسمی صفری، وھذا الذی ذکروا امر قریب لاسعید فی الوھم لانا علی الترتیب نجد ازمان السنۃ عندھم۔ الازمنہ ۱۲۷/۱۲۸

[3] مارگولیتھ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"FOR THREE AUTUMN MONTHS AND ONE SPRING MONTH A TRUCE OF GOD WAS OBSERVED BY MANY TRIBES WHO THEREIN LAID DOWN THERE ARMS OF SHED NO BLOOD"

اور اسی جگہ حاشیہ پر مذکور ہے : (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

NONNOSUS اور پروکوپیس (PROCOPIUS) نے ان محترم مہینوں کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے :-

"دو ماہ انقلابِ صیفی کے بعد اور ایک مہینہ وسطِ بہار کا (محترم خیال کیا جاتا تھا) ۔"

اس صراحت سے بھی متذکرہ بالا نقشہ کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے، انقلابِ صیفی SUMMER SOLSTICE ۲۱ جون کو ہوتا ہے، اور نقشۂ بالا کے بموجب ذی قعدہ اور ذو الحجہ بالترتیب جولائی اور اگست سے مطابق ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مہینہ وسطِ بہار کا نقشۂ بالا کے مطابق رجب کا آتا ہے جو مارچ اور اپریل سے مطابق ہونا چاہیئے۔ ولہا زن نے بھی رجب کو بہار (SPRING) اور محرم کو خریف (AUTUMN) سے مطابقت دی ہے[1]۔

اس کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے، بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا:

نہ "فرع" کوئی چیز ہے نہ "عُتیرہ"۔ "فرع" اونٹ کے پہلے بچے (اول النتاج) کو کہتے تھے جس کو وہ بتوں کے لیے ذبح کرتے تھے اور "عُتیرہ" کی قربانی بھی رجب کے مہینے میں کی جاتی۔" (بخاری)

عُتیرہ بکری یا بھیڑ کے پہلے بچے (اول ما ینتج) کو کہا جاتا تھا[2]۔

لسان العرب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب "فرع" یعنی اونٹ کے پہلے بچے کی قربانی اس درجہ ابتدائی عمر میں کرتے کہ اس کا گوشت ہنوز لبلبا ہوتا اور پوست سے چھڑانا مشکل ہوتا[3]۔

ڈاٹی DOUGHTY کا بیان ہے کہ عرب میں اونٹ کا تولیدی زمانہ CALVINGTIME فروری اور مارچ کا ابتدائی حصہ ہے[4]۔ رابرٹسن اسمتھ ROBERTSONSMITH کے بیان کے بموجب یہ تخصیص صرف اونٹ کے بچوں کے لیے نہیں، بلکہ عرب میں ہر چھوٹے بڑے جانور کا تولیدی زمانہ تقریباً یہی ہے[5]۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروری اور مارچ میں جتنے بھی اول النتاج ہوتے وہ عام دستور کے مطابق رجب کے مہینے میں دیوتاؤں کی نذر کر دیئے جاتے، نیز یہ کہ رجب کا مہینہ بھی اس تولیدی زمانہ کے بالکل متصل ہوتا، کیونکہ فرع کے ذیل میں جو صراحتیں ملتی ہیں اُن سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ قربانیاں تقریباً وسط یا آخر مارچ تک ہو جاتیں۔

غالباً اسی بنیاد پر ولہاوزن نے اسرائیلیوں کے مشہور تیوہار فسح کو جو ماہِ نسان میں منایا جاتا "رجب کے تیوہار" سے مطابقت دی ہے[6]۔ کیونکہ یہودی بھی اپنا یہ تیوہار تقریباً اسی زمانے میں مناتے جب کہ سورج برجِ حمل میں ہوتا اور اپنی پیداواروں کے

(۱ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

NONNOSUS AND PROCOPIUS "TWO MONTH AFTER THE SUMMER SOLSTICE AND ONE IN MID SPRING" (MARGOLIOUTH RESE P 5)

[1] ENCYCLOPIADIA OF ISLAM VOL IIP [2] لسان العرب ۶/۲۱۰ نیز دیکھیے نہایہ غریب الحدیث ۳/۲۶۵

[3] لسان العرب ۱۰/۱۲۰ نیز دیکھیے: نہایہ غریب الحدیث ۳/۱۹۵ [4] THE CALVING TIME FOR CAMELS IS IN FEBRUARY AND EARLY MARCH W. R. SMITH RELIGIONS OF SMITES 465

[5] IBID [6] IBID P. 227 - 228

پہلے حاصل (FIRST FRUITS) اور بھیڑوں اور بکریوں کے یک سالہ بچے لیواہ کی نذر کرتے۔

اگر یہ مطابقت ٹھیک ہے تو اس سے یہ اہم نتیجہ نکلتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں یہودی اور عربی تقویم تقریباً ایک ہی نقطۂ فصلی سے شروع ہوتی، کیونکہ "رجب" کی طرح یہودیوں کا ماہ نیسان بھی "ساتواں" مہینہ شمار کیا جاتا تھا اور دونوں مہینوں کا تعلق آغازِ بہار سے تھا۔

علاوہ ازیں تاریخ کی مضبوط ترین شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں قوموں کا پہلا مہینہ یعنی محرم اور تشری بھی ایک ہی نقطۂ فصل سے شروع ہوتے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مستحکم دلیل عاشورے کی روائتیں ہیں جن کو میں یہاں کسی قدر تفصیل سے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہی روائتیں حقیقتاً میرے پورے نظریۂ تقویم کا مرکزی نقطہ ہیں اور سچ پوچھئے تو انھیں نے میری رہنمائی اس جدید نظریئے کی طرف کی ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہی احادیث پوری جاہلی تقویم کے لیے قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ آنحضرت ؐ نے مدینے پہنچ کر یہود کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا تو مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا۔ یہودی یہ روزہ اپنی تقویم کے مطابق ماہِ تشری کی ۱۰ تاریخ کو رکھا کرتے تھے، جو ہمیشہ ستمبر اور اکتوبر کے متوازی رہتا، ابن عباس ؓ فرماتے ہیں:۔

"آنحضرت ؐ مدینے تشریف لائے تو انھوں نے یہودیوں کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا، اس پر آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ وہ صالح دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمنوں کے ہاتھ سے نجات دی تھی اس لیے موسیٰ ؑ نے اُس روز روزہ رکھا تھا۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ تمھارے مقابلے میں ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں، اس کے بعد آپ ؐ نے بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی حکم دیا۔[1]"

انھیں ابن عباس ؓ سے ایک دوسری روایت اس طرح ہے:۔

"جب آنحضرت ؐ مدینے تشریف لائے تو یہودیوں کو صومِ عاشورہ رکھتے پایا، آپ ؐ نے اُن سے دریافت کیا تو بولے یہ وہ دن ہے کہ اس روز موسیٰ ؑ اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے فرعون پر فتحمندی عطا کی تھی، اور ہم اس کی عظمت کے لیے روزہ رکھتے ہیں، اس پر آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ ہم تمھارے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہیں، اس کے بعد آپ ؐ نے اس روزہ کا حکم دیا۔[2]"

---

[1] بخاری، نیز دیکھئے مسند ۴/۴۴/۲۶ اور ۲۸۳۲ [2] بخاری۔ بظاہر ابن عباس کی ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آنحضرت ؐ کے سامنے مدینے کے یہودیوں کے یومِ عاشوراء کی غلط توجیہہ کی گئی یا اسلامی رواۃ غلط سمجھے کیونکہ خروج بنی اسرائیل کا واقعہ ماہ تشری کا نہیں۔ (دیکھئے خروج ۱۲: ۱-۶)

ایک اور روایت ابوموسیٰؓ اشعری سے اس طرح ہے، وہ فرماتے ہیں :-

"کہ آنحضرتؐ مدینے تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشورے کی عظمت کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں، اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہم اس روزے کے زیادہ حق دار ہیں، اور روزہ اس روزے کا حکم دیا۔" (بخاری)

ان تینوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عاشورے کا روزہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ خود پیغمبرِ اسلامؐ نے عین اُس دن رکھا تھا جس روز یہودیوں کے عاشورے کا دن تھا۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ یہودی یہ روزہ ماہِ تیشری کی ۱۰ تاریخ کو رکھا کرتے تھے جو ان کی تقویم کا پہلا مہینہ شمار ہوتا تھا اور مسلمانوں میں بھی یہ روزہ دس محرم کو مسنون ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس سال پہلی بار مدینے میں یہ روزہ رکھا گیا تھا کم سے کم اس سال عربوں کا ماہِ محرم یہودی "تیشری" کے عین مطابق تھا، جو ہمیشہ اعتدالِ خریفی میں آتا تھا۔

ان روایات سے اکثر مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے یہ روزہ یہود کی تقلید میں اختیار کیا تھا[۱] مگر واقعاتی طور پر یہ خیال صحیح نہیں۔ بلکہ زمانۂ جاہلیت میں قریشِ مکہ بھی یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں :-

"یوم عاشورہ کا روزہ زمانۂ جاہلیت میں قریش رکھا کرتے تھے اور رسول اللہ بھی رکھتے تھے، جب آپؐ مدینے تشریف لائے تو خود آپؐ نے بھی روزہ رکھا۔ اور اس کا حکم بھی دیا، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو جس نے چاہا یہ روزہ رکھا اور جس نے چاہا ترک کیا۔" (بخاری)

یہی نہیں بلکہ جس طرح یہودی اُس روز اپنے مقدس معبد کی سالانہ صفائی کرنے کی رسم ادا کرتے۔ ٹھیک اسی طرح قریش بھی اسی عاشورے کے دن "بیت اللہ" کے سجانے، بنانے اور اس پر غلافِ کعبہ چڑھانے کی رسم بجالاتے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے :-

"قریش رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ رکھتے اور اُسی دن وہ کعبہ پر غلاف چڑھاتے، تو جب اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے، رسول اللہؐ نے فرمایا، جس کا جی چاہے یہ روزہ رکھے، جس کا جی چاہے ترک کردے۔" (بخاری)

حضرت عائشہؓ کی ان دونوں روایتوں کو ایک ساتھ پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالباً یہ رسم پوری سامی دنیا یا کم سے کم ابراہیمؑ[۲] کی اولاد میں مشترک چلی آتی تھی اور قریش بھی ایامِ جاہلیت میں اسی خاص دن یہ نسلی شعار پوری سرگرمی اور ٹھیک ٹھیک اوقات پر انجام دیتے تھے۔

---

[۱] MARGOLIOUTH RISE P. 250 [۲] آلِ ابراہیمؑ سے مراد شمالی عرب کے اصلی باشندے ہیں۔

اگر اس زمانے میں "بیت المقدس" کی تطہیر ہوتی تو مکے میں بھی "بیت اللہ" پر ٹھیک اُسی روز غلاف چڑھایا جاتا، فلسطین کے باشندے اگر اس دن روزہ رکھتے تو قریش میں بھی یہی دستور تھا، غرض شمال سے جنوب تک یہ تیوہار آلِ ابراہیم میں مشترک معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی "وَالْفَجْرِ" کی تفسیر اور عبید بن عُمیر کی محرم کے متعلق تصریحات قابلِ لحاظ ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" سے مراد محرم ہے جو "فجر السنہ"[1] ہے، گویا لیال عشر سے مراد عاشورے تک کی دس راتیں ہیں۔

عُبید بن عُمیر سے روایت ہے:۔

> محرم الٰہی مہینہ ہے اور وہ سنہ کی ابتدا ہے جس میں بیت اللہ پر غلاف چڑھایا جاتا ہے اور جس سے لوگ شمار ایام کرتے ہیں[2]۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشورے کا روزہ یہودِ مدینہ کی تقلید کا نتیجہ نہ تھا بلکہ قریش بھی زمانۂ جاہلیت میں اس دن کی تقدیس کرتے اور روزہ رکھتے، ہاں! ہجرت سے پہلے مدینے کے لوگوں میں عاشورے کا رواج قطعاً نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ عین عاشورے کے دن صبح تک اہلِ مدینہ بے خبر تھے کہ آج انھیں روزہ رکھنا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہاں کے باشندے نسلاً جنوبی عرب سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک مدنی صحابی سلمہ بن اکوعؓ کہتے ہیں:۔

> "آنحضرتؐ نے عاشورے کے دن لوگوں میں اعلان کی غرض سے ایک آدمی روانہ کیا کہ جس کسی نے کچھ کھا لیا ہے، وہ اب کچھ نہ کھائے اور روزہ رکھے اور جس نے کچھ نہیں کھایا، وہ اب نہ کھائے۔"
> (بخاری)

ایک اور مدنی روایت جو ربیع بنتِ مُعوّذ سے ہے ملاحظہ ہو، جس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ اعلان صرف انصار کی بستیوں تک محدود تھا، فرماتی ہیں:۔

> "نبی علیہ السلام نے عاشورے کی صبح کو انصار کی بستیوں میں کہلا بھیجا کہ جس نے بغیر روزے کے صبح کی ہو، تو وہ باقی دن بلا کچھ کھائے پیئے پورا کرے اور جس شخص نے روزے کی حالت میں صبح کی ہو وہ روزہ رکھے۔" (بخاری)

اِن دونوں مدنی روایتوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہلِ مدینہ میں باوجود یہودی اثر و رسوخ کے عاشورے کا

---

[1] البدایۃ ۳/۲۰۷ نیز دیکھئے طبری ۲/۲۵۳

[2] بدایۃ ۳/۲۰۷

تیوہار موجود نہ تھا[1] اور پیغمبرِ اسلام کی ہجرت کے بعد عین عاشورے کے دن صبح کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مدینے کے لوگ بھی یہ تیوہار منائیں چنانچہ ان بستیوں میں اعلان کی ضرورت پڑی، اور کہلا بھیجا گیا کہ آج کوئی شخص کچھ نہ کھائے، نہ پیئے بلکہ روزہ رکھے۔

متذکرہ بالا تمام روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ عاشورے کا روزہ بیشتر اُسی روز رکھا جاتا تھا جس روز یہودی یوم عاشورہ مناتے، پیغمبرِ اسلام نے جب اس روزے کا حکم دیا تو اُسی دن کا لحاظ رکھا، ہاں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اسی حکم میں اتنی ترمیم کر دی گئی کہ مسلمانوں کو یہ روزہ یہودیوں سے صرف ایک دن پہلے یا بعد رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں:

> "رسُول اللہؐ نے فرمایا کہ عاشورے کا روزہ رکھو، اور اس میں یہودیوں کی مخالفت کرو، اور یا تو ایک روز قبل رکھو یا ایک دن بعد[2]"

یہ روایت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں عربوں کا ماہ "محرم" اور یہودیوں کا ماہ "تشری" بالکل یا اکثر و بیشتر متوازی ہوتے اور مسلمانوں اور یہودیوں کے روزے میں زیادہ سے زیادہ صرف ایک دن کا فرق رہتا، چنانچہ ابن عباسؓ کی ایک دوسری روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔

الحکم بن الاعرج کہتے ہیں کہ ایک بار میں عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا تو وہ زمزم سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے، میں بھی بیٹھ گیا اور ان سے عاشورہ کے متعلق سوال کئے:

> "میں نے کہا یوم عاشورہ کے متعلق مجھے بتایئے تو فرمایا کہ اس کے متعلق کیا دریافت کرتے ہو، میں نے کہا اس کے روزے کے متعلق، فرمایا جب تم محرم کا چاند دیکھو تو اس سے حساب لگاؤ اور جب نُویں کی صبح ہو جائے تو اسی صبح کو روزہ رکھو، میں نے عرض کیا کہ کیا رسُول اللہؐ یوں ہی روزہ رکھتے تھے، فرمایا، ہاں[3]!

ان احادیث پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عربی تقویم کا ماہِ محرم جس میں یہ روزہ مسنون ہے، عہدِ رسالتؐ میں اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر یہودیوں کے ماہِ تشری" سے مطابق رہتا جو بغیر اس صورت کے ممکن نہیں کہ ہم اصولِ کبیسہ کے تحت عربی تقویم کی ابتدا ہمیشہ اعتدالِ خریفی سے کریں۔

---

[1] معلوم نہیں کہ اہلِ مدینہ کو اس روزے سے اس درجہ اجتناب کیوں تھا، اس لیے کہ امیر معاویہ کے زمانے میں پھر ایک بار یہی سوال اٹھا تو انھوں نے علمائے مدینہ کو چیلنج کیا اور آنحضرتؐ کی اس سلسلہ کی حدیث سنائی۔ حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ جس سال امیر معاویہ نے حج کیا تو عاشورے کے دن وہ منبر پر چڑھے اور فرمایا "اے اہلِ مدینہ تمھارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہؐ سے سُنا، آپؐ اس دن کو عاشورے کا دن فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ (اگرچہ) یہ روزہ تم پر فرض نہیں ہے، لیکن میں روزہ دار ہوں، تو جس کا جی چاہے روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔ (موطا، صیام یوم عاشورہ)

[2] مسند ۴/۲۱۵۴۔ [3] مسند ۴/۲۱۳۵ نیز دیکھئے ۲۵۴۰/ ۔ نیز دیکھئے ۲۱۴

اس سلسلے میں یہ خیال کہ صرف ہجرت کے پہلے سال ماہِ محرم چکر کاٹ کر یہودیوں کے ماہِ تشری کے مطابق ہو گیا تھا، از روئے حساب بالکل غلط ہے اور اسی بناء پر البیرونی نے متذکرہ بالا تمام احادیثِ صحیحہ کو حسابی قاعدے سے باطل قرار دیا ہے۔

البیرونی کے پورے استدلالات مقالۂ اول پر پیش کیے جا چکے ہیں، مجھے یہاں صرف یہ عبارت دوبارہ پیش کرنا ہے:۔

"..... لیکن یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ امتحانی شہادتیں ان کے خلاف ہیں اور وہ اس طرح کہ ہجرت کے سال پہلی محرم کو جمعہ کا دن اور ماہ تموز ۹۳۳ء سکندری کی ۱۶ تاریخ تھی مگر جب ہم حساب لگاتے ہیں تو اس سال یہودیوں کے سنہ کا آغاز یکشنبہ ۱۲ ایلول کو ہوا تھا جو ۲۹ صفر کے مطابق تھا۔ اس حساب سے عاشورے کا دن سہ شنبہ ۹ ربیع الاول کو پڑتا ہے .... اور محرم میں اس کا وقوع یا تو اس سال سے کئی برس پہلے ممکن ہے یا کچھ اوپر بیس برس بعد ہونے والا تھا، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اس لیے عاشورے کا روزہ رکھا کہ وہ اس سال دسویں (محرم) کے مطابق تھا....."[1]

البیرونی کا یہ خیال اگرچہ قمری حسابات کی بنیاد پر بظاہر ٹھیک معلوم ہوتا ہے، لیکن جب وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں "قمری شمسی" سال استعمال ہوتا تھا اور عربی فصول کی ابتداء ہمیشہ اعتدالِ خریفی سے ہوتی تھی۔ نیز یہ کہ عربی مہینے انھیں فصولِ چہارگانہ پر بٹے ہوئے تھے تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ احادیثِ صحیحہ کو غلط قرار دیا جائے۔

اس پر اتنا اور اضافہ کیجئے، کہ نہ صرف اہلِ مکہ بلکہ شاید پورے مشرقِ وسطیٰ کے سنین کی ابتداء (بجز عراق اور ایران کے) اعتدالِ خریفی ہی سے ہوتی تھی، چنانچہ مرزوقی نے عربی تقویم کی خریف سے ابتداء ہونے پر یہی دلیل پیش کی ہے، اُن کا بیان ہے:۔

"اور منجملہ ان قوموں کے جنھوں نے اسے خریف سے شروع کیا ہے، شام کے سُریانی بھی ہیں، کیا آپ اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کے سنہ کا آغاز تشرین اول (اکتوبر) سے ہوتا ہے، جو صدرِ خریف ہے۔ ابتدائی موسمِ برشگال کا آغاز ہے اور شاید عرب بھی اپنی تقویم اسی نقطہ سے شروع کرتے تھے اور انھوں نے اس کا آغاز ابتدائی موسمِ برشگال (وسمی) کو قرار دیا تھا جس طرح کہ وہ زمانے اور انواء (منازلِ قمر) کی تقسیم میں مقدم رہتا ہے، بنا بریں وہ شروع برسات کو مقدم کرنے میں اپنے پرانے رسوم پر قائم رہے۔"[2]

مرزوقی کے اس بیان سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں عربی تقویم بھی پڑوسی قوموں کی طرح ہمیشہ "خریف" سے شروع ہوتی تھی، وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے عربوں کے نزدیک فصلوں اور انواء کا آغاز و اختتام بھی اسی نقطۂ فصلی سے

---

[1] البیرونی آثار / ۳۳۰ - یہ ملحوظ رہے کہ مقالۂ اول صفحہ ۲۸ میں البیرونی کی اس عبارت کا ترجمہ سخاؤ کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے اور مذکورہ بالا ترجمہ اصل عربی سے براہِ راست کیا گیا ہے۔ [2] الازمنہ والامکنہ ۱/۱۶۷

ہوتا تھا، گویا اُن کی تقویم اور انواء اسی طرح لازم و ملزوم تھیں جس طرح ہندوؤں کے نچھتر اور مہینے۔

بنا بریں میری رائے میں مکّے کی جاہلی تقویم کی بازیافت اب چنداں مشکل نہیں رہی بلکہ اگر دیکھا جائے تو بڑی حد تک سامنے آچکی ہے اور اب صرف یہ کام باقی ہے کہ دائرۂ انواء و بروج "کو پیشِ نظر رکھ کر حسابی قاعدوں کی مدد سے عہدِ رسالتؐ کے ایسے چاندوں کا انتخاب کر لیا جائے جن کی رویت سورج کے بُرجِ میزان میں داخل ہونے سے کچھ پہلے یا بعد نقطۂ اعتدال خریفی کے متصل تر ہوئی ہو اور جس کے دوران میں چاند بحالتِ بدر بُرجِ حمل میں رونما ہو سکے۔ ایسے مہینوں کو مکّی تقویم کا پہلا مہینہ یعنی محرم قرار دے کر سال کے باقی مہینوں کو اسی حساب سے نامزد کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ایک سہل تر طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ عام قمری تقویم سے صرف ایسے قمری مہینوں کا انتخاب کر لیا جائے جن کی رویتِ قمر نقطۂ اعتدال خریفی (۲۲ ستمبر) کے متصل ہوئی ہو، خواہ یہ چاند ستمبر میں ہوئے ہوں یا ابتدائی اکتوبر میں اور ان مہینوں کو سال کا پہلا مہینہ قرار دے کر پوری تقویم مرتب کر لی جائے کیونکہ عہدِ رسالتؐ میں از روئے حساب سورج تقریباً اسی زمانے میں بُرجِ میزان میں داخل ہوتا تھا اور آغازِ خریف کا زمانہ سمجھا جاتا تھا۔

اس طریقے کے تحت ۱ھ سے ۱۰ھ تک صرف چار کبیسہ سالوں کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ دس شمسی سالوں کے دن (3652) ہوتے ہیں اور دس قمری سالوں کی تعداد ایام (3543) ہوتی ہے گویا (۱۰۹) دن یا بالفاظ دیگر تین ماہ اکیس دن کا فرق پڑتا ہے، جس کو قمری شمسی تقویم میں صرف اسی صورت سے پورا کیا جا سکتا ہے کہ پورے چار ماہ کا اضافہ کر دیا جائے جس کے نتیجے میں گیارھویں سال خود بخود شمسی اور قمری تقویم کی تعداد ایام تقریباً مساوی ہو جائے گی۔

آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ البیرونی اور البیرونی کے بعد سر ولیم میور (MUIR) کو اس بات پر پورا اصرار تھا کہ اہلِ مکّہ نے اپنا طریقۂ نسیٔ یہودیانِ مدینہ سے حاصل کیا تھا، اس خیال کی اگرچہ تردید کی جا چکی ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا سکتا کہ یہودی اور مکّی تقویم کی ابتداء (اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر) ایک ہی نقطۂ فصلی سے ہوتی، اور غالباً یہی مشابہت تھی، جس کو پیشِ نظر رکھ کر البیرونی یا اس کے کسی ابتدائی راوی کو اتنا عظیم دھوکا ہوا، تاہم اس اصُول کی روشنی میں کہ عہدِ رسالتؐ میں یہودی اور عربی تقویم (ایک حد تک) متوازی چل رہی تھی، مکّے کی گم شدہ تقویم کی بازیافت کا ایک طریقہ یہ بھی ممکن تھا کہ خود یہودیوں کی تقویم کی مدد سے جو ہنوز زندہ ہے، عربوں کی مُردہ تقویم میں جان ڈال جائے مگر میری رائے میں یہ طریقہ اس لیے مناسب نہ تھا کہ ظہورِ اسلام کے وقت اس میں موجودہ یکسانیت اور ہم آہنگی نظر نہیں آتی، اور مختلف مقامات پر کبیسہ سالوں کے بالکل مختلف فارمولے رائج ملتے ہیں البیرونی نے بڑی صراحت کے ساتھ ان اختلافات کو بیان کیا ہے، جس کو دیکھ کر یہ فیصلہ دُشوار ہو جاتا ہے کہ مدینے اور حجاز میں کونسا فارمولا رائج تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی قوم میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اتنے مختلف اصُول کس طرح قابلِ عمل تھے۔

بنا بریں میری رائے میں سب سے زیادہ سہل اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ عام حسابی قاعدوں کی مدد سے سنہ وار ایسے چاندوں کا انتخاب کر لیا جائے جن کی رویت نقطۂ اعتدال خریفی (۲۲ ستمبر) کے متصل ہوئی ہو، اور ان کو سال کا پہلا مہینہ شمار کر کے پورا کیلنڈر مرتب کر لیا جائے۔

قمری تقویم کے بموجب یہ چاند حسبِ ذیل ہو سکتے ہیں:۔

سنہ ۱	یکشنبہ	۱۲ ستمبر ۶۲۲ء
سنہ ۲	ہفتہ	۱ اکتوبر ۶۲۳ء
سنہ ۳	پنجشنبہ	۲۰ ستمبر ۶۲۴ء
سنہ ۴	دوشنبہ	۹ ستمبر ۶۲۵ء
سنہ ۵	ہفتہ	۲۸ ستمبر ۶۲۶ء
سنہ ۶	پنجشنبہ	۱۷ ستمبر ۶۲۷ء
سنہ ۷	چہارشنبہ	۵ اکتوبر ۶۲۸ء
سنہ ۸	دوشنبہ	۲۵ ستمبر ۶۲۹ء
سنہ ۹	جمعہ	۱۴ ستمبر ۶۳۰ء
سنہ ۱۰	چہارشنبہ	۲ اکتوبر ۶۳۱ء

یہ جملہ چاند ایسے ہیں جن کی ۱۴ تاریخ کو سورج یقیناً برج میزان میں اور چاند بحالتِ بدر اس کے مقابل برجِ حمل میں ہونا چاہیئے۔ ان میں صرف سنہ ۸ ایک ایسا سال ہے جو مروجہ یہودی تقویم کے اصول پر پورا نہیں اُترتا، اگر میرے نزدیک اہلِ مکہ چونکہ محرم کی ابتدا ہمیشہ ایسے چاند سے کرتے تھے جس کی رویت نقطۂ اعتدالِ خریفی سے نزدیک تر ہوتی، اور سورج مہینے کے بڑے حصے یا کم از کم نصف ماہ تک برج میزان میں رہتا، اس بناء پر ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ ۵ ستمبر کی رویتِ ہلال کو محرم کا مدخل کسی طرح قرار نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ یہ نقطۂ اعتدالِ خریفی سے پیچھے رہے گا، اور چاند بحالتِ بدر بجائے برجِ حمل کے حوت میں ہوگا۔ بوجوہِ بالا میری رائے میں مکی تقویم کی ابتدا صرف اُن چاندوں سے ممکن تھی، جن کی فہرست میں نے اُوپر دی ہے۔

اب صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ سنہ ۱ ہجری سے سنہ ۱۰ ہجری تک کن کن سالوں کو کبیسہ اور غیر کبیسہ قرار دیا جائے اور کبیسہ مہینے سال کے آخر میں بڑھائے جائیں یا وسطِ سال میں، جیسا کہ یہودیوں میں یہ دستور تھا۔

یہ مسئلہ نہایت مشکل ہے اس لیے کہ تاریخ میں ایسی کوئی مثبت شہادت نہیں جس کو قاعدۂ کلیہ کے طور پر پیش کیا جا سکے، بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مہینے سال کے آخر میں بڑھتے اور بعض مورخوں کا بیان ہے کہ شروع سال میں بڑھائے جاتے، جس سے صرف اس قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ نساۂ عرب کبھی آخر سال میں ان کا اضافہ کرتے کبھی شروعِ سال میں اور ایک دو روائتیں درمیان سال کی بھی ملتی ہیں۔

مثلاً شہرستانی کا بیان ہے:۔

"اور ان میں کچھ لوگ وہ تھے جو مہینوں میں "نسی" کرتے تھے، اور وہ ہر دوسرے برس میں ایک ماہ اور ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ کیا کرتے اور جب اس سال حج کرتے تو ملبہ روک لیتے کہ

یوم ترویہ، یوم عرفہ اور یوم نحر ذوالحجہ کے مہینے میں قرار دیں، یہاں تک کہ اسی بڑھائے ہوئے مہینے کی دسویں تاریخ کو یوم نحر قرار دینے " (شہرستانی ۴۴۳/۲)

مسعودی نے اپنی کتاب التنبیہ والاشراف میں شہرستانی کے مقابلے میں زیادہ واضح الفاظ استعمال کئے ہیں :۔

" اور وہ ہر تین سال میں ایک مہینے کی اس طرح بیشی کرتے کہ سال میں سے ایک مہینہ گرا دیتے۔ اور اگلے مہینے کو اس بڑھائے ہوئے مہینے کا نام دے دیا کرتے اور یوم ترویہ اور یوم عرفہ اور یوم النحر کو اس مہینے کی آٹھ، نو اور دس تاریخ کو مناتے تھے۔ بس سال کے باقی مہینوں میں بھی یہی صورت وہ رہ کرتی رہتی، اور وہ اس طرح دوسری اُمتوں سے اُن کے شمسی سال کی مدت اور وقت میں قریب آجاتے۔"

وہ لوگ یہی کرتے رہے تاآنکہ اسلام ظاہر ہوا، اور رسول اللہؐ نے مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد ابوبکرؓ کو آنحضرتؐ نے ہجرت کے نویں سال حج کو بھیجا اور انھوں نے لوگوں کے ساتھ حج کیا اور یہ مشرکوں کا آخری حج تھا۔

(التنبیہ والاشراف /۲۱۹)

شہرستانی اور مسعودی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسی کا یہ مہینہ ہر دوسرے تیسرے سال ہمیشہ ذوالحجہ کے بعد بڑھایا جاتا بلکہ اس سال خاص حج کی تین بڑی رسمیں جو یوم ترویہ، یوم عرفہ اور یوم النحر کو ہوتیں، روک لی جاتیں اور ان رسوم کو اس بڑھائے ہوئے مہینے کی آٹھویں، نویں اور دسویں تاریخ کو ادا کیا جاتا تاکہ آنے والے مہینے کا نام محرم رکھا جاسکے اور سال پھر محرم کے مقدس مہینے سے شروع ہو کر ذوالحجہ پر ختم ہو۔

نیز ان سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ نُسّاۃِ عرب کبیسہ کے مہینے کو ہمیشہ ذوالحجہ کا مہینہ قرار دیتے، جو حرام مہینہ شمار ہوتا تھا، مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ قرآنِ مجید میں صراحت ہے کہ کبھی اس مہینے کو حلال قرار دیا جاتا اور کبھی حرام؛ یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا ؕ

بنا بریں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قلامسہ ہمیشہ اس مہینے کو ذوالحجہ کا نام دینے کے پابند تھے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ اور بھی اصول مقرر تھے جس سے یہ مہینہ حلال ہو جاتا۔

متعدد علماء کا خیال ہے کہ ایامِ جاہلیت میں ماہِ محرم کا حقیقی نام "صفر" تھا، جب یہ مہینہ حرام کیا جاتا تو اس کو محرم کہتے ورنہ صفر ہی کے نام سے پکارا جاتا، چنانچہ بلوغ الارب میں ہے کہ ایامِ حج میں قلمّس جمرۃ العقبہ کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کرتا کہ :۔

" میں نے اس سال صفر کے دو مہینوں میں سے آخری صفر کو حرام قرار دیا ہے، اور پہلے صفر کو حلال کر دیا۔

اور اس طرح دونوں رجبوں (رجب اور شعبان) کے درمیان عمل کرتے۔" (بلوغ الارب ۲ /۲۹۸)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ مہینہ محرم اور صفر کے درمیان بڑھایا جاتا اور گاہ گاہ رجب اور شعبان کے درمیان بھی، مرزوقی کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے کہ یہ مہینہ محرم اور صفر کے درمیان بھی بڑھتا۔

او ذوالحجہ میں جب عرب حج کے لیے جمع ہوتے تو اعلان کرتے، والاکثر اعوناء اور حسان کرتا کہ اے لوگو! ہم نسی کرنا چاہتے ہیں اور اس کو فرض کر دینا چاہتے ہیں،

اے لوگو! محرم صفر ہے اور صفر محرم اکبر ہے تو محرم میں قتال وغیرہ حلال کر دیتے اور صفر میں حرام کر دیتے ۔“ (المرزوقی)

گویا جب ”نسی“ کے مہینے کو حلال کیا جاتا تو اس کو ذوالحجہ کے بعد بڑھا کر اس کا نام صفر رکھ دیتے اور اس کے بعد کے مہینے کو محرم قرار دے دیا جاتا، اور جب اُسے حرام کرنا مقصود ہوتا، تو اس کا نام ”ذوالحجہ“ یا ”محرم“ ہی ہوتا اور محرم کے بعد والے مہینے کو بھی محرم قرار دیا جاتا۔

ولہاوزن (WELHOUSEN) کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ مہینہ محرم اور صفر کے درمیان بڑھایا جاتا، لیکن مسعودی اور شہرستانی کے بیانات کی روشنی میں جو اُوپر گزر چکے ہیں، ولہاوزن کے اس خیال کو قاعدہ کلیہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی، اس پر ابن حبیب کے مندرجہ ذیل بیان کا اور اضافہ کیجیے۔

”پس ان قلمسوں میں سے ایک قلمس ایامِ تشریق میں حجر میں کھڑا ہوتا، اور اُن کو فتویٰ دیتا، اس کے علاوہ کسی اور شخص سے سوال نہیں کیا جاتا، پس ان میں سے ایک شخص کعبے کے دروازے کے پاس کھڑا ہوتا اور دوسرا حجر میں، پھر ان میں سے ہر ایک کہتا:-
”انا الذی لا اعاب ولا احاب ولا یرد قضا“ پھر اگر اس کے پاس کچھ لوگ ایسے آتے جو محرم میں لُوٹ کھسوٹ چاہتے وہ اس سے محرم کو پیچھے ہٹا دینے کی درخواست کرتے جس پر وہ ان کی خاطر حساب لگاتا اور کہتا کہ سال صفر اول رہے گا، اور یہ بات وہ اُس حساب سے کہتا جس پر سنہ کا دورہ نہ ہوتا، اور وہ سال چاندوں سے شروع نہ ہوتا، اور نہیں جانا جاتا تھا کہ یہ مہینہ کیا ہے، تو لوگ اس پر عمل درآمد کرتے اور محرم پیچھے ہٹا دیا جاتا اور صفر مقدم کر دیا جاتا، اس طرح ایک سال محرم کو حلال اور دوسرے سال حرام کر دیتے۔“ (ابن حبیب / ۱۵۷)

ابن حبیب نے اگرچہ جاہلی نساۃ پر بہت کچھ الزام لگانے کی کوشش کی ہے تاہم اس بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلیت کے تقویمی حسابات کا مدار حقیقتاً رویتِ قمر پر نہیں تھا، ”وکانت لا تاخذ بالاھلۃ ولا تندھی مأخذ“ بلکہ روایاتِ قمر کو حسابوں کے مطابق کرنا پڑتا۔

بہر حال مندرجہ بالا بیانات پر مجموعی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نساۃ عرب کبھی تو نسی کا مہینہ سال کے آخر میں بڑھاتے اور کبھی شروع سال میں، جس کا اعلان بہر صورت ذوالحجہ ہی میں کیا جاتا، جب یہ مہینہ سال کے آخر میں بڑھایا جاتا تو اسی سال حج کی تین بڑی رسمیں روک لی جاتیں جو اس بڑھائے ہوئے مہینے میں ادا کی جاتیں، اس طرح جب یہ مہینہ شروع سال میں بڑھایا جاتا تو نساۃ کو اختیار ہوتا کہ وہ اس مہینے کو صفر قرار دیں یا محرم، گویا یہ بات نساۃِ مکہ کے ہاتھ میں تھی، کہ زائرینِ حج کی واپسی پرامن و آشتی ہو جائے یا اس پروانۂ امن کو واپس لے لیا جائے جو مذہب نے ان کی سہولت کے لیے جاری کیا تھا۔

میری رائے میں ” یُحِلُّوْنَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَہٗ عَامًا “ کا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ بعض فلکی حسابات اور احترامِ دین کے محرمات پر مبنی ہو، لیکن اس میں نساۃ مکہ کی اغراض بھی وابستہ ہو جائیں اور ان کے اختیارات تمیزی کو نظر انداز

پر ڈال دیتیں۔

بہرحال یہ مسئلہ ہنوز تشنہ ہے کہ سنہ ۱ ہجری سے سنہ ۱۰ ہجری تک نسی کے مہینے سال کے آخر میں بڑھائے گئے تھے یا ابتداء سال میں، یا وہ کون سا سنہ تھا، جس میں یہ مہینہ آخر میں بڑھایا گیا تھا اور کس سنہ کی ابتداء "نسی" سے کی گئی تھی، اس سلسلے میں مجھے یہ اعتراف کرنا ہے کہ تلاش و کوشش کے باوجود بھی اوراقِ تاریخ میں کوئی اشارہ نہ مل سکا، جس کی بناء پر کوئی اصول یا قاعدہ کلیہ پیش کیا جا سکے، ہاں اتنی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس سال یہ اضافہ سال کے آخر میں ہوتا، اُس سال مکہ میں زائرین اور حجاج کا اجتماع ایک مہینے زیادہ رہتا، کیونکہ حج کی تین بڑی رسمیں یعنی یوم ترویہ، یوم عرفہ اور یوم النحر اس سال نسی کے مہینے میں ادا کی جاتیں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس کو حرام مہینہ قرار دیا جاتا، لیکن جس سال نسی کا مہینہ ابتدائے سال میں یعنی محرم و صفر کے درمیان بڑھایا جاتا۔ اس سال ایامِ حج قدرتاً ٹھیک وقت پر آتے اور حجاج کو زیادہ زحمتِ انتظار نہ کرنا پڑتی۔

میرا خیال ہے کہ سال کے آخر میں اضافہ پروہتوں، تاجروں اور مذہبی علماء کی مقدس اور مذہبی لوٹ کے لیے ایک پرانہ جواز تھا، جس کو نساۃ مکہ جب چاہتے لگا سکتے تھے بہرصورت میں نے یہ کیا ہے کہ ابتدائی دو سالوں یعنی سنہ ۱ اور سنہ ۲ کے آخر میں اور آخری دو سالوں یعنی سنہ ۸ اور سنہ ۹ کی ابتداء میں یہ اضافے اس طرح کئے ہیں کہ ہلالِ محرم ہمیشہ اعتدالِ خریفی کے متصل رہے اور ایامِ حج سورج کے برج سنبلہ میں ہونے کی حالت میں آئیں اور میری رائے میں یہ اضافے شاید ہوئے بھی اسی طرح تھے۔

سنہ ۹ کا اضافہ بالبداہت سنہ ۸ کے ایامِ حج میں کیا گیا ہو گا۔ کیونکہ مشرکینِ قریش کا یہ آخری حج تھا، اس طرح سنہ ۸ کا اضافہ سنہ ۷ کے ایامِ حج میں ہوا ہوگا، ان اصولوں کے ماتحت اگر سنہ ۱ سے لے کر سنہ ۱۱ تک جداولِ تقویم بنائی جائیں تو وہ حسبِ ذیل ہوں گی۔

سنہ ۱	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ ۵
محرم ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء دوشنبہ	محرم ۲ اکتوبر ۶۲۳ء یکشنبہ	محرم ۲۱ ستمبر ۶۲۴ء جمعہ	محرم ۱۰ ستمبر ۶۲۵ء سہ شنبہ	محرم ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء یکشنبہ
صفر ۱۳ اکتوبر، چہارشنبہ	صفر ۳۱ اکتوبر، دوشنبہ	صفر ۲۰ اکتوبر، شنبہ	صفر ۹ اکتوبر، چہارشنبہ	صفر ۲۸ اکتوبر، سہ شنبہ
ربیع الاوّل ۱۱ نومبر، پنجشنبہ	ربیع الاوّل ۳۰ نومبر، چہارشنبہ	ربیع الاوّل ۱۹ نومبر، دوشنبہ	ربیع الاوّل ۸ نومبر، جمعہ	ربیع الاوّل ۲۶ نومبر، چہارشنبہ

سنہ ۱	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ
ربیع الآخر ۱۱ردسمبر، شنبہ	ربیع الآخر ۲۹ردسمبر، پنجشنبہ	ربیع الآخر ۱۸ردسمبر، سہ شنبہ	ربیع الآخر ۰ردسمبر، شنبہ	ربیع الآخر ۲۶ردسمبر، جمعہ
جمادی الاولیٰ ۹رجنوری ۶۲۳ء یکشنبہ	جمادی الاولیٰ ۲۸رجنوری ۶۲۴ء شنبہ	جمادی الاولیٰ ۱۷رجنوری ۶۲۵ء پنجشنبہ	جمادی الاولیٰ ۶رجنوری ۶۲۶ء، دوشنبہ	جمادی الاولیٰ ۲۴رجنوری ۶۲۷ء شنبہ
جمادی الاُخریٰ ۸رفروری، سہ شنبہ	جمادی الاُخریٰ ۲۶رفروری یکشنبہ	جمادی الاُخریٰ ۱۵رفروری، جمعہ	جمادی الاُخریٰ ۴رفروری، سہ شنبہ	جمادی الاُخریٰ ۲۳رفروری، دوشنبہ
رجب ۹رمارچ، چہارشنبہ	رجب ۲۷رمارچ، سہ شنبہ	رجب ۱۷رمارچ، یکشنبہ	رجب ۶رمارچ، پنجشنبہ	رجب ۲۴رمارچ سہ شنبہ
شعبان ۸راپریل، جمعہ	شعبان ۲۵راپریل، چہارشنبہ	شعبان ۱۵راپریل دوشنبہ	شعبان ۴راپریل، جمعہ	شعبان ۲۳راپریل پنجشنبہ
رمضان ۷رمئی، شنبہ	رمضان ۲۵رمئی، جمعہ	رمضان ۱۵رمئی، چہارشنبہ	رمضان ۴رمئی، یکشنبہ	رمضان ۲۳رمئی، شنبہ
شوال ۶رجون، دوشنبہ	شوال ۲۴رجون، یکشنبہ	شوال ۱۳رجون پنجشنبہ	شوال ۲رجون، دوشنبہ	شوال ۲۲رجون دوشنبہ
ذیقعدہ ۵رجولائی، سہ شنبہ	ذیقعدہ ۲۴رجولائی، سہ شنبہ	ذیقعدہ ۱۳رجولائی، شنبہ	ذیقعدہ ۲رجولائی، چہارشنبہ	ذیقعدہ ۲۱رجولائی، سہ شنبہ
ذوالحجہ ۴راگست، پنجشنبہ	ذوالحجہ ۲۲راگست، چہارشنبہ	ذوالحجہ ۱۱راگست، یکشنبہ	ذوالحجہ ۳۱رجولائی، پنجشنبہ	ذوالحجہ ۲۰راگست، پنجشنبہ
ذوالحجہ نسی ۲رستمبر، جمعہ	× × × × × ×	× × × × × ×	ذوالحجہ نسی محرم ۳۰راگست، شنبہ	× × × × × ×

سنہ ۶ھ	سنہ ۷ھ	سنہ ۸ھ	سنہ ۹ھ	سنہ ۱۰ھ
محرم ۱۸ر ستمبر ۶۲۷ء ، جمعہ	محرم ۹ر اکتوبر ۶۲۸ء پنجشنبہ	محرم ۲۶ر ستمبر ۶۲۹ء، سہ شنبہ	محرم ۱۵ر ستمبر ۶۳۰ء ، شنبہ	محرم ۲ر اکتوبر ۶۳۱ء پنجشنبہ
محرم النسی، صفر ۱۸ر اکتوبر ، یکشنبہ	صفر ۴ر نومبر ، جمعہ	صفر ۱۵ر اکتوبر ، چہار شنبہ	محرم النسی ، صفر ۱۴ر اکتوبر ، یکشنبہ	صفر ۲ر نومبر ، شنبہ
صفر ۱۶ر نومبر ، دوشنبہ	ربیع ۱ ۴ر دسمبر ، یکشنبہ	ربیع ۱ ۲۴ر نومبر ، جمعہ	صفر ۱۳ر نومبر ، سہ شنبہ	ربیع ۱ یکم دسمبر ، یکشنبہ
ربیع ۱ ۱۶ر دسمبر ، چہار شنبہ	ربیع ۲ ۲ر جنوری ۶۲۹ء دوشنبہ	ربیع ۲ ۲۳ر دسمبر ، شنبہ	ربیع ۱ ۱۲ر دسمبر ، چہار شنبہ	ربیع ۲ ۳۱ر دسمبر ، سہ شنبہ
ربیع ۲ ۱۴ر جنوری ۶۲۸ء پنجشنبہ	جمادی ۱ یکم فروری ، چہار شنبہ	جمادی ۱ ۲۲ر جنوری ۶۳۰ء دوشنبہ	ربیع ۲ ۱۱ر جنوری ۶۳۱ء ، جمعہ	جمادی ۱ ۲۹ر جنوری ۶۳۲ء چہار شنبہ
جمادی ۱ ۱۳ر فروری ، شنبہ	جمادی ۲ ۲ر مارچ ، پنجشنبہ	جمادی ۲ ۲۰ر فروری ، سہ شنبہ	جمادی ۱ ۹ر فروری ، شنبہ	جمادی ۲ ۲۸ر فروری، جمعرات ، جمعہ
جمادی ۲ ۱۳ر مارچ ، یکشنبہ	رجب ۱ر اپریل ، شنبہ	رجب ۲۳ر مارچ ، پنجشنبہ	جمادی ۲ ۱۱ر مارچ ، دوشنبہ	رجب ۲۹ر مارچ ، یکشنبہ
رجب ۱۲ر اپریل ، سہ شنبہ	شعبان ۱ر مئی ، دوشنبہ	شعبان ۲۰ر اپریل ، جمعہ	رجب ۹ر اپریل ، سہ شنبہ	شعبان ۲۸ر اپریل، سہ شنبہ
شعبان ۱۱ر مئی ، چہار شنبہ	رمضان ۳۱ر مئی ، چہار شنبہ	رمضان ۲۰ر مئی ، یکشنبہ	شعبان ۹ر مئی ، پنجشنبہ	رمضان ۲۷ر مئی چہار شنبہ، پنجشنبہ
رمضان ۱۰ر جون ، جمعہ	شوال ۲۹ر جون ، پنجشنبہ	شوال ۱۸ر جون ، دوشنبہ	رمضان ۷ر جون ، جمعہ	شوال ۲۶ر جون ، جمعہ
شوال ۹ر جولائی ، شنبہ	ذیقعدہ ۲۹ر جولائی ، شنبہ	ذیقعدہ ۱۸ر جولائی ، چہار شنبہ	شوال ۷ر جولائی ، یکشنبہ	ذیقعدہ ۲۵ر جولائی ، شنبہ
ذیقعدہ ۸ر اگست ، دوشنبہ	ذوالحجہ ۲۷ر اگست ، یکشنبہ	ذوالحجہ ۱۶ر اگست پنجشنبہ	ذیقعدہ ۵ر اگست ، دوشنبہ	ذی الحجہ ۲۴ر اگست ، دوشنبہ
ذوالحجہ ۶ر ستمبر ، سہ شنبہ	××××××	×××××××	ذوالحجہ ۴ر ستمبر ، چہار شنبہ	××××××

ان جدولوں کو میں نے اس اصول پر مرتب کیا ہے کہ قمری تاریخوں میں ہفتے کا جو دن DAY OF THE WEEK متداولہ تقویموں میں تسلیم کر لیا گیا ہے وہ علی حالہٖ برقرار رہے، اس سلسلہ میں کننگھم (CUNINGHAM) اور وسٹنفلڈ (WUSTENFELDS) کی تقویموں سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا گیا ہے، جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

عام تقویمی قاعدہ یہ ہے کہ قمری سنین میں محرم کے تیس اور صفر کے اونتیس ۲۹ دن شمار کیے جاتے ہیں، اسی طرح ایک مہینہ تیس کا اور دوسرا اونتیس ۲۹ کا مانا جاتا ہے، مگر ان جدولوں میں مذکورہ بالا اصول کے تحت اس طریقے کی خلاف ورزی کرنا پڑی تاکہ بین الاقوامی تقویموں سے بہرحال مطابقت رہے۔ مثلاً ۲ سنہ کے محرم کو تیس دن کا اور صفر کو اُنتیس دن کا شمار کرنا چاہیے جس کے حساب سے صفر ۲ سنہ سہ شنبہ یکم نومبر ۶۲۳ء کو شروع ہوتا مگر وسٹنفلڈ کی تقویم میں ایک قمری مہینہ دوشنبہ ۳۱ اکتوبر کو شروع ہو رہا تھا جو میرے نظریہ کے بموجب بھی صفر ۲ سنہ سے مطابق تھا، اس لیے میں نے صفر کی پہلی تاریخ بجائے یکم نومبر کے ۳۱ اکتوبر برقرار دی ہے، تاکہ مسلمہ تاریخوں اور دنوں سے پوری مطابقت رہے، یہی طریقہ دوسرے مہینوں کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اس لیے ہو سکتا ہے، کہ کہیں کہیں قارئین کو ایک دن کا فرق محسوس ہو، لیکن یہ فرق ایسا نہیں جو کسی طرح بھی قابلِ لحاظ سمجھا جائے، کیونکہ قمری تقویموں میں اس قسم کا ایک روزہ فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور اکثر و بیشتر ہر تاریخ کی کتاب میں نظر آتا ہے، جس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، کبھی یہ فرق اختلافِ رویت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی تقویمی اصولوں کے اختلاف کے باعث، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعہ نگار کو صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوتی، یا غلط فہمی ہو جاتی ہے، بہرحال یہ مسئلہ ایسا نہیں جو زیادہ قابلِ بحث ہو۔

مقالۂ گزشتہ میں چند در چند مثالیں دے کر یہ بات پیش کی گئی تھی کہ واقعاتِ سیرۃ کی تقریباً ۳/۴ روایات مروجہ تقویمی اصولوں پر پوری نہیں اُترتیں، کبھی دن تاریخوں سے مطابقت نہیں کرتے، کبھی مہینے موسموں سے، جس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ اس قسم کے جملہ واقعات مکے کی گم شدہ تقویم کے مطابق ریکارڈ کیے گئے تھے، اس تقویم کا اکتشاف کر لیا جائے تو یہ تضاد دُور ہو سکتے ہیں، اب جبکہ میرے دعوے کے بموجب اس گم شدہ تقویم کی بازیافت کر لی گئی ہے تو اصولاً ان تمام واقعات کی توقیتی صراحتوں کو مجموعی طور پر ان جدولوں پر پورا اُترنا چاہیے، دو چار تاریخوں کی درستی کے معنی اتفاقات بھی ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ ان جدولوں کی پوری افادیت تو مقالۂ چہارم میں قارئین کے سامنے آئے گی جہاں دو تقویمی نظریئے کا ہر پہلو پیش کیا جائے گا، اور سیرۃ کی تقریباً جملہ توقیتی شہادتوں کی روشنی میں اس کو پرکھنے کی کوشش کی جائے گی، تاہم قارئین اگر چاہیں تو بطورِ خود ان جدولوں کی ابتدائی آزمائش فرما سکتے ہیں، میں دو ایک مثالیں دے کر طریقۂ عمل کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔

مقالۂ اوّل میں راقم الحروف نے قسم وار توقیتی تضادات کی مثالیں پیش کی ہیں، انھیں مثالوں سے ابتدائی تین قسموں کی جانچ فرما کر دیکھیے۔ مثلاً:

ہجرت کی مجمع علیہ تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱ سنہ بیان کی گئی ہے، جو عام قمری تقویموں پر پوری نہیں اُترتی، اس کے لیے میری ۱ سنہ کی جدول میں ربیع الاوّل ملاحظہ فرمائیے جو پنجشنبے کے دن شروع ہو رہا ہے، اس حساب سے ۱۲ ربیع الاوّل

کو دوشنبہ ہی پڑے گا۔

اسی طرح دوسرے واقعات کی تاریخوں اور دنوں کا امتحان کیا جا سکتا ہے، ان میں بعض ریکارڈ ایسے بھی ملیں گے جن میں ایک دن کا فرق محسوس ہوگا، لیکن اس فرق کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔

موسمی مطابقت کا اندازہ انگریزی مہینوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ہر قمری مہینے کے نیچے لکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً: بدر، اُحد، فتح مکہ اور حنین وغیرہ تمام غزوات کا تعلق از روئے روایات موسمِ گرما سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر عام تقویمی اعتبار سے یہ سرمائی واقعات سمجھے جاتے تھے ان جدولوں سے معلوم ہوگا کہ یہ غلط فہمی محض مکی تقویم کو فراموش کر دینے کا نتیجہ تھی، کیونکہ ان جملہ واقعات کی تاریخیں مئی، جون اور جولائی سے مطابق ہو جاتی ہیں اسی طرح سرمائی واقعات مثلاً سریۂ ذاتِ سلاسل، سریۂ علقمہ بن مجزز وغیرہ کی تاریخیں سرمائی مہینوں سے پوری طرح مطابقت کرتی ہیں۔

۲۷ر جنوری ۶۳۲ء کا سورج گرہن جو ابراہیم بن رسول اللہؐ کے انتقال کے روز ہوا تھا۔ ربیع الآخر سے اور خسرو پرویز کی تاریخ قتل فروری ۶۲۸ء جمادی ۶ سنہ سے عین مطابق ہے۔ میں مقالۂ چہارم میں پوری تفصیل سے ان مطابقتوں کو پیش کروں گا اس لیے اِس سرسری مطابقت سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ واقعاتِ سیرۃ کے توقیتی تضاد پوری طرح حل ہو چکے ہیں اور ہمیں اپنی تحقیقات ختم کر دینا چاہیئے۔

مدنی کلینڈر (۳)

میں نے اپنے نظریہ میں جہاں واقعاتِ سیرۃ پر مکی تقویم کی اثراندازی کا اظہار کیا ہے، وہیں یہ بات بھی پیش کی ہے کہ سیرت کے بہت سے واقعات کی توقیتی صراحتوں پر ایک خالص قمری تقویم کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے، جو میری رائے میں مدنی تقویم کے نام سے موسوم ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش کی جا چکی ہے کہ اگرچہ یہ دونوں تقویمیں اصولی اور بنیادی طور پر مختلف تھیں، لیکن ان کے مہینے قطعاً مشترک الاسم معلوم ہوتے ہیں۔

اوراقِ گزشتہ میں مکی تقویم کی بازیافت کے بعد اب یہی دو مسئلے (یعنی مدنی تقویم اور اس کے مشترک الاسم مہینے) قابلِ غور رہ جاتے ہیں۔

جہاں تک مدنی تقویم کی جُداگانہ حیثیت کا تعلق ہے تو تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینے میں مکی یا کوئی اور بیرونی سنہ بجز یہودی سنہ کے رائج نہ تھا، نیز یہ کہ مدینے کا سنہ مکی سنہ سے بالکل مختلف تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ مدینہ اپنے "آطام" سے شمارِ ایام کیا کرتے تھے اور البیرونی کی شہادت کے مطابق مدنی لوگوں میں مشاہیر کے نام سے سنین چلانے کا دستور بھی موجود تھا۔

اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اہلِ مدینہ کے سنہ ہمیشہ قمری ہوتے، اور ان میں قمری شمسی (LUNI SOLAR) سنین کا رواج مطلقاً نہ تھا۔

زمانۂ قدیم میں قمری شمسی تقویم کی ابتدائی غرض اور حقیقی افادیت بجز اس کے اور کچھ نہ تھی، کہ اس کے ذریعہ مرکزی معبدوں پر بدایا اور زرعی پیداواروں کے اوّلین حاصل ٹھیک وقت پر پہنچ سکیں۔

ظہورِ اسلام کے وقت حجاز کے تین بڑے شہروں یعنی مکے، طائف اور مدینے میں "صرف مدینہ ہی ایک ایسا شہر تھا جہاں کوئی بڑا یا مرکزی معبد نظر نہیں آتا، قرب و جوار میں چند چھوٹے چھوٹے مندر ملتے ہیں، ان کی اوراقِ تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں، قبولِ اسلام سے پہلے مدینے کے لوگ "مناۃ" کے خاص طور پر پرستار تھے، لیکن اس دیوی کا مندر بھی مدینے میں نہ تھا، بلکہ مکے کے قریب مشلّل میں تھا، سال میں صرف ایک بار جب مدینے کے حاجی مکے پہنچتے تو اس مندر کی زیارت بھی کرتے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کو اپنی عام ضروریات میں قمری شمسی تقویم کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

اس خیال کو مزید تقویت یوں ہوتی ہے کہ جن مقامات پر قمری شمسی تقویم کا رواج ہوتا وہاں اس کے حسابات کو درست رکھنے کے لیے مستقل عہدے دار مقرر کئے جاتے، چنانچہ رومیوں، یہودیوں اور خود اہلِ مکہ کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان میں "نساۃ" کے محکمے بالکل مستقل تھے۔ مدینے کے لوگ اگرچہ مذہبًا اہلِ مکہ سے بہت کچھ مختلف اور آزاد تھے، تاہم تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں کہ اُن کے یہاں بھی یہ محکمہ یا "نسی" کرنے والوں کا عہدہ موجود تھا، حالانکہ اس شہر کے متعلق ظہورِ اسلام کے زمانے کے حالات کافی محفوظ ہیں۔

قطع نظر اس سے خود واقعاتِ سیرت کی توقیتی شہادتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت مدینے میں ایک خالص قمری تقویم رائج تھی۔ میں نے مقالۂ گزشتہ میں متعدد واقعات ایسے پیش کئے ہیں، جو ایک خالص قمری تقویم کے مطابق ریکارڈ کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جن کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر مدینے میں کوئی خالص قمری تقویم رائج نہ تھی تو یہ ریکارڈ کہاں سے آئے اور کس نے کئے؟ کیونکہ مہاجرینِ مکہ کا سنہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قمری شمسی تھا۔

یہ تمام شہادتیں اس بات کے حق میں بیان کی جاتی ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت مدینے میں جو تقویم رائج تھی، وہ خالص قمری تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یقینی معلوم ہوتی ہے کہ اس تقویم میں جو مہینے اور دن رائج تھے اُن کے نام وہی تھے جو مکی تقویم میں مستعمل ہوتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مورخین نے بڑی صراحت کے ساتھ متعدد جاہلی سنین اور شہور کے نام گنائے ہیں جو مختلف قبائل میں رائج تھے اور یہ نام عربی تقویم کے مروجہ ناموں سے بالکل مختلف بھی ہیں، بلکہ ان کے دنوں تک کے نام الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ نام مدینے میں بھی رائج تھے۔

اہلِ مدینہ سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روایتیں منقول ہیں، اور مدنی صحابہ نے اپنی روایتوں میں بڑی کثرت سے مہینوں اور دنوں

کے نام بھی لیے ہیں۔ لیکن سیرت اور حدیث کی کتابوں میں شاید ایک روایت بھی ایسی نہیں جس میں مروجہ ناموں کے علاوہ کوئی اور نام لیا گیا ہو۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اگر مدینے میں مہینوں اور دنوں کے کچھ اور نام رائج ہوتے تو کبھی نہ کبھی کسی مدنی راوی کی زبان سے وہاں کا مروجہ نام ضرور نکلتا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان ناموں کا تذکرہ اکثر و بیشتر رواۃ کی زبان پر ہوتا۔

پیغمبرِ اسلام کے آخری خطبۂ حج یعنی حجۃ الوداع میں بلاشبہ "رجب مُضر" کا نام آیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نام کا کوئی اور مہینہ دوسرے قبائل میں موجود تھا، آپ نے تخصیص کی خاطر "مُضر" کا اضافہ کر کے اس اشتباہ کو دور کر دیا لیکن اگر دیکھیے تو اس کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں کہ اہلِ مکہ کے اثر سے اُن کے مہینے دُور اور نزدیک قبائل میں مقبول کر لیے گئے تھے۔

مختلف النوع سنین اور ان کے مشترک الاسم مہینے تاریخ میں کوئی عجوبہ شے نہیں۔ آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ "یہودی" اور سریانی سنین کی بناوٹ میں بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں سنین ہنوز زندہ ہیں اور ایک سنہ آج بھی قمری شمسی اصولوں پر چل رہا ہے، جبکہ دوسرا خالص شمسی سنہ ہے۔ حالانکہ دونوں سنوں کے مہینے تقریباً مشترک الاسم ہیں، یہی کیفیت بکرمی، فصلی اور بنگلہ سنہ کی ہے۔ جن کے مہینے مشترک لیکن اصولِ تقویم جُدا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اہلِ مدینہ نے اپنے قمری سنہ کے مہینوں کے نام اسی طرح اہلِ مکہ سے لیے تھے جس طرح شام کے مسیحیوں نے اپنے کلینڈر کے مہینے یہودی تقویم سے۔

بہرصورت واقعاتِ سیرت کی توقیتی شہادتیں بتاتی ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں مدینے کے اندر دو قسم کی تقویمیں کارفرما رہیں، جن میں ایک خالص قمری تھی، اور دوسری قمری شمسی، مگر ان دونوں کے مہینوں اور دنوں کے نام قطعاً مشترک تھے۔

یہ تقویمیں کم سے کم ۹ھ تک پہلو بہ پہلو چلتی رہیں، حتیٰ کہ ۹ سنہ تک مکی تقویم کو مسلمانوں کی دینی تقویم کا مرتبہ بھی حاصل رہا۔ اور تمام مہاجر و انصار اسی کے ماہِ محرم میں صوم عاشورہ اور اسی کے ماہِ رمضان میں روزے رکھتے رہے ۲ سنہ کے بعد اور ۹ سنہ کی ابتداء میں جب پیغمبرِ اسلام نے اس تقویم کی تنسیخ کا اعلان فرمایا تو مسلمانوں کا مذہبی سنہ بجائے مکی کے مدنی بن گیا جو آج تک اسی طرح قمری چلا آ رہا ہے۔

مدنی سنہ کو اسلامی سلطنت کی قبولیت کا شرف خلیفۂ ثانی کے عہد کا واقعہ ہے اور اسی زمانے میں اس کا نام ہجری سنہ قرار دیا گیا۔[1] یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں اس سے نسبتاً کم واقعات ریکارڈ کئے گئے تھے۔

ہجری سنہ میں صرف بارہ قمری مہینے ہوتے ہیں، ایک قمری مہینہ چونکہ 29.53 دن کا ہوتا ہے اس لیے بارہ قمری ماہ یا ایک قمری سال 354.36 دن کا ہوا، لیکن عملی طور پر ایک سال 353 دن سے کم اور 355 دن سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ تین متواتر ماہ انتیس ۲۹ انتیس ۲۹ دن کے ہو سکتے ہیں، اور چار متواتر ماہ تیس ۳۰ تیس ۳۰ دن کے۔

منجمین حساب کی آسانی کے لیے محرم کو تیس ۳۰ دن کا اور صفر کو انتیس دن کا شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مہینہ تیس دن کا اور

---

[1] طبری ۲/۔

دوسرا انتیس کا قرار دیا جاتا ہے، ہر ۳۰ سالہ دور میں گیارہ سال ذوالحجہ کو بھی ۳۰ دن کا شمار کرتے ہیں[۱] لیکن یہ سب حسابی طریقے ہیں، سچ یہ ہے کہ حسابی رویت اور حقیقی رویت میں عملاً فرق پڑتا رہتا ہے جس کی وجہ سے عموماً توقیتی غلطیاں ہو جاتی ہیں، چاند ہوتا ہے اور نظر نہیں آتا، چاند نہیں ہوتا ہے اور ہم مان لیتے ہیں۔ بہر حال میں یہاں ۱ھ سے لے کر ۱۱ھ تک کی جدول تقویم پیش کرتا ہوں جن میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کا دن اور عیسوی تاریخ لکھ دی گئی ہے اور ان جدولوں کو میں نے کننگھم اور وسٹنفلڈ کی تقویموں سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا ہے۔

سنہ ۱ھ	سنہ ۲ھ	سنہ ۳ھ	سنہ ۴ھ	سنہ ۵ھ	سنہ ۶ھ
محرم جمعہ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء	محرم سہ شنبہ ۵ جولائی	محرم یکشنبہ ۲۴ جون	محرم پنجشنبہ ۱۳ جون	محرم دوشنبہ ۲ جون	محرم شنبہ ۲۳ مئی
صفر یکشنبہ ۱۵ اگست	صفر پنجشنبہ ۴ اگست	صفر سہ شنبہ ۲۴ جولائی	صفر شنبہ ۱۳ جولائی	صفر چہارشنبہ ۲ جولائی	صفر دوشنبہ ۲۲ جون
ربیع الاول دوشنبہ ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء	ربیع الاول جمعہ ۲ ستمبر	ربیع الاول چہارشنبہ ۲۲ اگست	ربیع الاول یکشنبہ ۱۱ اگست	ربیع الاول پنجشنبہ ۳۱ جولائی	ربیع الاول سہ شنبہ ۲۱ جولائی
ربیع الآخر چہارشنبہ ۱۳ اکتوبر	ربیع الآخر یکشنبہ ۲ اکتوبر	ربیع الآخر جمعہ ۲۱ ستمبر	ربیع الآخر سہ شنبہ ۱۰ ستمبر	ربیع الآخر شنبہ ۳۰ اگست	ربیع الآخر پنجشنبہ ۲۰ اگست
جمادی الاولیٰ پنجشنبہ ۱۱ نومبر	جمادی الاولیٰ دوشنبہ ۳۱ اکتوبر	جمادی الاولیٰ شنبہ ۲۰ اکتوبر	جمادی الاولیٰ چہارشنبہ ۹ اکتوبر	جمادی الاولیٰ یکشنبہ ۲۸ ستمبر	جمادی الاولیٰ جمعہ ۱۸ ستمبر
جمادی الاخریٰ شنبہ ۱۱ دسمبر	جمادی الاخریٰ چہارشنبہ ۳۰ نومبر	جمادی الاخریٰ دوشنبہ ۱۹ نومبر	جمادی الاخریٰ جمعہ ۸ نومبر	جمادی الاخریٰ سہ شنبہ ۲۸ اکتوبر	جمادی الاخریٰ یکشنبہ ۱۸ اکتوبر
رجب یکشنبہ ۹ جنوری ۶۲۳ء	رجب پنجشنبہ ۲۹ دسمبر	رجب سہ شنبہ ۱۸ دسمبر	رجب شنبہ ۷ دسمبر	رجب چہارشنبہ ۲۶ نومبر	رجب دوشنبہ ۱۶ نومبر
شعبان سہ شنبہ ۸ فروری	شعبان شنبہ ۲۸ جنوری ۶۲۴ء	شعبان پنجشنبہ ۱۷ جنوری ۶۲۵ء	شعبان دوشنبہ ۶ جنوری ۶۲۶ء	شعبان جمعہ ۲۶ دسمبر	شعبان چہارشنبہ ۱۶ دسمبر
رمضان چہارشنبہ ۹ مارچ	رمضان یکشنبہ ۲۶ فروری	رمضان جمعہ ۱۵ فروری	رمضان سہ شنبہ ۴ فروری	رمضان شنبہ ۲۴ جنوری	رمضان پنجشنبہ ۱۴ جنوری ۶۲۸ء

[۱] اس سلسلے میں دیکھیے میرا مقالہ جو ماہنامہ "زندگی" رامپور، جون ۶۲ء میں شائع ہو رہا ہے اور جس میں سنہ ہجری کے مداخل کے استخراج کے طریقے اور عیسوی سنہ سے مطابقت کے اصول پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ میں نے بخوفِ طوالت اس حصے کو زیرِ نظر مقالے سے علیحدہ کر دیا ہے۔
(علوی)

سنہ ۱	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ ۵	سنہ ۶
شوال جمعہ ۸ر اپریل	شوال سہ شنبہ ۲۷ رمارچ	شوال یکشنبہ ۱۷ رمارچ	شوال پنجشنبہ ۶ رمارچ	شوال دوشنبہ ۲۳ رفروری	شوال شنبہ ۱۳ رفروری
ذلیقعدہ شنبہ ۷ مئی	ذلیقعدہ چہارشنبہ ۲۵ راپریل	ذلیقعدہ دوشنبہ ۱۵ راپریل	ذلیقعدہ جمعہ ۴ راپریل	ذلیقعدہ سہ شنبہ ۲۴ رمارچ	ذلیقعدہ یکشنبہ ۱۳ رمارچ
ذوالحجہ دوشنبہ ۶ رجون	ذوالحجہ جمعہ ۲۵ رمئی	ذوالحجہ چہارشنبہ ۱۵ رمئی	ذوالحجہ یکشنبہ ۴ رمئی	ذوالحجہ پنجشنبہ ۲۳ راپریل	ذوالحجہ سہ شنبہ ۱۲ راپریل

سنہ ۷	سنہ ۸	سنہ ۹	سنہ ۱۰	سنہ ۱۱	سنہ ۱۲
محرم چہارشنبہ ۱۱ رمئی	محرم دوشنبہ یکم مئی	محرم جمعہ ۲۰ راپریل	محرم سہ شنبہ ۹ راپریل	محرم یکشنبہ ۲۹ رمارچ	
صفر جمعہ ۱۰ رجون	صفر چہارشنبہ ۳۱ رمئی	صفر یکشنبہ ۲۰ رمئی	صفر پنجشنبہ ۹ رمئی	صفر سہ شنبہ ۲۸ راپریل	
ربیع الاوّل شنبہ ۹ رجولائی	ربیع الاوّل پنجشنبہ ۲۹ رجون	ربیع الاوّل دوشنبہ ۱۸ رجون	ربیع الاوّل جمعہ ۷ رجون	ربیع الاوّل چہارشنبہ ۲۷ رمئی	
ربیع الآخر دوشنبہ ۸ راگست	ربیع الآخر شنبہ ۲۹ رجولائی	ربیع الآخر چہارشنبہ ۱۸ رجولائی	ربیع الآخر یکشنبہ ۷ رجولائی	ربیع الآخر جمعہ ۲۶ رجون	
جمادی الاولیٰ سہ شنبہ ۶ رستمبر	جمادی الاولیٰ یکشنبہ ۲۷ راگست	جمادی الاولیٰ پنجشنبہ ۱۶ راگست	جمادی الاولیٰ دوشنبہ ۵ راگست	جمادی الاولیٰ شنبہ ۲۵ رجولائی	
جمادی الاخریٰ پنجشنبہ ۶ راکتوبر	جمادی الاخریٰ سہ شنبہ ۲۶ رستمبر	جمادی الاخریٰ شنبہ ۱۵ رستمبر	جمادی الاخریٰ چہارشنبہ ۴ رستمبر	جمادی الاخریٰ دوشنبہ ۲۴ راگست	
رجب جمعہ ۴ رنومبر	رجب چہارشنبہ ۲۵ راکتوبر	رجب یکشنبہ ۱۴ راکتوبر	رجب پنجشنبہ ۳ راکتوبر		
شعبان یکشنبہ ۴ ردسمبر	شعبان جمعہ ۲۴ رنومبر	شعبان سہ شنبہ ۱۳ رنومبر	شعبان شنبہ ۲ رنومبر		
رمضان دوشنبہ ۲ رجنوری ۶۲۹ء	رمضان شنبہ ۲۳ ردسمبر	رمضان چہارشنبہ ۱۲ ردسمبر	رمضان یکشنبہ یکم دسمبر		

سنہ ۷	سنہ ۸	سنہ ۹	سنہ ۱۰	سنہ ۱۱	سنہ ۱۲
شوال چہارشنبہ ۱رفروری	شوال دوشنبہ ۲۲رجنوری سنہ ۶۳۰	شوال جمعہ ۱۱رجنوری سنہ ۶۳۱	شوال سہ شنبہ ۳۱ردسمبر		
ذیقعدہ پنجشنبہ ۲رمارچ	ذیقعدہ سہ شنبہ ۲۰رفروری	ذیقعدہ شنبہ ۹رفروری	ذیقعدہ چہارشنبہ ۲۹رجنوری		
ذوالحجہ شنبہ ۱راپریل	ذوالحجہ پنجشنبہ ۲۳رمارچ	ذوالحجہ دوشنبہ ۱۱رمارچ	ذوالحجہ جمعہ ۲۸رفروری		

گزشتہ مہینے یہ دلچسپ اتفاق ہوا کہ جن مضامین کی مجھے سخت ضرورت تھی وہ یہیں مل گئے، یعنی پرسیوال (PERCIVAL) اور محمود پاشا فلکی کے "نظریات" جن کے دلائل دیکھ کر یہ اطمینان ہو گیا کہ میرا طرزِ فکر غلط نہیں۔

پرسیوال اور محمود پاشا دونوں کے اصل مقالات فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے تھے جن میں اول الذکر کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر (ISLAMIC CULTURE VOL XXI-1947) میں شائع ہو چکا ہے۔ محمود پاشا فلکی کی کتاب کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے "نتائج الافہام" کے نام سے عربی میں کیا تھا۔ اس کتاب کو مولوی سید محی الدین خان صاحب جج ہائیکورٹ (حیدرآباد) نے اُردو کا جامہ پہنایا اور ۱۸۹۸ء میں نول کشور پریس نے شائع کیا۔

ان دونوں علمائے کے نظریات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پرسیوال کے نزدیک تو مکی سنہ "قمری شمسی" تھا (اگرچہ حسابات غلط تھے) اور محمود فلکی کی رائے میں "خالص قمری" تھا۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ دونوں نے واقعاتِ سیرت کی تاریخوں کو بہت کم قابلِ اعتنا سمجھا، اور اپنے دلائل میں صرف دو دو تین تین واقعات پیش کر کے نظریات مکمل کر لیے۔ حالانکہ محمود فلکی تھوڑی سی جستجو کے بعد درجنوں مثالیں پیش کر سکتے تھے۔ بہرصورت ان دونوں مقالات کو یا تو اپنی کتاب میں بطور ضمیمہ شائع کر دوں گا یا ان کے نظریات اور دلائل کی تھوڑی بہت وضاحت کر دی جائے گی۔ ——— (علوی)

مقالۂ اوّل میں واقعاتِ سیرت کے توقیتی تضادات کا ابتدائی جائزہ لینے کے بعد میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ سیرت کے واقعاتی ریکارڈوں پر دو قسم کی تقویموں کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے جن میں ایک "خالص قمری" تھی اور دوسری "قمری شمسی" (SUNI SOLAR) جس کو میں نے "مکی تقویم" کا نام دیا تھا۔[1]

مقالۂ دوم میں اس "قمری شمسی" تقویم کی بازیافت کی کوشش کی گئی تھی جو میری رائے میں ٹھیک ٹھیک دریافت کر لی گئی ہے، اور یقین ہے کہ خود قارئین نے بھی اس کی ابتدائی آزمائش کر کے یہی نتیجہ نکالا ہو گا۔

مدینے کی "خالص قمری" پہلے ہی سے باعثِ نزاع نہ تھی، اس لیے زیرِ نظر مقالے میں بظاہر یہ آسان تھا کہ واقعاتِ سیرت

کو علی الترتیب پیش کرکے ان دونوں تقویموں پر منطبق کردیا جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ جن روایات پر ڈیڑھ ہزار سال کی کہنگی کے آثار یعنی کتابتی اغلاط، فہمی غلطیاں، مصنفین کے سہو موجود ہوں۔ اُن کا فوری انطباق آسان نہیں۔

علاوہ ازیں خود اس نظریہ پر بعض اصولی سوالات بلکہ یوں کہیے کہ شبہات بھی پیدا ہوتے ہیں جن پر تطبیق سے پہلے غور کرلینا ضروری ہے مثلاً :-

پہلا سوال مقالۂ اوّل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ پرسیوال (PERCIVAL) اور میور کے نزدیک بھی مکی سنہ "قمری شمسی"[1] تھا، جو میرے دعوے کے عین مطابق ہے، نیز ونکلر (WINCKLER) اور نیلسن (NEILSEN) کا یہ تصور بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت مکّے اور مدینے کی تقویمیں بالکل جُدا جُدا تھیں، مگر دونوں تقویموں کے مہینے مشترک الاسم تھے[2]۔ یہ خیال بھی بعینہٖ وہی ہے جو خود پیش کر رہا ہوں، بلکہ میں نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ ونکلر کے اسی تصوّر نے میرے ذہن میں دو تقویمی تصورات کو جسم دیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر حمید اللہ کے سامنے بھی ونکلر کا یہی تصور تھا، کیونکہ انھوں نے بھی مکی اور مدنی تقویموں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اصولی طور پر ان علماء کے تصورات تقریباً وہی تھے جو میں پیش کر رہا ہوں تو پھر میرے اور ان علماء کے نظریات میں بنیادی فرق کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ اُن کے حسابات سے سیرت کے توقیتی مسائل حل نہیں ہوتے؟

اس سلسلہ میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میور اور پرسیوال سے تو بظاہر یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے عرب جاہلیت کی تقویمی صلاحیتوں کو پورے طور پر نہیں سمجھا اور یہ رائے قائم کرلی کہ جاہلی عربوں میں حسابی کم فہمی کے باعث، عہدِ رسالت میں ایام حج مارچ میں آنے لگے تھے اور رسال اپنی قدیم جگہ سے ہٹ گیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تصور بنیادی طور پر صحیح نہ تھا اسی لیے ان کا نظریہ واقعاتِ سیرت کی توقیتی توجیہ کرنے میں ناکام رہا۔

ونکلر WINCKLER کے دو تقویمی نظریے کی تفصیلات میرے سامنے نہیں البتہ ڈاکٹر حمید اللہ کا قیمتی مقالہ "عہدِ نبوی کے عربی ایرانی تعلقات" اس وقت میرے سامنے ہے جس میں فاضل مقالہ نگار نے دو تقویمی تصور کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے، اور جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں، ایک جدولِ تقویم بھی شامل کی ہے جسے میں نے مقالۂ اوّل میں بجنسہٖ نقل کر دیا ہے[3]۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں مکی اور مدنی تقویمیں پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں، میرے اور ڈاکٹر حمید اللہ کے تصورات میں کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ ایک بنیادی اور نہایت ہی اہم فرق یہ ہے کہ ان کی رائے میں یہ دونوں تقویمیں سنہ ۱ھ میں جاکر ایک ہوگئی تھیں اور ذوالحجہ سنہ ۱۰ھ دونوں تقویموں کے اعتبار سے مشترک ایام میں آیا تھا، جس کے کھلے معنی یہ ہوتے ہیں کہ محرم سنہ ۱۰ھ بھی مشترک ایام میں آیا ہوگا۔

---

[1] دیکھئے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۸۸ [2] دیکھئے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۹۳

[3] دیکھئے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۹۴ / ۲۹۵

اگر یہ خیال صحیح ہے کہ مکی تقویم ہمیشہ اعتدالِ خریفی سے شروع ہوتی تھی اور اگر یہ روایتیں غلط نہیں کہ عہدِ رسالت میں صوم عاشورا ہمیشہ محرم میں رکھا جاتا تھا، جو یہودیوں کے یوم عاشوراء سے صرف ایک دن آگے یا پیچھے[1] ہوتا تو یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ ۱۰ھ میں مکے اور مدینے کی تقویموں کے ایام و شہور مشترک ہو گئے تھے۔

اس سلسلہ میں البیرونی کی جرح و تنقید پہلے پیش کی جا چکی ہے اور آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس عظیم ریاضی دان نے احادیثِ عاشوراء کو غلط ثابت کرنے میں یہی دلیل پیش کی ہے کہ عہدِ رسالت میں "ماہِ تشری" اور "ماہِ محرم" ایک ساتھ نہیں آ سکتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا اس ذیل میں صرف یہ استدلال ہے :-

> کہ جنابِ رسالت مآب صلعم نے ذی الحجہ ۱۰ھ میں سالِ کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبۂ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت "انما النسئ زیادۃ فی الکفر الآیۃ" کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا "ان الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض" اور متفقہ طور پر اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع تھے۔[2]

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر اہم نظریئے کے لیے محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ "متفقہ طور پر اس کی یہ تشریح کی جاتی ہے۔" بالخصوص اس حالت میں کہ اس مرادی معنی کی پشت پر (بجز چند علمائے کے اقوال اور قیاسات کے) تاریخی، واقعاتی یا حسابی شہادتوں میں سے ایک چھوٹی سے چھوٹی شہادت بھی نہیں، اور بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ ۱۰ھ میں مکی اور مدنی تقویمیں ایک ہو گئی تھیں تو پھر ایسی تاریخی روایات اور واقعات کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ جو مروجہ تقویم کی مدد سے حل نہیں ہوتے، مثلاً اسی سن کے سورج گرہن کے واقعے کو لیجیئے جو روایتی طور پر ربیع الاول یا ربیع الآخر ۱۰ھ میں ہوا تھا، لیکن از روئے حسابِ ہیئت اس کی تاریخ ۲۷ جنوری ۶۳۲ء متعین ہوتی ہے جو ہجری کلینڈر کے بموجب ۲۸ شوال ۱۰ھ سے مطابق ہونا چاہیئے اور علیٰ ہذا القیاس دوسرے واقعات کی بھی یہی کیفیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غلطی صرف ڈاکٹر حمید اللہ ہی کے قلم سے نہیں ہوئی، بلکہ اتنی عام ہے کہ غالباً ہر محقق کو اسی جگہ ٹھوکر لگی ہے۔ میور اور پرسیوال نے بھی اسی تصور کے تحت ۱۰ھ میں مکی اور مدنی تقویم کو ہم زمانہ قرار دے[3] کر واقعاتِ سیرت کی توقیتی صراحتوں کو کہیں سے کہیں رکھ دیا ہے۔

جہاں تک "ان الزمان قد استدار" کے صحیح مفہوم کا تعلق ہے تو میں نے اس کی تشریح مقالۂ چہارم میں حجۃ الوداع کے ذیل میں کی ہے، یہاں یہ سمجھ لیجیئے کہ ۹ھ میں مکی تقویم کو منسوخ کیا گیا تھا اور مدینے کی خالص قمری تقویم اختیار کر لی گئی تھی جس کے باعث ہم

---

[1] دیکھئے برہان جولائی ۱۹۶۴ء / ۱۱   [2] معارف ۱۹۴۴ء

[3] پرسیوال کے نظریہ کے لیے دیکھئے ISLAMIC CULTURE XXI 1947)

حج پہلی بار مارچ ۶۳۱ء میں آیا تھا،

دوسرا سوال دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرے اس نظریئے سے صرف قسم اوّل، دوم اور سوم کی توقیتی اُلجھنیں ہی دُور ہوتی ہیں؟ یا یہ نظریہ چوتھی اور پانچویں قسم پر بھی حاوی ہے[1]؟ اور ایسے واقعات کے تضادات کو بھی دُور کر دیتا ہے جن کی توقیت میں قدیم علمائے سیرت کو اس درجہ اختلاف تھا کہ دو مکاتبِ تاریخ وجود میں آ گئے تھے[2] کیونکہ اگر یہ نظریہ ان تضادات کو دُور نہیں کرتا تو توی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تصور محض ایک تاریخی وہم اور حسابی مغالطے سے زیادہ نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دو تقویموں کی موجودگی کے لیے صرف اتنا ثبوت کافی نہیں کہ ہم کچھ واقعات کی تاریخیں ایک جدول سے اور کچھ دوسری جدول سے درست کر دکھائیں، کیونکہ جب ایک سے زیادہ جدولوں کی مدد سے توقیتی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگرچہ یہ واقعات غلط ہی ریکارڈ کیے گئے ہوں، خود بخود بڑی حد تک درست نظر آنے لگیں گے، اور قدرتاً کچھ واقعات ایک جدول پر اور کچھ دوسری پر پورے اُترتے محسوس ہوں گے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی تیسری تقویم کا اور اِدعا کر دیا جائے تو ہر توقیتی صراحت خواہ وہ کتنی ہی غلط ہو سَو فیصدی صحیح ثابت ہو جائے گی۔

دو تقویموں کی بیک وقت موجودگی، اصولاً صرف اُسی وقت ہو سکتی ہے جب ایک ہی واقعے کے متعلق دو ایسی جُداگانہ توقیتی صراحتیں مل سکیں جو علیحدہ علیحدہ کلینڈروں کے مطابق ریکارڈ کی گئی ہوں اور وہ بظاہر کتنی ہی مختلف یا متضاد معلوم ہوں، لیکن جب حساب لگایا جائے تو ان سے صرف ایک ہی زمانہ متعین ہو سکے۔ کیونکہ یہ تصور قطعاً خارج از قیاس ہے کہ دو تقویموں کی موجودگی میں، واقعات کا ریکارڈ کرتے وقت ایک ہی راوی نے کبھی مکّی اور کبھی مدنی تقویم استعمال کی ہوگی بلکہ اس کے مقابلہ میں معمولی عقل COMMON SENCE یہ چاہتی ہے کہ اگر واقعی عہدِ رسالت میں دو تقویمیں رائج تھیں تو ایسے رُواۃ نے جو مکّی تقویم کے عادی تھے، مکّی اور جو مدنی کے عادی تھے مدنی تقویم استعمال کی ہوگی۔

دو دستاویزی تصور ظاہر ہے کہ اس صورت میں بہت سے واقعاتی ریکارڈ ایسے بھی ہونا ضروری ہیں، جو بیک وقت دونوں تقویموں کے بموجب ریکارڈ کیے گئے ہوں، گویا "دو تقویمی" نظریئے کو قبول کرنے سے پہلے اصولاً ہمیں "دو دستاویزی" تصور اختیار کرنا پڑے گا، جس کی تائید میں تاریخی شہادتیں درکار ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ دو تقویمی نظریئے کے لیے "دو دستاویزی نظریہ" بالکل ابتدائی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر واقعاتِ سیرت میں دو دستاویزی کارفرمائی کا پتہ نہیں چلتا تو دو تقویموں کی موجودگی ثابت ہونا ممکن نہیں، بنا بریں اصولاً ہمیں پہلے اس مسئلے پر غور کرنا ضروری ہے۔

یہ مسئلہ اگرچہ سیرت کے ابتدائی ماخذوں پر ایک سیر حاصل بحث چاہتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں تاہم میں کوشش کروں گا کہ تفصیلات کو ترک کر کے مقالے کو محض تقویمی دائرے تک محدود رکھا جائے۔

---

[1] ان قسموں کے لیے دیکھیے "برہان" مئی ۱۹۶۴ء / ۲۶۷ [2] دیکھیے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۸۳

آپ جانتے ہیں کہ سیرت کے ابتدائی ماخذ چند در چند ہیں جن کی آخری کڑیاں ایسے صحابہ سے جا ملتی ہیں جنھوں نے اپنا آنکھوں دیکھا، یا کانوں سنا حال کسی نہ کسی نہج سے ابتدائی مصنفین، مثلاً عبداللہ بن عباسؓ، ابان بن عثمانؓ، عروہ بن زبیرؓ اور دوسرے علماء مغازی تک پہنچایا، اور انھوں نے ان ذخائر کو قلمبند کر کے آنے والی نسلوں کے حوالے کیا، لیکن یہ قدیم ریکارڈ چونکہ آج موجود نہیں اس لیے متاخرین کے یہاں ان میں سے اکثر روایات کی آخری سند صرف دو ائمۂ مغازی یعنی ابن اسحاق المتوفی (۱۵۰ھ) اور واقدی المتوفی (۲۰۷ھ) کے ناموں پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

ان دونوں کی منزلت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اول الذکر یعنی ابن اسحاق تو صحابہ کے عہد سے اتنے قریب ہیں کہ انھیں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ نیز انھوں نے متعدد بڑے بڑے علماء کا فیضِ صحبت پایا، کئی اعلیٰ پائے کے اساتذہ کے شاگرد رہے، ان کے عہد میں کئی عمدہ لائبریریاں معرضِ وجود میں آچکی تھیں[1] جن کا تعلق براہِ راست کتبِ سیرت و احادیث سے تھا۔ امام زہری کے

---

[1] (۱) مثلاً ایک ذخیرۂ کتب کا پتہ مشہور صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلتا ہے جو ابن اسحاق کے وقت تک ضائع نہ ہونا چاہیے۔ حسن بن امیہ ضمری کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار ابوہریرہؓ کے سامنے ایک روایت بیان کی تو انھوں نے اس سے انکار کیا، میں نے کہا کہ یہ روایت تو میں نے خود آپ سے سنی ہے، بولے اگر تم نے یہ مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس مکتوبی صورت میں ہوگی، اس کے بعد انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر لے گئے اور مجھے رسول اللہ کی حدیثوں کی کثیر التعداد کتابیں دکھائیں (فاراناکتبا کثیرة من احادیث رسول اللہ) (دیکھیے جامع ابن عبدالبر) (۲) اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک عمدہ ذخیرۂ کتب نظر آتا ہے، مشہور سیرۃ نگار موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں جو ابن اسحاق کے معاصر بھی تھے، کہ ایک بار "کریب" نے جو ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے ابن عباس کی (مملوکہ) کتابیں اس تعداد میں میرے سامنے رکھ دیں کہ ایک بارِ شتر ہوتیں، کریب نے بتایا کہ عبداللہ کے صاحبزادہ "علی" کو جب کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھے لکھ بھیجتے...... (دیکھیے ابن سعد، (V. VOCCA) (۳) عروہ بن زبیر جو سیرۃ کی سب سے بڑی سند سمجھے جاتے ہیں ایک عمدہ کتب خانے کے مالک تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک اہم کتاب خانہ جمع کیا تھا جس میں گوناگوں مضامین کی کتابیں تھیں، یہ کتب خانہ تاریخی اور قانونی دونوں قسم کی کتابوں پر مشتمل تھا (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM, VOL. IV, P. 104) (۴) مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان (المتوفی ۸۶ھ) کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے ایک بار کثیر بن مرہ کو لکھا تھا کہ تمھارے پاس رسول اللہؐ کے صحابیوں کی جو حدیثیں ہوں ان کی نقل مجھے بھیج دو، سوائے ابوہریرہ کی کتاب کے کیونکہ وہ میرے پاس موجود ہے "الاحدیث ابی ہریرة فانه عندنا" (ابن سعد، ۷/۱۵۷) (۵) خلفائے بنو امیہ کو سیاسیات کے ساتھ ساتھ علمی کاموں سے عام طور پر دلچسپی رہی، چنانچہ امیر معاویہؓ کے عہد میں عبداللہ بن عباسؓ، عروہ بن زبیرؓ، آبان بن عثمان، ابوالاسود، اور وہب بن منبہ وغیرہ جیسے عظیم سیرۃ نگاروں کے ساتھ ساتھ، کعب احبار اور عبید بن شریہ جیسے اہلِ قلم بھی نظر آتے ہیں، خود امیر معاویہ کے پوتے، خالد بن یزید بھی اعلیٰ پایہ کے سائنٹسٹ اور مصنفین کی فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، عبدالملک بن مروان نے امام زہری کو درباری عالم کا مرتبہ دے کر علوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے، عمر بن عبدالعزیز نے سرکاری طور پر حدیثیں جمع کرائیں اور دفتر کے دفتر لکھوا ڈالے۔ کہتے ہیں کہ امویین (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شاگردِ خاص اور اس پائے کے تلامذہ میں سے تھے، جن سے خود اُستاد تک نے استفادہ کیا تھا۔[1] کہتے ہیں، کہ امام زہری کے دروازے پر دربان مقرر تھا، کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آنے پائے، لیکن ابن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں۔[2] "سیرت میں ان کا مرتبہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ جیسے محتاط محدث نے اُن سے استناد کیا ہے حتیٰ کہ اپنی کتاب المغازی کی ابتدا، گویا کہ ان کے نام سے کی ہے۔

ثانی الذکر یعنی واقدی کو اگرچہ ایک خاص مکتب خیال یعنی "معذرت پسند" علمائے نے آج کل بہت بدنام کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن اُن کے متعلق ابن کثیر جیسے محدث کی رائے یہ ہے :۔

"اور واقدی کے پاس عمدہ تفصیلات اور اکثر واقعات کی تحریر شدہ تاریخیں تھیں اور وہ اس فن (یعنی سیرت) کے ائمہ کبار میں سے تھے، اپنی ذات سے صدوق اور کثیر روایتیں بیان کرنے والے تھے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "تکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل" میں ان کی عدالت کے متعلق بیان کیا ہے۔"[3]

واقدی پر سب سے سنجیدہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ "یہ شیعہ" تھے،[4] لیکن میری رائے میں یہ اعتراض بالکل ایسا ہی ہے جیسا ابن اسحاق کے متعلق یہ خیال کہ وہ یہود و نصاریٰ[5] سے روایت کرنا جائز سمجھتے تھے، حالانکہ تاریخ کی نظر میں یہ دونوں باتیں عیب نہیں۔ واقدی کے زمانہ میں مامون الرشید کا کتب خانہ کافی اہمیت رکھتا تھا، لیکن حیرت ہے خود اس عظیم مورخ کے ذاتی کتب خانے میں کتابوں کے چھ سو بھرے ہوئے کتاب دان[6] بیان کئے جاتے ہیں۔ تحقیقی ذوق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جب اپنی کتاب لکھی تو متعدد واقعات اور معاہدے خاص عہدِ رسالت کی دستاویزوں کو سامنے رکھ کر لکھے۔

اِن دونوں اساطینِ سیرت کی تالیفات پر غور کیا جاتا ہے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر جو ابتدائی دستاویزیں تھیں اُن میں بہت سی بلقید ایام و شہور مُدوّن کی گئی ہوں گی، اس لیے دونوں کے یہاں تقریباً تمام واقعات کو مُوقّت کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے بلکہ کچھ واقعات تو ایسے ملتے ہیں جن میں دن اور تاریخ کے علاوہ گھڑی اور گھنٹہ تک کا خیال رکھا گیا ہے۔[7] ظاہر ہے کہ تاریخ و ایام کی یہ صراحتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی مصنف کے پیشِ نظر کافی تفصیلات نہ ہوں۔

ابن اسحاق اور واقدی کی روایات کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں بہت سی روایتوں کے ماخذ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے آگے) کے زوال کے بعد ان کے سرکاری کتب خانے سے جب کتابیں منتقل ہوئیں تو صرف امام زہری کی کتابیں گھوڑوں اور اونٹوں کے ذریعے روانہ کی گئیں۔

[1] (ALFRED GUILLAUME P

[2] مولانا شبلی سیرۃ ۱/۲۳

[3] ابن کثیر، البدایہ ۳/۲۳۴

[4] ابن ندیم/۱۴۴

[5] شبلی سیرۃ ۱/۲۴

[6] ابن ندیم/۱۴۴ ۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک کتاب دان میں صرف ۲۰ کتابیں رہتی تھیں تو ۱۲ ہزار کتابیں ہونا چاہئیں۔

[7] مثلاً دیکھئے ابن ہشام/ واقعہ ہجرت یا طبری/ قتل خسرو پرویز کی تاریخ وغیرہ۔

ایک حد تک مشترک تھے، اس لیے کہ واقعاتِ متعلقہ کی توقیت اور دوسری تاریخی تفصیلات میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں، مثلاً مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخی روایتوں کے ماخذ تقریباً مشترک معلوم ہوتے ہیں۔

واقعۂ ہجرت، غزوۂ الابوا، غزوۂ عشیرہ، غزوۂ بدر، غزوۂ سویق، غزوۂ احد، غزوۂ حمراء الاسد، غزوۂ بنو نضیر، غزوۂ دومۃ الجندل، غزوۂ مریسیع، غزوۂ حدیبیہ، فتحِ مکہ، حنین وغیرہ اور اگرچہ ان غزوات میں سے کچھ کی تفصیلی تاریخوں میں تھوڑا بہت اختلاف بھی ہے لیکن جہاں تک مہینوں کا تعلق ہے وہ قطعاً مشترک ہیں۔

ان کے مقابلے میں مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخوں پر نظر کیجیے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق اور واقدی کے بعض ماخذ بالکل مختلف تھے اور باوجودیکہ واقدی کے سامنے ابن اسحٰق کی پوری کتاب موجود تھی۔ پھر بھی انھیں اپنی تحقیق اور اس کے نتائج پر اس درجہ اعتماد بلکہ اصرار تھا کہ انھوں نے ابن اسحٰق کی بیان کردہ بہت سی تاریخوں اور توقیتی صراحتوں کو چھوا تک نہیں اور اپنے ماخذوں کو برقرار رکھا۔ میں نے مقالۂ اوّل میں بھی ان واقعات کا سرسری تذکرہ کیا ہے اور یہاں بھی دوبارہ فہرست دیتا ہوں۔

واقعات	بروایت ابن اسحٰق	بروایت واقدی
۱۔ غزوۂ کرز بن جابر فہری	جمادی الاخریٰ سنہ ۲ھ	ربیع الاوّل سنہ ۲ھ
۲۔ غزوۂ بنی سُلیم	شوال سنہ ۲ھ	محرم سنہ ۳ھ
۳۔ غزوۂ ذی امر	محرم سنہ ۳ھ	ربیع الاوّل سنہ ۳ھ
۴۔ سریہ زید بن حارثہ	ربیع الاوّل سنہ ۳ھ (بدر سے چھ ماہ بعد)	جمادی الاخریٰ سنہ ۳ھ
۵۔ غزوۂ احد	شوال سنہ ۳ھ	محرم سنہ ۴ھ (بروایت عبدالحمید بن جعفر)
۶۔ حادثۂ رجیع	شوال/ذیقعدہ سنہ ۳ھ (اُحد کے بعد)	صفر سنہ ۴ھ
۷۔ غزوۂ بدر موعد	شعبان سنہ ۴ھ	ذیقعدہ سنہ ۴ھ
۸۔ غزوۂ ذات الرقاع	جمادی الاوّل سنہ ۴ھ	محرم سنہ ۵ھ
۹۔ غزوۂ کرز الی عرنیین	جمادی الاولیٰ سنہ ۶ھ	شوال سنہ ۶ھ
۱۰۔ غزوۂ خیبر	محرم سنہ ۷ھ	جمادی الاولیٰ سنہ ۷ھ

ان واقعات کے توقیتی اختلافات سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ابن اسحٰق اور واقدی نے غیر دیانت داری سے کام نہیں لیا تھا، تو ان دونوں کے ابتدائی ماخذ بالکل جُدا جُدا تھے۔

اس طرح ہم سیرت کی ابتدائی تدوین سے کم از کم دو مساوی درجے کے ماخذوں یا دستاویزوں کی کارفرمائی محسوس کرتے ہیں۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف دستاویزوں میں ایک ہی واقعہ کے متعلق جو دو مختلف مہینوں کے نام لیے گئے ہیں اُس کی بنیادی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا واقعی ابن اسحٰق اور واقدی کے رواۃ ان واقعات کے توقیت کے سلسلہ میں اتنے ہی زیادہ مختلف الخیال تھے کہ وہ متفقہ طور پر واقعات کا صحیح مہینہ بھی بیان نہیں کر سکتے تھے یا پھر یہ تمام ایام و شہور کی صراحتیں

محض فرضی اور صرف زیبِ داستان کے لیے سمجھی جائیں جن میں شرکا کی عینی شہادتوں کو دخل نہ تھا۔

دو تقویمی نظریہ کی ابتدا: یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے حقیقی معنی میں دو تقویمی نظریہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں جبکہ یہ دستاویزیں یا دوسرے الفاظ میں یادداشتیں ضبطِ تحریر میں آ رہی تھیں تو ان کے رُواۃ کچھ مہاجر تھے اور کچھ انصار، غالباً مہاجرین کی یادداشتیں اور روایات سب کی سب مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ ہوئی تھیں، جن کے مقابلے میں انصار اپنی قدیم خالص قمری تقویم استعمال کر رہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ان یادداشتوں کو تابعین کے عہد میں اکٹھا کیا گیا تو اس بات کا لحاظ نہیں رہا کہ اصل دستاویزوں میں کونسی دستاویز مکی تھی اور کونسی مدنی؟ دونوں تقویموں کے مہینے چونکہ مشترک الاسم تھے اس لیے ان سب کو اُسی ایک کلینڈر کی تاریخیں سمجھ لیا گیا جو مدونین کے زمانے میں جاری تھا، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی، بلکہ دوسرے قدیم مصنفین کے یہاں بھی مکی اور مدنی توقیت کا ایک عجیب اختلاط نظر آتا ہے۔

میرے اس دعوے کا متذکرہ بالا توقیتی اختلافات محض دو دو دستاویزوں، اور دو تقویموں کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں، ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ میری "مکی تقویم" کے پہلو میں اگر "عام قمری تقویم" رکھ دی جائے تو یہ تمام اختلافات اُسی آن ختم ہو جاتے ہیں۔

قارئین کو اس کا مکمل اندازہ تو "مقالہ چہارم" میں ہو سکے گا، جہاں اس قسم کے تمام واقعات سے ترتیب وار اور پوری بحث کی گئی ہے، تاہم یہاں صرف مندرجہ ذیل واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا کافی ہو گا۔

۱ - غزوۂ کرز بن جابر فہری کے متعلق واقدی نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ ربیع الاوّل سنہ ۲ھ کا ہے[۱] اس کے مقابلے میں ابن اسحاق نے اس کو جمادی الاخریٰ کا واقعہ قرار دیا ہے[۲] جمادی الاُخریٰ سنہ ۲ھ مدنی ۳۰ رنومبر ۶۲۳ء کو شروع ہوا تھا[۳] مکی جدول تقویم میں ربیع الاوّل سنہ ۲ھ بھی اسی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے[۴] گویا یہ واقعہ ۳۰ رنومبر ۶۲۳ء کے بعد کا ہے۔

۲ - اسی طرح غزوۂ بنو سُلیم بروایت واقدی محرم سنہ ۳ھ کا واقعہ ہے[۵] لیکن ابن اسحٰق نے اس کی تاریخ بدر کے عین بعد شوال سنہ ۲ھ بیان کی ہے[۶] ہجری تقویم کے بموجب محرم سنہ ۳ھ ۲۴ رجون ۶۲۴ء کے مطابق تھا[۷] میری مکی تقویم کے بموجب شوال سنہ ۲ھ بھی عین اُسی تاریخ شروع ہوا تھا[۸] گویا واقدی کی تاریخ مدنی ہے اور ابن اسحٰق کی مکی۔

۳ - غزوۂ ذی امر کے متعلق واقدی کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت ربیع الاوّل سنہ ۳ھ[۹] میں بنو غطفان کی طرف روانہ ہوئے تھے، ابن اسحٰق نے اس غزوے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ آنحضرت جب غزوۂ سویق سے واپس آئے تو ذوالحجہ کا باقی مہینہ یا اس کے لگ بھگ مدینے میں رہے اس کے بعد غطفان سے جنگ کے لیے نکلے اور یہی غزوۂ ذی امر ہے[۱۰]

---

[۱] ابن ہشام ۲/۲۵۱ [۲] واقدی ۲/ [۳] دیکھئے برہان جولائی ۱۹۶۲ء/۲۹ [۴] ایضاً/۳۰ [۵] واقدی/۱۸۳ [۶] ابن ہشام ۳/۴۶ [۷] دیکھئے برہان جولائی ۱۹۶۲ء/۲۹، [۸] برہان/۳۱ [۹] واقدی/۱۹۱ [۱۰] ابن ہشام ۳/۴۹۔

غزوۂ سویق متفقہ طور پر ذوالحجہ کا واقعہ ہے[1]۔ اس لیے غزوۂ ذی امر بھی اسی ذی الحجہ کے آخر اور ابتدائی محرم میں ہونا چاہیے۔ ہجری حساب سے ربیع الاول ۳ھ ۲۲ اگست ۶۲۴ء کو شروع ہوا تھا[2]۔ اور میری مکی تقویم کے موجب ذوالحجہ مکی کی ابتداء بھی عین اسی تاریخ یعنی ۲۲ اگست کو ہوئی تھی[3]۔

۴۔ سریۂ زید بن حارثہ کے متعلق ابن اسحٰق کی یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ سریہ بدر سے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے[4]۔ جنگ بدر رمضان ۲ھ میں ہوئی تھی[5]۔ اس لیے یہ واقعہ ربیع الاول ۳ھ میں ہونا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں واقدی کی روایت کے بموجب یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۳ھ میں پیش آیا تھا[6]۔ ہجری تقویم کے بموجب جمادی الاُخریٰ ۳ھ ۱۹ نومبر ۶۲۴ء کو شروع ہوا تھا[7]۔ مکی تقویم کے مطابق ربیع الاول ۳ھ بھی اسی نومبر کو شروع ہوا ہے[8]۔

۵۔ غزوۂ اُحد ۳ھ کا سب سے مشہور واقعہ ہے اور اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی دونوں نے اس کی تاریخ شوال ۳ھ بیان کی ہے[9]۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، واقدی نے عبدالحمید بن جعفر[10] کی ایک غیر مشہور روایت درج کر کے اس کی مشہور توقیت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ یہ واقعہ شوال ۳ھ کا تھا یا محرم ۴ھ کا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی دو تقویمی کارفرمائی کا ایک دلچسپ نمونہ ہے، چنانچہ ہجری تقویم کے بموجب محرم ۴ھ ۱۳ جون ۶۲۵ء کو شروع ہوا تھا[11] اور میری مکی تقویم میں شوال ۳ھ بھی اسی ۱۳ جون کو شروع ہو رہا ہے[12]۔ جس سے یہ اندازہ ہوتے بغیر نہیں رہتا کہ اس غزوے کے متعلق شوال کی توقیت مکی ریکارڈوں کے مطابق کی گئی تھی اور یہ روایت مدنی حسابات کی آئینہ دار ہے۔

۶۔ غزوۂ احد کے بعد ابن اسحٰق نے ایک واقعہ "یوم رجیع" کے نام سے بیان کیا ہے[13]۔ اور امام بخاری نے بھی خود ابن اسحٰق کے حوالے سے اس کو اُحد کے بعد کا واقعہ قرار دیا ہے[14]۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ غزوۂ اُحد متفقہ طور پر شوال ۳ھ کا واقعہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے ابن حبیب نے اس کی تاریخ آخر شوال ۳ھ ہی بیان کی ہے[15]۔ جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حادثہ شروع ذلیقعدہ ۳ھ میں پیش آیا۔ بخلاف اس کے واقدی نے اس واقعہ کی تاریخ صفر ۴ھ بیان کی ہے[16]۔ جس کے تتبع میں ابن سعد وغیرہ نے بھی اسی تاریخ کو قبول کیا ہے[17]۔ یہ متضاد تاریخیں بھی دو تقویمی کارفرمائی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ ہجری تقویم کے موجب صفر ۴ھ کی ابتدا ۱۲ جولائی ۶۲۵ء کو ہوئی تھی[18]۔ اور میری مکی تقویم کے موجب ذلیقعدہ[19] ۳ھ بھی اسی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے۔ گویا ابن اسحٰق کی اسناد کا ریکارڈ مکی تھا اور واقدی کا مدنی۔

---

۱ واقدی/۳، ۱۸۲ ۲ ابن ہشام/ ۳ دیکھیے برہان جولائی/ ۲۹ ۴ ایضاً/۲۱ ۵ البدایہ ۴/۴ ۶ ابن ہشام ۲/ ۲۷۸، واقدی/۳ ۷ واقدی/۱۹۵ ۸ دیکھیے برہان جولائی ۱۹۶۲ء/۱۹ ۹ برہان/۲۰ ۱۰ دیکھیے ابن ہشام، نیز دیکھیے واقدی/۳ ۱۱ واقدی/۲۱۷، ۲۱۸ ۱۲ دیکھیے برہان جولائی ۱۹۶۲ء/۲۹ ۱۳ برہان/۲۱ ۱۴ ابن ہشام ۱۵ بخاری ۱۶ ابن حبیب/۱۱۷ ۱۷ واقدی/۴ ۱۸ ابن سعد ۲/۳۹ ۱۹ دیکھیے برہان جولائی ۱۹۶۲ء/۲۹ ۲۰ برہان/۲۱

۷ - اسی طرح غزوۂ "بدر موعد" کی تاریخ واقدی کے یہاں ذیقعدہ سنہ ۴ھ مذکور ہوئی ہے[1]۔ مگر ابن اسحٰق کے یہاں شعبان سنہ ۴ھ ملتی ہے[2]، عام قمری تقویم کے حساب سے ذیقعدہ سنہ ۴ھ ۲ اپریل ۶۲۵ء کو شروع ہوا تھا[3]۔ اس کے مقابلے میں مکی شعبان سنہ ۴ھ کی ابتدا بھی اسی ۴ اپریل کو ہوئی تھی[4]۔ گویا ابن اسحٰق نے اس واقعہ کی مکی تاریخ بیان کی ہے اور واقدی نے مدنی مہینے کا نام لیا ہے۔ مزید نظر دوڑائیے تو پتہ چلتا ہے کہ دونوں ریکارڈوں میں صرف مہینے کا اختلاف ہے، تاریخ میں نہیں، چنانچہ ابن سعد نے صراحت کی ہے کہ یہ ہلال ذیقعدہ کا واقعہ تھا[5]۔ اس کے مقابلے میں ابن حبیب کے یہاں مستہل شعبان مذکور ہے[6]۔ گویا ایک راوی کے نزدیک یہ ذیقعدہ کی چاندرات کا واقعہ تھا اور دوسرے کے نزدیک یکم شعبان کا، جس سے دو تقویمی نظریے کی صحت میں شبہ نہیں رہتا۔

۸ - بالکل یہی کیفیت غزوۂ "ذات الرقاع" کی ہے، واقدی کا بیان ہے کہ یہ غزوہ محرم ۵ھ کا واقعہ تھا[7]۔ لیکن ابن اسحٰق نے اس کی تاریخ جمادی الاولیٰ سنہ ۴ھ بیان کی ہے[8]۔ میری مکی تقویم کے بموجب محرم ۵ھ ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء کو شروع ہوا تھا[9] اور قمری تقویم کی رو سے جمادی الاولیٰ سنہ ۴ھ بھی اسی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے[10]۔

اس غزوے کی تاریخ بھی دونوں ریکارڈوں میں بالکل مشترک ہے۔ ابن سعد کے نزدیک یہ ۱۰ محرم کا واقعہ تھا[11]۔ اور ابن حبیب کے نزدیک ۱۰ جمادی الاولیٰ کا[12]، جس سے یہ پورا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی رواۃ دو علیحدہ علیحدہ تقویمیں استعمال کر رہے ہیں۔

میری مکی تقویم کی رو سے جمادی سنہ ۶ھ ۱۴ فروری ۶۲۸ء کو شروع ہوا تھا[13] اور اسی تاریخ کو قمری شوال کی بھی ابتداء ہوئی تھی[14]۔

۹ - غزوۂ خیبر کی تاریخوں کا بھی یہی حال ہے، واقدی کے بیان کے بموجب غزوۂ خیبر جمادی الاولیٰ ۷ھ کا واقعہ تھا[15]، لیکن ابن اسحٰق نے اس کو محرم ۷ھ میں ظاہر کیا ہے[16]، بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذی قرد جو ذی الحجہ سنہ ۶ھ کا واقعہ تھا، غزوۂ خیبر سے صرف تین دن پہلے کی بات ہے[17]، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خیبر پر فوج کشی محرم سے کچھ پہلے شروع ہو گئی تھی۔

مدنی تقویم کے بموجب جمادی الاولیٰ کی پہلی تاریخ ۶ ستمبر ۶۲۸ء سے مطابق تھی[18]۔ مکی تقویم کے بموجب ذوالحجہ مکی بھی

---

[1] واقدی / ۴ — [2] ابن ہشام ۳ / ۲۲۰ — [3] دیکھئے برہان جولائی ۱۹۶۴ء / ۲۹ — [4] برہان / ۲۱
[5] ابن سعد ۲ / - — [6] ابن حبیب / ۱۱۳ — [7] واقدی / ۴ — [8] ابن ہشام ۳ / ۲۱۴ — [9] برہان جولائی ۱۹۶۴ء / ۲۰
[10] ایضاً / ۲۹ — [11] ابن سعد ۲ / ۴۳ — [12] ابن حبیب / ۱۱۳ — [13] دیکھئے برہان جولائی ۱۹۶۴ء / ۲۲
[14] ایضاً / ۲۹ — [15] واقدی / ۴ — [16] ابن ہشام ۳ / ۳۴۲ — [17] کتاب المغازی
[18] دیکھئے برہان / ۳۰

اسی تاریخ کو شروع ہوا تھا۔[1]

ان دونوں مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس زمانے میں یہ واقعات ریکارڈ کئے گئے تھے تو مکی اور مدنی تقویمیں دوش بدوش چل رہی تھیں اور ابتدائی رُواۃ اپنے اپنے طریقے پر ان واقعات کا ریکارڈ کر رہے تھے۔ ریکارڈ جب مختلف اساتذہ اور مصنفین کے ہاتھوں سے گزرتے ہوئے ابن اسحٰق اور واقدی تک پہنچے، تو ان کی کتابوں میں اختلافات کا ہونا بالکل قدرتی تھا۔

تاہم حیرت ہے کہ واقدی نے ان ماخذوں پر اتنا بھروسا کیا کہ اپنے عظیم پیش رو یعنی ابن اسحٰق کی بیان کردہ توقیت کو چھوا تک نہیں، حالانکہ ان کی گراں پایہ تصنیف واقدی کے سامنے رہی۔

غالباً یہ روائتیں عہدِ صحابہ ہی میں خلط ملط ہو گئی تھیں | سطورِ بالا میں جن واقعات کی تاریخوں پر امتحانی نظر ڈالی گئی ہے۔ اگر صرف انھیں تاریخوں کو سامنے رکھ کر مزید غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق اور واقدی کو جس زمانے میں یہ تاریخیں پہنچی تھیں تو مخلوط ہو چکی تھیں، یعنی یہ نہیں ہوا کہ مثلاً ابن اسحٰق کو صرف مکی تاریخیں ملی ہوں اور واقدی کو صرف مدنی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ابتدائی اساتذہ اور مدوّنینِ سیرت یا یوں کہئے کہ ابتدائی جامعینِ روایات کے عہد میں یہ اختلاط ہو چکا تھا، چنانچہ نقشہ ذیل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

واقعات	ابن اسحٰق	واقدی
غزوۂ کرز بن جابر فہری	مدنی	مکی
غزوۂ بنو سُلیم	مکی	مدنی
سریہ زید بن حارثہ	مکی	مدنی
غزوۂ ذی امر	مکی	مدنی
غزوۂ اُحد	مکی	مدنی
حادثۂ رجیع	مکی	مدنی
غزوۂ بدر موعد	مکی	مدنی
غزوۂ ذات الرقاع	مدنی	مکی
سریہ کرز بن جابر الی عرنیین	مکی	مدنی
غزوۂ خیبر	مکی	مدنی

اس نقشے سے اگرچہ اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق اور ان کے اساتذہ کے ماخذ بیشتر مکی ریکارڈ تھے اور واقدی کا سرمایہ زیادہ تر مدنی ریکارڈوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان اساطینِ سیرت کے دور سے بہت پہلے عامۃ الناس تو کیا علمائے اسلام تک مکی اور مدنی تقویم کے امتیازات بھول چکے تھے اور یہ توقیتی روائتیں آپس میں پوری طرح خلط ملط ہو چکی تھیں، چنانچہ ابن اسحاق کے یہاں کم از کم دو ریکارڈوں (یعنی ۱ و ۸) کی تاریخیں مدنی معلوم ہوتی ہیں اور واقدی کے یہاں یہی تاریخیں مکی

---

[1] برہان/۲۲

نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک ضروری سوال

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس قسم کا اختلاط اُن مشترک توقیتی روایات میں بھی ممکن ہے یا نہیں، جو ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان "مختلف فیہ" نہیں، اور اگر ان روایتوں میں بھی موجود ہے تو پھر اس بات کا اندازہ کس طرح لگایا جائے کہ فلاں واقعے کا ریکارڈ "مکی تقویم" کے موجب ہوا تھا اور فلاں کا مدنی تقویم کے ذریعہ، کیونکہ ان کی تاریخوں کے "متفق علیہ" ہونے کی وجہ سے ہمارے پاس بجائے "دو گواہوں" کے صرف "ایک گواہ" رہ جاتا ہے اور وہ بھی ایسا جس کے متعلق یہ قیاس مشکل ہے کہ اس کے ذہن میں کون سی تقویم تھی، گویا تاریخی طور پر جو "مختلف فیہ" روایات تھیں، وہ اس نظریئے کی بدولت (توقیتی اعتبار سے) زیادہ قابلِ وثوق نظر آ رہی ہیں اور متفق علیہ تاریخوں کے متعلق یہ فکر دامن گیر ہے کہ ان کا صحیح زمانہ کس طرح متعین کیا جائے۔

اس سلسلے میں میرا طریقۂ کار حسب ذیل ہے :-

۱ - ابن اسحٰق اور واقدی کی "مختلف فیہ" روایات کے علاوہ عام روایتوں میں بھی جگہ جگہ دو تقویمی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس طرح تقریباً ۱۹، ۲۰ واقعات کا زمانہ بآسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

۲ - کئی واقعات ایسے ملتے ہیں جن کے موسم تلاش کرنا ممکن ہیں، ان موسموں کی وساطت سے صحیح تاریخ معلوم کی جا سکتی ہے اور پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ رواۃ کے ذہن میں مکی تقویم تھی یا مدنی۔

۳ - کچھ واقعات ایسے ہیں جن کی تاریخیں عصری تاریخ یا علم ہیئت کی شہادت کے ذریعے متعین کی جا سکتی ہیں، مثلاً کسریٰ کے قتل یا چاند گرہن وغیرہ کی توقیت وغیرہ۔

۴ - اسی طرح بہت سے واقعات کا زمانہ جو مندرجہ بالا واقعات کے متصل ظہور میں آتے تھے، خود بخود متعین ہو جائے گا۔

۵ - تاریخ و ایام کی مطابقت اور عدم مطابقت کی شہادتیں بھی افادیت سے خالی نہیں مگر ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

۶ - سب سے آخر میں، ایک قیاسِ تاریخی رہ جاتا ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

توقیتی اختلافات کا واقعاتی ترتیب پر اثر

ان توقیتی اختلافات کا اثر ظاہر ہے کہ کتبِ سیرت کی واقعاتی ترتیب پر ناگزیر تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی مصنفین سیرت کے یہاں یہ ترتیبی اختلافات اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور بعض اوقات تو خود ان مصنفین کی روایات کا صحیح مفہوم سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر واقدی اور ابنِ سعد نے صفر سنہ ۴ھ کے دو واقعات بہ ایں صراحت بیان کئے ہیں، کہ یہ ہجرت سے ۳۶ مہینے بعد ظہور میں آئے[1] تھے اس میں سے ایک "بیر معونہ" اور دوسرا "رجیع" کا واقعہ ہے، رجیع کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان دونوں میں واقدی نے بیر معونہ کے واقعے کو متقدم قرار دیا ہے اس واقعے کا ماحصل یہ ہے کہ صفر سنہ ۴ھ میں بنو عامر کا رئیس مدینے آیا اور پیغمبرِ اسلامؐ کو مشورہ دیا کہ اطرافِ نجد میں کچھ مبلغین

---

[1] واقدی / ۳

روانہ کیے جائیں۔ اس پر آپؐ نے تعلیم یافتہ مبلغین کی ایک بھاری جماعت روانہ کردی، یہ لوگ جب بنو عامر کی بستیوں میں پہنچے تو سب کے سب قتل کر ڈالے گئے۔[۱]

ابن اسحٰق کے نزدیک بھی یہ واقعہ صفر ۴ھ ہی کا ہے، لیکن رجیع سے تقریباً تین ماہ بعد کا۔[۲] واقعہ رجیع کے متعلق واقدی کا بیان یہ ہے کہ اسی صفر ۴ھ میں عضل و قارہ کے کچھ لوگ مدینے آئے اور پیغمبر اسلامؐ سے استدعا کی ان کے ساتھ کچھ ایسے افراد کر دیئے جائیں جو تعلیم اسلام دے سکیں[۳]۔ اس پر کچھ چیدہ افراد اُن کے ہمراہ کر دیئے گئے۔ یہ لوگ جب بنو لحیان کی بستیوں میں پہنچے، تو میزبانوں نے مہمانوں سے دھوکا کیا اور تقریباً سب کو قتل کر ڈالا صرف خبیب بن عدی اور زید بن دثنہ کو گرفتار کر کے لے گئے اور قریش کے حوالے کر دیا۔

واقدی اور ابن سعد دونوں نے صراحت کی ہے کہ خبیب کو قریش نے فوراً قتل نہیں کیا اور یہ اس وقت تک ان کی قید میں رہے جب تک حرام مہینے (جن میں خوں ریزیاں ممنوع تھیں) نہ گزر گئے۔ واقدی کے الفاظ یہ ہیں ...... "فلما انسلخت الاشہر الحرام ......"[۴] اور تقریباً یہی لفظ ابن سعد نے اختیار کئے ہیں "حتٰی خرجت الاشہر الحرم"[۵]۔ جوں ہی یہ حرام مہینے ختم ہو گئے قریش نے خُبیب کو تنعیم میں لے جا کر قتل کر دیا اور سُولی دے دی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی خُبیب کو صفر ۴ھ میں روانہ کیا گیا تھا، اور وہ جاتے ہی گرفتار ہو گئے تھے، تو ان مورخوں کے نزدیک "انقضائے اشہر حرم" سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ "صفر" کے بعد "رجب" تک کوئی حرام مہینہ نہیں آتا پھر "رجب" بھی تنہا مہینہ ہے اور "اشہر حرم" کی شرط پوری کرنے کے لیے کچھ اور حرام مہینے درکار ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ تفصیلات صحیح ہیں تو خبیب ۴ھ میں قتل نہیں ہوئے۔ بلکہ محرم ۵ھ ختم ہونے کے بعد قتل کئے گئے اور پورے ایک سال قریش کی قید میں رہے جو نہایت بعید از قیاس بات ہے۔

اس کے مقابلے میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ابن اسحٰق نے رجیع کے متعلق یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ احد سے کچھ دن بعد کا ہے[۶]۔ غزوۂ احد چونکہ شوال ۳ھ میں ہوا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ "خبیب" ذیقعدہ میں گرفتار ہوئے تھے[۷] جو حرام مہینہ تھا، اس لیے قریش نے اُن کو قید میں ڈال دیا اور جب تک ذوالحجہ اور محرم کے حرام مہینے ختم نہ ہو لئے، اُن کو قتل نہیں کیا گیا، غور فرمایئے کہ ان تفصیلات کو دیکھتے ہوئے واقدی کی توقیت کس درجہ مشتبہ ہو جاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ واقدی کو اس واقعہ کی مدنی تاریخ ملی تھی، یعنی صفر ۴ھ جو ذیقعدہ مکی کا متوازی مہینہ تھا، واقدی سے یہ غلطی ہوئی کہ اُنھوں نے اس "صفر" کو وہی "صفر" ۴ھ سمجھ لیا جس میں حادثۂ بیر معونہ ہوا تھا، حالانکہ یہ مدنی صفر تھا، جو معرکۂ اُحد کے (یعنی محرم کے) بعد آیا تھا۔

---

[۱] واقدی/۳۴۶، ابن سعد ۲/۳۶ نیز دیکھئے البدایۃ ۴/۷۲، طبری ۳/۳۳، ۳۴ [۲] دیکھئے ابن ہشام ۳/۱۹۳؛ [۳] واقدی/۳۴۷، ابن سعد ۲/۳۹ [۴] واقدی/۳۴۸ [۵] ابن سعد ۲/۴۰ [۶] ابن ہشام ۳/۱۷۸۔ [۷] خود واقدی کے یہاں بھی اتفاقاً اس ذیقعدہ کا ذکر آگیا ہے، دیکھئے/۳۴۸؛

پھر اس غلطی کی بنا پر دوسری غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے اس واقعہ کو حادثۂ بیرمعونہ سے متقدم قرار دے دیا جس کی بنیادی وجہ یہی دو تقویمی کارفرمائی تھی۔

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مقالہ چہارم "واقعہ رجیع" اور حادثۂ بیرمعونہ)

ایک اور شبہ کا ازالہ

آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا ہے کہ واقدی اور ابن سعد نے واقعۂ رجیع اور بیرمعونہ کے متعلق جو توقیتی صراحت کی ہے، اُس میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں "علیٰ راس ستۃ وثلثین شہرا"[1] بلکہ عام طور پر تمام غزوات و سرایا کے سلسلے میں اُنھوں نے اسی قسم کے الفاظ اختیار کئے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے کتنے مہینے بعد پیش آیا تھا، جس سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ اُن کے اصل ماخذوں میں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے تھے اور اصل رواۃِ سیرت نے واقعات کو بیان کرنے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا کہ فلاں واقعہ ہجرت سے کتنے عرصے بعد کا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ واقدی اور ابن سعد کے مخصوص طرزِ بیان یا طریقِ توقیت سے تعلق رکھتے ہیں، اصل روائتوں میں یہ لفظ نہ تھے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ انھیں روائتوں کو جب ابن اسحٰق یا دوسرے مورخین، حتیٰ کہ کسی قدیم سے قدیم راوی نے بیان کیا ہے تو یہ طریقہ اختیار نہیں کیا اور کسی نے یہ نہیں بتایا کہ فلاں واقعہ ہجرت سے اتنے مہینے بعد کا ہے۔

چنانچہ ابن اسحٰق جب کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو ان کے تمہیدی جملوں کا الگ انداز ہوتا ہے مثلاً بدر کے بعد غزوۂ بنو سلیم کی ابتدا یوں کی ہے:۔

"جب رسول اللہؐ (بدر سے) تشریف لائے تو صرف سات راتیں قیام فرمانے پائے تھے کہ بنو سلیم پر بذاتِ خاص لشکر کشی فرمائی[2]"

یا اس کے بعد غزوۂ سویق کے تمہیدی الفاظ یہ ہیں:۔

"بعد ازاں ذی الحجہ کے مہینہ میں ابوسفیان بن حرب کا غزوۂ سویق ہے اور اس حج کا انتظام مشرکوں کے ہاتھ میں تھا[3]"

غزوۂ ذی امر کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:۔

"تو جب رسول اللہ غزوۂ سویق سے واپس تشریف لائے تو ذی الحجہ کے باقی مہینے یا اس کے لگ بھگ مدینے میں قیام فرمایا، اس کے بعد غطفان پر فوج کشی کی اور یہی غزوۂ ذی امر ہے[4]"

ظاہر ہے کہ اصل روائتوں میں اگر وہی الفاظ ہوتے جو واقدی یا ابن سعد نے بیان کئے ہیں تو ابن اسحٰق کا طرزِ بیان بھی بالکل ویسا ہی یا اُس کے لگ بھگ ہوتا۔

---

[1] واقدی ۱/۳ - ابن سعد ۲/ ۳۹   [2] ابن ہشام ۳/۴۶   [3] ابن ہشام ۳/۴۷   [4] ابن ہشام ۳/۴۸
نیز دیکھیے البدایہ والنہایہ ۴/۲

اس طرح ابن اسحٰق کے ان تمہیدی جملوں کا تعلق بھی اصل روایات سے کچھ نہیں، بلکہ حقیقتاً یہ خاص ابن اسحٰق کا "طرز توقیت" ہے، اس لیے ان دونوں ائمہ سیرت کے مخصوص اندازِ بیان اور طرزِ توقیت سے ہمیں اس مغالطے میں نہ پڑنا چاہیئے۔ کہ ان کے اصل ماخذوں میں اس قسم کی عبارتیں موجود تھیں یا اصل رواۃ سیرت کا یہی "طرزِ توقیت" تھا، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف ان کی ذاتی فہم اور دو تقویمی کارفرمائی کا منطقی نتیجہ ہے۔

واقعے کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے یہاں غزوۂ "بدر موعد" اور "غزوۂ ذات الرقاع" کے توقیتی اختلافات اور خاص طور پر ترتیب پر غور فرمایئے، ابن اسحٰق اور واقدی کے مکاتب تاریخ میں یہ اختلاف مدتوں سے چلا آرہا ہے کہ ان میں کون سا واقعہ مقدم ہے اور کون سا مؤخر، چنانچہ مورخین کا ایک گروہ جو ابن اسحٰق کا ہمنوا ہے۔ غزوۂ "ذات الرقاع" کو مقدم سمجھتا ہے اور واقدی کے ہم خیال علماء غزوۂ بدر موعد کو، لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ یہ دونوں واقعات غزوۂ بنو نضیر کے بعد ظہور میں آئے تھے۔

میری رائے میں اس اختلاف کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ابنِ اسحٰق کو "بدر موعد" کی مکی تاریخ یعنی "شعبان" پہنچی تھی، اور غزوۂ ذات الرقاع کی مدنی یعنی "جمادی" بخلاف اس کے واقدی کو "بدر موعد" کی مدنی تاریخ یعنی "ذلیقعدہ" پہنچی تھی اور "ذات الرقاع" کی مکی یعنی "محرم ۵ھ"

ابن اسحٰق اور واقدی کے زمانے میں چونکہ صرف ایک تقویم پر عمل ہو رہا تھا، اور مکی تقویم عرصۂ دراز سے تقویم پارینہ بن چکی تھی اس لیے ان تمام مہینوں کو صرف ہجری مہینے سمجھ لیا گیا، اور اسی اعتبار سے واقعات کو مرتب کر دیا گیا، اس قسم کی غلطیوں کو مندرجہ ذیل مثال سے سمجھئے:

فرض کیجئے کہ پرانے مخطوطات کے کسی تاجر کے یہاں آپ کو تین قدیم ورق ملتے ہیں، ان میں سے ایک پر "غزوۂ بنو نضیر" کا حال درج ہے اور اس میں مذکورہ واقعے کی تاریخ ربیع الاوّل بیان کی گئی ہے، دوسرے پر "بدرِ موعد" کا حال، اور اس کی تاریخ شعبان درج ہے اور تیسرے پر "غزوۂ ذات الرقاع" کی روداد کے ساتھ اس کی تاریخ "جمادی" بیان کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان اوراق میں کسی پر یہ صراحت بھی موجود ہے کہ یہ تینوں واقعات ۱۲ ماہ کے اندر ہی پیش آئے تھے اور ان میں "غزوۂ بنو نضیر" سب سے مقدم ہے۔

اسی طرح کے تین ورق مجھے ملتے ہیں، جن میں "غزوۂ بنو نضیر" کی تاریخ تو وہی "ربیع الاوّل" درج ہے مگر "بدرِ موعد" کی "ذلیقعدہ" اور ذات الرقاع" کی "محرم" باقی تمام صراحتیں تقریباً یہی موجود ہیں، جو متذکرہ بالا اوراق میں بیان کی جا چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان اوراق کو سامنے رکھ کر میرے اور آپ کے تاریخی نتائج اور واقعاتی ترتیب میں بیّن فرق ہوگا۔ آپ جب ان واقعات کو ترتیب دیں گے تو کالم "الف" کے مطابق اور میری ترتیب کالم "ب" کے مطابق ہوگی:

(۱) "الف"	(۱) "ب"
غزوۂ بنو نضیر ربیع الاوّل	غزوۂ بنو نضیر ربیع الاوّل

"الف"	"ب"
(۲)	(۲)
غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ر جمادی الاولیٰ	غزوۂ بدرِ موعد ۱ر شعبان
(۳)	(۳)
غزوۂ بدر موعد ۱ر شعبان	غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ر محرم

آپ غزوۂ ذات الرقاع "کو" بدر موعد" کے بعد اس لیے جگہ نہیں دے سکتے کہ اس طرح یہ واقعہ غزوۂ بنو نضیر سے ۴ مہینے بعد جا پڑے گا، اور ایک سال کی شرط ٹوٹ جائے گی اور میں غزوۂ ذات الرقاع کو بدر موعد سے اس لیے مقدم نہیں کر سکتا کہ میرے ورق میں اس کی تاریخ محرم ہے سا ایک ایسا محرم جو غزوۂ بنو نضیر سے بہرصورت بعد میں آیا تھا۔

بعینہٖ یہی مثال ابن اسحٰق اور واقدی کی ترتیب کی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکی تقویم کے فراموش ہو جانے کے بعد جب غیر مسلسل اور غیر مربوط تاریخی یادداشتیں علمار تاریخ کو ملیں تو ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ محض اپنی ذہانت اور حسابات کی روشنی میں ان واقعات کو ترتیب دیں۔

مزید دستاویزیں

مباحثِ گزشتہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ سیرت کے ابتدائی ماخذ دو قسم کی دستاویزوں پر مشتمل تھے، جن میں ایک پر مکی تقویم کی کارفرمائی تھی اور دوسری پر مدنی کی۔

"دو دستاویزوں کے لفظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ سیرت کے ابتدائی ماخذ صرف دو افراد تھے جنہوں نے خود عہدِ رسالتؐ میں تدوینِ سیرت کا کام ختم کر لیا تھا، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خیال نہ تو تاریخی اعتبار سے صحیح ہے اور نہ واقعاتی شہادتیں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عہدِ رسالتؐ کی بہت سی مکتوبی یادداشتوں کا تذکرہ اوراقِ تاریخ میں ملتا ہے۔ ان کو موجودہ اصطلاح میں کسی مستقل یا مرتب کتاب کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ میری دانست میں ان مکتوبات کا مقصد "تصنیف" نہ تھا، بلکہ یہ محض نجی ضروریات کے لیے ایک قسم کے نوٹ تھے، جو اشاعت کی غرض سے ضبطِ تحریر میں نہیں آئے تھے، تاہم اتنی بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھیں یادداشتوں کا سہارا لے کر متعدد صحابہ نے روایتیں بیان کی تھیں اور بعض حالتوں میں

اُن کے ورثاء اور شاگردوں تک بھی پہنچیں، لیکن ایسا بھی ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد ان کے لکھنے والوں کے نام متعین کرنا دشوار ہو گیا، مثلاً امام زہری کے زمانے میں یزید بن ابی حبیب المصری کی جو کتاب ملی تھی[1] اس کے مصنف کا نام اس کتاب کے مکتشف تک کو معلوم ہو سکا اس لیے ہم یہ قیاس تو کر سکتے ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں متفرق واقعات کی نجی یادداشتیں ضبطِ تحریر میں آ رہی تھیں، لیکن ان یادداشتوں کو تاریخی ترتیب دینا صرف تدوینِ سیرت کا کام تھا جو کو بہت کچھ قطع و برید سے کام لینا پڑا ہوگا۔

توقیتی نقطۂ نظر سے ان یادداشتوں یا دستاویزوں کو اگرچہ دو ہی قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن اگر واقعہ تولیں ایک سے زیادہ تسلیم کر لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ ایک ہی واقعے کے متعلق یہ ابتدائی یادداشتیں متعدد ہونا چاہئیں، جن میں کچھ مفصل ہو سکتی ہیں اور کچھ مجمل، چنانچہ کتبِ سیرت کی محتاط ورق گردانی سے ہمیں اس کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی ایک ایسے واقعے کو لیجئے جو ابن اسحٰق اور واقدی دونوں کے نزدیک کسی مشترک الاسم "مہینے میں ہوا ہو، اور اس کے بعد اس واقعے کی توقیتی تفصیلات پر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں روایتیں بہت سی باتوں میں مختلف ہیں۔ مثلاً غزوۂ سویق جو ان دونوں کے نزدیک ذوالحجہ ۲ھ کا واقعہ ہے، بنیادی طور پر ایک ہی تقویم سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب مزید تاریخی تفصیلات تلاش کی جاتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس واقعے کو کم سے کم دو ابتدائی راویوں نے بیان کیا ہوگا، اس لیے کہ ابن اسحٰق کے یہاں اس غزوے کا کوئی دن یا تاریخ مقرر نہیں، صرف مہینے کا نام ملتا ہے، بخلاف اس کے واقدی کے یہاں اس کی پوری صراحت موجود ہے:

"رسول اللہؐ یکشنبے کے دن ۵ ذوالحجہ کو نکلے۔"[2]

ظاہر ہے کہ اس روایت کا اگر ایک ہی راوی ہوتا تو ابن اسحٰق نے بھی یہی تفصیل بیان کی ہوتی،

اسی طرح فتح مکہ کے واقعہ کو لیجئے، ابن اسحٰق کے یہاں اس واقعے کے متعلق "دن" کی کوئی صراحت نہیں ملتی، صرف ۱۰ رمضان مذکور ہے[3] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ واقدی کے پیشِ نظر جو دستاویز تھی اس میں پوری صراحت موجود تھی۔

"اور رسول اللہؐ چہار شنبے کے دن ۱۰ رمضان کو نکلے۔"[4]

غور فرمائیے کہ اگر یہ تفصیل ابن اسحٰق کی نظر سے بھی گزرتی یا اُن کی کسی سند نے اس کو بیان کیا ہوتا تو وہ اس کو کیوں قبول نہ کرتے؟

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ روایاتِ سیرت کے ابتدائی ریکارڈ بیشتر متفرق اور منتشر تھے، جیسے جیسے مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کا شوق اور شعور پیدا ہوتا گیا، ویسے ویسے ان کی علمی پیاس نے گم شدہ ذخائر کے سوتے تلاش کر لیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق کے بعد ابن ہشام اور واقدی کے بعد ابن سعد کے یہاں مزید معلومات کا خزانہ برابر بڑھتا رہا۔

---

[1] طبری ۸۵/۲ [2] واقدی ۱۸۲/۳ [3] ابن ہشام ۴۲/۴ [4] ابن سعد ۹۷/۲

ابن حبیب کی دستاویز اس سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز کام وہ ہے جو ابن حبیب المتوفی (۲۴۵ھ) کی کتاب المحبر" میں نظر آتا ہے۔

ہر چند کہ "محبر" سیرت کی کتاب نہیں، بلکہ بعض بہت ہی مفید، عمدہ اور گوناگوں معلومات کا ایک چھوٹا سا کشکول ہے جس میں پیغمبرِ اسلام کے غزوات و سرایا کی بھی ایک مفصل فہرست دو علٰحدہ علٰحدہ بابوں میں دی گئی ہے۔

"غزوات النبیؐ" کے عنوان سے جو باب[1] ہے۔ اُس میں ستیس واقعات کی ترتیب وار فہرست دی گئی ہے۔ ان واقعات میں کم از کم ۲۶ کی تفصیلی تاریخیں درج ہیں، باقی چھ واقعات کے صرف مہینے متعین کئے گئے ہیں۔

سرایا کے ذیل میں صرف ایک سریہ (یعنی سریہ غالب بن عبداللہ اللیثی) کی پوری تاریخی صراحت ملتی ہے[2]۔ باقی سرایا کی صرف مجمل فہرست کتاب میں شامل کی گئی ہے جس میں اکثر واقعات کے مہینے بھی نامزد نہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالباً ابن حبیب کو ان واقعات کی پوری ترتیبی صراحتیں نہ مل سکی تھیں۔

حیرت ہے کہ ابن حبیب کی فہرستِ غزوات میں جو تاریخیں ملتی ہیں وہ دوسری سیرۃ یا تاریخ کی کتابوں سے کیفیت اور کمیت دونوں میں زائد ہیں۔ ابن اسحٰق تو خیر بہت متقدم ہیں، متاخرین میں ابن کثیر تک کے یہاں اتنی صراحتیں ناپید ہیں جن کے سامنے اسلاف کا بہت بڑا ذخیرۂ معلومات موجود تھا، چنانچہ کتاب المحبر کے ایڈیٹر، ڈاکٹر حمید اللہ کو یہ نوٹ لکھنا پڑا۔

"کتاب المحبر میں تمام کتبِ مغازی کے مقابلے میں بعض غزوات کی تاریخوں میں اختلاف ہے، متنبہ رہیے!"[3]

اس صورت میں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے لیے ابن حبیب کی یہ تاریخی تفصیلات کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔؟

ابن حبیب اور محبر کی حیثیت ابن حبیب تیسری صدی ہجری کے نصف اوّل کے مصنف ہیں، یہ واقدی اور ابن ہشام سے قریب العہد اور ابن سعد المتوفی (۲۳۰ھ) کے معاصر تھے، اس اعتبار سے ان کا شمار متقدمین میں ہوتا ہے۔ تقریباً ۴۵ کتابیں تصنیف یا تالیف کیں۔ جن میں سے ان کی "کتاب المحبر" کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ ابن ندیم[4]، خطیب بغدادی[5]، اور یاقوت حموی[6] وغیرہ نے ان کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے اور البیرونی اور اصفہانی وغیرہ نے ان سے استناد کیا ہے[7]۔ اس اعتبار سے یہ کہنا تو شاید غلط ہوگا کہ غزوات و سرایا کی تاریخیں بیان کرنے میں اس فاضل مصنف نے احتیاط سے کام نہیں لیا، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ ہمیں ان کی ابتدائی سند یا ماخذ اصلی کا کوئی علم نہیں، اور جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے، عام طور پر کسی سیرت یا مغازی کی کتاب میں ابن حبیب جیسی تاریخی تفصیلات نظر نہیں آتیں، گویا اس لحاظ سے ابن حبیب "منفرد" ہیں، ہاں طبری کے یہاں کچھ واقعات کی تاریخیں وہی ملتی ہیں، جو ابن حبیب نے بیان کی تھیں، اور اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یا تو طبری نے یہ تاریخیں خود ابن حبیب سے لی ہیں یا ان دونوں کا کوئی مشترک ماخذ تھا، جو آج ہمارے سامنے نہیں، میرا خیال ہے

---

[1] دیکھیے ابن حبیب / ۱۱۱ [2] ابن حبیب / ۱۱۷ [3] ابن حبیب / ۱۱۰ [4] ابن ندیم فہرست / ۱۰۶ [5] خطیب بغدادی / ۲
[6] یاقوت ۶ / ۴۷۴ [7] دیکھیے آثار، کتاب الاغانی ۱۰ / ۱۴۹ !

کہ مشترک ماخذ کا ہونا زیادہ قرین قیاس ہے ، اس لیے کہ طبری کے یہاں کچھ الفاظ زیادہ نظر آتے ہیں جن کو ابن حبیب نے غالباً اختصار کی خاطر حذف کر دیا ہے ، بہرحال یہ تاریخیں حسب ذیل ہیں :-

ابن اسحٰق اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ بدر کے بعد مدینے پہنچتے ہی پیغمبر اسلامؐ نے بمشکل ایک ہفتے آرام فرمایا ہوگا ، کہ بنو سُلیم اور غطفان کے اجتماع کی اطلاع مدینے پہنچی[۱] جس کو سُن کر آپؐ فوراً ہی بنو سُلیم کی طرف بڑھے اور "قرقرۃ الکدر" تک جا پہنچے ، اس غزوے کی تاریخ اور دن کسی قدیم سیرت نگار کے یہاں محفوظ نہیں ، مگر ابن حبیب کا بیان ہے :-

"قرقرۃ الکدر کی جانب جمعہ یکم شوال کو کوچ فرمایا[۲]"

طبری نے اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ :-

"بعد ازاں قرقرۃ الکدر پر لشکر کشی کی تو آپؐ مدینے سے جمعہ کے دن ارتفاعِ شمس کے بعد یکم شوال کو نکلے[۳]"

اسی طرح ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے "غزوۂ بنی قینقاع" کی کوئی واضح توقیتی صراحت نہیں کی ہے ۔ لیکن واقدی اور ابن سعد کے یہاں اس کو نصف شوال ۲ھ کا واقعہ ظاہر کیا گیا ہے[۴] بخلاف اس کے ابن حبیب نے اس کی تاریخ سب سے ہٹ کر ، ۷ صفر ۳ھ بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ :-

"بنی قینقاع کا محاصرہ یکشنبے کے دن ، ۷ صفر کو کیا[۵]"

طبری نے بھی اس غزوے کے سلسلے میں ایک قول صفر ہی کے متعلق نقل کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ "گمان کیا جاتا ہے ، کہ نبی علیہ السلام نے ان سے ۹ صفر کو جنگ کی[۶]"

ابن حبیب نے لفظ سَبع (سات) اور طبری نے "تسع" (نو) استعمال کیا ہے ، اس لیے یہ اختلاف بظاہر تجنیس خطی کی وجہ سے ہوا ہوگا ، ورنہ جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے ، وہ غالباً مشترک تھا ۔

اس مشترک دستاویز کی سب سے بڑی شہادت سریۂ غالب بن عبد اللہ اللیثی ہے جو طبری کے بقول اسی ۲ھ بلکہ عین اُس زمانے کا واقعہ ہے جب پیغمبر اسلامؐ بنو سُلیم پر حملہ آور تھے ، اس واقعے کی توقیت نہ تو ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے کی ہے اور نہ واقدی اور ابن سعد نے ، لیکن ابن حبیب لکھتے ہیں کہ :

"نبی (صلعم) نے غالب بن عبد اللہ اللیثی کو یکشنبے کے دن ۱۰ شوال کو روانہ کیا تو ان کی بنو سُلیم سے مڈبھیڑ ہوئی اور جنگ ہوئی ، اور یہ لوگ ہفتے کے دن جب کہ شوال کے ۱۴ دن باقی تھے مالِ غنیمت کے ساتھ واپس ہوئے[۷]"

طبری کے یہاں بھی بعینہٖ یہی تاریخی تفصیلات کچھ اضافے کے ساتھ ملتی ہیں ، وہ لکھتے ہیں کہ :-

---

[۱] ابن ہشام ۳/۴۶ [۲] ابن حبیب /۱۱۱ [۳] طبری ۲/ ۴۹۸ [۴] واقدی / ۱۷۷ ، ابن سعد ۲/ ۱۹ [۵] ابن حبیب /۱۱۲
[۶] طبری ۲/ ۴۹۸ [۷] ابن حبیب / ۱۱۷

"اور بعض مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ غزوۂ کدر سے مدینے واپس آئے اور آپؐ نے بلا لڑائی کے دشمن کے مویشیوں اور لوگوں کو ہانک لیا تھا، اور آپؐ کی اس غزوے سے تشریف آوری جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے ۱۰ شوال کو ہوئی تھی تو آپؐ نے غالب بن عبداللہ اللیثی کو یکشنبے کے دن ۱۰ شوال کو بنی سُلیم کی طرف روانہ کیا، اُن کی جنگ ہوئی اور انھوں نے بنو سُلیم کے مویشی پکڑ لیے، اور مالِ غنیمت کے ساتھ ہفتے کے دن جب کہ شوال کی ۱۴ راتیں باقی تھیں واپس آئے"[1]

اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن حبیب اور طبری کا ماخذ کوئی مشترک دستاویز تھی، جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں۔ اُوپر کی مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان غزوات و سرایا کی تاریخی تفصیلات کے ذیل میں ابن حبیب کے سامنے جو دستاویز تھی وہ کم سے کم طبری کے زمانہ تک متداول رہی اور قابلِ استناد سمجھی جاتی تھی، اور ہر چند کہ ابن حبیب کی طرح طبری نے بھی اس سند کی کوئی ادنیٰ نشان دہی نہیں کی ہے بلکہ ہر جگہ "وَقَالَ بَعْضُهُمْ" کہہ کر نظر انداز کر دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دستاویز اتنی اہم ضرور تھی، کہ طبری جیسے محتاط مؤرخ نے اس کو قابلِ نقل سمجھا۔

اس طرح ہم ابن اسحٰق اور واقدی کی دستاویزوں کے علاوہ ایک تیسری ضمنی دستاویز سے روشناس ہوتے ہیں۔

یہاں میں اتنی بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ابن حبیب، ابن اسحٰق کے مقابلے میں واقدی سے زیادہ قریب العہد تھے، لیکن "محبّر" میں جو تاریخیں ملتی ہیں وہ زیادہ تر ابنِ اسحٰق کی تاریخوں کی ایک طرح تفصیل مزید یا تکملہ کہی جا سکتی ہیں، واقدی کی منفرد تاریخوں میں سے ابن حبیب نے کسی ایک تاریخ کو قبول نہیں کیا ہے۔[2]

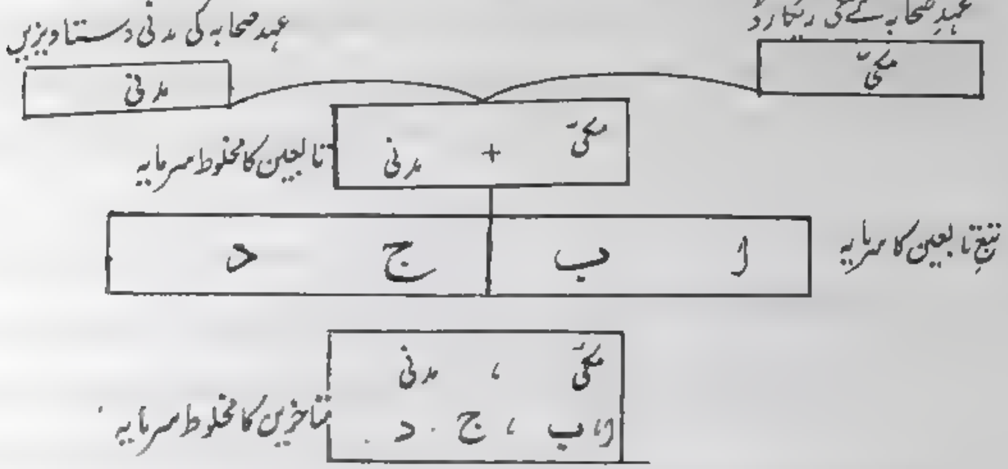
(۴)

چوتھی دستاویز ابن اسحٰق، واقدی اور ابنِ حبیب کی بیان کردہ تاریخوں کے علاوہ کچھ اور تاریخیں بھی ہیں جو متفرق طور پر کتبِ سیر و تاریخ میں ملتی ہیں، اور جن کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ماخذ بھی صدرِ اوّل کے ریکارڈ ہوں گے، اس لیے اگر ان سب کے مجموعہ کو چوتھی ضمنی دستاویز کا نام دے دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان چاروں دستاویزی ریکارڈوں کے لیے میں نے علاماتِ ذیل اختیار کی ہیں:-

ابن اسحٰق کے ماخذ	واقدی کے ماخذ	ابن حبیب وغیرہ کے ماخذ	دوسری روایات کے ماخذ
ا	ب	ج	د

۱؎ طبری ۲ / ۲۹۹۔ ۲؎ یہاں یہ بات بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبیب کی فہرستِ غزوات کتابتی سہو و اغلاط کی بنا پر جگہ جگہ معمہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی چند مثالیں اس مقالے میں پیش کی جائیں گی۔

اس طرح تقویمی اعتبار سے سیرت کا موجودہ سرمایۂ تاریخی حسب ذیل نقشہ سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے :۔



۵

کتابتی سہو اور دوسری قسم کی غلطیاں

گزشتہ مباحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے موجودہ سرمایۂ سیرت میں (تاریخی اعتبار سے روایات ا، ب، ج، د کو سب سے بڑا دخل ہے، جو ابن اسحٰق، واقدی، ابن حبیب، اور دوسرے متقدمین کی ماخذ اصلی تھیں، اس سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ ہماری موجودہ روایاتِ سیرت (تمام کی تمام) بعینہٖ وہی ہیں جو اُن اصلی دستاویزوں سے سیرت نگاروں کو پہنچی تھیں، اور ان میں کتابتی سہو، تصحیفی غلطیاں یا تفہیمی اغلاط کا کوئی دخل نہیں ہے یہاں اس بات کو دیکھنا ہے کہ کیا یہ دستاویزیں اپنی اصل صورت میں ہم تک پہنچی ہیں، یا ان پر امتدادِ زمانہ کے اثرات بھی معلوم ہوتے ہیں۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ زمانۂ قدیم میں اگرچہ صحتِ نقل کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا، شاگرد ان خاص جب اپنے شیوخ اور اساتذہ سے اُن کی مرویات لیتے تو اپنے مکتوبات کو اُن کے سامنے پڑھ کر سناتے تاکہ امکانی غلطیوں کا راستہ بند ہو سکے، باوجود اس کے کتابتی سہو اور نقل در نقل کی غلطیاں ایسی نہ تھیں جو انسانی فطرت سے باہر ہوں۔

بائبل اور قرآن سے زیادہ صحتِ کتابت کا فخر شاید دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں، لیکن ان میں بھی اختلافاتِ قرأت موجود ہیں جو بالبداہتہ کتابتی اختلافات کا نتیجہ ہیں۔ اس صورت میں یہ بات بالکل خارج از قیاس ہے کہ روایاتِ سیرت میں خواہ اُن کا تعلق ایام شہور سے ہو یا دوسری اصنافِ روائت سے، اس قسم کے اختلافات یا غلطیاں موجود نہیں۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخی روایات کا تعلق چونکہ بیشتر حسابات اور ریاضی سے ہے اس لیے ان کی غلطیاں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور ان کی صحت و عدمِ صحت کی تمیز حسابی قاعدوں سے ممکن ہے۔

روایاتِ سیرت پر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ توقیتی اعتبار سے ان میں اگر کہیں غلطیاں ہیں تو بیشتر دو ہی قسم کی کتابتی سہو اور تفہیمی اغلاط، کتابتی سہو بیشتر اس نوعیت کے ہیں کہ مشترک الاسم مہینوں کے ذیل میں کاتبوں کی بے احتیاطی سے چند مقامات پر "اوّل" "آخر" ہو گیا ہے اور "آخر" "اوّل"۔ تاریخوں کے ذیل میں بعض جگہ "عشرین" "عشرہ" بن گیا ہے اور "مضین"، "بقین"

ایک دو جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے اور کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مصنفین کوئی مخطوطہ صحیح طور پر پڑھ نہ سکے تھے اور جتنا پڑھ سکے، وہی درج کر دیا گیا، کچھ غلطیاں تساہل اور بے پروائی کا نتیجہ بھی معلوم ہوتی ہیں۔

بہر حال تقریباً تمام قسم کی غلطیاں ایسی ہیں جو نقل در نقل کا قدرتی نتیجہ ہیں، میں یہاں سب سے پہلے ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جو ربیع الاوّل اور ربیع الآخر یا جمادی الاولیٰ اور جمادی الاُخریٰ کے ذیل میں ہوئی ہیں اور جن کو ناقلین مابعد کی عدم توجہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابن ہشام کے موجودہ نسخوں میں ابن اسحٰق سے یہ روایت ملتی ہے :۔

"اس کے بعد رسول اللہؐ ربیع الاوّل کے مہینے میں قریش کے ارادے سے نکلے، یہاں تک کہ بواط پہنچے جو رضویٰ کے قریب ہے، بعد ازاں مدینے واپس آئے اور لڑائی نہیں ہوئی اور آپؐ نے ربیع الآخر کا بقیہ حصہ اور جمادی الاولیٰ کے کچھ حصے مدینے میں قیام فرمایا۔"[1]

اسی روایت کو ابن حمید نے سلمہ کی وساطت سے ابن اسحٰق سے لیا تھا جس کو طبریؒ نے یوں نقل کیا ہے :۔

"اس کے بعد رسول اللہؐ "ربیع الآخر" کے مہینے میں قریش کے ارادے سے نکلے، یہاں تک کہ "بواط" پہنچے، جو رضویٰ کے قریب ہے، بعد ازاں مدینے واپس آئے اور لڑائی نہیں ہوئی اور آپؐ نے "ربیع الآخر کے بقیہ حصے اور جمادی الاولیٰ کے کچھ حصے مدینے میں قیام فرمایا۔"[2]

ظاہر ہے کہ ان دونوں روایتوں میں صرف ربیع الاوّل اور ربیع الآخر کا فرق ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ طبری کے پیش نظر جو نسخہ تھا اس میں بجائے "ربیع الاوّل" کے "ربیع الآخر" مرقوم تھا، سیرت ابن اسحٰق کے فارسی ترجمے کا جو مخطوطہ[3] میرے پیش نظر ہے اس میں بھی اس غزوے کو "ربیع الاوّل" کا ظاہر کیا گیا ہے جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ خود ابن اسحٰق کے مختلف نسخوں میں سے کسی نسخے میں ربیع الاوّل تھا اور کسی میں ربیع الآخر۔

واقدی اور ابن سعد کے موجودہ نسخوں میں اس واقعے کی تاریخ ربیع الاوّل[4] بیان کی گئی ہے، لیکن قدماء میں ابن حبیب کے بیان اس غزوہ کی تاریخ ربیع الآخر ہی[5] ملتی ہے، جس کی وجہ سے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس واقعہ کی روایات کے اصل ماخذوں میں ربیع الاوّل مذکور تھا، یا ربیع الآخر، میری رائے میں ربیع الآخر کو یوں ترجیح دی جا سکتی ہے کہ روایت کے آخری حصے میں "بقیہ ربیع الآخر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن سے گمان ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق نے روانگی کی تاریخ بھی ربیع الآخر ہی بیان کی ہوگی۔

ربیع کے ذیل میں اوّل و آخر کی غلطیاں کئی اور مقامات پر بھی ملتی ہیں، مثلاً غزوۂ "دومۃ الجندل" کے متعلق ابن اسحٰق اور واقدی کے موجودہ نسخوں میں ربیع الاوّل کی تاریخ ملتی ہے[6] لیکن ابن کثیر کے سامنے جو واقدی کا نسخہ تھا، اس میں "ربیع الآخر" مذکور تھا،

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۳۸ ۔ [2] طبری ۲/۲۶۰ [3] مخطوطہ ورق ۲۴۸ رضا لائبریری رام پور، نمبر ۱۸۸۸ فارسی [4] واقدی ۱/۳ ابن سعد ۲/۳ [5] ابن حبیب/۱۱۱ ، [6] ابن ہشام واقدی ۴/۱

چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"اور واقدی کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ کا دومۃ الجندل کی طرف خروج "ربیع الآخر" میں ہوا[1]"

اسی طرح سریۂ عکاشہ بن محصن کے ذیل میں واقدی کے موجودہ نسخوں میں ربیع الآخر[2] مذکور ہے، لیکن طبری کے یہاں ربیع الاول[3]۔

سریۂ محمد بن مسلمہ (ذی قصہ) کے ذیل میں "طبری" کے یہاں ربیع الاول[4] ملتا ہے لیکن واقدی کے یہاں ربیع الآخر[5]، سریۂ خالد بن ولید کے متعلق (جو بنی عبد المدان کی طرف بھیجا گیا تھا) طبری کی ترجیحی رائے یہ ہے کہ واقعہ ربیع الآخر کا ہے، جب کہ خود ان کے سامنے ربیع الاول کے الفاظ بھی موجود تھے، چنانچہ سنہ ۱۰ھ کے ذیل میں مرقوم ہے :-

"تو آنحضرتؐ نے خالد بن ولید کو ربیع الآخر میں روانہ کیا، اور کہا جاتا ہے کہ ربیع الاول میں اور کچھ لوگ جمادی الاولیٰ میں بتاتے ہیں[6]"

گویا طبری کے زمانے میں بھی ربیع الاول اور ربیع الآخر کا اختلاف پیدا ہو چکا تھا اور کچھ نسخوں میں "اول" تھا، کچھ میں "آخر"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کتابتی سہو، مختلف مصنّفین کی کتابوں کا محتاج نہیں ہے، بلکہ آپ ایک ہی مصنّف کی کتاب میں ایک ہی سطر کے بعد کتابتی سہو ملاحظہ فرما سکتے ہیں، چنانچہ ابن حبیب کے موجودہ نسخے میں جس کو ڈاکٹر حمید اللہ نے ایڈٹ کیا ہے، غزوۂ بنو نضیر کے ذیل میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

"اور آنحضرتؐ سہ شنبہ کے دن ۱۲ ربیع الآخر کو ان کی یعنی بنو نضیر کی طرف نکلے اور ۵ ربیع الآخر کو واپس ہوئے[7]"

گویا ۱۲ ربیع الآخر کو بنی نضیر کی طرف کوچ کیا گیا اور اسی مہینے کی ۵ تاریخ کو واپسی ہوئی، یہ غلطی اتنی موٹی تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کی تصحیح کر کے بجائے ربیع الآخر کے ۱۲ ربیع الاول لکھ دیا، لیکن کئی مقامات پھر بھی ایسے رہ گئے جو ہنوز قابلِ نظر ہیں، (جن کو میں ابھی پیش کروں گا)

اول و آخر کے ذیل میں بعینہٖ یہی کیفیت جمادیٰ کے سلسلے میں بھی ملتی ہے، ابن سعد نے سریۂ زید بن حارثہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"اور یہ واقعہ ہلال جمادی الاخریٰ کا ہے[8]"

یہی تاریخ واقدی کے موجودہ نسخوں میں ہے، لیکن ابن کثیر کے سامنے جو واقدی کا نسخہ تھا اس میں اس سریہ کی تاریخ

---

[1] البدایہ والنہایہ ۴/۹۲ [2] واقدی/۵ [3] طبری/ [4] طبری/ [5] واقدی/۵
[6] طبری ۳/۱۵۶ [7] ابن حبیب/۱۱۳ [8] واقدی ./۱۹۵

مستہل جمادی الاولیٰ" مذکور ہے :-

"اور واقدی کا بیان ہے کہ اس سریّہ کے لیے زید بن حارثہ کا خروج ہلال جمادی الاولیٰ کا واقعہ ہے[۱]"

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف بھی کتابتی سہو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، بالکل ایسی ہی غلطیاں ابن حبیب کے یہاں بھی موجود ہیں، چنانچہ غزوۂ ذات العشیرہ کے ذیل میں مذکور ہے۔

"اور غزوۂ ذات العشیرہ یکم جمادی الاولیٰ کا واقعہ ہے ...... اور آنحضرت[ؐ] جمادی الاخریٰ کے آٹھ دن باقی تھے کہ واپس ہوئے[۲]"

گویا یکم جمادی الاولیٰ کو پیغمبرِ اسلام[ؐ] اس غزوہ کے لیے نکلے تھے اور ۲۱ رپا ۲۲ رجمادی الاُخریٰ تک مدینے سے باہر رہے، (یعنی تقریباً ایک ماہ ۲۱ روز) لیکن دوسری ہی سطر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۲ رجمادی الاُخریٰ کو جب کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کیا تھا تو آنحضرت[ؐ] مدینے میں موجود تھے، اور آپؐ نے کرز کا پیچھا بدر تک کیا تھا، چنانچہ بدرِ اولیٰ کے سلسلے میں خود ابن حبیب نے جو تاریخ بیان کی ہے وہ یہ ہے :-

"(اور بدر اولیٰ کے لیے) دوشنبہ کے دن ۱۲ رجمادی الاخریٰ کو نکلے[۳]"

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات العشیرہ کی واپسی کی تاریخ ابن حبیب نے بجائے ۲۲ رجمادی الاُخریٰ کے ۲۲ رجمادی الاولیٰ لکھی ہوگی، کیونکہ اتنی موٹی حسابی غلطی کم از کم ابن حبیب جیسے مصنف کے قلم سے ممکن نہیں۔

تاریخ دیوم کی غلطیاں کتبِ سیرت میں تاریخ دیوم کی کتابتی اغلاط کی مثالیں بھی موجود ہیں، جن میں کم سے کم ایک مثال ایسی ہے کہ اس میں غالباً لفظ "عشرین" "عشرہ" بن گیا ہے۔ واقدی کی کتاب المغازی میں قتل کعب بن اشرف کی تاریخ ۱۴ ربیع الاوّل[۴] بیان کی گئی ہے۔

واقدی نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ اس تاریخ آنحضرت[ؐ] مدینے ہی میں موجود تھے[۵] لیکن چند ہی سطروں کے بعد "غزوۂ ذی امر" کے ذیل میں جو بقول واقدی اسی مہینہ کا واقعہ ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ ملتے ہیں :-

"رسول اللہ[ؐ] پنجشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاوّل کو ذی امر کے لیے نکلے[۶]"

گویا کعب بن اشرف کے قتل سے دو روز پہلے ۱۲ ربیع الاوّل کو آپؐ مقامِ ذی امر کی طرف کوچ فرما چکے تھے، ظاہر ہے کہ یہ غلطی بھی محض کتابتی سہو ہے اور واقدی نے شاید لثنتی عشرہ کے بجائے ۲۲ تحریر کیا ہوگا۔ اس لیے کہ از روئے حساب ۱۲ تاریخ کو پنجشنبہ کا دن بھی نہیں آتا بلکہ ۲۲ ہی کو پڑتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلطی بھی بہت قدیم ہے، اس لیے کہ واقدی کے شاگردِ خاص ابن سعد نے جب اس روایت کو لیا تو ۱۲ ربیع الاوّل ہی درج کیا۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ ۴/۵ [۲] ابن حبیب /۱۱۰ [۳] ابن حبیب /۱۱۱ [۴] واقدی /۱۸۸ [۵] واقدی /۱۸۸
[۶] واقدی /۳ !

مضین اور یقین میں التباس ابن حبیب کے یہاں ایک بہت دلچسپ کتابتی سہو غزوۂ سویق کے ذیل میں نظر آتا ہے جس کی اصل وجہ خود میری کتابت کی غلطی سے ظاہر ہوئی۔

"محبر" میں اس غزوے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے :-

"نخرجَ النبیّ صلّی اللہ علیہ یوم الاحد لسبع مضین بقین من ذی الحجۃ ورجع علیہ لثمان بقین من ذی الحجۃ۔"[1]

گویا آنحضرت غزوۂ سویق کے لیے ۲۲ کو نکلے اور ۲۱ کو مراجعت فرما ہوئے، ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے اس غلطی کے متعلق یہ ہے، کہ غالباً اصل عبارت یوں ہوگی :-

"خرجَ لثمان بقین ورجع لسبع بقین"[2]

لیکن میں نے جو نوٹ لیا تھا، اس میں دونوں جگہ لفظ "بقین" کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اس کو مسلسل "مضین" پڑھتا رہا، اور اس میں وہ کتابتی سُقم نظر نہ آیا جس کی طرف ڈاکٹر حمید اللہ نے توجہ دلائی تھی، گویا یہ حسابی غلطی میری غلط نویسی سے خود بخود دور ہو گئی میرا خیال ہے کہ اصل نسخوں میں بھی دونوں جگہ "بقین" کی جگہ "مضین" ہی ہو گا جس کو قدیم ناقلوں نے "بقین" پڑھ کر درج کتاب کر دیا۔

یہ غلطی بھی قدیم نسخوں کی معلوم ہوتی ہے اور اس کا الزام ابن حبیب یا ابن حبیب کے ناقلین کو نہیں دیا جا سکتا، بلکہ غالباً یہ الفاظ ابن حبیب کے اصل ماخذوں میں موجود تھے جو طبری اور ابن حبیب کی مشترک دستاویز کہی جا سکتی ہے، اس لیے کہ طبری کے یہاں بھی تھوڑی قطع برید کے ساتھ اس غزوے کے متعلق ایک روایت یہ بھی موجود ہے :-

"کہ رسول اللہ نے یکشنبہ کے روز ذوالحجہ کی سات راتیں باقی تھیں کہ لشکر کشی فرمائی۔"[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبری نے روایت کا آخری جزو یعنی "رجع علیہ لثمان لبقین من ذی الحجہ" اسی حسابی غلطی کے پیشِ نظر ترک کر دیا۔ "سبع لبقین" کے بجائے "سبع مضین" پر ایک قیاس یہ بھی ہے کہ دوسرے مورخین مثلاً واقدی اور ابن سعد کے یہاں اسی غزوے کی تاریخ "خمس خلون"[4] مذکور ہوئی ہے جو "سبع مضین" سے قریب تر ہے، اور ہو سکتا ہے، کہ راوی کے نزدیک یہی تاریخ ہو۔

سقوطِ الفاظ کی مثالیں مخطوطات کی نقل در نقل میں سقوطِ الفاظ کی غلطیاں اتنی عام ہیں کہ ان پر کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے عام طور پر یہ غلطیاں مشکل سے گرفت میں آتی ہیں، لیکن تاریخوں کا مسئلہ چونکہ حسابی مسئلہ ہے۔ اس لیے جلد سمجھ میں آجاتا ہے۔ چنانچہ غزوۂ بواط کے متعلق اس قسم کی ایک غلطی ملاحظہ ہو :-

"ابن حبیب کی موجودہ عبارت یوں ہے :

"(آنحضرت) دوشنبہ کے دن ۳ ربیع الآخر کو نکلے، بعد ازاں دوشنبہ کے دن ۲۰ ربیع الآخر کو واپس ہوئے"[5]

معلوم ہوتا ہے کہ کسی بے احتیاط ناقل کے قلم سے "ثلاث عشرۃ خلون" کی بجائے "ثلاث خلون" کے الفاظ نکل گئے اور لفظ "عشرۃ"

---

[1] ابن حبیب /۱۱۱ [2] ایضاً [3] طبری ۲/۲۹۹ [4] واقدی /۳، ۱۸۲، ابن سعد ۲/۲۰، قسطلانی ۱/۱۱۵ [5] ابن حبیب /۱۱۰

لکھنے سے رہ گیا ہے کیونکہ از روئے حساب جب کسی مہینے کی ۲۰ کو دوشنبہ ہوگا تو اس سے پہلے ہفتوں میں صرف ۱۳ اور ۶ تاریخ کو دوشنبہ ہو سکتا ہے، اس بناء پر ظاہر ہے کہ یہاں صرف یہی قیاس کیا جا سکے گا کہ روایت میں "لثلاث عشرۃ خلون" مذکور تھا۔

اس واقعہ کی تاریخ کے ذیل میں ایک دوسری غلطی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ کتابوں میں بجائے "ربیع الآخر" اس کی تاریخ "ربیع الاوّل" درج ہو گئی ہے جس کے خلاف متعدد قرائن ہیں جو مقالہ چہارم میں پیش کئے گئے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ کتابتی سہو حضرت ابو سعید خُدری کی ایک روایت میں نظر آتا ہے۔ ابن اسحٰق اور دوسرے سیرت نگاروں نے (سوائے واقدی اور ابن سعد کے) غزوۂ خیبر کی تاریخ محرم ۷ھ بیان کی ہے۔ صرف واقدی اور ابن سعد نے اسے جمادی الاولیٰ ۷ھ کا واقعہ ظاہر کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ابن سعد نے ابو سعید خدری کی ایک روایت بھی نقل کی ہے جو حسب ذیل ہے:

"بیان کیا کہ ہم رسول اللہؐ کے ہمراہ خیبر کے لیے ۸ رمضان کو نکلے اور بہت سے لوگوں کے روزے تھے۔"[1]

قدیم سیرت نگاروں میں سے کسی ایک نے بھی غزوۂ خیبر کو رمضان میں ظاہر نہیں کیا ہے، بلکہ بخاری میں تو یہ صراحت موجود ہے کہ صرف دو غزوے یعنی بدر اور فتح مکہ "رمضان میں ہوئے تھے، اس بناء پر ابو سعید خُدری کی روایت کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن قسطلانی نے "مواہب" میں اس غلطی کو محض کتابتی سہو قرار دیا ہے، چنانچہ مذکور ہے:۔

"ابن سعد اور ابن ابی شیبہ نے ایک غریب روایت ابو سعید خدری سے یہ بیان کی ہے کہ "ہم رسول اللہؐ کے ہمراہ خیبر گئے، یہ رمضان کی ۱۸ تاریخ تھی" اگرچہ اس کی اسناد حسن ہے لیکن روایت (پھر بھی) غلط ہے، غالباً یہ لفظ حُنین تھا جو غلطی سے خیبر ہو گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ حُنین غزوۂ فتح (مکہ) کے بعد ہوا تھا، اور غزوۂ فتح کے لیے رسول اللہؐ بالیقین رمضان میں نکلے تھے۔"[2]

حُنین کو اگرچہ بدخطی کی بناء پر خیبر پڑھا جا سکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس روایت کے بعض دوسرے الفاظ پڑھنے اور سمجھنے میں بھی کہیں اور غلطی ہوئی ہے، اس لیے کہ غزوۂ حنین بھی ۱۸ رمضان کا واقعہ نہیں، بلکہ شاید آخر رمضان یا شوال کا واقعہ ہے۔

اسی طرح غزوۂ خندق اور بنو قریظہ کی تاریخیں ہیں، جن کی ابتدائی دستاویزوں میں کچھ ایسی غلطیاں نظر آتی ہیں، جن کی تصحیح فی الوقت مشکل ہے۔ خندق کی تفصیلی تاریخ ابن حبیب نے بھی بیان کی ہے اور واقدی نے بھی، اور دونوں کے یہاں ایک ہی نمونہ کی غلطیاں ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ تاریخیں جب ابتدائی یادداشتوں سے نقل کی گئی تھیں، تو خود ناقلین نے اُن کو پورے طور پر نہیں سمجھا تھا، اور یہ تاریخیں خواہ ابتدائی یادداشتوں کی بدخطی کی وجہ سے خواہ مسودات کے نقص کی بنیاد پر قطعاً غلط نقل ہوئی تھیں۔

ابن حبیب نے غزوۂ خندق کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے:

"کہ آنحضرتؐ پنجشنبہ کے دن ۱۰ شوال کو نکلے اور ہفتہ کے دن یکم ذلیقعدہ کو یہ لڑائی ختم ہوئی۔"[3]

---

[1] ابن سعد ۲/ ۷۸۔ [2] قسطلانی مواہب/ ۱۴۳ [3] ابن حبیب/ ۱۱۳۔

عام قمری تقویم کے بموجب اگرچہ ۱۰ رشوال سنہ کو چہار شنبہ آتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ پنجشنبہ بھی ممکن ہے، لیکن روایت کا دوسرا حصہ بدیہی طور پر غلط نقل ہوا ہے، اس لیے کہ جب ۱۰ رشوال کو پنجشنبہ ہوگا تو یکم ذلیقعدہ کو ہفتہ ممکن نہیں بلکہ چہارشنبہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح واقدی اور ابن سعد کی تاریخیں بھی غلط معلوم ہوتی ہیں؛ ابن سعد کا بیان ہے :۔

"اور رسول اللہ دوشنبہ کے دن ۸ ر ذلیقعدہ کو نکلے اور مشرکین نے پندرہ راتیں محاصرہ کیا اور رسول اللہ چہارشنبہ کو جبکہ ذلیقعدہ کی سات راتیں باقی تھیں واپس تشریف لائے۔"[1]

اول تو یہ واقعہ ذلیقعدہ کا نہیں، بلکہ اس سے متقدم مہینے یعنی شوال کا ہے، جس پر موسمی قرائن موجود ہیں، دوسرے یہ کہ بالفرض اگر اس کو ذلیقعدہ کا واقعہ تسلیم کر بھی لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ ۸ ر ذلیقعدہ کو دوشنبہ کا دن تھا، تو اس سے پندرہ دن کے بعد ۲۲ ر ذلیقعدہ کو پھر دوشنبہ ہی کا دن ہوگا، نہ کہ چہارشنبہ کا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقدی اور ابن سعد کے یہاں غزوۂ خندق اور غزوۂ بنو قریظہ کی تاریخیں مخلوط ہو گئی تھیں :

بہرصورت ان غزوات کی تاریخیں نہ ابن حبیب کے یہاں ٹھیک ہیں اور نہ ابن سعد اور واقدی کے یہاں، از روئے حساب صحیح ہیں، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی کتابت میں کب اور کہاں غلطی ہوئی تھی۔

سیرت کی کتابوں میں بعض غلطیاں ایسی بھی موجود ہیں جو محض مولفین مابعد کے تساہل اور عدم توجہی کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہیں، مثلاً دیار بکری[2] نے غزوۂ بنو لحیان کے متعلق ابن اسحٰق کی طرف یہ روایت منسوب کی ہے کہ ان کی رائے میں یہ واقعہ شعبان سنہ ۶ کا تھا، حالانکہ ابن ہشام نے ابن اسحٰق سے جو روایت بیان کی ہے، اس میں صاف طور پر اس واقعہ کو جمادی الاولیٰ ظاہر[3] کیا ہے۔ طبری نے ابن حمید سے جو روایت بیان کی ہے اس میں بھی جمادی الاولیٰ ہی[4] درج ہے۔ حتیٰ کہ سیرت ابن اسحٰق کے فارسی ترجمہ میں بھی شعبان نہیں بلکہ جمادی ہی[5] ہے۔ علاوہ ازیں عام طور پر تمام مولفینِ مابعد نے ابن اسحٰق سے جو روایتیں بیان کی ہیں۔ وہ سب کی سب جمادی الاولیٰ کی ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیار بکری کو پھر یہ شعبان کی روایت کہاں سے ملی؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سہو کتابت یا خود مؤلف کی عدم توجہی کا نتیجہ ہے۔

(۴)

زیر نظر مقالہ میری کتاب "حل التضاد" کا حصہ دوم ہے گزشتہ مقالوں میں جو نظریہ پیش کیا جا چکا ہے اس کو واقعات سیرت پر منطبق کرنا ضروری تھا، اس

---

[1] ابن سعد ۲ / ۴۸ [2] دیار بکری ۲ / ۵

[3] ابن ہشام ذکر غزوۂ بنو لحیان [4] طبری، ذکر غزوۂ بنو لحیان

[5] مخطوطہ رام پور ۱۸۸۸ء

ستے میں کچھ کم منتشر واقعات کی تاریخوں کی آزمائش کی گئی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ گنتی کی چند تاریخوں کے علاوہ سب کی سب صحیح ثابت ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کے اسلاف کا یہ ایک ایسا بے مثال کارنامہ ہے جس پر حیرت واستعجاب بھی ہوتا ہے اور بے اختیار داد بھی نکلتی ہے، کیونکہ جس زمانے میں یہ واقعات قلمبند کئے جا رہے تھے، دنیا اس درجہ تاریخی شعور سے خالی تھی کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات تک کو مؤقت کیا جائے۔

پھر تقریباً پونے چودہ سو سال سے یہ تاریخیں علیٰ حالہٖ چلی آ رہی ہیں، ان میں بیشتر ایسی تاریخیں ہیں جو متداولہ اصولوں پر صحیح ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ جن پر اعتراضات کئے جاتے تھے، جن کو غلط قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن علمائے اسلام کی دیانت کا تقاضہ یہ تھا کہ بلا کسی ادنیٰ کتر بیونت کے انھیں بجنسہٖ برقرار رکھا جائے چنانچہ یہ آج تک محفوظ ہیں۔

یہ سلسلہ کم سے کم دس قسطوں تک چلتا، (جو میری ہمت سے باہر تھا) اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ہر سال کا کم سے کم ایک واقعہ بجنسہٖ شائع کر دیا جائے اور باقی واقعات کا اختصار یا ان کے متعلق اشارے پیش کر دوں تاکہ قارئین کو اس نظریئے کو پرکھنے کا پورا موقع ملے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کتاب شائع ہونے سے پہلے، یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ صاف ہو جائے۔

(علوی)

گذشتہ مباحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ واقعاتِ سیرت پر وہ دستاویزی کارفرمائی بدرجہ اتم موجود ہے جس کے باعث واقعاتی توقیت اور ترتیب خاص طور پر متاثر ہوئی اور علت و معلول کے اکثر سلسلے منقطع ہو گئے جو تاریخی واقعات کی تفہیم کے لیے سب سے ضروری شے تھے، بدیں وجہ ضرورت تھی کہ ان واقعات کو ازسرِ نو مرتب کر کے پیش کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ واقعاتی توقیت کے لحاظ سے پوری سیرت دوبارہ لکھی جائے، جو میری رائے میں ایک بالکل علیحدہ موضوع اور جداگانہ بحث ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں تاریخ نویسی کے زاویئے تبدیل ہو چکے ہیں اور سب سے ضروری بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہر واقعے کی جانچ تقریباً انھیں اصولوں پر ہو جو علومِ طبیعیہ کے لیے ہم نے مقرر کئے ہیں، اور جس طرح طبیعیات و کیمیا میں اشیاء کے خواص اور ان کے عمل اور ردِ عمل سے نتائج نکالے جاتے ہیں، کم و بیش وہی طریقے تاریخی واقعات کو پیش کرتے وقت سامنے رہنا چاہئیں اور ان کے سلسلۂ علت و معلول، اور اثر و باز اثر پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر واقعہ خواہ کتنا ہی حقیر اور مختصر کیوں نہ ہو، نتیجہ ہوتا ہے، بہت لمبے سلسلۂ واقعات کا جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں اور جن کا مکمل احاطہ کسی طرح ممکن نہیں، تاہم ایک تاریخی واقعے کو سمجھنے کے لیے کم سے کم اس قدر ضروری ہے کہ حتی المقدور اس کا صحیح پس منظر اور پورا ماحول ہمارے سامنے ہو اور اس کی اصلِ علت کا پتہ چل جائے۔ خاص طور پر پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت کے لیے یہ سب سے ضروری بات ہے۔ کیونکہ آپؐ کی ذاتِ گرامی سے وہ عظیم تحریک جس کو عرفِ عام میں "اسلام" کہا جاتا ہے۔ کچھ اس طرح وابستہ اور منسلک ہے کہ بلا اس تحریک کو سمجھے خود آپ کی شخصیت گم ہو جاتی ہے اس لئے ایک سیرۃ نویس کا فرضِ اولین یہ ہو جاتا ہے کہ پہلے اس تحریک کے قدرتی عوامل اور محرکات پر غور کرے اور یہ دیکھے کہ مشیتِ ایزدی نے اس تحریک کو عرب کے ریگزار میں سے کن حالات میں اٹھایا تھا اور کم سے کم عہدِ جاہلیت کے سیاسی، اقتصادی، معاشی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی حالات کے ساتھ ساتھ اسلام کی

جسم بھومی کے جغرافیائی تقاضوں، اور عرب قوموں کی نسلی افتادِ طبیعت کا حتی المقدور جائزہ لے تاکہ اس زمانے کے ذہنی رجحانات، حیاتی کشمکش اور علمبر دارانِ اسلام کی ذاتی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکے، اور دریافت کیا جا سکے کہ اس "الٰہی تحریک" کے بالکل ابتدائی اور فطری تقاضے کیا تھے، جو اس کے آناً فاناً فروغ اور قبولِ عام کا باعث بنے۔

انسانی تاریخ چونکہ ہر واقعے کی "مادی توجیہ" چاہتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ہم پیغمبرِ اسلامؐ کے حالاتِ زندگی کو ہاتھ لگانے کے اس وقت تک مجاز نہیں جب تک ان کی مادی توجیہات ہمارے سامنے نہ ہوں اور ہم ان کی روشنی میں اس "عظیم ترین انسان" کے ایک ایک حکم اور ایک ایک عمل کو نہ پرکھ سکیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ایک علیحدہ فرصت اور کچھ نئے مقدمات کے بغیر ممکن نہیں۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ آپؐ کی ابتدائے حیات سے آخر عمر تک کے حالات محض توقیتی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) کے ساتھ اس طرح پیش کر دیئے جائیں کہ قارئین کتبِ سیرت کو پیش نظر رکھ کر خود تاریخی نتائج نکال سکیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی یہ کام اس لیے بھی زیادہ مشکل بلکہ ایک طرح ناممکن ہے کیونکہ سیرت یا تاریخ کی کتابوں میں ہجرت سے پہلے کے واقعات کی کوئی واضح توقیت نہیں ملتی۔ عہدِ ماقبل نبوت ایک طرف بعثت کے بعد کے حالات کی تاریخیں بھی محفوظ نہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ آپؐ کے مشن کا مکی حصہ جو بعض حیثیتوں سے انتہائی اہم ہے، توقیتی اعتبار سے بالکل تشنہ اور غیر واضح نظر آتا ہے، حالانکہ یہ حصہ وہی ہے جس کا ایک ایک لمحہ، نظریاتی جنگ، ذہنی کش مکش اور فکری جدل کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریک کی تدریجی گر مضبوط نشو و نما میں صرف ہوا تھا، چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے پہلی بار کس تاریخ کو تبلیغ شروع کی تھی؟ ابوبکرؓ اور دوسرے رفقا، کب اسلام لائے؟ بلالؓ اور ان جیسے اور غلاموں کو خرید کر آزاد کرا دینے کی کیا تاریخ تھی؟ جس سے عملاً پسماندہ اور غریب طبقے کی ہمت افزائی ہوئی، اسی طرح ہم نہیں جانتے کہ مہاجرینِ حبشہ نے جب ہجرت کی تو وہ کونسا مہینہ تھا یا اسلامی تحریک کے خلاف عمومی بائیکاٹ کا ریزولیوشن کس تاریخ منظور یا ضبطِ تحریر میں آیا تھا؟ وعلیٰ ہذا القیاس تقریباً تمام دوسرے واقعات اسی طرح تشنۂ توقیت ہیں۔

مکی عہد کا یہ توقیتی فقدان نقادانِ تاریخ کے لیے ایک نیا زاویۂ نکر پیش کرتا ہے، کیونکہ قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس فقدان کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ تاریخِ اسلام میں جب کہ مدنی عہد کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات بھی مؤقت کیے گئے ہیں۔ مکی دور کے کسی بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم واقعے کی تاریخ نہیں ملتی؟ یہ سوال حقیقتہً بہت زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ خاص طور پر تاریخِ اسلام کے وہ ایسے "انتہا پسند" علما کے لیے جو کلیتہً اسلامی روایات کے تحریری ریکارڈوں کے قائل نہیں۔

ان میں سے پہلا گروہ ایسے نقادانِ تاریخ کا ہے جن کو شبہ ہے کہ یہ جملہ ریکارڈ زمانۂ مابعد کی جعلسازی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ ایسے خوش فہم علمائے اسلام کا ہے جن کے خیال میں اس قسم کی تمام تر توقیتی روایات محض عربوں کے غیر معمولی حافظے کا نتیجہ تھیں، اور جن کو مدونینِ سیرت نے سوا سو ڈیڑھ سو سال بعد پہلی بار ریکارڈ کرنا شروع کیا تھا۔

مندرجۂ بالا فقدان دونوں کمیوں کو بیک وقت دعوتِ فکر دیتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ :

(ا) اگر یہ توقیتی صراحتیں فی الحقیقت مورخینِ اسلام کی جعلسازی تھیں تو کیا وجہ ہے کہ یہی جعلسازی مکی عہد کے واقعات میں نظر نہیں آتی ؛ سامنے کی بات ہے کہ جو لوگ مدنی عہد کے متعلق اس فعل کے مرتکب ہو سکتے تھے وہ مکی دور کو کس طرح تشنہ چھوڑ دیتے ؟

(ب) اسی طرح علمائے اسلام سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ توقیتی صراحتیں محض زبانی روایات، یا صحابہ اور تابعین کے عجیب و غریب حافظے کا نتیجہ تھیں تو یہی معجزہ مکی واقعات کے ذیل میں کیوں ناکام رہا ؟ اور ان میں یہ صراحتیں کیوں موجود نہیں؟ وہی صحابی، وہی عربی حافظہ، وہی احکام اور واقعات سے لگن، مگر ان واقعات کی توقیت مفقود۔

ظاہر ہے کہ مکی عہد کا یہ توقیتی فقدان مدنی عہد میں ایک خاص "مادی" تبدیلی کا پتہ دیتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد اسلامی تنظیم میں کوئی نہ کوئی "بنیادی ترقی" ضرور ہوئی تھی ؛ — ایک ایسی ترقی جو مکی دور میں موجود نہ تھی اور صرف مدینے جا کر پیدا ہوئی۔

میری رائے میں یہ ترقی مدینے کی شہری ریاست پر اسلام کے سیاسی اقتدار کی صورت میں پہلی بار رونما ہوئی جو بہت جلد ایک باضابطہ مملکت یا باقاعدہ سلطنت میں تبدیل ہوتی چلی گئی اور جس کے کارپردازوں اور متعلقین نے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ضروریات کے لیے ان واقعات کو ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں اکثر و بیشتر صرف ایسے واقعات کی تاریخیں ملتی ہیں جن کا تعلق سیاسی مہمات سے تھا۔

سیاسی اقتدار صحیح معنی میں "تاریخ گر" ہوتا ہے، وہ نہ صرف قوموں کی تاریخ پیدا کرتا ہے بلکہ ان کی زندگی میں وہ جملہ محاسن بھی پیدا کرتا چلا جاتا ہے جن کی اس قوم کو ضرورت پڑتی ہے، خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اس اقتدار کی پشت پر ایک ترقی پسند مقصد، اور آگے بڑھانے والی تاریخ کارفرما ہوتی ہے۔

بظاہر یہی وجہ ہے کہ مدنی عہد کی تاریخ، توقیتی اعتبار سے جس درجہ مالا مال ہے، مکی عہد اسی نسبت سے تہی دامن نظر آتا ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ہم پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کے ابتدائی ترپن۵۳ سال کے حالات توقیتی تفصیلات کے ساتھ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے، بلکہ اس دور کے واقعات کا صرف تخمینی اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اس کتاب کا موضوع چونکہ پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت نہیں، بلکہ واقعاتِ سیرت میں جو بظاہر توقیتی تضادات نظر آتے ہیں، ان کا ایک حل پیش کرنا ہے، اس لیے میں نے صرف ایسے واقعات سے بحث کی ہے جن کی تاریخیں واضح طور پر متعین ہیں اور جو مکی تقویم فراموش کر دینے کی وجہ سے مشتبہ سمجھی جاتی تھیں، یہ تاریخیں واقعۂ ہجرت سے شروع ہوتی ہیں اور آخر تک مسلسل چلی جاتی ہیں اس لیے میں نے کتاب کے اس حصے کی ابتدا واقعۂ ہجرت سے ہی کی ہے۔

اس حصے میں تمام واقعات (بجز ایسے واقعات کے جو ایک دوسرے سے متعلق ہیں) علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت پیش کئے گئے ہیں مگر ان کی ایسی تمام تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں جن کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ توقیت سے نہ تھا تاہم اس قسم کی تفصیلات کو برقرار رکھا گیا ہے جن کو اڑا دینے سے واقعات کی تاریخی نوعیت ختم ہو جاتی۔

واقعات بیان کرنے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان کا معمولی تعرف مختصر الفاظ میں کرا دیا جائے اور کہیں ضرورت پیش آئی ہے تو واقعاتی تسلسل برقرار رکھنے کے لیے کسی قدر تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ حتی الوسع اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک واقعے سے دوسرے واقعہ کا جو تاریخی تعلق ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے تاکہ قارئین کو واقعاتی ترتیب کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

کتبِ سیرت میں بعض واقعات اس درجہ مختلف التوقیت نظر آتے ہیں کہ بظاہر ایک ایک دو دو سال کا فرق محسوس ہوتا ہے، اور ان کی نسبت علماء تاریخ کی آرا بھی متضاد نظر آتی ہیں، اول تو بیشتر ایسے واقعات میں خود دو تقویمی نظریہ توازن پیدا کر دیتا ہے، لیکن اگر کہیں مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو وہ بھی کر دی گئی ہے۔

تقریباً سو [۱۰۰] سوا سو [۱۲۵] چھوٹے بڑے واقعات میں سے جو سیرت کی مختلف کتابوں میں منتشر نظر آتے ہیں فی الحال کچھ کم ستر واقعات انتخاب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان پر اس "جدید نظریئے" کی آزمائش کی جا سکے، باقی واقعات کو اس لیے نہیں چھوڑا گیا ہے کہ وہ اس نظریہ کے خلاف شہادت دیتے بلکہ صرف اس لیے ترک کر دیئے گئے ہیں کہ یا تو ان پر دو تقویمی کارفرمائی کا پتہ نہیں چلا، یا یہ متعین نہیں ہو سکا کہ وہ کس تقویم کے مطابق ریکارڈ کیے گئے تھے۔

تمام واقعات سنہ وار پیش کیے جا رہے ہیں اور ہر سنہ کا ایک علیحدہ چارٹ بھی دیا جا رہا ہے جو مکی اور مدنی دونوں تقویموں پر مشتمل ہے، یہ چارٹ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ "مکی" اور "مدنی" تقویموں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کے درمیان جولین (JULIUN) کلینڈر رکھ دیا گیا ہے تاکہ ان دونوں میں جو تفاوت چل رہا تھا، وہ بالکل واضح ہوتا چلا جائے۔ اور دریافت کیا جا سکے کہ کون سا "مکی" مہینہ کس "مدنی" مہینے سے مطابق ہوگا، اور یہ دونوں مہینے عیسوی اعتبار سے کس تاریخ شروع ہوئے تھے، ساتھ ہی ان مہینوں کے پہلو میں واقعات کے عنوانات بھی لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ قارئین کو ہر واقعے کی توقیتی آزمائش میں پوری سہولت رہے۔ اگر کسی واقعے کا ریکارڈ مکی اور مدنی دونوں تقویموں کے بموجب ہوا تھا، تو چارٹ کے دونوں جانب اس کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

کچھ واقعات ایسے بھی تلاش کیے گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں، جن کی تاریخیں اور دونوں تقویموں پر پوری نہیں اترتیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ان کا تناسب کیا ہے، اور کیا وجہ ہے کہ یہ غلط ثابت ہو رہی ہیں۔

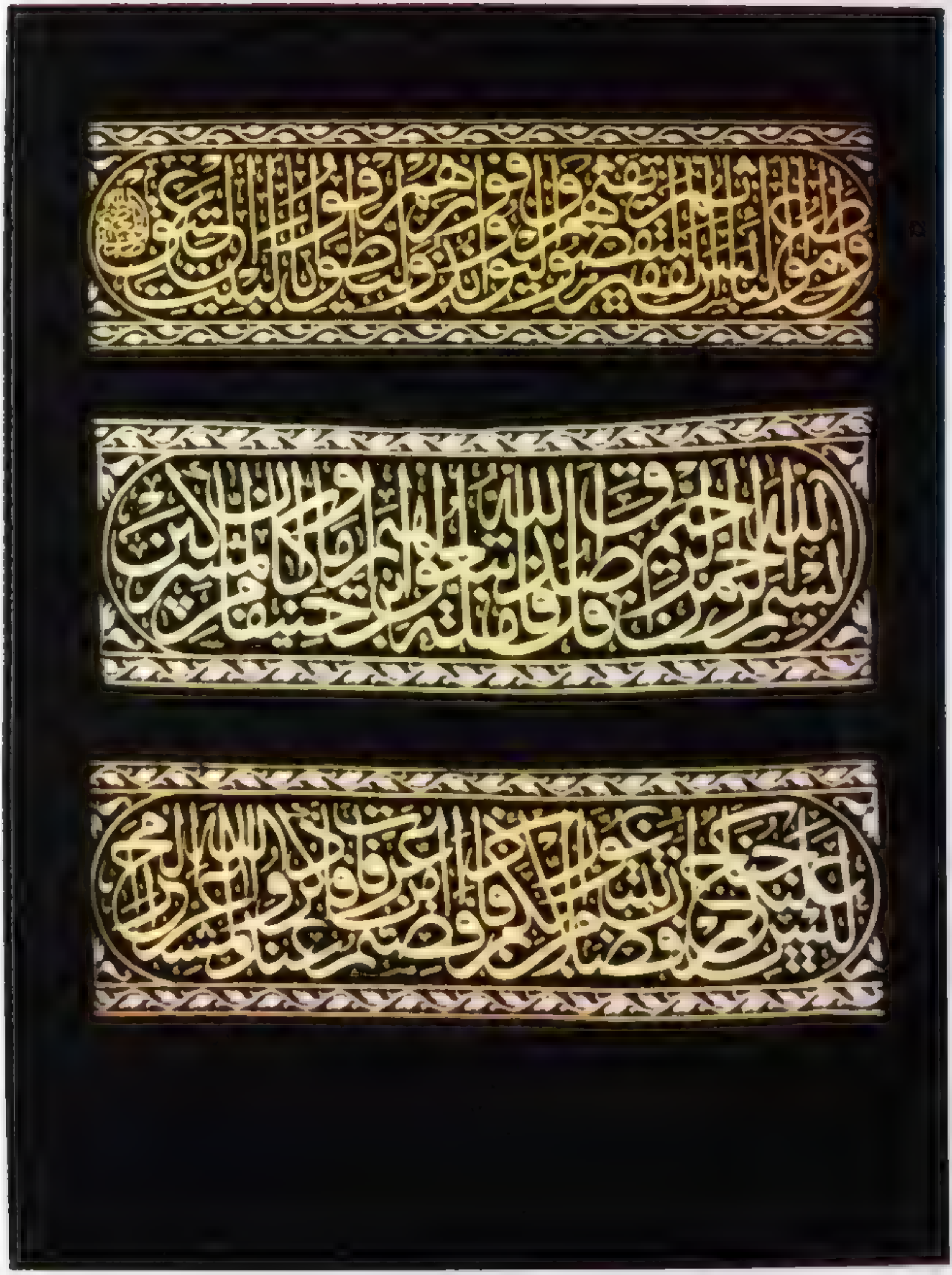
بحیثیتِ مجموعی اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ قارئین کے پیشِ نظر اس مسئلہ کے جملہ پہلو آجائیں جن سے ایک قابلِ قبول تاریخ مرتب ہو سکے۔

واقدی اور ابن سعد کے یہاں دو تین چھوٹے چھوٹے واقعات کے سنہ بظاہر غلط معلوم ہوتے ہیں، جن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے، ان واقعات کو میں نے فی الحال ترک کر دیا ہے۔

۱، ۲

نوٹ: ان جدولوں میں داہنی جانب مکی تقویم ہے، بائیں جانب موجودہ سنہ ۱، ۲ اور ہجری مہینے ہیں، درمیان میں جولین تاریخیں درج کی گئی ہیں تاکہ دریافت کیا جا سکے کہ کون سا مہینہ کس تاریخ دیوم کو شروع ہو رہا تھا۔ (مصنف)

مکّی	جولین تاریخ ایّام (وسٹنفیلڈ)	مدنی ہجری	
محرّم	۱۳ ستمبر سنہ ۶۲۲ دوشنبہ	ربیع الاوّل	
صفر	۱۳ اکتوبر چہارشنبہ	ربیع الآخر	
ربیع الاوّل	۱۱ نومبر پنجشنبہ	جمادی الاولیٰ	۱۲ ربیع الاوّل دوشنبہ ہجرت
ربیع الآخر	۱۱ دسمبر شنبہ	جمادی الاُخریٰ	
جمادی الاولیٰ	۹ جنوری سنہ ۶۲۳ یکشنبہ	رجب	
جمادی الاُخریٰ	۸ فروری سہ شنبہ	شعبان	
رجب	۹ مارچ چہارشنبہ	رمضان	
شعبان	۸ اپریل جمعہ	شوّال	
رمضان	۷ مئی شنبہ	ذلقیعدہ	
شوّال	۶ جون دوشنبہ	ذوالحجّہ	
ذیقعدہ	۵ جولائی سہ شنبہ	محرم سنہ ۲	
ذوالحجّہ	۴ اگست پنجشنبہ	صفر	
ذوالحجّہ نسی	۲ ستمبر جمعہ	ربیع الاوّل	



غلاف کعبہ پر چند آیات قرآنی

ہجرت

ربیع الاوّل سنہ ۱

یہ واقعہ (غالباً) پنجشنبہ یکم ربیع الاول سنہ ۱ کا ہے۔ کہ سرداران قریش نے مکے کے "دارالندوۃ"(SENATE HOUSE) میں تمام شرفاء شہر کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ اسلام اور داعئ اسلام کے متعلق آخری اور قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔

اس اجلاس میں تقریباً ہر خاندان کے رئیس مثلاً ابو سفیان، ابوجہل، نضر بن حارث، اُمیہ بن خلف وغیرہ شریک تھے بحث کا موضوع یہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھ کر کیا تدبیریں اختیار کی جائیں، جن سے یہ نیا فتنہ (فتنۂ اسلام) دب سکے؟

کچھ لوگوں نے یہ رائے پیش کی کہ داعئ اسلام کو پا بہ زنجیر کر کے حبسِ دوام کی سزا دی جائے۔[۱] اس کے مقابلہ میں دوسری رائے یہ تھی کہ محض جلاوطنی کافی ہے، ایک تیسری رائے یہ تھی کہ آنحضرتؐ کو قتل کر دیا جائے[۲] اس کا پیش کرنے والا ابوجہل تھا، جو قریش میں بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا، اہلِ مجلس نے اسی رائے سے اتفاق کر لیا۔

قبائلی زندگی میں ایک انسان کی جان، خود اس کی نہیں، بلکہ اس کے قبیلے کی مقدس امانت سمجھی جاتی تھی، خطرہ یہ تھا کہ اس صورت میں نہ صرف بنوہاشم، بلکہ تمام بنو عبد مناف، ایک ہو جائیں گے، اور مکہ خانہ جنگی کا مرکز بن جائے گا، آخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد اس پر اتفاق ہو گیا کہ ہر خاندان سے ایک ایک فرد چن لیا جائے اور ان منتخب اشخاص کی پوری جمعیت قتل کی ذمہ دار ہو۔[۳]

پیغمبرِ اسلامؐ کو دارالندوہ کے اجلاس کی نیت اور ارادے کا علم ہوا[۴]، تو آپؐ نے دوپہر ہی سے اقامت گاہ خالی کر دی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:۔

"ہم دوپہر کو ابوبکرؓ کے گھر بیٹھے تھے کہ کسی نے اُن سے کہا کہ رسول اللہؐ چہرے پر مقنع ڈالے تشریف لا رہے ہیں، حالانکہ معمولاً آپؐ اس وقت کبھی تشریف نہ لاتے تھے۔"[۵]

آپؐ نے آتے ہی حضرت ابوبکرؓ سے تخلیے میں بات چیت کی، اور ہجرت کا ارادہ ظاہر فرمایا، تو وہ فوراً رفاقت کے لیے تیار ہو گئے۔[۶]

ابن اسحٰق کے بیان کے بموجب آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ دونوں اسی وقت عقبی دروازے سے نکل گئے۔ (فخرجا من خوخة لابی بکر فی ظھر بیتہ) اور غارِ ثور میں پناہ لی، جو مکے سے جنوب میں ہے۔[۷]

---

[۱] ۲/۱۲۴، ابن سعد ۱/۱۵۳ [۲] ابن ہشام ۲/۱۲۵، ابن سعد ۱/۱۵۳، طبری ۲/۲۴۳ [۳] ابن سعد ۱/۱۵۳، ابن ہشام ۲/۱۲۶، طبری ۲/۲۴۵ [۴] ابن سعد ۱/۱۵۴، ابن ہشام ۲/۱۲۹ [۵] بخاری/باب ہجرۃ النبیؐ [۶] نیز دیکھیے یہی روایت ابن ہشام ۲/۱۲۹ [۷] ابن ہشام ۲/۱۳۰، مقدسی ۴/۱۷۱، طبری ۲/۲۴۷ [۸] MARGOLIOUTH RISE P. 208

ادھر قریش نے رات میں مکان کا محاصرہ کر لیا، اور آپ کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے اندر جھانک کر دیکھا تو بستر خالی نہ تھا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ آنحضرت کی جگہ حضرت علیؓ بستر پر سوتے رہے تھے[1] یہاں سے یہ لوگ دوڑے ہوئے ابوبکرؓ کے گھر گئے، وہ بھی نہ ملے تو یقین ہو گیا کہ دونوں ہجرت کر گئے، چونکہ ابھی وقت کم گذرا تھا اور گمان تھا کہ دونوں مکے کے قرب و جوار میں گرفتار کیے جا سکیں گے، اس لیے فوراً سو اونٹوں کے انعام کا اشتہار جاری ہوا[2]، اور لوگ تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

پیغمبر اسلامؐ اور ابوبکرؓ تین شبانہ روز "غارِ ثور" میں رہے[3]۔ ہر روز عبداللہ بن ابی بکر آتے اور اہلِ مکہ کی خبریں پہنچاتے، حتیٰ کہ ابوبکرؓ کے گھر سے کھانا بھی آتا، غارِ ثور میں اس سہ روزہ قیام کی بظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔

اولاً یہ کہ رات کی تاریکی کچھ کم ہو جائے تاکہ چاندنی میں سفر آسان اور زیادہ سے زیادہ فاصلے تک ہو سکے، دوم یہ کہ قریش کے امکانی تعاقب کا خطرہ باقی نہ رہے۔

ارباب سیرت لکھتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ دوشنبے کی رات میں عازم مدینہ ہوئے تھے۔

طبری کا بیان ہے:-

"آنحضرتؐ کا خروج، دوشنبے کا واقعہ ہے اور مدینے میں ورود دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کا واقعہ ہے[4]"

اس حساب سے پہلا دوشنبہ ۵ ربیع الاول کو پڑتا ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے صراحت کی ہے:-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خروج، دوشنبے کی رات میں ربیع الاول کی چار راتیں گزار کر ہوا[5]"

تمام متقدمین کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ ۱۲ ربیع الاول سنہ کو دوشنبے کے دن وارد قبا ہوتے تھے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے:-

"رسول اللہؐ مدینے میں ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبے کے روز تشریف لائے جبکہ دوپہر ہو چکا تھا، اور سورج سمت الراس پر تھا[6]"

واقدی فرماتے ہیں:-

"رسول اللہؐ دوشنبے کے دن ۱۲ ربیع الاول کو مدینے پہنچے[7]"

ابن سعد کے نزدیک یہ تاریخ مجمع علیہ ہے:-

"اور آنحضرتؐ نے جب مکے سے ہجرت فرمائی تو آپؐ دوشنبے کے دن ۱۲ ربیع الاول کو مدینے پہنچے اور یہ تاریخ مجتمع علیہ ہے[8]"

---

[1] ابن سعد ۱/ ۱۵۳، ۱۵۴، [2] ابن ہشام ۲ / ۱۲۶ [3] ابن ہشام ۲ / ۱۳۰، ابن سعد ۱/ ۱۶۰ -
[4] طبری ۲ / ۲۵۴، ابن ہشام ۲/ ، [5] ابن سعد ۲/ ۲ نیز دیکھئے ابن سعد ۱/ ۱۵۷، [6] ابن ہشام ۲/ ،
[7] واقدی ۲/ [8] ابن سعد ۲/ ۲ ؛

چنانچہ مسعودی[۱]، مقدسی[۲]، طبری[۳] وغیرہ تمام بڑے بڑے مصنفین نے اسی کو اختیار کیا ہے، حتیٰ کہ اکثر مستشرقین اور علمائے یورپ[۴] بھی اس سے انکار نہ کر سکے، شیعہ اکابر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں[۵]۔

البتہ البیرونی اور اس کے بعد چند نئے مصنفینِ سیرت مثلاً مارگولیتھ MARGOLIOUTH[۶] ایچ، جی ویلز H. G. WELLS مولانا شبلی[۷] وغیرہ کے نزدیک یہ تاریخ ۸ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ عام قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ کو دوشنبہ ممکن نہیں، خالص قمری تقویم کی جدولوں کے مطابق دوشنبے کا دن صرف ۸ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے، اس لیے آج کل یہی تاریخ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔

مگر میرے نظریۂ تقویم کے بموجب ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ کو دوشنبہ ہی کا دن تھا، کیونکہ اس سال مکی ماہ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ پنجشنبہ ۱۱ نومبر ۶۲۲ء کے مطابق تھی، جس کے حساب سے ۱۲ ربیع الاوّل کو دوشنبے کا دن اور جولین GULIAN تاریخ ۲۲ نومبر ۶۲۲ء ہونا چاہیے جو روایات کے عین مطابق ہے۔

یہاں مجھے پرسیوال PERCVAL کے نظریہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے، جس کو پیشِ نظر رکھ کر سر ولیم میور نے اپنی گراں قدر کتاب لکھی ہے، کیونکہ اس نظریہ کے بموجب بھی ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ کو دوشنبہ کا دن پڑتا ہے اور دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ نظریہ صحیح ہے، لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس نظریہ سے واقعاتِ سیرت کے موسم بالکل الٹے ہو جاتے ہیں، اسی واقعہ کو دیکھئے کہ یہ میور کے نزدیک ۲۸ جون ۶۲۲ء کا ہے[۹]۔ یعنی انتہائی موسمِ گرما کا، لیکن تمام کتبِ سیرت میں یہ روایت ملتی ہے کہ ہجرت کی شب حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے بستر پر خود آنحضرتؐ کی اونی چادر (بُرد) اوڑھ کر سوئے تھے[۱۰]۔ اس روایت کو میور نے بھی پوری آب و تاب سے بیان کیا ہے، حالانکہ ماہ جون میں مکّہ کا موسم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص معمولاً اونی کپڑے یا چادر اوڑھ کر سو سکے، روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ مدینے میں داخل ہوئے تو فصلِ خریف سمیٹی جا رہی تھی، گو میری دانست میں موسم آخری ہو چلا[۱۱] تھا۔

---

[۱] التنبیہ والاشراف / ۲۳۳ [۲] البدء والتاریخ ۴ / ۱۷۷ [۳] طبری ۲ / ۲۵۴

[۴] MENTO GOMN P - MUIR LIFE TOV, ANDRAIS - THE MAN AND HIS FAITH P. 5 - MOHAMED THE PROPHET OF ALLAH P. 61

[۵] کلینی الاباب التاریخ، [۶] MARGOLIOUTU RISE 471 [۷] H. G. WELLS OUT LINE P. 600

[۸] سیرت النبیؐ ۱/ ۲۷۷ [۹] IT WAS MONDAY JUNE 28 A D 622 - MUIR - LIFE 168

[۱۰] ابن ہشام ۲/ ۱۲۶، ابن سعد ۱/ ۱۵۴، طبری ۲ / ۲۴۳، ۲۴۴ [۱۱] بخاری میں ہے کہ جب رسول اللہؐ مدینے پہنچے تو عبداللہ بن سلام ایک نخلستان میں فصلِ خریف چُن رہے تھے، "وھو فی النخل لاھلہ یخترف لھم" باب ہجرۃ النبی، نیز دیکھئے ابن سعد ۱/ ۱۶۰

۱۲ ربیع الاوّل "قبا" میں آمد کی تاریخ ہے، جو حوالیٔ مدینہ میں ایک چھوٹی سی بستی تھی، یہاں انصار کے کئی خاندان آباد تھے، جن میں غالباً سب سے ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا، اس خاندان کے رئیس کلثوم بن ہدم تھے، جو مہاجرین کی پہلے سے میزبانی کر رہے تھے، آنحضرتؐ بھی یہیں مقیم ہوئے۔[1]

"قبا" میں اگرچہ آپؐ کی اقامت تقریباً دو ہفتے (چودہ راتیں "اربع عشر لیلة"[2]) رہی، جیساکہ انس بن مالک کی روایت سے ثابت ہے، (یعنی تقریباً ۲۵، ۲۶ ربیع الاوّل تک) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں آپ شہر آتے جاتے رہے، چنانچہ ۱۶ ربیع الاوّل کو جمعہ کے دن آپؐ نے خاص مدینے میں نماز ادا فرمائی[3] اور پہلا خطبہ بنو سالم کے محلے میں دیا۔

مدینے میں جب تعمیرِ مسجد کا انتظام شروع ہوا، تو آنحضرتؐ ابوایوبؓ کے مکان میں منتقل ہوگئے۔ جہاں تقریباً سات مہینے قیام فرمایا۔

ذیل میں ان واقعات کی تاریخوں پر دوبارہ نظر ڈالئے!

۱ - غارِ ثور کو روانگی	جمعہ ۲ ربیع الاوّل	مطابق ۱۲ نومبر ۶۲۲ء
۲ - غار میں سہ روزہ قیام	جمعہ تا دوشنبہ ۲ تا ۵ ربیع	″ ۱۲ تا ۱۵ نومبر ۶۲۲ء
۳ - قبا میں آمد	دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل	″ ۲۲ نومبر ۶۲۲ء
۴ - مدینہ میں نمازِ جمعہ	جمعہ ۱۶ ربیع الاوّل	″ ۲۶ نومبر ۶۲۲ء
۵ - مدینہ میں مستقل قیام	یکشنبہ یا دوشنبہ ۲۵، ۲۶ ربیع	″ ۵ دسمبر ۶۲۲ء

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ چودہ دن کے بعد جمعہ کو آپؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے"[4] لیکن صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قبا میں آنحضرتؐ کا ورود دوشنبے کو ہوا تھا، تو چودہ دن کے بعد پندرھویں دن پھر دوشنبہ ہی ہوگا، نہ کہ جمعہ، علاوہ ازیں مولانا نے یعقوبی سے ایک زائچہ بھی نقل کیا ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں، اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ ورودِ قبا کی صحیح تاریخ ۲۰ ستمبر ہے جس کو مولانا نے اختیار کیا ہے، تو بھی یہ زائچہ ٹھیک نہیں بیٹھتا، کیونکہ ۲۰ ستمبر کو سورج برجِ میزان کے قریب ہوتا ہے، نہ کہ برجِ سرطان میں، جیساکہ اس زائچہ میں دکھایا گیا ہے۔

سنہ ۲، ۳

اصل کتاب میں اگرچہ اس سنہ کے مندرجہ ذیل واقعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے مگر یہاں میں صرف غزوۂ ذات العشیرہ اور الواء کی تفصیلات پر غور کیا جائے گا۔ باقی واقعات کی توقیت صرف مجملاً پیش کی جارہی ہے۔

۱ - صومِ عاشورا بیان کیا جاچکا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے مدینے پہنچ کر عاشورے کے روزے کا حکم دیا تھا، یہ واقعہ بالبداہت ۲ سنہ کا ہے سنہ ۱ کا نہیں، کیونکہ آپؐ نے ربیع الاوّل سنہ ۱ میں ہجرت فرمائی تھی اور آپؐ کی ہجرت

---

[1] ابن ہشام ۲/ [2] طبری ۲/ [3] بخاری میں انس بن مالک سے روایت ہے۔ [4] ابن ہشام ۲/
[5] سیرت النبیؐ ۱/ ۲۷۷؛

کے بعد پہلا یوم عاشورا محرم ۲ھ میں آیا تھا پوری تفصیلات کے لیے دیکھئے برہان / جولائی ۱۹۶۲ء)

۲-۳- غزوۂ ذات العشیرہ غزوۂ ابوا

دیکھئے صفحہ نمبر ۱۱۰ مقالۂ ہذا۔

۴- غزوۂ طلب کرز بن جابر فہری

ابن اسحٰق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۲ھ کا تھا چنانچہ ابن حبیب نے اس کی تاریخ ۱۲ جمادی الاخریٰ ۲ھ ہی بیان کی ہے، بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد کے نزدیک یہ واقعہ ربیع الاول ۲ھ کا ہے، دو تقویمی جدول کی رو سے یہ دونوں مہینے متبادل ہیں؛ اس لیے ان روایات میں تضاد نہیں رہتا، ابن حبیب نے اس کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ۱۲ جمادی کو دوشنبہ تھا جو اگرچہ حسابی رو سے ۱۳ کو پڑتا ہے، مگر یہ ایک دن کا فرق، قابلِ لحاظ نہیں۔

۵- غزوۂ بواط

اس غزوہ پر جانے کی تاریخ ابن حبیب کے موجودہ نسخے میں ۳ ربیع الآخر یوم دوشنبہ نظر آتی ہے مگر ساتھ ہی تاریخ مراجعت دوشنبہ ۲۰ ربیع الآخر بیان کی گئی ہے۔ یہ دونوں تاریخیں آپس میں مطابقت نہیں کرتیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ روانگی بجائے ۳ کے ۱۳ تھی کیونکہ ۲۰ کو جب دوشنبہ ہوگا تو اس سے پہلے صرف ۶ اور ۱۳ کو دوشنبہ ممکن ہے۔ (دیکھئے برہان ستمبر ۱۹۶۲ء) اس تاریخ میں بھی صرف ایک دن کا فرق محسوس ہوتا اور مکی تقویم کے بموجب ۱۲ کو دوشنبہ پڑتا ہے۔

۶- تحویلِ قبلہ

امام زہری نے اس واقعے کی تاریخ جمادیٰ بیان کی ہے مگر عام روایات میں شعبان ملتی ہے۔ اس واقعے پر بھی دو تقویمی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے چنانچہ ۲ھ میں مکی جمادیٰ مدنی شعبان کا متبادل مہینہ تھا۔

۷- سریۂ عبداللہ بن جحش

یہ واقعہ مکی رجب کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ روایات سے ثابت ہے کہ قریش کے نزدیک یہ حرام مہینہ تھا، جس کی خلاف ورزی پر انھوں نے سخت احتجاج کیا تھا۔

۸- غزوۂ ینبع

ابن حبیب نے اس کی تاریخ پنجشنبہ ۲ شعبان ۲ھ بیان کی ہے، جو بالکل صحیح ثابت ہوئی ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ ہوا تھا۔ (مقابلہ کیجئے برہان مئی / ۲۸۶)

۹- بنو غفار اور اسلم سے معاہدات

ابن حبیب نے بیان کیا ہے کہ ان معاہدات کے لیے پیغمبرِ اسلام سہ شنبہ ۱۴ شعبان کو عازم سفر ہوئے تھے، مکی تقویم کے بموجب ۱۴ شعبان ۲ھ کو سہ شنبہ ہی پڑتا ہے، اور یہ ریکارڈ یقیناً مکی ہے۔ (مقابلہ کیجئے برہان مئی / ۲۸۶)

۱۰- غزوۂ بدر

اس غزوے کی مشہور تاریخ اگرچہ جمعہ ۱۷ رمضان ہے مگر سیرت کی سب سے بڑی سند عروہ بن زبیر نے اس کی تاریخ ۱۶ رمضان بھی بیان کی ہے (دُرِّ منثور ۳ / ۱۸) حسابی قاعدے سے رمضان کی پہلی اگرچہ جمعہ کو تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رواۃ کے نزدیک جمعرات کی پہلی تسلیم کی گئی تھی، جس کے اعتبار سے ۱۶ رمضان کو ہی جمعہ پڑتا ہے، روایات سے اس غزوے کا موسم گرم ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ مکی تقویم کے بموجب رمضان ۲ھ جون ۶۲۴ء سے مطابق تھا، اس لیے یہ ریکارڈ بھی مکی معلوم ہوتا ہے۔ (مقابلہ کیجئے برہان مئی / ۲۶۹)

۱۱۔ غزوۂ بنو سُلیم ابن اسحٰق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کا تعلق شوال ۲ سنہ سے تھا، مگر واقدی نے اس کی تاریخ محرم ۳ سنہ بیان کی ہے، دو تقویمی نظریہ سے یہ تضاد کلیۃً دُور ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ قتلِ ابو عفک اس واقعے کی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ شدید موسم گرما کا تھا، مکی جدول تقویم کی رُو سے شوال ۲ سنہ جون سے مطابق ہے، اس لیے یہ مکی ریکارڈ معلوم ہوتا ہے۔ (مقابلہ کیجیے برہان مئی ۲/۴۷)

۱۳۔ سریہ غالب بن عبداللہ اس واقعے کی تاریخ پر غزوۂ بنو سُلیم کے ساتھ اصل کتاب میں پوری بحث کی گئی ہے۔

۱۴۔ غزوۂ بنو قینقاع اس غزوے کی تاریخ واقدی نے ہفتہ نصف شوال بیان کی ہے، مکی تقویم کے موجب ۱۴ یا ۱۵ شوال کو ہفتے ہی کا دن پڑتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مکی ریکارڈ تھا، ابن حبیب نے اس کی تاریخ یکشنبہ، صفر ۳ سنہ بیان کی ہے جو غالباً یہودیوں کی جلاوطنی کی تاریخ ہے، یہ تاریخ مَدنی معلوم ہوتی ہے، اس واقعے پر بھی دو تقویمی کارفرمائی کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

۱۵۔ نکاح حضرت فاطمہ رضؓ طبری نے اس کی تاریخ آخر صفر بیان کی ہے جو غالباً مدنی روایت ہے۔ علمائے شیعہ یکم ذوالحجہ پر متفق ہیں جو مکی ریکارڈ معلوم ہوتا ہے[1]۔ جدولِ تطبیق کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداً ذوالحجہ مکی، آخر صفر مدنی سے متصل تھی۔

۱۶۔ غزوۂ سویق اس واقعہ کا مہینہ ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان متفق علیہ ہے، مگر واقدی نے اس کی تاریخ یکشنبہ ۵ ر ذوالحجہ بیان کی ہے، جو مکی حساب پر قطعاً درست اُترتی ہے۔

۱۷۔ قتلِ کعب بن اشرف اس کا ریکارڈ مدنی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مکی ربیع الاول ۳ سنہ موسم سرما میں آیا تھا۔

۱۸۔ غزوۂ ذوامر اس واقعے کی توقیت پر بھی دو تقویمی کارفرمائی کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ ابن اسحٰق کی صراحت سے اس کی تاریخ آخر ذوالحجہ ۲ سنہ ثابت ہوتی ہے جب کہ واقدی کے نزدیک یہ ربیع الاول ۳ سنہ کا واقعہ تھا، جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۲ سنہ میں ذوالحجہ اور ربیع الاول متبادل مہینے تھے۔

---

[1] روایت شیعہ کی تائید ہو جاتی ہے اور روایات کا اختلاف بھی اس سے دُور ہو سکتا ہے۔

سنہ ۲، ۳

	مکی[1]	جولین	مدنی ہجری	
۱۰ محرم سنہ ۲ یوم عاشورا	محرم	۲ اکتوبر سنہ ۶۲۳ یکشنبہ	ربیع ۲	
غزوۂ ابوا پہلا غزوہ بروایت ابن اسحٰق و واقدی وغیرہ	صفر	۳۱ اکتوبر دوشنبہ	جمادی ۱	غزوۂ ذات العشیرہ پہلا غزوہ بروایت بخاری (زید بن ارقم)
غزوۂ طلب کرز بن جابر فہری بروایت واقدی و ابن سعد	ربیع ۱	۳۰ نومبر چہارشنبہ	جمادی ۲	غزوۂ طلب کرز بن جابر فہری، بروایت ابن اسحٰق، بروایت ابن حبیب ۱۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۲
غزوۂ بواط - واپسی دوشنبہ ۲۰ ربیع الآخر، ابن حبیب	ربیع ۲	۲۹ دسمبر پنجشنبہ	رجب	×
تحویل قبلہ بروایت زہری	جمادی ۱	۲۸ جنوری سنہ ۶۲۴ء شنبہ	شعبان	تحویل قبلہ۔ (عام روایت)
×	جمادی ۲	۲۶ فروری یکشنبہ	رمضان	
سریۂ عبداللہ بن جحش	رجب	۲۷ مارچ سہ شنبہ	شوال	
غزوہ ینبع پنجشنبہ ۲ شعبان سنہ ۲ (ابن حبیب) بنو غفار اور اسلم سے معاہدہ سہ شنبہ ۱۴ شعبان سنہ ۲	شعبان	۲۵ اپریل چہارشنبہ	ذلقعدہ	
غزوۂ بدر جمعہ ۱۶ رمضان سنہ ۲ بروایت عامر بن ربیعہ و عروہ بن زبیر	رمضان	۲۵ مئی جمعہ	ذوالحجہ	
۱۔ غزوۂ بنو سلیم، بروایت ابن اسحٰق ۲۔ قتل ابو عفک، بروایت واقدی ۳۔ سریۂ غالب بن عبداللہ بروایت ابن حبیب ۴۔ غزوۂ بنو قینقاع (بروایت واقدی) ۱۴ شوال ہفتہ	شوال	۲۴ جون یکشنبہ	محرم سنہ ۳	۱ غزوۂ بنو سلیم، بروایت واقدی و ابن سعد
×	ذلقعدہ	۲۴ جولائی سہ شنبہ	صفر	۱۔ غزوۂ بنو قینقاع بروایت ابن حبیب یکشنبہ ۷ صفر ۲۔ نکاح حضرت فاطمہ بروایت طبری
۱۔ نکاح حضرت فاطمہ ۲۔ غزوۂ سویق یکشنبہ ۵ ذی الحجہ (ابن اسحٰق و واقدی) ۳۔ غزوۂ ذو امر بروایت ابن اسحٰق	ذوالحجہ	۲۲ اگست چہارشنبہ	ربیع ۱	۱۔ قتل کعب بن اشرف ۱۴ ربیع الاول بروایت واقدی، ۲۔ غزوۂ ذو امر بروایت واقدی

[1] مصنف نے گزشتہ اوراق میں لکھا ہے کہ یہودیوں کو روزہ دار دیکھ کر محرم کے روزے کا خیال آیا۔ ورنہ قریش بھی محرم کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس سے خود یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ مدینہ آکر نئے کیلنڈر سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ ابتداً رمضان غالباً مکی کیلنڈر ہی سے ہوتا رہا تھا، اور ہمیشہ موسم گرما میں آتا تھا۔ (نثار)

نوٹ :۔ ۶ رجون ۶۲۴ء کو چہار شنبے کے دن چاند گرہن ہوا تھا، یعنی سہ شنبے کی چودس اور چہار شنبے کی پورن ماشی تھی۔

غزوۂ ذات العُشَیرہ

غزوۂ ابوا ، ودّان

جمادی الاولیٰ ، صفر سنہ ۲ مطابق اکتوبر سنہ ۶۲۳ء

تقریباً تمام اہلِ سیر کا اتفاق ہے کہ سب سے پہلی مہم جس میں پیغمبرِ اسلامؐ بنفسِ نفیس شریک تھے، غزوۂ ابوا ہے[1] جس کو "غزوۂ ودان" بھی کہتے ہیں۔ متقدمین میں ابن اسحٰق، واقدی، ابن ہشام، ابن سعد، ابن حبیب اور طبری وغیرہ نے اور اس کے بعد جملہ متاخرین نے سلسلۂ غزوات کی ابتدا اسی غزوے سے کی ہے۔

اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ غزوۂ ابوا صفر سنہ ۲ کا واقعہ ہے[2] بلکہ شرح مواہب میں تو یہاں تک ہے کہ اسی صفر میں خدا نے جہاد کی اجازت دی تھی۔[3]

علمائے سیرت کے اس متفقہ خیال کا مقابلہ بخاری کی کتاب "المغازی" سے کیا جائے تو ایک تناقض نظر آتا ہے، اس لیے کہ امام بخاریؒ نے سلسلۂ غزوات کی ابتدا غزوۂ عشیرہ سے کی ہے اور دلیل میں زید بن ارقمؓ کی یہ روایت پیش کی ہے :۔

"زید بن ارقم سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے کتنی لڑائیاں لڑیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ انیس[1]، ان سے پوچھا گیا کہ تم کتنی لڑائیوں میں شریک تھے؟ فرمایا سترہ[1] میں، پھر ان سے کہا گیا کہ سب سے پہلا غزوہ کون سا ہے؟ تو فرمایا "عُسیرہ یا عُشیرہ"[4،5]

اگر یہ صحیح ہے کہ رسول اللہؐ کو "صفر" ہی میں جہاد کی اجازت دی گئی تھی، اور اسی مہینے آپؐ قریش کے کاروانی شاہراہ کی ناکہ بندی اور پڑوسی قبائل سے خیر سگالی کے معاہدے کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے (جو مدینے کی معاشی ضروریات کے لیے بے حد ضروری تھے) تو غزوۂ ذات العشیرہ اسی صفر سنہ ۲ میں ہونا چاہیے، اس لیے کہ حضرت زید کی شہادت ایسے شخص کی شہادت ہے جو منجملہ ۱۹ کے، انھیں میں رسول اللہؐ کے رفیقِ کار اور ساتھی رہ چکے تھے۔

اس کے مقابلے میں ابن اسحٰق اور واقدی وغیرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ (یعنی غزوۂ عُشیرہ) صفر سنہ ۲ کا نہیں، بلکہ جمادی الاولیٰ سنہ ۲ کا ہے[6] اس طرح عام طور پر یہ مہم غزوۂ "ابواء" سے دو ڈھائی مہینے بعد کی تسلیم کی جاتی ہے۔

---

[1] دیکھیے ابن ہشام ۲/۲۴۱، واقدی ۲/۷ - ابن سعد ۲/۳ - طبری ۲/۲۶۱ - مقدسی ۴/۱۸۲ - مسعودی التنبیہ/۲۳۵ [2] واقدی/۲ - ابن سعد ۲/۳، ابن ہشام ۲/۲۴۰ - قسطلانی/۹۸ [3] شرح مواہب ۱/۴۶۶، [4] بخاری کتاب المغازی، اس روایت کو واقدی اور طبری وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے، دیکھیے واقدی ۷/۱ - طبری واقعات سنہ ۲ [5] پیغمبرِ اسلامؐ کے غزوات کی تعداد مختلف مصنفین نے مختلف بیان کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نے بعوث اور سرایا کو بھی غزوات میں شامل کر لیا ہے۔ بعض نے ایسا نہیں کیا۔

[6] دیکھیے ابن ہشام ۲/۲۴۹، واقدی ۲/۳، ابن سعد ۲/۴، طبری ۲/۲۶۰، ابن حبیب/۱۱۱، البدایہ ۳/۳۴۶، عیون الاثار/۲۲۶

محدثین اور سیرت نگاروں کے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں روائتیں بظاہر مشکوک ہو جاتی ہیں اور کبھی ہم بخاری اور زید بن ارقم پر جرح کرنے لگتے ہیں اور کبھی سیرت نگاروں پر، لیکن واقعاتی طور پر جانچ کیجئے تو یہ صرف ایک تقویمی فریب ثابت ہوتا ہے جس میں سیرت نگار اور مورخ عرصۂ دراز سے مبتلا ہیں۔

سنہ۲ کی دو تقویمی جدولوں پر نظر ڈالئے تو مکی صفر کے مقابلے میں مدنی جمادی الاولی نظر آئے گا جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ سنہ۲ میں دونوں مہینے ایک ساتھ چل رہے تھے، مکی تقویم کے بموجب اُسی مہینے کا نام "صفر" تھا جو عام قمری اعتبار سے جمادی الاولیٰ کہلاتا تھا، اس طرح دونوں واقعے ایک ہی ماہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

سیرت نگاروں نے "غزوۂ ابوا" کو محض اس لیے مقدم قرار دیا کہ روایات کے بموجب یہ واقعہ "صفر" نام کے مہینے کا تھا، جو جمادیٰ سے پہلے آتا ہے، اس کے مقابلے میں ذات العشیرہ کو تیسرا غزوہ صرف اس لیے تسلیم کیا گیا، کہ از روئے روایات یہ "جمادی الاولیٰ" کا واقعہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ مدینے کے قرب وجوار کی بستیوں سے معاہدہ کے لیے نکلے تو آپ پہلے ذات العشیرہ پہنچے جہاں "بنوضمرہ" اور "بنو مدلج" سے گفتگو ہوئی، اور معاہدے کی شرطیں طے پائیں، لیکن "بنوضمرہ" کے اصلی مساکن "ابوا" یا "ودان" میں تھے۔ چنانچہ آپ وہاں بھی تشریف لے گئے اور غالباً "بنوضمرہ" کے ساتھ معاہدے کی آخری توثیق وہیں ہوئی۔ "بنوضمرہ" کا سردار اس زمانے میں مخشی بن عمرو تھا۔[1]

ذات العشیرہ کے ذیل میں جو معاہدہ ہوا، اس کے متعلق طبری میں منقول ہے:۔

"اور اس میں بنو مدلج اور ان کے حلفاء بنوضمرہ سے معاہدہ کیا"۔[2]

گویا ابتدائی معاہدہ بنو مدلج سے ہوا تھا، اور اس کے ذیل میں بنو مدلج کے حلیف بنوضمرہ سے بھی معاہدہ کیا گیا لیکن "غزوۂ ابوا" کے ذیل میں جو معاہدہ مذکور ہے اس میں صرف بنوضمرہ کا ذکر ہے، بنو مدلج کا نہیں۔

"سو اس ذیل میں آنحضرتؐ نے "بنوضمرہ" سے معاہدہ کیا اور جس شخص سے یہ معاہدہ کیا وہ مخشی بن عمرو تھا جو اس زمانہ میں "بنوضمرہ" کا سردار تھا۔"[3]

ابن حبیب نے بھی صرف بنوضمرہ کا ذکر کیا ہے، اور بنو مدلج کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔

"سو "بنوضمرہ" سے معاہدہ کیا اور اُن کے لیے ایک تحریر لکھی اور "ودان" اور "ابوا" تک تشریف لے گئے"۔[4]

اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ "غزوۂ عشیرہ" کے فوراً بعد آپ "ابوا" تشریف لے گئے، اس کے لیے اگر آپ "ابوا" پہلے تشریف لے جاتے اور بنوضمرہ سے معاہدے کی تکمیل ہو چکی ہوتی تو پھر غزوۂ عشیرہ میں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ جملہ اہلِ سیر کے نزدیک ان دونوں مہموں میں فوج کے علمبردار حمزہؓ بن عبد المطلب تھے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہی فوج ان دونوں مقامات پر پہنچی تھی جس کا پہلا ہدف "عشیرہ" تھا اور دوسرا "ابوا"۔[5]

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۴۱، ابن سعد ۲/۳، طبری ۲/۲۵۹ وغیرہ [2] ابن ہشام ۲/۲۴۹، ابن سعد ۲/۵۔ طبری ۲/۲۶۰، [3] ابن ہشام ۲/۲۴۱ (نیز دیکھئے، ابن سعد ۲/۳، طبری ۲/۲۵۹ وغیرہ) [4] ابن حبیب/۱۱۰ [5] طبری ۲/۲۶۱

ذات العشیرہ کا محلِ وقوع "ینبع" سے قریب ہے بلکہ سیرت نگار اس کو "بطلِ ینبع" ہی قرار دیتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ فوج "ینبع" ہوتی ہوتی "الوا" پہنچی۔

ابن اسحٰق کی روایت کے بموجب "عشیرہ" سے واپسی کی تاریخ ابتدائی جمادی الاخریٰ سنہ ۲ھ ہے۔ "تو جمادی الاولیٰ اور کچھ راتیں جمادی الاخریٰ تک قیام فرمایا، اس کے بعد مدینے تشریف لائے۔"[۱]

مگر تاریخ "عشیرہ" سے مدینے پہنچ جانے کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے کچھ ہی دن کے بعد ۱۲ر جمادی الاخریٰ کو غزوہ کرز بن جابر فہری پیش آیا تھا۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے۔

"اور آنحضرتؐ نے "غزوۂ عشیرہ" سے واپسی پر مدینے میں بہت تھوڑی راتیں قیام فرمایا تھا، جن کی تعداد دس تک پہنچتی، کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر چھاپہ مارا۔"[۲]

اور بقول ابن حبیب کرز کے حملے کی تاریخ ۱۱ر جمادی الاخریٰ[۳]۔ اس لیے آنحضرتؐ کو "عشیرہ" سے جمادی الاخریٰ کے ابتدائی ہفتے میں مدینے پہنچ جانا چاہیئے۔

ابن سعد کے بیان کے بموجب "غزوۂ ذات العشیرہ" کا مقصد ابوسفیان کے ان تجارتی کارواں پر چھاپہ مارنا تھا، جو مکے سے شام کو مالِ تجارت لیے جاتا تھا اور یہ وہی قافلہ تھا جس کی واپسی پر رمضان سنہ ۲ھ میں بدر کی مشہور لڑائی ہوئی تھی[۴]۔ مگر سیرت کی سب سے بڑی سند عروہ بن زبیر کی شہادت اس کے خلاف ہے[۵]۔ عروہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان کا قافلہ مکے سے اس وقت روانہ ہوا تھا، جب سریۂ عبداللہ بن جحش میں ابن حضرمی قتل ہو چکا تھا، اور مسلمان قریش کا قافلہ لوٹ چکے تھے۔ یہ واقعہ رجب سنہ ۲ھ کا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ عشیرہ کا تعلق ابوسفیان کے قافلے کی دیکھ بھال سے نہ تھا۔

(۵)

سنہ ۳، ۴

	مکی	جولین	مدنی	
	محرم	۳۱ر دسمبر سنہ ۶۲۴ جمعہ	ربیع ۲	
	صفر	۲۰ر اکتوبر سہ شنبہ	جمادی ۱	
۱۔ سریہ زید بن حارثہ، قردہ بدر سے چھ ماہ بعد بروایت ابن اسحٰق ۲۔ نکاحِ حضرت ام کلثوم	ربیع ۱	۱۹ر نومبر دوشنبہ	جمادی ۲	۱۔ سریہ زید بن حارثہ قردہ بروایت واقدی و ابن سعد ۲۔ نکاحِ حضرت ام کلثوم

[۱] ابن ہشام ۲/۲۴۹ [۲] ابن ہشام ۲/ ۲۵۱ [۳] ابن حبیب / ۱۱۱ [۴] ابن سعد / ۲ [۵] طبری ۲ / ۲۶۷

	مکی	جولین	مدنی	
	ربیع۲	۱۸ر دسمبر سہ شنبہ	رجب	
غزوۂ بحران	جمادی۱	۱۷ر جنوری ۶۲۵ء پنجشنبہ	شعبان	
	جمادی۲	۱۵ر فروری جمعہ	رمضان	
	رجب	۱۷ر مارچ یک شنبہ	شوال	
	شعبان	۱۵ر اپریل دوشنبہ	ذیقعدہ	
	رمضان	۱۵ر مئی چہار شنبہ	ذوالحجہ	
۲-غزوۂ احد ۱۱ر شوال ۳ھ شنبہ ۳-غزوۂ حمراء الاسد ۴-وفد عضل وقارہ	شوال	۱۳ر جون پنجشنبہ	محرم ۴ھ	۱-سریہ عبداللہ بن انیس ۲-غزوۂ احد ۳- وحمراء الاسد- (بروایت عبدالحمید بن جعفر)
۱-حادثۂ رجیع بروایت ابن اسحٰق وغیرہ	ذیقعدہ	۱۳ر جولائی شنبہ	صفر	۱-حادثۂ رجیع بروایت واقدی وابن سعد وغیرہ
	ذوالحجہ	۱۱ر اگست یکشنبہ	ربیع الاول	

سنہ ۳، ۴

اس سنہ کے مندرجہ ذیل سات واقعات پر بحث کی گئی ہے، جن میں سے غزوۂ احد اور حمراء الاسد کی پوری بحث یہاں پیش کی جارہی ہے۔ باقی واقعات کا اختصار یہ ہے:-

۱۔ سریۂ زید بن حارثہ

اس مہم کے متعلق ابن اسحٰق کی تشریح یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے چھ ماہ بعد کا ہے (یعنی ربیع الاول سنہ ۳ کا) بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد نے اس کو جمادی الاخریٰ کا واقعہ قرار دیا ہے، اس واقعے کی تاریخوں پر بھی دو تقویمی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ جدولِ تقویم میں ربیع الاول سنہ ۳ مکی، جمادی الاخریٰ مدنی کے مطابق ہے۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ موسم سرما (شتا) کا تھا۔ جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ربیع الاول سنہ ۳ نومبر دسمبر سنہ ۶۲۴ سے مطابق تھا۔

۲۔ نکاح حضرت ام کلثوم

اس واقعے کے متعلق واقدی کی روایت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے ان کا نکاح ربیع الاول سنہ ۳ میں ہوا تھا۔ مگر رخصتی جمادی الاخریٰ میں ہوئی، جس کی بظاہر کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی، گمان غالب یہ ہے کہ واقدی کو اس نکاح کی دو مختلف روایتیں پہنچی تھیں، ایک ربیع کی دوسری جمادی کی، ان دونوں میں تطبیق کی خاطر انھوں نے نکاح اور رخصتی دونوں رسموں کو علیحدہ علیحدہ مہینے میں قرار دیا۔

۳۔ غزوۂ نجران

اس غزوے کی تاریخ ربیع الاخریٰ اور جمادی سنہ ۳ بیان کی جاتی ہے جو غالباً مکی تاریخ ہے، کتاب میں اس کے مکی ہونے کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ سریۂ عبداللہ بن انیس

واقدی نے اس کی تاریخ محرم سنہ ۴ بیان کی ہے یعنی غزوۂ احد سے تقریباً ڈھائی ماہ بعد کی، لیکن دو تقویمی نقطۂ نظر سے یہ سریۂ غزوۂ احد سے چند روز پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے عبداللہ بن انیس کو اس لیے متعین کیا تھا کہ قریش کو سفیان بن خالد کی فوجی اعانت حاصل نہ ہو سکے جو وہ اس لڑائی کے لیے لینا چاہتے تھے، روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی تھی کہ سفیان، مسلمانوں کے خلاف فوج اکٹھی کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوج قریش کی اعانت کے لیے جمع کی جا رہی ہوگی، ورنہ تنہا بنو ہذیل مدینے پر حملے کی جرأت نہ کر سکتے تھے، اس سریہ کی تاریخ خود عبداللہ نے دوشنبہ ۵ محرم بیان کی ہے جو از روئے حساب صحیح ثابت ہوتی ہے۔

۵، ۶۔ غزوۂ احد اور حمراء الاسد

اس پر پوری بحث صفحہ   پر ملاحظہ ہو۔

۷۔ حادثۂ رجیع

ابن اسحٰق کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ احد سے کچھ بعد آخر شوال سنہ ۳ میں عضل و قارہ کا وفد بھیجا آیا تھا، جس کی درخواست پر آنحضرتؐ نے کچھ آدمی اس کے ساتھ روانہ کر دیئے تھے۔ جو کم سے کم ذیقعدہ سنہ ۳ میں روانہ ہوئے ہوں گے۔ واقدی نے اس کی تاریخ صفر سنہ ۴ بیان کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس واقعے کی توقیت پر دو تقویمی اثرات موجود ہیں۔ ذیقعدہ سنہ ۳ مکی، صفر سنہ ۴ سے مطابق ہے (تفصیلات کے لیے دیکھئے برہان اگست سنہ ۶۴)

معرکۂ اُحد اور غزوۂ حُمراء الاسد

شوال (مکی) سنہ ۳ = محرم (مدنی) سنہ ۴

اُوپر گزر چکا ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے قریش مکہ کی جو تجارتی ناکہ بندی کی تھی، وہ اس قدر کامیاب تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ

میں اہلِ مکہ کو شام اور دوسری شمالی بندرگاہوں کی تجارت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے، عراق سے بھی تجارت خطرے میں پڑ چکی تھی اور ایک چاندی سے لدا ہوا قافلہ زید بن حارثہ کے لشکر کا ہدف بن چکا تھا۔

اس تجارتی یا بالفاظِ دیگر اقتصادی ناکہ بندی کا اثر اہلِ مکہ پر تباہ کن ہونا چاہیے جس سے چھٹکارے کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ اسلامی تحریک کے سامنے ہتھیار ڈال دیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر مسلمانوں کے مرکز پر ایسی ضرب لگائیں جس سے اس فولادی ناکہ بندی کا جال ٹوٹ جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زید بن حارثہ کے ہاتھوں لٹنے کے چند ہی ماہ بعد قریش نے ایک مضبوط فوج فراہم کرلی جس نے شوال ۳ھ میں مدینے کا محاصرہ کرلیا۔

اربابِ سیر کہتے ہیں کہ اس ناکہ بندی کو توڑنے کے لیے قریش نے غزوۂ بدر کے بعد ہی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں[1] یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کے پیہم دباؤ نے، اُن کی شمالی تجارت کو بالکل مفلوج کر رکھا تھا، لیکن اس کا فوری سبب واقعۂ قردہ کے غم و غصے کو ہونا چاہیے جس میں تقریباً ایک لاکھ کی چاندی لُٹ چکی تھی۔

بہرحال شوال ۳ھ میں قریش کی فوجیں جن میں مکہ کے قرب و جوار کے قبائل اور خاص طور پر احابیش شامل تھے[2] مکے سے نکلیں تو اس شان و شوکت سے کہ ان کے ہمراہ لات و عُزّیٰ کی مورتیاں تھیں[3] جن کے جلو میں سوار اور پیادے دستے کوچ کر رہے تھے۔ معرکۂ اُحد سے چند روز پہلے پیغمبرِ اسلام ؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے ایک خفیہ تحریر کے ذریعہ اس لشکر کشی کی اطلاع آنحضرت ؐ کے پاس بھیج دی تھی[4] جو غالباً شروع شوال ۳ھ کو مدینے پہنچ گئی تھی، چہار شنبہ[5] کے روز (غالباً، ۸ ر تاریخ کو) قریش کی فوجیں ”وادیٔ عقیق“ میں ذو الحلیفہ کے مقام پر پہنچ چکی تھیں، جس کا فاصلہ مدینے سے صرف ۵ میل ہے، مدینے کے جنوب میں چونکہ لاوے کی کثرت ہے اس لیے قریش نے اُحد کی پہاڑی کے دامن کو میدانِ کارزار تجویز کیا، اور ان کا لشکر چکر کاٹ کر[6] شمال میں پہنچا اور وہیں خیمہ زن ہو گیا۔

ہفتے کے دن صبح[7] سے لڑائی شروع ہوئی اور شاید دوپہر تک ختم ہو گئی، جس میں مسلمانوں کا شدید نقصان ہوا اور بہت سے نامور شہید کر دیے گئے، ایک حبشی غلام نے پیغمبرِ اسلام ؐ کے چچا حضرت حمزہ ؓ پر ایسا وار کیا کہ اسلام کی یہ شمشیر بھی ٹوٹ گئی،[8] خود رسول اللہ ؐ کے چوٹیں آئیں، چہرہ مبارک پر زخم آیا اور آپ ؐ گر پڑے، اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ ابن قمیہ کے ہاتھوں[9] آپ ؐ شہید ہو گئے اور لڑائی گویا ختم ہو گئی۔

۱؎ ابن سعد ۲/۲۵، نیز دیکھیے واقدی ۱۹۸/۱۹۹، ۲؎ طبری ۳/۱۰، البدایہ ۴/۱۰، ۳؎ ایک راوی نے کارزارِ اُحد کا نقشہ کھینچتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ......: ”واقبل ابوسفیان یحمل اللات والعزیٰ“ (طبری ۳/۱۴) جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لات و عزیٰ کی مورتیاں قریش اپنے ساتھ لے گئے تھے، نیز دیکھیے البدایہ ۴/۱۰ ۴؎ واقدی ۲۰۶/ - ابن سعد ۲/۲۵ - ابن سید الناس ۲/۳

۵؎ طبری ۳/۱۴، ۶؎ ۲/۱۱ MUIR - LIFE 253 - ۷؎ طبری ۳/۱۱ ۸؎ ابن ہشام ۳/۷۲

۹؎ ابن ہشام ۳/۹۹

قریش نے تشنگان بدر کا جی بھر کے بدلہ لیا اور شہدا کی لاشوں کا مُثلہ کر ڈالا[۱] معلوم ہوتا ہے کہ فتح مندی کے نشے میں سرشار سرداران قریش اسی تادیب کو کافی سمجھتے تھے اور ان کی فوجیں واپس ہونے لگیں۔ قریش کے لشکر کا بڑا حصہ غالباً واپس ہو چکا تھا کہ سالار قریش کو آنحضرتؐ کے صحیح و سلامت ہونے کی اطلاع ملی، جس پر سالِ آئندہ پھر ایک بار قسمت آزمائی کا چیلنج دے کر یہ آخری دستہ بھی واپس ہو گیا۔[۲]

غزوۂ حمراء الاسد

دوسرے دن یکشنبے کو علی الصبح ایک مزنی شخص یہ خبر لایا کہ مقام ملل پر قریش کا لشکر رُک گیا ہے اور ابوسفیان کی خواہش ہے کہ ادھوری کامرانی کو فتح میں تبدیل کر دیا جائے۔[۳] واقدی نے اس واقعے کی پوری تفصیل بیان کی ہے اور عبدالحمید بن جعفر کی یہ روایت من و عن درج کی ہے:

"جب محرم کے مہینے میں یکشنبے کی رات آئی تو عمرو بن عوف المزنی، رسول اللہؐ کے دروازے پر حاضر ہوئے اور بلالؓ اذان دے کر دروازے پر بیٹھے آنحضرتؐ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آپؐ باہر تشریف لائے تو مزنی آنحضرتؐ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور بولے یا رسول اللہؐ میں اپنے گھر سے واپس آ رہا تھا، جب میں "ملل" پہنچا تو قریش وہاں خیمہ زن تھے، میں نے سوچا کہ میں ان میں جاؤں اور ان کی باتیں سنوں، تو میں اُن کے پاس پہنچا اور میں نے ابوسفیان اور اُن کے دوستوں کی بات چیت سُنی، وہ کہتے تھے کہ ہم نے کچھ نہ کیا، اور تم نے دشمن کی شوکت و قوت توڑ دی ہے، تو چلو واپس چل کر بقیہ کا بھی قلع قمع کر دیں اور صفوان بن اُمیہ انکار کر رہا تھا، اس پر آنحضرتؐ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کو طلب کیا اور ان سے وہ باتیں بیان کیں، جو مزنی نے کہی تھیں، ان دونوں نے کہا کہ دشمن کے تعاقب میں چلیے، ورنہ ڈر ہے کہ وہ ہمارے اہل و عیال پر آ پڑیں گے۔"

نماز کے بعد آپؐ نے سلام پھیرا تو لوگ اکٹھا ہو گئے۔ آپؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں دشمن کے تعاقب کے لیے جانے کا اعلان کر دیں۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ اتوار کے دن آپؐ نے مدینے میں صبح کی تو دشمنوں کے تعاقب کا حکم دیا۔ اس پر مسلمان باوجود زخموں کے نکل پڑے۔[۴]

مؤرخین کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ اس خبر کو پا کر قریش کے تعاقب میں مقام حمراء الاسد تک تشریف لے گئے جہاں تین روز قیام فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کو غزوۂ حمراء الاسد[۵] کا نام دیا گیا ہے۔

واقدی کی اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے راویِ اوّل کے ذہن میں معرکۂ اُحد اور غزوۂ حمراء الاسد کی تاریخ وقوع محرم کا مہینہ تھا جیسا کہ "لما کان فی المحرم" کے الفاظ سے ظاہر ہے، حالانکہ بلا استثناء تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ

---

[۱] ابن ہشام ۳/۹۸-۱۰۱ - طبری ۳/۲۴، ۲۵ - [۲] ابن ہشام ۳/۱۰۶ - طبری ۳/۲۴ - [۳] واقدی ۳۱۷ - [۴] واقدی ۳۱۸/، ۳۱۷،
[۵] ابن ہشام ۳/۱۰۸، طبری ۳/۲۸، ابن خلدون ۲/۲۷

یہ دونوں غزوے شوال ۳ھ کے واقعات ہیں، چنانچہ خود واقدی نے بھی اس کو شوال ہی کے ذیل میں بیان کیا ہے۔[1]

یہ سوال کہ غزوۂ احد محرم کا واقعہ تھا، یا شوال کا؟ میری دو تقویمی جدول سے حل ہو جاتا ہے۔ ۳ھ کی جدول تقویم میں مکی شوال مطابق ۱۳ جون ۶۲۵ء کا متوازی مدنی مہینہ "محرم" ہے جس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ اختلاف روایت محض دو تقویمی کا فرمائی کا نتیجہ ہے۔ نیز یہ کہ شوال کے متعلق جو روائتیں ملتی ہیں، وہ مکی تقویم کے موجب ریکارڈ کی گئی تھیں، اس خیال کی تصدیق موسمی اشارات سے بھی ہوتی ہے، روایات بتاتی ہیں کہ غزوۂ احد اور حمراء الاسد جس موسم میں ہوئے، اس میں تازہ کھجوریں چل چکی تھیں، چنانچہ میور (MUIR) نے بصراحت بیان کیا ہے کہ غزوۂ حمراً الاسد کے دوران میں پوری مسلمان فوج کو یہی راشن تقسیم کیا گیا تھا۔

اس مقام پر لشکر نے تین دن قیام کیا اور تازہ کھجوروں پر بسر کی، ایک باافراط فصل پر جس کو اسی وقت چُنا گیا تھا۔[2]

غزوۂ حمراء الاسد سے واپسی کے کچھ ہی دن بعد ایک جان نثار صحابی کی بیوہ نے جن کے شوہر اسی غزوہ اُحد میں شہید ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ کی مع چند احباب کے اپنے باغ میں دعوت کی تو سایہ دار درختوں کے نیچے چھڑکاؤ کر کے فرش بچھایا گیا، اور کھانے کے بعد تازہ اور نوَرس کھجوروں (رُطب) کا ایک طباق مہمانوں کے سامنے پیش ہوا۔ روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ کھجوریں فصل کے "پہلے" یا اس سے کچھ ہی بعد کے پھل تھے۔[3]

حجاز میں عام طور پر رطب کا موسم جون اور جولائی ہے۔ اب اگر اس واقعے کو قمری شوال ۳ھ کا قرار دیا جاتا ہے تو مارچ ۶۲۵ء کے مطابق ہوگا اور یہ زمانہ "رطب" کا ہرگز نہیں، حیرت ہے کہ میور (MUIR) نے اُحد کی تاریخ جنوری ۶۲۵ء قرار دی ہے[4] جس میں تازہ کھجوریں تو درکنار پھول بھی نہیں ہوتا، اور اس پر مستزاد یہ کہ مذکورۂ بالا دونوں روائتیں بڑی تفصیل کے ساتھ نقل بھی کی ہیں۔[5]

اس مرحلے کے بعد ہمیں اس غزوے کی تاریخوں پر نظر ڈالنا چاہیئے، ابن کثیر کا بیان ہے:-

"اُحد کا واقعہ ۳ھ میں ہوا، جس کو زہری، قتادہ، موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحٰق اور مالک نے بیان کیا ہے۔ ابن اسحٰق کا قول نصف شوال کا ہے، قتادہ کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ہفتے کے دن ۱۱ شوال ۳ھ کا ہے۔ مالک کے قول کے موجب یہ دن کے ابتدائی حصے کا واقعہ ہے۔"[6]

ان تاریخوں میں قسطلانی نے قتادہ کی تاریخ کو متفق علیہ قرار دیا ہے، اور اگرچہ باقی تاریخیں بھی بیان کی ہیں، لیکن سب

---

[1] واقدی ۱/۱۹۷۔

[2]

AT THIS SPOT THE FORCE SPENT THREE DAYS AND REGALED THEMSELVES WITH "FRESH" DATE A PLENTIFULL HARVEST OF WHICH HAD JUST BEEN GATHERED (MUIR - LIFE 267)

[3] واقدی ۱/۳۳۱ [4] MUIR LIFE 252 [5] IBID - 267, 273 [6] البدایہ ۴/۹

کی سب قیل کے ساتھ، وہ کہتے ہیں :-

"شوال ۳ھ میں ہفتے کے دن ۱۱ شوال پر سب کا اتفاق ہے، اور بعض لوگ کہتے ہیں، ۷ شوال اور بعض کے نزدیک نصف شوال تھی"[1]

ابن سید الناس نے "عیون الاثر" میں ابن عائذ کی سند سے جو مشہور سیرت نگار ہیں، ۱۱ تاریخ بیان کی ہے۔

"غزوۂ اُحد، ابن عائذ کے نزدیک شوال ۳ھ میں ہفتے کے دن ۱۱ تاریخ کو ہوا تھا"[2]

تعجب یہ ہے کہ دیار بکری نے خود ابن اسحٰق سے ایک روایت ۱۱ شوال کی نقل کی ہے[3]۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں خود دیار بکری کی غلطی یا بھول چوک کو دخل نہیں ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ ابن اسحٰق کے بعض نسخوں میں یہ تاریخ بھی موجود تھی جو اب نہیں ملتی۔

بخلاف اس کے واقدی نے اس کی تاریخ ہفتہ ۷ شوال[4] اور ابن اسحٰق نے بروایتِ مشہور ہفتہ نصف شوال بیان کی ہے[5] جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہفتے کے دن پر سب کا اتفاق ہے لیکن تاریخوں میں کسی غلط فہمی کے باعث اختلاف ہو گیا ہے۔ ان میں سب سے قدیم روایت قتادہ کی ہے۔ جو ۱۱ شوال کی ہے اور غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ مکی شوال کی پہلی تاریخ کو موجودہ حساب کے مطابق پنجشنبہ تھا۔ اس اعتبار سے ۱۱ تاریخ کو ہفتہ ہونا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، حسابی رویت اور واقعی رویت میں ایک دن کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اب رہی واقدی اور ابن اسحٰق کی مشہور تاریخ تو اس کے غلط ہو جانے کے متعلق میرا گمان یہ ہے کہ اس کی بڑی وجہ غالباً غزوۂ حمراء الاسد کا تاریخی اختلاط ہے کیونکہ ان دونوں واقعات میں صرف ایک دن کا آگا پیچھا ہے۔ نیز یہ کہ غزوۂ حمراء الاسد ایک ذیلی غزوہ تھا، اس لیے ابتدائی دستاویزوں میں ان دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ ہوا ہو گا، اور ہو سکتا ہے کہ ان دونوں ائمہ سیرت کی غلط فہمی کا باعث بن گیا ہو۔

غزوۂ حمراء الاسد میں آنحضرتؐ نے ۴ دن صرف کئے تھے، اگر ۱۱ تاریخ میں یہ دن جوڑ دیئے جائیں تو ابن اسحٰق کی ۱۵ تاریخ آ جاتی ہے اور اگر کم کر دیئے جائیں تو واقدی کی ۷ تاریخ بنتی ہے۔

بہر صورت میری رائے میں ابن اسحٰق اور واقدی دونوں کی تاریخیں غلط ہیں، اور ان کو صرف اسی صورت میں صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، جب یہ فرض کر لیا جائے کہ غزوۂ اُحد مکی شوال کا نہیں، بلکہ مدنی شوال کا واقعہ ہے۔ لیکن اس مفروضے کو تسلیم کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔

---

[1] مواہب ۱/۱۱۹ -

[2] عیون الاثر ۲/۱ -

[3] تاریخ الخمیس ۱/۴۱۹ -

[4] واقدی ۱/۱۹۸ - نیز دیکھئے ابن سعد ۲/۲۰ -

[5] ابن ہشام ۳/۱۹ - نیز دیکھئے طبری ۳/۱۱ -

سنہ ۴، ۵

	مکی	جولین	مدنی	
۱۔ سریۂ ابو سلمہ ۔ یکم محرم ۲۔ غزوہ دومۃ الجندل یکم محرم ۳۔ بروایت ابن حبیب	محرم	۱۰ر ستمبر سنہ ۶۲۵ سہ شنبہ	ربیع۲	غزوہ دومۃ الجندل بروایت واقدی
۳۔ حادثہ بیر معونہ	صفر	۷ر اکتوبر ۔ چہارشنبہ	جمادی۱	
۴۔ غزوۂ بنو نضیر سہ شنبہ ۱۲ر ربیع۱ بروایت ابن حبیب	ربیع۱	۸ر نومبر جمعہ	جمادی۲	
	ربیع۲	[illegible] دسمبر شنبہ	رجب	
	جمادی۱	۷ر جنوری سنہ ۶۲۶ دوشنبہ	شعبان	
۵۔ قتل ابو رافع سلام بن ابی الحقیق	جمادی۲	۴ر فروری سہ شنبہ	رمضان	۵۔ قتل ابو رافع سلام بن ابی الحقیق
	رجب	۶ر مارچ پنجشنبہ	شوّال	
۶۔ غزوۂ بدر موعد، بروایت ابن اسحٰق پنجشنبہ یکم شعبان (ابن حبیب)	شعبان	۴ر اپریل جمعہ	ذیقعدہ	۶۔ غزوۂ بدر موعد بروایت واقدی۔ یکم ذیقعدہ (ابن سعد)
	رمضان	۴ر مئی ، یکشنبہ	ذوالحجّہ	
	شوّال	۲ر جون دوشنبہ	محرم سنہ ۵	
	ذیقعدہ	۲ر جولائی چہارشنبہ	صفر	
	ذوالحجّہ	۳۱ر جولائی پنجشنبہ	ربیع۱	
؟ غزوۂ دومۃ الجندل یکم محرم	نسی	۳۰ر اگست شنبہ	ربیع۲	غزوۂ دومۃ الجندل ؟ بروایت واقدی

سنہ ۴ھ

اس سنہ کے مندرجہ ذیل چھ واقعات کو ہاتھ لگایا گیا ہے :

۱و۲۔ سریۂ ابوسلمہ مخزومی اور غزوۂ دومۃ الجندل اہلِ سیرت بیان کرتے ہیں کہ محرم ۴ھ میں آنحضرتؐ نے ابوسلمہ کو ایک قلیل فوج کے ساتھ قبائلِ نجد کی طرف روانہ کیا تھا، اس کی تاریخ یکم محرم ۴ھ بیان کی جاتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ سریہ غزوۂ دومۃ الجندل کا ذیلی سریہ تھا جو ۵ھ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، کتاب میں اس کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں، اور ظاہر کیا گیا ہے کہ غالباً غزوۂ دومۃ الجندل کا تعلق بھی ۴ھ سے تھا۔

۳۔ حادثہ بیر معونہ ابن اسحٰق اور واقدی دونوں متفق ہیں کہ یہ واقعہ صفر ۴ھ کا ہے، میری رائے میں یہ صفر مکی تھا، اور حادثۂ رجیع سے تقریباً چار ماہ بعد کا واقعہ ہے، جیسا کہ ابن اسحٰق کا خیال ہے۔

۴۔ غزوۂ بنونضیر اس واقعہ کی تاریخ ابن حبیب نے سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۴ھ بیان کی ہے جو مکی تقویم کے حساب سے ٹھیک بیٹھتی ہے۔ وسٹنفیلڈ کی تقویم کے اعتبار سے یہ تاریخ غلط ہے۔

۵۔ قتلِ ابورافع اس کے سلسلہ میں علمائے تاریخ مختلف الرائے ہیں کہ یہ کس سنہ کا واقعہ ہے، بعض اس کو جمادی الاخریٰ ۳ھ کا، بعض ۴ھ کا اور بعض رمضان ۶ھ کا واقعہ قرار دیتے ہیں، ان مختلف تاریخوں میں دو تقویمی جدول توازن پیدا کر دیتی ہے، کتاب میں اس پر پوری بحث ہے۔

۶۔ غزوۂ بدرِ موعد اس پر پوری بحث برہان میں شائع ہو رہی ہے۔

غزوۂ بدرِ موعد

شعبان ۴ھ یا ذیقعد ۴ھ

اربابِ تاریخ بیان کرتے ہیں کہ جنگِ اُحد میں ابوسفیان نے پیغمبرِ اسلامؐ کو چیلنج کیا تھا کہ اگلے سال پھر میدانِ بدر میں قسمت آزمائی[1] ہوگی، جہاں قریش کو ایک سال پہلے شکستِ فاش ہو چکی تھی، آنحضرتؐ کو یہ چیلنج یاد تھا، چنانچہ اس سال کافی لشکر لے کر آپؐ مقررہ ایام میں میدانِ بدر کی طرف بڑھے، قریش بھی پورے ساز و سامان کے ساتھ نکلے اور ظہران تک پہنچے ہوں گے کہ ان کی ہمتوں نے جواب دے دیا[2] اور موسم کی ناموافقت کی وجہ سے واپس چلے گئے۔

اس غزوہ کو بدرِ موعد کا نام اسی چیلنج کی وجہ سے دیا گیا ہے، ممکن ہے کہ اس مہم کی صرف یہی وجہ ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ

---

[1] ابن ہشام ۳/۲۲۰، ابن سعد ۲/۲۔ ابن سید الناس ۲/۵۴ [2] ابن ہشام ۳/۲۲۰، طبری ۳/۲۱

اس میں مدنی تجارت کو فروغ اور قریش کی تجارتی ناکہ بندی کی مصلحت کو بہت بڑا دخل تھا۔

ابن اسحٰق نے اس غزوے سے پہلے غزوۂ ذات الرقاع کا ذکر کیا ہے[1]۔

لیکن واقدی کی ترتیب[2] کے بموجب غزوۂ ذات الرقاع بدر موعد سے بعد کا واقعہ ہے، اور یہی خیال درست ہے۔ ابن اسحٰق نے بدر موعد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بعد ازاں رسول اللہؐ شعبان کے مہینے میں ابوسفیان کے وعدے کے بموجب نکلے[3]"

ابن حبیب نے زیادہ صراحت کے ساتھ، دن اور تاریخ بھی بیان کی ہے:

"اور پنجشنبے کے دن مستہل شعبان کو نکلے، اور چہارشنبہ کے دن ۲۰ کو واپس تشریف لائے[4]۔"

اس کے مقابلے میں واقدی اور ابن سعد کا بیان بالکل جدا ہے طبقات میں ہے:

"رسول اللہؐ نے بدر موعد کے لیے لشکر کشی فرمائی، اور یہ بدر قتال سے جداگانہ غزوہ ہے اور یہ ہلال ذلقعدہ (یکم ذلیقعدہ) کا واقعہ ہے[5]۔"

گویا بجز چاند کی پہلی تاریخ کے ابن اسحٰق اور واقدی کے مکاتب میں کوئی مشترک تاریخی تصور نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس غزوہ کی بھی دو ابتدائی دستاویزیں الگ الگ محسوس ہوتی ہیں جن میں سے ایک مکی تقویم کے بموجب تھی اور دوسری مدنی کے!

میری سنہ ۴ھ کی جدولِ تقویم میں مکی شعبان کا متبادل مدنی مہینہ ذلیقعدہ ہے، جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے اور نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں دستاویزیں الگ الگ ریکارڈ کی گئی تھیں،

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ دونوں دستاویزوں میں تاریخِ روانگی چاند کی پہلی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک راوی کے نزدیک یہ واقعہ یکم شعبان کا تھا، تو دوسرے کی نظر میں یکم ذلیقعدہ کا؛

ابن حبیب نے اس غزوے کی تاریخ روانگی پنجشنبہ مستہل شعبان اور واپسی کی تاریخ چہارشنبہ ۲۰ شعبان بیان کی ہے، وسٹنفیلڈ کی ہجری تقویم کے مطابق ہلال ذلیقعدہ سنہ ۴ھ کی رویت ٹھیک پنجشنبے کو ہوئی تھی، جو روایت کے عین مطابق ہے۔

سنہ ۵، ۶ھ

	مکی	جولین	مدنی	
۱۔ غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ محرم بروایت واقدی	محرم	۲۸ ستمبر سنہ ۶۲۶ء یکشنبہ	جمادیٰ	۱۔ غزوۂ ذات الرقاع بروایت ابن اسحٰق ۱۰ جمادی الاولیٰ بروایت ابن حبیب

[1] ابن ہشام ۳/۲۱۳، [2] واقدی / ابن سعد ۲/۴۲، ۴۳، مسعودی التنبیہ / ۲۴۷، ۲۴۸،
[3] ابن ہشام ۳/۲۲۰، نیز دیکھئے طبری ۳/۴۱، ابن سید الناس / ۵۳ [4] ابن حبیب / ۱۱۳ [5] ابن سعد / ۲/۴۲ - نیز دیکھئے واقدی /

مکیؐ	جولین	مدنی	
صفر	۲۸ر اکتوبر سہ شنبہ	جمادیٰ۲	۲- چاند گرہن
ربیع۱	۲۶ر نومبر چہار شنبہ	رجب	×
ربیع۲	۲۶ر دسمبر جمعہ	شعبان	۳- غزوۂ بنو مصطلق، ہفتہ یکم شعبان بروایت ابن حبیب، بروایت مسعودی اور قسطلانی ۲ر شعبان
جمادیٰ۱	۲۴ر جنوری ۶۲۷ء شنبہ	رمضان	۴- اہل مقنا کی جعلی دستاویز تاریخ اور دن غلط
جمادیٰ۲	۲۳ر فروری دوشنبہ	شوال	۵- غزوۂ خندق پنجشنبہ ۱۰ر شوال (ابن حبیب)
رجب	۲۴ر مارچ سہ شنبہ	ذلیقعدہ	۶- غزوۂ بنو قریظہ ۲۵ر دن محاصرہ
شعبان	۲۳ر اپریل پنجشنبہ	ذوالحجہ	۷- بنو قریظہ سے واپسی، دوشنبہ ۴ر ذوالحجہ ابن حبیب
رمضان	۲۳ر مئی شنبہ	محرم ۶ھ	۴- اہل مقنا کی جعلی دستاویز تاریخ اور دن غلط
شوال	۲۲ر جون دوشنبہ	صفر	
ذلیقعدہ	۲۱ر جولائی سہ شنبہ	ربیع۱	
ذوالحجہ	۲۰ر اگست پنجشنبہ	ربیع۲	

۵ھ، ۶۲۶ء

اس سنہ کے مندرجہ ذیل واقعات سے بحث کی گئی ہے :

۱۔ غزوۂ ذات الرّقاع	اس پر پوری بحث بُرہان میں شائع ہو رہی ہے۔
۲۔ چاند گرہن ۵ھ	مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ جمادی الاخریٰ ۵ھ میں مدینے کے اندر ایک چاند گرہن دیکھا گیا تھا، از روئے حساب ۱۹ نومبر ۶۲۶ء کو ایک چاند گرہن ہوا تھا، جو مدنی جمادی الاخریٰ سے مطابق ہوتا ہے۔
۳۔ غزوۂ بنو مصطلق	اس غزوے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے یا ۶ھ کا، حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غزوۂ خندق سے پہلے کا واقعہ تھا، اس کی تاریخ ہفتہ یکم شعبان (بروایت ابن حبیب) اور بروایت مسعودی ۲ رشعبان بیان کی جاتی ہے، ہفتہ ۲ رشعبان ۵ھ سے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوتا ہے۔
۴۔ اہلِ مقنا کی جعلی دستاویز	ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی مشہور کتاب الوثائق السیاسیہ میں اس دستاویز کا تذکرہ کیا ہے، جو بظاہر جعلی ہے، اس دستاویز پر تاریخ کتابت جمعہ ۳ رمضان ۵ھ تحریر ہے۔ یہ تاریخ نہ مکی تقویم پر پوری اُترتی ہے نہ مدنی پر۔
۵-۶ غزوۂ خندق و بنو قریظہ	ان واقعات کی صحیح تاریخیں محفوظ نہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دستاویزوں میں ان کی کتابت غیر واضح تھی، کتاب میں اُن پر پوری بحث ہے۔ نیز ملاحظہ فرمایئے بُرہان ستمبر ۱۹۶۴ء۔

غزوۂ ذات الرّقاع

محرم ۵ھ یا جمادی الاولیٰ ۵ھ

قتلِ ابورافع سلام بن ابی حقیق کے ذیل میں گذر چکا ہے کہ بنو نضیر نے مدینے سے نکلنے کے بعد گویا بیڑا اُٹھایا تھا کہ اسلامی تحریک کا کلیتہً استیصال کر دیا جائے گا، چنانچہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اواخر ۴ھ میں خیبر اور مدینے کے قرب وجوار کے قبائل متحد ہونا شروع ہوئے اور قریش جو سیاسی اعتبار سے بسترِ مرگ پر آچکے تھے، یہودی مسیحائی سے پھر زندہ ہونے لگے جس کے نتیجے میں ۵ھ کا وہ مشہور معرکہ ہوا، جو غزوۂ خندق کے نام سے مشہور ہے لیکن اسی ۵ھ میں جنگِ خندق سے چند ماہ پہلے دو غزوے اور ہوئے تھے، یعنی غزوۂ ذات الرقاع اور غزوۂ بنو مصطلق یا مُریسیع، یہ بھی اسی یہودی تحریک کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

غزوۂ ذات الرقاع کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ اقدام بنو غطفان اور بنو غطفان کی دوسری شاخوں یعنی بنو محارب، بنو ثعلبہ اور انمار وغیرہ کے خلاف تھا جو یہودیان بنو نضیر کے بہترین دوست تھے اور خیبر سے بالکل متصل رہتے تھے، خبر آئی تھی کہ یہ قبائل

مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں، جس پر پیغمبرِ اسلامؐ نے انھیں منتشر کر دینے کے لیے خود ان کے مساکن تک کوچ فرمایا، ابن سعد کا بیان ہے کہ:

"سو آنحضرتؐ کے اصحاب نے اطلاع دی کہ بنو انمار اور ثعلبہ اپنے لیے جماعتیں فراہم کر رہے ہیں.....
سو آپؐ نکلے"۔[1]

ابن سعد نے اسی غزوے کا مہینہ جمادی الاولیٰ ۵ھ بیان کیا ہے، یعنی غزوۂ بنو نضیر سے صرف ڈیڑھ ماہ بعد جیسا کہ عبارت ذیل سے پتہ چلتا ہے:۔

"بعد ازاں آنحضرت مدینے میں غزوۂ بنو نضیر کے بعد جو ربیع الاخریٰ اور جمادی الاولیٰ کے ابتدائی حصے کا واقعہ ہے، مقیم رہے، اس کے بعد نجد پر بنی محارب اور بنی ثعلبہ کے ارادے سے لشکر کشی فرمائی، جو غطفان کی شاخیں ہیں"۔[2]

ابن حبیب نے اس غزوے کی تاریخ اور دن زیادہ تفصیل سے متعین کیا ہے۔

اور آنحضرتؐ دو شنبے کے دن ۱۰ ر جمادی الاولیٰ کو نکلے اور اسی مہینے میں چہارشنبے کے دن واپس تشریف لائے۔[3]

بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد نے اس کو محرم ۵ھ کا واقعہ قرار دیا ہے جیسا کہ طبقات میں ہے:۔

"رسول اللہؐ کی ذات الرقاع پر لشکر کشی محرم میں ہوئی اور آپؐ ہفتے کی رات میں ۱۰ ر محرم کو نکلے"۔[4]

مواہب میں اس اختلاف کی صدائے بازگشت ملاحظہ ہو:

"اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب کا ہے، ابن اسحٰق کے نزدیک غزوۂ بنو نضیر کے بعد ۴ھ کے ربیع الآخر اور جمادی الاولیٰ کے کچھ حصے میں ہوا، اور ابن سعد اور ابن حبان کی رائے میں محرم ۵ھ کا واقعہ ہے"۔[5]

اس ابتدائی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض علمائے نے اس کو غزوۂ بنو قریظہ (۵ھ) سے بھی بعد میں جگہ دی:

"اور ابو معشر کا خیال ہے کہ یہ بنو قریظہ کے بعد کا واقعہ ہے"۔[6]

ظاہر ہے کہ یہ جملہ اختلافات اس دستاویزی اختلاف کا نتیجہ ہیں جو سیرت کے ابتدائی مدوّنین کو مل چکی تھیں، چنانچہ ابن سعد اور ابن حبان کی روایت کے بموجب میری مرتبہ جدول میں ۵ھ محرم کو دیکھیے تو اس کا متوازی مدنی مہینہ جمادی الاُخریٰ نظر آتا ہے' جو دونوں دستاویزوں کے بالکل مطابق ہے، اور جس کی بنیاد پر ابن اسحٰق کی ترتیبی غلطی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ دونوں دستاویزوں میں یہ واقعہ ۱۰ ر تاریخ کا بیان کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک راوی کے نزدیک یہ جمادی کی ۱۰ ر تاریخ تھی اور دوسرے کے نزدیک محرم کی۔!

---

[1] ابن سعد ۲/ ۴۲۔ [2] ابن ہشام ۳/ ۲۴۲ ۔نیز دیکھیے ابن سید الناس ۲/ ۵۲ [3] ابن حبیب/ ۱۱۲ [4] ابن سعد ۲/ غزوۂ ذات الرقاع ۔نیز دیکھیے مسعودی التنبیہ/ ۲۴۸ [5] قسطلانی/ ۱۲۷، [6] ایضاً؛

ابن حبیب نے ۱۰ رجمادی ۱ کو دوشنبہ بیان کیا ہے، وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب جمادی ۱ کی پہلی تاریخ کو یکشنبہ تھا، (مطابق ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء) اس حساب سے دوشنبہ ۹ رجمادی کو ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک روزہ اختلاف ناقابلِ التفات ہے۔

ابن سعد کے موجودہ نسخوں میں محرّم کی دسویں تاریخ کو یوم السبت[1] ملتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلطی کسی ابتدائی ناقل کی ہے جس نے نسخہ کی خرابی کے باعث، یا بدخطی کی وجہ سے "اثنین" کے دندانوں کو "س" کے دندانے سمجھ کر سبت پڑھ لیا، ورنہ از روئے حساب ۱۰ رکو ہفتہ کسی طرح ممکن نہیں۔

سنہ ۶، ۷ھ

	مکّی	جولین	مدنی	
	محرم سنہ ۶ھ	۱۸ ستمبر سنہ ۶۲۷ء جمعہ	جمادی ۱	
	نسی	۱۸ اکتوبر یکشنبہ	جمادی ۲	
	صفر	۱۶ نومبر دوشنبہ	رجب	
	ربیع ۱	۱۶ دسمبر چہارشنبہ	شعبان	
	ربیع ۲	۱۴ جنوری سنہ ۶۲۸ء پنجشنبہ	رمضان	
۱۔ قتل خسرو پرویز۔ بروایت واقدی سہ شنبہ ۱۰ رجمادی	جمادی ۱	۱۳ فروری سنہ ۶۲۸ء سہ شنبہ	شوال	۱۔ قتل خسرو پرویز ۲۷ فروری سنہ ۶۲۸ء یورپی تاریخ ۲۔ سریہ کرز بن جابر فہری الی عُرنیین بروایت واقدی
۲۔ سریہ کرز بن جابر فہری بروایت ابن اسحٰق	جمادی ۲	۱۳ مارچ یکشنبہ	ذیقعدہ	۳۔ غزوۂ حدیبیہ، روانگی دوشنبہ یکم ذیقعدہ بروایت ابن سعد

[1] ابن سعد ۲/۴۳۔

	مکی	جولین	مدنی	
	رجب	۱۲ر اپریل سہ شنبہ	ذوالحجہ	۴-سفارت دحیہ بن خلیفۃ الکلبی اپریل ۶۲۸ء (یورپی تاریخ)
	شعبان	۱۱ر مئی چہار شنبہ	محرم ۷ھ	
	رمضان	۱۰ر جون جمعہ	صفر	
	شوّال	۹ر جولائی شنبہ	ربیع ۱	
	ذلقعدہ	۸ر اگست دوشنبہ	ربیع ۲	
غزوہ ذی قرد بروایت بخاری	ذوالحجہ	۶ر ستمبر سہ شنبہ	جمادی ۱	غزوہ بنولحیان بروایت ابن اسحٰق غزوہ ذی قرد

نوٹ :۔ پچھلے دو کبیسہ سالوں میں لوند کے مہینے آخر سال میں بڑھائے گئے تھے، ان سالوں میں شروع میں بڑھائے گئے ہیں،

۶ھ، ۷ھ

اس سنہ کے مندرجہ ذیل واقعات سے بحث کی گئی ہے :

۱-قتلِ خسرو پرویز اور صلح حدیبیہ بُرہان میں پوری بحث ملاحظہ فرمائیے ۔

۲-سریۂ کرز بن جابر فہری اس واقعہ کی توقیت پر بھی دو تقویمی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے ۔ اس کی ایک تاریخ جمادی الاخریٰ بیان کی جاتی ہے، دوسری شوّال ۶ھ۔ بہ دل ۶ھ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوّال ۶ھ مدنی کا اختتام جمادی الاخریٰ مکی کی ابتدا کے مطابق تھا ۔

۴-سفارتِ دحیہ بن خلیفۃ الکلبی اس کی تاریخ یورپی مصنفین کے یہاں بھی محفوظ ہے جو روایتی تاریخ سے مطابقت کرتی ہے ۔

۵ - غزوۂ بنو لحیان } کتاب میں تفصیلی بحث ہے۔
۶ - غزوۂ ذی قرد } 〃 〃 〃

صُلح حُدیبیہ

جمادی الاولیٰ ۶ھ = ذیقعدہ ۶ھ

ہجرت کے بعد قریش اور اسلام کی جتنی جنگیں ہوئی تھیں، ان میں ۵ھ تک حملے کی پہل ہمیشہ قریش کے ہاتھ میں رہی۔

مدینے پر پہلا حملہ جمادی ۲ھ مدنی میں کرز بن جابر نے کیا تھا، اس کے بعد ذوالحجہ ۲ھ میں خود ابو سفیان نے مدینے پر لشکر کشی کی، جس کو غزوۂ سویق کہتے ہیں، پھر ۳ھ میں معرکۂ احد ہوا، جس میں بظاہر مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد ۴ھ میں ابو سفیان کے چیلنج کی پیش رفت میں بدر موعد کا غزوہ ہوا۔ ۵ھ میں قریش کے سب سے بڑے حملے کو خندق کے ذریعہ روکا گیا، جس میں قریش اور ان کے اتحادیوں کی پوری طاقت نے کام کیا تھا، لیکن کامیابی نہ ہونے کی وجہ سے ہمتیں پست ہو کر رہ گئیں، خود اعتمادی اور ساکھ ختم ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ پیغمبرِ اسلام نے اسی وقت پیشین گوئی فرمائی تھی کہ قریش کا یہ آخری حملہ تھا جو ہو چکا۔[1]

اب ہر قسم کی پہل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، چنانچہ ۶ھ کے موسمِ بہار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ قبلۂ اسلام یعنی کعبے کی زیارت کی جائے، جو ہنوز مشرکینِ مکہ کے تصرف میں تھا، یہ اقدام ظاہر ہے کہ جتنا سیاسی مصالح پر مبنی تھا، اس سے کہیں زیادہ جرأت مندانہ تھا، اس لیے کہ عین اس زمانے میں جبکہ کے کے اندر پورے عرب کے مشرکین کا اجتماع ہوتا تھا مٹھی بھر مسلمانوں کی حیثیت ہی کیا تھی۔

قریش کو جب آنحضرتؐ کی آمد کا علم ہوا، تو چراغ پا ہو گئے، بے دین مسلمانوں کو حج بیت اللہ کی اجازت ان کے سیاسی مفاد کے خلاف تھی، اور اگرچہ ایامِ حج اور ایامِ عمرہ میں وہ رواج اور دستور کے مطابق کسی کو زیارتِ بیت اللہ سے روکنے کا حق نہ رکھتے تھے۔[2] لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو روکنے کے لیے مضبوط فوجی دستے مقرر کیے گئے، جنھوں نے شاہراہیں بند کر دیں، یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ نے عام راستہ ترک کر کے حدیبیہ کا راستہ اختیار کیا[3] اور اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کی غرض جنگ نہیں بلکہ محض عمرہ ہے۔[4] ساتھ ہی حضرت عثمانؓ کو مکے بھیجا تاکہ وہ اکابر قریش کو ہر طرح مطمئن کر دیں۔[5]

مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا اور قریش اپنی ہٹ پر اڑے رہے، دورانِ اثنا یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ کو اہلِ مکہ نے قتل کر ڈالا جس کو سن کر رسول اللہؐ نے مکے پر حملے کا ارادہ کر لیا اور وہ مشہور بیعت لینا شروع کی جس کو تاریخ کی زبان میں "بیعتِ رضوان" کہا جاتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر اگرچہ غلط تھی، تاہم اس بیعت سے بڑے دُوررس نتائج نکلے اور قریش ایک ایسی صلح پر

---

[1] دیار بکری ۱/۴۹۲ [2] MAGRC HOP III, 3 [3] طبری ۲/۷۱-355
[4] طبری ۲/۷۴ [5] طبری ۲/۷۷

مجبور ہو گئے، جس کی اُمید نہ تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ گفت و شنید کے بعد ایک صلحنامہ مرتب ہوا جس میں فریقین نے دس سال تک ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کی ذمہ داری لی[1] عمرے کے متعلق یہ طے ہوا کہ سالِ آئندہ انہی ایام میں مسلمان زیارت بیت اللہ کے لیے آ سکیں گے اور صرف تین دن میں مناسک ادا کر کے واپس چلے جائیں گے، حدودِ حرم میں اسلحہ لانے کی اجازت نہ ہو گی[2] ان شرائط کے ساتھ بعض دوسری شرطیں بھی تھیں، جن میں سب سے اہم شرط یہ تھی کہ قبائلِ عرب میں ہر قبیلے کو یہ اختیار ہو گا کہ خواہ وہ مسلمانوں کے وفاق میں داخل ہو، یا قریش کے ساتھ رہے[3] جس کے کھلے معنی یہ تھے کہ فریقین کے بعد معاہد قبائل کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو اصل فریق کے تھے۔

ابن اسحٰق اور واقدی دونوں متفق ہیں کہ آنحضرتؐ اس عمرے کے لیے ذلیقعدہ ۶ھ میں عازمِ مکہ ہوئے تھے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ

"اور آنحضرتؐ ذلیقعدہ میں عمرے کی نیت سے نکلے، لڑائی کا ارادہ نہ تھا۔"[4]

واقدی فرماتے ہیں:

"اس کے بعد آنحضرتؐ نے ذلیقعدہ میں عمرۂ حدیبیہ فرمایا۔"[5]

ابن سعد نے مدینے سے روانگی کا دن اور تاریخ بھی متعین کی ہے:

"اور آپؐ اس کے لیے دوشنبہ کے دن یکم ذلیقعدہ کو روانہ ہوئے۔"[6]

وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب یکم ذلیقعدہ کو یکشنبہ پڑتا ہے، مگر یہ ایک روزہ تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ابن حبیب نے یکم ذلیقعدہ کو پنجشنبہ بیان کیا ہے[7] جو از روئے حساب غلط ہے۔

محدثین کو بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ذلیقعدہ ۶ھ کا ہے۔ مگر محدثین اور سیرت نگاروں کی اس ہم آہنگی کے باوجود کتبِ سیرت میں بعض روایات ایسی ملتی ہیں، جن سے چند در چند تاریخی شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

طبری نے ایرانِ قدیم کے ذیل میں عکرمہ کے حوالہ سے لکھا ہے:-

"سو اللہ نے کسریٰ کو ہلاک کیا، اور اس کی خبر رسول اللہؐ کے پاس حدیبیہ کے زمانے میں پہنچی تو خود آنحضرتؐ اور آپؐ کے جملہ ساتھی مسرور ہوئے۔"[8]

گویا کسریٰ کا قتل اور صلح حدیبیہ ایک ہی زمانے کی باتیں تھیں، لیکن مورخینِ اسلام کے نزدیک کسریٰ کا قتل متفقہ طور پر جمادی الاولیٰ کا قصہ ہے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ کو اس قتل کی اطلاع بصراحت یوم و تاریخ فوراً بذریعہ وحی ہو گئی تھی:

---

[1] ابن سعد ۲/-۔ [2] ایضاً [3] ابن سعد ۲/-۔ [4] ابن ہشام ۳/۳۲۱، نیز دیکھیے طبری ۳/-۔ [5] واقدی /۶، نیز دیکھیے ابن سعد [6] ابن سعد ؛ /۶۹، نیز دیکھیے قسطلانی ۱/۱۶۲۔ [7] ابن حبیب /۱۱۵ ؛ [8] طبری ۲/۱۴۳.........

"فہلک اللہ کسریٰ وجاء الخبر الی رسول اللہ یوم الحدیبیۃ ففرح ومن معہ۔"

"اور وحی آئی کہ اللہ نے کسریٰ پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا اور اس نے فلاں رات اور فلاں مہینے میں اس کو قتل کر ڈالا یعنی ۱۰ جمادی ۷ھ کو"[1]

واقدی نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ کسریٰ کے قتل کی تاریخ بیان کی ہے، فرماتے ہیں :۔

"شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو سہ شنبہ کی رات میں ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا، جبکہ چھ گھنٹے گزر چکے تھے"[2]

ان دونوں روایتوں میں ۷ھ تو بالبداہت سہوِ کتابت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جب اس قتل کی اطلاع صلح حدیبیہ کے موقع پر ۶ھ میں مکے پہنچ چکی تھی، تو پھر ۷ھ کے کوئی معنیٰ نہیں رہتے[3]، البتہ جمادی الاولیٰ اور ذلقیعدہ میں جو فرق ہے، اس پر غور کرنا ضروری ہے،

اگر واقعی مسلمان مصنفین کے یہاں کسریٰ کے قتل کی تاریخ فرضی نہیں اور یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۶ھ کا ہے جیسا کہ واقدی اور تمام مصنفین بیان کرتے ہیں تو پھر صلح حدیبیہ اسی جمادی الاولیٰ میں یا اس کے متصل ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اطلاع تقریباً چھ سات ماہ بعد مکے پہنچی تھی اور صلح حدیبیہ اور کسریٰ کا قتل ہم زمانہ واقعات نہیں، حالانکہ تمام مؤرخینِ اسلام یہی تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ابو نعیم نے دلائلِ نبوت میں لکھا ہے کہ رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی زمانے میں شکست ہوئی تھی جس زمانے میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تھا[4] اور طبری کے بقول جب اس شکست کی اطلاع حدیبیہ پہنچی تو تمام مسلمانوں میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی[5]۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء تاریخ کے نزدیک یہ دونوں واقعات بالکل قریب العہد ہیں اور ان میں چھ سات ماہ کا بُعد نہیں، ان تاریخی شہادتوں کے پیشِ نظر ہمیں ۶ھ کی دو تقویمی جدول کا امتحان لینا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں وہ کیا رہنمائی کر سکتی ہے؟

۶ھ کی جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکی جمادی الاولیٰ کا متبادل قمری مہینہ شوال ۶ھ تھا جس کے بعد ذلقیعدہ آتا ہے، یعنی وہی ذلقیعدہ مدنی جس میں تمام سیرت نگاروں کے نزدیک صلح حدیبیہ ہوئی تھی، اس طرح دونوں واقعات بالکل ہم عہد ہو جاتے ہیں اور کسریٰ کا واقعۂ قتل جو نینوا میں جمادی الاولیٰ کے مہینے میں ہوا تھا، اس کی اطلاع جمادی الاخریٰ کے اوائل میں مکے پہنچنا بالکل قدرتی بات ہے۔

اس تقویمی شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسریٰ کے قتل کی روایت مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی تھی اور صلحِ حدیبیہ کا

---

[1] ابن خلدون ۲/۳/۸ ، [2] طبری ۳/۹۱ "قتل شیرویہ اباہ کسریٰ لیلۃ الثلاثاء لعشر لیال مضین من جمادی الاولیٰ من سنۃ السبع لست ساعات مضت فیھا۔۔۔۔" [3] چنانچہ واقدی کی اس روایت کو طبری نے بھی ۶ھ کے تحت درج کیا ہے۔ دیکھیئے طبری ۳/۹۱ [4] دلائل /۱۴۴ [5] طبری ۲/۱۴۳

ریکارڈ مدنی تقویم کے مطابق چلا آ رہا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں واقدی کی بیان کردہ تاریخ قتل پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، جو بعض مؤرخین کے لیے باعثِ شک اور موجب حیرت[1] رہ چکی ہے۔ تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس روایت کو کسی کوئی تاریخی افادیت ہے یا نہیں؟

واقدی کا بیان ہے کہ یہ واقعہ سہ شنبہ ۱۰ رجادی الاولیٰ کی ہے، از روئے حساب مکی جمادی الاولیٰ کی پہلی تاریخ سہ شنبہ ۱۳ ر فروری ۶۲۸ء کے مطابق تھی، اس حساب سے ۱۰ رجادی الاولیٰ کو دوشنبہ ۲۲ ر فروری ۶۲۸ء ہو گی، لیکن روایت میں چونکہ سہ شنبہ کی صراحت ہے، اس بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ رویتِ قمر ایک دن بعد تسلیم کی گئی تھی اور ۱۰ رجادی کو سہ شنبہ اور فروری کی ۲۳ تاریخ تھی۔

یورپی مصنفین میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کس تاریخ کا ہے، گبن (GIBBON) نے کسریٰ کی گرفتاری اور اس کے ساتھ ۱۸ شہزادگان[2] کا بے دردانہ قتل ۲۵ ر فروری ۶۲۸ء کا واقعہ ظاہر کیا ہے اور ان کی رائے میں پانچویں دن کسریٰ کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ گویا ۲۹[3] فروری کو، ڈاکٹر حمید اللہ نے خود قیصر کے ایک خط کی سند سے تاریخ قتل ۲۷ ر فروری ۶۲۸ء بیان کی ہے[4]۔ اگر اس تاریخ کے ساتھ یہ روایت شامل کر دی جائے کہ کسریٰ کا قتل گرفتاری کے پانچویں دن ہوا تھا تو خسرو کی گرفتاری کا واقعہ ٹھیک ۲۳ ر فروری ۶۲۸ء کا تسلیم کرنا پڑیگا۔ جو واقدی کی روایت کے بموجب تاریخ قتل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ واقدی کے رُواۃ نے گرفتاری اور قتل دونوں کو ایک ہی دن کا واقعہ سمجھا، اس طرح واقدی اور یونانی مصنفین کی تاریخوں میں ایک نہایت ہی قریبی تعلق محسوس ہوتا ہے، اور جو فرق رہتا ہے، وہ بعدِ ذرائع اطلاع کے۔ اختلافات کا قدرتی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے بہر حال عرب روایات کو یونانی مصنفین کی روایات پر یہ تفوق حاصل ہے کہ ان میں اس واقعہ کی تاریخ کے ساتھ دن بھی متعین کیا گیا ہے جو تقویمی حساب سے صحیح آتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں مسلمانوں کے ذرائع اطلاع کس درجہ صحیح تھے

ان مراحل سے گزرنے کے بعد ابھی ایک مسئلہ اور باقی ہے، جو ان سے بھی زیادہ اہم اور قابلِ غور ہے، تمام سیرت کی کتابوں میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حُدیبیہ کا تعلق ایامِ حج یا عمرہ سے تھا، اور اس فریضہ کو ادا کرنے کے لیے قبائلِ عرب جوق در جوق مکّے میں جمع ہو رہے تھے، مسلمان بھی اسی غرض کے لیے وہاں پہنچنا چاہتے تھے، لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعۂ حُدیبیہ مدنی ذیقعدہ

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ کے نزدیک واقدی کی یہ روایت غلط ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "اگر واقدی کی یہ روایت کہ یہ قتل ۱۰ رجادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مان لیا جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں" معارف ۱۹۴۲ء

[2] E. GIBBON, DECLINE, VOL III P. 302, MARGOLIOUTH - RISE 362

[3] دیار بکری نے مقتول شہزادگان کی تعداد ۱۷ بیان کی ہے (دیار بکری ۲/۹۱)

[4] E. GIBBON DECLINE - VOL III P. 3 ، ۵ معارف ۱۹۴۲ء نیز دیکھیے روداد ادارۂ معارف اسلامیہ اجلاس دوم ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۰۰ (انگریزی حصہ)

میں پیش آیا تھا، جس کا ایامِ حج سے کوئی تعلق نہیں تھا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدنی ذیلقعدہ میں قبائلِ عرب کا یہاں اجتماع کیسا؟ اس کا جواب بھی دو تقویمی جدول دے گی۔

چنانچہ اُسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۶ھ میں مدنی ذیلقعدہ کا متبادل مکی مہینہ جمادی الاُخریٰ تھا، جس کے بعد رجب کا مقدس مہینہ شروع ہوتا ہے جو مکی تقویم کے بموجب "عمرے یا حجِ اصغر" کا مخصوص مہینہ شمار ہوتا تھا[۱] اور ایامِ جاہلیت میں اس مہینے میں بھی ویسا ہی اجتماع اور ہماہمی ہوتی تھی جیسی ذوالحجہ کے مقدس مہینے میں فرق صرف یہ تھا کہ رجب کے فریضے کو حجِ صغر یا عمرہ کہا جاتا تھا[۲] اور ذوالحجہ کے فریضہ کو حجِ اکبر بلکہ ایامِ حج یعنی ذوالحجہ میں عربوں کے نزدیک "عمرہ" قطعاً ممنوع تھا[۳] اور اس کو بڑا گناہ سمجھتے تھے، حتیٰ کہ ۱۰ھ تک تنسیخِ تقویم کے بعد بھی (حجۃ الوداع کے موقع پر) جب آنحضرتؐ نے حج کے ساتھ عمرے کا حکم دیا تو خود مسلمانوں پر یہ بات گراں گزری تھی[۴] اس لیے یہ بات قابلِ قیاس نہیں کہ خاص ایامِ حج میں آپؐ نے عمرے کا اعلان فرمایا ہو، بالخصوص اس حالت میں کہ آپ بہ صلح آشتی اور پُرامن طریقے پر یہ مراسم ادا کرنا چاہتے تھے۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ حدیبیہ کے موقع پر عمرے ہی کے لیے تشریف لائے تھے، اور عمرے ہی کا احرام باندھا تھا، حج کی کوئی نیت نہ تھی، اس بات کی تصدیق مزید حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ کی مندرجہ ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:۔

"ابن عمرؓ سے روایت ہے اُن سے دریافت کیا گیا کہ آنحضرتؐ نے کتنے عمرے فرمائے؟ جواب دیا چار، جن میں سے ایک رجب کے مہینے میں تھا (احدھن فی رجب) سوال کرنے والا کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ اے اُمّ المومنین! کیا آپ نے نہیں سُنا کہ ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمرؓ) کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے جو عمرے کئے ان میں ایک رجب میں تھا، وہ بولیں، کہ ابوعبدالرحمٰن پر خدا رحم کرے، آنحضرتؐ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا، جس میں خود عبداللہ موجود نہ ہوں، اور آنحضرتؐ نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔[۵]"

عبداللہ بن عمرؓ کے اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک آنحضرتؐ نے کم سے کم ایک عمرہ رجب میں کیا تھا، جس میں بقول حضرت عائشہؓ عبداللہ بھی شریک تھے، اور ان کو شاہدِ عینی کا مرتبہ حاصل تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، روایات سے آنحضرتؐ کے کل چار عمرے ثابت ہوتے ہیں۔ جن میں ایک تو یہی عمرۂ حدیبیہ ہے۔ دوسرا عمرۃ القضا جو ٹھیک انھیں ایام میں ۷ھ میں ادا فرمایا تھا، تیسرا فتحِ مکہ کے بعد عمرۂ جعرانہ کے نام سے مشہور ہے جو متفقہ طور پر

---

[۱] طبری ۳/۱۵۷۔ [۲] ...بل للعمرۃ شہر رابع من الاشہر الحرم ھو رجب اکبر الاشہر الحرم فی الحرمۃ" نیز دیکھئے طبری ۳/۱۵۷ [۳] ابن عباس کہتے ہیں "کانوا یرون ان العمرۃ فی اشہر الحج من افجر الفجور فی الارض" (بخاری وجوب الحج، مسند، نیز دیکھئے بیہقی، سنن، ۴/۳۴۵ (باب العمرہ) [۴] بخاری حجۃ الوداع۔ [۵] بخاری تجرید ابواب العمرہ۔ نیز دیکھئے طبری ۳/۱۷۴!

ذیقعدہ کا واقعہ ہے اور چوتھا عمرہ حجۃ الوداع کے ساتھ ادا فرمایا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان چاروں عمروں میں دو عمرے یعنی عمرۂ جعرانہ اور عمرۂ حجۃ الوداع تو رجب میں ہو نہیں سکتے، اس لیے یا تو عمرۂ حُدیبیہ رجب میں ہوگا یا عمرۃ القضا جس کے لیے آنحضرتؐ حسبِ معاہدہ ٹھیک اُن ہی ایام میں عازم مکہ ہوئے تھے، جس میں عہد نامہ حُدیبیہ ہوا تھا۔

میری رائے میں عمرۂ حُدیبیہ تو رجب شروع ہونے سے کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے، لیکن عمرۃ القضاء ٹھیک رجب میں ادا کیا گیا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے جو اس کے رجب میں ہونے سے انکار کیا ہے، اس کی وجہ یہی مکّی اور مدنی تقویم کا فرق معلوم ہوتا ہے جو کہ انھوں نے نظر انداز فرما دیا۔

نوٹ :- بعض علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ صلح حُدیبیہ کے سال ایک سُورج گرہن بھی ہوا تھا، مگر افسوس ہے کہ اس کا صحیح مہینہ محفوظ نہیں، تاکہ اس روایت کی جانچ کی جا سکتی، البتہ اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ گرہن شاید واقعۂ حدیبیہ کے بعد ہوا تھا، کننگھم CUNNIGHAM نے ۱۰/ اپریل ۶۲۸ء کو ایک سُورج گرہن کا پتہ دیا ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ یہ حجاز میں نظر آسکتا تھا یا نہیں، علمائے ہیئت غور فرمائیں۔

(۶)

سنہ ۸/۷

	مکّی	جولین	مدنی	
۱۔ غزوۂ خیبر بروایت ابن اسحٰق ۲۔ وادی القریٰ	سنہ ۷ محرم ۳	۶/ اکتوبر ۶۲۸ء پنجشنبہ	جمادیٰ ۲	غزوہ خیبر بروایت واقدی ۲۔ سریہ زید بن حارثہ بجانب حسمیٰ
	صفر	۴/ نومبر جمعہ	رجب	
	ربیع ۱	۴/ دسمبر یکشنبہ	شعبان	
	ربیع ۲	۲/ جنوری ۶۲۹ء دوشنبہ	رمضان	
	جمادیٰ ۱	یکم فروری چہارشنبہ	شوّال	

مکی	جولین	مدنی	
جمادی ۲	۲ر مارچ، پنجشنبہ	ذلیقعدہ	عمرۃ القضا
رجب	۱ر اپریل، شنبہ	ذوالحجہ	دوشنبہ ۶ر ذلیقعدہ
شعبان	یکم رمئی۔ دوشنبہ	محرم سنہ ۸	
رمضان	۳۱ر مئی، چہارشنبہ	صفر	
شوال	۲۹ر جون پنجشنبہ	ربیع ۱	
ذلیقعدہ	۲۹ر جولائی، شنبہ	ربیع ۲	
ذوالحجہ	۲۷ر اگست، یکشنبہ	جمادی ۱	غزوۂ موتہ

سنہ ۷، ۸

۱۔ غزوۂ خیبر | برہان میں اس کی توقیت پر غور کیا جارہا ہے۔

۲۔ سریہ زید بن حارثہ | بجانب حسمیٰ: اس واقعے کے متعلق واقدی اور ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ جمادی الاخریٰ سنہ ۶ کا واقعہ ہے مگر غالباً اس کا تعلق سنہ ۷ سے ہے۔ کتاب میں اس کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

۳۔ عمرۃ القضا | اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ذیقعدہ سنہ ۷ کا واقعہ ہے، ابن حبیب نے اس کی تاریخ روانگی دوشنبہ ۶ر ذلیقعدہ سنہ ۷ بیان کی ہے جس میں صرف ایک روز کا فرق محسوس ہوتا ہے، کیونکہ موسمی صراحت کے اعتبار سے یہ ایام گرما کا واقعہ تھا، مدنی تقویم کے بموجب جمادی الاولیٰ اگست ستمبر سنہ ۶۲۹ء سے مطابق ہوتا ہے۔

غزوۂ خیبر

محرم سنہ ۷ ۔ جمادی سنہ ۷

صلح حدیبیہ کے بعد قریش کا فتنہ تو اس حد تک دب گیا تھا، لیکن یہودی سازشیں برابر جاری تھیں، مدینے سے جلاوطنی کے بعد بنو نضیر کے یہودیوں کی بڑی تعداد اگرچہ شام چلی گئی تھی، لیکن تمام سربرآوردہ خاندان خیبر ہی میں رہ پڑے

تھے[1] جہاں سے ان کی فتنہ پردازیاں ہنوز جاری تھیں۔ جنگِ خندق کا باعث بھی رؤسائے بنونضیر تھے، جنھوں نے ایک طرح اس پوری مہم کا انصرام کیا تھا[2] اور اسلام کے خلاف نہ صرف بنوغطفان اور بنوسلیم کو قریش کے دوش بدوش لاکھڑا کیا تھا، بلکہ دوسرے قبائلِ عرب میں بھی ایک حرکت پیدا کر دی تھی۔ بنوغطفان جو ان کے پرانے اتحادی تھے، ان کے اشارے سے مسلسل مسلمانوں کے خلاف اقدام کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ خیبر سے صرف تین دن پہلے غطفانیوں نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کیا تھا[3]۔

علاوہ ازیں سیاسی طور پر عرب کی یہ چھوٹی چھوٹی آزاد شہری مملکتیں CITY STATES ہر بڑی سلطنت کے قیام کے راستے میں ایک سنگِ گراں کا حکم رکھتی تھیں جن کو آہستہ آہستہ ہٹا دینا ضروری تھا، اگر دیکھا جائے تو اس سے عرب کی قدیم اور روایتی لامرکزیت اور آزادی تو ختم ہوتی تھی، لیکن اس کے ساتھ ایک عظیم بین الاقوامی مملکت کا تصور بھی پیدا ہوتا تھا، جو اسلام کی ان تمام مساعی کا انعام تھا، اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جوں ہی پیغمبر اسلامؐ کو قریش سے تھوڑی سی فرصت ملی، اسلام کی قوتِ عمل کا رُخ جنوب سے شمال کو ہو گیا، اس کا پہلا ظہور غزوۂ خیبر اور وادی القریٰ کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں اور دوسرا موتہ اور تبوک کی مہمات کی شکل میں جو روم کی عظیم سلطنت کے خلاف ابتدائی اقدامات کیے جا سکتے ہیں اور جہاں سے زوالِ روم کی داستان کی ابتدا ہوتی ہے۔

بہر حال آخر ۶ھ یا ابتدائے ۷ھ میں عین اس وقت جبکہ یہودیوں کے اتحادی بنوغطفان نے مدینے کی نواح پر حملہ کیا تھا، مسلمان فوجیں خیبر کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

غزوۂ خیبر کی تاریخوں میں بھی ویسا ہی اختلاف ہے جیسا دوسرے غزووں کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں اور جو قطعی طور پر دو دستاویزی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، امام مالکؒ کے نزدیک یہ واقعہ آخر ۶ھ کا ہے، جس کی تائید میں ابن حزم کا قول ملتا ہے۔ ابن اسحٰق نے اس کو محرم یعنی شروع ۷ھ کا واقعہ قرار دیا ہے[4]۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختلاف کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ جس واقعہ کی ابتدا آخر ۶ھ میں ہوئی ہو، وہ ۷ھ کے آغاز تک جاری رہ سکتا ہے، چنانچہ طبری نے اس غزوہ کا تذکرہ کیا تو ان الفاظ میں :-

"بعد ازاں آنحضرتؐ آخر ۶ھ میں محرم کے بقیہ مہینے میں خیبر پر فوج کشی کے لیے نکلے[5]۔"

جو بظاہر امام مالکؒ اور ابن اسحٰق کی تصریحات کا آمیزہ معلوم ہوتے ہیں، بہر حال اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ اس غزوے کی ابتدا ۶ھ میں ہو گئی تھی جس کی تکمیل ابن اسحٰق کے قول کے بموجب محرم بلکہ صفر ۷ھ میں ہوئی، اس خیال کی تصدیق کہ اس مہم کا آغاز ذوالحجہ میں ہو گیا تھا، بخاری کی تصریحات سے بھی ہوتی ہے، جس کو میں ابھی پیش کروں گا، بہر صورت امام مالکؒ، ابن حزم، ابن اسحٰق اور ان کے بعد ان کے جملہ متعلقین کے نزدیک غزوۂ خیبر کا زمانہ آخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر ذوالحجہ ۶ھ یا محرم ۷ھ میں یہ مہم شروع ہو گئی تھی۔ بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۷ھ[6] کا ہے گویا ۷ھ کے تقریباً وسط کا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس غزوے کے متعلق بھی دو ابتدائی دستاویزیں موجود تھیں جن میں سے ایک امام مالکؒ اور

---

[1] طبری ۳/ ۳۸ - ابن ہشام ۳/ ۴۱ ، البدایہ ۴/ ۶۲ ، [2] ابن ہشام ۳/ ۳۴۲ [3] دیکھیے بخاری باب غزوہ ذی قرد [4] طبری ۳/ ۷ ، [5] طبری ۳/ ۹۱ [6] واقدی ۲/ ۴ ۔

ابن اسحٰق کا ماخذ تھی، اور دوسری واقدی کا۔

واقدی کے نزدیک غزوۂ خیبر، صلح حدیبیہ سے تقریباً چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ جو تاریخی طور پر درست معلوم ہوتا ہے، بخلاف اس کے ابن اسحٰق کے نزدیک یہ واقعہ حدیبیہ سے صرف ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد کا ہے، جس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کو اس غزوے کی تاریخ "محرم ۷ھ" پہنچی تھی۔ حدیبیہ ذیقعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے، اس بنا پر اصولاً ان کو یہی نتیجہ نکالنا تھا۔ حالانکہ دو تقویمی نقطۂ نظر سے واقدی اور ابن اسحٰق کی روائتوں (یعنی محرم اور جمادیٰ) میں کوئی فرق یا بُعد نہیں۔

جدولِ تقویم پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۷ھ میں مکی ذوالحجہ اور مدنی جمادی الاول دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اور ان دونوں کی ابتداء ۶ ستمبر ۶۲۸ء کو ہوئی تھی۔ اس بناء پر ان دونوں ائمۂ سیرت کی دستاویزیں ایک ہی زمانے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں بلکہ واقدی کے بیان سے ابن اسحٰق کی اتنی تائید نہیں ہوتی جتنی امام مالکؒ کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ واقعہ آخر ۶ھ کا ہے۔ اوپر گذر چکا ہے[1] کہ خود ابن اسحٰق نے غزوۂ ذی قرد کو "جمادی الاولیٰ" کا واقعہ بیان کیا ہے جس کے متعلق بخاریؒ کی صراحت یہ ہے کہ :-

"یہ وہ غزوہ ہے جو خیبر سے تین دن پہلے آنحضرتؐ کی اونٹنیوں کو لوٹنے کے سلسلہ میں ہوا تھا[2]"

یہ گویا ابن اسحٰق کی طرف سے واقدی کی ایک طرح تائید ہے۔ کہ غزوۂ خیبر کا تعلق بھی جمادی سے تھا۔ قطع نظر اس سے خود موسمی اور اتفاقی شہادتیں بھی اس بات کے حق میں ہیں کہ غزوۂ خیبر صلح حدیبیہ (ذیقعدہ مطابق مارچ، اپریل) سے بہت بعد کا واقعہ ہے۔

تقریباً تمام سیرت کی کتابوں میں یہ روایتیں موجود ہیں کہ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ ہزارہا من خشک کھجوروں کے ذخائر لگے تھے[3]۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ نے حضرت صفیہ سے نکاح فرمایا تو اس کی دعوتِ ولیمہ میں حاضرین کے سامنے خشک کھجوریں (تمر) گھی اور پنیر پیش کیا گیا، خیبر کی سب سے قیمتی اور لذیذ پیداوار یہی کھجوریں تھیں جن کو گھی اور پنیر کے ساتھ ایک چمڑے کے دسترخوان پر ڈال دیا گیا تھا اور لوگ سیر ہو کر کھا رہے تھے[4]۔ اس سے قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ فتح خیبر کے زمانے میں کھجوروں کی فصل تھی اور یہ میوہ بافراط دستیاب ہو سکتا تھا، حجاز میں خشک کھجور کا موسم ستمبر، اکتوبر ہے۔ جو ۷ھ میں مکی محرم اور مدنی جمادیٰ کے بالکل مطابق تھا۔ چونکہ ان کھجوروں کے ساتھ گھی اور پنیر بھی پیش کیا گیا تھا جو صرف خشک کھجوروں کے ساتھ کھایا جاتا ہے، اس بناء پر ان کو تازہ، نورس یا گدر کھجوریں تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ابن اسحٰق کی اس بات کو اگر مان لیا جائے کہ غزوۂ خیبر صلح حدیبیہ کے متصل ہوا تھا، تو یہ دعوتِ ولیمہ مئی جون میں ہونا چاہیئے جو تازہ اور گدر کھجوروں کا زمانہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس غزوے میں دحیہ بن خلیفۃ الکلبی کی موجودگی ثابت ہے جن کو آنحضرتؐ نے اپریل ۶۲۸ء میں قیصر کے پاس سفارت پر بھیجا تھا، جہاں وہ کچھ عرصے قیصر کے انتظار میں رہے اور جب قیصر سے ملاقات ہو گئی تو واپس آئے۔

---

[1] یہ اشارہ ہے غزوۂ بنولحیان کی طرف جو اصل کتاب میں صراحت کے ساتھ لکھا گیا۔ [2] بخاری باب غزوۂ ذی قرد۔ [3] ابن ہشام ۳/۳۶۳

طبری ۳/- [4] IUN'R LHI 375

اس لیے ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ۶ جون کا نہیں ہو سکتا۔

سنہ ۸، ۹

	مکی	جولین	مدنی
	محرم ۸ھ	۲۶ر ستمبر ۶۲۹ء سہ شنبہ	جمادی ۲
	صفر	۲۵ر اکتوبر چہار شنبہ	رجب
	ربیع ۱	۲۴ر نومبر جمعہ	شعبان
	ربیع ۲	۲۳ر دسمبر شنبہ	رمضان
	جمادی ۱	۲۲ر جنوری ۶۳۰ء دو شنبہ	شوال
۱۔ سریہ عمرو بن عاص ذاتِ سلاسل	جمادی ۲	۲۰ر فروری سہ شنبہ	ذلیقعدہ
	رجب	۲۳ر مارچ پنجشنبہ	ذوالحجہ
	شعبان	۲۰ر اپریل جمعہ	محرم ۹ھ
۲۔ فتح مکہ روانگی چہار شنبہ ۱۰ر رمضان (ابن سعد) فتح مکہ جمعہ ۲۰ر رمضان	رمضان[1]	۲۰ر مئی یکشنبہ	صفر
۳۔ غزوۂ حنین شنبہ ۶ر شوال ۴۔ غزوۂ طائف	شوال	۱۸ر جون دو شنبہ	ربیع ۱
عمرۃ الجعرانہ۔ تاریخیں غلط	ذلیقعدہ	۱۸ر جولائی چہار شنبہ	ربیع ۲
	ذوالحجہ	۱۶ر اگست پنجشنبہ	جمادی ۱

[1] فتح مکہ کے زمانے تک رمضان موسم گرما ہی میں آ رہا تھا، یعنی مکی تقویم کے مطابق تھا۔

سنہ ۸، ۹

کتاب میں ۸ھ کے مندرجہ ذیل واقعات پیش کئے گئے ہیں :-

۱۔ سریۂ عمرو بن عاص، ذاتِ سلاسل اس سریہ کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ جمادی الآخری سنہ ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے بعد شام کے سرحدی علاقے کی طرف روانہ کیا گیا تھا جس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ غزوۂ موتہ سے صرف ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سریہ غزوۂ موتہ سے تقریباً چھ ماہ بعد مکی جمادی الاخریٰ میں روانہ کیا گیا تھا، کیونکہ اس سریہ کے زمانے میں اس بلا کی سردی تھی کہ ایک بار عمرو بن عاص صبح کو غسل تک نہ کر سکے تھے، مکی جمادی الاخریٰ فروری سنہ ۶۳۰ء کو شروع ہوا تھا۔

۲۔ فتح مکہ اس پر تفصیلی بحث بُرہان میں ملاحظہ ہو۔

۳۔ غزوۂ حُنین ابن سعد نے اس غزوے کی تاریخ روانگی ہفتہ ۶ شوال سنہ ۸ھ بیان کی ہے۔ جو مکی تقویم کے موجب بالکل صحیح بیٹھتی ہے، اس غزوے کا موسم بھی صحیح ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ غزوۂ طائف یہ واقعہ حُنین کے فوراً بعد کا ہے۔

۵۔ عمرۂ جِعِرّانہ ابن سعد نے اس واقعے کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ نہ مکی تقویم پر پوری اُترتی ہے نہ مدنی پر معلوم ہوتا ہے کہ مؤرخینِ اسلام کو کہیں سخت دھوکا ہوا ہے۔ کتاب میں اس پر بحث کی گئی ہے۔

فتح مکہ

(رمضان سنہ ۸ھ مکی)

فتح خیبر اور انضمام فدک و وادی القریٰ کے بعد اسلامی ریاست کی سیاسی برتری کے آثار واضح ہو چکے تھے اور اس کے مادی اور روحانی اثرات کا یہ عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سرحدیں خطرے میں پڑ چکی تھیں، گرد و پیش کے تقریباً تمام قبائل نے اسلامی فوقیت تسلیم کر لی تھی اور خود بخود اسلامی وفاق میں داخل ہوتے چلے جا رہے تھے، خود قریش کا سمجھ دار طبقہ مائل بہ اسلام تھا چنانچہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے شمشیر زن اور مدبّر مدینے پہنچ چکے تھے۔

مکّے کی "نیم مذہبی حکومت" روز بروز مائل بزوال تھی، اور اہلِ مکہ خوف، مایوسی اور تذبذب کی اذیتوں میں مبتلا تھے جس کو مسلمانوں کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اور یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر ۸ھ میں مسلمان فوجیں مکّے میں داخل نہ ہو جاتیں، تو جلد یا بدیر اہلِ مکہ طائف والوں کی طرح خود درخواستِ انضمام پیش کرتے، جنھوں نے ۹ھ میں بخوشی اپنی قسمتوں کو اسلام کے حوالے کر دیا تھا۔ بہرحال مورخین

فتحِ مکہ کی جو وجہ بیان کرتے ہیں، وہ یہ ہے:

معاہدۂ حدیبیہ کی رُو سے تمام قبائلِ عرب کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ جب پسند "اسلامی وفاق" میں داخل ہو جائیں یا قریش کے ساتھ رہیں، جس کے نتیجے میں بنو خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور بنو بکر نے قریش کی دوستی کو ترجیح دی تھی، ان دونوں قبائل میں پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی، جو اسلامی جنگوں کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے دب گئی تھی، صلح حدیبیہ کے بعد جب کچھ امن ہوا تو ۸ھ کے وسط میں یہ دشمنی پھر اُبھری اور جھگڑے شروع ہو گئے، جس میں قریش نے اسلحہ اور جنگی ساز و سامان دے کر بنو بکر کی حمایت کی اور بہت سے قریشی نوجوانوں نے رضاکارانہ جنگ میں حصہ لیا،[1] خزاعہ چونکہ اسلام کے اتحادی تھے۔ اور ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمے تھی۔ اس لیے حدیبیہ کا معاہدہ خود بخود ٹوٹ گیا اور مدینے سے اعلان کر دیا گیا کہ اب اس معاہدے کی کوئی قیمت نہیں، قریش کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے ابوسفیان کو تجدیدِ معاہدہ کے لیے مدینے بھیجا، مگر یہ مشن کامیاب نہ ہو سکا۔[2]

معاہدۂ حدیبیہ کی شکست غالباً اوائلِ رمضان ۸ھ میں ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات میں اس کی صدائے بازگشت موجود ہے:-

"اعلان براۃ ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان لوگوں کے لیے جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا، سو چار مہینے ملک میں چل پھر لو، اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور اللہ منکروں کو رسوا کرتا ہے۔[3]"

علمائے اسلام میں اختلاف ہے کہ یہ چار مہینے کون سے ہیں، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہاں رمضان ۸ھ سے لے کر ذوالحجہ ۸ھ تک کا زمانہ مراد ہے، اس لیے کہ اس سال حج باوجود اسلامی استیلاء کے مشرکین ہی کی زیرِ نگرانی ہوا تھا اور اس میں وہ تمام مراسم ادا ہوئے تھے، جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، مشرکین کا یہ آخری حج تھا۔ اس کے بعد پھر انھیں یہ اجازت نہ تھی کہ وہ داخلِ حرم ہو سکیں۔

"اور بے شک مشرک ناپاک ہیں، تو یہ لوگ اپنے اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے اندر نہ جائیں۔[4]"

اس آیت میں الفاظ "اپنے اس سال کے بعد (بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا) خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مہلت سالِ رواں کے اختتام تک کے لیے تھی، مکے پر فوج کشی رمضان میں ہوئی تھی اور اس رمضان سے چار ماہ بعد سال ختم ہو رہا تھا، اس لیے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں جو چار ماہ کی اجازت مذکور ہے اس سے کون سا زمانہ مراد ہے۔ نیز یہ کہ مکے پر حملہ "بھی" رمضان میں ہوا تھا۔

---

[1] طبری ۳/۱۱۱۔ ابن ہشام ۴/۳۲ نیز دیکھیے ابن سعد ۲/۹۷ [2] ابن ہشام ۴/۳۸۔ ابن سعد ۲/۹۷ [3] ۹ : ۱، ۲، میرا گمان ہے کہ یہ آیات فتحِ مکہ سے پہلے نازل ہو چکی تھیں جن میں معاہدۂ حدیبیہ کی شکست کا اعلان تھا، کیونکہ اس معاہدے کو توڑے بغیر مکے کے خلاف کسی قسم کی فوجی کارروائی ممکن نہ تھی۔ [4] ۹ : ۲۹

سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ ۱۰ رمضان ۸ھ کو جبکہ ہر مسلمان سپاہی روزہ دار تھا، مسلمانوں کی تقریباً دس ہزار فوج مدینے سے نکلی اور عازم مکہ ہوئی، ابن اسحٰق کا بیان ہے:

"اور آنحضرتؐ ۱۰ رمضان کو نکلے، تو آپؐ کا روزہ تھا، اور آپؐ کے ساتھ سب ساتھیوں کے روزے تھے، یہاں تک کہ "کدید" پہنچے، جو عسفان اور "امیح" کے درمیان ہے[۱]۔"

یہ فوج جب مکے میں داخل ہونے والی تھی تو مکے کے رئیس ابوسفیان نے جو عملی طور پر اس وقت پورے شہر کے واحد سربراہ تھے، اسلامی تفوق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا[۲]۔ اور اس طرح بلا کسی باضابطہ مزاحمت کے مشرکین عرب کا یہ سب سے بڑا قلعہ مسخر ہو گیا[۳]۔

فوجوں کے داخلے سے پہلے اعلان کر دیا گیا تھا کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے یا خود اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے، اس کو امن ہے[۴]۔

کسی شخص پر یہ پابندی نہ تھی کہ فوراً تبدیلِ مذہب کرے۔ صفوان بن اُمیہ کے سامنے جو ابوسفیان کے وزیر کا مرتبہ رکھتے تھے، جب اسلام پیش کیا گیا تو اُنھوں نے غور و فکر کے لیے مہلت مانگی، آپؐ نے فرمایا، "چار ماہ[۵]" یعنی وہی پورے سالِ رواں کی مہلت جو سب کو دی گئی تھی۔

کعبے کے اندر جو اوثان تھے، نکال دیئے گئے۔ باہر جو (۳۶۰) مورتیاں تھیں، توڑ ڈالی گئیں[۶]۔ لیکن باوجود اس کے کعبے کی تولیت اور حج کا انتظام حسبِ اعلان، مشرکین کے ہاتھ میں بجنسہٖ رہا، چنانچہ مورخین کہتے ہیں کہ اس سال حج پرانے مراسم ہی کے ساتھ ادا ہوا، طبری میں ہے:

"اور اس سال حج ان مراسم پر ہوا جن پر عرب کرتے چلے آئے تھے[۷]۔"

۱؎ ابن ہشام ۳/۴۳ - نیز دیکھئے ابن سعد ۲/۹۷، طبری ۳/۱۱۴ ۲؎ ابن ہشام ۴/۴۲، ۴۳، ۴۴ - ابن سعد ۲/۹۸، طبری ۳/۱۱۶ ۳؎ اہلِ مکہ اگر چاہتے تو مدافعت ممکن تھی اور مسلمان ایک طویل عرصے شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ مکے کے گرد اگرچہ فصیل نہ تھی، لیکن اس کے چو طرفہ چھوٹی بڑی پہاڑیاں کچھ اس طرح واقع ہیں کہ شہر ایک قلعہ بند وادی بن گیا ہے اور یہ پہاڑیاں فصیلِ شہر کا کام دیتی ہیں جن سے مدافعین ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہے۔

تاریخ میں اس شہر کے تین[۳] محاصرے، بہت مشہور رہیں، پہلا محاصرہ ظہورِ اسلام سے پہلے ابرہہ نے کیا تھا، جو ناکام رہا۔ دوسرا محاصرہ یزید بن ابی سفیان کے زمانے میں حصین بن نمیر نے کیا تھا، جو لگاتار چھ[۶] مہینے جاری رہا اور بالآخر کامیابی نہ ہو سکی، تیسرا محاصرہ عبدالملک کے زمانے میں حجاج بن یوسف نے کیا، یہ بھی چھ[۶] مہینے جاری رہا اور شامی سپاہ بدقت کامیاب ہو سکی، یہ تینوں محاصرے اعلیٰ ترین فوج نے بہترین اسلحہ کے ساتھ کئے تھے جن میں سے کم از کم آخری دو محاصروں میں مشینی اسلحہ یعنی منجنیقوں وغیرہ کا آزادانہ استعمال تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ فتح پیغمبرِ اسلامؐ کی اعلیٰ حکمتِ عملی، معاملہ فہمی، تالیفِ قلوب اور حالات کو اپنی موافقت میں تبدیل کر لینے کی عمدہ ترین صلاحیتوں کا نتیجہ تھی جس نے مکے کو بلا کسی شدید خوں ریزی کے ایک ہی دن میں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ ۴؎ طبری ۳/۱۱۶ بیہقی سنن ۹/۱۱۸ ۵؎ ابن ہشام ۴/۶۰ ۶؎ ابن ہشام ۴/۵۵، ۵۹، دیار بکری ۲/۸۵، ۸۶، ۷؎ طبری ۳/۱۳۹؛

معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری موسمِ حج تھا، جس میں بنو فقیم کے سردار نے مقامِ حجر پر کھڑے ہو کر اعلانِ "نسی" کیا اور آنے والے محرم کے بعد صفر اور محرم کے درمیان ایک نسی کا مہینہ بڑھا کر پرانی رسموں کو آخری بار ادا کیا تھا،

ابن اسحٰق، واقدی، اور دوسرے مصنفین اس غزوہ پر روانگی کی تاریخ ۱۰ رمضان سہ شنبہ بیان کرتے ہیں، ابن اسحٰق کا بیان اوپر گذر چکا ہے:

ابن سعد کے بیان کے موجب اس روز چہار شنبہ تھا، طبقات میں ہے:

"اور رسول اللہؐ چہار شنبہ کے دن دس رمضان کو عصر کے بعد روانہ ہوئے"[۱]

وسٹنفیلڈ کی قمری تقویم کے بموجب ۱۰ رمضان سہ شنبہ کو بجائے چہار شنبے کے دوشنبہ آتا ہے، اور روایات سے مطابقت نہیں کرتا، جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ رمضان قمری نہیں تھا، بلکہ مکی رمضان تھا، چنانچہ مکی رمضان یکشنبہ ۲ مئی ۶۳۰ء کو شروع ہوا تھا جس کے حساب سے ۱۰ کو سہ شنبہ آتا ہے، گویا ایک دن کا فرق جو قابلِ لحاظ نہیں، یہ مدینے سے روانگی کی تاریخ تھی، مگر ابن سعد نے تسخیرِ مکہ کی تاریخ بھی بیان کی ہے جو مکی تقویم کے اعتبار سے قطعاً صحیح ثابت ہوتی ہے۔ طبقات میں ہے:

"اور مکہ جمعے کے دن ۲۰ رمضان کو فتح ہوا، اور رسول اللہؐ نے وہاں پندرہ دن قیام فرمایا"[۲]

ابن اسحٰق نے بھی یہی تاریخ بیان کی ہے مگر اس میں جمعہ کا دن مذکور نہیں[۳] بہر صورت یہ تاریخ قطعاً درست ہے، کیونکہ یکم رمضان کو یکشنبہ ہوگا، تو ۲۰ کو جمعہ ہونا یقینی ہے، اس پر اتنا اضافہ اور کیجئے، کہ ابن سعد وغیرہ نے مکے میں قیام کی مدت پندرہ دن بیان کی ہے، جس کے حساب سے آنحضرتؐ کو ۶ شوال ہفتے کے دن غزوۂ حنین کے لیے نکلنا چاہیئے، چنانچہ مورخین نے حنین کو روانگی کی تاریخ یہی بیان کی ہے[۴] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جملہ تاریخیں پوری احتیاط کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں اور سب کی سب مکی تقویم کے اعتبار سے ریکارڈ کی گئی ہیں، اب ہمیں اس غزوے کے موسم پر نظر ڈالنا چاہیئے۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان فوجیں جب مدینے سے نکلی تھیں، تو روزہ دار تھیں، اور آنحضرتؐ نے مقامِ کدید یا قدید پر پہنچ کر افطار فرمایا تھا، اس کے کھلے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں دینی طور پر ہنوز مکی تقویم رائج تھی، اور اس کے مطابق فرائضِ مذہبی انجام پاتے تھے، اس بنا پر میرے نزدیک میور (MUIR) اور دوسرے مستشرقین کا یہ خیال درست نہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں رمضان کا مہینہ ہمیشہ موسمِ سرما ہی میں آتا تھا[۵] جس کی تائید میں ان کے پاس کوئی دستاویزی شہادت نہیں، بخلاف اس کے کتبِ سیرتؐ احادیث

---

[۱] ابن سعد ۲/۹۷ - [۲] ابن سعد ۲/۹۹، نیز دیکھیے دیار بکری ۲/۸۷ [۳] ابن ہشام ۴/۸۰ [۴] ابن سعد ۲/۱۲۱ [۵] میور کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:-

IT WAS WINTER WHEN THE FAST WAS ORDAINED AND MOHAMMED PROBABLY THEN CONTEMPLATED ITS BEMG ABUAYS KEPT IN THE SAME SEASON IN WHICH CASE THE PROHIBTION TO EAT OR DRINK DURING THE DAY WOULD NOT EVEN FOR A MONTH, HAVE INVOLVED ANY EXTREME HARDSHIP IN COURSE OF TIME, HOWEVER.

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ نمبر ۱۹۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

میں متعدد روایتیں ایسی موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہِ صیام ہمیشہ موسمِ گرما میں آتا، مستدرک حاکم میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ:

> "رسول اللہ ﷺ نمازِ مغرب سے پہلے "رطب" (یعنی تر رس کھجوروں) سے افطار فرماتے تھے، اگر "رطب" نہ ملتیں تو پھر "تمر" (یعنی خشک کھجوروں) سے، اور اگر یہ بھی میسر نہ ہوتیں تو صرف پانی کے گھونٹوں سے۔[1]"

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ میں "رمضان" ایسے ایام میں آتا جس میں تازہ کھجوریں (رطب) چل جاتی تھیں، لیکن اگر یہ نہ چلتیں، پھر خشک کھجوروں یا پانی پر اکتفا فرماتے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ حجاز میں رطب کا زمانہ جون، جولائی ہے، اس بناء پر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ رمضان کے مہینے اکثر و بیشتر انھیں ایام میں آتے، اور اگرچہ کبھی کبھی فصل پکنے میں دیر ہوتی تو اس وقت "تمر" سے افطار فرماتے۔

ماہِ رمضان کا ایامِ گرما سے متعلق از روئے روایات بدیہی ہے، چنانچہ ایک اور روایت ملاحظہ ہو: ابو درداء فرماتے ہیں:

> "ہم گرمی کے موسم میں نبی علیہ السّلام کے ساتھ کسی سفر میں تھے، گرمی کی یہ شدت تھی (کہ تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے) آدمی اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا، اس وجہ سے ہم لوگوں میں بجز نبی علیہ السلام اور ابن رواحہ کے اور کوئی روزے دار نہ تھا۔[2]"

معلوم نہیں کہ یہ کس سفر کا قصہ ہے بہر حال خاص فتحِ مکہ کا موسم مندرجہ ذیل روایات سے پوری طرح سامنے آجاتا ہے، جابر رضؓ سے ایک روایت یوں ہے:

> "رسول اللہ ﷺ رمضان کے مہینے میں ایک سفر فرما رہے تھے کہ آپ ﷺ کے ساتھیوں میں ایک شخص پر روزہ گراں گذرنے لگا تو گرمی کی وجہ سے اس کی سواری ایک درخت کے نیچے روک دی اور آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع کی، آپ ﷺ نے اس کو افطار کا حکم دیا، اور ایک برتن منگایا جس کو لے کر خود آپ ﷺ نے پانی پیا، اور لوگ دیکھ رہے تھے۔[3]"

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ نمبر ۱۹۰)

BY THE INTRODUCTION OF THE LUNAR YEAR, RAMADAN GRADULY SHIFTED TILL IT REACHED THE SUMMER SEASON; AND THEN THE PROHIBITION TO TASTE WATER FROM MORNING TELL EVENING BECAM'E A BURDIN HEAVY TO BEAR" MUIR LIFE 1929 193.

میور کی اس رائے کو پڑھیے اور ملاحظہ فرمائیے کہ محض تقویم کی گمشدگی کے باعث کس درجہ غلط تاریخی نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ [1] مستدرک حاکم ۱/۴۳۲

[2] بخاری کتاب الصوم۔ [3] مستدرک ۱/۴۳۳ نیز دیکھیے مسند ۵/۳۲۶۰۔

یہ واقعہ مقامِ کدید کا معلوم ہوتا ہے جس کے متعلق ابن عباسؓ کی روایت اس طرح ہے : فرماتے ہیں کہ :

"رسول اللہؐ فتح مکہ کے سال رمضان کے مہینے میں نکلے تو آپؐ کا روزہ تھا ، جب کدید پہنچے تو لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے ، آپؐ نے ایک برتن لیا اور اس سے پانی پیا[1] تاکہ لوگ بھی افطار کر لیں ۔

موطا میں اسی واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ جس سال مکہ فتح ہوا ، تو آپؐ نے اس سفر کے لیے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ نہ رکھیں اور فرمایا کہ دشمن کے مقابلہ میں قوی رہو ، مگر آنحضرتؐ نے خود روزہ رکھا ۔ ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ جس شخص نے مجھ سے یہ روایت بیان کی اُس نے بتایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو "عرج" میں دیکھا کہ آپؐ پیاس یا گرمی کی وجہ سے سر پر پانی بہا رہے تھے ، اس کے بعد رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ آپؐ کے روزے کی وجہ سے بہت سے آدمیوں نے روزے رکھ لیے ہیں ، تو جب آپؐ "کدید" پہنچے تو آپؐ نے ایک برتن منگایا اور پانی پیا ، اس پر اور لوگوں نے بھی روزے کھول لیے[2]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری روایت ابوبکر بن عبدالرحمنؒ نے مشہور صحابی ابوہریرہؓ سے لی تھی جو اس سفر میں بذاتہ پیغمبرِ اسلامؐ کے ہم رکاب تھے ، کیونکہ مستدرک میں اس روایت کا مندرجہ ذیل ٹکڑا انھیں کی سند سے بیان کیا گیا ہے :-

"میں نے رسول اللہؐ کو عرج میں دیکھا کہ آپؐ گرمی کی وجہ سے اپنے سر پر پانی بہا رہے تھے ، کیونکہ آپؐ روزے دار تھے[3]"

ان تمام روایات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نہ صرف عہدِ رسالتؐ میں ماہِ رمضان ہمیشہ موسمِ گرما میں آتا بلکہ فتحِ مکہ کا تعلق بھی شدید گرمائی زمانے سے تھا ۔

ان موسمی شہادتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم وسٹنفیلڈ کی تقویم پر نظر ڈالتے ہیں تو فصلی اعتبار سے بعد المشرقین نظر آتا ہے کیونکہ ان کی تقویم کے بموجب رمضان ۸ھ دسمبر اور جنوری کا متوازی مہینہ تھا ، یہاں یہ اور عرض کر دوں کہ نہ صرف وسٹنفیلڈ بلکہ میور کا زاویۂ نظر بھی یہی ہے حتیٰ کہ مولانا شبلیؒ نے جب اس غزوے کا تذکرہ کیا تو اُن کو بھی جلی عنوان سے "فتحِ مکہ رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء" لکھنا پڑا ۔

ظاہر ہے کہ ان تمام غلطیوں کی بنیادی وجہ صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ مورخینِ اسلام عرصۂ دراز سے مکی تقویم فراموش کر چکے تھے ۔

اس جدید نظریۂ تقویم کے بموجب رمضان ۸ھ مئی جون ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے ۔

---

[1] ابن سعد ۲/۱۰۰ [2] موطا ، ما جاء فی الصیام فی السفر ۔ [3] مستدرک ۱/۱۳۲

سنہ ۹، ۱۰

	مکّی	جولین	مدنی	
	محرّم	۱۵ ستمبر سنہ ۶۳۰ سہ شنبہ	جمادی ۲	
	محرم نسی صفر	۱۴ اکتوبر یکشنبہ	رجب	
	صفر	۱۳ نومبر سہ شنبہ	شعبان	
	ربیع ۱	۱۲ دسمبر چہار شنبہ	رمضان	
سریہ علقمہ بن مجزز	ربیع ۲	۱۱ جنوری سنہ ۶۳۱	شوّال	
	جمادی ۱	۹ فروری سہ شنبہ	ذلیقعدہ	
	جمادی ۲	۱۱ مارچ دوشنبہ	ذوالحجہ	حج اکبر، اعلان براءت فرض حج، تنسیخ تقویم
غزوۂ تبوک تاریخ روانگی دوشنبہ ۱ رجب بروایت ابن حبیب	رجب	۹ اپریل سہ شنبہ	محرم سنہ ۱۰	
	شعبان	۹ مئی پنجشنبہ	صفر	
واپسی از تبوک	رمضان	۷ جون جمعہ	ربیع ۱	
واپسی از تبوک بروایت ابن حبیب	شوّال	۷ جولائی یکشنبہ	ربیع ۲	
	ذلیقعدہ	۵ اگست دوشنبہ	جمادی ۱	
	ذوالحجہ	۴ ستمبر چہار شنبہ	جمادی ۲	

۹ھ ، ۱۰ھ

۹ھ کے صرف تین واقعات پر قلم اٹھایا گیا ہے جو ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

۱۔ سریہ علقمہ بن مجزز اس سریے کے متعلق صراحت ملتی ہے کہ یہ ربیع الآخر ۹ھ کا واقعہ تھا۔ روائتی تصریحات سے پتہ چلتا ہے، کہ سریہ کے دوران میں سپاہی تاپنے کے لیے الاؤ لگا لیتے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ واقعہ موسم سرما کا تھا، یہ تاریخ مکی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ربیع الآخر ۹ھ (مدنی) جولائی ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں مکی ربیع الآخر ۱۱ جنوری ۶۳۱ء کو شروع ہوا تھا۔

۲۔ حج ابوبکرؓ اس واقعے کی تاریخ ذیقعدہ ۹ھ بیان کی جاتی ہے جس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ غزوۂ تبوک کے بعد کا واقعہ ہے، لیکن دو تقویمی نقطۂ نظر سے یہ حج غزوۂ تبوک سے صرف ایک ماہ پہلے ہوا تھا، چنانچہ سورۂ براۃ میں اس واقعے کا تذکرہ یعنی اعلانِ براۃ، غزوۂ تبوک کے ذکر سے پہلے ہے۔ علاوہ ازیں عکرمہ نے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جب اس حج سے واپس آگئے تو پیغمبر اسلامؐ غزوۂ تبوک کے لیے نکلے تھے۔

۳۔ غزوۂ تبوک اس پر تفصیلی بحث برہان میں ملاحظہ ہو۔

غزوۂ تبوک

رجب مکی ۹ھ

غزوۂ موتہ میں رومیوں اور غسانیوں کی مشترکہ فوجوں نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا تھا، وہ اگرچہ کم نہ تھا لیکن "رومی عقاب" کی دور بیں نظریں صحرائے عرب کے انقلابی تموج کو بغور دیکھ رہی تھیں، اور غیر مطمئن تھیں، چنانچہ مدینے میں برابر اس قسم کی خبریں آرہی تھیں کہ شمالی پڑوسی کسی بڑے حملے کی تیاری میں مصروف ہیں، خود قیصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت حمص یا دمشق میں موجود تھا۔

حُنینؑ[1] کے مالِ غنیمت کا صحیح مصرف یہ تھا کہ اس کو مؤثر طور پر شمالی دشمن کے خلاف صرف کر دیا جائے جس کے لیے ایک بڑی فوج درکار تھی، اس لیے غالباً مدینے آتے ہی، آنحضرتؐ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ عام چندے کے اعلان کے ساتھ دوست اور نو معاہد قبائل سے رضاکاروں کی بھرتی شروع کر دی جائے۔

ابنِ اسحٰق اور واقدی کا بیان ہے کہ اس چندے میں حضرت عثمانؓ نے ایک ہزار اشرفیاں مع اس تجارتی مال کے جو شام

---

[1] غزوۂ حنین، اس غزوے سے صرف آٹھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔

جا رہا تھا۔ نذر کی تھیں، حضرت عمرؓ نے اپنے پورے سرمایہ کا نصف اور حضرت ابوبکرؓ نے جو کچھ حاضر تھا،[1] سب کا سب پیش کر دیا تھا، اس سے ہم دوسرے لوگوں کے عطیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

قبائل عرب نے بھی آپؐ کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اس کثرت سے شرکت کی درخواستیں آئیں کہ بار برداری کا تو ذکر کیا خود سپاہیوں کو سواریاں دینا ممکن نہ تھا۔[2] حتیٰ کہ شرکائے کے نام تک درجِ فہرست نہ ہو سکے۔[3]

مؤرخین کہتے ہیں کہ اس لشکر کی مجموعی تعداد تیس ہزار تھی،[4] جن میں دس ہزار گھوڑ سوار فوج کے دستے تھے۔[5] یہ تعداد اتنی بڑی تھی کہ غالباً سرزمینِ عرب نے اتنی عظیم فوج پہلے نہ دیکھی تھی، غور کیجئے کہ میدانِ بدر میں مسلمانوں کی تعداد لگ بھگ تین سو تھی لیکن اس سے صرف ساڑھے چھ سال بعد سو گنی ہو گئی، یعنی تیس ہزار۔

ماسوا اس کے ۸ھ میں حکومتِ مدینہ نے سرحدی قبائل کے دل جیت لینے کے لیے عمرو بن عاص کی سرکردگی میں جو مہم روانہ کی تھی، وہ بہمہ وجوہ کامیاب تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک پانچواں کالم ان قبائل میں بھی مرتب ہو چکا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کہ آنحضرتؐ جب تبوک پہنچے، تو رومی فوج کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس بناء پر آنحضرتؐ تبوک ہی میں رُک گئے اور یہیں سے مختلف مقامات پر چھوٹے بڑے دستے روانہ فرمائے جو سب کامیاب ہوئے، بحرِ سُرخ کی سب سے اہم بندرگاہ اس زمانے میں ایلہ (عقبہ) تھی۔ اس بندرگاہ کے حاکم نے معاہدے کے ذریعہ اسلامی دولتِ مشترکہ ((COMMON WEALTH)) سے وابستگی حاصل کر لی۔[6]

خالد بن ولید نے دومۃ الجندل جا کر اُکیدر کو جو وہاں کا فرمانروا تھا۔ گرفتار کیا اور پیغمبرِ اسلامؐ کے حضور میں پیش کر دیا۔[7] اس طرح پورے شمالی عرب نے پہلی بار اسلامی تفوق کی جھلک اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

اس غزوے کی تاریخ روانگی متفقہ طور پر رجب ۹ھ اور واپسی رمضان یا شوال ۹ھ بیان کی جاتی ہے اور اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی کے یہاں کچھ زیادہ تاریخی صراحت نہیں، لیکن ابن حبیب کے ماخذ نے اس کو بقیدِ یوم و تاریخ بیان کیا ہے:

"اور آنحضرتؐ اس کے لیے دوشنبے کے دن یکم رجب کو نکلے اور آخر شوال میں واپس ہوئے۔"[8]

وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب یہ رجب اکتوبر و نومبر کا متوازی مہینہ تھا، یعنی موسمِ سرما کے آغاز کا زمانہ جس کے حساب سے واپسی جنوری میں ہونا چاہیئے۔

سر ولیم میور (MUIR) اور مولانا شبلیؒ کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ میور نے اکتوبر[9] اور مولانا شبلیؒ نے "رجب ۹ھ مطابق نومبر"[10]

---

[1] ابن سعد ۲/۱۱۹ [2] قرآن [3] بخاری میں کعب بن مالک سے روایت ہے جو اس غزوے میں شریک نہ ہو سکے تھے کہ .... والمسلمون مع رسول اللہؐ کثیر" ولا یجمعھم کتاب حافظ" [4] یہ تخمینہ تھوڑا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ [5] ابن سعد ۲/۱۱۹۔ [6] MUIR LIFE P. 441, 442 [7] ابن سعد ۲/۱۲۰ [8] ابن حبیب/۱۱۵ [9] MUIR LIFE P. 439 [10] سیرۃ النبی ۱/۵۶۳

اس غزوے کی تاریخ روانگی قرار دی ہے۔ اس کے مقابلے میں سیرت کی جملہ روایتیں اس بات کے حق میں ہیں کہ اس غزوے کا موسم گرم تھا، کعب بن مالک رض کہتے ہیں :۔

"اور رسول اللہ صلعم نے یہ لشکر کشی سخت گرمی کے زمانے میں کی تھی"[1]

اور آگے چل کر مزید نشاندہی اس طرح کرتے ہیں :۔

"یہ غزوہ اس وقت ہوا، جب پھل اچھے ہو جاتے ہیں"[2]

ابن اسحٰق نے زہری وغیرہ کی سند سے اس کے موسمی نقشے کی تصویر اس طرح کھینچی ہے :۔

"اور یہ لوگوں کی تنگدستی اور خشک سالی کا زمانہ تھا اور شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ جب کہ پھل خوش آئند ہو جاتے ہیں اور لوگ اپنے باغوں اور سایہ کو پسند کرتے ہیں"[3]

قطع نظر ان روایات کے خود قرآن مجید نے منافقین کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ :۔

"گرمی میں نہ نکلو"[4]

جس کا جواب یہ دیا گیا کہ :۔

"جہنم کی آگ سب سے زیادہ گرم ہے"[5]

ان تمام موسمی شہادتوں سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مہم نومبر، دسمبر اور جنوری کے مہینوں کی ہرگز نہ تھی، بلکہ ایسے موسم کی تھی جس میں پھل اچھے ہو جاتے ہیں، گرمی میں تیزی اور شدت آ جاتی ہے، لوئیں چلنے لگتی ہیں اور درختوں کے سائے باعثِ تسکین ہو جاتے ہیں، غزوۂ تبوک کے "رجب" کو مذکورہ موسم کے مطابق ہونا چاہیئے۔

میری جدولوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال مکی رجب ۸ اپریل، مئی سنہ کے متوازی تھا جو روایتی موسم سے عین مطابق ہے۔

ابن حبیب نے اس غزوے کی تاریخ روانگی دوشنبہ یکم رجب بیان کی ہے، جو تقویمی حساب سے بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے، کیونکہ از روئے حساب یکم رجب سہ شنبہ کو شروع ہو رہا ہے، اور دوشنبے کی چاند رات تھی، مگر مجھے یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ایک تاریخ تیس ہزار فوج کی بیک وقت روانگی کی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے ابتدائی دستوں کی ہو گی، اس خیال کی تصدیق ابن سعد اور مواہب کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یوم خروج پنجشنبہ کا دن تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف دستے آگے پیچھے روانہ ہوتے رہتے تھے۔ آخر یہ بھی واضح کرنا ہے کہ حج ابوبکر جو میرے خیال کے مطابق اس سے ٹھیک پہلے مہینے میں ہوا تھا۔ حاجیانِ مدینہ کی تعداد کا اتنا کم ہونا نیز اس میں بجز ابوبکر رض اور علی رض کے کسی اور بڑی شخصیت کا نظر نہ آنا۔ شاید اس وجہ سے تھا کہ آنحضرت صلعم اپنے رفقاء کے اسی غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

---

[1] ابن ہشام ۴/۱۷۶، [2] ابن ہشام ۴/۱۷۶ [3] ابن ہشام ۴/۱۵۹ [4] لا تنفروا فی الحر [5] نار جہنم اشد حراً۔

	مکّی	عیسوی تاریخ و یوم	مدنی	
	محرم سنہ ۱۰	۲ر اکتوبر سنہ ۶۳۱ پنجشنبہ	رجب	
	صفر	۲ر نومبر شنبہ	شعبان	
	ربیع ۱	یکم دسمبر یکشنبہ	رمضان	۱۔ سریہ علی بن ابی طالب (یمن)
۲۔ سریہ خالد بن ولید یمن ۳۔ وفات ابراہیم بن رسول اللہ ۴۔ سورج گرہن ۲۷ر جنوری سنہ ۶۳۲	ربیع ۲	۳۱ر دسمبر سہ شنبہ	شوّال	
	جمادیٰ ۱	۲۹ر جنوری سنہ ۶۳۲ء چہار شنبہ	ذلیقعدہ	۵۔ حجۃ الوداع کے لیے روانگی شنبہ ۲۵ر ذلیقعدہ
	جمادیٰ ۲	۲۸ر فروری جمعہ	ذوالحجّہ	۶۔ حجۃ الوداع
	رجب	۲۹ر مارچ یکشنبہ	محرم سنہ ۱۱	
	شعبان	۲۸ر اپریل سہ شنبہ	صفر	۷۔ دوشنبہ ۲۸ر صفر جہاد روم کی تیاری کا حکم۔
	رمضان	۲۷ر مئی چہار شنبہ	ربیع ۱	۸۔ آخری خطبہ ہفتہ ۱۰ر ربیع الاوّل سنہ ۱۱ ۹۔ رحلت ۱۲ر ربیع الاوّل دوشنبہ
	شوّال	۲۶ر جون جمعہ	ربیع ۲	
	ذلیقعدہ	۲۵ر جولائی شنبہ	جمادیٰ ۱	
	ذوالحجّہ	۲۴ر اگست دوشنبہ	جمادیٰ ۲	

سنہ ۱۰، ۱۱

یہ سال سیرت رسول اللہؐ کا اختتامی باب ہے، اس میں مندرجہ ذیل واقعات پیش کیے گئے ہیں :

۱، ۲ - سریۂ علی بن ابی طالبؓ
سریۂ خالد بن ولید

کتب سیرت میں ان دونوں واقعات کی تاریخیں علیحدہ علیحدہ بیان کی گئی ہیں جن میں بعد المشرقین ہے، حضرت علیؓ کے متعلق مذکور ہے کہ ان کو رمضان سنہ ۱۰ میں یمن بھیجا گیا تھا، اور خالد بن ولید کے متعلق ربیع الآخر کی صراحت ملتی ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ خالدؓ کو جو ہدایات دی گئی تھیں، ان میں اس بات کو صاف کر دیا گیا تھا کہ اگر اس کی ملاقات حضرت علیؓ سے ہو جائے تو وہ پوری فوج کی امارت انھیں سونپ دیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں واقعے تقریباً باہم زمانہ تھے، چنانچہ مکی تقویم کے بموجب ربیع الآخر سنہ ۱۰ کا آغاز مدنی رمضان کے اختتام پر ہو رہا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ سریۂ خالد بن ولید کا ریکارڈ مکی تقویم کے بموجب ہوا تھا اور جناب امیر کے سریہ کا مدنی کلینڈر کے مطابق۔

۳ - وفاتِ ابراہیم اور سورج گرہن :- اس کی تاریخوں پر کتاب میں پوری بحث ہے۔

۴ - حجۃ الوداع :-

۵ - جیشِ اسامہ، اور رحلتِ رسول اللہؐ :-

حجّۃ الوداع

ذو الحجہ سنہ ۱۰ مدنی

فتح مکہ کے بعد حج کا انصرام مشرکینِ مکہ ہی کے ہاتھ میں برقرار رکھا گیا تھا، دوسرے سال ذیقعدہ قمری میں غزوۂ تبوک کے انتظامات درپیش تھے، جو حج سے زیادہ ضروری مسئلہ تھا، اس لیے پیغمبرِ اسلامؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیج دیا اور خود حج نہیں فرمایا۔ اس بنا پر ابھی ارکانِ حج کی تعلیم باقی تھی، قبائل عرب کو اسلام کی رُوح سمجھانا تھی، حکومتِ الٰہیہ کا اعلان ضروری تھا، تمام قدیم مفاخر نیست و نابود کرنا تھے، عورتوں، غلاموں اور بے مایہ مقروضوں کے ساتھ رحم و انصاف کی تعلیم اور ان کی داد رسی کا اعلان کرنا تھا،

بنا بریں قمری ذیقعدہ سنہ ۱۰ میں آپؐ نے خود حج کا ارادہ فرمایا، جس کو حجّۃ الوداع کہا جاتا ہے، اس کی تفصیلات تمام سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں، اس لیے میں یہاں صرف واقعہ کا وہ ضروری حصہ جس کا تعلق تقویم سے ہے پیش کروں گا۔

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ ۲۵ ذیقعدہ کو ہفتے کے دن مدینے سے روانہ ہوئے تھے۔[1] وسٹنفیلڈ نے ذیقعدہ سنہ ۱۰ کی پہلی تاریخ کو چہارشنبہ قرار دیا ہے، جس کی رُو سے ۲۵ کو ٹھیک ہفتہ ہی آتا ہے جو روایت کے عین مطابق ہے۔

---

[1] ابن سعد ۲/۱۲۴ ؛

جب یہ قافلہ مرّ الظہران پہنچا تو دوشنبہ تھا۔

"اور دوشنبے کے دن مرّ الظہران میں تھے کہ سورج سرف میں غروب ہوا[۱]"

ابن عباسؓ اور جابرؓ کی روایت کے مطابق یہ ذوالحجہ کی ۴ر تاریخ تھی، جابرؓ فرماتے ہیں :

"آنحضرتؐ ۴ر ذوالحجہ کو تشریف لائے[۲]"

عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے :۔

"اور آنحضرتؐ نے حج کی تہلیل فرمائی، تو آپؐ ۴ر ذوالحجہ کو تشریف لائے[۳]"

گویا دوشنبہ ۴ر ذوالحجہ کے مطابق تھا، وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب اگرچہ یہ دونوں بیانات صحیح ہیں، کیونکہ از روئے حساب ذوالحجہ ۱۰ھ کی پہلی تاریخ کو جمعہ تھا، اس لیے دوشنبے کو ذوالحجہ کی ۴ر تاریخ ہی ہونا چاہیئے، لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سال حج جمعہ کو ہوا تھا، یعنی جمعہ کے دن ۹ر تاریخ تھی، جس کی رُو سے دوشنبہ کو بجائے چار کے پانچ تاریخ ہونا چاہیئے، اس کے یہ معنی ہیں کہ مکہ معظمہ میں ذوالحجہ کا چاند ۲۹ رکو تسلیم کر کے بجائے جمعہ کے پنجشنبے کی پہلی تاریخ قرار دی گئی تھی اور حج اسی حساب سے ادا کیا گیا تھا[۴]، یہ ایک دن کا فرق ایسا نہیں جو قمری مہینوں میں نیا یا کوئی اہمیت رکھتا ہو ؛

حجۃ الوداع کی تاریخی عظمت اور اہمیت کی آئینہ دار اگر کوئی شے ہے تو وہ آنحضرتؐ کا خطبۂ حج ہے، جس کا ایک ایک لفظ عالم انسانیت کو نئی روشنی اور نیا درسِ حیات دیتا ہے، اس کے جستہ جستہ ٹکڑے کتبِ سیرت و احادیث میں موجود ہیں، جن میں سے مجھے صرف ایک حصّے کا یہاں تذکرہ کرنا ہے، جس کا تعلق تنسیخ تقویم سے تھا۔

مکی تقویم جو اجرام پرستی کا سرچشمہ بن گئی تھی، اگرچہ ۹ھ میں بذریعہ قرآن منسوخ ہو چکی تھی، لیکن آپؐ نے اپنے اس خطبے میں بھی اس کا ذکر فرمایا : اور "ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض" فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا :۔

"سال کے بارہ مہینے ہیں، جن میں چار مہینے قابلِ احترام ہیں، تین متواتر مہینے، ذلیقعدہ، ذوالحجہ اور محرّم اور چوتھا رجب مضر، جو جمادی اور شعبان کے درمیان میں ہے[۵]"

اِس ابتدائی جملے یعنی "ان الزمان قد استدار" کا مفہوم بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سال قمری شمسی دونوں تقویمیں ایک ہی نقطہ پر جمع ہو گئی تھیں، اور ذوالحجہ کا مہینہ دونوں حسابوں سے ایک ہی زمانے میں آ پڑا تھا، لیکن جیساکہ تحریر کیا

---

۱ ابن سعد ۲/ ۱۲۴ ۲ ابن سعد ۲/ ۱۲۶ ۳ ایضاً ۴ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے جن کو علمِ نجوم میں کافی دسترس تھی، اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نجومی حساب کی رُو سے ۹ر کو جمعہ نہیں پڑتا، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اس سال اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے ممکن ہے، کہ بے قاعدہ رویت ہوئی ہو، تاکہ پیغمبرِ اسلامؐ کا یہ حج جُمعہ کے مقدس دن میں ہو سکے، میری رائے میں یہاں یہ بحث کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ قمری مہینوں میں رویت قمر کا انحصار محض تسلیم اور عدم تسلیم پر ہے۔ ۵ بخاری تجرید کتاب بدالخلق۔

جا چکا ہے، یہ خیال غلط ہے۔

نقشۂ تقویم کو سامنے رکھ کر قمری محرم کو ملاحظہ فرمائیے، جو اس سال ۲۹ مارچ یعنی اعتدالِ ربیعی کے عین متصل شروع ہو رہا ہے، یہ بات مسلّمہ ہے کہ قدیم اہلِ بابل، اہلِ ایران اور شاید جزیرۂ عرب کے باشندے اور تمام باشندگانِ ہند اعتدالِ ربیعی سے سال کا آغاز کرتے تھے جس کا رواج ہندوستان میں آج تک چلا آ رہا ہے، یہودیوں کے مذہبی سنِ تقویم کا پہلا مہینہ "نیساں" بھی اسی نقطہ سے شروع ہوتا تھا، اور گمان غالب یہ ہے کہ قدیم عربوں میں بھی ایک سنہ کا آغاز اعتدالِ ربیعی سے کیا جاتا تھا جبکہ سورج برجِ حمل میں داخل ہوتا، کیونکہ عربوں کا بھی یہی خیال تھا کہ آفرینشِ عالم اعتدالِ ربیعی میں ہوئی تھی۔ ابنِ قتیبہ کا بیان ہے:

"اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اس وقت پیدا کیا جب کہ سورج برجِ حمل میں تھا اور زمانۂ اعتدال تھا۔ اور دن اور رات مساوی تھے۔ تو فصلوں کی ابتداء سیف سے ہوئی اور اسی کو لوگ فصلِ بہار کہتے ہیں۔ اور جب کبھی سورج برجِ حمل میں ہوتا ہے، تو اس سے دنیا کے لیے ایک سال گذر جاتا ہے"[1]

سنہ ۱۰ میں قمری محرّم گھوم پھر کر اسی نقطۂ اعتدالِ ربیعی پر آ گیا تھا اس لیے آنحضرتؐ کا یہ ارشاد: "ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض" اسی سنہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، اس سے یہ مُراد لینا کہ آنحضرتؐ کے نزدیک واقعی آسمان اور زمین کی تخلیق اسی زمانے میں ہوئی تھی، شدید ترین غلطی ہے اور اس سے بڑی غلطی یہ تصور ہے کہ اس زمانے میں شمسی اور قمری تقویم ایک ہو گئی تھی۔

جیشِ اُسامہؓ اور رحلتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

ربیع الاوّل سنہ ۱۱ مدنی

دس سال کی بے اندازہ جسمانی اور ذہنی کش مکش کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ نے نوعِ انسانی کے لیے اگرچہ ایک نئی زمین اور نئے آسمان کی تعمیر کر دی تھی، جس کے سایہ میں پورا عالمِ انسانیت سما سکتا تھا، لیکن اس کی دعوت پر ابھی صرف جزیرہ نمائے عرب نے لبیک کہا تھا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ دعوت دنیا کے کانوں تک پہنچی نہ تھی، لیکن ہر کام کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس دس سال میں اسلامی تحریک نے جو مقبولیت حاصل کی تھی وہ صرف جزیرہ نما تک محدود تھی مگر یہ قبولِ عام بھی ایسا نہ تھا جو دوسروں کو متاثر نہ کر سکے، صحرا کے ہر ذرہ میں ایک نئی چمک، نئی دمک اور نئی لگن اور تڑپ پیدا ہو گئی تھی، جو سب کو نظر آ رہی تھی۔

فتحِ خیبر کے بعد اسلامی ریاست کی سرحدیں دُنیا کی سب سے عظیم طاقت یعنی بازنطینی شہنشاہیت سے جا ملی تھیں، جس نے ابھی حال ہی میں تاجِ کیانی کو پارہ پارہ کر کے دُنیا کو دوبارہ اپنی عظمت کا یقین دلایا تھا، اس سلطنت کے کرتا دھرتا رگستانی سمندر کے جدید

---

[1] ابن قتیبہ کتاب الانواء / ۱۹ ؛ ۲۰

تموّج کو بنظرِ غائر دیکھ رہے تھے، چنانچہ ۷ھ کے اواخر میں خود قیصر اور قیصر کی پروردہ مصر و شام کی ریاستیں اسلامی سفارتوں کو باریاب کر کے اس کے وجود کو تسلیم کر چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اثر بڑی سُرعت سے شمال کی طرف بڑھ رہا تھا، کیونکہ مستبد طبقے کی عقلیں صرف اس وقت معطّل ہوتی ہیں، جب کوئی عظیم خطرہ سر پر منڈلاتے لگتا ہے۔ ۸ھ کی ابتداء میں حارث بن عمیر کو قتل کر کے جو اسلامی سفارت پر بلقاؔ گئے ہوئے تھے، اور ۹ھ میں فروہ بن عمر گورنر معان کو سولی دے کر جنھوں نے اعلانِ اسلام کر دیا تھا، رُومی کارپردازانِ حکومت نے کسی اچھے تدبر کا ثبوت نہیں دیا تھا، اور ان شہیدوں کے خون سے خود انھوں نے وہ شاہراہ تعمیر کر دی تھی، جس پر اسلامی فوجیں بہ آسانی گامزن ہو سکتی تھیں۔ بنا بریں ۸ھ میں غزوۂ موتہ اور ۹ھ میں غزوۂ تبوک دونوں مہموں کو رُومیوں کی اِسی بے عقلی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۰ھ کے موسمِ بہار کا بڑا حصّہ اگرچہ اِنصرامِ حج (حجۃ الوداع) میں صرف ہو چکا تھا، مگر مسلمان فوجیں تیار کھڑی تھیں کہ جہادِ روم پر جانے کا حکم کس وقت ملتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے دو ہی مہینے بعد اس کی تیاری کا بگل بج گیا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ صفر ۱۱ھ کے آخری ہفتے میں دوشنبے کے دن آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہادِ روم پر جانے کی تیاری کریں۔

"کہتے ہیں کہ جب دوشنبے کا دن آیا، اور صفر کی چار راتیں باقی تھیں، تو آنحضرتؐ نے جہادِ روم کی تیاری کا حکم دیا۔"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کے راوی اوّل کے ذہن میں دوشنبے کی ۲۷ر تاریخ تھی، لیکن وسٹنفیلڈ (WUSTENFELDS) کی تقویم کے بموجب دوشنبہ ۲۸ر کو پڑتا ہے،

اس سے صرف ایک دن بیچ یعنی چہارشنبہ کے روز یکایک پیغمبرِ اسلامؐ کی طبیعت ناساز ہونا شروع ہوئی، ابن سعد کا بیان ہے کہ:

"جب چہارشنبے کا دن آیا تو بخار اور دردِ سر کی ابتداء ہوئی۔"[2]

ابن سعد کے رواۃ کے نزدیک یہ چہارشنبہ ۲۹ صفر کو پڑتا تھا۔

"کہتے ہیں کہ چہارشنبے کے دن صفر کی دو راتیں باقی تھیں کہ اُمّ المومنین میمونہؓ کے مکان میں علالت شروع ہوئی۔"[3]

مگر جیسا کہ کہا جا چکا ہے، دوشنبے کی ۲۸ر تاریخ تھی، اس لیے چہارشنبے کی بجائے ۲۹ر کے ۳۰ر ہونا چاہیئے۔ یہ غالباً راوی کی حسابی غلطی ہے، بہرحال تمام رفقاء تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور جُرف میں فوج اکٹھی ہونا شروع ہو گئی۔ جو غالباً عہدِ رسالتؐ

---

[1] ابن سعد ۱۳۶/۲ [2] ایضاً [3] ابن سعد ۳/۳،

میں فوجی پڑاؤ تھا، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس پروگرام کو کسی طویل عرصے کے لیے ملتوی کر کے فوج کو چھٹی دے دی جائے، چنانچہ آنحضرتؐ نے دوسرے ہی دن یعنی پنجشنبے کے روز خود اپنے دستِ مبارک سے ایک پرچم تیار کیا اور اُسامہ بن زید کے سپرد کر کے قیادت اُن کے ہاتھ میں دے دی، طبقات میں ہے :-

"بعد ازاں جب پنجشنبے کی صبح ہوئی، تو خود آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اسامہ کے لیے جھنڈا باندھا[۱]"

وسٹنفیلڈ کی جدول کے بموجب یہ پنجشنبہ ۲ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے، لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ربیع الاوّل کا چاند بجائے ۳۰ کے ۲۹[۲] کو ہوا تھا، یا اہلِ مدینہ اس کو دیکھ نہ سکے تھے تو پنجشنبے کی پہلی تاریخ ہوگی جو روایت کے عین مطابق ہے۔

دوسرے پنجشنبے یعنی ۸ ربیع الاوّل سلہ (مطابق ۴ جون ۶۳۲ء) کو آپؐ کی طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی، تو آپؐ نے ایک تحریر لکھنا چاہی[۳]، لیکن بیماری کی شدت تھی، اور یہ کام نہ ہو سکا، اس عرصے میں طبیعت کبھی بگڑتی کبھی سنبھلتی۔

تمام اہلِ سیرت متفق ہیں کہ اسامہ کی نامزدگی پر لوگوں میں ویسی ہی سرگوشیاں شروع ہوگئی تھیں، جیسی ان کے باپ کی سرداری پر، اور کہنے والوں نے پھر یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اکابر صحابہ کی موجودگی میں ایک نوعمر شخص کو اتنی اہم فوج کی قیادت مناسب نہیں، تو آپ اسی بیماری کی حالت میں مسجد تشریف لائے اور خطبہ دیا، جس کا خلاصہ یہ ہے :

"لوگو! اسامہ کے لشکر کو بڑھاؤ، اور اس میں جا کر ملو، اگر تم اس کے امیر ہونے پر اعتراض کرتے ہو تو اس سے پہلے تم نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا اور بیشک اُسامہ ہر طرح سرداری کے لائق ہے، اور اس کا باپ بھی لائق تھا[۴]"

یہ واقعہ ۱۰ ربیع الاوّل (مطابق ۶ جون ۶۳۲ء) کا ہے، جب کہ مرض اپنی پوری شدت پر تھا، آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ یہ لشکر جلد از جلد روانہ ہو، چنانچہ اسی تاریخ کو اکثر صحابہ آنحضرتؐ سے رخصت ہو کر "جرف" کو روانہ ہوگئے جہاں لشکر پڑا تھا، ابن سعد کا بیان ہے :

"اور یہ واقعہ ہفتے کے دن ۱۰ ربیع الاوّل کا ہے کہ جو مسلمان اُسامہ کے ساتھ جانے والے تھے، آنحضرتؐ سے رخصت ہوئے[۵]"

---

[۱] ابن سعد ۲/۱۳۶

[۲] منجمین صرف حسابی صورت کے لیے محرّم کو اصولاً ۳۰ دن کا اور صفر کو ۲۹ کا شمار کرتے ہیں۔

[۳] ابن سعد ۳/۳۶،

[۴] ابن سعد ۳/۴۱۔

[۵] ابن سعد ۲/۱۳۶؛

"اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہفتے کے دن یعنی ۶ رجون ۶۳۲ء کو ربیع الاول کی ۱۰ تاریخ تھی، اور ربیع الاوّل کا چاند بجائے ۲۹ رکے ۳۰ رکا تسلیم کیا گیا تھا، کہتے ہیں کہ اسی روز مرض میں اور ترقی ہو گئی، اور آنحضرتؐ بے ہوش ہو گئے، یکشنبے کے دن مرض پوری شدت پر تھا: دوشنبے کے دن صبح کو طبیعت قدرے درست ہو گئی، آپؐ نے حجرہ کا پردہ اُٹھا کر دیکھا، تو لوگ نمازِ فجر میں مشغول تھے۔ یہ دیکھ کر آپؐ فرطِ مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے سمجھا، آپؐ باہر آنا چاہتے ہیں، قریب تھا کہ صفیں درہم برہم ہو جائیں، آپؐ نے اشارے سے روکا، یہ جمالِ اقدس کی آخری زیارت تھی، جو فدایانِ نبوت نے کی، جوں جوں دن چڑھتا گیا، حالت بگڑتی گئی، بار بار ہوش آتا اور بار بار غشی طاری ہو جاتی، آخر کار رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کا وقت آگیا، لبِ مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سُنے:۔

"نماز اور غلام[1]"

یہ واقعہ[2] ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو دوشنبے کے دن دوپہر کے بعد کا ہے (یعنی ۸ رجون ۶۳۲ء) کا، کہ اُسامہ کا پرچم جو جرف پہنچ چکا تھا، واپس آیا اور آستانۂ نبوت پر نصب کر دیا گیا۔

"صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا"

رحلتِ رسول اللہؐ کی توقیتی جدول

واقعات	مدنی	جولین
جہادِ روم کی تیاری کا حکم[3]	۲۸ رصفر ۱۱ھ، دوشنبہ ۲۹ ر " " سہ شنبہ	۲۵ رمئی ۶۳۲ء ۲۶ رمئی "

[1] ابن سعد ۱/ ۔ [2] نتوفی... حين زاغت الشمس يوم الاثنين لاثنى عشر ليلة خلت من شهر ربيع الاوّل۔ ابن سعد ۱۴/

پیغمبرِ اسلام کی تاریخِ وفات میں اگرچہ اختلاف ہے اور مؤرخین یکم ربیع الاوّل اور بعض ۲ رکو ترجیح دیتے ہیں، حتیٰ کہ واقدی کی کتاب المغازی میں بھی ۲ ر ربیع الاوّل مذکور ہے، لیکن واقدی کی مشہور تر روایت جس کو اکثر علماء نے قبول کیا ہے ۱۲ ر ربیع الاوّل ہے۔ اس تاریخ پر علماء کی ایک جماعتِ کثیر کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ شیعہ روایت بھی اسی کی تائید میں ملتی ہے۔ کلینی میں ہے: "ثم قبض لاثنى عشرة ليلة مضت من ربيع الاوّل يوم الاثنين (الواب التاريخ) اس سے قطع نظر دوشنبہ کا دن جو متفق علیہ ہے ۱۲ ر ربیع الاوّل کے علاوہ کسی اور تاریخ کو نہیں پڑتا۔ نہ یکم کو نہ ۲، مارگولتھ نے دوشنبے کی ۷ رجون قرار دی ہے جو غلط ہے دوشنبہ ۸ رجون ۶۳۲ء کو پڑتا ہے۔

[3] روایت میں ۲۷ تاریخ ہے، جو راوی کی حسابی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ MARGOLIOUTH RISE 471,

واقعات	مدنی	جولین
• علالت کی ابتداء[1]	۳۰ر صفر ۱۱ھ ، چہار شنبہ	۲۷ر مئی ۶۳۲ء
• پرچم سازی	یکم ربیع " پنجشنبہ	۲۸ر مئی "[2]
	۲ر " " جمعہ	۲۹ر " "
	۳ر " " ہفتہ	۳۰ر " "
	۴ر " " یکشنبہ	۳۱ر مئی "
	۵ر " " دوشنبہ	یکم جون "
	۶ر " " سہ شنبہ	۲ر " "
	۷ر " " چہارشنبہ	۳ر " "
• واقعۂ قرطاس	۸ر " " پنجشنبہ	۴ر " "
	۹ر " " جمعہ	۵ر " "
• آخری خطبہ	۱۰ر " " ہفتہ	۶ر " "
• مرض کی انتہائی شدت	۱۱ر " " یکشنبہ	۷ر جون ۶۳۲ء
• رحلت	۱۲ر ربیع الاوّل ۱۱ھ ، دوشنبہ	۸ر جون[3] ۶۳۲ء

۱؎ روایت میں ۲۹ تاریخ ہے جو راوی کی حسابی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۲؎ وسٹنفیلڈ کے حساب سے یہ پنجشنبہ (۲۹ر کا چاند مان کر) ۲ر ربیع الاوّل کو پڑتا ہے، لیکن اگر ۳۰ر کا چاند مان لیا جائے، یا یہ فرض کر لیا جائے کہ اہلِ مدینہ ۲۹ر کا چاند دیکھ نہ سکے تھے تو پنجشنبہ کی ٹھیک پہلی تاریخ ہوگی، جو روایات کے عین مطابق ہے۔

۳؎ بعض یورپی مصنّفین مثلاً مارگولتھ، ایچ، جی، ویلز H. G. WELLS وغیرہ نے تاریخِ رحلت ۷ر جون قرار دی ہے جو بالکل غلط ہے، کیونکہ دوشنبہ ۷ر کو نہیں بلکہ ۸ر جون کو پڑتا ہے۔

اَلرِّسَالَاتُ النَّبَوِیَّہ

یعنی

رسولِ اکرم فخرِ عالم و آدم محمدِ مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم

کے

منتخب مکتوبات و فرامین کا اردو متن

مع ترجمہ و مختصر حواشی

تحقیق

دکتور نثار احمد الفاروقی

اُستاذ مُشارِک

فی اللُّغۃ العربیۃ المعاصرۃ بجامعۃ دلہی ، الہند

۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء

فہرس

۴۱ - عمرو بن معبد الجهنی
۴۲ - بلال بن الحارث المزنی
۴۳ - بُدیل و بُسر و سرواتِ بنی عمرو
۴۴ - العداءٌ بن خالد بن ہوذۃ
۴۵ - مُسیلمۃ الکذاب
۴۶ - سلمۃ بن مالک
۴۷ - العباس بن مرداس السلمی
۴۸ - ہوذۃ بن نُبیشہ السلمی
۴۹ - الاَجب
۵۰ - راشد بن عبد السلمی
۵۱ - حرام بن عبد عوف
۵۲ - الزُبیر بن العوام
۵۳ - نُعیم بن مسعود
۵۴ - جمیل بن رزام العدوی
۵۵ - حصین بن نضلۃ الاسدی
۵۶ - بنی غفار
۵۷ - بنی ضمرۃ بن بکر
۵۸ - الہلال صاحب البحرین
۵۹ - اُسیبخت بن عبد اللہ
۶۰ - اہل ہجر
۶۱ - المنذر بن ساوی
۶۲ - المنذر بن ساوی
۶۳ - العلاءٌ بن الحضرمی
۶۴ - ضغاطر الاسقف
۶۵ - بنی جنبہ یہود مقنا
۶۶ - یُحنّہ بن رؤبۃ اور سرواتِ اہل ایلہ
۶۷ - جبل تہامہ کے گروہ بند
۶۸ - بنی غادیا
۶۹ - بنی عریض
۷۰ - بنی زہیر بن اُقیش
۷۱ - ابوظبیان الازدی
۷۲ - حبیب بن عمرو الغامدی
۷۳ - الولید بن جابر
۷۴ - سمعان بن عمرو بن قُریط
۷۵ - فروۃ بن عمرو الجذامی
۷۶ - بکر بن وائل
۷۷ - السُعیر بن عداءٌ
۷۸ - الحارث بن عبد کلال و نُعیم بن عبد کُلال والنعمان
۷۹ - عبد القیس
۸۰ - اقیالِ حضرموت
۸۱ - نُفاثہ بن فروۃ
۸۲ - مطرّف بن الکاہن
۸۳ - نہشل بن مالک
۸۴ - بنو ثقیف
۸۵ - سعید بن سُفیان الرعلی
۸۶ - عُتبہ بن فرقد
۸۷ - سلمۃ بن مالک
۸۸ - بنی خباب کلبی
۸۹ - مہری بن الابیض
۹۰ - خثعم
۹۱ - ثمامہ والحُدّان
۹۲ - بارق الازدی

۹۳ - وائل بن حُجر
۹۴ - اہل نجران
۹۵ - اُکیدر
۹۶ - یُحنّہ بن روبہ
۹۷ - اہل اُذرح
۹۸ - اہل جربا و آذرح
۹۹ - اہل مقنا

مُقدّمہ

تمہید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خطوط اور دستاویزات جو اب تک مختلف مصادر سے ہمیں ملتی ہیں اُن کی تعداد ڈھائی سو (۲۵۰) سے زیادہ ہے اور اُن کا متن حواشی کے ساتھ " الوثائق السیاسیہ" میں یک جا ملتا ہے دنیا کے تمام بانیانِ مذاہب میں یہ امتیاز بھی فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے کہ آپ کے مکتوبات کی کم از کم چار اصلیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ہمارے قدیم مورخ بھی بعض خطوط کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی شہادت دیتے ہیں۔ ایک خط اسپین کے عیسائی بادشاہوں کے قبضے میں تھا۔ ایک اور خط کے دیکھنے کا حال ابن فضل اللہ العمری نے کتاب مسالک الابصار میں لکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اصل مکتوب اسکاٹ لینڈ کے ایک مستشرق (D.M. DUNLOP) ساکن برائڈکرک کو فلسطین کے ایک پادری سے ملا تھا، اس کا عکس پہلے جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن (جنوری ۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا۔ اس خط کی جو روایات دوسری کتابوں میں (مثلاً الطبری ، ابن القیم ، قسطلانی اور قلقشندی) میں ملتی ہیں اُن میں بعض الفاظ کم و بیش ہیں۔ اس کی محققانہ بحث ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنے فاضلانہ مضمون میں کی ہے۔ اس خط کے جواب میں نجاشی مُلکِ حبشہ نے جو خط بھیجا تھا وہ بھی ابن اسحٰق اور طبری وغیرہ کے ہاں محفوظ ہے[1]۔

نجاشی کے نام رسالت مآبؐ کے مکتوب گرامی کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کہتے ہیں :

> " ابھی حال میں حبشی اطالوی جنگ کی ابتداء میں اخباروں نے (ہمدم نے مصر کے اخبار البلاغ سے اور اس نے ادیس بابا کے اخبار برہانِ اسلام سے نقل کر کے) یہ خبر شائع کی تھی کہ نجاشی نے اپنے خزانے سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ خط جو اب تک محفوظ ہے، نکال کر مسلمانوں کے ایک وفد کو دکھایا۔"[2]

قدیم روایات میں بھی یہی ملتا ہے کہ نجاشی نے اس خط کو ہاتھی دانت کے ایک ڈبّے میں مُہر بند کر کے ایک کنیز کو دے دیا تھا کہ وہ اسے

---

[1] دیکھو محمد حمید اللہ ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۲۹ - ۱۳۰

[2] ایضاً ص ۱۳۱

محفوظ کر دیئے لہ ڈنلاپ نے اس اصلی مکتوب کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں دمشق میں کسی شخص نے حبشہ کے ایک پادری سے خریدا تھا اور برٹش میوزیم وغیرہ کے ماہرین نے اس کی جانچ کر لی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اور خطوط پچھلی صدی میں دریافت ہوئے تھے۔ یہ خطوط مقوقس والیِ اسکندریہ اور المنذر بن ساوی کے نام ٹہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے "مکتوب نبوی بنام ہرقل" کی اصل فرانسیسی رسالہ ARABICA (۱۹۵۵ء) میں شائع کرایا تھا۔

المنذر بن ساوی گورنر بحرین کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دمشق کے قوتلی خاندان میں محفوظ ہے اور اس کی عبارت اس متن کے مطابق ہے جو صبح الاعشیٰ، زاد المعاد اور مواہب اللدنیہ جیسی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مکتوب، ۱۹۱۱ء میں خواجہ کمال الدین نے بچشمِ خود دیکھا تھا اور رسالہ اسلامک ریویو ووکنگ (۱۹۱۷ء) میں اس پر مضمون بھی لکھا تھا۔ مستشرق فلائشر (H.L.FLEISCHER) نے نہایت بودی دلیلوں کے ساتھ اِسے جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس خط کا اصلی ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

عیسائی مستشرقین اپنی بدنیتی سے کبھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف عربوں کے درمیان تبلیغ کرتے رہے اور انھوں نے دوسرے ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجے ہی نہیں، کبھی اِن واقعات کی تاریخوں پر شبہات وارد کرتے ہیں، کبھی کسی نام پر بحث کرتے ہیں کہ یہ نام نہیں تھا وہ تھا، کبھی دریافت شدہ اصل خطوط کو جعلی بتاتے ہیں اور یہ سب وہی حرکتیں ہیں جو عیسائی اور یہودی علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی کرتے رہے تھے یہاں تک کہ اپنی مذہبی کتابوں میں تحریف کرنے سے بھی باز نہیں آئے تہ اور مقصد صرف یہ کہ آپ کے دعویٰ رسالت کو

لہ فجعله فی حُقٍّ من عاجٍ وخَتَمَ علیه ودَفَعه إلی جاریته دیکھو:
FARUQI(N.A.): EARLY MUSLIM HISTORIOGRAPHY DELHI 1978, P.212.

ٹہ اس خط کا عکس پہلی بار جرمن رسالہ ZDMG ۱۸۶۳ء میں چھپا تھا۔

تہ طبقات ابن سعد ۱/۳۶۳ میں ہے:

عن سهل مولی عُتَیبه أنه كان نصرانیاً من أهل مریس وأنه كان یتیماً فی حجر أمه وعمه، وأنه كان یقرأ الانجیل، قال: فأخذت مصحفاً لعمّی فقرأته حتی مرّت بی ورقة فأنكرت كتابتها حین مرّت بی ومسستُها بیدی، قال، فنظرت فاذا فصول الورقة ملصق بغراء قال: ففتقتُها فوجدت فیها نعتَ محمد، صلی الله علیه وسلم، أنه لا قصیر ولا طویل، أبیض، ذو ضفیرین، بین كتفیه خاتم، یكثر الاحتباء ولا یقبل الصدقة ویركب الحمار والبعیر ویحتلب الشاة ویلبس قمیصاً مرقوعاً ومن فعل ذلك فقد برئ من الكبر وهو یفعل ذلك وهو من ذریة اسمعیل إسمه أحمد، قال سهل، فلمّا انتهیت الی هذا من ذكرِ محمد صلی الله علیه وسلم جاءَ عمّی فلمّا رأی الورقة ضربنی وقال: مالكَ وفتح هذه الورقة وقرأتها، فقلت فیها نعت النبی صلی الله علیه وسلم، احمد، فقال: إنه

(باقی اگلے صفحہ پر)

باطل ثابت کرسکیں۔ پچھلی صدی میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین خطوط اپنی اصل حالت میں دستیاب ہوئے اور ان کے چربے یا عکس بھی مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تب بھی ان مستشرق علمائے اپنا ہٹ دھرمی کا مسلک نہیں چھوڑا اور انہیں جھٹلاتے رہے۔ لیکن اب عربوں کی دولت نے یا مشرقِ وسطیٰ کی سیاست نے معیارِ علم و تحقیق کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ چار سال قبل رائٹر کے حوالے سے ایک خبر[1] ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لم یأتِ بعدُ۔"

(ترجمہ: سہل مولیٰ عُتیبہ سے روایت ہے کہ وہ عیسائی تھے مریس کے باشندوں میں سے۔ اور وہ یتیم تھے اس لیے اپنی ماں اور چچا کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے اور وہ انجیل پڑھا کرتے تھے۔ کہا: ایک دن میں نے اپنے چچا کی انجیل اٹھائی اور اسے پڑھنے لگا حتیٰ کہ ایک ورق پر پہنچا تو مجھے اس کی لکھاوٹ عجیب (بے جوڑ سی) لگی میں نے اُس ورق کو ہاتھوں سے چھوا، اب جو دیکھا تو وہ ورق لیئی سے چپکا دیے گئے تھے، میں نے اُسے علیحدہ کیا تو دیکھا کہ اس صفحہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت لکھی ہوئی ہے کہ ان کا قد میانہ ہوگا، رنگ گورا، دو گیسوؤں والے، کندھوں کے درمیان مُہرِ نبوت، بہت باحیا، صدقہ قبول نہیں کریں گے۔ گدھے اور گھوڑے کی سواری بے تکلف کریں گے، بکری دوہ لیں گے، پیوند لگی قمیص پہن لیں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے پاک ہوتا ہے اور وہ حضرت اسماعیل کی اولاد میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہوگا۔ سہیل کہتے ہیں جب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں یہاں تک پہنچا تو میرے چچا آ گئے انھوں نے وہ ورق پھٹا ہوا دیکھا تو مجھے مارا اور کہا کہ تو نے کیوں اسے اُدھیڑا اور کیوں پڑھا؟ میں نے کہا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔ چچا نے کہا کہ یہ نبی ابھی ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔)

[1] LETTER BY MOHAMMAD
FOUND GENUINE

AMMAN, APRIL 12 (RUTER).

A LETTER WRITTEN BY PROPHET MOHAMMAD TO A SEVENTH CENTURY BYZANTINE LEADER, HANDED DOWN TO JORDAN'S KING HUSSEIN BY HIS GRANDFATHER, HAS BEEN DECLARED GENUINE BY EXPERTS IN LONDON, THE KING ANNOUNCED.

THE LETTER, WRITTEN IN THE PROPHET'S OWN HAND ON GHAZELLE HIDE, CALLED ON EMPEROR HERECULIUS TO EMBRACE ISLAM.

THE KING SAID ON TELEVISION LAST NIGHT THAT IT WAS EXAMINED BY THE DEPARTMENT OF ORIENTAL MANUSCRIPTS AT THE BRITISH 'BRARY IN LONDON AND DECLARED GENUINE.

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہی مکتوب گرامی (بنام ہرقل) ہے جس کے لیے مستشرق کیتانی (مولف حولیاتِ اسلام) نے اوّل تو یہ زور لگایا تھا کہ اس طرح کی سفارت بھیجے جانے کے واقعے ہی کو سرے سے بے بنیاد ثابت کرے، پھر اس خط کے اصلی ہونے پر شک وشبہ کا اظہار کیا تھا۔ مگر "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" وہی برٹش میوزیم، اور وہی اس کے "ماہرین" جو مکتوب بنام "نجاشی" کو کسی قوی اور قطعی دلیل کے بغیر جعلی قرار دے رہے تھے، وہ اب ہرقل عظیم روم کے نام دریافت شدہ مکتوب نبوی کے اصلی ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف اگر انھیں کوئی ضعیف ترین یا جعلی عبارت بھی ملتی ہے تو اُسے خوب بڑھا چڑھا کر اور اہمیت دے کر پیش کرتے ہیں، لیکن جس چیز سے تاریخِ اسلام کے راویوں کی تصدیق وتائید ہوتی ہو اُس میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرنا ان کا خاص مشغلہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور مکتوب مبارک بنام کسریٰ پرویز بن ہرمز بھی اپنی اصلی حالت میں دریافت ہو چکا ہے[1] اس کی اطلاع مئی ۱۹۶۲ء میں تمام اخباروں میں آچکی ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد جو عربی مخطوطات کے مستند عالم اور محقق ہیں، اُنھوں نے اس مکتوب کا عکس بیروت کے روزنامہ الحیاۃ (۲۲-مئی ۱۹۶۳ء) میں چھاپا تھا۔ یہ خط بیروت کے سابق وزیرِ خارجہ ہنری فرعون نے دمشق میں ڈیڑھ سو اشرفی کے عوض خریدا تھا۔ یہ مکتوب مبارک بھی جھلّی پر لکھا ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط وفرامین کو محفوظ کرنے کا رجحان اسلامی تاریخ کے راویوں میں شروع ہی سے رہا ہے اس کے لیے یہاں صرف چند حوالے بطور نمونہ پیش کرنا کافی ہوگا:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہری بن الابیض کو جو دستاویز لکھ کر دی تھی اس کے بارے میں ابنِ سعد کہتا ہے:
فکتابه عندھم الی الیوم (آپ کا خط اُن لوگوں کے پاس آج تک موجود ہے)[2]

۲۔ نجاشی بادشاہ حبشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خطوط کو احتیاط سے محفوظ کرادیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

THE LETTER WILL BE KEPT AT AL-HASHEMIYAH PALACE NEAR AMMAN UNTIL A SPECIAL MOSQUE IS BUILT WHERE THE FAITHFUL WILL BE ALLOWED TO SEE IT BY THEMSELVES.

KING HUSSEIN'S FAMILY IS DECENDED FROM THE PROPHET.

(INDIAN EXPRESS, NEW DELHI. APRIL 13, 1977.)

[1] اس کے بارے میں تفصیل دیکھو: محمد حمید اللہ، "رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی" دارالاشاعت کراچی ۱۹۸۰ء

[2] طبقات ابنِ سعد ۱/۳۵۹

ودعا بحُقٍّ من عاج فجعل فيه كتابَي
رسول الله صلّى الله عليه وسلم
وقال : لن تزال الحبشة بخيرٍ ما كان
هذان الكتابان بين أظهرها[1]

اس نے ہاتھی دانت کا ایک صندوقچہ طلب کیا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خطوط رکھے اور کہا کہ جب تک یہ دونوں مقدس خطوط حبشہ میں محفوظ رہیں گے یہ ملک خیریت سے رہے گا۔

۳- ہشام بن محمد السائب الکلبی کی روایت ہے کہ اُس سے بنو بُحتر کے ایک شخص نے بیان کیا کہ الولید بن جابر بن ظالم بن حارثہ بن عتّاب بن ابی حارثہ بن جُدَی بن تَدُول بن بُحتر (قبیلہ بنو طے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے تھے وہاں اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک خط لکھ دیا۔

هو عند أهله بالجبلين[2]

وہ جبلین میں اُن کے خاندان والوں کے پاس موجود ہے۔

۴- الشُعیر بن عداء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دستاویز لکھ دی تھی وہ اس کے بیٹے نے ابن سعد کے سلسلۂ رواۃ میں یحییٰ بن سلمان کو دکھائی تھی۔

-عبد الله بن يحيىٰ بن سلمان قال : أرانى ابنٌ لِلشُعَير بن عدّاء كتاباً من رسول الله صلى الله عليه وسلم[3]

۵- الواقدی کا بیان ہے کہ اُس سے اہلِ دومۃ کے ایک شخص نے اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط دکھایا جو اُکیدر کو لکھا گیا تھا میں نے اُسے پڑھا اور اُسے نقل بھی کر لیا:

"حدثنى شيخ من أهل دومة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب لأكيدر هذا الكتاب وجاء فى بالكتاب فقرأته و أخذت منه نسخته"[4]

۶- الواقدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مکتوب مبارک بھی دیکھا تھا جو آپ نے اہلِ اذرح کے نام لکھا تھا۔

"ونسخت كتاب أهل أذرح فاذا فيه ....."[5]

۷- ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کو بنی عُقَیل کے ایک فرد نے اپنی قوم کے بڑے بوڑھوں کے حوالے سے بتایا کہ بنی عُقَیل کا وفد کہ مُطَرِّف بن عبد اللہ وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوئے تھے۔ آں حضرت نے سُرخ چمڑے پر ایک تحریر لکھ کر مُطَرِّف کو دی تھی اور یہ تحریر مُطَرِّف کے پاس تھی جس کی رُو سے اس قبیلے کے افراد کو العقیق میں

---

[1] طبقات ابنِ سعد ۱/۲۹۵ و ۱/۲۶۰
[2] ایضاً ۱/۲۸۰
[3] ایضاً ۱/۲۸۲
[4] الطبقات الکبیر ۱/۲۸۸
[5] ایضاً ۱/۲۹۰

جاگیر ملی تھی [1]

اسی طرح الرقاد بن عمرو بن ربیعہ کو آپ نے الفلج میں جاگیر دی تھی اور اس کے لیے ایک دستاویز لکھی تھی جو الکلبی کے وقت تک اُن لوگوں کے پاس محفوظ تھی [2]

۹۔ ہشام بن محمد بن السائب کلبی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس بن سلمہ کو جو خط لکھا تھا اس کی نقل میں نے حاصل کی تھی۔

"کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقیس بن سلمۃ کتاباً نسختہ" [3]

۱۰۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قیصرِ روم کے نام خط لکھا تو اصحاب نے کہا کہ جس خط پر مُہر نہ ہو اُسے یہ (ایرانی بادشاہ) نہیں پڑھتے، تب آپ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو بیضوی شکل کی تھی اس میں اوپر اللہ درمیان میں رسول اور نیچے کی سطر میں محمد لکھا ہوا تھا۔ آپ خطوط و فرامین پر یہی مُہر لگایا کرتے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ انگشتری سعید بن العاص حبشہ سے کندہ کرا کر لائے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ انگشتری خلفائے راشدین کے پاس محفوظ رہی۔ یہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ سے اریس کے کنوئیں میں گر گئی تھی اُنھوں نے اِسے تلاش کرانے میں بہت مبالغہ کیا۔ لیکن نہیں ملی۔ آخر انھوں نے اس کنوئیں ہی کو پٹوا دیا [4]

۱۱۔ ۱۴ ربیع الاوّل ۳ھ کو کعب بن الاشرف یہودی کے قتل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے جو معاہدہ کیا تھا وہ کاغذ بعد کو حضرت علیؓ کے پاس محفوظ تھا۔ [5]

وکان ذلک الکتاب مع علی رضی اللہ عنہ بعد۔

ان چند مثالوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات اور فرامین کو محفوظ رکھنے کا ابتدا سے اہتمام کیا گیا۔ ڈیڑھ ہزار برس کے تاریخی انقلابات کے باوجود آج بھی آپ کے چار مکتوب اپنی اوریجنل حالت میں دستیاب ہیں۔ متفرق کتب تاریخ وسیرۃ کے علاوہ مکتوبات و فرامینِ نبوی سے متعلق جو مستقل کتابیں تالیف ہوئیں اور اب دستیاب ہیں ان میں چند یہ ہیں:

۱۔ اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین (عربی): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات کا یہ مجموعہ ابن طولون نے مرتب کیا تھا اور دمشق سے شائع ہوا۔

۲۔ صبح الاعشی (عربی) القلقشندی جلد ششم

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۳۱۲ [2] ایضاً ۱/۳۰۲ [3] ایضاً ۱/۳۲۵

[4] اس کی تفصیل کے لیے میرا مضمون "ابن سعد اور طبقات ابن سعد" ملاحظہ ہو۔ [5] الطبقات الکبیر ۲/۳۱-۳۴

۳ - زاد المعاد (جلد سوم) مولفہ ابن القیم
۴ - المواہب اللدنیہ (جلد دوم) مولفہ القسطلانی
۵ - رسالات نبویہ (اردو) مولفہ عبد المنعم خاں - دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۳۳۹ء
۶ - بلاغ مبین (اردو) مولفہ محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی - ندوۃ المصنفین دہلی

(مطبوعہ خواجہ پریس دہلی)

۷ - مکتوبات نبوی (اردو) سید محبوب رضوی

ادارہ اسلامیات لاہور ۱۹۷۸ء

۸ - الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ (عربی) مولفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

یہ کتاب عہد نبوی کی دستاویزوں کے عربی متن پر مشتمل ہے اور ۱۹۴۲ء میں پہلی بار مصر سے شائع ہوئی - پھر اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں - اردو میں اس کا ترجمہ "سیاسی وثیقہ جات" کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے -

(۳)

جیسا کہ ہم نے ابتداً میں اشارہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (۲۵۰ سے زاید) مکاتیب اور وثائق مختلف مصادر میں ملتے ہیں اور یک جا سب سے زیادہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی قابلِ قدر کتاب الوثائق السیاسیہ میں دیے گئے ہیں - ہم نے یہاں خاص طور پر نقوش کے سیرۃ نمبر کے لیے ان میں سے بعض اہم خطوط اور دستاویزوں کا انتخاب کرکے اُن کا متن درج کر دیا ہے - بیشتر متون طبقات ابن سعد کے حوالے سے درج ہوئے ہیں - یہاں ان خطوط اور دستاویزوں کے اردو ترجمہ سے متعلق بھی دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں - "سیاسی وثیقہ جات" کے نام سے جو اُردو ترجمہ ان دستاویزوں کا مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں :

"اس کا اردو ترجمہ سیاسی وثیقہ جات کے نام سے کسی صاحب نے مجھے مسودہ بتائے بغیر طباعت اوّل کی اساس پر چھاپا ہے - بدقسمتی سے اصل کی ساری خصوصیتیں (مآخذ، اشاریہ وغیرہ) حذف کر دی گئی ہیں - ترجمے کی صحت کا بھی میں ذمہ دار نہیں ہوں -"

(رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۳۱۱)

دوسری کتاب سید محبوب رضوی کی مولفہ مکتوبات نبوی جو پہلے دیوبند سے پھر ادارہ اسلامیات لاہور سے چھپی ہے اس میں عربی متن نہیں ہے صرف ترجمہ دیا گیا ہے میں نے اس ترجمہ کا متن سے مقابلہ کیا تو مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ اکثر ناقص اور بعض مواقع پر گمراہ کن ہے اس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا - اس لیے میں نے از سرِ نو ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ کلاسیکی عربی ایک خاص انداز و اسلوب کی ہے اور معاملہ ایک ایسی عظیم شخصیت سے

نسبت کا ہے کہ ترجمہ مکمل احتیاط اور صحت کے ساتھ ہونا چاہیے اس کے لیے جو وقت درکار تھا وہ میرے پاس نہیں تھا اس کے لیے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہاں جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ ہر طرح قابلِ استناد ہے، لیکن اتنا کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مذکورہ بالا دونوں ترجموں سے قدرے بہتر اور زیادہ صحیح ہوگا۔

یکم ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ ——— نثار احمد فاروقی
شعبہ عربی
دہلی یونیورسٹی دہلی

الرِّسالاتُ النَّبوِیَّہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ذی الحجہ ۶ھ میں حدیبیہ سے واپس ہوئے تو آپ نے پڑوسی ملکوں کے چھ بادشاہوں کے نام خطوط لکھوائے۔ اصحاب نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! بادشاہ ایسے خطوط نہیں پڑھتے جن پر مُہر لگی ہوئی نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن چاندی کی ایک انگوٹھی تیار کرائی جس کا نگینہ بھی چاندی کا تھا اور اس پر تین سطروں میں محمد رسول اللہ اس طرح لکھوایا:



پھر خطوط کے آخر میں یہی مُہر لگائی اور ایک ہی دن میں چھ قاصدوں کو چھ خط دے کر مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔ یہ ابتدائے محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

ان قاصدوں میں سب وہ تھے جو اُس ملک کی زبان سے بھی واقف تھے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر جا رہے تھے[1]

۱۔ النَّجاشی کے نام

سب سے پہلے حضورؐ نے عَمرو بن امیۃ الضمری کو حبشہ کے فرمانروا النجاشی کی طرف روانہ کیا اور النجاشی کے نام دو خطوط لکھوائے، ایک میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور قرآن شریف کی آیات پیش کی تھیں۔

مَلکُ النجاشی نے حضورؐ کا نامۂ مبارک وصول کر کے آنکھوں سے لگایا اور از راہِ احترام اپنے تخت سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا[2]۔ پھر وہ ایمان لے آیا اور حق کی شہادت دی۔ اور کہا اگر مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی استطاعت ہوتی تو ضرور قدمبوس ہوتا۔

پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا جواب لکھا جس میں حضورؐ کی رسالت کی تصدیق کی اور جعفر بن ابی طالب کے

---

[1] ابنِ سعد ۱/۲۵۸

[2] کتاب الوفا ۲/۷۳۴، ۷۳۵ ۔ تاریخ الطبری ۲/۳۰-۳۱

ہاتھ پر اپنے اسلام کا اظہار کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نجاشی کے انتقال کی خبر آئی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ رنج و حُزن کیا اور اُس کی غائبانہ نمازِ جنازہ چار تکبیروں کے ساتھ پڑھی تھی۔ مسلم وغیرہ کی روایت ہے کہ یہ دُوسرا نجاشی تھا جس کی نماز پڑھی تھی۔

دُوسرے خط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے النجاشی کو حکم دیا تھا کہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان سے آپؐ کا عقد کر دے۔ ام حبیبہؓ اپنے شوہر عُبید اللہ بن جَحش الاسدی کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کر گئی تھیں ان کا شوہر وہاں جاکر عیسائی ہو گیا تھا اور مر گیا تھا۔ اس خط میں آں حضرتؐ نے یہ بھی حکم دیا کہ جو اصحاب ہجرت کر کے وہاں گئے ہیں انھیں سوار کرا کر واپس بھیج دے۔ النجاشی نے دونوں احکام کی تعمیل کی۔ اُمِ حبیبہ بنت ابی سفیان سے چار سو دینار مہر کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح کرا دیا اور مسلمانوں کو سفر کی تیاری کے لیے تمام ضروری سامان دے کر دو کشتیوں میں سوار کرا دیا۔ ان کے ساتھ عَمرو بن اُمیہ الضمری بھی تھے۔ (کتاب الوفا ۲/۷۳۶)

پھر اس نے ہاتھی دانت کا ایک ڈِبّہ طلب کیا اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خطوط حفاظت سے رکھ دیے اور یہ کہا کہ جب تک یہ دونوں خطوط ہمارے درمیان رہیں گے حبشہ تمام آفات سے محفوظ رہے گا۔ النجاشی کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب الطبری، ابن القیم، قسطلانی اور القلقشندی نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے۔ متن میں بعض الفاظ کم و بیش ہیں۔ اس کی بحث ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" میں ملے گی۔ یہ اصل خط دریافت ہو چکا ہے اور اس کے مطابق صحیح متن یہ ہے:

بسم الله الرحمٰن الرحيم

من محمد رسول الله الى النّجاشي عظيم الحبشه سلام على من اتّبع الهُدى امّا بعد فانّى أحمد اليك الله الّذى لا إلـه إلّا هو الملك القُدّوس السّلام المؤمن المهيمن وأشهد أنّ عيسٰى بن مريم روح الله وكلمته ألقاها الى مريم البتول الطّيّبة الحصينة فحملت بعيسٰى من روحه ونفخه كما خلق آدمَ بيده وإنّى أدعوك إلى الله وحده لاشريك له والموالاة على طاعته وان تتبعنى وتوقن بالّذى جاءنى، فانّى رسول الله وإنّى أدعوك وجنودكَ إلى الله عزّ وجلّ وقد بلّغتُ ونصحتُ فاقبل نصيحتى والسّلام على من اتّبع الهُدى[1]

الله
رسول
محمد

[نیز طبقات ابن سعد ۳/ ۱۵]

---

[1] اس خط میں بعض الفاظ کا املا غریب ہے اس کی بحث محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" ص ۱۲۸-۱۲۹ پر ملے گی۔

ترجمہ: [محمد رسول اللہ کی طرف سے النجاشی عظیم حبشہ کے نام۔ سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد میں تمھارے سامنے اس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ملک، قدّوس، سلام، مومن اور مہیمن ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہُوں کہ عیسٰی بن مریم روح اللہ ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے پاک عفت مآب مریم پر اِلقا کیا تو وہ اللہ کی روح اور اس کے نفخ سے عیسٰی سے حاملہ ہوئیں، جیسے اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور میں تمھیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلاتا ہُوں اور اسں کی طاعت پر دوستی کی طرف اگر تم میری پیروی کرو گے اور میرے پیغام پر یقین کرو گے تو میں اللہ کا رسول ہوں تمھیں اور تمھارے لشکر کو اللہ عزّ وجل کی طرف بلاتا ہوں میں نے تمھیں پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کر دی ہے پس میری خیر خواہی کو قبول کرو اور سلام ہو اسں پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔]

اسں خط کا نجاشی نے یہ جواب دیا:

إلى محمد رسول الله من النّجاشي سلامٌ عليك يا نبي الله ورحمة الله وبركاته الّذي لا إله الّا هو الّذي هداني الى الاسلام أمّا بعد فقد بلغني كتابك يا رسول الله فيما ذكرت من أمر عيسٰى فورب السّماءِ والارض إنّ عيسٰى عليه السّلام ما زاد على ما ذكرتَ ثفروقاً وإنّه كما قُلتَ وقد عرفنا ما بعثتَه إلينا وقدم ابنُ عمك وأصحابُه واشهد انّك رسول الله وقد بايعتكَ و بايعتُ ابن عمك وأسلمتُ على يديه لله رب العالمين وقد بعثت إليك يا بني وإن شئتَ أن آتيكَ فعلتُ يا رسول الله فانّي أشهد أنّ ما تقول حقٌّ والسّلام عليك ورحمة الله وبركاته۔ [الوفا ۲/۷۳۵]

ترجمہ: [محمد رسول اللہ کے نام نجاشی کی طرف سے۔ اے نبی اللہ! آپ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکات ہوں اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی طرف ہدایت دی ہے۔ اما بعد اے رسول اللہ آپ کا خط میرے پاس پہنچا آپ نے جو عیسٰی علیہ السلام کا ذکر کیا ہے تو آسمان اور زمین کے رب کی قسم عیسٰی علیہ السّلام نے بھی اُس پر ذرہ بھر زیادہ نہیں کیا اور وہ ایسے ہی ہیں جو آپ نے فرمایا آپ نے جو دعوت بھیجی ہے اسے ہم نے جان لیا آپ کے چچازاد بھائی اور ان کے ساتھی آئے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ میں نے آپ کی بیعت کی اور آپ کے چچازاد بھائی کے ہاتھ پر بیعت کی اللہ رب العالمین کے واسطے۔ میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں اور آپ حکم دیں تو میں خود بھی حاضر ہو سکتا ہوں میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سچ ہے۔ والسّلام]

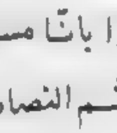
مورخین کہتے ہیں کہ النجاشی مسلمان ہو گیا تھا اور اس کے انتقال کی خبر ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسں کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی تھی۔ آپؐ نے نجاشی کو ایک اور خط کچھ تحفوں کے ساتھ بھیجا تھا جس کا متن ابن اسحٰق کے حوالے سے بیہقی وغیرہ نے

دیا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

هذا كتاب من محمد النبي الى النجاشي الأصحم عظيم الحبشة ۔ سلامٌ على من اتبع الهُدٰى وآمن بالله ورسوله و أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له لم يتخذ صاحبة ولا ولدًا و أن محمدًا عبدهٗ ورسوله و أدعوك بدعاية الاسلام فإني أنا رسوله فأسلم تسلم۔ يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواءٍ بيننا وبينكم ألا نعبدَ إلا الله ولا نُشركَ به شيئاً ولا يتخذَ بعضنا بعضاً أرباباً مِن دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون فإن أبيتَ فعليك إثم النصارى من قومك[۱]

یہ خط پیغمبر محمدؐ کا حبشیوں کے سردار نجاشی اصحم کے نام ہے سلامتی اس شخص کے لیے ہے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں، وُہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اس کی نہ بیوی ہے نہ بچّہ۔ اور یہ بھی کہ محمدؐ اسی کا بندہ اور رسول ہے۔ میں تجھے اسلام کے بُلاوے کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اُسی کا رسول ہوں۔ اسلام لا، تو سلامت رہے گا۔ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات پر ہم تم جمع ہو جائیں جو ہمارے درمیان مشترک ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پُوجا نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی آپس ہی میں سے کسی کو اللہ کے سوا معبود نہ بنائے اگر وُہ پلٹ جائیں تو کہہ دو کہ ہم تو مسلمان ہیں اور اگر تم انکار کرو گے تو تمام نصرانی قوم کا وبال تمہاری گردن پر رہے گا۔



۲۔ قیصرِ روم کے نام

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ بن خلیفہ الکلبی کو (جو اُن چھ قاصدوں میں سے ایک تھے) قیصرِ روم کی طرف اپنے نامۂ مبارک کے ساتھ بھیجا اور حکم دیا کہ یہ خط بُصریٰ[۲] کے حاکم کو دے دیں تاکہ وہ اِسے قیصرِ روم کے پاس بھجوا دے۔ اُس زمانے میں قیصر شہر حمص[۳] میں تھا۔ والیِ بُصریٰ نے وہ خط وہاں بھجوا دیا۔

---

۱ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۲۰ - ۱۲۱

۲ بُصریٰ شام میں دمشق کے اعمال میں سے ہے۔ [معجم البلدان ۱/۴۴۱ طبع بیروت دارصادر]

۳ حمص دمشق اور حلب کے درمیان نصف راہ پر واقع ہے۔

[معجم البلدان ۲/ ۳۰۲ - ۳۰۴]

اس کا سبب یہ تھا کہ قیصرِ روم نے ایک مَنّت مانی تھی کہ اگر روم کو ایران پر غلبہ حاصل ہو گیا تو وہ قسطنطنیہ[1] سے ایلیا[2] تک پا پیادہ زیارت کے لیے جائے گا۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ اپنی یہ نذر پُوری کر رہا تھا۔

قیصر نے آں حضرتؐ کا نامۂ مبارک پڑھا اور روم کے بڑے بڑے امراء جو اس کے ہم رکاب تھے انھیں حمص میں اپنی بارگاہ میں باریاب کیا اور کہا،

"اے اہلِ روم! کیا تم رُشد و فلاح چاہتے ہو تاکہ تمھارا ملک تمھارے لیے باقی رہے اور تم اس کی پیروی کرتے ہو جو عیسٰی بن مریم نے کہا ہے؟"

رومیوں نے کہا: جہاں پناہ! وہ کیا ہے؟

بادشاہ: کیا تم اُس نبیِ عربی کی پیروی کرو گے؟

اس پر وہ سب وحشی گدھوں کی طرح بدک گئے اور رینگنے لگے، اُنھوں نے صلیبیں بلند کرلیں۔ جب ھرقل نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو اُن کے اسلام لانے سے مایوس ہو گیا اور اُسے اُن کے سامنے اپنی جان اور اپنی سلطنت خطرے میں دکھائی دینے لگی۔ اس نے اِن اُمراء کو اطمینان دلایا اور کہا:

"میں نے جو کچھ تم سے کہا وہ صرف تمھاری آزمائش کے لیے تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اپنے دین میں کتنے پکے ہو۔ چنانچہ میں نے تمھیں ویسا ہی پایا جیسا میں چاہتا تھا۔"

یہ سُن کر وہ سب امراء سجدے میں گر پڑے۔[3]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنْ محمّدٍ عبدِ اللہ ورسولہٖ إلیٰ هِرَقْلَ عظیمِ الرُّوم سلامٌ علیٰ من اتّبع الهُدیٰ، امّا بعد فانّی أدعوك بدعایۃ الاسلام أسْلِم تَسْلَم یؤتك اللہ أجرَكَ مرّتَیْنِ فان تَوَلَّیْتَ فعلیك إثم الاریسیّین: ویَا أهْلَ الکتابِ تَعَالَوْا إلیٰ کَلِمَۃٍ سَواءٍ بیننا وبیْنکم الا نعبد إلّا اللہ ولا نُشْرِك بہٖ شیئًا ولا یتّخذ بعضُنا بعضًا أربابًا مِنْ دُونِ اللہ فانْ تولّوا فقولوا أشهدوا بأنا مسلمون۔" [کتاب الوفا ۲/۲۴ ـ الجامع الصحیح للبخاری]

ترجمہ: [اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمدؐ کی طرف سے ہرقل بادشاہ روم کی طرف سلام ہو اس پر

---

[1] بادشاہ روم کا مستقر آج کل استنبول کہلاتا ہے۔ [معجم البلدان ۴/۳۴۸]

[2] ایلیا، بیت المقدس (یروشلم) کا قدیم نام۔ ایلیاہ کے معنی ہیں بیت اللہ۔ [معجم البلدان ۱/۲۹۳-۲۹۴]

[3] طبقات ۱/۲۵۹ - کتاب الوفا لابن الجوزی ۲/۲۰، ۳۲،
محمد حمید اللہ: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۷۳-۱۷۸

جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد میں تمھیں اسلام لانے کی دعوت دیتا ہوں اسلام لے آؤ تو سلامت رہو گے اللہ تمھیں دوگنا اجر عطا فرمائے گا اور اگر روگردانی کرو گے تو اریسیوں کا گناہ بھی تمھارے سر ہوگا اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے کسی چیز کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کچھ لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو اختیار نہیں کریں گے، اگر وہ پلٹ جائیں تو تم کہہ دینا کہ گواہ رہو ہم مسلمان ہیں۔]

۲۔ کسریٰ بن ہرمز کے نام انھیں چھ قاصدوں میں سے ایک عبداللہ بن حذافہ بن قیس السہمی بھی تھے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط دے کر ایران کے شہنشاہ کسریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس خط میں کسریٰ کو اسلام کی دعوت دی تھی۔[۱]

عبداللہ بن حذافہ کا بیان ہے کہ میں نے اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دیا وہ اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ پھر اُس نے اُسے (پڑھنے والے کے ہاتھ سے) لے کر پھاڑ دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بات بیان ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ:

اَللّٰھُمَّ مَزِّقْ مُلْکَہٗ (اے اللہ! اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے)

کسریٰ نے یمن[۲] میں اپنے گورنر باذان کو لکھا کہ وہ اپنے پاس سے دو تگڑے آدمی اس شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس حجاز میں بھیج دے تاکہ وہ اسے گرفتار کر کے میرے پاس لے آئیں۔ چنانچہ باذان نے اپنے قہرمان[۳] کو اور ایک اور شخص کو بھیجا ان کے نام بانویہ اور خرخسرہ بتائے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ ایک خط بھی دیا۔ یہ مدینہ آئے اور باذان کا خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اسے دیکھ کر آں حضرت مسکرائے اور اُن دونوں کو اسلام لانے کی دعوت دی۔ اُس وقت اُن دونوں پر لرزہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِرْجِعَا عَنِّیْ یَوْمَکُمَا ھٰذَا حَتّٰی تَأْتِیَانِی الْغَدَ فَاُخْبِرُکُمَا بِمَا اُرِیْدُ۔[۴]

آج تو تم دونوں چلے جاؤ کل پھر میرے پاس آنا اُس وقت میں تمھیں بتاؤں گا کہ میرا ارادہ کیا ہے!

یہ دونوں اگلے دن آئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[۱] الوفا باحوال المصطفیٰ ۲/۳۲۷

[۲] معجم البلدان ۵/۴۴۷-۴۴۸

[۳] داخل خارج کا انچارج یا ٹیکس کلکٹر۔ اِس کا نام الطبری اور کتاب الوفا میں بانویہ بتایا گیا ہے۔

[۴] طبقات ۱/۲۶۰ کسریٰ بن ہرمز کے لیے دیکھو الطبری ۲/۱۷۶-۲۰۸

أَبْلِغَا صَاحِبَكُمَا أَنَّ رَبِّيْ قَدْ قَتَلَ رَبَّهٗ کِسْرٰی فِیْ هٰذِهِ اللَّیْلَةِ لِسَبْعِ سَاعَاتٍ مَضَتْ مِنْهَا۔

تم دونوں اپنے آقا تک یہ پیغام پہنچا دو کہ میرے رب نے اُس کے خداوند کسریٰ کو آج رات سات گھڑی گئے ہلاک کر دیا ہے۔

اور یہ منگل کی رات تھی۔ جمادی الاولیٰ کی دسویں یا تیرھویں تاریخ اور سنہ ۷ھ (۶۲۸ء)۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَ أَنَّ اللّٰہَ تبارکَ وتعالیٰ سلّطَ علیه ابنَهٗ شِیْرَوَیْهِ فَقَتَلَهٗ۔

اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا جس نے اسے قتل کر دیا۔

یہ سُن کر وہ دونوں باذان کے پاس آئے۔ وہ اسلام لے آیا اور دوسرے ابنائے فارس بھی جو یمن میں تھے مسلمان ہو گئے[۱]۔ نامۂ مبارک کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم[۲]

مِن محمد عبد اللہ و رسوله إلی کسری عظیم فارس سلامٌ علی من اتّبع الهدیٰ و اٰمن باللہ و رسوله و شهد أن لا إله إلّا اللہ وحدهٗ لا شریك له و أن محمداً عبدهٗ و رسوله۔ ادعوك بدعایة اللہ فانّی انا رسول اللہ إلی النّاس کافّةً لأُنذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین أسلم تسلم فان ابیته فانّما علیك إثم المجوس۔

اللہ
رسول
محمد

ترجمہ: [اللہ کے بندے اور رسول کی طرف سے کسریٰ عظیم فارس کے نام۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تمھیں اللہ کی دعوت

---

[۱] یہاں لفظ ابناء استعمال ہوا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آیا ہے جو فارسی نسل کے تھے اور اہلِ حبشہ کو وہاں سے نکالنے کے بعد یمن میں آباد ہو گئے تھے۔ سیر و مغازی کے مشہور راوی وہب بن منبّہ انھیں ابناء میں سے تھے۔ ان کے والد اسلام لائے تھے اور یہ ابناء اسی واقعہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

[۲] یہ متن اصل کے عکس سے لیا گیا ہے اور نہایت خفیف فرق کے ساتھ وہی ہے جو کتاب الوفاء (۲/۲۳۷) میں ملتا ہے۔ الطبری ۳/۹۰ میں اس کا متن قدرے مختلف ہے۔

کی طرف بلاتا ہوں کیونکہ میں اللہ کا رسول ہُوں جسے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ میں زندوں کو (آخرت سے) ڈراؤں، اور یہ بات کافروں پر بہت گراں ہے تم اسلام قبول کرو سلامت رہو گے اور اگر سرکشی کرو گے تو سارے آتش پرستوں کا عذاب تمھاری گردن پر ہوگا۔]

۴۔ مقوقس کے نام

اور حدیبیہ سے واپس آکر ذی قعدہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن ابی بلتعۃ اللخمی کو (جو اُن چھ قاصدوں میں سے ایک تھے) قبطیوں کے سردار اور اسکندریہ کے والی مقوقس کے پاس بھیجا اسے اسلام لانے کی دعوت دی تھی اور اس کے نام ایک خط تحریر فرمایا۔ جب اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچایا گیا، اس نے پڑھا اور کوئی کلمۂ خیر کہا اور خط کو لے کر ایک ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھ کر اسے سر بند کیا اور اپنی کنیز کے سپرد کر دیا۔ مگر ایمان نہیں لایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لکھا:

قَدْ عَلِمْتُ اَنَّ نَبِيًّا قَدْ بَقِیَ وَکُنْتُ اَظُنُّ اَنَّهٗ یَخْرُجُ بِالشَّامِ وَقَدْ اَکْرَمْتُ رَسُوْلَكَ وَبَعَثْتُ اِلَيْكَ بِجَارِيَتَيْنِ لَهُمَا مَکَانٌ فِی الْقِبْطِ عَظِيْمٌ وَقَدْ اَهْدَيْتُ لَكَ کِسْوَةً وَبَغْلَةً تَرْکَبُهَا۔[۲]

میں جانتا تھا کہ ایک نبی کی آمد ابھی باقی ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کرے گا۔ میں نے آپ کے قاصد کا اکرام کیا ہے اور اس کے ہمراہ آپ کے لیے دو ایسی باندیاں[۳] بھیج رہا ہوں جنھیں قبطیوں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ میں نے آپ کے لیے کچھ لباس اور ایک خچر بھی بطور ہدیہ بھیجا ہے[۴] جس پر آپ سواری فرمائیں۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ مقوقس نے چار باندیاں ہدیہ میں بھیجی تھیں۔

---

[۱] معجم البلدان ۱/۱۸۲-۱۸۹ ، الطبری ۴/۱۰۸ ، الوفا باحوال المصطفیٰ ۲/۱۷،

[۲] ابن سعد ۱/۲۶۰

[۳] ان دو کنیزوں میں ایک اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں، جن کے بطن مبارک سے حضرت ابراہیم بن محمدؐ بن عبداللہ پیدا ہوئے اور سولہ ماہ کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ ان کے انتقال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت دلگیر ہوئے تھے اور فرمایا تھا:

"انّ العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقك یا ابراہیم لمحزونون" (الوفا ۲/۶۴۱)

دوسری حضرت ماریہ کی بہن حضرت سیرین قبطیہ تھیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا تھا۔

[۴] یہ خچر سفید رنگ کا تھا اور اُس وقت تک عرب میں اس کے سوا کوئی خچر نہیں آیا تھا۔ اس کا نام دُلدُل تھا (ابن سعد ۱/۲۶۰)۔ یہ امیر معاویہ کے زمانے تک موجود تھا (کتاب الوفا ۲/۱۷)

اس کا جواب دیکھ کر آں حضرتؐ نے فرمایا:

ضَنَّ الْخَبِیْثُ بِمُلْکِہٖ وَلَا بَقَاءَ لِمُلْکِہٖ۔ (الوفا ۲/ ۷۱۷)

خبیث نے اپنی حکومت کی وجہ سے اپنا دامن بچایا اور اس کے ملک کو رہنا نہیں ہے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کہتے ہیں کہ اس نے ہماری خوب خاطر مدارات کی باریاب ہونے کے لیے ہمیں اس کے ڈیوڑھی پر زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑتا تھا مگر میں اس کے پاس پانچ دن سے زیادہ نہیں رہا۔

مقوقس کے نام اس خط کی اصل دریافت ہو چکی ہے، جس کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِن محمد عبدِ اللہِ و رسولہ إلیٰ مقوقس عظیم القبط سلامٌ علیٰ من اتّبع الھُدیٰ اما بعد: فإنّی أدعوکَ بدعایۃِ الإسلامِ فأسلم تَسلم یؤتِکَ اللہُ اجرکَ مرّتین فان تولّیت فعلیک اثمُ القبط۔ یا اھلَ الکتابِ تعالَوْا إلیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم ألّا نعبُدَ إلّا اللہَ ولا نُشرکَ بہٖ شیئاً ولا یتّخذَ بعضُنا بعضاً أرباباً من دونِ اللہِ فانْ تولّوا فقولوا اشھدوا بأنّا مسلمون[1]



[نیز مواہب اللدنیہ ۳/ ۲۴۷]

ترجمہ: [محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے مقوقس عظیم قبط کے نام۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ امّا بعد: میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ سلامت رہو گے اور اللہ تمھیں دوگنا اجر دے گا اور اگر روگردانی کرو گے تو قبطیوں کا عذاب تمھاری گردن پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پوجا نہیں کریں گے اور نہ اس کا شریک کسی کو ٹھہرائیں گے اور نہ ہم میں سے کچھ لوگ کچھ لوگوں کو اللہ کے برابر بنائیں گے۔ اگر وہ روگردانی کریں تو تم گواہی دو کہ ہم مسلمان ہیں۔]

۵۔ الحارث بن ابی شمر الغسانی کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شجاع بن وہب الاسدی کو (جو چھ قاصدوں میں سے ایک ہیں) الحارث بن ابی شمر

---

[1] اس خط کا عکس ایک تفصیلی بیان کے ساتھ فرنچ مستشرق REINAUD نے جرنال ایشیاٹک (۱۸۵۴ء) میں شائع کرایا تھا۔ اس مضمون کی تلخیص ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے دی ہے (رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۱۵۰ و بعد) اصل مکتوب سلطان عبدالمجید والیِ ترکی نے تین سو اشرفیوں میں خرید کر اپنے محل میں محفوظ کرایا تھا اور یہ اب ترکی کے توپ کاپی میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے۔

الغسانی[1] کے پاس بھیجا اُس کے نام ایک مکتوب مبارک دیا اور اُسے قبولِ اسلام کی دعوت دی۔

شجاع نے کہا جب میں اُس کے پاس پہنچا تو وہ دمشق[2] کے نخلستان میں تھا اور قیصر کو اپنا مہمان بنانے کے انتظامات میں مشغول تھا جو حمص سے ایلیا (بیت المقدس) آیا ہوا تھا۔ میں دو یا تین دن تک اس کی ڈیوڑھی پر ٹھہرا رہا پھر اس کے حاجب سے کہا:

میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قاصد ہوں جسے اُس کے پاس بھیجا گیا ہے۔"

حاجب نے کہا:

"تم اس سے ملاقات نہیں کر سکتے۔ مگر فلاں فلاں دن جب وہ برآمد ہوگا۔"

اُس حاجب نے، جس کا نام مُری تھا اور وہ رومی تھا، مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوالات کرنے شروع کیے۔ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا، اور یہ بتایا کہ وہ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں، تو وہ پگھل گیا حتیٰ کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بولا: میں انجیل پڑھتا ہوں اور میں نے اس پیغمبر کی یہی صفات اُس میں دیکھی ہیں، میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں، مگر مجھے الحارث سے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دے گا۔

اس نے میری بہت خاطر مدارات کی اور بہت اکرام کیا۔ ایک دن الحارث برآمد ہوا، مسند پر آکر بیٹھا اور تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔ اس وقت مجھے باریاب کیا گیا۔ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دیا۔ اس نے پڑھا اور پھینک دیا۔ پھر بولا: مجھ سے میرا ملک کون چھین سکتا ہے؟ میں اس کی طرف جاؤں گا، اگر وہ یمن میں بھی ہے تو وہیں پہنچوں گا۔ اسی طرح وہ اپنے جانے کا وقت متعین کرتا رہا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور حکم دیا کہ گھوڑوں کے نعل باندھے جائیں۔ پھر کہا: "اپنے آقا سے کہہ دینا جو کچھ تم نے دیکھا ہے۔"

پھر قیصر کو خط لکھا اُسے میرے آنے کے بارے میں اور اپنے جواب سے متعلق آگاہ کیا۔ قیصر نے اسے جواب میں لکھا:

"تم اس کی طرف مت جاؤ، اسے نظر انداز کر دو اور مجھ سے ایلیا میں آکر ملو۔"

جب قیصر کا جواب آیا تو مجھے پھر بلایا اور کہا:

"تم کب تک اپنے سردار کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے کہا: کل۔ پھر اس نے میرے لیے سو مثقال سونے کا حکم جاری کیا اور پھر مجھے مُری ملا اس نے میرے لیے زادِ راہ اور لباس کا حکم دیا اور کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا سلام کہنا۔"

میں جب آں حضرتؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کو آگاہ کیا تو فرمایا:

---

[1] کتاب الوفا باحوال المصطفیٰ لابن الجوزی ۲/ ۷۴۷، ۷۴۸۔

[2] معجم البلدان ۲/ ۴۶۳۔ ۴۷۰

بَادَ مُلْكُهٗ ۔ (اس کا ملک ویران ہوگیا)
جب میں نے مُرّی کا سلام عرض کیا اور اس کے بارے میں آں حضرتؐ کو بتایا تو فرمایا :
صَدَقَ ۔ (اُس نے سچ کہا)
الحارث بن ابی شمر نے عام الفتح میں انتقال کیا۔[1]

۶۔ ہَوذہ بن علی الحنفی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سَلیط بن عَمرو العامری کو (جو اُن چھ قاصدوں میں سے ایک ہیں) ہَوذہ بن علی الحنفی گورنر یمامہ کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے بھیجا اور ایک خط بھی دیا۔ یہ وہاں پہنچے اور باریاب ہوئے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا اور اُسے اِس طرح رَد کیا جسے رَد کرنا بھی نہیں کہہ سکتے اور رسول اللہؐ کو لکھا :

"کیا ہی اچھی بات ہے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دے رہے ہیں۔ میں اپنی قوم کا شاعر اور خطیب ہوں۔ عرب میرے مرتبہ سے مرعوب ہیں۔ مجھے آپ کوئی عہدہ دے دیجئے تو میں آپ کا پیرو ہوجاؤں۔"

پھر اس نے سَلیط بن عَمرو کو انعام دیا، خلعت پہنایا جو ہَجَر[2] کا بُنا ہوا تھا۔ وہ یہ سب چیزیں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور انھیں اس کی گفتگو سے مطلع کیا۔ آں حضرتؐ نے اس کا خط پڑھا اور فرمایا :

لَوْ سَأَلَنِیْ سِیَابَةً مِّنَ الْاَرْضِ مَا فَعَلْتُ بَادَ وَبَادَ مَافِیْ یَدَیْهِ۔	اگر وُہ مجھ سے ذرا سی بنجر زمین بھی مانگے تو میں نہیں دوں گا، وہ خود بھی تباہ ہوا اور جو کچھ اس کے قبضے میں ہے وُہ بھی گیا۔

جب آپؐ عام الفتح سے واپس ہوئے تو جبرئیل علیہ السلام آئے اور اُنھوں نے آپؐ کو بتایا کہ وُہ مرچکا ہے۔

۷۔ جَیفر و عَبد بنی الجُلَندَی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمرو بن العاص کو ذی قعدہ ۸ھ میں جَیفر اور عَبد بن الجُلَندَی[3] کے پاس عمان بھیجا۔ یہ دونوں قبیلہ ازد سے تھے، اور یہ دونوں اپنے باپ جَیفر بن الجلندی کی وفات کے بعد مشترک طور پر حکمران ہوئے تھے۔ ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی۔ عَمرو کے ہاتھ ان دونوں کے لیے ایک خط بھیجا اور اسے سربند کردیا۔

عَمرو نے بیان کیا، جب میں عُمان پہنچا تو میں نے عَبد سے ملنے کا ارادہ کیا وہ ان دونوں میں سب سے زیادہ بُردبار اور اچھے اخلاق والا تھا۔

---

[1] ابن سعد ۱/۲۶۱ - کتاب الوفا ۲/۷۴۷
[2] ہَجَر بروزن خبر معجم البُلدان ۵/۳۹۳ - الوفا باحوال المصطفیٰ ۲/۷۴۸ - تاریخ الطبری ۲/۶۴۴ - ۶۴۵
[3] الطبری ۳/۲۹ میں نام عَباد دیا گیا ہے۔ کتاب الوفا باحوال المصطفیٰ لابن الجوزی الجزء الثانی ص ۷۴۱

میں نے کہا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں جسے تمہارے پاس اور تمہارے بھائی کے پاس بھیجا گیا ہے"۔
اُس نے کہا: "میرا بھائی عمر میں مجھ سے بڑا اور ملک میں زیادہ حقدار ہے میں تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گا تاکہ وہ تمہارا خط پڑھ لے"۔

میں چند روز اُس کی ڈیوڑھی پر انتظار میں رہا۔ پھر اس نے مجھے بلایا، میں پہنچا اور سربند خط حوالے کیا۔ اُس نے لفافے کی مُہر توڑی اور خط کو آخر تک پڑھا، پھر اپنے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے بھی اُسی طرح آخر تک پڑھا، البتہ میں نے اُس کے بھائی کو اُس سے زیادہ نرم دل پایا۔ کہنے لگا:

"آج تو مجھے چھوڑ دو، کل میرے پاس آؤ"۔

اگلے دن میں گیا، بولا:

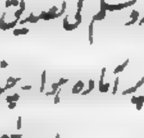
"تم نے جو مجھے دعوت دی ہے اس پر میں نے سوچ بچار کیا، اگر جو کچھ میرے پاس ہے وہ میں کسی شخص کے حوالے کردوں تو گویا میں عرب کا سب سے کمزور آدمی ہوں!"

میں نے کہا: "تو میں کل جا رہا ہوں"۔

جب اسے میرے جانے کا یقین ہو گیا تو صبح ہونے پر اس نے مجھے طلب کیا۔ میں آیا تو اس نے اور اس کے بھائی دونوں نے اسلام قبول کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔ میرے اور صدقہ (زکوٰۃ) کی وصولی کے احکام کے درمیان سے ہٹ گیا اور اگر کسی نے میری مخالفت کی تو میری مدد پر آمادہ ہوا۔ چنانچہ میں نے وہاں کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی اور فقرأ میں تقسیم کردی۔ میں اُس وقت تک وہاں مقیم رہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر وہاں پہنچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنْ محمدٍ رسول اللہ إلى جیفر وعبد ابنی الجلندی السّلام علیٰ من اتّبع الھُدیٰ
امّا بعد فانی أدعوکما بدعایۃ الاسلام أسلما تسلما فانی رسول اللہ الی النّاس کافّۃً
لأُنذر من کان حیًّا و یحقّ القول علی الکافرین و أنکما ان أقررتما بالاسلام ولیتکما وان
أبَیْتُما أن تقرّا بالاسلام فان مُلکُما زائلٌ وخیلی تحلّ بساحتکما و تظھر نبوّتی علی ملکما۔
وکتب أُبی بن کعب۔



ترجمہ: [اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے الجلندی کے دونوں بیٹوں جیفر اور عبد کی طرف۔ سلام ہو اُس پر جو

لہ اس خط کا متن القلقشندی، قسطلانی وغیرہ کے ہاں ملتا ہے ۔ اور ہم نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" (ص ۲۴۲) سے لیا ہے۔

ہدایت کی پیروی کرتا ہے اما بعد میں تم دونوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لے آؤ سلامت رہو گے کیونکہ میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں تاکہ سب زندوں کو (آخرت سے) ڈراؤں اور یہ بات کافروں کو بہت ہی ناگوار ہوتی ہے۔ تم دونوں اگر اسلام کا اقرار کر لو گے تو میں تمھیں (بدستور) والی بنائے رکھوں گا اور نافرمانی کرو گے تو تمھارا ملک ہاتھوں سے جانے والا ہے۔ میرے گھوڑے تمھارے صحن کو روندیں گے اور میری نبوت تمھارے ملک پر غالب ہو کر رہے گی۔]

۸۔ المُنذِر بن ساوی العبدی

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جِعرّانہ[1] سے واپس آتے ہوئے العلاء بن الحضرمی کو ایرانی حکومت کے گورنر المُنذِر بن سَاوی العبدی کے پاس بحرَین[2] میں بھیجا۔ اسے اسلام کی دعوت دی اور ایک خط لکھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مِن محمد النبی رسول اللہ إلی المُنذِر بن ساوَی۔ سلامٌ علیك فانّی احمدُ إلیك اللہ الذی لا إلہ الا ھو، اما بعد، فان کتابكَ جاءَنی و رُسُلكَ و إنّہ من صَلّی صلاتنا واُکل ذبیحتنا واستقبل قِبلتنا فانّہٗ مُسلمٌ، لہٗ ما للمسلمین وعلیہ ما علی المسلمین ومن اُبی فعلیہ الجزیۃ۔

[الطبری ۳/۲۹ طبع مصر تحقیق ابو الفضل ابراہیم]

ترجمہ: [محمد نبی رسول اللہ کی جانب سے المنذر بن ساوی کے نام۔ سلامٌ علیک۔ میں تم سے اُس اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اما بعد تمھارا خط اور تمھارے قاصد آئے۔ جس نے ہماری نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا وہ مسلمان ہے اور اُس کے وہی حقوق و فرائض ہیں جو مسلمانوں کے ہیں، اور جس نے انکار کیا اُسے جزیہ دینا ہوگا]

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب میں اپنے اسلام لانے اور رسالت کی تصدیق کرنے کا حال لکھا:

وإنِّی قَدْ قَرَأتُ کِتَابكَ عَلٰی اَھْلِ	میں نے آپ کا خط ہَجَر والوں کو پڑھ کر سنایا
هَجَر فَمِنھُمْ مَنْ اَحَبَّ الْاِسْلَامَ وَ	ان میں کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اسلام کو پسند کیا
اَعْجَبَہٗ وَ دَخَلَ فِیْہِ وَمِنھُم مَنْ	اس سے محبت کی اور اس میں داخل ہو گئے اور کچھ

---

[1] اہل الحدیث اسے جیم اور عین پر زیر اور راء پر تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اہل الادب عین ساکن اور راء خفیف کے ساتھ (جِعرَانَہ) معجم البلدان ۲/۱۴۲ (دار صادر - بیروت)

[2] معجم البلدان ۱/۳۴۶ - ۳۴۸

كَرِهَهُ وَ بِأَرْضِي مجوس ويهود فأحدِثْ إِلَيَّ فِي ذٰلِكَ أَمْرَكَ ۔

ایسے تھے جنھیں یہ ناگوار ہوا ۔ میری سرزمین میں مجوس اور یہودی بھی ہیں ۔ ان کے بارے میں آپ اپنا حکم مجھے لکھ کر بھیجیے ۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا :

"إِنَّكَ مَهْمَا تُصْلِحْ فَلَنْ نَعْزِلَكَ عَنْ عَمَلِكَ وَمَنْ أَقَامَ عَلَى يَهُودِيَّةٍ أَوْ مَجُوسِيَّةٍ فَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ ۔"

(تم جب تک ٹھیک رہو گے ہم تمھیں گورنری سے معزول نہیں کریں گے ۔ اور جو یہودیت یا مجوسیت پر قایم رہنا چاہے گا اس پر جزیہ عائد ہو گا]

۹ ۔ اہلِ ہجر کے نام اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں کو خط لکھا اور اسلام کی دعوت دی ۔ اگر وہ انکار کریں تو اُن سے جزیہ لیا جائے اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے اور ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمی کے ساتھ ابو ہریرہؓ کو بھیجا تھا اور وصیت فرمائی تھی کہ وہ مؤخرالذکر کے ساتھ اچھا سلوک کریں ۔

فرائض صدقات : اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمی کو اونٹوں ، گایوں ، بکریوں ، پھلوں اور دوسرے اموال کے بارے میں (زکوٰۃ کی شرح کے) فرائض لکھ کر دیے تھے ۔ چنانچہ العلاء نے وہ خط لوگوں کو پڑھ کر سُنایا اور ان سے صدقات وصول کیے ۔

۱۰ ۔ اہلِ یمن کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کے لیے ایک خط لکھا تھا جس میں انھیں شرائع اسلام کی خبر دی تھی اور جانوروں اور اموال میں زکوٰۃ کی شرح بتائی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ آپؐ کے اصحابؓ اور قاصدوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے ۔ اہلِ یمن کی طرف آپ نے حضرت معاذ بن جبل اور مالک بن مُرارہ کو اپنا قاصد بنا کر بھیجا تھا ۔ اس خط میں یہ بھی اطلاع دی تھی کہ اُن کا (اہل یمن کا) قاصد پہنچا اور جو کچھ اُن لوگوں کی طرف سے اس نے پہنچایا وہ بھی لکھا تھا ۔

۱۱ ۔ اہل یمن کے نام اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد یمن والوں کے نام خطوط ارسال فرمائے جن میں سے چند یہ ہیں :

۱ ۔ الحارث بن عبدِ کُلال

۲ ۔ شریح بن عبدِ کُلال

۳ ۔ نُعیم بن عبدِ کُلال

۴ - نعمان قَیل ذی یزن
۵ - مَعَافِر[1]
۶ - ہمدان[2]
۷ - زُرعہ ذی رُعَین ——— یہ حمیر[3] کا پہلا اسلام لانے والا تھا۔ اس نے اہل حمیر کو حکم دیا کہ صدقہ (زکوٰۃ) اور جزیہ جمع کریں، اور یہ سب مُعاذ بن جبل اور مالک بن مَرارۃ کو دے دیں۔ اور حکم دیا کہ ان دونوں (قاصدوں) کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ مالک بن مرارۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے اسلام لانے اور طاعت کرنے کی علامت کے طور پر اہل یمن کے قاصد تھے۔ چنانچہ ان کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا کہ:

"أَنَّ مَالِكَ بن مُرَارَة قَدْ بَلَّغَ الخَبَر وحفِظَ الغَيْبَ۔[4] مالک بن مرارہ نے خبر پہنچا دی اور غیب کی حفاظت کی۔

۱۲۔ جَبَلہ بن الایہم

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسان کے بادشاہ جَبَلہ بن الایہم کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے ایک خط تحریر فرمایا۔[5] وہ اسلام لایا اور اپنے اسلام لانے کی خبر خط کے جواب میں آن حضرت کو بھی دی آپؐ کے لیے کچھ ہدایا بھیجے اور برابر مسلمان رہا یہاں تک کہ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانۂ خلافت میں ایک دن دمشق کے بازار میں مُزینہ کے ایک شخص نے اس کو اپنے پاؤں سے روند دیا[6]۔ وہ مزنی اس کے اوپر گرا تو اس نے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ اسے پکڑ کر ابو عبیدہ بن الجراح کے پاس لایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس شخص کو جبلہ نے تھپڑ مارا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: تو اس کے بھی تھپڑ لگاؤ۔

لوگوں نے کہا: کیا اسے قتل نہ کیا جائے گا؟

کہا: نہیں۔

کہا: کیا اس کے ہاتھ بھی نہ کاٹے جائیں گے؟

---

[1] مَعَافِر یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ معجم البلدان ۵/۱۵۳
[2] معجم البلدان ۵/۱۴۰-۱۴۱
[3] ایضاً ۲/۳۰۷
[4] یہاں غیب سے مراد پیغام ربانی ہے۔
[5] الطبقات الکبیر الوفا لابن الجوزی ۲/۳۹،
[6] دُوسری اور زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ حج بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کا لباس کسی شخص کے پیروں تلے آگیا جو بنو فزارہ کا آدمی تھا۔ جبلہ نے اس کے ایک تھپڑ رسید کر دیا جس سے اس کی ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو گیا۔ ابن الجوزی نے اس داستان کو "المنتظم" میں تفصیل سے لکھا ہے۔

کہا، نہیں۔ اللہ کا حکم قصاص کے لیے ہے۔

جبلہ نے کہا: اے لو، میں تو ایک گنوار کے برابر ہوا جا رہا ہوں۔ یہ تو بہت ہی بُرا مذہب ہے!

پھر وہ نصرانی ہوگیا اور اپنی قوم میں واپس چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بھاگ کر ملک روم میں قسطنطنیہ چلا آیا۔ جب یہ بات حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچی تو انھیں بہت ہی ناگوار ہوئی اور انھوں نے حسان بن ثابت سے کہا: "ابو الولید! کیا تم نے بھی سُنا ہے کہ تمہارا دوست جبلہ بن الایہم مرتد ہو کر نصرانی ہوگیا ہے!"

حسان نے کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون، ایسا کیوں ہوا؟"

کہا کہ "مزینہ کے ایک شخص نے اس کو تھپڑ مار دیا تھا۔"

یہ سن کر حسان نے کہا: "تب تو اس نے ٹھیک ہی کیا۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ اُٹھے اور اپنا کوڑا سنبھالا اور حسان کے کوڑے لگائے۔

۱۳۔ ذی الکلاع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جریر بن عبد اللہ البجلی کو ذی الکلاع[۱] بن ناکور بن حبیب بن مالک بن حسان بن تبع اور ذی عمرو کے پاس بھیجا۔ ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور یہ عہد فاروقی میں اپنے آٹھ سو غلاموں کے ساتھ اسلام لے آئے تھے۔ اسی طرح ضریبہ بنت ابرہہ بن الصباح جو ذی الکلاع کی بیوی تھی وہ بھی اسلام لائی تھی مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت تک جریر انھیں لوگوں کے پاس تھے۔ ذی عمرو نے انھیں وفات کی اندوہ ناک خبر سنائی تھی اور جریر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

۱۴۔ اہلِ نجران[۲] کے نام

نجران سے ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تھا۔ اس کا سربراہ وہب تھا، اور عبد المسیح اور ابو حارثہ پادری تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مباہلہ کرنے کا ارادہ کیا مگر انھوں نے مصالحت کر لی تھی اس پر آں حضرتؐ نے یہ خط لکھ دیا تھا۔ اس معاہدے کو حضرت ابوبکرؓ نے بھی باقی رکھا مگر عمر فاروقؓ نے ان کو جلاوطن کر دیا تھا اور ان کی جائداد خرید لی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو الحارث بن کعب کے پادری اور نجران کے پادریوں، کاہنوں، ان کے پیرؤوں اور راہبوں کے نام تحریر فرمایا تھا:

أنّ لهم على ما تحت ايديهم من قليلٍ وكثيرٍ من بيعهم وصلواتهم ورهبانيتهم وجوار الله ورسوله ولا يغيّر أسقف عن أسقفيته ولا راهبٌ عن رهبانية

---

[۱] اس نے عہدِ جاہلیت میں خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا اور ہزاروں انسان اسے سجدہ کیا کرتے تھے۔ عہدِ فاروقی میں اسلام لانے کے بعد بہت سادہ زندگی گزاری۔ (کتاب الوفا ۲/۴۰۷)

[۲] معجم البلدان ۵/۲۶۶-۲۷۰

ولا کاھنٌ عن کہانتِہٖ ولا یُغیّر حقٌّ من حقوقہم ولا سلطانہم ولا شئٌ مما کانوا علیہ ما نصحوا و اُصلحوا فیما علیہم غیر مثقلین بظُلمٍ ولا ظالمین [1]

یہ خط المغیرہ بن شعبہ نے لکھا تھا۔

۱۵۔ ربیعہ بن ذی مرحب

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیعہ بن ذی مرحب الحضرمی، ان کے بھائیوں اور چچاؤں کو لکھا کہ حضرموت میں ان کے اموال، عطایا، غلام، کنوئیں، درخت، پانی، سواریاں، کھیتیاں سب اُن کے ہیں اور یہ مال سب آل ذی مرحب کا ہے۔ یہ معاہدہ معاویہ بن ابی سفیان نے لکھا تھا:

اَنَّ لَھُمْ اَمْوَالَھُمْ وَ نَخْلَھُمْ وَ رَقِیْقَھُمْ وَ آبَارَھُمْ وَ شَجَرَھُمْ وَ مِیَاھَھُمْ وسواقیھم وَ نَبْتَھُمْ وَ شَرَاجِعَھُم بِحَضْرَمَوْتَ وَ کُلَّ مَالٍ لِآلِ ذِیْ مَرْحَبَ وَ اَنَّ کُلَّ رَھْنٍ بِاَرْضِھِمْ یُحْسَبُ ثَمْرُہٗ وَ سِدْرُہٗ وَ قَضْبُہٗ مِنْ رَھْنِہٖ الَّذِیْ ھُوَ فِیْہِ وَ اَنَّ کُلَّ مَا کَانَ فِیْ ثِمَارِھِمْ مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّہٗ لَا یَسْاَلُہٗ اَحَدٌ عَنْہُ وَ اَنَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ بُرَاءٌ مِنْہُ وَ اَنَّ نَصْرَ آلِ ذِیْ مَرْحَبْ عَلٰی جَمَاعَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اَنَّ اَرْضَھُمْ بَرِیَّۃٌ مِنَ الْجَوْرِ وَ اَنَّ اَمْوَالَھُمْ وَ اَنْفُسَھُمْ وَ زَافِرحا ئطِ الْمَلِکِ الَّذِیْ کَانَ یَسِیْلُ اِلٰی آلِ قَیْسٍ وَ اَنَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ جَارٌ عَلٰی ذٰلِکَ۔

ترجمہ: [ان کے اموال، نخلستان، غلام، کنوئیں، درخت، پانی کے ذخیرے، کھیتیاں اور اونٹ جو حضرموت میں ہیں سب ان کے رہیں گے، یہ سب آل ذی مرحب کا مال ہوگا۔ ان کی زمین میں جو گروی رکھی ہوئی ہیں اور جس کا پھل، لکڑی، گھاس وغیرہ اس کے ہیں جس کے پاس وہ ہے اور اس کے سارے پھل بھی۔ اس میں کوئی دعویٰ نہیں کرے گا اور اللہ اور اس کا رسول اس سے بری ہوں گے۔ آلِ ذی مرحب پر واجب ہوگا کہ مسلمانوں کی مدد کریں، اور ان کا علاقہ ظلم سے پاک رہے گا اور ان کے جان و مال بھی اُسی طرح اُن کے علاقے کی وہ باڑھ جو آل قیس تک چلی گئی ہے اور اللہ اور اس کے رسول اس کے محافظ ہیں]

۱۶۔ بنو لخم

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لخم کے قبیلہ حدس سے جو لوگ اسلام لائے، نماز قایم کی اور زکوٰۃ ادا کی، خدا اور رسول کا حصہ ادا کیا، مشرکوں سے علٰحدگی اختیار کی، وہ اللہ اور اس کے

---

[1] طبقات ۱/۲۶۶

رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّی ہیں اور مامون ہیں۔ اور جو اپنے دین سے پھر گیا تو اللہ اور رسول اس سے بری الذمہ ہیں۔ اور جس کے مسلم ہونے کی شہادت کسی مسلمان نے دی وہ بھی مسلمان مانا جائے گا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ میں محفوظ رہے گا۔ یہ دستاویز عبداللہ بن زید نے لکھی :

مَنْ أَسْلَمَ مِنْ حدس مِنْ لَخْم وَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَی الزَّكٰوةَ وَ أَعْطٰی حَظَّ اللّٰهِ وَحَظَّ رَسُوْلِهٖ وَفَارَقَ الْمُشْرِكِيْنَ فَاِنَّهٗ اٰمِنٌ بِذِمَّةِ اللّٰهِ وَذِمَّةِ رَسُوْلِهٖ محمدٍ وَمَنْ رَجَعَ عَنْ دِيْنِهٖ فَاِنَّ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَ ذِمَّةَ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِهٖ مِنْهُ بَرِيْئَةٌ وَمَنْ شَهِدَ مُسْلِمٌ بِاسْلَامِهٖ فَاِنَّهٗ اٰمِنٌ بِذِمَّةِ مُحَمَّدٍ وَاِنَّهٗ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔[1]

[لخم کے خاندان حدس کے لوگ جو ایمان لائیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اللہ اور اس کے رسول کا حصہ ادا کریں مشرکوں سے قطع تعلق کر لیں وہ اللہ اور اس کے رسول محمد کے ذمّہ امان میں رہیں گے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اس سے اللہ اور اس کے رسول کا ذمّہ بھی اُٹھ جائے گا اور جو گواہی دے کسی مسلمان کے اسلام کی اسے بھی امان ہے اور وہ مسلمانوں میں شمار کیا جائے گا]

۱۷۔ خالد بن ضماد الازدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ضماد الازدی کو یہ امان نامہ لکھ کر دیا۔ اسے اُبیّ بن کعب نے لکھا تھا :

اَنَّ لَهٗ مَا أَسْلَمَ عَلَيْهِ مِنْ أَرْضِهٖ عَلٰی أَنْ يُّؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَلَا يُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَيَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَعَلٰی اَنْ يُّقِيْمَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَيَصُوْمَ شَهْرَ رَمَضَان وَيحج البيت وَلَا يأوي مُحْدِثًا وَلَا يَرْتَابَ وَعَلٰی اَنْ يَّنْصَحَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَعَلٰی اَنْ يُّحِبَّ أَحِبَّاءَ اللّٰهِ وَيُبْغِضَ أَعْدَاءَ اللّٰهِ وَعَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ أَنْ يَّمْنَعَهٗ مِمَّا يَمْنَعُ مِنْهُ نَفْسَهٗ وَمَالَهٗ وَ أَهْلَهٗ وَ أَنَّ لِلْخَالِدِ الْاَزْدِيِّ ذِمَّةَ اللّٰهِ وَذِمَّةَ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ اِنْ وَفٰی بِهٰذَا۔[2]

[اسلام لاتے وقت جو کچھ علاقہ ان کا تھا، اُن کا رہے گا بشرطیکہ وہ اللہ پر ایمان لائیں اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور گواہی دیں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں اور بشرطیکہ وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، رمضان کے روزے رکھیں، حج کریں اور کوئی بدعت نہ کریں، شک میں نہ پڑیں اور اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں اور اللہ کے دوستوں کو دوست اور اللہ کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں اور محمد نبی اللہ پر یہ شرط ہے کہ وہ جس بات سے خود کو روکتے ہیں اس سے اُنھیں روکیں جسے اپنے مال اور عیال کے لیے اچھا نہیں سمجھتے

---

[1] الطبقات الکبریٰ ۱/ ۲۶۶-۲۶۷

[2] ایضاً ۱/ ۲۶۷

اُسے اُن کے لیے بھی اچھا نہ سمجھیں اور خالد الازدی اگر ان شرائط کی بجاآوری کریں تو اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ میں رہیں گے]

۱۸۔ عمرو بن حزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمرو بن حزم کو یمن کی طرف بھیجا تو ایک دستاویز لکھ کر دی جس میں شریعت کے قوانین اور ٹیکس کی شرحیں اور تعزیرات کے قوانین سمجھائے تھے۔ یہ دستاویز بھی اُبیّ نے لکھی تھی[1]

اسی طرح آپؐ نے تمیم الداری کے بھائی نُعیم بن اوس کو لکھ کر دیا کہ شام کے علاقہ حبری اور عینون[2] کے سب دیہات، میدان، پہاڑ، پانی، کھیتیاں، گھوڑے اور گائیں اُن کی ہیں اور اُن کے بعد اُن کے اخلاف کی۔ اس میں دوسرا کوئی دعوی نہیں کر سکتا اور نہ اس میں زور زبردستی سے گُھس سکتا ہے۔ جو کوئی ظلم کرے اور ان سے زور زبردستی سے کچھ چھین لے، اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ یہ دستاویز حضرت علیؓ نے لکھی تھی:

أَنَّ لَهُ حِبْرَى وَعَيْنُون بِالشَّامِ قَرْيَتَهَا كُلَّهَا سَهْلَهَا وَجَبَلَهَا وَمَاءَهَا وَحَرْثَهَا وَأَنْبَاطَهَا وَبَقَرَهَا وَلِعَقِبِهِ مِنْ بَعْدِهِ لَا يُحَاقُّهُ فِيهَا أَحَدٌ وَلَا يَلِجُهُ عَلَيْهِمْ بِظُلْمٍ وَمَنْ ظَلَمَهُمْ وَأَخَذَ مِنْهُمْ شَيْئًا فَإِنَّ عَلَيْهِ لَعْنَةَ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (الطبقات ۱/۲۶۷)

ترجمہ: [ملک شام میں حبری اور عینون کے دونوں گاؤں سالم، اس کے میدان، پہاڑ، کھیتی، مویشی سب اُن کے اور اُن کے بعد اخلاف کے رہیں گے ان پر کوئی ظلم نہیں کرے گا اور اس جایداد پر دعویدار نہیں ہوگا اور جو ایسا کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے]

۱۹۔ حُصَین بن اوس الاسلمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حُصَین بن اوس الاسلمی کو لکھا کہ اُنھیں الفرغین و ذات اعشاش کے علاقے دیے جاتے ہیں ان پر دوسرا کوئی دعویدار نہ ہو یہ دستاویز بھی علیؓ بن ابی طالب نے لکھی[3]

اور بنی قرۃ بن عبد اللہ بن ابی نجیح النبہانی کو لکھا کہ انھیں المظلۃ کا پورا علاقہ دیا جاتا ہے اس کی سب زمین، پانی، میدان، پہاڑ اور چراگاہ جس میں وہ اپنے مویشی چرائیں۔ یہ دستاویز معاویہ نے لکھی۔

آپ نے بنی الضباب کو جو بنی الحارث بن کعب میں سے تھے کو لکھا کہ انھیں ساربہ اور اس کا اوپری علاقہ دیا جاتا ہے جب تک یہ نماز پڑھتے رہیں، زکوٰۃ دیتے رہیں، اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے رہیں اور مشرکین سے علٰحدہ رہیں

---

[1] طبقات ۱/۲۶۷ یہ دستاویز عمرو بن حزم کے پوتے ابوبکر بن محمد بن حزم کے پاس محفوظ تھی۔

[2] عَینُون عبرانی لفظ ہے۔ یہ بیت المقدس کے پاس ایک گاؤں ہے۔ مصر سے حج کے لیے آنے والوں کے راستے میں پڑتا تھا (معجم البلدان ۴/۱۸۰)

[3] طبقات ۱/۲۶۷

اس پر کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ یہ مغیرہ نے لکھا تھا:

أَنَّ لَهُمْ مَارِبَةَ وَسَارِفعها لايحاقهم فِيهَا أَحَدٌ مَّا أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطَاعُوا اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَفَارَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

۲۰۔ یزید بن الطفیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید بن الطفیل الحارثی کو المضّہ کا علاقہ دیتے ہوئے لکھا کہ وہ جب تک نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور مشرکین سے جنگ کریں اس علاقے پر کوئی دوسرا دعویدار نہ ہو۔ یہ دستاویز جُہیم بن الصلت نے لکھی:

أن لهُ المضّة كلّها لايحاقّه فيها احدٌ ما أقامَ الصّلاة وآتى الزّكاة وحارب المشركين۔ (طبقات ۱/۲۶۸)

۲۱۔ بنی قنان بن ثعلبہ اور آپ نے بنی قنان بن ثعلبہ (من بنی الحارث) کو لکھا کہ اُن کے لیے مَجس کا علاقہ ہے اور ان کے جان و مال کو امان دی جاتی ہے (طبقات ۱/۲۶۸)۔ یہ دستاویز المغیرہ نے لکھی۔

أَنَّ لَهُمْ مَجَسًا وَأَنهم آمِنُونَ عَلٰى أَمْوَالِهم وأَنْفُسِهِمْ۔

۲۲۔ عبدلغوث بن وعلہ اور عبدلغوث بن وعلہ الحارثی کو الارقم بن ابی الارقم المخزومی سے لکھوا کر دیا:

أَنَّ لَهٗ مَا أَسْلَمَ عَلَيْهِ مِنْ أَرْضِهَا وَأَشْيَائِهَا يعنى نخلها مَا أَقَامَ الصَّلَاةَ وَاٰتَى الزَّكَاةَ وَأَعْطٰى خُمُسَ الْمَغَانِمِ فِي الْغَزْوِ وَلَا عُشْرَ وَلَا حَشْرَ وَمَنْ تَبِعَ مِنْ قَوْمِهٖ۔

[انھیں جو چیزیں دی گئی ہیں۔ زمین اور اس کے متعلقات یعنی نخلستان وغیرہ، وہ جب تک نماز پڑھیں، زکات دیں اور مالِ غنیمت میں سے خُمس ادا کریں وہ اُن کی ہیں اُن سے عُشر (لگان) نہیں لیا جائے گا، انھیں اور اُن کے بعد آنے والوں کو بے دخل بھی نہیں کیا جائے گا۔]

۲۳۔ زیاد بن الحارث آپ نے بنی زیاد بن الحارث الحارثی کو جماء[1] اور اُذنبہ کا علاقہ دیا اور لکھا کہ وہ جب تک نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں اور مشرکوں سے جنگ کریں، امان میں رہیں گے۔ یہ کاغذ علیؓ بن ابی طالب نے لکھا تھا۔[2]

---

[1] جمّاء مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی جو العقیق سے جرف کی طرف جاتے ہوئے راستے میں آتی ہے۔ معجم البلدان ۲/۱۵۸)

[2] الطبقات الکبریٰ ۱/۲۶۸

۲۴ - یزید بن المحجّل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے یزید بن المحجّل الحارثی کو لکھا:

أَنَّ لَهُمْ نمرة و مَسَاقِيهَا و وَادِي الرَّحْمٰنِ مِنْ بَيْنِ غَابَتِهَا وَأَنَّه عَلٰى قَوْمِهِ مِنْ بَنِي مَالِك وَعَقَبَة لا يُغْزَوْنَ وَلَا يُحْشَرُوْنَ۔

یہ دستاویز المغیرہ بن شعبہ نے لکھی تھی۔

۲۵ - قیس بن الحصین اسی طرح آپ نے قیس بن الحصین کو ذی الغصّۃ کا علاقہ دیا جو اُن کے خاندان[1] اور بنو الحارث اور بنو نہد کے پاس امانت رہے گا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ رہیں گے نہ اُنھیں بے دخل کیا جائے گا اور نہ ان سے لگان لیا جائے گا جب تک وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور مشرکوں سے علیحدہ رہیں اور اپنے اسلام کی گواہی دیتے رہیں اور ان کے اموال میں مسلمانوں کا حق ہے۔

لِقَيْسِ بنِ الحُصَيْنِ ذِي الغُصَّةِ أَمَانَةً لِبَنِي أَبِيهِ بني الحارث ولِبَنِي نَهْد أَنَّ لَهُمْ ذِمَّةَ اللهِ وَ ذِمَّةَ رَسُوْلِهِ لَا يُحْشَرُوْنَ وَلَا يُعْشَرُونَ مَا أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ وَفَارَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَ أَشْهَدُوْا عَلٰى إِسْلَامِهِمْ وَ أَنَّ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقًّا لِلْمُسْلِمِين۔

۲۶ - بنی قنان بن یزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قنان بن یزید الحارثی کو مِذْوَدْ[2] اور اس کے نخلستان عطا فرمائے اور لکھا کہ جب تک وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور مشرکین سے علیحدہ رہیں اور راستے پُرامن رکھیں اور اپنے اسلام کی گواہی دیتے رہیں یہ ان کی جاگیر رہے گی۔

أنّ لهم مِذْوَدًا و سَوَاقِيَهُ ما أقاموا الصّلاة و آتوا الزكاة وفارقوا المشركين و أمنوا السّبيل و أشهدوا على اسلامهم۔ (الطبقات ۱/ ۲۶۸ - ۲۶۹)

۲۷ - عاصم بن الحارث آپ نے عاصم بن الحارث الحارثی کو الارقم سے لکھوا کر دیا:

أنّ لَهُ نجمة منْ راكس لايحاقّه فيها أحد۔

۲۸ - بنو معلویہ بن جَرْوَل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی معلویہ بن جَرْوَل (قبیلہ بنی طے) میں سے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور جو نماز قایم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور مالِ غنیمت میں سے اللہ اور اس کے رسول کا خُمس ادا کریں اور مشرکوں سے علیحدہ رہیں اور اسلام پر شہادت دیں اُنھیں اللہ اور اس کے رسول کی امان حاصل ہو گی اور جس پر وہ اسلام لائے ہیں وہ ان کی اور ان کے مویشیوں کی رہایش کے لیے ہے۔ یہ دستاویز الزبیر بن العوّام نے لکھی۔

(الطبقات ۱/ ۲۶۹)

---

[1] بنو نہد، بنو الحارث کے حلیفوں میں سے تھے۔ (طبقات ۱/ ۲۶۸) [2] معجم البلدان ۵/ ۹۰

۲۹ - عامر بن الاسود ابن عامر بن جُوین الطّائی

عامر بن الاسود ابن عامر بن جوین الطائی کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے المغیرہ بن شعبہ سے لکھوایا :

أن له ولقومه طیّ ما أسلموا علیه من بلادهم ومیاههم ما أقاموا الصلاة وأتوا الزکات وفارقوا المشرکین - (الطبقات ۱/ ۲۹۹)

[علاقہ طیّ ان کے اور ان کی قوم کے لیے ہے جب تک وہ اپنے شہروں اور اپنے پانیوں میں اسلام کے ساتھ رہیں، نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں]

۳۰ - بنی جُوین طائی کے نام

آپ نے قبیلۂ طےّ کے خاندان بنی جُوین کے اُن لوگوں کے نام جو ایمان لائے، جنھوں نے نماز قایم کی، زکوٰۃ ادا کی اور مشرکوں سے دور رہے ، اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے رہے ۔ اللہ کا خُمس اور نبی کا حصّہ مالِ غنیمت سے ادا کرتے رہے اور اسلام پر گواہی دیتے رہے ، یہ لکھا کہ انھیں اللہ اور محمد بن عبداللہ کی امان حاصل ہے ، اُن کی زمینیں اور اُن کے پانی (کے ذخیرے) ان کے ہیں۔

أن لهم أرضهم ومیاههم وما أسلموا علیه وغدوة[1] الغنم من ورائها مبیتة۔

یہ خط بھی المغیرۃ بن شعبہ نے لکھا۔

۳۱ - بنی معن طائی

آپ نے قبیلہ بنی طےّ کی شاخ بنی معن کو لکھا کہ حالتِ اسلام میں جو علاقہ اور پانی کے جو ذخیرے ان کے پاس ہیں اور ان کے مویشی جہاں تک چرتے ہوئے جائیں وُہ ان کا ہوگا جب تک وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں اور اپنے اسلام کی گواہی دیتے رہیں اور راستے پُرامن رکھیں۔ یہ العلاء بن الحضرمی نے لکھا اور اس پر اپنی گواہی ثبت کی۔

۳۲ - بنی اسد کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنْ مُحَمَّد النبی إلی بنی أسَد ، سلامٌ علیکم فإنّی أحْمدُ إلیکم اللهَ الذی لا اله الا هوَ - أمّا بعد فلا تقربُنّ میاهَ طَیٍّ وَأرضهم فانه لا تَحلّ لکم میاهُهُم ولا یَلِجَنَّ أرضَهم إلّا مَن أولَجُوا وذِمّةُ محمّدٍ بَرِیئةٌ مِمّن عَصَاهُ وَلْیَقُمْ قُضَاعیّ ابْنُ عَمْرٍو۔

---

[1] غَدوةُ الغنم سے مراد یہ ہے کہ مویشی صبح کو چرنے جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں جہاں تک وہ جائیں اور اُن کے پیچھے جتنی زمین رہ جائے وہ سب اس خاندان کی مِلک شمار ہوگی۔

[محمد نبی کی طرف سے بنو اسد کے نام۔ سلام علیکم۔ میں اُس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ امّا بعد، وہ (قبیلہ بنی) طیؔ کے پانی اور زمینوں کی طرف نہ جائیں کیونکہ اُن کے پانی تمہارے لیے جائز نہیں ہیں، نہ اُن کی زمینوں میں داخل ہوں، مگر وہ جو داخل کیے جائیں اور جو اِس (فرمان سے) روگردانی کرے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے ذمّہ سے بری ہیں اور قضاعی ابن عمرو اس کے نگراں ہوں گے]

قضاعی بن عمرو قبیلہ بنی عُذرہ کے فرد تھے اور بنو اسد کے علاقے میں عامل تھے۔ یہ خط خالد بن سعید نے لکھا۔

۳۳۔ جُنادۃ الازدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط جُنادۃ بن الازدی اس کی قوم اور جو اس کی پیروی کریں اُن کے نام لکھا کہ جب تک وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اللہ اور رسول کی اطاعت کریں، مغانم میں سے اللہ کا خُمس اور رسول کا حصّہ ادا کرتے رہیں، مشرکوں سے علٰحدہ رہیں، وہ اللہ اور محمد بن عبداللہ کے ذمّہ میں رہیں گے۔

یہ خط اُبَیؓ نے لکھا۔ (الطبقات ۱/۲۷۰)

۳۴۔ سَعد ہُذیم

آپ نے قضاعہ کے سَعد ہُذیم اور جُذام کے نام ایک ہی خط لکھا جس میں انھیں صدقے کے احکام تعلیم کیے اور حکم دیا کہ وہ صدقہ (زکوٰۃ) اور خُمس اپنے دو قاصدوں اُبَیؓ اور عنبسہ کو یا جسے وہ دونوں مامور کریں اُسے ادا کریں۔

۳۵۔ بنی زُرعۃ اور جُہینہ کے بنی الرّبعۃ کے نام[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی زُرعۃ اور جُہینہ کے بنی الرّبعۃ کے نام لکھا کہ اُنھیں اپنے جان و مال کی امان حاصل رہے گی اور جو اُن پر ظلم کرے گا یا اُن سے جنگ کرے گا اُس کے خلاف مدد ملے گی بشرطیکہ وہ جنگ ان کے دین یا خاندان سے متعلق نہ ہو اور اُن کے اہلِ بادیہ میں سے بھی جو نیک اور پرہیزگار ہوں وہی معاملہ ہوگا جو شہریوں کے ساتھ ہوگا۔

أنهم آمنون على أنفسهم وأموالهم وأنّ لهم النصر على من ظلمهم أو حاربهم إلّا في الدّين والأهل، ولأهل باديتهم من برّ منهم واتّقى ما لحاضرتهم والله المستعان۔ (الطبقات ۱/۲۷۰)

۳۶۔ بنی جُعَیل کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جُعَیل کے نام لکھا کہ:
لهم مثل الذی لهم وعليهم مثل الذی عليهم

---

[1] یہ ۱ھ کے معاہدوں میں سے ہے۔ جُہَینہ یہودی قبیلہ تھا۔ یہ مدینہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ینبوع کے قریب آباد تھا۔

وأنّهم لا يُحشرون ولا يُعشرون[1] وأن لهم ما أسلموا عليه من اموالهم و أن لهم سعاية نصروسعد بن بكر و ثمالة وهُذيل و بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم على ذلك عاصمُ بن أبي صيفي وعمرو ابن أبي صيفي والاعجم بن سفيان وعليّ بن سعد ۔ (الطبقات ۱/۲۷۰)

اس دستاویز پر العباس بن عبد المطلب ، علی بن ابی طالب ، عثمان بن عفّان اور ابو سفیان بن حرب نے گواہی ثبت کی ۔

۳۷ ۔ الاسلم الخزاعی

خاندان بنی خزاعہ کے اُن افراد کے لیے جو ایمان لائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھا :

من امن منهم وأقام الصلاة و اٰتیٰ الزكاة و ناصح في دين الله أن لهم النصر على من دهمهم بظلم[2] وعليهم نصر النبي صلى الله عليه وسلم إذا دعاهم ولاهل باديتهم[3] ما لأهل حاضرتهم[4] وأنهم مهاجرون حيث كانوا ۔ (الطبقات ۱/۲۷۱)

یہ خط العلاء بن الحضرمی نے لکھا اور اس پر اپنی گواہی ثبت کی ۔

۳۸ ۔ عوسجة بن حرملة الجهنی

بسم الله الرحمٰن الرحيم

هذا ما أعطى الرسول عوسجة ابن حرملة الجهني من ذی المروة أعطاه ما بين بلكثة[5]

---

[1] ابنِ سعد کہتا ہے کہ اس دستاویز پر بنی عبد مناف کو گواہ اس لیے بنایا گیا کہ بنی جُعَیل اُن کے حلفاء تھے ۔ لا یُحشرون سے مراد یہ ہے کہ پانی کے ایک ذخیرے سے دوسرے ذخیرے کی طرف جلاوطن نہیں کیے جائیں گے ۔ اور لا یُعشرون سے مراد ہے کہ سال میں ایک بار سے زیادہ عُشر نہیں لیا جائے گا ان لهم سعاية نصر میں سعایہ سے مراد صدقات (زکوٰۃ وغیرہ) ہیں ۔

[2] دهمهم بظلم ، اچانک حملہ کرنا ظلم کے ساتھ ۔

[3] أهل باديتهم ، اس قبیلہ کے وہ لوگ جو صحرا میں رہتے ہیں (بدو) ۔

[4] أهل حاضرتهم ، اس قبیلے کے شہر میں بسنے والے افراد ۔

[5] بلكثة (بروزن زمزمہ) طبقات کے مطبوعہ نسخہ میں شین سے ہے ۔ لیکن یہ طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ بلكثه (ثائے مثلثہ سے) ہونا چاہیے ۔ ذی المروۃ کے پاس یہی جگہ ہے اور اس کی جمع بلاکث بھی مستعمل ہے ۔ دیکھو معجم البلدان ۱/ ۴۷۸ ۔

إلی المصنعة إلی الجفلاتِ الی الجُدّ[1] جَبَلِ القبلةِ لایُحاقّه أحدٌ و من حاقّهُ فلا حقّ له و حقّه حقٌّ۔

[یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مروہ والے عوسجہ بن حرملہ جہنی کو بلکثہ سے مصنعہ (گڑھی) اور جفلات سے جبل القبلہ کے کنوئیں تک کا علاقہ عطا کیا ہے اس میں کوئی دوسرا دعویدار نہ ہو گا جو کوئی دعویٰ کرے گا اس کا کوئی حق نہ ہو گا اور اِن کا حق سچا سمجھا جائے گا]

اس پر عقبہ نے گواہی لکھی اور انھوں نے ہی کتابت کی۔

۳۹- بنی شنخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جُہینہ کے بنی شنخ کو لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا ما أعطى محمد النبيّ (صلى الله عليه وسلم) بني شَنْخٍ مِن جُهَيْنَةَ أعطاهم ماخطّوا من صُفَيْنَةَ و ما حَرثوا و من حاقّهم فلا حقّ لهٗ وحقّهم حقّ۔

یہ العلاء بن عقبہ نے لکھا اور گواہی ثبت کی۔

۴۰- بنی الجُرمُز بن ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی الجُرمُز بن ربیعہ کو، جو بنو جُہینہ کی ایک شاخ ہیں، لکھا کہ وہ اپنے علاقوں میں امان سے رہیں گے اور اسلام لانے کے وقت جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ اُن کا رہے گا۔

یہ دستاویز المغیرہ نے قلمبند کی۔

۴۱- عَمرو بن معبد الجُہنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمرو بن معبد الجُہنی اور جُہینہ کی شاخ بنی الحُرَقہ اور بنی الجُرمُز کے ایمان لانے والوں کو لکھا جو نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور مالِ غنیمت میں سے اللہ کا خُمس اور رسولؐ کا حصّہ ادا کریں اور جو اپنے اسلام کی شہادت دے اور مشرکوں سے علٰحدہ رہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی امان میں رہے گا اور جس مسلمان پر کوئی قرض ہو گا وہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا اور جو رہن کا سُود ہو گا باطل قرار دیا جائے گا۔ ان کا صدقہ (زکاۃ) پھلوں میں دسواں حصّہ ہو گا اور جو ان کے ساتھ مل جائے گا اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

۴۲- بلال بن الحارث المُزنی آپ نے بلال بن الحارث المزنی کو لکھا:

أن له النخل و جزعة شطْرِه ذا المزارع و النخل،

و أنّ له ما اصلح به الزرع من قدس و انّ له المضّة و الجزع و الغَيلة إن كان صادقاً۔

---

[1] جدّ قدیم لغت میں کنوئیں کے لیے آتا ہے۔ معجم البلدان ۲/۱۱۳

یہ معاویہ نے لکھا۔

ابنِ سعد کہتا ہے:

جزَعۃ سے مراد جایداد ہے۔

شطرِہ سے مراد ہے اس جانب کی۔ جیسے قرآن کریم میں ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شطر المسجد الحرام یعنی مسجد حرام کی طرف۔

قَدَس مویشی یا سواری کے جانور۔

اور مَضَّہ ایک جگہ کا نام ہے۔

۴۳۔ بُدَیل و بُسر و سَرَوات بنی عَمرو

أمّا بعد فانّی لم آثم مالکم ولم أضَعْ فی جنبکم و إنّ أکرمَ أهلِ تِهامةَ علیَّ و أقربُهم رَحِماً مِنّی أنتم ومن تبعکم من المُطَیّبینَ، امّا بعدُ فانّی قد أخذت لمن هاجر منکم مثلَ ما أخذتُ لنفسی ولو هاجر بأرضه إلّا ساکن مکّة إلّا مُعتمراً أو حاجّاً فانّی لم أضع فیکم منذ سالمتُ وأنّکم غیرُ خائفینَ مِنْ قِبَلی ولا مُحصرینَ، امّا بعدُ فانّهُ قد أسلم عَلقمةُ[1] بنُ عُلاثةَ وابنا هوذةَ[2] وهاجرا و بایعا علی من تَبِعهُمْ[3] مِن عِکرمَةَ و أنّ بعضنا من بعضٍ فی الحلالِ والحرام وأنّی واللهِ ما کذبتُکم ولیحِبّکُم ربکم۔ (الطبقات ۱/۲۷۲)

اس خط میں آپ نے سلام نہیں لکھا تھا کیونکہ یہ خط سلام نازل ہونے سے پہلے بھیجا گیا تھا۔

۴۴۔ العدّاء بن خالد بن ہوذۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العدّاء بن خالد بن ہوذۃ اور اس کے پیروؤں کو جو خاندان عامر بن عکرمہ سے تھے۔ ایک خط خالد بن سعید سے لکھوایا اور ان کو وہ علاقہ عطا فرمایا جو المصباعہ سے الزُّجّ[4] اور لوابۃ الخرّار کے درمیان ہے۔ (الطبقات ۱/۲۷۳)

۴۵۔ مسیلمۃ الکذّاب

آپ نے مسیلمۃ الکذّاب کی طرف بھی ایک نامۂ مبارک بھیجا اور اُسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ خط عَمرو بن اُمیّۃ الضّمری لے کر گئے۔ مسیلمۃ نے اس خط کا جواب بھی دیا تھا

---

[1] علقمہ بن علاثہ بن عوف بن الاحوص بن جعفر بن کلاب

[2] یہ العدّاء بن خالد و عَمرو بن خالد بن ہوذۃ خاندان بنی عَمرو بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ سے ہیں۔

[3] عکرمہ بن خصفہ ابن قیس بن عیلان مراد ہیں۔ اوپر "من تبعکم من المطیبین" سے بقول ابن سعد بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو الحارث بن فہر اور تیم بن مُرّۃ اور اسد بن عبد العزّٰی کی طرف اشارہ ہے۔

[4] الطبقات کے مطبوعہ نسخہ میں الزّحّ (حائے مہملہ سے) ہے لیکن جیم سے درست ہے۔ (معجم البلدان ۳/۱۳۳)

اور یہ لکھا تھا کہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نبی ہے، اس نے تجویز پیش کی تھی کہ سرزمینِ عرب کا علاقہ آپس میں بانٹ لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلعنُوہُ لَعنَہُ اللہ۔

اور یہ جواب لکھوایا:

بلغنی انکتابك الکذب والافتراء علی اللہ وإن الارض للہ یورثها من یشآء من عباده والعاقبة للمتقین والسلام علی من اتبع الهدی[1]

یہ خط لے کر السائب بن العوام گئے تھے جو حضرت الزبیر بن العوام کے بھائی اور عروہ بن الزبیر کے چچا ہیں۔

۴۶۔ سلمة بن مالک کے نام

آپ نے بنو حارثہ کے سلمہ بن مالک بن ابی عامر السلمی کو خط لکھا اور علاقہ مَدْفوا عطا فرمایا اور لکھا کہ اس پر کوئی اور دعویٰ کرے تو وہ باطل ہوگا اور ان کا حق صحیح سمجھا جائے گا۔

۴۷۔ العباس بن مرداس السلمی

بعض راویوں نے کہا کہ آپ نے العباس بن مرداس السلمی کو لکھا اور مدفوا کا علاقہ عطا فرمایا۔ یہ دستاویز العلاء بن عقبہ نے لکھی اور اس پر اپنی گواہی ثبت کی۔

(الطبقات ۱/۲۷۳)

۴۸۔ ہوذہ بن نبیشة

آپ نے ہوذہ بن نبیشة (نُ بَ ئ شَ ة) السلمی اور بنی عُصَیّہ کو الجفر[2] کے اطراف کا پورا علاقہ عطا فرمایا۔ (الطبقات ۱/۲۷۳)

۴۹۔ الأجبّ کے نام

قبیلہ بنی سُلَیم کے ایک فرد الأجبّ کو آپ نے فالس عطا فرمایا، اور یہ خط الأرقم نے لکھا۔

۵۰۔ راشد بن عبد السلمی

راشد بن عبد السلمی کو آپ نے غَلْوَتَیْنِ سہم (دو تیر پرتاب فیصلہ) ایک غلوۃ حجر (ایک پتھر پھینکنے کا فاصلہ) رُہاط[3] میں عطا فرمایا کہ اس پر اور کوئی دعویٰ کرے تو باطل ہوگا۔ یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی۔

۵۱۔ حَرام بن عبد عوف

بنی سُلَیم کے فرد حرام بن عبد عوف کو شواق اور اذاما کا علاقہ عطا فرمایا۔ یہ بھی خالد بن سعید نے لکھا۔

---

[1] تاریخ الطبری میں اس کا متن قدرے مختلف ہے۔

[2] الجفر نواحِ مدینہ میں ایک مقام ہے۔ (معجم البلدان طبع بیروت ۲/ ۱۴۶)

[3] رُہاط مکہ سے تین میل کا فاصلہ مدینہ کے راستے پر۔ یہ بنی سعد اور بنی مسروح کا علاقہ تھا۔ معجم البلدان ۳/ ۱۰۷ طبع بیروت۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵۲۔ الزبیر بن العوام هذا كتابٌ من محمدٍ رسول اللهِ للزبير بن العوّام أُنى أُعطيته شواقَ أعلاه واسفلهُ لا يحاقه فيه أحدٌ۔

یہ دستاویز علی بن ابی طالب نے لکھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵۳۔ نُعَیم بن مسعود هذا ما حالف عليه نُعيم بنُ مسعودِ بنِ رُخيلةَ الأشجعي حالفه على النَّصرِ والنصيحة وما كان أُحدٌ مكانه ما بلّ بحرٌ صوفةً ۔ (الطبقات ۱/۲۷۴)

یہ خط بھی حضرت علی بن ابی طالب نے لکھا۔

۵۴۔ جمیل بن رِزام العدوی آپ نے جمیل بن رِزام العدوی کو الرّمدا عطا فرمایا اور اس کے لیے دستاویز لکھ دی جس کے کاتب علی بن ابی طالب تھے۔

۵۵۔ حصین بن نضلۃ الاسدی آپ نے حصین بن نضلۃ الاسدی کو المغیرہ بن شعبہ سے لکھوا کر دستاویز دی کہ ارامؔ[1] اور کسّۃ اُن کا ہے اس پر کوئی دعویٰ کرے تو باطل ہوگا۔

۵۶۔ بنی غِفار کے نام آپ نے بنی غفار کو لکھ کر دیا کہ وہ مسلمانوں میں سے ہیں اور حقوق و فرائض میں جو معاملہ مسلمانوں کے ساتھ ہوگا وہ ان کے ساتھ ہوگا اور اللہ کے نبی نے ان کی جان و مال کو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں لیا ہے۔ اگر کوئی ان پر ظلم کرے گا تو انھیں مدد دی جائے گی اور جب نبی انھیں مدد کے لیے بلائیں گے تو وہ لبیک کہیں گے اور ان پر نبی کی امداد (واجب) ہوگی مگر یہ کہ کوئی دین میں جنگ کرے۔

أنهم من المسلمين لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين وأن النبي عقد لهم ذمة الله وذمة رسوله على اموالهم وأنفسهم ولهم النصر على من بدأهم بالظلم، وأن النبي اذا دعاهم لينصروه أجابوه وعليهم نصره الا من حاربَ فى الدين ما بلّ بحرٌ صوفةً وأن هذا الكتاب لا يحول دون إثم ۔ (الطبقات ۱/۲۷۴)

۵۷۔ بنی ضَمرۃ بن بکر آپ نے بنی ضمرہ بن بکر ابن عبد مناۃ بن کنانہ کو لکھ کر دیا کہ اُن کی جان و مال کو امان ہے اور کوئی ان پر حملہ کرے گا تو ان کی مدد کی جائے گی اور ان پر بھی واجب ہے کہ نبی کی مدد کریں بشرطیکہ وہ اللہ کے دین کے لیے جنگ کریں اور جب نبی ان کو بلائیں تو لبیک کہیں، اس کے لیے وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں ہیں اور ان میں سے جو نیک اور پرہیزگار رہیں ان کے لیے مدد ہوگی۔

---

[1] ارام مکہ اور مدینہ کے درمیان پہاڑی۔ (معجم البلدان ۱/۵۲)

أنهم آمنون على اموالهم وانفسهم وأن لهم النصر على من دهمهم بظلم وعليهم نصر النبي (صلى الله عليه وسلم) ما بلّ بحرٌ صوفةً الا أن يحاربوا في دين الله وأن النبي إذا دعاهم أجابوه عليهم بذلك ذمة الله ورسوله ولهم النصر على من برّ منهم واتقى۔ (الطبقات ۱/۲۷۵)

۵۸۔ الهلال صاحب البحرین

الهلال صاحب البحرینؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا:

سِلْمٌ أنت فانی أحمدُ إليك الله الذی لا إله الا هُوَلا شريك لهٗ وأدعوك إلى اللهِ وحدهٗ تؤمن بالله وتطيعُ وتدخلُ في الجماعةِ فانهٗ خيرٌ لك والسّلام على من اتبع الهُدٰی۔ (الطبقات ۱/۲۷۵)

تم صلح پسند ہو، میں تم سے اُس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس کا کوئی شریک نہیں اور تمھیں اللہ واحد کی طرف بلاتا ہوں، ایمان لاؤ، اللہ کی اطاعت کرو اور جماعت میں داخل ہو جاؤ تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو۔

۵۹۔ اسیبخت بن عبداللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیبخت بن عبداللہ صاحب ہجرؓ کو لکھا:

إنه قد جاء نی الأقْرع بكتابك وشفاعتك لقومك وإنی قد شَفَّعْتُك وصدَّقتُ رسولك الأقْرع فی قومك فأبْشِرْ فيما سألْتَنی وطلبْتَنی بالّذی تُحِبّ ولكنی نظرتُ أن أُعَلِّمهٗ وتلقانی، فان تجئْنا أكرِمْكَ وإنْ تَقْعُدْ أكرمك اما بعد فانی لا أستهدی أحَدًا وإن تُهدِ إلیّ أقبل هديّتك وقد حَمِدَ عُمّالی مَكانَكَ وأوصيكَ بأحسن الّذی أنت عليه من الصّلاة والزّكاة وقرابة المؤمنين وإنّی قد سَمّيْتُ قومَكَ بنی عبد الله فمُرْهم بالصّلاة وبأحسن العَمَلِ والبُشْرِ، والسّلام عليك وعلى قومك المؤمنين۔

۶۰۔ اہلِ ہجرؓ کے نام

اما بعد فانی أوصيكم بالله وبأنْفُسِكم ألاّ تضلّوا بعدَ أنْ هُدِيتُمْ ولا تغوُوا بعدَ أنْ رُشِدتُم، اما بعد فانهٗ قد جاءنی وفدُكم فلم آتِ إليهم إلا ما سرّهم ولو أنی إجتهدْتُ فيكم جُهدی كلّهٗ أخرجْتُكم من هجر فشفّعْتُ غائبَكم وأفضلْتُ على شاهِدِكم فاذكروا نعمة الله عليكم اما بعد فانهٗ قد أتانی الذی صنعتُم وإنّه من يُحسِنُ منكم

۱؎ معجم البلدان ۱/۳۴۶ ۔۔۔ ۲؎ ایضاً ۵/۳۹۳

۳؎ ہجر (بروزن سفر) معجم البلدان ۵/۳۹۳

لا أحمل علیه ذنب المسیئ. فاذا جاءکم أمرائی فأطیعوهم وانصروهم علی امر الله و فی سبیله وانه من یعمل منکم صالحةً فلن تضل عند الله ولا عندی۔

(الطبقات ۱/ ۲۷۵-۲۷۶)

۶۱ - المنذر بن ساوی[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے المنذر بن ساوی گورنر بحرین کے پاس العلاء بن الحضرمی کو یہ خط دے کر بھیجا تھا۔ ابن سعد میں اس کی روایت اس طرح ہے:

اما بعد فانّ رسلی قد حمدوك و إنك مهما تصلح أصلح إلیك و أثبك علی عملك وتنصح لله ولرسوله والسلام علیك۔

خط کا پورا متن یہ ہے:

بسم الله الرحمٰن الرحیم

من محمد رسول الله إلی المنذر بن ساوی سلامٌ علیك فانی أحمد الله الیك الذی لا إله غیره وأشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله - اما بعد فانی أذكرك الله عز وجل فانه من ینصح فانما ینصح لنفسه وإنه من یطع رسلی ویتبع أمرهم فقد أطاعنی ومن نصح لهم فقد نصح لی وإن رسلی قد أثنوا علیك خیراً وإنی قد شفعتك فی قومك فاترك للمسلمین ما أسلموا علیه وعفوت عن أهل الذنوب فاقبل منهم وإنك مهما تصلح فلن نعزلك عن عملك ومن أقام علی یهودیة أو مجوسیة فعلیه الجزیة۔ (زاد المعاد جلد سوم ص ۶۱ بحوالہ حمید اللہ)

۶۲ - المنذر بن ساوی کے نام دوسرا خط[2]

أما بعد فانی قد بعثت الیك قدامة وأبا هریرة فادفع إلیهما ما اجتمع عندك

---

[1] المنذر بن ساوی، ایران کی ساسانی حکومت کی طرف سے بحرین کا گورنر تھا۔ اس کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اصل مکتوب ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) میں ایک فرانسیسی سیاح کو مصر کے ایک قبطی راہب سے ملا تھا۔ ایک خط مقوقس بادشاہ کے نام بھی ایک فرانسیسی سیاح کو ملا تھا اور اسے سلطان عبدالمجید والیٔ ترکی نے خرید کر قسطنطنیہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ باریک سیاہی مائل کھال پر بھوری سیاہی سے لکھا ہوا ہے اور اس کے عکس متعدد بار شائع ہو چکے ہیں۔ (مکتوبات نبوی ۱۶۴) کتاب الوفاء ۲/ ۷۴۲

[2] المنذر بن ساوی گورنر بحرین کے نام مکتوب نبوی کی اصل کا عکس پہلی بار جرمن مجلہ ZMDG جلد XVII (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کی بحث محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" (۱۶۸-۱۷۲) میں ملاحظہ ہو۔ یہ خط دمشق کے قوتلی خاندان میں اب تک محفوظ ہے۔

من جزیة أرضكَ والسّلام ۔ (الطبقات ۱/۲۷۶)

میں نے قدامہ اور ابُوہریرہ کو تمھارے پاس بھیجا ہے ، اپنے علاقے کا جو ٹیکس (جزیہ) جمع ہوگیا ہو وہ ان دونوں کے حوالے کردو۔

یہ خط اُبَیّ نے لکھا۔

۶۳ ۔ العلاؔ بن الحضرمی

امّا بعد فانّی قد بعثت إلی المنذرِ بن سَاوَی من یقبضُ منه ما اجتمع عنده من الجزیة فعَجِّلْهُ بها وأبعث معها ما اجتمع عندك من الصدقةِ والعشورِ والسلام ۔

(الطبقات ۱/۲۷۶)

[میں نے المنذر بن سَاوَی کے پاس ایک قاصد بھیجا ہے کہ اس نے جو کچھ جزیہ جمع کر لیا ہو وہ اس کے حوالے کر دے ، تم اُسے عجلت پر آمادہ کرو اور تمھارے پاس جو صدقہ (زکوٰۃ) اور عُشر (لگان) جمع ہوگیا ہو وہ بھی جزیہ ٹیکس کے ساتھ ہی روانہ کردو۔ والسلام]

یہ خط بھی اُبَیّ نے لکھا تھا۔

۶۴ ۔ ضغاطر الاسقف کے نام

سلامٌ علی من آمن ۔ أمّا علی أثرِ ذٰلك فانّ عیسی بنَ مریمَ روحُ اللهِ وکلمتُه القاھا إلی مریم الزکیّةِ وإنّی أومِنُ باللهِ وما أنزِلَ إلینا وما أنْزِلَ إلی إبراھیم وإسمعیل وإسحاق ویعقوب والأسباطِ وما أوتِیَ موسٰی وعیسٰی وما أوتی النبیّوُن من ربّھم لا نفرّق بین أحدٍ منھم ونحن لهٗ مسلمونَ ، والسّلامُ علی من اتبع الھُدٰی ۔ (الطبقات ۲/۲۷۶)

[جو ایمان لائے اس پر سلام ہو اور اس کی نشانی یہ ہے کہ عیسٰی بن مریم روح اللہ ہیں اور کلمۃ اللہ ہیں جو اللہ نے پاکدامن مریم پر القا کیا۔ اور میں اللہ پر ایمان لایا ہوں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم ، اسمٰعیل ، اسحٰق ، یعقوب اور آلِ یعقوب پر نازل کیا گیا اور جو موسٰی وعیسٰی کو دیا گیا اور دوسرے انبیاء کو دیا گیا۔ ہم انبیاء میں ایک دوسرے کے درمیان فرق و امتیاز نہیں کرتے اور اس کے مسلم ہیں ۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے]

یہ خط دحیۃ بن خلیفۃ الکلبی لے کر گئے تھے۔

۶۵۔ بنی جُنْبَہ یہودِ مقنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقنا[1] کے یہودیوں کو لکھا، مقنا اَیلہ کے قریب واقع ہے۔

أمّا بعد۔ فقد نَزَل علیَّ أیتُکُم[2] راجعینَ إلیٰ قریَتکم فاذا جاءَکم کتابی ھذا فانکم اٰمنون لکم ذمّۃ اللّٰہ وذمّۃُ رسولہ وإنّ رسولَ اللّٰہ غافرٌ لکم سیّئاتکم وکُلَّ ذُنوبکم وإنّ لکم ذِمّۃَ اللّٰہ وذمّۃَ رسولِہ لاظُلمَ علیکم ولا عدیّ وإنّ رسولَ اللّٰہ جارُکم ممّا مَنَع منہ نفسَہٗ فانّ لرسولِ اللّٰہ بزّکم وکلّ رقیقٍ فیکم والکُراعَ والحلْقۃَ[3] إلّا ما عفا عنہ رسولُ اللّٰہ أو رسولُ رسولِ اللّٰہ وإنّ علیکم بعد ذٰلک رُبْعَ ما أخْرَجَتْ نخلُکم ورُبْعَ ما صادتْ عُروکُکُم[4] ورُبْعَ ما اغتزل نساؤکم وإنکم بَرِئتُم بعدُ من کُلّ جزیۃٍ او سُخرۃٍ فان سمعتمُ واَطعتم فان علی رسول اللّٰہ ان یکرم کریمکم ویعفُو عن مسیئکم، أمّا بعدُ فالی المؤمنین والمسلمین من أطلعَ أھلَ مقنا بخیرٍ فھوخیرٌ لہ ومن أطلعھم بشرٍّ فھوشرٌّ لہ وأنْ لیسَ علیکم امیرٌ إلاّ مِن اَنفُسِکُم أو من أھلِ رسولِ اللّٰہ والسّلام۔ (الطبقات ۱/ ۲۷۷)

[تمہارے قاصد، تمہارے گاؤں کی طرف واپس جاتے ہوئے مجھ سے ملے۔ جب تمہیں میرا یہ خط پہنچے تو تمہیں امان ہے اور تم اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ میں ہو اور اللہ کا رسول تمہارے عیوب اور تمام گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ تمہیں خدا اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے کوئی تم پر ظلم و زیادتی نہیں کرے گا رسول اللہ تمہارے لیے بھی وہ ناپسند کریں گے جو وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور رسول اللہ کے لیے تمہارے اموال اور سارے غلام اور مویشی اور ہتھیار ہیں مگر جو کچھ اللہ کے رسول تمہیں معاف کر دیں (وہ تمہارا ہے) یا رسول اللہ کے سفیر جو تمہیں بخش دیں۔ آج کے بعد سے تم اپنے نخلستانوں سے ایک چوتھائی لگان دوگے اور ایک چوتھائی شکار کی ہوئی مچھلیاں اور ایک چوتھائی عورتوں کا کاتا ہوا سوت اُس کے بعد تم ہر ٹیکس اور جزیہ سے آزاد ہو اگر تم نے فرماں برداری کی تو رسول اللہ تمہارے باعزّت افراد کا اکرام کریں گے اور تمہاری غلطیوں سے درگزر کریں گے۔ تمام مومنوں اور مسلموں میں سے جو اہلِ مقنا سے ملے وہ ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے اور جو اُن کے ساتھ بُرائی کرے گا یہ اُس کے لیے بُرا ہوگا۔ تمہارے امیر تم میں سے ہی مقرر کیے جائیں گے یا رسول اللہ کے خاندان سے ہوں گے۔ والسّلام]

---

[1] معجم البلدان ۵/ ۱۷۸

[2] أیتکم یعنی رسلکم تمہارے قاصد (۱/ ۲۷۷)

[3] حلقہ: گھر میں جو سامان اور ہتھیار وغیرہ ہوں۔

[4] لٹھے جنہیں پانی میں بہاکر اُن پر بیٹھتے تھے اور مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔

۶۶ - یُحنّہ بن رُوبہ اور سرواتِ اہلِ اَیلہ[1] کے نام

سِلْمٌ أنتم فانی أحمدُ إلیکمُ اللهَ الّذی لا إلٰهَ إلّاهُوَ فانی لم أکن لأقاتلکم حتّی أکتب إلیکم فأَسْلِمْ أو أَعْطِ الجزیةَ وأطع اللهَ ورسوله ورُسُلَ رسوله وأکرِمهم واکسُهم کسوةً حسنةً غیرَ کسوة الغُزاءِ واکسُ زیداً کسوةً حسنةً فمهما رضیتْ رُسُلی فانّی قد رَضِیْتُ وقد عُلِمَ الجزیةَ فانْ أردتم أن یأمَنَ البرُّ والبحرُ فاطع اللهَ ورسوله ویمنعُ عنکم کلَّ حقٍّ کان للعرب والعجم إلّا حقّ الله وحقّ رسوله وإنّك إنْ رددتّهم ولم تُرضِهم لا آخُذُ منکم شیئاً حتّی أُقاتلکم فاسْبِی الصغیرَ وأَقْتُلَ الکبیرَ فانّی رسُولُ اللهِ بالحقّ أومن بالله وکُتُبِه ورُسُلِه وبالمسیح بنِ مریمَ أنّهُ کلمة الله وإنّی أومن به أنّه رسولُ اللهِ وَأْتِ قبل أنْ یمسّکم الشّرّ فانّی قد أوصیتُ رُسُلی بکم وأعط حرملةَ ثلاثة أوْسُقٍ شعیراً وإنّ حرملةَ شفعَ لکم وإنّی لولا اللهُ وذلك لم أراسِلْکمُ شیئاً حتّی تری الجیش وإنکم إنْ أطعتُم رُسُلی فانّ اللهَ لکم جارٌ ومحمّدٌ ومن یکون منه وإنّ رُسُلی شرحْبیل وأُبَیّ وحرملةَ وحریثَ بنَ الطّاف فانهم مهما قاضوكَ علیه فقد رضیتُه وإنّ لکم ذمّةَ اللهِ وذمّةَ محمّدٍ رسُولِ اللهِ والسّلامُ علیکم إن أطعتُم وجهّزوا أهل مقنا[2] إلی ارضهم۔

۶۷ - جبلِ تہامہ کے گروہ بندوں[3] کے نام

بسم الله الرّحمن الرّحیم

هٰذا کتابٌ من محمدٍ النبی رسولِ اللهِ لعبادِ اللهِ العتقاءِ إنّهم إن آمنوا وأقاموا الصلوٰة وآتوا الزکاةَ فعبدهم حُرٌّ ومولاهم محمّدٌ ومن کان منهم من قبیلةٍ لم یُرَدَّ إلیها وماکان فیهم من دمٍ أصابوه أو مالٍ أخذوه فهو لهم وماکان لهم من دَیْنٍ فی النّاسِ رُدَّ إلیهم ولا ظلمَ علیهم ولا عُدوانَ وإنّ لهم علی ذٰلك ذمّةَ اللهِ وذمّةَ محمدٍ والسلام علیکم۔

(الطبقات ۱/ ۲۷۸)

---

[1] ایلہ بحرِ قلزم کے ساحل پر واقع ہے۔ یہ حجاز کی آخری حد اور شام کی ابتدائی سرحد پر ہے۔ یہاں یہودیوں کی آبادی تھی جن کے بارے میں قرآن میں ہے کہ انھوں نے سبت کے دن مچھلی کا شکار کیا اور ان کی صورتیں مسخ ہوگئیں۔ (معجم البلدان ۱/۲۹۲)

[2] مقنا، یہ بھی ایلہ کے قریب یہودیوں کی بستی تھی۔ (معجم البلدان ۵/۱۷۸)

[3] معجم البلدان ۲/۶۳

یہ خط ابی بن کعب نے لکھا۔

[یہ خط محمد نبی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے اللہ کے آزاد بندوں کی طرف ہے کہ وہ اگر ایمان لائیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں تو اُن کے غلام آزاد ہیں اور اُن کے مولا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں گے اگر ان میں سے کوئی دوسرے قبیلے کا (مولا) ہوگا تو اُسے اُدھر واپس نہیں کیا جائے گا اگر انھوں نے کوئی خون بہایا ہوگا یا کوئی مال لیا ہوگا تو وہ ان کا سمجھا جائے گا اور لوگوں میں ان کا جو قرض ہوگا وہ انھیں دلایا جائے گا ان پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی اور وہ اللہ کے اور محمد کے ذمہ میں ہوں گے والسلام علیکم]

۶۸۔ بنی غادیا[1] کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتابٌ من محمد رسول اللہ لبنی غادیا أنّ لھم الذمّۃ وعلیھم الجزیۃ ولاعداءَ ولاجلاءَ اللیلُ مدٌّ والنھار شدٌّ۔ (الطبقات ۱/ ۲۷۹)

[یہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خط ہے بنی غادیا کے نام۔ کہ وہ ذمی ہیں اور ان پر جزیہ ہے اور ان سے نہ جنگ کی جائے گی نہ اُنھیں جلاوطن کیا جائے گا۔ اور یہ معاہدہ ہمیشہ کے لیے رہے گا]

یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی۔

۶۹۔ بنی عریض[2] کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتابٌ من محمد رسول اللہ لبنی عریضٍ طُعمۃٌ من رسول اللہ عشرۃ أوسُقٍ شعیراً فی کلّ حصادٍ وخمسینَ وسقاً تمراً یُوفَونَ فی کلِّ عامٍ لحینہٖ لایظلمون شیئاً۔

[یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے بنی عریض کے لیے ہے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہر فصل میں دس وسق جَو اور پچاس وسق کھجور ہر سال دیتے رہیں گے اور اُن پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا]

یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی۔

---

[1] بنی غادیا یہودی قبیلہ تھا۔ اللیلُ مدٌّ والنھارُ شدٌّ عربی محاورہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ لیل و نہار کی تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

[2] بنی عریض بھی یہودی تھے۔

۷۰۔ بنی زُہیر بن اُقَیش

ابنِ سعد کہتا ہے کہ ہم سے اسماعیل بن ابراہیم الاسدی بن عُلَیّہَ نے الجریری اور اُنھوں نے ابوالعلاء سے روایت کی، کہا: میں مطرّف کے ساتھ سوق الابل (اونٹوں کے نخاس) میں تھا کہ ایک بدو اپنے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹکڑا لیے ہوئے آیا اور کہنے لگا: تم میں پڑھنا کون جانتا ہے؟ میں نے کہا: میں جانتا ہوں۔ اُس نے کہا: تو اِسے پڑھو یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے لکھ کر دیا ہے۔ اس میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد النّبی لبنی زُہَیرِ بنِ اُقَیشٍ حَیٍّ من عُکْلٍ اَنّھم اِنْ شہدوا اَن لا الٰہ الّا اللہ واَنّ محمداً رّسولُ اللہ وفارقوا المشرکین واَقرّوا بالخُمسِ فی الغنائمھم وسھم النبی وصَفِیّہٖ فانّھم اٰمنون باَمان اللہ ورسولہٖ۔

[یہ محمد نبی کی طرف سے بنی زُہیر بن اُقَیش کے نام ہے جو عُکل کا ایک قبیلہ ہے کہ اگر وہ کلمۂ شہادت لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ پڑھیں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں اور اپنے مویشیوں میں خُمس کا اور رسول کے حصّے (ادا کرنے) کا اقرار کریں تو انھیں اللہ اور اُس کے رسول کی اماں حاصل ہوگی]

لوگوں میں سے کسی نے اُس بدو سے کہا: "کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سُنا ہے؟ ہمیں بھی سناؤ۔" اس نے کہا: ہاں۔ لوگوں نے کہا: تو پھر ہم سے بھی بیان کرو، اللہ تم پر رحم کرے۔ تب ہم نے اُسے یہ کہتے سُنا:

مَن سَرّہٗ اَن یذھب کثیر من وحَرِ الصّدْرِ فلْیصم شھر الصَّبْر وثلاثۃ اَیّامٍ من کُلِّ شھرٍ[1]۔

[جو یہ پسند کرتا ہو کہ اس کے سینے کی جلن کا بڑا حصہ دُور ہو جائے تو اُسے چاہیے کہ ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور ہر ماہ تین دن روزے سے رہے]

پھر کسی نے پوچھا: کیا یہ حدیث تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟

اس نے کہا، میں سمجھتا ہوں تمھیں یہ خوف ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی حدیث منسوب نہ کر دوں، تو خدا کی قسم اب آج کوئی اور حدیث تمھیں نہیں سناؤں گا۔

۷۱۔ ابوظِبیان الازدی الغامدی

ہشام بن محمد بن السائب الکلبی نے بیان کیا کہ ہم سے لوط بن یحییٰ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوظبیان الازدی کے نام خط لکھا جس میں اُسے اور اُس کے قبیلے کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے اپنی قوم کے چند نفر مکہ بھیج کر اس خط کا جواب دیا اُن میں مخنف، عبداللہ، زُہیر بنو سُلَیم، عبدشمس بن عفیف ابن زُہیر وغیرہ تھے۔ یہ لوگ تو مکہ گئے اور آپ کے پاس مدینہ میں الحَجَن بن المرقّع، جُندب ابن

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۲۷۹

زُہَیر ، جُندب بن کعب آتے ۔ ان کے بعد چالیس آدمیوں کو لے کر الحکم بن مُغفّل آئے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوظبیان کو خط لکھا ۔ یہ ابوظبیان صحابی تھے اور انھوں نے حضرت عمر بن الخطاب کا زمانہ بھی پایا تھا ۔

ابن سعد نے خط کا متن نہیں دیا ہے [۱]

۷۲ ۔ حبیب بن عَمرو

ہشام بن محمد بن السائب الکلبی نے جمیل بن مرثد سے روایت کیا ، کہا : الأجئیین کا ایک شخص جس کا نام حبیب بن عَمرو تھا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے اسے یہ خط لکھ کر دیا :

هذا كتابٌ من محمد رسول الله لحبيب ابن عمرو أخي بني أجاء ولمن أسلم من قومه و أقام الصلاة و أتى الزكاة أن له مالهُ وماءه ، ما عليه حاضره و باديه على ذالك عهد الله و ذِمّةُ رسوله ۔ (الطبقات ۱/۲۸۰)

۷۳ ۔ الولید بن جابر

ہشام بن محمد بن السائب الکلبیؒ نے بیان کیا کہ طَیّ کے قبیلہ بنی بُحتُر کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا نام الولید بن جابر بن ظالم بن حارثہ بن حتّاب بن ابی حارثہ بن جُدَی بن تدُول بن بُحتُر تھا ۔ وہ اسلام لایا اور اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط لکھ کر دیا جو ابھی تک اُس کے خاندان میں علاقہ جَبَلَین میں [۲] موجود ہے ۔

۷۴ ۔ سمعان بن عمرو بن قُریط

ابومعشر ، یزید بن رومان ، محمد بن کعب القرظی اور ابن شہاب الزُہری وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمعان بن عَمرو ابن قُریط بن عُبید بن ابی بکر بن کلاب کو عبداللہ بن عَوسَجہ العُرَنی کے ساتھ خط بھیجا ۔ یہ خط چمڑے پر لکھا ہوا تھا اور انھوں نے اس سے اپنے ڈول میں پیوند لگا لیا تھا ۔ اس لیے انھیں بنو الرّاقع کہا جانے لگا ۔ بعد میں سمعان مسلمان ہو گئے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے [۳]

جب العُرَنی نے ڈول میں پیوند لگایا تو اس کی بیٹی نے کہا : مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم پر کوئی بلا نازل ہو گی کیونکہ تمھارے پاس سیّد العرب کا خط آیا اور تم نے اس کی یہ قدر کی کہ ڈول میں چپکا لیا ۔

کچھ زمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا گزر اس کے علاقے سے ہوا اور اس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا ۔ تب یہ حاضرِ خدمت ہوئے اور اسلام لے آئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم ہونے سے پہلے ہی سارا مالِ غنیمت واپس کرا دیا ۔

---

[۱] الطبقات ۱/۲۸۰
[۲] الطبقات ۱/۲۸۰
[۳] معجم البلدان ۲/۱۰۴
[۴] الطبقات ۱/۲۸۰

۷۵۔ فروۃ بن عمرو الجذامیؓ کے نام

حضرت فروۃ بن عمرو الجذامیؓ عمّان پر البلقاء کے علاقے میں رومیوں کے گورنر تھے۔ ایک روایت میں مُعان بھی ہے۔ یہ مسلمان ہو گئے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھ کر ایک قاصد کے ہاتھ بھیجا جس کا نام مسعود بن سعد تھا، اور ہدایا میں ایک سفید خچر، ایک گھوڑا، ایک گدھا، کچھ باریک کپڑے اور زرتار لباس بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکھا:

مِن محمدٍ رسولِ اللہِ إلی فروۃَ بنِ عمرٍو۔ امّا بعد فقد قدمَ علینا رسولُکَ و بلّغَ ما أرسلتَ بہ وخبّرَ عمّا قِبَلَکُمْ و أتانا باسلامک و أنّ اللہ ھداک بھُداہُ إن اصلحت و أطعتَ اللہ ورسولہ و أقمتَ الصّلوٰۃَ و اٰتیتَ الزّکاۃَ۔

[محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے فروۃ بن عمرو کے نام۔ امّا بعد۔ تمھارا قاصد آیا اور کچھ تم نے بھیجا تھا وہ پہنچایا اور تمھارے احوال سے مطلع کیا اور تمھارے اسلام لانے کی خبر پہنچائی۔ اللہ نے تمھیں اپنی ہدایت سے نوازا ہے اگر تم امن پسند رہو، اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرو، نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو]

پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تو انھوں نے قاصد مسعود بن سعد کو بارہ اوقیہ چاندی عطا کی۔ جب رومی بادشاہ کو فروۃ کے مسلمان ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا: اگر تم اپنے (پرانے) دین پر واپس ہو جاؤ تو ہم تمھیں (گورنری پر) بحال کر دیں گے۔ انھوں نے کہا: میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین نہیں چھوڑوں گا۔ تم جانتے ہو کہ حضرت عیسیٰ نے اُن کے آنے کی بشارت دی تھی لیکن تم اپنے ملک کو بچانے کی خاطر نہیں مان رہے ہو۔ تب بادشاہ روم نے انھیں قید کر لیا، پھر قید خانے سے نکال کر قتل کیا اور سُولی پر لٹکا دیا۔[1]

۷۶۔ بکر بن وائل کے نام

قتادہ نے بنی سدوس کے ایک شخص کے حوالے سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکر بن وائل کو لکھا:

أمّا بعد۔ فأسْلِمُوا تَسْلَمُوا۔

[تم اسلام قبول کر لو تو بچ جاؤ گے]

اُسے کوئی خط کا پڑھنے والا نہیں ملا۔ آخر بنی ضُبَیعۃ بن ربیعہ کا ایک شخص آیا اور اس نے خط پڑھا ان لوگوں کا نام بنی الکاتب پڑ گیا تھا اور رسول اللہ کا یہ خط لے کر ظبیان بن مرثد السدوسی آئے تھے۔[2]

---

[1] الطبقات ۱/۲۸۱ معجم البُلدان ۴/۱۵۰ کتاب الوفاء لابن الجوزی ۲/۷۴۰۔۷۴۱

[2] الطبقات ۱/۲۸۲

۷۷ - الشعیر بن عداء کے نام

عبداللہ بن یحییٰ بن سلمان نے کہا کہ الشعیر بن عداء کی اولاد میں سے ایک نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط دکھایا:

من محمد رسول اللہ إلی الشعیر بن عداء أنی قد أخفرتك الرحیم وجعلت لك فضل بنی السبیل۔ (الطبقات ۱/۲۸۲)

۷۸ - الحارث بن کلال[1]

ابن شہاب الزہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر عبد کلال حمیری کے بیٹوں الحارث، مسرح اور نعیم کو لکھا:

سلم أنتم ما آمنتم باللہ ورسولہ وأن اللہ وحدہ لاشریك لہ بعث موسٰی بآیاتہ و خلق عیسٰی بکلماتہ۔ قالت الیہود عزیر ابن اللہ وقالت النصاریٰ اللہ ثالث ثلاثۃ عیسی ابن اللہ۔ (الطبقات ۱/۲۸۲)

الزہری نے کہا کہ یہ خط دے کر آپ نے عیاش بن ابی ربیعۃ المخزومی کو بھیجا اور اُن سے فرمایا جب تم اُن کے علاقے میں پہنچو تو رات کو (بستی میں) داخل نہ ہونا، انتظار کرنا کہ صبح ہو جائے پھر خوب پاک صاف ہو جانا اور دو رکعتیں پڑھنا، اللہ سے پناہ مانگنا اور قبولیت و کامیابی کی دُعا کرنا پھر میرا یہ خط اپنے داہنے ہاتھ میں لینا اور اپنے داہنے ہاتھ سے ان کے داہنے ہاتھ میں دینا تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ پھر آپ نے یہ پڑھا:

لم یکن الذین کفروا من أہل الکتاب والمشرکین منفکین فاذا فرغت منہا فقل آمن محمد وأنا أول المؤمنین۔

پھر وُہ جو بھی دلیل لائیں گے باطل ہو جائے گی اور جو بھی روشن کتاب پیش کریں گے اس کا نور زائل ہو جائے گا، وہ تمہارے سامنے (اپنی کتاب) پڑھیں گے۔ اگر عجمی زبان میں کچھ پڑھیں تو کہنا کہ اس کا ترجمہ کرو، اور کہنا کہ میرے لیے اللہ کافی ہے اسی پر میں ایمان لایا ہُوں اور جو کچھ اس نے نازل کیا ہے، اور مجھے اس نے حکم دیا ہے کہ تمہارے ساتھ عدل کروں۔ اللہ ہمارا تمہارا رب ہے، ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حُجت نہیں ہے۔ اللہ ہمارے تمہارے لیے درمیان اتفاق پیدا کر سکتا ہے اور اسی کی طرف ہم سب کو جانا ہے۔ پھر اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو ان سے پوچھنا کہ وہ تین لکڑیاں کہاں ہیں کہ جب وہ لائی جاتی ہیں تو یہ لوگ اسے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ جھاؤ کے درخت کی تین شاخیں ہیں جن پر پالش کیا ہوا ہے کچھ سفید اور کچھ زرد ان کا رنگ ہے اور ایک لکڑی گرہ دار ہے جو دیکھنے میں خیزران (نرکل) معلوم ہوتی ہے اور کالی والی موٹی سا سم کی سی ہے۔ ان لوگوں نے وہ لکڑیاں نکالیں اور انھوں نے اُسے جلا دیا۔

---

[1] الحارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور النعمان ذی رعین، ہمدان اور معافر کے قیل (نواب) تھے۔

عیاش کہتے ہیں کہ میں گیا اور جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ویسے ہی کیا جب میں (اُن کی بستی میں) داخل ہوا تو لوگ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے۔ میں ان کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ تین گھروں کے دروازوں پر تین بڑے پردے دیکھے، ایک پردہ اٹھایا اور بیچ کے دروازے میں داخل ہوا تو اُس گھر کے بڑے کمرے میں مجھے یہ لوگ مل گئے میں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں، اور جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات دی تھیں اسی طرح میں نے عمل کیا۔ چنانچہ وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

محمد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوکِ حمیر کو یہ خط لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد رسول الله الى الحارث بن عبد كُلال و نُعَيم بن عبد كُلال والنّعمان قَيْلِ ذى رُعَين وهَمدان و مَعافر، امّا بعد فانّى أحمد اليكم الله الذى لا إله الّا هو فانّه وقع الينا رسولكم قافلاً من ارض الروم فلقينا بالمدينة فبلّغ ما أرسلتم و أنبانا باسلامكم وقتلكم المشركين وان الله تعالىٰ قد هداكم بهدايته ان اصلحتم واطعتم الله ورسوله واقمتم الصّلاة وأتيتم الزكاة واعطيتم من المغانم خُمس الله وخُمس نبيّه و صفيّه وماكتب الله على المؤمنين من الصدقة ومن كان على يهوديته ونصرانيته فانّه لا يُغيّر عنها وعليه الجزيه۔ (كتاب الوفا ۲/۷۴۳)

۷۹۔ عبدالقیس کے نام

الزہری ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالقیس کو یہ خط لکھا:

من محمد رسول الله إلى الأكبرِ بنِ عبدِ القيسِ أنّهم آمنون بامان الله و امان رسوله على ما أحدثوا فى الجاهلية من القُحَم وعليهم الوفاءُ بما عاهدوا ولهم أن لا يُحبَسُوا عن طريق الميرة ولا يُمنعوا صَوبَ القَطْرِ ولا يُحرَمُوا حريم الثّمارِ عند بلوغه والعلاءُ بن الحضرمى أمين رسول الله على برّها و بحرها وحاضرها و سَرايا ها و ماخرج منها و أهل البحرين خُفَراؤه من الضّيم وأعوانه على الظالم وأنصاره فى الملاحم عليهم بذٰلك عَهْدُ اللهِ وميثاقُه لا يُبدّلوا قولاً ولا يُريدوا فُرقةً ولهم على جُندِ المسلمين الشّركةُ فى الفئ والعدلُ فى الحكم والقصدُ فى السّيرة حكمٌ لا تبديل له فى الفريقين كِليهما والله ورسوله يشهد عليهم۔ (الطبقات ۱/۲۶۳)

[محمد رسول اللہ کی طرف سے الاکبر بن عبدالقیس کی طرف۔ انھیں اللہ اور اس کے رسول کی امان حاصل ہے اُن باتوں سے جو بدعنوانیاں انھوں نے عہدِ جاہلیت میں کیں اور جو معاہدہ انھوں نے کیا ہے اُسے

پُورا کرنا اُن پر واجب ہے۔ ان کے غلہ اور خوراک کے راستے نہیں روکے جائیں گے اور پھلوں کے پک جانے پر اُنھیں روکا نہیں جائے گا۔ العلاء بن حضرمی رسول اللہ کے امین ہیں جو خشکی اور سمندر، جنگل اور بستی اور اس کی کل پیداوار کے نگراں ہیں۔ بحرین کے باشندے ہر ظلم سے ان کی پناہ میں ہیں اور ظالموں سے لڑنے میں اُن کے مددگار ہوں گے اور میدانِ جنگ میں اُن کی پشت پناہی کریں گے۔ اس کے لیے ان کا عہد و میثاق اللہ سے ہے اس میں کوئی لفظ تبدیل نہ کریں اور اس سے علٰحدگی نہ چاہیں۔ مسلمانوں کے لشکر میں وہ مالِ غنیمت کے شریک ہوں گے اور حکم میں انصاف کریں گے اور سیرۃ پسندیدہ رکھیں گے۔ اس حکم میں دونوں فریقوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اللہ اور اس کا رسول (اس معاہدے پر) اُن کے درمیان گواہ ہیں]

۸۰۔ اقیالِ حضرموت کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرموت کے اقیال[1] اور بڑے لوگوں کو بھی خطوط لکھے جن میں زُرعۃ، قہد، البتی، البَحَیری، عبدکلال اور ربیعۃ و حُجر شامل ہیں[2]

۸۱۔ نُفاثہ بن فروۃ کے نام

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نُفاثہ بن فروۃ الدئلی ملک السماوۃ کو بھی خط لکھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے قبیلہ عُذرہ کو عسیب یعنی کھجور کی شاخ پر لکھا ہوا خط بھیجا جسے بنی عذرہ کا ایک شخص لے کر گیا ورد بن مرداس نے جو قبیلہ بنی سعد ہذیم کا ایک فرد تھا اس شاخ کو توڑ دیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہوا اور زید بن حارثہ کے ساتھ غزوۃ وادی القریٰ یا غزوۃ القردۃ میں شہید ہوا[3]۔

۸۲۔ مُطرف بن الکاہن الباہلی

آپ نے مطرف بن الکاہن الباہلی کو یہ خط لکھا:

هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله لمطرّفِ بنِ الكاهنِ ولمن سكنَ بيشةَ من باهِلةَ أنّ مَنْ أحيا أرضاً مواتاً بيضاءَ فيها مُناخُ الأنعامِ ومُراحٌ فهي له وعليهم في كُلِّ ثلاثينَ من البقرِ فارِضٌ وفي كُلِّ أربعينَ من الغنمِ عَتُودٌ وفي كلِّ خمسينَ من الإبلِ ثاغيةٌ مسِنّةٌ وليس للمصدّقِ أن يُصَدِّقَها إلا في مَراعِيها وهم آمنون بأمانِ الله۔ (الطبقات ۱/۲۸۴)

[محمد رسول اللہ کی طرف سے مطرف بن الکاہن کے نام اور باہلہ میں سے جو بھی اُس علاقے میں رہے کہ

---

[1] اِقیال - قَیل (بروزن فیل) کی جمع ہے بمعنی امرا اور شاہی خاندان کے افراد۔
[2] ابنِ سعد نے ان میں سے کسی خط کا متن نہیں دیا ہے۔ (الطبقات ۱/۲۸۴)
[3] الطبقات ۱/۲۸۴

جو کوئی بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنائے گا جس میں مویشیوں کے لیے چراگاہ اور میدان بھی ہوں تو وہ زمین اُسی کی ہوگی۔ ان لوگوں پر تینتس گایوں میں سے ایک پوری گائے اور چالیس بکریوں پر ایک بکری اور پچاسس اونٹوں پر ایک پورا اونٹ بطور زکوٰۃ واجب ہوگا، اور زکوٰۃ دینے والا ان کی زکوٰۃ چراگاہوں میں ہی ادا کرے گا اور انھیں اللہ کی امان حاصل ہو گی]

۸۳ - نَہشَل بن مالک الوائلی باہلہ کے نہشل بن مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا؛ یہ خط عثمان بن عفان نے لکھا:

باسمك اللهمّ هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله لنَهْشَلِ بنِ مالكٍ و من مَعَهُ من بنی وائلٍ لمن أسْلَمَ وَ أقامَ الصّلاةَ و اٰتی الزّكاة و أطاع الله و رسوله و أعطٰی من الغنَم خُمُسَ الله و سَهم النبیِّ واشهد علی اسلامه و فارق المشركين فانّه آمنٌ بامان الله وبریء إليهِ محمدٌ من الظلم كُلِّهِ و أنّ لهم أنْ لا يُحْشروا و لا يُعشروا وعاملهم من أنفُسِهم۔ (الطبقات ۱/ ۲۸۴)

[اے اللہ تیرے نام سے۔ یہ خط محمد رسول اللہ کا ہے نہشل بن مالک اور اس کے ساتھیوں کے نام جو قبیلہ بنی وائل سے اسلام لائے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے ہیں اور اپنے غنیمت میں سے اللہ کا خُمس اور رسول اللہ کا حصہ ادا کرتے ہیں اور جو اپنے اسلام پر گواہی دیں، مشرکوں سے الگ تھلگ رہیں، انھیں اللہ کی امان حاصل ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انھیں ہر ظلم سے بچائیں گے اور اُنھیں زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا نہ ان سے عُشر (لگان) لیا جائے گا اور اُن کا عامل اُنھیں میں سے مقرر کیا جائے گا۔

۸۴ - بنو ثقیف کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ثقیف کو لکھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول محمد بن عبد اللہ کے ذمہ میں ہیں اُن شرائط پر جو اُنھیں لکھی گئیں۔ اور یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی اور اس پر الحسنؓ اور الحسینؓ نے گواہی ثبت کی۔ یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نُمیر بن خَرَشَہ کو دیا۔ یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی تھی:

هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله إلی المؤمنين، انّ عِضاهَ وَجٍّ وصيدَه لا يُعْضَدُ فمن وُجِدَ يفعل ذٰلك فانه يُؤخَذُ فَيُبَلِّغ النبیَّ وهذا أمرالنبیِّ محمدبنِ عبد اللهِ رسول الله۔ (الطبقات ۱/ ۲۸۵)

۸۵ - سَعید بن سُفیانِ الرِّعلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید بن سُفیان کو یہ خط خالد بن سعید سے لکھوا کر عطا فرمایا:

هذا ما أعطى رسول الله صلّى الله عليه وسلّم سعيد بن سُفيانَ الرِّعلي أعطاهُ نخلَ السُّوارقية وقصرها لا يُحاقّه فيها أحدٌ ومن حاقّهُ فلا حقَّ له وحقّه حقٌّ۔

(الطبقات ۱/۲۸۵)

[اس دستاویز کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید بن سفیان الرعلی کو سوارقیہ کا پورا نخلستان عطا فرمایا ہے اس میں اور کوئی دعویدار ہوگا تو اس کا دعویٰ باطل ہوگا۔]

۸۶ - عُتبہ بن فرقد

عتبہ بن فرقد کے نام یہ دستاویز معاویہ نے لکھی:

هذا ما أعطى النبيُّ صلى الله عليه وسلم، عُتبةَ بن فرقد، أعطاهُ موضعَ دارٍ بمكة يَبنيها مِمّا يلي المروةَ فلا يُحاقّه فيها أحدٌ ومن حاقّه فانّه لا حقّ له وحقّهُ حقٌّ۔ (الطبقات ۱/۲۸۵)

[اس دستاویز کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن فرقد کو مکہ میں ایک گھر کی جگہ دی ہے کہ وہ مروہ کے آگے تعمیر کرلیں، اس میں کوئی اور دعویٰ کرے تو باطل سمجھا جائے گا]

۸۷ - سَلَمَۃ بن مالک السلمی

سلمۃ بن مالک السلمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دستاویز لکھ کر عطا فرمائی اور اس پر علی بن ابی طالب اور حاطب بن ابی بلتعہ نے گواہی ثبت کی:

هذا ما أعطى رسول الله، صلى الله عليه وسلم، سَلَمَةَ بْنَ مالك السّلمى، أعطاهُ ما بين ذات الحناظي إلى ذات الأساود، لا يُحاقّه فيها أحدٌ۔ (الطبقات ۱/۲۸۵)

[یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمۃ بن مالک السلمی کو ذات الحناظی سے ذات الاساود تک کا درمیانی علاقہ عطا فرمایا ہے اس میں اور کوئی دعویٰ کرے تو باطل ہوگا]

۸۸ - بنی خباب کلبی کے نام

هذا كتابٌ من محمد النبي رسول الله لبني خبابٍ وأحلافهم ومن ظاهرهم على إقام الصلاة وإيتاء الزكاة والتمسّك بالايمان والوفاء بالعهد وعليهم في الهاملة الرّاعية في كل خمسٍ شاةٌ غيرُ ذاتِ عوارٍ والحمولةُ المائرة لهم لاغيةٌ والسّقيُ الرّواءُ والعِذىُ من الأرض يقيمهُ الأمينُ وظيفةٌ لا يُزاد عليهم۔

شهد سعد بن عبادة وعبد الله بن أُنَيس ودِحية بن خليفة الكلبي۔

(الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ خط محمد نبی رسول اللہ کی طرف سے بنی خباب اور ان کے حلیفوں کے لیے ہے اور ان کے لیے جو نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، ایمان پر مستقیم رہنے اور عہد کو پورا کرنے میں اُن کے معاون ہوں۔ چرواہے کے

ساتھ اور بغیر چرواہے کے جانوروں میں انھیں ہر پانچ بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں دینا ہوگا جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ بار برداری کے جانور، جن سے اون اتاری جائے اور جو بیکار ہوں، وہ اُن کے ہوں گے۔ آبپاشی کی زمینیں اور وسائل اور بارش سے سیراب ہونے والی زمینوں کا لگان امین مقرر کرے گا جو اُن پر زیادہ نہیں کیا جائے گا۔

گواہ سعد بن عبادہ و عبد اللہ بن اُنیس اور دِحیہ بن خلیفہ الکلبی]

۸۹ - مُہری بن الابیض

هذا كتاب محمد رسول الله لمَهْرِيّ بن ابيض على من اٰمَنَ مِن مَهْرَةَ أنهم لا يُؤكلون ولا يغار عليهم ولا يُعركون وعليهم اقامة شرائع الاسلام فمن بدّل فقد حارب الله و من اٰمَنَ به فله ذمّة الله و ذمّة رسوله اللُّقَطَةُ مؤدَّاةٌ و السَّارحةُ منداةٌ و التَّفَثُ السَّيِّئَةُ وَ الرَّفَثُ الفُسُوْقُ و كتب محمد بن مسلمة الأنصاري[1] (الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے مُہری بن الابیض کے نام ہے کہ مُہرہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اُنھیں اکھاڑا نہیں جائے گا، اُن پر حملہ نہیں ہوگا، اُن سے جنگ نہیں کی جائے گی۔ اُن پر یہ ذمہ داری ہے کہ شرائع اسلام کو قائم کریں، جو ان میں تبدیلی کرے گا وہ خدا سے جنگ کرتا ہے اور جو اُن پر ایمان لائے وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں رہے گا۔ گری پڑی چیز واپس ہوگی اور چرنے والے مویشیوں کو سیراب کیا جائے گا گندگی، بُرائی، فحش گوئی اور بدکاری سے بچیں گے]

۹۰ - خَثْعَم کے نام

خَثْعَم والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دستاویز لکھ کر دی۔ اس پر جریر بن عبد اللہ اور حاضر الوقت صحابی نے گواہی ثبت کی۔

هذا كتابٌ من محمّد رسول الله لخثعَمَ من حاضِرِ ببيشَة و باديتها أنّ كُلّ دَمٍ أَصَبْتُمُوهُ فى الجاهلية فهو عنكم موضوعٌ ومن أسْلَمَ منكم طوعًا أو كُرهًا فى يَدِهِ حَرْثٌ من خبارٍ أو عَزازٍ تَسْقِيهِ السماءُ أو يرويه اللثى فزكا عمارةً فى غيرِ أزمةٍ ولا حطمةٍ فله نشرهُ و أكْلُه وعليهم فى كُلِّ سَيْحٍ العُشْرُ و كُلّ غربٍ نصف العُشْرِ۔

(الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ محمد رسول اللہ کا خط ہے خَثْعَم کے لیے، ان کے صحرا میں رہنے والوں اور بستیوں میں رہنے والوں کے لیے،

---

[1] یہ خط ابنِ سعد کے زمانے تک محفوظ تھا۔ (الطبقات ۱/۳۵۹)

انھوں نے زمانہ جاہلیت میں جو خون کیا ہو اس کا قصاص اٹھایا جاتا ہے اور اُن میں سے جو خوشی سے یا با دلِ نخواستہ ایمان لائے ہیں اُن میں جن کے ہاتھ میں کھیتی ہے، آبپاشی کی ہو یا آسمان سے سیراب ہونے والی اور جو قحط سالی یا آتش زنی کے دنوں کے سوا بھری پڑی رہتی ہو اس کی پیداوار ان کے لیے ہے اور اُنھیں ہر سیراب زمین کی پیداوار سے دسواں حصہ اور کم سیراب زمینوں کی پیداوار پر بیسواں حصہ دینا ہوگا۔]

۹۱ - ثُمالۃ والحُدّان

ثمالۃ اور الحُدّان کے وفود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوئے تو آپ نے یہ دستاویز ثابت بن قیس بن شماس سے لکھوا کر دی اور اس پر گواہی سعد بن عبادۃ اور محمد بن مسلمۃ نے ثبت کی:

هذا كتابٌ من محمد رسول الله لبادية الاسياف ونازلة الأجوافِ مما حازت صُحارُ ليسَ عليهم في النخل خِراصٌ ولا مِكيالٌ مُطبقٌ حتّى يوضع في العَداءِ وعليهم في كُلِّ عَشَرَةٍ أوساقٍ وسْقٌ۔ (الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ خط محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے اُن جنگجو صحرانشینوں کی طرف ہے جو صُحارؒ کے علاقے میں جمع ہیں ان کی کھجوروں کی پیداوار میں اندازہ یا بند پیمانوں سے کام نہیں لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ سب ڈھیر کرلی جائیں اور انھیں ہر دس وسق میں ایک وسق (زکاۃ) دینا ہوگی۔]

۹۲ - بارق الازدی

هذا كتابٌ من مُحمّدٍ رسولِ الله لبارقٍ أن لا تُجذَّ ثِمارُهُم وأن لا تُرعى بلادُهم في مَربَعٍ ولا مصِيفٍ إلّا بمسألةٍ من بارقٍ ومن مرَّ بهم من المسلمين في عَرَكٍ[۲] أو جدْبٍ[۳] فله ضيافةُ ثلاثةِ أيّامٍ فاذا أينعت ثمارهم فلابنِ السّبيلِ اللقاطُ يوسعُ بطنَه من غيرِ أن يقتثم[۴] (الطبقات ۱/۲۸۷)

یہ خط ابی بن کعب نے لکھا اور اس پر گواہی ابو عبیدہ بن الجراح اور حذیفۃ بن الیمان نے ثبت کی۔

[یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے بارق کے لیے ہے کہ اُن کے پھلوں کو (جلدی) نہیں توڑا جائے گا اور

---

[۱] معجم البلدان ۳/۳۹۳

[۲] عَرَك = اُونٹوں کو چارہ کھانے کے لیے چھوڑ دینا، خاص طور سے حنظل کے جنگل میں۔

[۳] جَدب = وہ زمین جہاں چرنے کے لیے گھاس نہ ہو۔

[۴] یقتثم = ساتھ میں (بہت سا سامان وغیرہ) لے جانا۔

اُن کے علاقوں میں موسمِ بہار یا جاڑوں میں جانور نہیں چرائے جائیں گے مگر بارق سے پُوچھ کر۔ اور مسلمانوں میں سے جو کوئی ان کے علاقے میں اونٹوں کی چراگاہ یا بے چارے والی زمین سے گزرے گا تو یہ اس کی تین دن تک مہمان نوازی کریں گے اور جب ان کے پھل پک جائیں تو اُس میں سے گرے پڑے پھل مسافروں کے ہوں گے جتنا بھی ان کے پیٹ میں سمائیں، مگر وہ ساتھ نہیں لے جائیں گے]

۹۳۔ وائل بن حُجر کے نام

وائل بن حُجر جب اپنی بستی کی طرف جانے لگے تو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ میری قوم کے لیے ایک خط تحریر فرما دیں۔ آں حضرتؐ نے امیر معاویہ سے فرمایا عباہلہ کو اِقیال (امراء) کے نام لکھ دو کہ وہ نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور چرنے والے جانوروں پر صدقہ (زکاۃ) ادا کریں اس میں خِلاط[1]، وِراط[2]، جلب[3]، جنب[4] اور شناق[5] نہیں ہے۔ اُن پر یہ واجب ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی مدد کریں اور ہر دس پر ایک بارِ شتر (زکاۃ) ہوگی۔ جو (اپنا مال) چھپائے گا وہ سود خور (کے حکم میں) ہوگا۔

وائل نے کہا کہ یا رسول اللہ! جاہلیت میں جو زمین میرے پاس تھی اس کے لیے بھی فرمان لکھ دیجئے۔ آپ نے یہ تحریر فرمایا:

هذا كتابٌ من محمدٍ النبي لوائل بن حُجرٍ قَيلِ حضرموتَ و ذٰلك أنك أسلمتَ وجعلتُ لك ما في يَديكَ من الأرضين والحُصونِ وإنّه يُؤخَذ منكَ من كُلِّ عَشَرَةٍ واحدٌ ينظرُ في ذٰلك ذوا عدلٍ وجعلتُ لك أن لا تُظلَمَ فيها ما قامَ الدّينُ والنّبيُّ والمؤمنون عليهِ أنصارٌ[6]

[یہ خط محمد نبی کی طرف سے حضرموت کے امیر وائل بن حُجر کے نام ہے۔ چونکہ تم مسلمان ہو گئے ہو میں نے تمھاری زمینیں اور قلعے تمھارے لیے کر دیے ہیں اور تم سے (ہر سال) دسواں حصہ لیا جائے گا اور دو اہلِ عدل اس کا فیصلہ کریں گے اور ایسا (انتظام) کیا جائے گا کہ اِس (تعینِ لگان) میں تم پر ظلم نہ ہو جب تک دین قایم ہے اور نبی اور مومنین ہیں وہ تمھارے مددگار رہوں گے]

بعض راویوں نے یہ کہا ہے کہ الاشعث کِندی وغیرہ نے حضرموت میں وائل بن حُجر سے جائداد کے معاملے میں کچھ جھگڑا کیا اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعویٰ پیش کیا تب آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ دستاویز لکھی۔

---

[1] خِلاط = اپنے مال کو دوسرے کے مال میں ملانا
[2] دراط = دھوکا دھڑی
[3] جَلَب = قیمت گھٹانا
[4] جنب = کترانا، آنا کانی کرنا
[5] گڈمڈ کرنا
[6] الطبقات ۱/۲۸۷

۹۴ - اہلِ نجران کے نام

هذا كتابٌ من محمد النبي رسول الله لاهلِ نجرانَ أنّهُ كان له عليهم حكمُه في كلِّ ثمرةٍ صفراءَ أو بيضاءَ أو سوداءَ أو رقيقٍ فافضلَ عليهم وترك ذلك كلهُ على ألفَيْ حُلّةَ حُللِ الأواقي في كلِّ رجبٍ ألفُ حُلّةَ وفي كلِّ صفرٍ ألفُ حُلّةٍ كلّ حُلّةَ أوقية فما زادت حُللُ الخراجِ أو نقصتْ على الأواقي فبالحساب وما قبضُوا من دروعٍ أو خيلٍ أو ركابٍ أو عرضٍ أُخِذَ منهم فبالحسابِ وعلى نجرانَ مثواةُ رُسُلي عشرين يومًا فدون ذلك ولا تُحبَسُ رُسُلي فوقَ شهرٍ وعليهم عاريةٌ ثلاثين درعًا وثلاثين فرسًا وثلاثين بعيرًا إذا كان باليمنِ كيدٌ وما هلك ممّا أعاروا رُسُلي من دروعٍ أو خيلٍ أو ركابٍ فهو ضمانٌ على رُسُلي حتى يؤدّوه إليهم ولنجرانَ وحاشيتهم جوارُ الله وذمّةُ محمدٍ النبي رسول الله على أنفسهم وملّتهم وأرضهم وأموالهم وغائبهم وشاهدهم وبيعهم وصلواتهم لا يغيّروا أُسقفًا عن أُسقفيّتهِ ولا راهبًا عن رهبانيّتهِ ولا واقفًا عن وقْفانيّتهِ وكلّ ما تحتَ أيديهم من قليلٍ أو كثيرٍ وليس ربًا ولا دمَ جاهليّةٍ ومن سأل منهم حقًّا فبينهم النّصفُ غيرَ ظالمينَ ولا مظلومين لنجرانَ ومَن أكلَ ربًا من ذي قبلَ فذمّتي منه بريئةٌ ولا يؤاخذُ أحدٌ منهم بظلمِ آخرَ وعلى ما في هٰذهِ الصحيفةِ جوار الله وذمّة النّبي أبدًا حتّى يأتي الله بامرهِ إن نصحوا وأصلحوا فيما عليهم غيرَ مُثقَلينَ بظُلمٍ۔

[یہ خط محمد رسول اللہ نبی کی طرف سے اہلِ نجران کے لیے ہے، اُن پر اگرچہ نبی کا حکم ہے اور وہ سونے چاندی اور لوہے (اسلحہ) یا غلاموں میں سے (اپنا حصہ) لے سکتے ہیں، مگر اُنھوں نے سب اُن کے لیے چھوڑ دیا اور خراج میں ایک اوقیہ (قیمت) کے دو ہزار حُلّے (لباس) سالانہ مقرر کر دیے - ان میں سے ایک ہزار حُلّے رجب کے مہینے میں اور ایک ہزار صفر کے مہینے میں دیے جائیں گے، ہر حُلّہ ایک اوقیہ (قیمت) کا ہوگا - اگر کوئی حُلّہ کم یا زیادہ قیمت کا ہوگا اس کا حساب لگا لیا جائے گا - اگر وہ حُلّوں کے بدلے زرہ بکتر یا گھوڑے یا سواری کے جانور دیں گے تو وہ بھی حساب میں لگا لیے جائیں گے - اہل نجران پر لازم ہے کہ وہ میرے کارندوں کو بیس دن یا کچھ زیادہ ٹھہرائیں، اور (لگان دینے کے لیے) اُنھیں ایک مہینے سے زیادہ ٹھہرنے پر مجبور نہ کریں - اگر یمن سے جنگ ہو تو وہ ۳۰ زرہ بکتر، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اونٹ عاریۃً دیں گے - اگر جنگ میں کچھ زرہیں، اونٹ یا گھوڑے ضائع ہو جائیں تو اُن کے ضامن ہمارے کارندے ہوں گے یہاں تک کہ وہ (اُن کا بدلہ) ادا کر دیں - اہلِ نجران اور اُن کے ساتھیوں کے لیے اللہ اور محمد نبی

رسول اللہ کا ذمہ ہے۔ اُن کی جانیں، ملت (مذہب)، اُن کی زمین، اموال، اُن کے غائب افراد، موجود افراد، ان کے کارندے، اُن کی نمازیں (سب کی ضمانت ہے)۔ اُن کے کسی پادری کو تبدیل نہیں کیا جائے گا نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے ہٹایا جائے گا نہ کسی واقف کو اس کی وقفانیت سے برطرف کیا جائے گا جو کچھ (جائداد) قلیل یا کثیر اُن کے قبضے میں ہے وہ ان کی رہے گی۔ کوئی سُود نہ ہوگا اور زمانہ جاہلیت کے کسی خون کا قصاص بھی نہ ہوگا۔ اُن میں سے کوئی اگر اپنا حق مانگے گا تو اُن کے درمیان ایسے انصاف کرنے والے (مسلمان قاضی) ہوں گے جو نہ ظالم ہوں اور نہ ظلم کرنے دیں۔ اور جس نے (اسلام کے ظہور سے پہلے) کچھ سُود کھایا ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ تم میں سے کسی کا مواخذہ دوسرے کے ظلم کے لیے نہیں کیا جائے گا۔ اس معاہدے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے اللہ اور اس کے نبی کا ذمہ ہے یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم ظاہر کر دے جب تک یہ خیر خواہ رہیں، آپس میں امن و سلامتی سے رہیں اور ظلم سے مجبور نہ کر دیے جائیں۔]

اس معاہدے پر ابوسفیان بن حرب، غیلان بن عمرو، مالک بن عوف النصری، الأقرع بن حابس اور المستورد بن عمرو اخو بلی اور المغیرہ بن شعبہ و عامر مولی ابوبکر نے گواہی ثبت کی۔[1]

۹۵۔ اکیدر[2] کے نام

اہل دُومۃ کے ایک شیخ نے محمد بن عمر الاسلمی الواقدی سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُکیدر کو یہ خط لکھا تھا۔ راوی نے وہ خط بھی دکھایا اور الواقدی نے اس کی نقل حاصل کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتابٌ من محمد رسول اللہ لِأُکیدِرَ حین أجاب إلی الاسلام وخلعَ الأنداد والأصنام مع خالد بنِ الولیدِ سیفِ اللہ فی دُومۃ الجندلِ وأکنافہا أنَّ لنا الضاحیۃ من الضحلِ والبورَ والمعامیَ وأغفال الأرضِ والحلقۃَ والسلاحَ والحافرَ والحِصنَ ولکم الضامنۃ

---

[1] الطبقات ۱/۲۸۷-۲۸۸

[2] اکیدر دُومۃ الجندل کا امیر تھا۔ اس مقام کے لیے دیکھیے:

معجم البلدان ۲/۴۸۷۔ اُکیدر عیسائی تھا اور مذکورہ بالا شرائط پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے صلح کی تھی لیکن بعد کو اس نے عہد شکنی کی تو اُسے حضرت عمر فاروق نے جلاوطن کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا خط کی تشریح یاقوت نے کی ہے:

الضاحی، البارز یعنی نمایاں۔ الضحل، کم پانی والے تالاب۔ البور، وہ زمین جس میں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو، افتادہ اراضی۔ المعامی، دُور افتادہ اور بیکار زمین۔ اغفال، جہاں کچھ آثار نہ ہوں۔ حلقہ، زرہیں۔ حافر، گھوڑے خچر وغیرہ باربرداری اور سواری کے جانور۔ حصن سے مراد دُومۃ الجندل کا قلعہ۔ الضامنہ، وہ محصور نخلستان جو قلعہ دُومۃ الجندل کے اندر ہے۔ المعین، بارہ مہینے جاری رہنے والا پانی۔

من النخلِ و المعينُ من المعمور و بعد الخُمُسِ لا تُعْدَلُ سارِحتُكم و لا تُعَدُّ فارِدتُكم ولا يُحظَرُ عليكم النباتُ و لا يُؤخذُ منكم إلاّ عُشْرُ الثَّباتِ، يقيمون الصلاة لوقتها و تؤتون الزكاة بحقّها، عليكم بذٰلك العهد و الميثاقُ و لكم بذٰلك الصِّدقُ و الوفاءُ۔

(الطبقات ۱/ ۲۸۸ - ۲۸۹)

[یہ تحریر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اُکیدر کے نام ہے جب کہ اس نے خالد بن ولید سیف اللہ کے سامنے دُومۃ الجندل میں اسلام قبول کیا ہے اور بتوں کی پُوجا چھوڑ دی ہے۔ ہمارے لیے تالاب کے اطراف کی زمینیں، غیر مزروعہ اور افتادہ زمینیں، ہتھیار کے ذخیرے اور قلعے، چوپائے اور تمہارے لیے نخلستان اور چشمے ہیں۔ خُمس کے بعد تمہارے مویشیوں پر ٹیکس نہیں ہوگا اور (زکوٰۃ کا حساب کرنے کے لیے) اِکا دُکا جانوروں کو دوسرے ریوڑ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ تمہارے لیے چراگاہوں میں باڑھ نہیں لگائی جائے گی (ممنوع نہیں ہوں گی) اور تم سے پُرانے درختوں کی پیداوار کے دسویں حصّے (عُشر) کے علاوہ کچھ نہیں لیا جائے گا، بشرطیکہ تم نماز اس کے مقررہ اوقات میں پڑھتے رہو اور زکوٰۃ اس کے حساب سے ادا کرتے رہو۔ اس پر تم سے یہ عہد و میثاق ہوا ہے اور تمہارے لیے اس کی پابندی صدق دل سے کرنا واجب ہے]

اس دستاویز پر اللہ اور تمام حاضر الوقت مسلمانوں کو گواہ بنایا گیا۔

۹۶ - یُحَنّہ بن رُوبہ

جب دُومۃ، اَیلہ اور تیماء والوں نے دیکھا کہ عرب کی اکثریت مسلمان ہوتی جا رہی ہے تو انھیں خوف ہوا، اَیلہ کا حکمران یُحَنّہ بن رُوبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ اُسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے علاقے میں بھی اسی طرح لشکر نہ بھیج دیں جیسے آپ نے اُکیدر کی طرف بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ اہلِ شام، اہلِ یمن، اہل البحر، جربا اور اَذرح کے لوگ بھی آئے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی۔ آپ نے اس پر جزیہ مقرر کر دیا اور یہ دستاویز لکھوا کر دے دی۔ آپ نے اہل ایلہ پر تین سو دینار سالانہ جزیہ مقرر کیا تھا کیونکہ یہ لوگ تعداد میں تین سو ہی تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا أَمَنَةٌ من الله و محمد النبي رسول الله لِيُحَنَّةَ بن رَوْبَةَ وَ أَهلِ أَيلةَ لسُفُنِهم و سيّاراتهم في البرّ والبحرِ لهم ذِمّة الله و ذمّة محمدٍ رسول الله و لمن كان معهم من أهل الشام و أهل اليمن و أهل البحرِ و من أحدث حدثاً فانّه لا يَحُولُ مالُهُ دونَ نفسه و أنّه طيّبة لمن أخذه من الناسِ و انّه لا يحلّ أنْ يُمنعُوا ماءً يَردونه ولا طريقاً يُريدونه من برٍّ و بحرٍ، هذا كتابُ جُهَيْمِ بنِ الصَّلْتِ

و شُرَحبِیلَ بنِ حسنَۃَ باذنِ رسول اللہ۔ (الطبقات ۱/ ۲۸۹)

[یہ امن نامہ اللہ اور اس کے نبی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے یُحَنّہ بن رَوبَۃ اور اہلِ اَیلَہ[1] کے لیے ہے۔ اُن کی کشتیاں اور سواریاں، خشکی اور سمندر میں، اللہ اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ میں ہیں اور اُن کے ساتھ جو شامی، یمنی، البحر والے ہیں (اُن کے لیے بھی یہ امان ہے) جو کوئی نئی بات کرے گا وہ اپنے مال کو اپنے سوا دوسروں کو منتقل نہیں کرے گا۔ ہاں جو کچھ وہ لوگوں سے لیں وہ جائز ہوگا اور اُنھیں یہ جائز نہیں ہے کہ جس پانی پر وُہ اُتریں اس سے دوسروں کو روکیں یا خشکی اور تری کے جس راستے پر وُہ ہوں (اس میں لُوٹ مار کریں)۔ یہ تحریر جہیم بن الصّلت اور شرحبیل بن حسنہ کی ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھی ہے]

الواقدی نے عاصم بن عمر بن قتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ عبدالرحمٰن بن جابر نے اپنے باپ (جابر) سے روایت کیا کہ انھوں نے یُحَنّہ بن رَوبَہ کو دیکھا تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو ایک سونے کی صلیب اس کے ماتھے پر بندھی ہوئی تھی اس نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اُسے چُھپا لیا اور اپنے سر کو جُھکا لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اشارہ کیا کہ اپنا سر اوپر اٹھاؤ۔ پھر آپ نے اس سے صُلح کر لی اور اسے ایک یمنی چادر اوڑھائی۔ اور حکم دیا کہ اسے بلال رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہرایا جائے۔ راوی نے کہا کہ میں نے اُکیدر کو بھی دیکھا تھا جب اسے خالد بن الولید رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے اس کے جسم پر بھی سونے کی صلیب تھی اور ریشمی لباس پہنے ہُوئے تھا۔

۹۷۔ اہلِ اذرُح[2] کے نام

الواقدی نے اس خط کی نقل بھی حاصل کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اذرح کے لیے لکھوایا تھا۔ یہ لوگ یہودی تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتاب من محمدٍ النبی لأھل أذرُح أنھم اٰمنون بأمان اللہ و محمد و أنّ علیھم مائۃَ دینارٍ فی کلِّ رجبٍ وافیۃً طیّبۃً واللہ کفیلٌ علیھم بالنصح و الاحسان للمسلمین و من لجأ إلیھم من المسلمین من المخافۃِ والتعزیر إذا خشوا علی المسلمین وھم اٰمنون حتّٰی یُحَدِّثَ إلیھم محمدٌ قبل خروجہ۔

[یہ تحریر محمد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اہل اذرح کے لیے ہے کہ وہ اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امان میں ہیں اور ان پر لازم ہوگا کہ وہ سَو دینار سالانہ (جزیہ) ہر رجب کے مہینے میں پورا پورا

---

[1] اَیلہ۔ معجم البلدان ۱/ ۲۹۲

[2] اذرُح ذریح کی جمع ہے۔ یہ اطرافِ شام میں ایک بستی کا نام ہے۔ یہ معاہدہ ۹ھ میں ہوا تھا۔ معجم البلدان ۱/ ۱۳۰

ادا کریں۔ اللہ ان کا کفیل ہوگا۔ اس خیر خواہی اور نیکی کے لیے جو وہ مسلمانوں کے ساتھ کریں گے اور مسلمانوں میں سے جس کی پناہ میں وہ جائیں کسی خوف سے یا تعزیر کے ڈر سے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ انھیں امان دیں یہاں تک کہ اُن کے خود واپس جانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود کچھ ارشاد فرمائیں]

یہ معاہدہ المقدسی کے زمانے تک محفوظ تھا اس کا بیان ہے کہ یہ کھال پر لکھا ہوا تھا۔

۹۸۔ اہل جَربا[1] و اذرُح کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جَربا اور اذرُح کے یہودیوں کو یہ امان نامہ لکھ کر دیا:

هذا كتابُ من محمّد النبي لاهل جربا و أذرُح أنهم آمنون بامان الله و أمان محمّدٍ وأنّ عليهم مائة دينارٍ في كلِّ رجبٍ وافيةً طيّبةً والله كفيل عليهم۔

(الطبقات ۱/۲۹۰)

[یہ تحریر محمد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اہلِ جربا و اَذرُح کے لیے ہے کہ وہ اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امان میں ہیں اور انھیں ہر سال ماہِ رجب میں سَو دینار (جزیہ) سونے کے سکّے پورے دینا ہوں گے اور اللہ ان کا کفیل ہے]

۹۹۔ اہلِ مقنا[2] کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مقنا کے یہودیوں کے نام یہ دستاویز لکھ کر دی:

أنّهم آمنون بأمان الله و أمان محمدٍ وأنّ عليهم رُبعَ غزولهم و رُبعَ ثمارهم۔ (الطبقات ۱/۲۹۰)

[اُنھیں اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امان ہے اور اُنھیں ٹیکس میں ایک چوتھائی (کاتا ہُوا سُوت) اور ایک چوتھائی پھل دینا ہوں گے]

---

[1] جَربا = اَذرُح کے پاس ہی ایک بستی ہے۔ یہ بھی شام کا علاقہ ہے اور ۹ھ میں فتح ہوا تھا۔ معجم البلدان ۲/۱۱۸

[2] مقنا = معجم البُلدان ۵/۱۷۸

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

تجھ سے پہلے ہم نے جو بھی رسُول بھیجا ، اُسے یہی وحی کی کہ
"میرے سوا اور کوئی معبُود نہیں ، لہٰذا تم سب میری عبادت کرو"

(الأنبیاء، ۲۵)

توحید

وحی



حقیقتِ توحید

اور

حقیقتِ وحی

مولانا امین احسن اصلاحی

شیخ الہند مولانا محمود حسن

حقیقتِ توحید

مولینا امین احسن اصلاحی

توحید کے دلائل پر غور کرنے سے پہلے چند امور کو بطور مقدمہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے :-

قرآن کے اوّلین مخاطب

قرآن مجید کے اوّلین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی جیسا کہ "حقیقتِ شرک" میں ہم بیان کر چکے ہیں ، خدا کا منکر نہیں تھا۔ بنی اسمٰعیل تھے، جو نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا بھی اقرار کرتے تھے۔ ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا یا ان صفات اور ان کے لوازم میں دوسروں کی حصّہ داری لازم آتی تھی۔ بنی اسرائیل تھے، جو خدا اور اُس کی تمام صفاتِ حُسنیٰ کے بھی قائل تھے اور اُن کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان کے تسلیم کردہ عقائد سے بالکل متناقض تھیں اور جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک ـــــ چنانچہ قرآن مجید نے ان گروہوں سے ان کو منکرِ خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلّمات کو بنیاد قرار دے کر ان کی صرف ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انھوں نے ان مسلمات سے بالکل متناقض اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔

یہ حال صرف قرآن کے ابتدائی مخاطبوں ہی کا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ہم نے "حقیقتِ شرک" میں بیان کیا ہے دُنیا کی قدیم قوموں میں خدا کا انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ ماضی کی تمام قوموں میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصوّر ضرور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تصوّر کے اردگرد ایسے اوہام کا حصار ہے کہ نہ تو اس سے اس کائنات کے معمّہ کے حل کرنے کے لیے کوئی روشنی حاصل ہوتی نہ ایمان و عمل صالح کی بنیادیں استوار ہوتیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ خدا کا انکار، جو بداہت کا انکار ہے، صرف عہدِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اس طرح کی سوفسطائیت اگر تاریخ میں کبھی ظاہر بھی ہوئی ہے تو وہ صرف ایک چھوٹے سے حلقہ کے اندر محدود رہی ہے۔ ایک باضابطہ دین کی حیثیت اس نے صرف اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال

یہی وجہ ہے کہ قرآن اثبات الوہیت کے باب میں ہمارے متکلمین کے طریقہ پر اثبات باری سے اپنی بحث کا آغاز نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا سارا خطاب مقتضائے حال سے بعید اور کلام مؤثر کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا اور وہ حکمتِ بالغہ جس نے دلوں اور روحوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، ایک خشک و بے اثر متکلمانہ

جدل کی شکل اختیار کر لیتی اور کلام کا بڑا حصہ بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہو جاتا بلکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ان کی رایوں اور ان کے عقائد میں جو غلطی اور کجی تھی وہ ان کے سامنے کھول کے رکھ دی کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کر لیں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیتِ جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن چونکہ الوہیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، یہ مرکزِ دین اور مبدأ ایمان ہے، جب تک یہ سرا ہاتھ نہ آجائے اس وقت تک نہ اس کائنات کا معمہ حل ہو سکتا، نہ آدمی کا کوئی قدم آگے بڑھ سکتا، نہ حق و باطل اور بر و اثم کے اصول قائم ہو سکتے ہیں، نیز قرآن مجید ایک ابدی ہدایت کا صحیفہ ہے۔ کسی خاص قوم یا کسی خاص عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس کو بنی نوع آدم کی تمام گمراہیوں کا قیامت تک کے لیے علاج کرنا ہے، اس وجہ سے اس نے اس باب میں ایک ایسا جامع اسلوبِ بیان اختیار فرمایا جس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کا تمام صفاتِ کمال مثلاً خلق، رحمت، علم، قدرت، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہو تاکہ ان لوگوں پر حجت پوری ہو سکے جو کسی نہ کسی نوعیت سے کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصور سے قاصر ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں پر بھی حجت قائم ہو سکے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ ہوں۔

پس قرآن میں الوہیت کا دعویٰ، مخاطب کے اعتبار سے تین مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ایک شکل وہ ہے جو خالص منکرین کے لیے حجت ہے۔ ان کے لیے جا بجا توحید کی تقریر ایسے جامع اسلوب میں ہوئی ہے کہ اس سے خدا کا اثبات بھی ہوتا ہے اور اس کی یکتائی بھی ثابت ہوتی ہے۔ دوسری شکل ان لوگوں کے لیے اختیار کی گئی ہے جو خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اس کے صفاتِ حسنیٰ کے تصور میں بھٹک گئے ہیں۔ ان کے سامنے خدا کے صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہونے پر تقریر کی گئی ہے تیسرے وہ لوگ ہیں جو خدا کو صفاتِ کمال سے متصف تو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی بعض متناقض اعمال و معتقدات میں گرفتار ہیں ان کے سامنے ان باتوں کی تردید کی گئی ہے جو انھوں نے اپنے اقرار سے بالکل مختلف اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔

استدلال کی مذکورہ بالا دو قسموں کے مخاطب بالعموم بنی اسماعیل ہیں ہر چند وہ خدا کے منکر نہ تھے لیکن خدا کی صفات کے باب میں ان کا ذہن نہایت الجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے سامنے توحید کی تقریر اس طرح فرمائی کہ وجودِ باری کے باب میں بھی ان کو یقین و بصیرت حاصل ہو سکے اور اس کی صفات کے تصور میں بھی ان کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو منکر و ملحد ہیں یا خدا کی صفات کے باب میں ان کے دماغ میں الجھنیں ہیں۔ استدلال کی تیسری قسم کے مخاطب اصلاً بنی اسرائیل ہیں جو تورات اور انجیل پر ایمان کے مدعی تھے لیکن اپنے مسلمات کے بالکل خلاف انھوں نے بہت ساری باتیں مان رکھی تھیں۔ ان پر جس نہج سے دلیل قائم کی گئی ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو خدا کی صفات اور ان کے لوازم کے باب میں کسی عملی و اعتقادی تناقض میں مبتلا ہوں۔ بعض مقامات میں اس طرح کے استدلال کے مخاطب بنی اسمٰعیل بھی ہیں لیکن اس کی ایک خاص حد ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

قرآنی استدلال کی اساس

اسی طرح قرآنی استدلال کی اساس اور اس کے مبدا، و ماخذ کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو ہم دلائل انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں :۔

۱۔ وہ استدلال جو مخالف کے اقرارات و اعترافات پر مبنی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں مثلاً جو قومیں کسی الٰہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں الٰہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں، یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی اخلاقی ضابطہ رکھتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے، اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے مُنہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲۔ دوسری قسم دلائلِ آفاق کی ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خُدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خُدا کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالقِ کائنات متصف ہے۔

۳۔ تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مُراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السموٰات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم برابر ان کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غافل و بلید انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر تنبہ کرتی رہتی ہے۔

قرآن نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح کی ہے :

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ، اَوَلَمْ يَكْفِ
بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ
اِنَّهُمْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ

ہم ان کو اپنی دلیلیں کائنات میں اور خود ان کے اندر
دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے کہ
وہی حق ہے، کیا تیرے پروردگار کے لیے یہ بات
کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر ہے۔ آگاہ! وہ اپنے

إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ۝ — رب سے ملنے کے بارہ میں شک میں ہیں آگاہ! وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(حم السجدہ ۵۳-۵۴)

اِس آیت میں دعویٰ روزِ جزا اور قیامت ہے۔ اس پر پہلے دلائل آفاق کا حوالہ دیا ہے۔ پھر دلائل انفس کا ذکر فرمایا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی صفات سے استدلال کیا ہے جن کا یا تو مخاطب کو اقرار ہے یا ان صفات کا اقرار ہے جن پر یہ صفتیں مبنی ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال سورۂ ذاریات میں ہے :-

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ - فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ -

(۲۰-۲۳)

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمھارے نفوس کے اندر بھی ہیں، کیا تمھیں دکھائی نہیں دیتی ہیں اور آسمان ہیں تمھاری روزی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تمھیں دھمکی سُنائی جا رہی ہے پس آسمان و زمین کے رب کی قسم یہ بات واقع ہو کر رہے گی بالکل اسی طرح جس طرح تمھارے لیے ایک بات کو بول دینا۔

یہاں بھی دعویٰ جزا و سزا کا وقوع ہے۔ ان آیات سے اُوپر اسی دعوے پر آسمان و زمین کی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کے فاطر کی پسند یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دنیا کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دے اس کائنات کے سنن و قوانین اور اس کی تاریخی سرگزشتیں اور ان کے احوال و نتائج اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ بدلہ کا ایک دن ضرور آنے والا ہے جس دن بدکار اپنی بُرائیوں کا بدلہ پائیں گے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا۔ پھر ایک جامع بات فرمائی کہ آسمان و زمین اور تمھارے نفوس کے اندر اس کی دلیلیں موجود ہیں۔ یہ آفاقی و انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد آسمان و زمین کے رب کی قسم بطور شہادت کھائی اور اصل دعویٰ پر اپنی ربوبیت سے استدلال کیا۔

یہ دو مثالیں ہم نے قرآن مجید سے محض یہ دکھانے کے لیے بیان کی ہیں کہ قرآن نے اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرما دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان تینوں ماخذوں سے قرآن نے اپنے بنیادی دعاوی، توحید، رسالت اور معاد پر کس کس طرح استدلال کیا ہے تو اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ یہاں ہمارا مقصود بالاجمال قرآنی استدلال کی اساسات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

بعض ضروری تنبیہات

لیکن ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے جس طرح قرآن کے استدلال کو علٰحدہ علٰحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں اُن کا بیان بھی الگ الگ ہے بلکہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرزِ استدلال اور اس کی اساسِ استدلال میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح مخاطب کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس کے بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے حجت پیش کی گئی ہے۔ کہیں دلائل انفس مذکور ہوئے ہیں کہیں آفاق کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ کہیں ان میں سے دو کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کہیں تینوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی اشتراک و انفراد ہے۔ کہیں صرف توحید پر استدلال ہے کہیں

صرف معاد پر، کہیں ان میں سے دو جمع کر دیئے گئے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے۔ ان میں فرق و امتیاز کرنا، ایک ناقد بصیر کا کام ہے۔ پھر قرآن میں استدلال کا طریقہ بالکل فطری ہے اس وجہ سے جو لوگ استدلال و نظر کے صرف مصنوعی طریقوں ہی کے عادی ہیں وہ قرآنی استدلال کی اصل قوت کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں

بعض بے خبر یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی تمام بنیاد تحکم پر ہے۔ جو بات وحی سے معلوم ہو گئی وہ حق ہے، اس کی کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔ بلا شبہ اہل ایمان کے لیے اللہ اور رسول کا فرمادینا ہی دلیل ہے لیکن مذہب مومنوں کے اندر نہیں منکروں کے اندر آیا ہے اور ان کے لیے اللہ و رسول کا فرمانا کوئی دلیل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس فرمان کی بنیاد کسی ٹھوس عقلی و فطری حقیقت پر نہ ہو۔ چنانچہ قرآن نے جیسا کہ اُوپر واضح ہو چکا ہے عالمِ انفس اور عالمِ آفاق کو بطورِ ماخذ استدلال کے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں اپنے دعاوی کی مطابقت آفاق و انفس کے قوانین و سُنن سے دکھائی ہے اور بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ جن باتوں کی شہادت کائنات کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے اور انسانی فطرت جن حقائق پر گواہی دے رہی ہے۔ قرآن انھی حقائق کا داعی ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ دین کے اساسی مسائل سے متعلق قرآن کے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ شریعت اور عالمِ آفاق اور عالمِ انفس کی باہمی موافقت کے اسرار بے نقاب ہوں اور جو لوگ قرآن کی عقلیت کی طرف سے بدگمان ہیں ان کی بدگمانی رفع ہو۔

اس مقدمہ میں تنبیہہ ان امور پر اس لیے ضروری تھی کہ جو لوگ قرآن کے اوّلین مخاطبوں کی مختلف جماعتوں اور اُن کی خصوصیات و حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، یا قرآن کے طرزِ استدلال میں مخاطب کا جس قدر لحاظ کیا گیا ہے اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں یا ان اساسات کو نہیں جانتے جن پر قرآن کا استدلال مبنی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا سارا استدلال ظنی اور الزامی قسم کا ہے اس کو فلسفیانہ برہانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ یونانی علوم سے متاثر و مرعوب ہوئے وہ اسی سوءِ ظن کی وجہ سے قرآن سے محروم رہے۔ وہ یا تو قرآن کی طرف آئے نہیں اور اگر آئے تو اس معدن کو (العیاذ باللہ) مزبلہ سمجھ کر آئے جہاں ان کو صرف الزامی اور خطیبانہ انداز کی دلیلوں کی توقع تھی، برہانیات کے جواہر ریزوں کی اُمید نہیں تھی۔ قرآن کی نسبت اسی بدگمانی میں اس زمانہ کے وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو جدید فلسفہ و سائنس سے مرعوب ہیں۔ ان کو عام طور پر یہ وہم ہے کہ قرآن مجید کی عقلیت صرف متوسط درجہ کے دماغوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ خواص اور عقلاء کے مبلغ ادراک سے اس کا استدلال العیاذ باللہ فروتر ہے ان لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنی استدلال کی اساسات سے واقف ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ مخاطب کے اعتبار سے یہ استدلال کن گوناگوں شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ہم اس رسالہ میں چاہتے ہیں کہ توحید سے متعلق قرآنی استدلال کی وضاحت کریں تاکہ دین کی حجّت واضح ہو۔

مباحث کی ترتیب

اس رسالہ میں مباحث کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے :-

توحید کے عمومی دلائل

(۱) دلائلِ آفاق

(۲) دلائلِ اُنفس

توحید کے خصوصی دلائل
(۳) دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب
(۴) پچھلی فصلوں کا خلاصہ
(۵) عقیدۂ توحید کے اثرات فرد اور جماعت پر۔
(۶) عقیدۂ توحید کی اہمیت دین میں۔

یہ رسالہ چونکہ "حقیقتِ شرک" کا تتمہ ہے اس وجہ سے اس کے مطالعہ سے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے اس رسالہ کی اصلی مقصود صرف توحید کے دلائل کی توضیح ہے۔ بقیہ مباحث جو اس باب سے متعلق ہیں وضاحت کے ساتھ "حقیقت شرک" میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں قلم سے حق نکلی ہیں اُن کو دلوں میں جگہ دے اور جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کے اثر سے محو فرما دے۔

توحید کے عمومی دلائل

دلائلِ آفاق

یہ دُنیا جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، مختلف پہلوؤں سے نہ صرف ایک علۃ العلل پر بلکہ ایک ایسے معبودِ حقیقی پر شاہد ہے جو تمام صفات کمال سے متصف ہے اور اس شہادت کی بنیاد ایسے امور پر ہے جس کا ہم خارج میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن کے بارہ میں ہماری عقل اور ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ان کو کسی ایسی ذات کی طرف منسوب کریں جو ان کی مصدر ہو سکے۔ ان امور کو قرآن کی زبان میں آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم اس فصل میں بقدرِ ضرورت ان کی شرح کریں گے۔

۱۔ کائنات کا حُسن و جمال

سب سے پہلی چیز جو ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حُسن و جمال ہے جو ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دُنیا میں کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں سے انسان غافل و بے پروا گزر سکے۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اُس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اس کے کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں اور ساتھ ہی انسان کے اندر حُسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے گرد و حُسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے۔ دفعتہً اُس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ معمور دُنیا خود بخود وجود میں آگئی اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:۔

تبارک اللہ احسن الخالقین — بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

یعنی صرف اسی بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق (DE - SIGNER) ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ بہترین خالق ہے۔ یکسر خیر و برکت ہے۔ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت اور کمالِ خیر و برکت کا نمونہ ہے۔ اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔

ظاہر ہے کہ دُنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام زنگارنگ حُسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی۔ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن، یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ آسمان ہوتا مگر یہ ستاروں کی بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی زنگارنگیاں نہ ہوتیں، ممکن تھا کہ یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دُنیا ان تمام جلوؤں سے معمور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کی حس باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دُنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمال قدرت، کمالِ صنعت و حکمت اور کمالِ خیر و برکت کی صفات سے متصف ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۔ (ق ۶-۸)	کیا انھوں نے اپنے اُوپر آسمان کو نہیں دیکھا کیسا ہم نے اُس کو بُلند کیا اور سجایا اور کہیں اس میں دراڑ نہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں لنگر انداز کر دیئے پہاڑ اور اُگائیں اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں بصیرت اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے ہر متوجہ ہونے والے بندے کے دل میں۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلوؤں کو دیکھے اور یوں ہی گزر جائے۔ اگر آنکھیں کُھلی ہوئی ہوں تو اس دُنیا کا مشاہدہ خود بخود انسان میں خُدا اور اس کی صفاتِ حُسنیٰ کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ واقعہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ	بھلا دیکھو تو اس آگ کو جس کو سُلگاتے ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا ہے یا ہم اس کو اگانے والے ہیں؟ ہم نے اس کو بنایا ہے یاد دہانی اور فائدہ اُٹھانے کی چیز مسافروں کے لیے۔

آیت کا آخری حصہ خصوصیت کے ساتھ لائق توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دُنیا کی چیزیں صرف ہماری کسی مادی ضرورت ہی کو نہیں پُورا کرتیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی تخلیق میں حسن و خوبروئی اور کمال صنعت کی ایسی نمود ہے کہ وہ آپ سے آپ ایک اعلیٰ اور برتر حقیقت پر ایمان لانے کے لیے تنبیہ بھی کرتی ہیں اور یہ تنبیہ کرنا محض ان کا ضمنی مقصد نہیں ہے بلکہ اُن کا اصلی وظیفہ ہی یہی ہے چنانچہ آیت میں تذکرہ کا لفظ مَتاع کے لفظ پر مقدم ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یاد دہانی ہے

سامانِ معیشت ہونا ان کا ایک مزید فائدہ ہے۔ جن لوگوں کی حسِ باطن بیدار ہوتی ہے ان اشیاء کا یہی پہلو سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے لیکن جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور بطن و فرج کی لذات کے سوا جن کے سامنے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں رہ جاتا ان کی آنکھیں خود بینوں اور دوربینوں سے مسلح ہونے کے باوجود اسی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں جو فی الحقیقت ہر شئے کے اندر سب سے زیادہ اُبھری ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن نے ایسے لوگوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے کان ہیں لیکن سنتے نہیں آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

یہ رنگا رنگ جلوے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو صفاتِ جمال و کمال سے متصف ہے کیونکہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دُنیا بنی ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں جو چیز بنی ہے خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، علیم ہے، مہربان ہے، کریم ہے۔ اُس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قابلیتوں اور بہترین قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ) نیز فرمایا (یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ) اُس نے پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں صرف غلہ ہی نہیں دیا بلکہ لطف اندوزی کے لیے پھل اور طرح طرح کے میوے بھی پیدا کئے اور مشام نوازی اور نظر بازی کے لیے پھول بھی کھلائے اور چمن بھی اُگائے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ (اور زمین کو بنایا مخلوق کے لیے، اس میں میوے ہیں اور کھجوریں غلاف دار، اناج ہیں بھس والے اور پھول ہیں)

ظاہر ہے یہ صرف خلق نہیں بلکہ کمالِ خلق اور کمالِ قدرت ہے۔ صرف بخشنا نہیں بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے۔ صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمالِ ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجود سے گزر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین وحدت یعنی اس مجموعی دُنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبّر ایک ہی ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک ایک سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے جس طرح ہم ایک حسین، متناسب الاعضاء اور خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اُس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے۔ اگر اس کے مختلف اعضا و اجزاء کی تشکیل مختلف کاریگروں کے مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا۔ اسی طرح اس مجموعی دُنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں و مختلف ارادے اس کے اندر کارفرما ہوتے تو اوّلاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جاتا تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیئے کی دکان کی شکل میں ہوتی اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے جہاں چیز

بے قرینہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی، کیونکہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اس کثرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق

دوسرا اہم اور قابل توجہ پہلو اس کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق (HARMONY) اور ان کی باہمی سازگاری ہے۔ اس دنیا کے مختلف اجزا میں جو باہم ایک دوسرے سے ضدین کی نسبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح کی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے جس طرح کی سازگاری اور موافقت ہم زوجین میں دیکھتے ہیں۔ ایک عورت اپنے ظاہر و باطن میں مرد سے بالکل مختلف حالت رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک مرد عورت سے بالکل مختلف خصوصیات وصفات کا حامل ہے۔ تاہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا شدید روحانی وجسمانی اتصال رکھتے ہیں۔ وہ ظاہر ہے۔ عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف یہ کہ مطلوب و مرغوب ہے بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے دواعی اور مقتضیات کا گویا جواب ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات وصفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی۔ نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عورت و مرد میں سے جس طرح ایک کا تنہا وجود بے غایت ہے۔ اسی طرح ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا اسی وقت کرتی ہے جب وہ اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔

توافق کا یہ پہلو صرف ہم ضدین ہی میں نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق و سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کے بقا اور اپنے وجود کی نشو و نما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آ کر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں۔ زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں، جب یہ سب کچھ ایک خاص ضبط و نظم کے ساتھ ہو لے تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے اور یہی حال اس دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی (MIND) ہے جو ان تمام اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی ہے اور ان کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ (ACCIDENT) ہے۔ آپ سے آپ وجود میں آ گئی اور اس کے مختلف اجزا کا ارتقا بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے، تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی

ہے، کیا کوئی عاقل ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ، مٹی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، چرند و پرند سب اتفاقی حوادث کے طور پر ظہور میں آئے، ہر ایک کا بطورِ خود ارتقا ہوا، پھر بالکل اتفاق سے ان میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو گیا۔ اور پھر بالکل اتفاق ہی سے یہ سب انسان کے لیے نہ صرف سازگار بلکہ اس کے خدمت گزار بن گئے؟ کیا عقلِ انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم و قدرت اور ربوبیت و حکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم و حکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و اتصال پیدا کرتا اور اُن کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی بھی شہادت مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین و آسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے جو مالک و متصرف ہے۔ کوئی دوسرا ارادہ اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اگر آسمان و زمین کے الگ الگ ناظم و مدبر ہوتے یا بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی، یا خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف اجزا میں یہ زوجین کا سا توافق اور ربط نہ ہوتا جو ہم اس دُنیا کے ہر گوشہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں، قرآن نے اس دلیل کو مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے مختلف مقامات میں بیان فرمایا ہے ہم بطورِ مثال صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

یہ دلیل نہایت اختصار کے ساتھ سورۂ ذریات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ۔ (۵۱-۴۹)

اور ہم نے ہر چیز میں سے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو پس اللہ کی طرف بھاگو میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک مت بناؤ میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

یہاں ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے معاد اور توحید دونوں پر استدلال کیا ہے۔ معاد پر استدلال یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ ہمارے رسالہ ’حقیقتِ معاد‘ میں آئے گی۔ توحید پر استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت پوری کرتی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا وجود و بقا اس کے اضداد کے توافق و سازگاری سے ہے اور اس سے بدیہی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا خالق و مدبر ایک ہی ہے جو ان کے اختلافات کے باوجود ان میں ربط و اتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اختلافات جو ہم اس کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں، محض ظاہر کا اختلاف ہے اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے۔ کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں۔ ان اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اس امر کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تحتِ تصرف اس کائنات کے تمام اجزا اپنے اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس دلیل کی تفصیل سورۂ بقرہ میں

ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ
خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ
تَتَّقُوْنَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا
وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا
لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (آیت ۲۲)

اے لوگو! اپنے اس مالک کی پیروی کرو جس نے تم کو
پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ اس کے
عذاب سے محفوظ رہو جس نے تمہارے لیے زمین کو
بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے
پانی اور اس سے پیدا کئے پھل تمہاری روزی کے لیے
پس اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔

یعنی جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں ۔ زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان یہ کیسے تصور کرتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے ۔ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ، ایک خاص مقصد کے لیے تصرف میں لائے ۔

یہی دلیل ذرا اور پھیلاؤ کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے ۔

اِلٰھُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ
الرَّحِیْمُ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ
تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ
کُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یَّعْقِلُوْنَ ۔ (بقرہ)

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ
رحمٰن اور رحیم، آسمانوں اور زمین کی خلقت، روز و شب
کی آمد و شد، اور کشتی میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نافع
چیزیں لے کر چلتی ہے اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان
سے اتارا اور اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے
بعد زندہ کیا اور اس میں ہر طرح کے جاندار پھیلائے اور
ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں، جو آسمان و زمین
کے درمیان مسخر ہیں، دلیلیں ہیں (توحید کی) سمجھنے والوں
کے لیے ۔

سورۂ نحل میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کائنات کی ہم آہنگی کو واضح فرمایا ہے :-

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً
لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۞ وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ

اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی اور اس سے زندہ کیا
زمین کو اس کے مرجانے کے بعد۔ بے شک اس کے
اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سنیں ۔ اور

لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ
بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا
لِلشَّارِبِينَ ۝ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَ
الْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا
حَسَنًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝
وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ
الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۝
ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ
ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ
أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۔ (آیت ۶۵-۶۹)

تمھارے لیے چوپایوں کے اندر بھی غور کرنے کی جگہ ہے۔ ہم تم کو پلاتے ہیں ان چیزوں کے اندر سے جو ان کے پیٹوں کے اندر ہیں گوبر اور خون کے درمیان سے، خالص دودھ، پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار، اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم تیار کرتے ہو نشہ اور اچھی روزی، بے شک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ بنا پہاڑ کے اندر چھتے اور درختوں میں اور ان میں جن کو ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں پھر پھل پھل کا رس چوس اور چل اپنے رب کی ٹھہرائی ہوئی راہوں میں اطاعت کے ساتھ، نکلتی ہے اس کے پیٹ سے پینے کی چیز جس کے رنگ مختلف ہیں اور جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بیشک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے۔ اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اسی بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر، درختوں کی شاخوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنا لیتی ہیں، پھول پھول کا رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں، جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی۔ انسان ان کو پیتا ہے۔ ان سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ گئے ہیں۔ یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں جس دنیا کے اتنے بعید اجزا کے اندر اتنے گہرے رشتے ہیں اور جو کائنات اپنے متضاد اجزاء کی کشاکشوں کے اندر توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہو سکتی، نہ مختلف ارادوں کی رزمگاہ ہو سکتی۔ ظاہر بین نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں۔ موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان کے اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ
فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ
أُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى
الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ
رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۔ (فاطر-۱۲-۱۳)

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں، ایک شیریں اور پینے
کے لیے خوشگوار ہے اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے،
اور تم دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور پہننے
کے لیے زیور نکالتے ہو اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو ان
میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کر سکو
اور تاکہ اس کی شکرگزاری کرو۔ داخل کرتا ہے رات کو دن
میں اور دن کو رات میں اور مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو
ہر ایک، ایک وقت مقرر تک کے لیے چلتا ہے
یہی اللہ تمہارا رب ہے اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے۔ تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے۔ کس طرح ان دونوں سے اپنی زینت و آرائش کے لیے موتی حاصل کر لیتا ہے۔ پھر کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں۔ پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو۔ دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے؟ کیا یہ نظم، یہ ضابطہ کی پابندی، یہ سازگاری یہ فیض رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض "نہ ماننے کی خواہش" پر مبنی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

۳۔ ضد سے ضد کا وجود

اسی طرح ایک اور پہلو پر غور کرو۔ اس کائنات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا

اور سرسبز درخت سے تمہارے لیے آگ بنائی۔

موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور زندگی سے موت۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ
مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ (انعام ۹۶)

نکالنے والا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے
وہی اللہ ہے تم کہاں بھٹکے جاتے ہو۔

ظاہر ہے کہ علت و معلول کے عام قانون سے یہ شے بالاتر ہے اور پیدائش کا وہ معروف ضابطہ جس پر ہم کو اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کی ادنیٰ اخلاف ورزی کا بھی ہم تصور نہیں کر سکتے۔ یہاں آکر بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا یہ اس امر کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ کوئی ہستی ان تمام ضوابط سے بالاتر بھی ہے جو ان سب پر اپنی قدرت کاملہ سے تصرف کرتی رہتی ہے اور اضداد سے اضداد کو وجود میں لاتی اور ان کو اپنی مخلوقات کے لیے نافع بناتی رہتی ہے؟ جو لوگ اس کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے بہرے قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسی روشنی میں اس کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی کیا توجیہہ کریں گے؟ اور ہرے بھرے درخت سے تر و تازہ پھلوں کی جگہ آگ کے شرارے جھڑنے کی کیا تعلیل کریں گے کیا علت و معلول کا عام ضابطہ یہی چاہتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً ایک ایسی ہستی کا اقرار کرنا پڑتا جو ان تمام سنن طبیعی پر حاکم و متصرف ہے۔

۴۔ متحدات سے مختلفات کا وجود

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک اور حقیقت بھی ہے۔ ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں کہ متحدات سے مختلفات کا وجود ہوتا ہے۔ سائنس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں بسیط ہے۔ پھر درجہ بدرجہ اس کے اجزا میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ اگر سچ ہے اور اس کی سچائی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی تفریق و تقسیم کرنے والا ہے جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ مظاہر کا تنوع اللہ کے تعدد و تنوع کی دلیل نہیں ہے۔ زمین ایک ہی ہے۔ پانی ایک ہی ہے۔ ہوائیں بھی ایک ہی طرح کی چلتی ہیں۔ تاہم نباتات بے شمار قسم کی اُگتی ہیں، پھولوں کے رنگ قسم قسم کے ہوتے ہیں پھلوں کی شکل و صورت، ان کی مقدار، ان کے رنگ و بو، ہر چیز کے اندر تفاوت ہوتا ہے۔ ایک ہی گٹھلی سے کبھی ایک سے زائد انکھوے نکلتے ہیں اور ان سے متعدد تنے اور شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی ایک ہی انکھوا نکلتا ہے اور ایک ہی تنا پیدا ہوتا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔ (الرعد - ۴)

اور زمین میں پاس پاس کے ٹکڑے ہیں اور انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھجوریں اکہرے اور دوہرے ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ تاہم پھل میں ہم ایک کو دوسرے پر بڑھا دیتے ہیں۔ بے شبہ اس میں نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔

یعنی جس شخص میں عقل ہوگی لازماً اس سے اس کو تنبہ ہوگا اور وہ ہر چیز کے رنگ اور اس کے پھلوں اور پھولوں کے تنوعات پر غور کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی خالق ہے جو کمال حکمت و قدرت اور کمال رحمت کے ساتھ تصرف فرما رہا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر واضح ہوگی کہ وہ اکیلا اور لاشریک لہٗ ہے کیونکہ جب ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودے اور ایک ہی قطعہ زمین کے درختوں سے یہ سارے تنوعات ہم دیکھتے ہیں اور اس کو پانی اور زمین کے اختلاف کا نتیجہ نہیں قرار دیتے

تو اس کائنات کی اس گوناگونی کو اللہ کے تعدد کی دلیل کیوں ٹھہرائیں؟ نیز یہ بات بھی اس پر واضح ہو گی کہ یہ سارے تنوعات پیدائش کے کسی اندھے بہرے ضابطہ کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ کوئی علیم و قدیر ہستی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندازہ کے ساتھ وجود میں لاتی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اس میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

۵ - مظاہرِ کائنات کی تسخیر

توحید کی ایک بہت بڑی دلیل وہ عجز و مقہوریت اور انقیاد و اطاعت بھی ہے جس کے آثار ہم اس کائنات کی تمام بڑی اور شاندار مخلوقات میں پاتے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت قوی ثبوت ہیں کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ہی ذات متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے، اپنے حسن و عظمت کے باوجود، اور زمین، دریا، پہاڑ، ہوا، ابر، برق در حد اپنی وسعت، قوت اور جلالت کے علی الرغم ایک محکم نظام حکمت کے ماتحت مقہور و مسخر ہیں تو لازماً ان کے سوا کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق اور رب ہے فرمانروا ہے۔ اب غور کرو وہ کون ہے جو ان سب کا خالق اور سب کا خالق اور رب پر آمر و متصرف ہے؟ اس سوال کو قرآن نے بار بار اٹھایا ہے اور اس کا جواب مشرکوں کی زبان سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس عالم کا خالق ایک عزیز و حکیم ہے۔ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا تو وہ جواب دیں گے ان کو عزیز و علیم نے بنایا ہے) کیونکہ جو شخص اس کائنات کے مظاہر پر غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان میں سے کسی کی طرف اس کائنات کی تخلیق کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ اس کائنات کا خالق کوئی ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو عزت و کبریائی اور علم و حکمت کی تمام صفات کے ساتھ متصف ہو

یہاں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان مظاہر میں سے جو جتنے ہی زیادہ شاندار ہیں۔ ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط، اور کسوف و خسوف کے آثار، جو ہم ان میں دیکھتے ہیں۔ دوسری کسی چیز میں بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی ان کی الوہیت کے دلائل میں سے گن لیا۔

توحید کی یہ دلیل، اجمال و تفصیل کی مختلف شکلوں میں، قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کو یہاں نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ابراہیمی حُسنِ مجادلہ کی بہترین تصویر ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا	جب اس کو رات نے ڈھانک لیا۔ اس نے ایک ستارے
رَبِّيْ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝	کو دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا، کہا
فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ	میں غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب چاند
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ	کو چمکتا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے۔ جب ڈوب گیا، بولا
مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ	اگر میرے پروردگار نے میری رہبری نہ فرمائی تو لازماً میں
بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ	بھٹکے لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا

أَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّي بَرِيْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ
اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ
(انعام ۷۶-۷۸)

کہا یہ میرا رب ہے۔ یہ بڑا ہے جب وہ بھی ڈوب گیا کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس ذات کی طرف پھیرا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

۶ - کائنات کی محکم تدبیر

اسی طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی شہادت وہ محکم اور ہمہ گیر تدبیر و نظام ہے جس کا، اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف قوتوں کی ایک رزم گاہ ہے۔ دوسری طرف یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان قوائے مختلفہ کے اس تصادم کے اندر نہ صرف یہ کہ تمام چھوٹی بڑی مخلوقات قائم و باقی ہیں بلکہ اپنی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پھل پھول رہی ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر قوت شتر بے مہار کی طرح اپنے رخ پر بڑھتی چلی جا رہی ہے، نہ وہ کسی نظام قاہر کی پابند معلوم ہوتی نہ کسی برتر قوت کی محکوم و مطیع، لیکن پھر دفعۃً ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مخفی ہاتھ اس کی باگ موڑ کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت پر لگا دیتا ہے۔ کتنی بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض بڑے بڑے اجرام سماویہ کسی خاص رخ پر بڑھ چلے اور اگر وہ اسی رخ پر بڑھتے چلے جاتے تو لازم تھا کہ ہمارے کرۂ زمین سے ٹکرا جاتے اور یہ کرۂ زمین پاش پاش ہو کے رہ جاتا۔ چنانچہ اس طرح کے مشاہدات کی بنا پر کبھی کبھی ماہرین فلکیات نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں مدت کے اندر یہ زمین فلاں جرم سماوی سے ٹکرا جائے گی لیکن جب وہ متعین وقت آیا دفعۃً اس جرم نے اپنا رخ اس طرح بدل دیا گویا کسی سوار نے مرکب کی باگ موڑ دی اور وہ عظیم خطرہ جو ہماری اس دنیا کے بالکل سر پر آ گیا تھا یکایک دفع ہو گیا۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غور کرو، یہ راکب کون ہے؟ کون ہے جو قویٰ اور عناصر اور اجرام و اجسام کی باگیں تھامے ہوئے ہے، جس حد تک چاہتا ہے ان کو ڈھیلتا ہے اور پھر جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک انچ بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ کیا یہ اندھی بہری قوتوں کی اپنی صواب دید سے سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا عقل بشری اور قلب انسانی کو ان جوابات سے تشفی و طمانیت مل سکتی ہے؟ قرآن اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ ان اللہ یمسک السمٰوٰت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ انہ کان حلیما غفورا (اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو کوئی اس کے بعد ان کا تھامنے والا نہیں بے شک وہ نہایت حلیم اور بخشنے والا ہے) اور کون ہے جو اس جواب کی سچائی کا انکار کر سکتا ہے؟

یہ وہ تدبیر و نظام ہے جو اس مادی دنیا کے قویٰ اور عناصر کے درمیان ہم دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم اس

کائنات کے اخلاقی قویٰ کے تصادم اور اس کے احوال و نتائج پر غور کریں تو وہاں بھی ہمیں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک باطل نظریہ جنم لیتا ہے، اس نظریہ کے علمبردار پیدا ہوتے ہیں، اس پر ایک باطل نظامِ اخلاق، ایک باطل نظامِ معیشت اور ایک باطل نظامِ سیاست کے ردّے پر ردّے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے غلبہ کے نیچے دب کر صالح اخلاق کے تمام عناصر دم توڑ دیں گے۔ تاہم اس نظامِ باطل کو مہلت ملتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام خشکی و تری میں فساد کی سیاہی چھا جاتی ہے اور اس عالم کے مصلحین اس دنیا کی از سرِ نو اصلاح سے مایوس ہونے لگتے ہیں۔ پھر دفعتہً ایک وقت آتا ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ نمودار ہو کر اس پورے نظامِ باطل کو اس طرح جھنجھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ بکھر جاتی ہے۔ حتی اذا استا یس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا جاءھم نصرنا (یہاں تک کہ جب انبیاء قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور قوم کے لوگ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کو جھوٹ عذاب کی دھمکی دی تھی ہماری مدد آجاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (اور ہلا دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ پکار اٹھتے ہیں انبیاء اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، آگاہ! اللہ کی مدد قریب ہے)

ان مشاہدات کے بعد کون ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکے کہ دنیا آپ سے آپ وجود میں آئی اور خود بخود قائم ہے یا یہ گمان کر سکے کہ یہ مختلف قویٰ اور عناصر کی ایک رزم گاہ ہے اور یہ قویٰ اور عناصر کسی بالاتر طاقت کے زیرنگیں نہیں ہیں؟ یا یہ خیال کر سکے کہ اس بالاتر قوت کی حاکمیت منقسم ہے؟ یا یہ سوچ سکے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بالاتر اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے۔

۷۔ ہر نظمِ اجتماعی کیلئے لازم ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو

اس عالم کا مجرد قیام ہی اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں۔ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی محکم تنظیمِ اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک ایسا نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا تاراج اور انارکی کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہرحال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب غور کرو کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی، سنبھلتی، اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس خوبی و صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر وہ شخص کر رہا ہے جو اس بادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کونسی بات عقل سے قریب تر ہے۔ کیا متکلمین کا یہ

عقیدہ کہ آسمان و زمین کے معبود الگ الگ ہیں یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور و ظلمت کے الگ الگ الٰہ ہیں یا اس بات کی کہ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دُنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سارے نظام کا ناظم و مدبّر صرف اللہ واحد و قہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا۔ یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت و انتشار کے ساتھ یہ وحدت قائم کیونکر ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ○ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ (انبیاء ۲۱، ۲۲)	کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا رکھے ہیں وہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ عرش کا مالک پاک ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ (بنی اسرائیل ۴۲-۴۳)	کہہ دو اگر اس کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ عرش والے سے منازعت کی راہ ڈھونڈھتے وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ کہتے ہیں

۸ - حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ

بعض قوموں کو خدا کی توحید بلکہ خود خدا کے باب میں بڑا سخت مغالطہ دُنیا میں شر و باطل کے وجود سے پیش آیا ہے۔ ان کی نظر باطل کے جھاگ پر جم گئی اور اس جھاگ کے نیچے جو حق کا مکھن تھا وہ ان کو نظر نہ آ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یا تو سرے سے کسی عزیز و رحیم اور پاک و قدوس خدا کے وجود سے ہی منکر ہو گئیں۔ یا مانا تو یہ مانا کہ یہ دُنیا بہت سے خون آشام دیوتاؤں کی لیلا ہے اور وہ اس کو پیدا کر کے، دُور بیٹھے ہوئے اس کے مصائب و شدائد اور اس کے دُکھوں اور آفتوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں یا پھر یہ کیا کہ خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خُدا ٹھہرا لیے اور دُنیا کو ان متضاد قوتوں کی ایک رزم گاہ بنا دیا۔ یہ غلط فہمی قوموں کو محض قلتِ تدبر، قلتِ صبر اور ظاہر بینی کی وجہ سے ہُوئی۔ نہ انھوں نے اس دُنیا کے اصلی مزاج و قوام کو پہچانا اور نہ حق و باطل کی اس آویزش کے اندر حق کے غلبہ کا مشاہدہ کیا۔ قرآن نے ان تمام اوہام کی نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم اجمال کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس دُنیا کے اصلی مزاج کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پس وادیاں ایک اندازہ کے ساتھ بہہ نکلیں، پس سیلاب کے اوپر جھاگ اُبھر آئی اور اسی طرح کی جھاگ اس چاندی میں ہوتی ہے جس کو آگ میں پگھلاتے ہیں زیور بنانے کے لیے یا کوئی اور سامان اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ اڑجاتا ہے باقی جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہے وہ زمین میں اٹک جاتا ہے۔ ایسی ہی اللہ مثلیں بیان کرتا ہے۔

(رعد - ۱۷)

یعنی اس دُنیا کا اصلی مزاج یہ ہے کہ جس طرح ایک خوش مذاق اور سلیم الفطرت انسان مکھی کو ہضم نہیں کر سکتا اسی طرح یہ باطل کو ہضم نہیں کر سکتی۔ یہ ہر گوشہ میں باطل کو چھانٹتی رہتی ہے اور حق و نافع کو قبول کرتی ہے۔ بارش ہوتی ہے اور وادیاں بہ نکلتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ پانی کی سطح پر جھاگ اُبھر آتے ہیں، پھر پانی زمین میں ٹک جاتا ہے اور جھاگ خشک ہو کر ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ اسی طرح تم چاندی کو زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو، اس کا میل الگ ہو جاتا ہے اور خالص چاندی بچ رہتی ہے۔ یہی اس دُنیا کا اصل مزاج ہے۔ اس میں مجرّد باطل کا وجود نہیں ہے۔ باطل جب بھی پایا جاتا ہے حق کے ساتھ مخلوط ہو کر جس طرح صالح درختوں اور صالح جانداروں کے ساتھ طفیلی پودے اور طفیلی کیڑے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح حق کے ساتھ باطل چمٹ جاتا ہے۔ تم تنگ نظری کی وجہ سے ان طفیلی کیڑوں اور طفیلی پودوں ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہو اور پھر قدرت کی زیادتیوں اور بے حکمتیوں پر معترض ہوتے ہو۔ حالانکہ یہ اعتراض محض تمہاری بوالفضولی اور حماقت کا نتیجہ ہے۔ قدرت ہر گوشے میں نہایت حکیم اور حق دوست ہے۔ اگر کسی مصنوع سے صانع کے مذاق و طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو اس دُنیا کے اس مزاج کو دیکھ کر نہایت آسانی سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق حق ہے، حق کو پسند کرتا ہے اور اپنے کلمات سے حق کو قائم و ثابت کرتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ه لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ه بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ

(انبیاء - ۱۶ - ۱۸)

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کرنے کے لیے۔ اگر ہم کھیل بنانا چاہتے تو اپنے پاس ہی سے بناتے اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو اس کا بھیجا نکال لیتا ہے اور باطل دفعتہً نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے ہلاکی ہے ان باتوں کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو۔

اس دُنیا کے اندر جو مصائب و آلام ہیں وہ اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ دُنیا مختلف المزاج دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے

قرآن نے تمام آسائشوں اور تمام دکھوں کو ایک ہی حکیم و قدیر خدا کی مشیت و حکمت کے تحت اور ان کی قوموں کے اخلاق و اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ بعض مرتبہ یہ آفتیں اس لیے آتی ہیں کہ جو مغرور اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں وہ ان سے متنبہ ہوں اور اپنے ضعف و عجز کو محسوس کر کے خدا کی طرف لوٹیں۔ بعض مرتبہ ان کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ کوئی سرکش قوم جس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے۔ ان کے ذریعہ سے تباہ کر دی جائے۔ بعض حالات میں اہل حق بھی ان سے کچھ حصہ پاتے ہیں تاکہ ان کے ایمان و عقیدہ اور صبر و عزیمت کا امتحان ہو، کمزوریاں دور ہوں اور خوبیاں اور قابلیتیں بروئے کار آئیں۔ ان ساری باتوں کو قرآن حکیم نے مختلف اسلوبوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح رات اور دن، سردی اور گرمی دونوں اس دنیا کے مادی بقا کے لیے یکساں ضروری ہیں اسی طرح نعمتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ساتھ آفات و آلام بھی اس دنیا کی اخلاقی زندگی اور روحانی حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور یہ ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ اس دنیا میں کون و فساد اور رحمت و نقمت کے الگ الگ دیوتا ہیں بلکہ صرف ایک ہی جو منعم بھی ہے اور وہی منتقم بھی ہے اور اس کا یہ انتقام بھی درحقیقت اس کے انعام ہی کا ایک پہلو ہے جیسا کہ قرآن میں اس امر کو واضح فرمایا ہے۔

یہی حال گناہوں اور معاصی کا ہے۔ یہ بھی خدا کی مشیت کے تحت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت جو انسان پر ہوئی ہے، یعنی اختیار، یہ اس کے ظلال میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کی پہچان دے کر اس کا امتحان کیا ہے۔ یہ امتحان مقتضی ہوا کہ انسان کو فی الجملہ آزادی بخشی جائے۔ اس آزادی کی وجہ سے انسان نیکی اور بدی دونوں کی راہیں اختیار کر سکتا ہے پہلی راہ اگرچہ فطرت کی راہ ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دوسری راہ فطرت اور خدا سے بغاوت ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اس راہ پر چلنے کی بھی مہلت دیتا ہے کیونکہ اس مہلت کے بغیر آزادی کی نعمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہ آزادی خدا کی بخشش اور اسی کی مشیت کے تحت ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ جو بات خدا کی مشیت کے تحت ہو وہ اس کو پسند بھی ہو۔ وہ اتمام حجت کے لیے ان کاموں کے لیے بھی لوگوں کو ڈھیل دیتا ہے جو صریحاً اس سے بغاوت کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ پس خیر ہو یا شر کُلٌّ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ نہ جبر محض کا دعویٰ صحیح ہے نہ اختیار مطلق کا۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور تفصیل اس کی انشاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کائنات میں شر محض کا وجود نہیں ہے۔ شر حق کے ظلال کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور حق ہی کی خدمت کے لیے ہے۔ پس لازماً اس کائنات کا خالق حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی آپ سے آپ نکل آئی کہ خیر و شر، نور و ظلمت، راحت و مصیبت، نیکی و بدی اور کون و فساد کے الگ الگ دیوتا نہیں ہیں۔ ایک ہی ہے جس کے تحت تصرف یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

۹۔ اشارات

اسی طرح توحید کی نہایت اہم دلیلیں ان لطیف اشارات (SU GGEST I0NS) میں ملتی ہیں جو اس کائنات کے مختلف مظاہر میں مضمر ہیں۔ اور یہ صرف ان کو نظر آتے ہیں جو باریک بین نظر اور عبرت پذیر قلب رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی دلائل کی ایک مخصوص قسم ہے جو منطق کی گرفت سے بالکل بالا ہے اور اس سے وہ قومیں

بہت کم فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو استدلال کے مصنوعی طریقوں کی خوگر ہو کر استنباط و استنتاج اور عبرت و تنبیہ کا وہ فطری جوہر کھو بیٹھتی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ جوہر صرف ان قوموں میں محفوظ رہتا ہے جو فطری سادگی پر قائم رہتی ہیں اور اس اعتبار سے تمام قوموں میں اہلِ عرب کو جو بلند مقام حاصل تھا وہ معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہایت ذکی الحس تھے اور اشاروں میں وہ سب کچھ پڑھ لیتے تھے جو دوسرے موٹی موٹی کتابوں میں بھی پڑھ کے نہیں سمجھ سکتے تھے جو لوگ عرب کے خطباء اور شعرا جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کے اس ذوق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ منزل یار کے ایک ایک مٹے ہوئے نقش کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں۔ اس سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور پھر اس کی عبرتوں اور اُس کے مخفی اشاروں اور پیغاموں کی ایسی مؤثر تصویر کھینچتے ہیں کہ سننے والے کا دل بھی بھر آتا ہے۔ قرآن سے پہلے ان کا یہ ذوقِ نظر جس کے لیے عربی ادب میں صحیح لفظ "توسّم" ہے صرف دیارِ یار کے آثار و نشانات تک محدود تھا اور لازماً اس کے اثرات بھی معمولی اور ادنیٰ درجے کے تھے۔ قرآن نے ان کے اس ذوق کو سندی اور کائنات کے آثار و عجائب اور اس کے اشارات کی وسعتوں کی طرف توجہ دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امراء القیس اور زہیر کے درجہ کے اشخاص پیدا کر سکتی تھی اس کے اندر سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی عظیم الشان ہستیاں اُٹھیں۔

یہ اشارات قرآن کے تمام بنیادی مسائل توحید، رسالت، معاد کے سلسلہ میں نمایاں کئے گئے ہیں۔ یہاں سب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف توحید سے متعلق ایک اشارہ کی توضیح کریں گے تاکہ دوسرے اشارات پر غور کرنے کے لیے نمونہ کا کام دے۔[1]

سورۂ رعد میں فرمایا ہے:-

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ ۔	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں راضی خوشی اور مجبوراً اور ان کے سائے صبح و شام۔ پوچھو کون ہے آسمانوں اور زمین کا رب، کہو اللہ۔

"طَوْعًا وَّكَرْهًا" کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کو سجدہ کرتے ہیں وہ تو کرتے ہی ہیں لیکن جو

---

[1] اس کائنات کے اشاراتِ حقیقت کی کوئی حد نہیں ہے جس طرح ہم عیسائیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گرجوں کی ہر چیز میں اپنے بنیادی عقائد کا مظاہرہ کرتے ہیں مثلاً اگر تثلیث پیشِ نظر ہے تو عمارت کے ایک ایک گوشے سے تثلیث نمایاں ہوگی یہاں تک کہ فرنیچر کی قسم کی بھی جو چیزیں ہوں گی سب مثلث ہوں گی۔ میز، قلمدان، قلم اور پیپر ویٹ تک سے تثلیث پکار رہی ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں توحید اور معاد کے حقائق کا مظاہرہ فرمایا ہے اور جس گوشہ پر بھی انسان تدبّر کی نظر ڈالے۔ وہیں سے اس کو توحید اور معاد کی کوئی نہ کوئی دلیل ہاتھ آجائے گی۔ اسی کو بعض عارفوں نے کہا ہے "ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار" لیکن غافل انسان اتنے دلائل کے باوجود خدا کی توحید اور جزا کے باب میں بھٹک جاتا ہے۔ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيَةً

اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کے آگے نہیں جھکتے انھیں مجبوراً جھکنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس مجبورانہ سجدہ کی شرح فرمادی کہ ان کے سائے صبح وشام خدا کا سجدہ بجا لاتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ آفتاب کے زوال کے ساتھ آفتاب کی بالکل مخالف سمت میں زمین پر اس طرح جھکنا شروع ہوتا ہے جس طرح ایک رکوع کرنے والا خدا کے آگے جھکتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ سایہ اس طرح زمین پر بچھ جاتا ہے جس طرح ایک ڈنڈوت کرنے والا اپنے معبود کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے یا ایک ساجد خدا کے حضور سجدہ کرتا ہے اور پھر ایک شب زندہ دار کی طرح رات بھر اسی حالت میں پڑا رہتا ہے۔ پھر جب صبح ہوتی ہے تو یہ سایہ بتدریج سورج کی بالکل مخالف سمت سے اٹھنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے قیام کی حالت میں آجاتا ہے جس طرح ایک مصلی سجدہ سے قیام کی حالت میں آگیا ہو اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اسی رکوع اور سجود کا دور آجاتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ صورت حال دو نہایت اہم حقیقتوں کی شہادت دے رہی ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز چوبیس گھنٹے رکوع و سجود میں ہے۔ دوسری یہ کہ یہ سجدہ آفتاب پرستی کے بالکل ضد ہے۔ آفتاب جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ ہر چیز کا سجدہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جب مغرب میں غروب ہونے لگتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی چیز اپنے تکوینی سجدہ میں آفتاب کی موافقت نہیں کرتی۔ پھر اگر ایک انسان، جو ایک بااختیار مخلوق ہے، خدا کو سجدہ نہ کرے بلکہ اس کے سامنے اکڑے یا سورج اور چاند کو سجدہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود تو خدا کے سامنے اکڑتا ہے لیکن اس کے سایہ وجود کا سایہ خدا کے آگے بچھا ہوا ہے یا وہ خود تو سورج اور چاند کے آگے سجدہ کر رہا ہے لیکن اس کا سایہ ابراہیمی فطرت رکھتا ہے جو کواکب پرستی سے بالکل بیزار ہے إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ پر عامل ہے۔ عالم اختیار اور عالم تکوینی کی یہ بے ربطی "من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید" کی مصداق ہے۔

یہی دلیل ہے جس کو قرآن نے دوسری جگہ کسی قدر مختلف الفاظ میں فرمایا ہے :-

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ	کیا انھوں نے نہیں دیکھا ان چیزوں کی طرف جو خدا نے
يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا	پیدا کی ہیں لوٹتا ہے ان کا سایہ دہنے اور بائیں سے سجدہ
لِّلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ (النحل - ۴۸)	کرتا ہوا اللہ کو اور وہ اس کے آگے ذلیل ہیں۔

قرآن میں اس طرح کے اشارات بہت ہیں اور ہر جگہ ان سے توحید، معاد اور رسالت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو قومیں صغریٰ وکبریٰ کی ترتیب کے بغیر کوئی بات نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ ان کے لیے بے شبہ ان اشارات کے اندر کوئی تعلیم نہیں ہے لیکن عرب جیسی حساس قوم اس طرح کے اشارات سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اٹھاتی تھی بلکہ ان کی اصلی عقلی غذا ان اشارات ہی میں تھی۔ یہ چیز تربیت عقل کے لیے بھی نہایت نافع ہے اور تاثیر کے اعتبار سے تو اشارات کی زبان تصریحات کے مقابلہ میں ہمیشہ بلیغ تر سمجھی گئی ہے۔ ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی اپنے قلب پر وہ اثر نہیں کر سکتے جو تغلق آباد اور دلی مرحوم کے کھنڈر دل

پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر سکتے ہیں ؎

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

توحید کے دلائل انفس میں

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے۔ پھر جب عقل و تمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک موخر ہے ورنہ در حقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دُور ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائل آفاق کی بنیاد در حقیقت انفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان و زمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کے لیے یہ تمام عالم تیرہ و تار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم ظلمات ہوتا چنانچہ جو بلید آسمان و زمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ہیں انکے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، دلنشیں بھی ہیں اور مستحکم بھی، جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ	اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے
أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔	اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی کیا تم نہیں دیکھتے۔

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالمِ نفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور اس وضاحت کے باوجود انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہدِ فطرت

توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے رسالہ "حقیقتِ شرک" کی آخری دو فصلوں میں کی ہے یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعم حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہاں ہم نے سائنس کے علماء کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اسی سے ان کی عبادت کا تصور ہوا۔ اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسبابِ زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو۔ جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو

اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے اور نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکر گزاری کا جذبہ در تصور پیدا کرتا ہے یہ جذبہ نہ تو مجرد الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں عدل سے تعبیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے ناپتا ہے اور اسی جذبۂ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدل فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلا وجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں ظلم عظیم یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے اور سب سے بڑا ظلم شرک۔

اس عدل کو قرآن نے انسانی فطرت کے عہد سے تعبیر کیا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ۔ (اعراف - ۱۷۲)	اور یاد کرو جب لیا تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا ان کے اوپر کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے ہاں ہم گواہ ہیں۔ یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے "حقیقتِ شرک" کی آخری فصل میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے۔ ہمیں تو نہ اس "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کی کوئی خبر ہے نہ اس "بلیٰ" کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد بہر شکل ہر ابن آدم پر حجت ہو گا لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے صدمات جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا

ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور و پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دَور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچے کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجئے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں، مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے، تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلّم ذمہ داری کوئی نہیں، یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلّم ہے۔ یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔"

"اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان و نفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت اور آزادی جان و مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔ اب فرض کیجئے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے۔ اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے۔ اس کے قائم کئے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ ذمہ داری سے بری ہوں یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک

ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اس قسم کے بار اُٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا، تو کیا اس کا جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک "میثاق غلیظ" کیا ہے اور زبانِ خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دُنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سُورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مُرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اُگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کر دیں۔ ہم جس مُرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کُتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دُودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھُول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا وہ عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دُنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کو سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدۂ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان اور قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کیلیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر

اس بات کا حقدار ہے کہ ہم اس کے عہدِ ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں اور گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے، گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔"

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکر گزاری کی جائے اور اس شکر گزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھہرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ قَالَ	اور سناؤ ان کو ابراہیم کی سرگزشت جب اُس نے
لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا	اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا یہ تم لوگ
نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ۝ قَالَ	کس چیز کی پُوجا کر رہے ہو! بولے ہم بتوں کو
هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝ أَوْ	پوجتے ہیں اور برابر پوجتے رہیں گے۔ پوچھا کیا یہ
يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا	سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟ کیا یہ تم کو
آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۝ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ	کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ بولے بلکہ ہم نے
مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ	اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا ہے کہا ذرا
الْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ	دیکھو تو ان کو جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے
الْعَالَمِينَ ۝ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ	اگلے بزرگ۔ یہ تو سب میرے دشمن ہیں مگر عالم کا
يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝	رب جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر ہدایت بخشتا ہے
وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَالَّذِي	اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں
يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي أَطْمَعُ	تو مجھے صحت بخشتا ہے اور جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ
أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝	کرے گا اور جس سے مجھے توقع ہے کہ جزا کے دن میرے
(شعراء ۶۹-۸۲)	گناہ بخشے گا۔

یعنی ایک منعم ہستی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا، جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی، جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم و کرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا ہو گا، بلاشبہ اس بات

کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی شہادت اور دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق اس کی شکر گزاری کی صورت میں ادا کریں اور اسی عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلم عظیم ہے۔

علم و یقین کی فطری طلب

انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابل میں علم اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو۔ اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو۔ وہ اپنی ہستی کی غایت، اور اس کے نیک و بد سے بالکل بے خبر ہو کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے، وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کرے اور اسی پر جم جائے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ ان سوالات سے یکسر کوئی تعرض ہی نہ کرے۔ انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کے مختلف زاویوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح چیز نہ پاکر کسی غلط چیز ہی کو اختیار کر لیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے۔ اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہانے ہیں جن سے طبیعت کو دھوکا تو دیا جا سکتا ہے لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جا سکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ! صرف اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے) یہی وہ روشنی ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہو جاتا ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے) اس کو پالینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصور کر سکتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اب اس کے لیے اخلاق کے اُصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہو سکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کر سکتا ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل و حواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا اور جس راہ میں جو قدم بھی رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہو گا۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل و حواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے حواس غلطی کر جاتے ہیں لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے

نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک بھی جاتی ہے۔ لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر مامور نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظرانداز کردینا بداہت کا انکار ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بتکلف انسان نے اختیار کی ہے۔ ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ وہ ایک "لا ادری" کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور اپنے باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے۔ اِلّا آنکہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفات کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح تر جواب اور عقل کی جستجو کا اصل مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا جو تمام کمال سے متصف ہے انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بنا لئے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب اس سے کسی زائد شے کو ماننا ایک امر واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرتِ انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے۔

فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (مومنون ۱۱۶-۱۱۷)	پس اللہ بادشاہ حقیقی بلند و برتر ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ باعظمت عرش کا مالک ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب، اس کے رب کے پاس ہے۔ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اندر اور باہر سے پا رہا ہے اس لیے اس کو ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی وہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرک کے ابطال پر دلائل قائم کرے کیونکہ مشرک

ایک خدا کو تو بہر حال مانتا ہی ہے، یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے، باقی سب شرکاء و انداد جو اس نے اپنے جی میں فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے دلائل کی۔ ان کی تردید کیلیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۲۔ فطرتِ انسانی کا علو

توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرتِ انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا ہے اور سروری و سرفرازی کا خواہشمند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساسِ برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرتاً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دُنیا میں آیا ہے اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی و برتری کا احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو وہ یقیناً اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ الآیۃ میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے کبھی اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى پکار اُٹھتا ہے کبھی اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ (میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے لیکن اس احساسِ برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں بچپنے بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اُسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آکھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کسی کے آگے جُھکنا نہیں چاہتی، ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قوی اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان و زمین کی مالک و مدبر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس میں بالطبع کمتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے اس میں اصل ولولہ تو خُدا بننے کے لیے ہے لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک اَن دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا لے جائے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ کبرِ نفس اور علو کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعترافِ حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے جو مدعی تھا کہ "میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں" اسی لئے میں ہی رب ہوں حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہہ کر کہ "اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اسے مغرب سے طلوع کر دو"۔ اس کے عجز کو بالکل بے نقاب کر دیا اور وہ اس معارضہ سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا، لیکن کبرِ نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا لیکن جن کی عقل دُرست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علو اور اپنے ضعف دونوں کے توازن کو

قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم و مدبر ہستی کے آگے جھک کر اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پا لیتے ہیں اور ان کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گداگر کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام مایحتاج پا لینے کے باوجود در در صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دنائت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل اور بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزتِ نفس ہے اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ چھنال ہے جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدا کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا ہے جو ایک خدا کو مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پُر ہو گیا۔ اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے۔ اگر تمھیں دوسرے آستانوں پہ بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو، مجھے اس سے معاف رکھو ؎

تحمل اصحابی ولم یحمل واجدی
وللناس اشجان ولی شجن وحدی

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں ارشاد فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَاءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ	اور میں نے پیروی کی اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحٰق،
وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ	اور یعقوب کے مذہب کی، ہمارے لیے زیبا نہیں
اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۚ ذٰلِكَ مِنْ	کہ ہم اللہ کا کسی کو ساجھی ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے
فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ	اوپر اور لوگوں پر احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کا
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝ یٰصَاحِبَیِ	شکر نہیں کرتے۔ اے میرے قید خانہ کے ساتھیو!
السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ	کیا بہت سے الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک ہی
اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ	اللہ جو سب کو قابو میں رکھنے والا ہے۔ نہیں تم پوجتے

دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف ۳۸-۴۰)

ہو اس کے سوا مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ نہیں ہے اختیار مگر اللہ کے ہاتھ میں اس نے حکم دیا ہے کہ نہ بندگی کرو مگر اس کی۔ یہی فطری دین ہے مگر اکثر نہیں جانتے۔

اس تقریر کے ابتدائی حصّہ کی رُوح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت و عزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا، لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلاکسی سبب کے اس نے اپنی نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے اور انسان اپنے نفس کے علو کے باوجود، اس لیے خدا کو ماننا ہے کہ اس کے ماننے بغیر اس کی فطرت کا خلا پُر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد و قہار کی اطاعت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ خود دار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے۔ وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسان کی فطرت بھی اس ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اسی علو کی بنا پر موحد و مشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (زمر-۲۹)

اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص (غلام) کی جس میں بہت سے جھگڑنے والے آقا شریک ہیں اور ایک شخص (غلام) کی جو سموچا ایک ہی شخص (آقا) کا ہے کیا دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے؟ شکر اللہ کے لیے بلکہ اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا، تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کر لیتا ہے؟ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے

بعد فطرتِ انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمدللہ یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔
انسان کے اسی علوئے فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ — کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔

یہی علوءِ نفس ہے جس کو انسان شرک میں آلودہ ہونے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعۃً رفعت و عزت کے اس آسمان سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے۔ انتہائی ذلت کی پستی میں گر جاتا ہے۔ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ۔ تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ۔

اور دُوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ	کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو
وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَ	آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند
النُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ	اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہتیرے
وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ	انسانوں میں سے بھی اور بہت سے ایسے ہیں جن پر
الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ	عذاب واجب ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے
مِنْ مُّکْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ۔	تو ان کو کوئی عزت دینے والا نہیں اور بے شک اللہ
(الحج - ۱۸)	کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گزاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴۔ اِنسان کا ضُعف و افتقار

چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے۔ ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اُگلوا لیتا ہے۔ فضاؤں میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے۔ سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعے سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے۔ ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں کسی چیز کو اُس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اسی کے بنائے ہوئے قانونِ طبیعی کی پابند بھی ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو سمجھے اور پھر

ان کے قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اُٹھائے اور یہ تمتع بھی۔ بس ایک مدت ہی تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک اَن دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ اور دوسری جگہ فرمایا ہے : وَاللّٰہُ الغنی وَ انتم الفقراء، اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خُدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤد، حضرت سلیمان، ذوالقرنین اور فاروق اعظم ہیں لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے ارد گرد دولت کی فراوانی، خدم و حشم کی کثرت اور طاقت و قوت کے کرشمے دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور بولہبوں کے ائمۂ ضلالت ہیں۔

جن لوگوں پر اس طرح کی خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خُدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی اور ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں اور اس وقت اس کے مُنہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکا خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ لشکر یا اس کے غیبی شرکاء و انداد سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات رہ جاتی ہے جس کا دامنِ رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے :-

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○ (انعام - ۶۳-۶۴)	پُوچھو کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور چُپکے چُپکے اگر اس نے ہم کو رہائی دی۔ اس آفت سے تو ہم شکر گزاروں میں سے بنیں گے۔ کہہ دو اللہ ہی ہے جو تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم اس کا ساجھی ٹھہراتے ہو۔

دُوسری جگہ فرمایا :-

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ	وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں یہاں تک کہ جب تم ہوتے ہو کشتی میں اور کشتیاں ان کو لے کر

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور اُبھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو انما اوتیته علی علم (ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے سائنس کے زور سے ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے۔ جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیئے تھے جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

توحید کے خصوصی دلائل

دلائل بلحاظ مسلّمات مخاطب

اوپر کی دو فصلوں میں ہم نے الوہیت اور توحید کی وہ دلیلیں بیان کی ہیں۔ جن کی حیثیت عام دلائل کی ہے۔ ان کی اساس اس کائنات کے نوامیس و سنن اور فطرتِ انسانی کے اذعانات و مسلمات پر ہے۔ اس وجہ سے، ہرچند ان کے مخاطب اوّل عرب ہیں لیکن ان کی حجت تمام بنی آدم پر، بلا امتیاز عرب و عجم اور بلا لحاظ کافر و مومن، یکساں اور عام ہے۔ یہ صحیفۂ کائنات ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور فطرت کی شہادتیں بھی ہر قلب سلیم کے اندر سے بول رہی ہیں۔ صرف وہی لوگ ان حقائق کے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں اور اپنے کان بہرے کر لئے ہوں، ایسے لوگوں کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی۔ اب ہم ان دلائل کی توضیح کریں گے جن کی بنیاد مخالف کے اعترافات پر قائم ہے۔ ان کی حیثیت خصوصی دلائل کی ہے یعنی مخاطب جن صحیح اصولوں کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن نے ان کو اپنا لیا ہے اور ان کی اساس پر ان کے مقتضیات و لوازم کی تشریح کر کے، مخاطب سے ان کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی جو باتیں ان مسلمات سے متناقض ہیں ان کی نفی کا مطالبہ کیا ہے استدلال کا یہ اسلوب بالکل عقلی و فطری ہے۔ اس پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں اساس استدلال بے ثبوت رہ گئی ہے بالکل لغو بات ہے۔ استدلال کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس اصل کو بھی مدلل و مبرہن کرنے پر وقت ضائع کیا جائے جو حریف کے نزدیک مسلم ہے۔ انہی دلائل کی وجہ سے ہمارے بعض فلاسفہ و متکلمین کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ قرآن کے سارے دلائل الزامی قسم کے ہیں یا وہ ایسے براہینات سے قرآن بالکل خالی ہے جن کی حجت تمام انسانوں پر عام ہو سکے۔ یہ خیال قرآن سے بے خبری پر مبنی ہے۔ یہ تو قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے جس کی بنیاد ایک طرف مخاطب کے اعتراف پر ہے اور دوسری طرف ان براہینات پر ہے جن کی شرح ہم پچھلی دو فصلوں میں کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی توضیح کی کوشش کریں گے۔

بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا	سازگار ہوا سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں تند
رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ	ہوا آتی ہے اور موجیں ان پر ہر طرف سے گھیرے
مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا	ڈالتی ہیں اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک
اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا	ہوئے پکارتے ہیں اللہ کو اسی کے لیے اطاعت کو
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ o	حاصل کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہم کو اس آفت سے
فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي	نجات دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔	پس جب ان کو نجات دے دی دفعتہً وہ زمین
(یونس ۲۲-۲۳)	میں سرکشی کرنے لگے بغیر کسی حق کے ۔

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی یہ کتنی سچی مثال ہے۔ دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے ۔ وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حُسنِ انتظام پر مغرور رہتا ہے۔ اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے اپنے سرو سامان اور اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خدا کی اطاعت و شکر گزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے لیکن جب دفعتہً سازگار ہوا طوفانی بن جاتی ہے کشتی ڈانواں ڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرِ کاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا، بلکہ تیرا شکر گزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا، نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی۔ لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے۔ پھر وہی غفلت اور مستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سرو سامان اور جس گھمنڈ کو اس نے اتنا بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے ایسے لوگوں کو خدا نے 'ختار' اور 'کفور' 'عہد شکن' اور 'ناشکر گزار' کہا ہے۔ کیونکہ فطرت کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آ کر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفرانِ نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مامن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا رہے تو وہ کبھی انانیت، خود سری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو، لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پا کر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے۔ لیکن بس بھول جاتا ہے، اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے قریبِ اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

۱۔ شرک کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے

اس بات میں قرآن نے عربوں پر سب سے بڑی حجت یہ قائم کی ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ان کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کا سوال تو خارج از بحث ہے کیونکہ اسے تو تم مانتے ہی ہو اور اس کی شہادت آفاق و انفس سے بھی مل رہی ہے لیکن اس کے سوا جن کو تم نے خدائی میں شریک بنا رکھا ہے۔ ان کی دلیل لانا تمھارا فرض ہے۔ بغیر دلیل کے کسی معمولی بات کو بھی ماننا انسان کی فطرت کے خلاف ہے چہ جائیکہ کسی کو خدا کا دست و بازو قرار دینا۔ پس اس کی اگر کوئی عقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو اور اگر کوئی نقلی دلیل ہے تو اس کو سامنے لاؤ۔ رہی یہ بات کہ تم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے اتنے بڑے دعوے کے ثبوت کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہو سکتی۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ
لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۔
(مومنون)

اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً
سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔
(یوسف)

تم نہیں پوجتے اس کے سوا مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ٹھہرا لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ
بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ۔ (الروم)

کیا ہم نے کوئی دلیل اتاری ہے جو شہادت دے رہی ہو ان چیزوں کی جن کو وہ خدا کا ساجھی ٹھہراتے ہیں

اہلِ عرب اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ہمارے بزرگوں نے جو شرک اختیار کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ قرآن نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے۔ خدا نے کبھی شرک کا حکم نہیں دیا ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی ایسی سند پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ
شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ
قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ۔ (الاحقاف - ۴)

کہو ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کیا چیز ہے زمین کی جو انھوں نے بنائی ہے یا کیا چیز ہے جس میں آسمانوں میں ان کا ساجھا ہے، میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی اور علمی سند اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

رہی یہ بات کہ یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کی تعلیم ہے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ تو ہجرت کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ واحد کے لیے اپنے خاندان و وطن سب کو چھوڑ دیا اور ہجرت کے وقت انھوں نے

شرکاء و شفعاء سے جس طرح اپنی علیحدگی کا اعلان کیا اور برأت کا جو یادگار کلمہ کہا آج تک ان کی ذریت کی ایک شاخ بنی اسرائیل میں اس کی روایت موجود ہے جو ان کے تمام اخلاف کے لیے ہمیشہ نشانِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس استدلال اور قرآن کے جواب کی پوری تفصیل موجود ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ
مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا
يَخْرُصُوْنَ ۔ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ
قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ بَلْ
قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ
وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ وَكَذٰلِكَ
مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ
نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا وَجَدْنَا
اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ
قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ
عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ، فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ
لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ
اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ
وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔

(۲۰-۲۸)

اور کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا ہم ان کو نہ پوجتے، ان کو اس کا علم نہیں ہے وہ محض اٹکل کے تیر چلاتے ہیں کیا ہم نے اس سے پہلے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کی وہ اپنے پاس سند رکھتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک ڈھرّے پر پایا ہے اور ہم انکے طریقہ پر راہ یاب ہیں اسی طرح ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک دھرّے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔ کہا کیا اگرچہ میں اس سے زیادہ ہدایت کی چیز لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے؟ بولے جو تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ پس ہم نے ان سے انتقام لیا پس دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو مگر اس سے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پس وہ میری رہبری فرمائے گا اور ہم نے اس اعلانِ برارت کو ایک یادگار کلمہ بنایا اس کی ذریت میں تاکہ وہ رجوع کریں۔

ان آیات کے مطالب کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ عرب شرک کی حمایت میں جو روایات پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور بے سروپا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی مدون سرگزشت جس کو ایک علمی سند کی حیثیت دی جا سکتی تھی اور جو بنی اسرائیل کے صحیفوں میں موجود تھی، عربوں کے ان من گھڑت فسانوں کی تردید کے لیے بالکل کافی تھی خصوصیت کے ساتھ ان کی ہجرت کا واقعہ تو توحید و اخلاص کا ایک یادگار کارنامہ تھا۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ذریت ابراہیم کی دونوں شاخوں میں سے کسی نے بھی اس کلمۂ باقیہ کی روح نہیں پہچانی۔ یہود اس نشانِ راہ کے باوجود بار بار بھٹکے اور بالآخر توحید کے صراطِ مستقیم سے

وہ اس قدر دُور ہو گئے کہ ان کے لیے اس کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی اور عربوں نے تو اپنی روایات کے دفتر سے سرے سے یہ سرگزشت ہی گم کر دی اور اس کے بالکل برعکس ایسی روایات گھڑ کے کھڑی کر دیں جن سے بُت پرستی کی تائید نکلے۔

عربوں کے ان اوہام کی تردید میں قرآن نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف واقعاتِ زندگی کا، نیز خانہ کعبہ کی تعمیر اور مقصدِ تعمیر کی ابتدائی تاریخ کا اور تمام انبیاء کرام کی دعوت کے مشترک مقصود کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے تمھارے اس دعوے کی تائید نکلتی ہو کہ خدا نے شرک و بت پرستی کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا ذریعہ انبیاء ہیں اور انبیاء کی دعوتیں اگلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کی دعوت کو بھی تم شرک کی حمایت میں پیش نہیں کر سکتے۔ انبیاء کی تاریخ کا مدون سرمایہ قرآن کے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے اور جہاں کہیں اس تاریخ میں کوئی بات ملائی گئی ہے اس کی تردید خود اسی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ لوازم سے استدلال

قرآن کے استدلالِ خصوصی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کی جن صفتوں کو تسلیم کرتے تھے۔ قرآن نے ان کے لوازم کو بھی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ لوازم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ صفات جو ان مانی ہُوئی صفات سے متفرع ہوتی ہیں، نیز ان صفات کی نفی جن سے مانی ہُوئی صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ دوسرے وہ حقوق و فرائض جو ان صفات کے اقرار سے لازمی نتیجہ کے طور پر اقرار کرنے والے پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و عقائد کی نفی جن سے خُدا کے مسلّمہ حقوق کی نفی لازم آتی ہے۔

اہلِ عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے قائل تھے بلکہ آسمانوں اور زمین کا خالق، روزی رساں، قوی اور قابلیتوں کا بخشنے والا۔ موت اور زندگی کا مالک اور مدبّرِ امر خدا ہی کو مانتے تھے لیکن ربّ یعنی مالک و حاکم خدا کے سوا اوروں کو بھی قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ جس کے لئے یہ ساری صفتیں تسلیم کرتے ہو لازم ہے کہ رب بھی اسی کو مانو۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۔ (یونس ۳۲)	پس وہی اللہ تمھارا حقیقی رب بھی ہے۔ پس حق کے بعد نہیں ہے مگر گمراہی۔ تو کہاں بھٹکے چلتے ہو۔

یعنی یہ ساری باتیں مان لینے کے بعد تو یہ لازم ہے کہ مالک و حاکم اور آمر و ناہی اسی کو مانو۔ اس حق کے بعد جو ثابت ہے۔ اگر کسی اور کو بھی مانتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو یہ بھی ضلالت و گمراہی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ جس کو خالقِ ارض و سماء مانتے ہو لازم ہے کہ اسی کو رب بھی مانو۔ اس کے سوا کسی اور کو مالک و حاکم نہ بناؤ۔ جو خالق ہے امر و حکم کا حق اسی کو پہنچتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	بے شک تمھارا مالک وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں

وَالْاَرْضَ . . . . . اَلَا لَـهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۔ اور زمین کو بنایا . . . . آگاہ اسی کے لیے خلق اور امر ہے۔

جس اللہ کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو اسی کو رب بھی مانو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خالق کوئی ہو اور رب کوئی بن جائے۔ جس نے خلق کیا ہے امر اسی کا حق ہے۔ جب ایک جزیرہ کا انکشاف کرنے والا اور ایک چیز کا ایجاد کرنے والا محض اپنے کشف و ایجاد کی بدولت یہ حق رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت اور اس پر تصرف کا حق اسے حاصل ہو تو خدا کے اس حق سے کیوں انکار کرتے ہو درآنحالیکہ اس کا حق کشف و ایجاد سے بدرجہا زیادہ ہے۔

اسی طرح خالق کے لیے صفت علم کو لازم قرار دیا یعنی جس ذات کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط کل مانو۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خلق کیا)

اسی طرح یہ لازم ہے کہ جس خدا کو خلق و تدبیر پر قادر مانا ہے۔ تمام نفع و ضرر اسی کے اختیار میں تسلیم کیا جائے۔ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ، وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اگر تم کو اللہ کسی نقصان میں پکڑے تو اس کو نہیں دُور کر سکتا مگر وہی اور اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پہ قادر ہے)

اسی طرح تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے بری قرار دیا گیا جو الوہیت کے منافی ہیں یا جن کو تسلیم کرنے سے ان صفات کی نفی لازم آتی تھی جن کو اہلِ عرب خدا کے لیے تسلیم کرتے تھے۔ یہ باب نہایت وسیع ہے اور اس پر ایک حد تک ہم رسالہ حقیقت شرک میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اچھی صفتیں سزاوار ہیں۔ کوئی بُری صفت الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ اس کائنات کا معمہ حل ہی ایک ایسی ذات کو ماننے سے ہوتا ہے جو تمام صفات جمال و کمال کی جامع ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت لگا دی جائے جو جمال و کمال کے منافی ہو تو یہ حل شدہ معمہ پھر معمہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کائنات پر وہی ظلمت پھر طاری ہو جاتی ہے۔ جس سے خدا کے صحیح تصور نے نکالا تھا۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآئِهٖ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ (الاعراف - ۱۸۰)	اور اللہ کے لیے اچھی ہی صفتیں ہیں تو انھیں صفتوں سے اسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات کے باب میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔

اس ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت شرکا و شفعاء کے اعتقاد کو حاصل ہے۔ اس عقیدہ سے خدا کی تمام اصولی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ان کے ان تناقضات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ شفعاء کو ذریعہ تقرب بنانے سے لازم آتا ہے کہ خدا کا علم محیط نہیں ہے کیونکہ اگر اس کا علم محیط ہے تو یہ شفعاء اس کے علم میں کیا اضافہ کریں گے، اور اگر وہ اپنے علم کے خلاف محض ان کی سفارش کی بنا پر، لوگوں کو نیکوکار اور بدکار ٹھہرائے گا تو اس سے اس کے عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے

اگر یہ خیال ہے کہ اس کی عنایت حاصل کرنے کے لیے تنہا عمل و اطاعت کافی نہیں ہے بلکہ کسی کا وسیلہ بھی ناگزیر ہے تو اس سے بندہ کے ساتھ اس کی قربت، اس کی رحمت عام، اور اس کے غفور و کریم ہونے کی نفی ہوتی ہے اور یہ ایک بدترین سوءِ ظن ہے جس میں ایک بندہ اپنے پروردگار کے متعلق مبتلا ہو سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کسی کو خدائی کے انتظام میں ساجھی ٹھہرانا یا تو خدا کے کمال قدرت کی نفی ہے یا کمالِ غیرت کی کیونکہ کسی اور کی حصہ داری وہی خدا گوارا کر سکتا ہے جس کے لیے آسمان و زمین کا سنبھالنا مشکل ہو۔ یا پھر وہ بے غیرت ہو کہ اسے اپنے حدود و حقوق میں دوسروں کی مداخلت سے کوئی ننگ نہ لاحق ہو اور الوہیت کا تصور ان تمام عیوب و نقائص سے بالکل پاک ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ عربوں کو ان تناقضات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی صفت نہ مانیں جو خدائی کے برتر مفہوم سے بے جوڑ یا جس سے ان صفات کی نفی لازم آتی ہے جن کو وہ تسلیم کر چکے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ الزامی اور تنزیہی پہلو بالکل ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں اور اندازِ کلام عموماً مجادلہ کا نہیں بلکہ ایک مسلّمہ حقیقت کے بیان کا ہوتا ہے کیونکہ ایک امر کے اقرار کے ساتھ اس کے لوازم کا اقرار اور اس کے اضداد کا انکار ایک امر بدیہی ہے جس سے صرف وہی لوگ گریز کر سکتے ہیں جو ہٹ دھرم ہوں۔

مندرجہ ذیل آیات پر مذکورہ بالا پہلو سے غور کرنا چاہیئے :-

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ
لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ
قَانِتُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ
(بقرہ - ۱۱۵)

اور وہ کہتے ہیں خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ وہ پاک ہے
بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے
سب اسی کے فرمانبردار ہیں، موجد ہے آسمانوں اور زمین
کا اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہو جا
پس وہ ہو جاتی ہے۔

یہاں 'سُبْحٰنَهٗ' (وہ پاک ہے) کا لفظ ایک دلیل کے طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ الوہیت کا تصور مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کی احتیاج اور ہر قسم کے کفو و برادری کی نسبت سے ارفع و منزہ ہو۔ وہ آسمان و زمین کا موجد ہو، ان کو عدم سے وجود میں لایا ہو اور اس کی قدرتِ کاملہ کا یہ حال ہو کہ جب چاہے مجرد اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے وجود میں لا دے۔ ایک ایسی ہی ذات خدا ہو سکتی ہے اور تم کو خدا کے لیے ان صفات سے انکار نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ تم بعض ایسی صفتیں بھی مان لیتے ہو جو ان سے بالکل متناقض ہیں، جو نہ تو مفہوم الوہیت کے شایانِ شان ہیں اور نہ تمہاری مانی ہوئی صفتوں کے ساتھ وہ کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :-

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط اَلْغَنِيُّ
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ

کہتے ہیں اللہ کے اولاد ہے۔ وہ پاک ہے، وہ مستغنی
ہے، اسی کے اختیار میں ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍۭ بِهٰذَا ط
(یونس - ۶۸)

جو کچھ زمین میں ہے۔ نہیں ہے تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل۔

ایک جگہ اوثان و اصنام کے ضعف و بے چارگی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ الوہیت کے تصور کی یہ انتہائی تحقیر ہے کہ ایسے بے بس وجودوں کو اس خدا کا دست و بازو قرار دو جس کو قوی و عزیز مانتے ہو اور جس کی قوت و عزت کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ط
اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ
يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ
يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ
مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ مَا
قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ
عَزِيْزٌ۔ (الحج ۷۳-۷۴)

اے لوگو! ایک مثل بیان کی جاتی ہے اس کو غور سے سنو، خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اس اس کو واپس نہیں لے سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ناتواں! انھوں نے اللہ کی حقیقی قدر نہیں پہچانی۔ بیشک اللہ قوت والا اور غالب ہے۔

ایک جامع مثال ملاحظہ ہو جس میں توحید کی مختلف الزامی، تنزیہی، آفاقی اور نفسی دلیلیں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں:-

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ م
مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط
اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ
كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ
يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى
النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ
الْقَمَرَ ط كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى
اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا مددگار بنا لیے ہیں کہتے ہیں ہم ان کو نہیں پوجتے ہیں مگر اس لیے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف سے پاس کے درجے۔ اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس چیز کے بارے میں جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں۔ اللہ نہیں راہ یاب کرے گا ان کو جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا کہ اپنے لیے اولاد بنائے تو اپنی مخلوق میں سے منتخب کر لیتا جو چاہتا وہ پاک ہے، وہ تو ایک ہی اللہ ہے سب کو قابو میں رکھنے والا۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ، ڈھانکتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے، ہر ایک متعین وقت کے لیے چلتا ہے۔ آگاہ! وہ غالب اور

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ
اَزْوَاجٍ ط يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ
خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ اِنْ
تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى
لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ
لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ط
ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ط اِنَّهٗ عَلِيْمٌ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذَا مَسَّ
الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا
اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا
لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ
تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۔

(زمر - ۳ - ۸)

بخشنے والا ہے۔ تم کو پیدا کیا ایک جان سے پھر اس کی جنس سے بنائی اس کی جورو اور اتاریں تمھارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ قسمیں۔ پیدا کرتا ہے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے، خلقت کے بعد خلقت، تین پردوں کے اندر، وہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کے لیے بادشاہی ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ تو کہاں بھٹک جاتے ہو، اگر تم ناشکری کروگے تو اللہ تم سے بے پرواہ ہے اور وہ اپنے بندوں کیلئے ناشکری کو پسند نہیں کریگا اور اگر شکر کروگے تو اس کو پسند کرے گا اور نہیں اُٹھائے گی کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ، پھر تمھارے رب کی طرف تمھارا لوٹنا ہے تو تم کو خبر دے گا تمھارے کئے کی۔ وہ سینوں کے بھید جاننے والا ہے اور جب انسان کو کوئی بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے۔ اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب اس کو بخش دیتا ہے اپنی طرف سے نعمت وہ بھول جاتا ہے اس کو جس کی طرف بلا رہا تھا اس سے پہلے اور اللہ کا شریک بنا لیتا ہے تاکہ اس کے رستے سے گمراہ کرے۔ کہہ دو اپنے کفر کے باوجود تھوڑا سا متمتع ہولے تو جہنم والوں میں سے ہے۔

جو شخص ان آیات پر غور و تدبر کرے گا اس کے سامنے بالتدریج توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے مندرجہ ذیل پہلو آئیں گے۔

(ا) جو لوگ کسی کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اگر ہے تو اس کو پیش کریں۔ اس دلیل کی تفصیل فصل کے شروع میں گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) یہ خیال کہ خدا کی بیٹیاں ہیں، جو اس کے ہاں سفارشی ہوں گی، بالکل باطل ہے۔ خدا کے لیے اولاد کا تصوّر ہی سرے سے غلط ہے۔ خدا کو واحد اور قہار (قابو CONTROL میں رکھنے والا) ہونا چاہیے۔ وہ ہر قسم کے احتیاج سے

بالاتر ہے۔ اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت۔ پھر ستم یہ ہے کہ اہلِ عرب خُدا کے لیے بیٹیاں مانتے تھے۔ حالانکہ خود بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوہری غلطی کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ خُدا کے لیے اولاد تسلیم کر رہے تھے۔ دوسری یہ کہ اولاد میں سے بھی خدا کے حصہ میں وہ اولاد دیتے تھے جس سے خود نفرت دیتے تھے۔

(ج) عالم کی خلقت عبث نہیں ہوئی بلکہ ایک غایت کے ساتھ ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزا کا ایک دن ضرور آنے والا ہے اور عدل کامل کا ظہور یقینی ہے۔ اس تصور کے ساتھ شفاعت کا تصور نہیں جمع ہو سکتا کیونکہ شفاعت کا تصور عالم کے بامقصد ہونے کی نفی کر دیتا ہے۔ شفاعت عدل کی نفی ہے۔

(د) اس کے بعد دلیل توافق اور دلیل تسخیر (جو اُوپر بیان ہو چکی ہے) سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کائنات کا خالق عزیز و غفار ہے۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے ہاں ایک لفظ بول سکے۔ 'غفار' یعنی بخشنے والا اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا۔ اس لیے اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کا اپنا عمل خود سفارشی ہے۔

(ہ) اس کے بعد خلقت اور ربوبیت کے دلائل سے اپنے علم کے احاطہ پر استدلال کیا اور پھر نتیجہ نکالا کہ جس نے پیدا کیا جس نے پرورش کے وسائل مہیا کئے، جو ماؤں کے پیٹوں کے اندر، تہ بہ تہ پردوں کے پیچھے اپنی کاریگری کے کرشمے دکھاتا ہے وہ خدا مستحق ہے اس بات کا کہ اس کو رب مانو۔ اسی کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ نہ ہونا چاہیے۔

(و) اس کے بعد قانونِ عدل بیان کر کے شفاعت کی ساری توقعات کی بنیاد ڈھا دی کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے نہ کفر کو پسند کرتا ہے نہ شکر کو ناپسند۔ تو جو شخص چاہے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرے اور جو چاہے ناشکری کر کے اس کے قہر و غضب میں اپنے تئیں مبتلا کر لے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار آدمی کے اپنے عمل پر ہے۔ کوئی دوسرا نہ شکر کو کفر بنا سکتا ہے نہ کفر کو شکر۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔

(ز) اس کے بعد اپنے احاطۂ علم کو بیان کر کے شفاعت کی ضرورت کی نفی کر دی کہ وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے کوئی دوسرا اس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا۔

(ح) آخر میں توحید کی وہ دلیل بیان کی ہے جو دلیل افتقار کے عنوان سے ہم دلائل انفس کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام لوازم اور تمام تر تنزیہات کے بعد خدا کا تصور جس شکل میں خُدا کے سامنے آیا اس کی ایک عمدہ مثال آیت الکرسی ہے:۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ	اللہ، نہیں کوئی معبود مگر وہ، زندہ ہے اور قائم رکھنے
لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ، لَهٗ مَا	والا، نہ اس کو اُونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند اس کے قبضہ

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَھُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۔ (البقر: ۲۵۵)

ہیں سے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے ہاں بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور ان کی حفاظت اس پر گراں نہیں ہے اور وہ بلند و بزرگ ہے۔

دوسری نہایت عمدہ اور جامع مثال سورۂ حشر میں ہے اور اس میں تنزیہہ کی جگہ اثبات کا پہلو غالب ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۰ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۰ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (حشر ۲۲-۲۴)

وہ اللہ ہے، نہیں کوئی معبود مگر وہ، ڈھکے اور کھلے کا جاننے والا، وہ رحمٰن و رحیم ہے، وہی اللہ ہے نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ بادشاہ، پاک، سکھ، امن دینے والا، معتمد، غالب، عالی جناب، متکبر، (غیور) پاک ہے اللہ ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے خلق کرنے والا (ڈیزائنر) وجود بخشنے والا، صورت گری کرنے والا اسی کے لیے ہیں ساری اچھی صفتیں، اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے

اسی ذیل میں سورۂ اخلاص کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔

کہہ اللہ بے ہمہ ہے، اللہ باہمہ ہے، نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔

خدا کا یہ تصور ان مسلمات کی اساس پر آراستہ ہوا جن کا اہلِ عرب کو اقرار تھا۔ قرآن نے یہ کیا کہ جن صفتوں کو اہلِ عرب مانتے تھے ان کے لوازم کو بھی اُس نے اُن کے سامنے رکھ دیا کہ ان کو بھی تسلیم کرو۔ علیٰ ہذا القیاس جن باتوں سے ان مسلمات یا ان کے لوازم کی نفی لازم آتی تھی، مطالبہ کیا کہ ان کا انکار کرو۔

اسی طرح ان صفات کو تسلیم کرنے سے تسلیم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے تھے ان کو بھی بلا شرکت غیرے تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

سورۂ اعراف میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جس نے خلق کیا ہے لازماً وہی رب ہے اور امر و حکم کا حق اسی کو

حاصل ہے یہ نتیجہ نکالا کہ خفیہ وعلانیہ اور اُمید وبیم ہر حال میں اسی کو پکارنا چاہیے، مشکلوں کو آسان کرنے والا، خطرات ومصائب کا دُور کرنے والا اور اُمیدوں کو پُورا کرنے والا وہی ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہُوئے اور چُپکے ہُوئے) وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اور اسی کو پکارو بیم ورجا میں)

سُورۂ بقرہ میں فرمایا کہ جس کو خالق مانتے ہو اسی کی بندگی اور اطاعت بھی کرو، دوسروں کو اس بندگی اور اطاعت میں شریک نہ کرو۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ	اے لوگو! اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔

اس بندگی کے لیے جگہ جگہ یہ شرط لگائی کہ خالص اطاعت کے ساتھ اس کی بندگی کرو۔ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ پُوجا خدا کی ہو اور اطاعت کسی اور کی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، پس اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہُوئے)

اسی طرح فرمایا جس رب کے لیے آسمان وزمین کی بادشاہی ثابت ہے، حمد وشکر کا سزاوار صرف وُہی ہے۔ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے شکر گزاری ہے)

سورۂ بقرہ ہی میں خدا کو منعم حقیقی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی کو محبت حقیقی کا مرکز ہونا چاہیے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا کہ جب سب کچھ خُدا ہی کی بخشش سے ملا ہے تو صرف خدا ہی کو ان کے حرام یا حلال کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے ان کو حلال وحرام کرنے کا حق تسلیم کرنا یا دوسروں کا ان کو حلال وحرام کرنا شرک ہے (دیکھو آیات ۱۶۳ - ۱۶۹ بقرہ)

سورۂ نحل (آیات ۴۸ - ۵۹) میں آسمان وزمین میں ایک ہی خدا کا تصرف ثابت کرنے کے بعد اس کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ (پس مجھ سے ڈرو) اور غیر اللہ سے ڈرنے پر تعجب کا اظہار فرمایا افغیر اللہ تتقون (کیا اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو)

سورہ انعام میں فرمایا کہ جو آسمان وزمین کا فاطر ہے لازم ہے کہ اسی کو یاور و ناصر بنایا جائے اور اپنے تئیں بالکلیہ اسی کے حوالے کیا جائے۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ	کہو کیا میں اللہ کے سوا جو آسمانوں اور زمین کا پیدا
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ یُطْعِمُ	کرنے والا ہے کسی اور کو اپنا مرجع بناؤں حالانکہ
وَلَا یُطْعَمُ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ	وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ کہو مجھے تو حکم ملا ہے
اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ۔	کہ میں پہلا حوالہ کرنے والا بنوں اپنے تئیں اللہ کو

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کو ہادی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی

کی جائے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ
اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ
يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ
لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ
كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (۳۵)

پوچھو تمھارے شرکا میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے کہہ دو اللہ حق کے لیے ہدایت کرتا ہے تو کیا جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو ہدایت نہیں پکڑ سکتے الا آنکہ ان کو ہدایت کی جائے۔ تو کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو۔ بندگی اسی کی کی جائے۔ استعانت اسی سے ہو۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔)

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے کسی دوسرے کو شریک کر کے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے۔ مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع و سفارشی مان کر اس کی صفت علم کی نفی نہ کرے۔ جو شخص خدا کو رحمان و رحیم مانتا ہے وہ شفاعت کا عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل سے بدگمان نہ ہو[1]۔ جو خدا کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے، وہ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرے جو خدا کو پاک و پاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء و انداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سکھ اور چین تسلیم کرتا ہے۔ وہ سکھ اور طمانیت اسی سے طلب کرے جو اس کو امن دینے والا مانتا ہو وہ اسی کی پناہ میں چھپے جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسا کرے اور اسی سے طالب مدد ہو جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اس کے آگے سب کو یکساں عاجز و سرفگندہ مانے۔ جو اس کو غیور مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کر کے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے جو خدا کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

---

[1] جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعا کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات کی شرکت اور اس کے علم اور عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں تدلل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز و سرفگندہ کھڑے ہوں گے نیز کوئی شخص بغیر اذنِ الٰہی کے اس کے حضور میں زبان نہ کھول سکے گا۔ نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہو گی جس سے حق باطل اور باطل حق بن جائے۔ پس انبیاء و صالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے اور اس پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم حقیقت معاد میں کریں گے اور بعض ضروری باتوں سے رسالہ حقیقت رسالت میں بھی تعرض کریں گے۔

۳- دلیلِ عدل

توحید کے انفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس شعورِ عدل کو قرآن نے عہدِ فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے۔ وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہلِ عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن سے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرتِ انسانی اور مسلمات عرب دونوں شامل ہیں۔ مثلاً اہلِ عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رساں خدا ہی کو مانتے تھے لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر ان کا رتبہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر جا کر بٹھا دیتے بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن نے ان کے اس مسلمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمہاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے اسی چیز کو اللہ جل شانہٗ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارہ میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے :-

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ
فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ
فَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ وَاللّٰهُ جَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً
وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ اَفَبِالْبَاطِلِ
يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ
لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا
وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ
اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ ضَرَبَ
اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى
شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے تو وہ جن کو فضیلت بخشی گئی ہے اپنی روزی اپنے مملوکوں کو نہیں دے دیتے کہ آپس میں برابر ہو جائیں۔ کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو پاکیزہ چیزوں کی روزی دی تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو ان کے لیے آسمان و زمین سے ذرہ برابر بھی ان کے لیے نہ رزق پر اختیار رکھتی ہیں اور اختیار حاصل کر سکتی ہیں تو اللہ کیلئے تمثیلیں بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا

کی جائے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (۳۵)

پوچھو تمھارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے کہہ دو اللہ حق کے لیے ہدایت کرتا ہے تو کیا جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو ہدایت نہیں پکڑ سکتے الا آنکہ ان کو ہدایت کی جائے، تو کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو۔ بندگی اسی کی کی جائے۔ استعانت اسی سے ہو۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے کسی دوسرے کو شریک کر کے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے۔ مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع و سفارشی مان کر اس کی صفت علم کی نفی نہ کرے۔ جو شخص خدا کو رحمان و رحیم مانتا ہے وہ شفاعت کا عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل سے بدگمان نہ ہو[1]۔ جو خدا کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے، وہ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرے جو خدا کو پاک و پاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء و انداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سکھ اور چین تسلیم کرتا ہے۔ وہ سکھ اور طمانیت اسی سے طلب کرے جو اس کو امن دینے والا مانتا ہو وہ اسی کی پناہ میں چھپے جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسا کرے اور اسی سے طالب مدد ہو جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اس کے آگے سب کو یکساں عاجز و سرفگندہ مانے۔ جو اس کو غیور مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کر کے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے جو خدا کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

---

[1] جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعاء کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات کی شرکت اور اس کے علم اور عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں تدلل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز و سرفگندہ کھڑے ہوں گے نیز کوئی شخص بغیر اذنِ الٰہی کے اس کے حضور میں زبان نہ کھول سکے گا۔ نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہوگی جس سے حق باطل اور باطل حق بن جائے۔ پس انبیاء و صالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے اور اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ ہم حقیقت معاد میں کریں گے اور بعض ضروری باتوں سے رسالہ حقیقت رسالت میں بھی تعرض کریں گے۔

۳ - دلیلِ عدل

توحید کے نفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس شعورِ عدل کو قرآن نے عہدِ فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے۔ وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہلِ عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن سے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرتِ انسانی اور مسلمات عرب دونوں شامل ہیں۔ مثلاً اہلِ عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رساں خدا ہی کو مانتے تھے لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر ان کا رتبہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر جا کر بٹھا دیتے بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن نے ان کے اس مسلمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمہاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے اسی چیز کو اللہ جل شانہٗ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارہ میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے :-

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ
فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ
اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً
وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ
يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ
لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا
وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ
اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ضَرَبَ
اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى
شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں
فضیلت دی ہے تو وہ جن کو فضیلت بخشی گئی ہے
اپنی روزی اپنے مملوکوں کو نہیں دے دیتے کہ آپس
میں برابر ہو جائیں۔ کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے
ہیں اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں
بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور
پوتے پیدا کئے اور تم کو پاکیزہ چیزوں کی روزی دی
تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا
انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی
بندگی کرتے ہیں جو ان کے لیے آسمان و زمین سے
ذرہ برابر بھی ان کے لیے نہ رزق پر اختیار رکھتی ہیں
اور نہ اختیار حاصل کر سکتی ہیں تو اللہ کیلئے مثلیں بیان کرو۔ اللہ جانتا
ہے اور تم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا
ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا

فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ، هَلْ يَسْتَوٗنَ ۚ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ -

(النحل - ۷۵-۷۶)

اور اس (آزاد) کی جس کو ہم نے اچھی روزی دے رکھی ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتا ہے۔ کیا وہ دونوں برابر ہوں گے؟ شکر اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے اور اللہ مثل بیان کرتا ہے دو آدمیوں کی۔ ایک گونگا ہے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے جہاں اس کو بھیجتا ہے کوئی کام ٹھکانے کا کر کے نہیں دیتا کیا وہ اور وہ شخص جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے رستہ پر ہے دونوں برابر ہوں گے؟

یہی اساس استدلال سورۂ نجم کی اس آیت میں ہے :-

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝

کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اللہ کے لیے لڑکیاں تو یہ بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔

اہلِ کتاب اور منافقین

یہود و نصاریٰ اور منافقین، جیسا کہ ہم "حقیقت شرک" میں بیان کر چکے ہیں، بالعموم یا تو خدا کی صفات کے صحیح تصور میں بھٹکے تھے یا ان سے متناقض چیزیں مانتے تھے یا ان صفات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ عمومی دلائل کی جگہ خصوصی دلائل کے مخاطب ہیں۔ ان کے سامنے ان کے مسلمات رکھ دیے گئے ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جو باتیں ان سے متناقض انھوں نے مان رکھی ہیں ان کو ترک کریں اور جو باتیں ان سے لازم آتی ہیں، ان کو تسلیم کریں۔ ان کے سامنے توحید کی حقیقت جس طرح پیش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل ہم حقیقت شرک میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے محض استدلال کی نوعیت اور اس کی اساس واضح کرنے کے لیے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

مثلاً اہل کتاب کے یہاں یہ چیز مسلّم تھی کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بات مانتے ہو تو مسیح علیہ السلام اور احبار و رہبان کو رب نہ بناؤ اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی کے لیے امر و نہی کا مطلق حق تسلیم کر لینا درحقیقت اس کو رب بنا لینا ہے زبان سے اس کو رب کہو یا نہ کہو۔ اسی طرح یہود کو اپنی نسبت یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور بندگی سے کچھ مافوق درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن نے ان کی اس تاریخ سے جس کو وہ مانتے تھے۔ ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی انہوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے باہر قدم نکالا ہے۔ خدا نے ان کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دی ہیں جو اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان کا درجہ بشریت سے کچھ اونچا نہیں ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری سرگزشت ان کو سنا کر ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ان کو خدا کے

ہاں جو تقرب اور درجہ حاصل ہوا وہ بندگی اور اطاعت کا ثمرہ تھا نہ کہ انھی کی اولاد کو خدائی کا مقام کیسے حاصل ہو جائے گا۔

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خارق عادت پیدائش کو ان کی الوہیت کے ثبوت میں پیش کیا تو قرآن نے ان کے مسلمات سے ان کے خلاف حجت پیش کی کہ تم آدم اور یحییٰ کی ولادت کو بھی خارق عادت مانتے ہو لیکن ان کی الوہیت کے مدعی نہیں ہو۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا کھانا کھانا بھی ان کی بشریت کے ثبوت میں پیش کیا کیونکہ کھانا کھانا بھی یہود و نصاریٰ کے ہاں بشریت کی ایک مسلّم دلیل تھی اور اسی دلیل سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ میں اپنے شاگردوں کی ایک غلط فہمی دُور کی تھی جس کی تفصیل حقیقت شرک میں گزر چکی ہے۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال کا جو غلط ترجمہ ہو گیا تھا، قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے انجیلوں میں بار بار یہ نقل ہوتا ہے۔ "میرا باپ اور تمھارا باپ"۔ قرآن نے اس کی تعبیر رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ "میرا رب اور تمھارا رب" سے کی ہے اور یہ تعبیر انجیلوں کے دوسرے بیانات نیز انجیلوں کی اصل زبان یعنی عبرانی کے بالکل مطابق ہے۔

منافقین کی تمام ضلالت ان لوازم اور حقوق کے سمجھنے میں تھی جو خدا اور اس کی صفتوں پر ایمان لانے سے بندے پر عائد ہوتے ہیں اور اس ضلالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان لوازم کے ادراک میں کوئی اشکال تھا۔ یہ ساری باتیں بالکل واضح تھیں اور اگر ان میں کوئی اشکال تھا تو وہ قرآن کی بار بار کی وضاحت سے دُور ہو گیا تھا لیکن منافقین کی بیماری عقلی نہیں قلبی تھی۔ ان کے دلوں کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ توحید کے مقتضیات کا ساتھ دے سکتے اس لیے اگر ایک راستہ سے خدا کے دین میں داخل ہوتے تھے تو دوسرے راستوں سے بھاگ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کو دُور کرنے کے لیے قرآن نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ان کرشموں کو بیان کیا جو مسلمانوں کی قلت و ضعف کے باوجود ان کی فتح و کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور دوسری طرف توحید کے تمام گوشوں کی پوری پوری توضیح کی چنانچہ تقریباً ان تمام سورتوں میں جن میں منافقین مخاطب ہیں۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ واحد کے آگے سرافگندہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں تاکہ خدا کی حمد و تسبیح میں تمام کائنات کی اس ہم آہنگی کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ہمت پیدا ہو اور اس خیال سے ان کے دل پست نہ ہوں کہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے ہیں بلکہ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھے کہ تھوڑے سے ناشکرے انسانوں کے سوا ساری کائنات اس راہ میں سرگرم سفر ہے اور قافلوں سے بھری ہوئی سڑک یہی ہے جو بظاہر سنسان نظر آ رہی ہے۔ قرآن میں جو لوگ مسبحات[1] کی رُوح سمجھ گئے ہیں ان کو ہمارے اشارات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

---

[1] مسبحات سے ہماری مُراد وہ سُورتیں ہیں جو "سَبَّحَ" اور "یُسَبِّحُ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سورتوں میں بالعموم رُوئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جنھوں نے زبان سے اقرار پوری توحید کا کر لیا تھا مگر اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں تھڑدلے پن کا ثبوت دے رہے تھے اور مشرکین مکہ اور یہود کی جتھے بندی سے خائف تھے کہ ممکن ہے ان کی منظم طاقت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ان کی قلتِ تعداد کی وجہ سے پسپا ہونا پڑے تو تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی رابطہ رکھا جائے (بقیہ صفحہ آئندہ)

پچھلی فصلوں کا خلاصہ

اُوپر کی تین فصلوں میں جو باتیں بیان ہُوئی ہیں ہم ان کا اجمالی خلاصہ بھی پیش کر دیتے ہیں تاکہ یہ پھیلے ہُوئے مطالب بسہولت پڑھنے والوں کی گرفت میں آجائیں۔

(ا) ان تفصیلات سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ جو لوگ کہتے ہیں، قرآن کے استدلال کی ساری عمارت الزامی اور خطیبانہ قسم کی دلیلوں پر قائم ہے اور وہ ٹھوس عقلی وفطری دلائل سے بالکل خالی ہے۔ وہ قرآن کے متعلق نہایت مکروہ قسم کے سوءظن میں مبتلا ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں الزامی دلائل ہیں لیکن یہ قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے اور اس کی مخاطب وہ جماعتیں ہیں جو بعض صحیح اُصولوں کو تسلیم کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے ان مسلمات سے ان پر حجت قائم کی ہے اور یہ استدلال کا ایک بالکل فطری اور عقلی طریقہ ہے جو تمام بنی آدم میں یکساں مسلم ہے۔ باقی قرآن کے عام استدلال کی اساس فطرت اور کائنات کی آیات پر ہے جن کی حجت عربی وعجمی اور عامی وفلسفی سب کے لیے یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل ہُوا اور اب قیامت تک دُنیا کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کافی ہے۔

(ب) دوسری حقیقت یہ ثابت ہُوئی کہ قرآنی استدلال ہمارے متکلمین وفلاسفہ کے استدلال سے بالکل مختلف ہے ان کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علۃ العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا اور نہ وہ خلا ہی بھرتا جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور جس کو بھرنے کی اس کے اندر اتنی شدید خواہش ہے کہ بسا اوقات اگر وہ صحیح چیز نہیں پاتا تو کسی غلط ہی چیز سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی استدلال سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے جس نے اپنے ارادہ سے دُنیا کو پیدا کیا ہے اور حکمت ورحمت کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اور یہود ومشرکین سے بھی ناتا نہ توڑا جائے۔ ان منافقین کے سامنے قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح کی اصل حقیقت ڈنڈوت اور جبیں سائی (PROSTRATION) ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ دُنیا کی ساری چیزیں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی مطیع وفرمانبردار ہیں اور سرِ مُو اس کے حکم سے انحراف نہیں کر رہی ہیں اور اپنے عمل سے خلائق کو دعوت دے رہی ہیں کہ سب اسی کی اطاعت میں سرگرم ہوں۔ نیز کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ کے فرمانبرداروں کی تعداد تھوڑی ہے بلکہ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ساری کائنات خدا کی فرمانبردار اور مطیع ہے۔ اس کی نافرمانی کرنے والے اگر ہیں تو بس انسانوں کے اندر ہیں تو جو شخص خدا کی راہ میں قدم رکھے وہ یہ خیال نہ کرے کہ وہ تنہا ہے بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ تھوڑے سے بلید انسانوں کے سوا جنھوں نے اپنے نفس کو یا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، آسمان سے لے کر زمین تک ایک ایک ذرہ اس کے ہم رکاب ہے۔

دُنیا کی تدبیر و پرورش فرما رہا ہے مگر یہ نہیں ہے کہ جس طرح سُورج سے بالاضطرار خلق کو فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح خدا سے یہ دُنیا بالاضطرار وجود میں آگئی اور اس سے اضطراراً فیض پا رہی ہے۔ نیز یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دُنیا کو خلق کرکے اس کے روزمرہ معاملات سے بے تعلق ہو گیا ہو، یہاں تک کہ اگر وہ غائب ہو جائے تو اس کے غائب ہو جانے سے دُنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے جیسا کہ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا بلکہ وہ تمام عالم کے تدبیر و نظام پر حاوی اور مسلّط ہے۔ اس کا علم جزئیات اور کلیات کو یکساں محیط ہے۔ زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اور آسمان کے اُوپر سے جو اترتا ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ تمام خیر و شر اس کے ہاتھ میں ہے۔ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ ایک ذرّہ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے نہ ایک پتہ اپنی شاخ سے گر سکتا ہے۔ نیز وہ بے ہمہ اور باہمہ ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہو گا تب بھی وہ ہو گا۔ وہ خالق ہے، باری ہے، مصوّر ہے، رزاق ہے، علیم و قدیر ہے، رحمٰن و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، غالب و قہار ہے، مومن و مہیمن ہے، غفار و ستار ہے، قدوس و سلام ہے، ملک اور رب ہے، غفور و ودود ہے، ہادی و کریم ہے، وہ سب سے مستغنی اور سب کی پناہ ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کوئی اس کی ذات برادری کا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی ان صفتوں کے لوازم ہیں اور جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے شریک ہے اسی طرح ان لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے، اسی کے امر و حکم کی پیروی کی جائے۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کی اطاعت و بندگی ہو۔ جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکر گزاری اور حقیقی محبت کا مرکز وہی ہے اور ساری شکر گزاریاں اور ساری محبتیں اس کی شکر گزاری اور محبت کے تابع ہیں۔ جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے، اسی سے استعانت ہو، اسی سے فریاد کی جائے۔ جب وہ عزیز و حکیم ہے تو حقیقی اعتماد کے لائق وہی ہے اور لازم ہے کہ رنج و راحت، دُکھ سکھ ہر حال میں اسی پر بھروسا کیا جائے۔ جب وہ علیم و قدیر ہے تو تمام سرّ و علانیہ کو اس پر آشکارا مانا جائے۔ جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کی پیروی کی جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے یا ان میں دوسروں کی حصّہ داری ثابت ہو۔

رہا یہ سوال کہ خدا کی مرضی اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس کے احکام کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے تاکہ انسان اس کی توحید کا پورا حق ادا کر سکے اور غیر اللہ کی اطاعت سے آلودہ نہ ہو تو اس پر تفصیل کے ساتھ ہم اپنے رسالہ "حقیقت رسالت" میں بحث کریں گے۔[1] یہاں اس سوال سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات اور فطرتِ انسانی کی کھُلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبّر ہے جو تمام صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہے اور اس تمام کائنات پر آمر و متصرف ہے۔ وہی ہمارا مولا اور رب ہے، جس کی عبادت اور اطاعت ہم پر واجب ہے۔ وہی ہماری تمام شکر گزاریوں، تمام نیاز مندیوں اور تمام التجاؤں کا مرکز ہے۔ لا الٰہ الا ھو ولا رب سواہ۔

---

[1] افسوس کہ یہ رسالہ نہ میں اب تک لکھ سکا اور نہ بظاہر اس کی توقع ہے۔

توحید کے اثرات

پچھلی فصلوں میں توحید کی جو حقیقت پیش کی گئی ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ توحید مجرد ایک علمی حقیقت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت ہے انسانی زندگی پر، خواہ انفرادی ہو یا جماعتی، اس کے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

انفرادی زندگی پر اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو آزادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دنارت و رذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے جو چیزیں اس کی تابعداری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابعداری اور اطاعت کرتا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسان کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے۔ غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے۔ ان کو ان داتا، خداوند نعمت، غریب پرور وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتا ہے، ان کے لیے ہر طرح کا امر و نہی کا حق تسلیم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے گزر مردوں کی قبروں پر بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے۔ ان کو امور کائنات میں متصرف، عالم الغیب اور نافع و ضار سمجھتا ہے۔ بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو معبود بنا لیتا ہے اور ہر گھنی جھاڑی ہر سنسان مقام، ہر بہتا دریا، ہر اونچا پہاڑ اور ہر ضرر رساں قوت اور نفع بخش طاقت اس کو بندگی کی دعوت دیتی ہے اور ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس کو اپنے نفس کو ذلیل کرنے میں کوئی غیرت نہیں لاحق ہوتی۔ وہ ایک مرتبہ اپنے مقام عزت سے گر کر برابر گرتا ہی چلا جاتا ہے اور اس شرف کو بالکل کھو دیتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز کیا تھا۔ یہی حقیقت ہے جو سورہ حج کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:-

وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ
فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ
فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (الحج - ۳۱)

اور جو شخص اللہ کا ساجھی ٹھہراتا ہے تو گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا پس اس کو چڑیا اُچک لے یا ہوا اڑا لے جائے کسی دور دراز گوشہ میں۔

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت گزاری میں لگایا وہ اس کی خدمت گزار رہنے کے باوجود یہ ننگ گوارا نہیں کرتیں کہ اس کو سجدہ کریں۔ ان کا سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے لیکن انسانوں کی دنارت کا یہ عالم ہے کہ ان سب کا مقصود ہونے کے باوجود، ان میں سے ہر ایک کے در کا نقش سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي
السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ کے لیے ہی سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے

وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ (الحج - ۱۸)

اور پہاڑ اور درخت اور جانور بہتیرے انسانوں میں سے بھی۔ اور بہتیرے ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کر دیتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے اور اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

لیکن توحید کا چمکارا پاتے ہی دفعۃً اس کی حالت میں ایسا انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے کہ وہی انسان جس کو ہم نے اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ اس دنیا کی ہر چیز سے نیچے تھا اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز اس سے نیچے آجاتی ہے۔ اس تغیر حال کی بہترین مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے مقابلہ کرنے والے ساحروں کی سرگزشت میں ملتی ہے جن جادوگروں کو فرعون نے اکٹھا کیا تھا گھڑی بھر پہلے ان کی دنائت طبع کا یہ حال تھا کہ میدان مقابلہ میں اترنے سے پہلے اپنی مزدوری کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتے ہیں اور نہایت ذلیل خوشامدانہ انداز میں التجا کرتے ہیں۔ ءَاِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ (سرکار! اگر ہم فتحمند رہے تو مزدوری بھرپور ملے گی نا؟) لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ توحید کا ایک پرتو پڑتے ہی ان کی طبیعت میں ایسا تغیر عظیم رونما ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کو ایمان لانے پر سخت سے سخت سزا کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم کو سولی پر لٹکا دوں گا لیکن ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بے دھڑک جواب دیتے ہیں، کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے پاس ہی جائیں گے، تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ تمہارا زور بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا، رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موحد پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دکھ ہو یا سکھ، زندگی ہو یا موت، ہر ایک کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔ پس وہ امید و بیم ہر حال میں ایک ہی سے امید رکھتا اور اسی سے ڈرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مختلف دیوتاؤں اور کارفرماؤں کی رزم گاہ نہیں ہے۔ ایک ہی عزیز و حکیم ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی مشیت کے خلاف اس عالم کے معاملات میں کوئی ایک ذرہ برابر دخل دے سکے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عالم کا خالق حق اور محبّ حق ہے اس وجہ سے اس عالم میں باطل مجرد کا وجود نہیں ہے باطل کی حیثیت اس دنیا میں طفیلی کی ہے جو حق کے ساتھ لگ جاتا ہے اور بالواسطہ وہ بھی حق ہی کی خدمت کرتا ہے۔ جس پر یہ راز کھل گیا اس نے دنیا جہان کی دولت پالی۔ اس کا خزانہ لازوال اور اس کی زندگی غیر فانی ہے۔ وہ نہ تو کبھی ہراساں ہوتا ہے نہ کبھی اس کو تنہائی دکھ دیتی ہے۔ وہ ایک سدابہار درخت سے کھاتا اور ایک ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے سے آسودہ حال رہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

کیا نہیں دیکھا کس طرح اللہ نے مثل بیان کی ایک مبارک کلمہ کی۔ وہ ایک مبارک درخت کے مانند ہے

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ۔
(ابراہیم - ۲۴)

جس کی جڑیں زمین میں جمی ہوئی ہوں اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ مثلیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔

یہی لوگ ہیں جن کا دماغ مصیبت و راحت ہر حال میں متوازن رہتا ہے اور تنگی و فراخی کی کوئی حالت ان کے دل کے اطمینان کو درہم برہم نہیں کرتی ۔ نہ وہ گھبراتے نہ مایوس ہوتے، نہ وہ اکڑتے اور نہ فخر کرتے، جس خندہ جبینی کے ساتھ وہ آرام کی گھڑیوں کا استقبال کرتے ہیں اسی شادمانی کے ساتھ آزمائشوں اور مصیبتوں کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِيۡٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ۔

یہ ایک موحد کا باطن ہے ۔ وہ اپنے باطن میں بالکل یکسو اور حنیف ہو جاتا ہے اور پھر یہی یکسوئی اور حنیفیت اس کے ظاہر پر بھی طاری ہو جاتی ہے ۔ وہ جس طرح قوانینِ طبیعی کے آگے بے بس اور مسلوب الاختیار ہوتا ہے وہی بے بسی اور مسلوب الاختیاری وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے آگے اختیار کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو آزادی بخشی ہے اپنی خوشی سے اسے اللہ کی مرضی کے ماتحت کر دیتا ہے ۔ سورج اور چاند، ابر و ہوا، دریا اور پہاڑ مجبورانہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں ۔ یہ مہاروں میں بندھی ہوئی اونٹنیوں کے مانند اپنے متعین راستوں پر چلتے ہیں لیکن مومن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکوں میں نکیل ڈال کر اس قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے اور یہی انسان کا اصلی شرف ہے ۔ یہی اختیاری انقیاد و اطاعت توحید کی اصلی روح ہے اور جو اس انقیاد میں جتنا ہی کامل ہے وہ اسی قدر توحید میں کامل ہے ۔ راہِ توحید کے سلوک کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی بندگی سے چھوٹ کر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ قوم، ملک، وطن اور تمام رسوم و قیود سے آزاد ہو کر خدا کی طرف بھاگتا ہے ۔ آخری درجہ یہ ہے کہ خوشی خوشی اس کی زندگی پر اللہ کے قرب اور اس کی معیت کو ترجیح دیتا ہے ۔ اِنَّ صَلَاتِيۡ وَنُسُكِيۡ وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِيۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۔

اسی طرح توحید کا اجتماعی اثر بھی نہایت گہرا ہے ۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے بغیر ناممکن ہے ۔ دُنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دُنیا کی سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے اس کے تمدنی شعور نے ترقی نہیں کی ہے ۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اور اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح بنا دیا ہے لیکن دلوں اور دماغوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ ہر قوم کا خدا بھی الگ ہے اور ہر ایک اپنا آدم بھی الگ بنائے ہوئے ہے ۔ اگر اس طرح کے انسان کسی طرح اپنی حد بندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھس جائیں تو ان میں اس طرح کا جدال و قتال متوقع ہے جس کا ہم آج دُنیا کی قوموں میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان کی

صُورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن ان کے دل درندوں کے ہیں۔ ان کو قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی حد بندیوں کے ذریعہ سے الگ الگ کر رکھا تھا لیکن سائنس نے یہ حدیں توڑ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں اور ساری دُنیا کا امن تاراج ہو گیا ہے جو لوگ ان مشکلات پر غور کر رہے ہیں۔ وہ اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ جن اصولوں پر ہمارے موجودہ تمدن و معاشرت کی عمارت قائم تھی وہ اصول موجودہ دُنیا کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ بچپن کی لنگوٹی پورے قد کے انسان کے لیے نہایت تنگ ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے قامت کے لحاظ سے اس کے لیے نیا جامہ تراشا جائے۔ نسل اور رنگ، وطن اور سرزمین کی اساسات پر جن تمدنوں کی اُٹھان ہوئی تھی اور جو سیاسی تنظیمات وجود میں آئی تھیں۔ ان کے خاتمہ کا وقت آگیا۔ اب دُنیا کو ایک نئے نظم (NEW ORDER) کی تلاش ہے لیکن وہ نیا نظم کیا ہو؟ اس سوال کا کوئی صحیح جواب اب تک نہیں دیا جا سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ اب دُنیا کو قومی اور ملکی حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر حکومت ——— (WORLD STATE) کی ضرورت ہے جس کی بنیاد عالمگیر انسانیت کے تصور پر ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ عالمگیر انسانیت کا مُبارک تصور وجود میں کس طرح آئے جب کہ قوموں کی افراتفری کا یہ عالم ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے نہ آدم؟ ہر قوم کا دعویٰ یہ ہے کہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ ہر ایک کا خُدا الگ ہے۔ اس کی نسل الگ ہے، اس کا باوا آدم الگ ہے، وہ اپنی تہذیب میں، اپنے معتقدات میں، اپنے اخلاق میں بالکل علیحدہ ہے اور اس علیحدگی کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتی ہے بلکہ دوسروں پر اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک سر رشتہ موجود نہیں ہے۔ مشترک سر رشتہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خدا کو سب اپنا خدا مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا سب اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر قومیت اور ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے اور دُنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مشکل کو حل کرنے کی اختیار کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی، کسی مشکل کو حل نہیں کریں گی۔

یہی راز ہے کہ قرآن نے (سورۂ نساء کے شروع میں) انسانی معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے، مذہب اور خاندان۔ پھر مذہب کی بنیاد توحید پر رکھی، یعنی صرف اللہ کو رب اور قانون دینے والا مانا جائے، دوسروں کے لیے اس میں کسی طرح کی حصہ داری نہ ہو اور خاندان کی بنیاد وحدتِ آدم کے تصور پر رکھی یعنی تمام نسلِ انسانی ایک ہی آدم سے ہے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے۔ پہلی چیز نے خداؤں اور الٰہوں کے تعدد اور قانون سازی اور حکمرانی کے مدعیوں کے تزاحم سے دُنیا کو نجات دی اور دُوسری چیز نے خاندان اور نسل و نسب کے سارے گھمنڈوں کو باطل کر دیا۔ سارے انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کے بیٹے بن گئے۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے۔ سب کے لیے یکساں امن ہے، یکساں عدل ہے، یکساں جد و جہد کا میدان ہے۔ یکساں استحقاق ہے اور یکساں ذمہ داری ہے۔ یہاں کسی نسل کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا

کہ وہ پیدائشی غلام ہے شدید گناہ ہے۔ یہاں ایرین اور سامی نسل کے درمیان کسی قسم کا امتیاز فساد فی الارض ہے۔ یہاں زنڈ انڈین کو محض رنگ کی بنیاد پر حقوق سے محروم کرنا ظلم کبیر ہے۔ اس نظام میں صرف وہ لوگ مساویانہ حقوق سے محروم ہیں جو ان اصولوں کے منکر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت کے، امن وعدل کے دشمن ہیں۔ وہ زمین میں فساد چاہتے ہیں اور انسانی معاشرے کی ان اساسات کو ہدم کر دینا چاہتے ہیں، جن سے محروم ہو کر دنیا کبھی چین نہیں حاصل کر سکتی۔

آج جو لوگ دنیا کے لیے نئے نظم کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ جب تک توحید کی حقیقت نہ سمجھ لیں، وہ کوئی ایسی اساس نہیں قائم کر سکتے جس پر تمام عالمِ انسانی کی اخوت کی عمارت قائم ہو سکے۔ انسان کے لیے یہ بات تو بالکل فطری ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کرے۔ یہ بات ایسی ہے جس کی دعوت تمام بنی آدم کو یکساں دی جا سکتی ہے اور ہر سلیم الفطرت انسان، خواہ وہ کسی قوم و نسل سے تعلق رکھتا ہو بغیر کسی عصبیت کے اس دعوت کو قبول کر سکتا ہے، اس کے اندر فطرتِ انسانی کے لیے ایک قدرتی کشش ہے۔ آفاق و انفس دونوں میں اس کی ناقابلِ انکار شہادتیں موجود ہیں باقی اس کے سوا جتنے بھی دعوے ہیں سب دعاوی جاہلیت کے حکم میں داخل ہیں۔ فطرتِ انسانی کے اندر ان کے لیے نہ تو کوئی اپیل ہے نہ کائنات کے نظام سے ان کو ہم آہنگی حاصل ہے، اگر ان میں سے کسی نظریے کو بھی بالجبر دنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً دنیا کا مزاج اس کو اُگلنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ یا تو یہ ہو گا کہ کوشش ناکام ہو گی یا کامیاب ہو گی تو اس کی حیثیت حلق کی پھانس کی ہو گی اور زمین کے ادیانِ باطلہ میں ایک دین باطل کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

توحید کی اہمیّت دین میں

پچھلے مباحث کو جن لوگوں نے غور سے پڑھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ نظامِ دین میں توحید کو وہی جگہ حاصل ہے جو جسم انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اگر دل بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہے اور اگر دل تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے۔ یہی راز کہ توحید کے بغیر آدمی کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور توحید کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے سوا جو کچھ ہے جس کے لیے چاہے گا، معاف فرمائے گا۔

توحید کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے۔ توحید، رسالت، معاد جس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سارے دین کا ایک ثلث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو جو خالص توحید کی سورہ ہے ثلث قرآن کہا گیا ہے لیکن اگر مزید غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ رسالت اور معاد بھی توحید کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزوِ توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ خدا ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ

اپنے احکام وقوانین اپنے رسُول کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث اپنی کتاب "حقیقت رسالت" میں کریں گے اور وضاحت کے ساتھ لَآ اِلٰہَ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے تعلق کی تشریح کریں گے۔ وہاں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسُول اور زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزوِ لاینفک ہے جو شخص اللہ کو واحد کہتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے وہ قطعی مشرک ہے، اس کو توحید سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

باقی رہا معاد کا مسئلہ تو وہ توحید کے تحت مختلف پہلوؤں سے داخل ہے۔ ہم اپنے رسالہ حقیقت معاد[1] میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ معاد خدا کے صفات کا لازمی اقتضاء ہے۔ یہاں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ معاد کی ساری رُوح توحید ہے جو لوگ معاد کے قائل ہیں لیکن ساتھ ہی شرکاء و شفعاء کو بھی مانتے ہیں جو اُن کے زعم کے مطابق ان کو بخشوا لیں گے۔ ان کے لیے معاد کا عقیدہ بالکل بے جان ہے۔ وہ خُدا کے سامنے جوابدہی کی ذمہ داری اور اُس کے قانونِ عدل کے ظہور سے ویسے ہی بے خوف ہو جاتے ہیں جیسے معاد کے منکرین چنانچہ اہلِ عرب اور یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ انھوں نے معاد کی ساری اہمیت شفاعت و کفارہ کے عقیدہ سے باطل کر دی تھی اور یہی حال مسلمانوں کے مبتدع گروہوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوتا ہے کیونکہ معاد کی ساری حقیقت ہوا ہو جائے۔ اگر توحید کے تصور میں ذرا بھی خلل واقع ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ اس جسم کی رُوح اور اس آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ مؤثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اُٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اُسی وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں دینِ فطرت کے احکام و قوانین کی تعلیم دی ہے اس کا آغاز لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کر) سے کیا اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ[2] (یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہے اور شرائع و احکام درحقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں جتنے انبیاء آئے سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا۔ اور اس نقطہ پر اس طرح جمے کہ کسی حال میں اس سے بال برابر سرکنے پر راضی نہ ہوئے۔ مخالفین نے لاکھ چاہا کہ پیغمبر اس معاملہ میں تھوڑی سی مداہنت گوارا کرلے۔ ذرا اپنے رویہ میں نرم ہو جائے کم از کم ان کے بتوں کی تحقیر ہی سے باز آجائے تو آگے بڑھ کر اس سے سمجھوتہ کرلیں (وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ) لیکن پیغمبر نے ایک لمحہ کے لیے اس میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہ کی

---

[1] افسوس ہے کہ یہ رسالہ بھی میں اب تک نہ لکھ سکا۔ [2] دیکھو آیات ۲۲-۲۹ بنی اسرائیل۔

انھوں نے مخالفتوں سے اس کو ڈرانا چاہا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا لیکن اس کو اس جگہ سے نہ ہلا سکے انھوں نے ترغیب کے پھندے ڈالے اور رشوت میں وہ سب کچھ پیش کیا جو کر سکتے تھے۔ لیکن اسے رام نہ کر سکے معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سرداری و سرداری، ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں۔ لیکن ان ساری ترغیبوں کے جواب میں اُن کے سامنے وہی توحید کی دعوت پیش کی گئی۔ جب ان تدبیروں میں ناکام رہے تو مخالفین نے آخری حربہ اُٹھا لیا اور پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے گھر کو، اپنے اعزہ کو، اپنے خاندان کو، اپنی املاک و جائداد کو اور اپنے مُلک و وطن کو چھوڑ دیں۔ خدا کے ہر نبی نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ قرآن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں تمام انبیاء کرام کی ہجرت کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو پڑھو۔ ہر نبی کی زبان پر اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو آخری کلمہ جاری ہوتا ہے وہ توحید کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اور سب کو چھوڑ کر تنہا یہی چیز ہے جس کو اپنی معیت و رفاقت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ غور کرو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ انسان سب کچھ چھوڑ دے مگر توحید پر حرف نہ آنے دے؟ بدر میں باپ نے بیٹے پر، چچا نے بھتیجے پر، ماموں نے بھانجے پر، بھائی نے بھائی پر توحید کی خاطر تلوار چلائی اس کے لیے بیویوں نے شوہروں سے اور شوہروں نے بیویوں سے جُدائی اختیار کر لی۔ عزیز سے عزیز قرابتوں اور محکم سے محکم روابط پر قینچی چل گئی اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چل گئی جو انسانیت کے گُلِ سرسبد تھے جو رحم و محبت اور اخلاص و وفا کے پیکر تھے، جن سے بڑھ کر اپنی قوم سے، اپنے قبیلہ سے، اپنے عزیزوں سے اور پھر عام انسانوں سے محبت کرنے والے لوگ اس زمین پر پیدا نہیں ہو سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ جب گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ حکم دیتے ہیں کہ جس قبیلہ کا مجرم ہے اسی قبیلہ کے لوگ اسے قتل کر دیں (اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ) اور بدر کے قیدیوں کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عزیز پر خود اپنے ہاتھ سے تلوار چلائے۔ اللہ اکبر! توحید کا حق یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہاتھ اگر اس کی حرمت کو بٹہ لگائے تو اس کا دوسرا ہاتھ اس سے انتقام لینے میں ذرہ برابر رحم و مروّت کو دخل نہ دے۔

توحید کی اس عظمت کی وجہ وہی ہے جو اُوپر کی مختلف فصلوں میں بیان ہو چکی ہے۔ توحید سب سے بڑے حق یعنی خدا کے حق کا اقرار ہے۔ یہی عدل و قسط کی بنیاد ہے جو شخص اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے بھی حق کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس سے اسی طرح کی ناانصافیاں اور تعدیاں ظہور میں آئیں گی، جیسی کہ موجودہ زمانہ کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے ظہور میں آ رہی ہیں اور جس کی طرف ہم نے پچھلی فصل میں اجمالی اشارہ کیا ہے۔ پس انبیاء کرام جو یکسر حق اور انصاف کی دعوت ہوتے ہیں وہ توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کیونکر گوارا کر سکتے ہیں۔ جب کہ توحید ہی تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ وہ اس معاملہ میں نہ باپ کو معاف کر سکتے ہیں نہ چچا کو، نہ بیٹے کو، نہ بیوی کو۔ جو چیز بھی اس حق کی ادائیگی میں مانع ہو، وہ ایک پتھر ہے اور ضروری ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔

پس انبیائے کرام کی ساری جدوجہد کا مقصود توحید خالص کا قیام ہے۔ وہ دُنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ خدا کے

بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کا بندہ بنادیں۔ وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتماد و توکل کریں، اسی سے طالبِ مدد ہوں۔ نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اسی سے استغاثہ کریں۔ طمع ہو یا خوف، اُمید ہو یا بیم، ہر حال میں نظر اسی کی طرف ہو۔ وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کردیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع، ان کی پسند اس کی پسند کے تحت ہو۔ اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں اس کی یکتائی تسلیم کریں اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، نہ کسی اور کو، نہ اپنی ذات کو۔

توحید کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جز نہیں ہے بلکہ یہ سارے دین کو محیط ہے۔ دُوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی پر ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی سورۂ فاتحہ ہے جس کی اصلی روح خُدا کی خالص شکر گزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ تبّت میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی جو خالص توحید کی سُورہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نقطہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد معوذتین قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ رکھ دی گئی ہیں جو شیطان کی آفتوں سے اس خزانۂ توحید کی حفاظت کر رہی ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ شیطان کو بنی آدم سے جو حسد ہے۔ اس حسد کے جوش میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطہ سے ہٹا دے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُس نے کہا۔ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (میں ان کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا) یعنی ان کو توحید کے رستہ پر قائم نہ رہنے دوں گا۔ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ۔ (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا رُوح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخِ نادرۂ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرکہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جان نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدّت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیٔ موسیٰؑ، جان نوازیٔ مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارزِ شہنشاہِ کونین (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گی۔

آج کی صبح وہی صبحِ جان نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے۔ آتشکدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ بُت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی۔ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اُٹھا۔

یعنی یتیمِ عبداللہ! جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شاہنشاہِ کونینؐ عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف لائے۔ عزّت و اجلال ہوا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ اللہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمْ۔

(شبلی نعمانی)

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

اور تمہاری خاطر تمہارے ذِکر کا آوازہ بلند کر دیا

(الم نشرح : ۴)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

[جلد ساتویں]

سید سلیمان ندوی

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

سیّد سلیمان ندوی

قال اللہ تعالیٰ :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (یوسف ۔ ۸)   حکم کسی کا نہیں ، مگر اللہ کا ۔

آیتِ بالا میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں ، مگر اللہ کا ہے ، اس لیے اسلام میں حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے ، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں :

ایک تشریعی ، یعنی وہ احکام جو انبیاؑ علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں ۔

دوسرے تکوینی ، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں ۔

ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری وساری ہے ، دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے نمرود وفرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر اُن کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی اور یہ شبہ ان سلاطینِ عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام وفرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں ، اسلام نے شک وشبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے ۔ اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی ۔ زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے ، اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے ۔ اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (یوسف ۔ ۸)	حکم نہیں ، مگر اللہ کا ۔
اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ ۔ (انعام ۔ ۷)	ہاں ! اسی کے لیے حکم کرنا ہے ، اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے ۔
لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (قصص ۔ ۷)	اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۔

امر تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے وہ زمین ، آسمان اور خاک وباد وآب وآتش اور جسم وجان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کرسکتا ، نہ اشیاؑ کے خواص کو بدل سکتا ہے ، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی واضافہ کرسکتا ہے ۔ خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور

ناچار ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ۔ (بقرہ - ۳۴)	تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہو گیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ۔ (آل عمران - ۳)	اے اللہ! سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لیے راہِ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اُس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیے ہیں، ان کے تتبع سے اہلِ علم اور مجتہدینِ دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہلِ عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یُوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مرتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حکمِ الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امرِ غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورۂ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے۔ عام طور سے فقہا نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

۱- اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (انعام و یوسف - ۸)	حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

۲۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (اعراف۔ ۷)

ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے' پہلی آیت دو جگہ ہے: سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں۔

سُورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ۔ (انعام۔ ۷)

جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے' اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے۔

وَمَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ (یوسف۔ ۸)

اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسا رکھنے والوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔

دُوسری آیت کا موقع یہ ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (اعراف۔ ۷)

بے شک تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا' پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور

حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے
ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے
پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے ، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ اَمر اور حُکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی بھی کسی درجہ میں شامل ہوجائیں لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دُوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے :

لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۔	(مریم ۔ ۵)	شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہے :

اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۔	(یٰسین ۔ ۴)	یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اُوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاءؑ اور ائمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے ، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ، لیکن دُوسروں کی اطاعت احکامِ الٰہی کی تبلیغ ، اجرا اور تنفیذ کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت ہے ، ارشادِ الٰہی ہے :

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت ، خواہ اس سے مراد علماءؑ ہوں یا حکام ، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے ، اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے ۔ جیسا کہ ارشاد ہے :

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔	(نساء ۔ ۸)	اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے ، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سُورہ میں ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔	(نساءؔ ۔ ۷)	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا ، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا ، اور ان کا

حکمِ خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔

(توبہ - ۴)

اہلِ کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دینِ حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہلِ کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قایم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکمِ الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ اُنھوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اللّٰهَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (توبہ - ۵)

اُنھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے، اور مریم کے بیٹے مسیح کو، حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبودِ برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہلِ کتاب کو دُوسری سُورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

(آلِ عمران - ۷)

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مانی ہُوئی ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دُوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے۔ ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدیؓ بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوئے، اور آپ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی، تو عدی نے کہا: "وہ ان کو معبود نہیں بناتے"۔ فرمایا: کیوں نہیں، انھوں نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: فَذٰلِكَ عبادتهم اياهم[1]۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر

آپؐ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے[1]

اس حدیث سے معلوم ہُوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضعِ حکم ہے اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے۔ اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکمِ خداوندی کسی دُوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کُھلا نفاق اور شرک فرمایا۔ چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریق اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا	کیا تُو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے
بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ	تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں
وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ۔	وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں
(نسآٔ - ۹)	حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے "کل معبود من دون اللہ" اور اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانینِ الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے، اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ	اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رُو سے
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ - ۷)	جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دُوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے۔ حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تِل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے

---

[1] ترمذی تفسیر آیت توبہ

ہوئے ہیں، اوران کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے۔ قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ۔ (طلاق - ۱)
یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ (طلاق - ۱)
یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (نساء - ۲)
یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرے تو اس کا نام "افتراء علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝
اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں)

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (نحل - ۱۵)
چند روزہ فائدہ ہے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیتِ پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال وحرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا، بلکہ یہ بھی پیشگوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے، اور اس حیثیت سے آپؐ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے، لیکن حکمِ الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپؐ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتابِ الٰہی آیا:

يَاۤاَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ۔ (تحریم - ۱)
اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہُوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کردے، مگر جب آں حضرتؐ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپؐ کو منع فرمادیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے، ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو، اُمت کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت شرع کا حکم رکھتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپؐ کے اس ترک سے اُمت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی۔ دُوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ۔ (توبہ - ۴)
اور (یہود و نصارٰی) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلّغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولو الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علمِ عقاید اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علمِ اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیرِ بحث آیا ہے کہ واضعِ قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر ونہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی سنہ ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لاحاکم سوی اللہ تعالیٰ ولاحکم الاما حکم به ویتفرع علیه ان العقل لایحسن ولایقبح و لا یوجب شکر المنعم و انه لاحکم قبل ورود الشرع۔ (۱۱۳، ۱ مصر)	جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے، اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ بُرا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے، اور یہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے، اور اسی کا قانون قانون ہے۔ اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رُو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عاید کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا، اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا بُرا کہہ سکتی ہے۔ علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لاخلاف فی انه رب العٰلمین۔ (ص ۸۹ - ۲)	اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگار عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ استوی واضح کرتے ہیں:

"حُسن و قبح اور شئے کے اچھے یا بُرے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا بُرا ہے، اس کے دُوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے، اور دُوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل بُرا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا بُرے ہونے کا عقل کی رُو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حُسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔" (ص ۹۰ برحاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، ہے یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی

مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہلِ عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہلسنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلکِ حق ہے۔ مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رُو سے سمجھا جا سکتا ہے یا صرف شرع سے، تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا فرمایا وہ بُرا ہے، اور اگر اللہ تعالےٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔"
(المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام)

بعض اہلِ اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

"اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام اُمت کا اجماع ہے اور ہمارے مشایخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے، اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ ایسا کہنے کی جُرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عقل بعض احکامِ الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشایخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔"

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسبِ ذیل فرق ہے:

"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ و حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو، تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے

جو حکم ہو اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔" (ص ۱۶، ارشاد الفحول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہٖ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (بُرا) ہے، تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ اتصاف، امر و نہی سے پہلے ہی عالمِ حقیقت میں ہو چکا تھا، اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حُسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرعِ الٰہی پر مبنی ہیں۔" (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصولِ فقہ درحقیقت اصولِ فقہ کی تہذیب ہے[1]۔ اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے، اُوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ "قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے"۔ یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرینِ قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضعِ شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانونِ شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہُوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول اور کلیات، اور دُوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا، تغیّر و

---

[1] تہذیب، منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

تبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے۔ جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فنِ طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر متبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھیے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تمنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب ہر طرح کی گاڑیوں، سائکلوں، اسکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے۔ ان سے حادثے پیش آجائیں یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نگاہ رکھتے ہوں، آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے۔ اہلِ اصول کے اس مسئلے کے قیاس کا حکم صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہائے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جا سکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قایم ہوئیں اور اب بھی قایم ہیں۔

سلطنت اور دین کا تعلق

سیّد سلیمان ندوی

دنیا میں اس وقت دُو قسم کی سلطنتیں ہیں:

ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا، اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو[1]۔ اس تعلیم میں قیصر اور خدا دُو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دُوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قایم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دُو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دُوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا، اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنت الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے جلّ شانہٗ و تعالیٰ اسمہٗ بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اصل دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین احکامِ خدا کی بجا آوری ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔	جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔
(نساء: ۱۱)	

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپؐ کے جو جانشین اور خلفا ہوئے، اُن میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرماں روا تھے۔ اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور

[1] انجیل

ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من اطاع امیری فقد اطاعنی و من عصٰی امیری فقد عصانی [1]

جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اس نے میرا کہا مانا۔ جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکامِ الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لیے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکمِ الٰہی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسبِ احکامِ الٰہی اللہ کے لیے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و مؤکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں۔

حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورہ صٓ میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) اُن کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰۵۷، و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲، ص ۲۲۳ مصر

لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ
حُسْنَ مَاٰبٍ ۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ
خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ
النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى
فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔
(ص ۲)

اُنھوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا، تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے۔ اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ما من امام یغلق بابه دون ذوی الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته
(ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۷)

جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔

من ولی من امر المسلمین شیئاً فاحتجب دون خلتهم وحاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عزوجل یوم القیمة دون خلته وفاقته وفقره۔
(مستدرک حاکم کتاب الاحکام ج ۴ ص ۹۳ حیدر آباد)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ اُنھوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چار دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی، اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں[۱] کے سوا کوئی اوٹ

[۱] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے۔ اس لیے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاؓ نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے، مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

قایم نہیں کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگایا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمدؐ بن مسلمہ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرکے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی۔ حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زادِ راہ دینا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینہ واپس چلے آئے۔ (ابنِ حنبل، ج ۱، ص ۴۵ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قایم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکمِ نبویؐ سے باخبر کیا تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا کہ جو اہلِ حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سُن کر ان کو مطلع کر دے۔ (ترمذی، ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے بالخصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائضِ حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا
حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ
اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ
فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ
اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ
تَاْوِيْلًا ۔

(نساء - ۸)

امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمھیں بہت خُوب نصیحت کرتا ہے، بیشک خدا سُنتا اور دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحبِ حکومت ہیں، ان کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

آیت کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے، اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ۔ (رحمٰن ۱)

اور تول کو انصاف کے ساتھ قایم کرو، اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے ، اور جس پیمانہ سے تم دُوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو۔

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ۔ (مطففین)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنیوالوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں ، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے ، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا ' اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ (مائدہ ، حجرات ۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۔ (آل عمران ۶ - ۱۴)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۔ (شوریٰ ۴)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

" ظلم " کے معنی کسی دُوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو ، یا خدا تعالیٰ کا ہو ، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں ، جس سے حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ ۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے ؛

الا ایھا الناس لا یقبل اللہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ما انزل اللہ ۔ (مستدرک ج ۴ ص ۸۹ ، کتاب الاحکام)

ہاں اے لوگو! جو امام ، خدا نے جو قانون اتارا ہے ، اس کو چھوڑ کر کچھ

فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں
کرے گا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دُوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرماں روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسبِ احکامِ الٰہی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے اور جو اس امتحان میں پُورے نہ اُتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

الامام الذی علی الناس راع هو مسئول عن رعیته۔ (صحیح بخاری ج ۲، ص ۱۰۵۷، کتاب الاحکام)

وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگراں کار ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پُرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوتے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گزر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسایش ہے، اور جو اس میں اُلجھ کر رہ گیا وہ اس دُنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رُسوا و خوار ہوگا۔

ما من عبد یسترعیه اللّٰہ رعیة فلم یحطها بنصحة الا لم یجد رائحة الجنة۔ (بخاری و مسلم حوالہ سابق)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پُوری پُوری نہ کرے تو وہ جنت کی بُو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، اُنھوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے:

ما من عبد یسترعیه اللّٰہ رعیة یموت یوم یموت وهو غاش لرعیته الا حرم اللّٰہ علیه الجنة۔
(مسلم، کتاب الامارہ)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے۔ عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کرکے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

انّ شرّ الرّعاء الحطمۃُ۔ (مسلم، کتاب الامارہ)	سب سے بُرا راعی (امیر) وُہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن۔

اس نے کہا: آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب میں بھوسی ہیں۔

فوراً بولے: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاءؑ فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں اُمت کی سیاست کی باگ ہوگی۔

صحابہؓ نے عرض کی: یارسول اللہؐ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

فرمایا: پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو۔ (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُھُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاھُمْ۔ (صحیح بخاری)	کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق بازپرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی اُمّت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

اللھم من ولی من امر امتی شیئًا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی من امر امتی شیئًا فرفق بھم فارفق بہ۔ (مسلم)	اے اللہ! جو کوئی میری اُمت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا، اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے۔ ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ والرجل راع علیٰ اھل بیتہ وھو مسئول عنہم والمرأۃ راعیۃ علیٰ بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولۃ عنہم والعبد راع علیٰ مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(مسلم وصحیح بخاری)

ہاں، تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔ تو ہاں، ہشیار رہو، تم سب نگران کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگران کے بابت بازپرس کی جائے گی۔

لفظِ رعیت اس موقع پر ایک مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے، اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں۔ یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں۔ راعی چرواہا اور رعیت وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلّے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُرمحبت معنوں میں آیا ہے، اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

ان المقسطين عند الله على منابر من نور عن يمين الرحمٰن وكلتا يديه يمين الذين يعدلون في حكمهم واهليهم وما ولوا۔ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)	بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امراٗ) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے ، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں ، یہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیرِ حکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں ، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہو گی ۔ ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے ۔ جامع ترمذی میں ہے :

ان احب النّاس الى الله يوم القيامة وادناهم مجلسًا امام عادل وابغض الناس الى الله وابعدهم منه مجلسًا امام جائر۔ (ترمذی ، ابواب الاحکام)	بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا ۔ اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دُور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دُور ہوں گے ، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دُور ہوں گے ۔ فرمایا :

ما من امير يلى امر المسلمين ثم لا يجهد لهم الا لم يدخل معهم الجنة۔ (صحیح مسلم ، کتاب الامارہ)	جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو ، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں ، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا ۔
ما من وال يلى رعية من المسلمين فيموت وهو غاش لهم الاحرم الله عليه الجنة۔ (صحیح بخاری ، کتاب الاحکام)	کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرِ نگرانی جماعت کا والی ہو ، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غدّاری کا مرتکب ہو ، اس پر جنّت حرام ہے ۔
انما الامام جنة يقاتل من ورائه ويتقى به فان امر بتقوى الله وعدل فان له بذالك اجرًا	امام ڈھال ہے ، اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے ، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل

وان امر بغیرہ فان علیہ وزراً۔ کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا،
(نسائی کتاب البیعۃ) اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ
کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزا و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، او راسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں یا قوانینِ الٰہی ہیں۔ یہ احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں۔ اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جُزٗ ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلادیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہلِ علم اور اہلِ اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیے۔ حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:[1]

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ! تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و
اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا کے لیے ہے، اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت بر ملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدانِ جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے۔ قرآن میں ہے:

---

[1] حافظ علیہ الرحمۃ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکامِ الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔

(انفال ۲)

اے اہلِ ایمان ! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا ، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمتِ عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہیے ، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے ، اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

(بقرہ ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں ، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ ، انصاف ، اقامتِ دین ، تنفیذ حکم ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے ، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے ، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے ، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ۔

(آل عمران ۲۰)

تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے میں ان کے گناہ دور کروں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے ، اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ ان میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ، تنفیذ اور

اقامت کے بھی ہیں۔ سورۂ نور میں ہے:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ۔ (نور-۱)	اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے۔

کھلی بات ہے کہ "اللہ کے دین" سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجرا ہی ہے۔ اسی طرح سورۂ بقر کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ (بقرہ ۲۴)	اور اُن سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے۔ سورۂ انفال کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (انفال ۴)	اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے۔ اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (انعام، یوسف)

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ۔ (انعام)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا۔ (نحل ۷)	اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمربستہ غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سایے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے

سلطنت، حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے۔ مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے ' الملک' ہونے کا استحقاق اسی کو ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔ (الناس ۱)	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی' لوگوں کے معبود برحق کی۔
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ۔ (حشر ۳)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا۔
فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (مومنون ۶)	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔
اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (جمعہ ۱)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا۔

یہ آیت قرآن پاک میں چند جگہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو " الملک الحق "یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس " لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس " لوگوں کا پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو۔ دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اوّل القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن وامان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی وسلامتی ظاہر ہو جائے۔ تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے۔ چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفتیں آئی ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و سفاکی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہنِ انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت

عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہان بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ

پایا جاتا ہے۔ اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

ان اخنم الاسماء عند اللہ رجل تسمی ملك الاملاك۔ (صحیح بخاری، کتاب الادب)	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فردِ عامل کا نام خلیفہ، اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے۔ خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرماں روا نہیں بلکہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قایم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں۔ توراۃ میں یہ بیان حضرت آدمؑ کے آغازِ پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے۔ اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکامِ الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے اساسی عقاید ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں[1]۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (بقرہ ۴)	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قایم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ یہ مضمون آج بھی پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہے۔

مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔
(بنی اسرائیل ۷)

ہم اُٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قایم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (بقرہ ۴)

تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہو گا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۔
(اعراف ۲)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمھارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدمؑ کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی۔

سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ۔ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے

لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (انعام - ۲) اور بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح کی قوم کا جانشین فرمایا:

وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ۔ (اعراف - ۹) اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ۔ (اعراف ۱۰) اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ۔ (ہود - ۵) تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہے:

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ۔ (انعام ۱۶) اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے، جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (نور ۷) اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا، جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ۔ (انعام ۲۰) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنایا۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (یونس ۔ ۲)	اور تم سے پہلے ہم کئی اُمتوں کو، جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں، اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ ۔ (یونس ۔ ۸)	لیکن ان لوگوں نے ان (نوحؑ) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو (طوفان سے) بچا لیا اور انھیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۔ (فاطر ۔ ۴)	وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ (ص ۔ ۱)	اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَف سے مشتق ہے، جس کے معنی 'پیچھے کے' ہیں۔ اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمایندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

۱۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ۔ (اعراف ۲۱ و مریم ۷)	تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طُور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

۲- وَ اَخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ۔ (اعراف ۱۶) — میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

۳- وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ۔ (زخرف ۶) — اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے۔ پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمھاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمھارے جانشین ہوتے۔ بعض نے کہا کہ تمھاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمھاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصل معنی نیابت اور قایم مقامی کے ہیں۔ لیکن اس نیابت اور قایم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النیابة عن الغیر اما لغیبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشریف المستخلف۔ (ص ۵۵، مصر) — خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے سبب سے ہو، یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کی نیابت کی عزت بخشنے کے لیے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحبِ روح المعانی تک نے ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں، اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہییں۔ میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قایم مقامی ہوگی۔ اسی اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اسی کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت

اور قایم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ۔ (حدید - ۱)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں۔ کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے۔ کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دُوسرے معنی صحیح ہیں۔ کشاف، بیضاوی اور رُوح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے:

ان الاموال التی فی ایدیکم انما ھی اموال اللہ بخلقہ وانشاءہ لہا وانما مولکم ایاھا وخولکم للاستمتاع بہا وجعلکم خلفآء فی التصرف فیہا۔

وہ مال جو تمھارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمھارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے، اسی نے تمھارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیہا۔

وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ عزوجلّ فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقۃً۔

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا، اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرعنوان ہے۔ یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ (بقرہ - ۴)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔



منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً مِّنِّيْ يَخْلُفُنِيْ فِي الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِيْ۔	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

انّ اللہ تعالیٰ اخبر الملٰئکۃ انہٗ جاعل فی الارض خلیفۃ لا یحکم فیھا بین خلقہ بحکمہ۔ (ص ۱۰۴، مصر)	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ تعالیٰ فی ارضہ وکذالک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم و تنفیذ امر فیھم لاحاجۃ بہ تعالیٰ الیٰ من ینوبہ بل لقصور قبضہ وتلقی امرہ بغیرہ بغیر وسط۔	اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲- روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا۔ اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیا قایم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کیے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا۔ یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

۳- اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے اور جس کا منشایہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور رہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی۔ جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا۔ اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور رہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے۔ اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے۔ ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہو جائے گا۔

۴- اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جن سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ۷)	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (تین-۱)	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (جاثیہ-۲)	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقاتِ الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے۔ مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

وَخَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (بقرہ - ۳)	اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔
وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ۔ (نحل - ۲)	اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمھارے) اختیار میں کیا۔
اَللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ۔ (جاثیہ - ۱)	اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمھارے قابو میں کر دیا۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ۔ (ابراہیم - ۵)	اور کشتیوں (جہازوں) کو تمھارے زیرِ فرمان کر دیا۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ۔ (ابراہیم ۵)	اور نہروں کو بھی تمھارے زیرِ فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصودِ اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا۔ (احزاب - ۹)	ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے۔ یہ امانتِ الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دُوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریت ملے ہیں۔ یہ حدیث کہ ان اللہ خلق اٰدم علیٰ صورتہٖ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے، اور مشہور قول تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو

بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دُنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست وگریباں ہیں۔

اب اس کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔	میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں۔

اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

مولانا سید سلیمان ندوی

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظامِ حکومت قایم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہلِ عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظامِ حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی۔ چنانچہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر پُرغرور اب تک بلند تھا۔ چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہِ ایران کا جواب اور قیصرِ روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیرِ سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ، اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے، اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام تھا وہ انھی دونوں میں سے کسی کے زیرِ اثر اور تابع تھے۔ یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسطِ عرب اور حدودِ شام رومیوں کے ماتحت یا زیرِ اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قایم کی تھی جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدودِ شام پر حکومت کرتا تھا یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قایم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اسی بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو، بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرماں برداری میں دے دیا جائے اور

بنایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی۔ چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے، مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ	بیچ کی اُمت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے
يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ)	بنو اور رسول تمھارا بتانے والا بنے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس اُمتِ مسلمہ کے لیے اور یہ اُمتِ مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے برشئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہلِ عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا، اور آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انھی قبائل کی اصلاح و ہدایت کی نذر ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے، اور قبائلِ یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپؐ کو قبیلۂ دوس کے عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرۃ بنایا۔ وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پُرخطر تھا اور ابتداءً میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قایم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصّوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصّوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا۔ چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا۔ چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ نے لکھا تھا اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمھاری ساری رعایا کے عدمِ قبولِ اسلام کا گناہ بھی تمھاری ہی گردن پر ہوگا۔ اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصّع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہِ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے

تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا :

اَلْیَوْمَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ۔	زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آگیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا۔ یہی پیش گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی :

اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَ اِذَا ھَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَہٗ۔	جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں، اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت، اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھی، یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں و حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلّم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ :

کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ۔

یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔

یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قایم ہوئیں یا ہوتی ہیں ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہِ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کر کے، سب کو زیر کر کے اپنی

سرداری اور بادشاہی کا اعلان کرتا ہے اور ان تمام خوں ریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے ۔ مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ سلطنت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی ، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری ، نہ خاندان قریش کی بادشاہی ، نہ عربی سلطنت ، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس ، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا ، صرف ایک شہنشاہِ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سر افگندگی ۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا ، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی ، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا ، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت ، قومیت ، زبان ، نسل ، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو ، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون ، طرزِ سلطنت ، طریقِ حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو ۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب ، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا ، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے ، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا ، اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی ، اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے ، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی ، عرب کی فطری شجاعت ، کوہ شکن عزم و استقلال ، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں ، اور ان اوصاف کی جلا ، اخلاص ، للٰہیت ، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی ، اس لیے اوّلاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال ، رعب و اقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا ، مذکورۂ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشوونما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ ، مامور من اللہ ، ایک پاکباز رہنما ، ایک مقدس امیر ، ایک معصوم امام کے پرتوِ صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ ، ایک ایسا پاک احساس ، ایک ایسا روشن ضمیر ، ایک ایسا نورِ ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کرے ۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں :

۱ - یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو ۔

۲ - یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساسِ اوّلین محض اخلاص قلب

اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قایم کیا گیا اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کی رُو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی۔ یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق مغرب میں بچھے تھے اُلٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قایم کی وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیونکہ اہلِ عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرواز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قایم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دُوسری شاہانہ حکومتیں تھیں۔ یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں۔ اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیرِ اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی۔ قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردارانِ قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فقول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خُمس قایم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردارانِ قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا، کہتا ہے: ؎

ونُنکر ان شئنا علی الناس قولهم
ولا ینکرون القول حین نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں
اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سردارانِ قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حربِ بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمی الا للّٰہ ورسولہ۔ — اللہ و رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کو مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امراء علیٰ قدر مراتب

سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدّوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کیے گئے۔ سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے ناجائز ٹھہرے، امامِ وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب و دربان کے پہرے اُٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کر دیے گئے۔ طلائی و نقرئی و زمردیں تخت اٹھوا دیے گئے۔ امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی۔ چنانچہ وضع و لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرقِ مراتب موجود نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصّوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیبِ تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربارِ عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی، جس کے شاہانِ وقت عادی تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا، جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصّہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پُوچھنا پڑتا کہ محمدؐ کون ہیں۔ لوگ اشارہ سے بتاتے۔ صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپؐ جلوہ افروز ہوں۔ مگر اس کو بھی آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانونِ الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہلبیتِ رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لیے دوہری سزا ہے۔ ایک بار ایک مخزومی خاتون بنت قیس نے چوری کی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ گراں گزرا اور اُنھوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جُرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جُرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔[1]

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے، مثلاً کراہۃ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان۔

اُوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی آپ نے اس سے کونچ دیا، جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا۔ آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ:

"آؤ اور مجھ سے قصاص لو۔"

لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔[1]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، اُنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ:

"بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔"[2]

ابطالِ سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سُودی معاملات کو باطل قرار دیا۔ جاہلیت کے انتقام کو مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اوّل اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا۔ اسلامی محاصل زکوٰۃ وصدقات وعشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصوّر پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے جو خاص خطاب خدا سے پایا، وہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیتِ کاملہ ہی آپ کا کمال تھا۔ اعزاز کے وہ وہمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ نے ان سب کو مٹا دیا۔ فرمایا:

"خدا کے نزدیک سب سے بُرا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو شاہ شاہان کہے۔"

ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا:

"یہ تو اللہ کے لیے ہے۔"

آپؐ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپؐ کو دوسرے انبیاؑ علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیمؑ کا انتقال ہو چکا تھا، اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؓ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپؐ صلوٰۃِ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔[3]

---

[1] ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۵۸، کتاب الحدود۔ [2] ابوداؤد [3] بخاری باب الکسوف

ایک بار ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رُعبِ نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ،

"ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔"

ایک بار آپؐ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا! میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمدؐ کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا[1]!" حالانکہ یہ وُہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپؐ نماز پڑھا رہے تھے، حالتِ نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔" آپؐ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ:

"تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمتِ الٰہی کو محدود کر دیا۔"[2]

حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطینِ زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دُنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دُوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے دُوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے۔ لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قایم کیا تھا اُس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے، اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے۔ زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیرِ سلطنت سب کا سب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے۔ زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکمِ الٰہی عام غربا اور اہلِ حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا۔ ابوداؤد میں ہے:

قال ما اوتیکم من شئ و ما امنعکم ان انا الا خازن اضع حیث امرت[3]	میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

---

[1] مسند ج ۳، ص ۴۳۵ مسند اسود بن الشریع۔ [2] بخاری ج ۲، ص ۸۸۹، کتاب الادب۔

[3] ابوداؤد ج ۲، ص ۵۱، کتاب الخروج والامارۃ۔

دوسرے موقع پر فرمایا :

انما انا قاسم و اللہ یعطی۔ میں تو صرف بانٹنے والا ہوں ، دینے والا تو خدا ہے ۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضورؐ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار رہتا تھا اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضورؐ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رُو سے مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا ۔ اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہِ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضورؐ اس کی آمدنی اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہو گی ۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے ۔ چنانچہ انھیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آں حضرتؐ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں ۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپؐ کے اس حُجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں ، دیکھا تو آپؐ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی ، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں ، حُجرہ میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا ، ایک طرف مُٹھی بھر جَو رکھے تھے ۔ اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پُوچھا ۔ عرض کی ؛ اے اللہ کے نبیؐ ! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے ، اُدھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لُوٹ رہے ہیں ، اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں ۔ ارشاد ہوا کہ اے ابنِ خطاب ! کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا ؛ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں ! بے شک یا رسول اللہؐ !

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی ، یا رسول اللہؐ ! دعا فرمائیے کہ خدا آپ کی امت کو فارغ البال کرے ، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیے ہیں ۔ آپؐ دفعۃً اُٹھ بیٹھے اور فرمایا :

"کیوں ابنِ خطاب ! تم اس خیال میں ہو ، رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں

دے دیے گئے ہیں۔"[۱]

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع[۲] ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعدؓ ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔"[۳]

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی: نہیں۔ تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے۔[۴]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے حیرت سے فرمایا:

معاذ! یہ کیا؟

عرض کی: "یا رسول اللہ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو دل چاہا کہ میں بھی حضورؐ کو سجدہ کروں۔"

ارشاد ہوا کہ "خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔"[۵]

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہلِ عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں۔ حیاتِ دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور احباب کی سربلندی سے زائد نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا

---

[۱] بخاری و مسلم، کتاب النکاح، باب الایلاد

[۲] یعنی پیوند دار کپڑا (معارف)

[۳] و [۴] ابو داؤد، کتاب النکاح

[۵] ابن ماجہ، کتاب النکاح۔

کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطاو بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امرا کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقرا کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قایم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویا کے مقابلے میں زیادہ توجہ کے قابل تھا۔ عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا۔ ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ قیمتی مہرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔[1]

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنعات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر آتا تھا، اسلام کے نظامِ حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہِ نبوت میں ایک طائرِ بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرضِ مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمدؐ کہہ کر خطاب کرتا اور حضورؐ خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے۔ اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا۔ آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا۔ مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا، اور حضورؐ اس کو شفقت سے سُنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قایم رکھے یا توڑ دے۔

حضرت بریرہؓ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انھوں نے اپنے شوہر سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے۔ آخر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا۔ اُنھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں، سفارش ہے۔ عرض کی: تو قبول سے معذور ہوں۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

---

[1] دونوں واقعے ابو داؤد، کتاب الخراج میں ہیں۔ [2] صحیح بخاری، باب تکوین الحرۃ تحت العبد و باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرۃؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فنِ جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے۔ انھوں نے عرض کی: یارسول اللہ! جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ:

انتم اعلم بامور دنیاکم۔ — تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہوں گے، اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا۔ چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، اُنھوں نے صورتِ حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے میری اتباع ضروری ہے۔ لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہُوں تو مَیں بھی بشر ہی ہُوں، تم آزاد ہو۔[1]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے۔ یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن جن امور میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ خداوندی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور کو بذریعۂ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ ان کا منشاء الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر یہ محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لیے وہ جوشِ اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یارسول اللہ! آپؐ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بے شبہ ہوں۔ اُنھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شُبہ ہیں۔ اُنھوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور

---

[1] صحیح مسلم، باب الفضائل۔

یہی گفتگو کی۔ انھوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے تھے۔ آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو اُنھوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔[1]

اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض معروض کی مگر حضورؐ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اسی طرح اسی واقعۂ حدیبیہ میں جب شرائطِ صلح طے ہوجانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدتِ شوقِ زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا۔ اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیلِ ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضورؐ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے۔ لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ ام المومنینؓ نے چہرۂ مبارک پر آزردگی کا اثر پاکر سبب دریافت کیا۔ آپ نے واقعہ بیان فرمایا۔ حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں۔ آپ خود اپنا احرام کھول دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہُوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پروا نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امورِ تجربیہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔[2]

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا۔ انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ

---

[1] بخاری ج ۱، ص ۳۸۰، کتاب الشروط۔

[2] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں ۔ آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ، قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کُنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے ، دُور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے ، لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آب پاشی کر لو ، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا ، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ ! آپؐ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں ۔ یہ سُن کر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تب آپؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا ، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر ! آب پاشی کر کے پانی روک لو یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے[1] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دُوسروں کے کھیتوں میں از خود چلا جائے ، یوں نہ جانے ۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے ، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا ، آیا اور کہا کہ :

یا رسول اللہ ! انصاف فرمایئے ۔

آپؐ نے فرمایا :

اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا ؟

ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا :

اگر آپؐ اجازت دیجیے تو اس کی گردن اڑا دوں ۔

لیکن آپؐ نے ان کو روک دیا[2] اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی ، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اُترے گا ، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے ۔ (یہ پیشگوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پُوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض و اجب کی حد سے گزر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے ، اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں ، تاہم اس سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے بُرے اسلوب سے بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفا اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی ، حق کوشی ، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی ۔

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قایم مقام ہوتے ہیں ، اس لیے اُن پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ

---

[1] ابو داؤد ، کتاب الفقہ ، ج ۲ ، ص ۶۷

[2] بخاری ج ۱ ، ص ۵۰۹ ، باب علامات النبوۃ فی الاسلام ۔

پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہدِ نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جُرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا۔ حکام و عمال سے فرمایا:

"ہاں، مظلوم کی بددُعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دُعا اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی۔" اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔"[1]

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپؐ کی گردن سُرخ ہو گئی۔ آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا: میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا۔

حضورؐ نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفراللہ، نہیں استغفراللہ، نہیں استغفراللہ۔

اس کے بعد فرمایا:

"میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو۔"

مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا۔ پھر آپؐ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ "اس کے ایک اُونٹ پر جَو اور دُوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔"[2]

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا:

"تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟"

بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے۔"

اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔[3]

ایک دفعہ ایک بدو اُونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپؐ

---

[1] صحیح مسلم ج ۲، ص ۳۶۶، کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء السعاۃ۔

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب الحلم۔

[3] ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

نے ایک دستی چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں۔ اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہؐ بدمعاملگی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، اس کو چھوڑدو، اس کو کہنے کا حق ہے۔

پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا۔ اس نے پھر وہی لفظ کہے۔ لوگوں نے پھر روکا۔ آپؐ نے پھر فرمایا: "اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے۔" اور اس جملہ کو کئی بار دُہراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوادیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے۔ جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم و عفو اور حُسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: "محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔"[1]

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے۔ ان سے بڑھ کر وُہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت و سُست کہہ کر کہا کہ "اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یونہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو!"

حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کرکے کہا: "او خدا کے دشمن! تُو رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے!"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: "عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کردوں۔" یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرض ادا کرکے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو۔ یہودی حلم و عفو کے اس پُر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔[2]

ایک دفعہ آپؐ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وُہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا۔ اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا۔ اس گستاخ نے کہا: "میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یُوں ہی اُڑا لیں اور دام نہ دیں۔" آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سُن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وُہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۲۶۸۔

[2] یہ روایت بیہقی، ابنِ حبان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے ——— کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (شرح شفا از شہاب خفاجی)

زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں[1]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کردی، ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امرا کے غرور و نخوت سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے، اس سے بھلا بُرا جو کچھ ہو وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپؐ کی خدمتِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کرکے واصلِ جہنم کر سکتی تھی با ایں ہمہ آپؐ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپ کا یہ اُسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہو، اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آیندہ آنے والے امرا اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو اُمت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب، استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روم میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قایم تھیں، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرا کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ ان کو امرا کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امرا و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگیِ اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔ اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز ناآشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے بلکہ اس ذاتِ اقدسؐ سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشمِ ادب کا سُرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیہ

---

[1] جامع ترمذی، کتاب البیوع

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے، اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا تھا، اس لیے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امراء کے لیے مثال و نظیر کا کام دے۔ آپؐ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ :

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔	(اے رسولؐ! امورِ سلطنت و جنگ و
(آل عمران - ع ۱۷)	صلح میں) اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بہ نفسِ نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انھوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ :

وَ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ۔	ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے
(شوریٰ ع ۴)	انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہدِ نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا، بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپؐ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا، اُنھوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[1] اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا[2] اور آکر آنحضرت صلی اللہ

---

[1] مصنف عبد الرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی داؤد و فتح الباری ابن حجر و روض الانف سہیلی و زرقانی (باقی برصفحہ آئندہ)

علیہ وسلم نے بیان کیا۔ چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہنچ کر آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں، باری باری سے ممتاز صحابہ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہؐ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑے، ہم تو یہیں رہیں گے۔ خدا کی قسم اگر آپؐ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔ اس کے بعد جب آپ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ حسبِ فرمانِ الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضورؐ کی اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے۔ اس پر انھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جا کر قیام فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپؐ نے پھر تمام صحابہ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ لوگوں نے مختلف رائیں دیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔[۱]

اُحد کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافقِ مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پُرجوش جان نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے، اور حضورؐ کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مالِ غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپؐ نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ اگرچہ آں حضرت صلی اللہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان، نووی میں ہے: فشرعه النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلك اما بوحی او باجتهاده صلی اللہ علیہ وسلم علی مذهب الجمهور فی جواز الاجتهاد له صلی اللہ علیہ وسلم ولیس هو عملاً بمجرد المنام هذا ما لا یشك فیه بلاخلاف۔

[۲] ابوداؤد و ترمذی، باب بدء الاذان

(صفحہ ہذا) [۱] ترمذی ص ۵۰۳، کتاب التفسیر سورۃ انفال۔

علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تمھارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں۔ جس وقت پہلا مالِ غنیمت آئے گا ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔

تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اُٹھے کہ:

"یا رسول اللہؐ! ہم اس پر راضی ہیں۔"

آپؐ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام و عریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔[1]

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکر و فریب، دغل و سازش، ظلم و ستم، جور و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے۔ اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا۔ احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ:

السلطان ظل اللہ فی الارض یأوی الیہ کل مظلوم من عباد اللہ[2]	یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:

السلطان العادل المتواضع ظل اللہ ورمحہ فی الارض[3]	عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد و صحیح بخاری، کتاب المغازی

[2] و [3] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت

(باقی بر صفحہ آیندہ)

خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

"عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔"

جو لوگ سلطنت کے کام کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وُہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں۔ ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی سے اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے۔ یہ سُن کر انھوں نے اپنی فوج ہٹا لی[1]۔

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہوجاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء و مزیل الالتباس عطا حلبی، لفظ سلطان، یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں 'السلطان' کے معنیٰ بادشاہ کے نہیں بلکہ طاقت و قوت کے ہیں جو انگریزی لفظ 'پاور' کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے۔ اس لیے اس حدیث کے معنیٰ یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظامِ حکومت مخلوقات الٰہی کے آرام و آسایش کے لیے گویا زمین میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عمالِ حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمایندے ہیں، سلطان کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے حدیث میں ہے:

اَلسُّلطانُ ولیّ من لا ولیّ لہٗ۔

یعنی جس کا کوئی وُلی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔

یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لیے اس کا ہر جائز نمایندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا۔ بادشاہ کے معنیٰ میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمودؒ کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

[1] صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش

خیال کرے گا۔ اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے۔ یورپ آج ظاہری و نمایشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے۔ ہر فرد رموزِ سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلّم ہو گیا ہے۔ لیکن بااین ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہو گا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیے دی جاتی ہے، لیکن بااین ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قایم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لیے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام کا نظامِ سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قایم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ چنانچہ کعب ابن اشرف کے قتل میں محمدؓ بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی۔ صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں عمّال مقرر کر دیے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سررشتہ اور نظام قایم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قایم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں عبد اللہؓ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللھم صل علی آل فلان، فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللھم صل علی آل ابی اوفی۔ (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، ص ۲۰۳)	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا! فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپ نے فرمایا کہ خداوندا! ابی اوفی کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدیؓ ابن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھ ملتا تھا، جو

عرب میں اسلام سے پہلے سردارانِ قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اول صدقة بیضت وجه رسول الله صلی الله علیه وسلم و وجوه اصحابه صدقة طی جئت بها۔[1] (مسلم ج ۲ کتاب الفضائل)	پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

قبیلۂ بنوتمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

صدقات قومنا[2]	یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی، حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جاکر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے۔[3]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہوگئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جُرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نورِ ایمان سے چمک اُٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہوجاتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہِ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سُود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جُرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگسار کیا جاتا ہے، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی تھی اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے، اپنے جُرموں کا ازخود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، اُنھوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب اُنھیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ازخود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یارسول اللہؐ! مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب الرجم) یارسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے۔ آپؐ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اُنھوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا

---

[1] و [2] مسلم ج ۲، کتاب الفضائل

[3] صحیح بخاری ج ۱، کتاب الزکوٰۃ۔ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ وکتاب الاجارۃ باب من آجر نفسہ

کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمائیے۔ اسی طرح بار بار وہ اعترافِ جرم کرتے رہے اور آپؐ اعراض فرماتے رہے۔ چوتھی بار آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ اُنھوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ ان تمام مراتب کے بعد آپؐ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا، بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ کو قبول کر لیتا[1]

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انھوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضورؐ نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی[2]

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے، جنھوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہمبستر نہیں ہوا، تو یہ گنہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے[3]

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمتِ اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہُوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اُٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے۔ لیکن حضورؐ نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لیے دُعا فرمائیے[4]

---

[1] ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۴۵ و صحیح بخاری، کتاب الحدود۔

[2] ابوداؤد، باب فی اقامۃ الحد علی المریض

[3] ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع و صحیح بخاری حدود۔

[4] ابوداؤد، کتاب الدیات۔

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حدِ فاصل قایم کر دیتے ہیں ، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دُوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جُرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے ، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے ، دنیاوی سلطنت میں جلّاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے لیکن صحابہؓ نے ماعز پر اس لیے پتھر برسائے کہ انھوں نے حکمِ الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی۔ دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دُوسرا جُرم ہے ، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وُہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قایم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جُرم کا ارتکاب کرتا ہے ، ایک رحمدل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے ، بڑے بڑے جرائم درگزر کر سکتی ہے ، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے ، لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے معمولی جُرم سے اغماض نہیں برت سکتی۔ عہدِ نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا ، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے ، اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انھوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی ، حاطبؓ ابن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے ، انھوں نے کفارِ قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی ، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا ، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے ، اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اُڑا دُوں۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پُوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ؟ حاطب نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے ، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں ، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے ، لیکن میرے بال بچّوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا ، اس لیے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچّوں کی حفاظت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا ، سچ کہتے ہیں ، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو ، بدگمانی کو راہ نہ دو۔ لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا ، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے ، اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا ، کیا وہ اہلِ بدر سے نہیں ہیں ، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہلِ بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے :

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ۔	جو چاہو کرو ، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی۔

یہ سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔[1]

---

[1] بخاری ج ۲ ، کتاب المغازی ، ص ۵٦٠

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ شرکتِ بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی' اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دیا جاسکتا ہے' سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبّر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارومدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص و اعتماد کی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادۃ۔	حسنِ ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

(ابوداؤد، کتاب الادب ص ۱۹۰)

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ۔	بعض گمان گناہ ہوتے ہیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی	جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جُستجو کرے گا
الناس افسدھم۔	وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویۃ قال سمعت رسول اللہ	حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم یقول انک	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے
ان اتبعت عورات الناس افسدتھم	جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا توان کو
او کدت ان تفسدھم۔	برباد کر دیا یا عنقریب برباد کر دو گے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قایم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انھوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے، البتہ جو جُرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

دخین حضرت عقبہؓ ابن عامر صحابی کے منشی تھے، انھوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آتے، اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں۔

حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ "درگزر کرو"۔

دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترکِ شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں۔
حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگزر کرو، کیونکہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ:

من رای عورۃ فسترھا کان کمن احییٰ موؤدۃ[1]

جس نے کسی بُرائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خُوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمامتر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قولِ نبویؐ میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وُہ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعتِ علم، حسنِ خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور اُن کا سرپرست اور نگران ہے، اس لیے سلطان وُہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو، اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے، اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وُہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خُوبیوں کا تمامتر دار و مدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ اس سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظامِ اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے

---

[1] یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النھی عن التجسس میں ہیں۔

پہلوتہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے، اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قایم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے، تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں، اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں شرابور ہو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے، اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں اُن میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دُور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انھوں نے کہا کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمھارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔"

ابنِ خلدون نے ان سطروں میں جو آئینِ جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرزِ عمل کا جو دُوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکامِ سلطنت کے عدمِ تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے، اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانونِ شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اُس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پُورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثباتِ جُرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری

کر رکھی تھیں ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے۔ چنانچہ فرمایا:

ان اللہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا۔	بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، اُنھوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گزر شام میں ہُوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ پُوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں[۱]۔

دنیوی حکمراں لُطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوم کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظامِ سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قایم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا۔ اور اس لیے یہ ابرِ کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملاتِ حکومت میں خود آپ کا طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے، کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں[۲]۔ یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے۔

آپؐ نے پُوچھا: کیا وضو کر کے چلے تھے؟

اس نے کہا: ہاں۔

آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟

اس نے کہا: ہاں۔

آپؐ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا[۳]۔

---

[۱] مسلم ج ۲، ص ۳۹۷، کتاب الادب [۲] ابوداؤد ج ۲، ص ۱۴۹، کتاب الحدود [۳] ابوداؤد ج ۲، ص ۱۴۲، کتاب الحدود۔ جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لیے بحکم ان الحسنات یذھبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی - ایک بار ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپؐ سے ایک ضرورت ہے - آپؐ نے فرمایا تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں - چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا[1]
عدیؓ بن حاتم جو مذہبًا نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے - جب وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضورؐ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں - لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گزرا تو کہہ اُٹھے کہ حضورؐ بادشاہ نہیں، کیونکہ یہ حسنِ خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گزر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بیباکی کے ساتھ سوال وجواب کرتے تھے، اور حضورؐ ان کے ساتھ رفق وملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے - ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپؐ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا[2]

بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے ہیں جن کے لیے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے۔

ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے، اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انھوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا[3]، لیکن آخر ایک[4] رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انھوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا۔

آپؐ نے دو بار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟

انھوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں، ہاں! یا رسول اللہ! مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں۔

فرمایا: ایک غلام آزاد کر دو۔

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۲۹۴

[2] بخاری ج ۲ ص ۹۰۰

[3] ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دے دی جائے - جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہے، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔

[4] اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ! اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں۔
آپؐ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو۔
عرض کی، یا رسول اللہ! جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے۔
آپؐ نے فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو۔
عرض کی: یا رسول اللہؐ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے۔
آپؐ نے ان کی یہ بات سُن کر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ وہ تم کو اس قدر کھجور دے گا کہ اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ۔ وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمھارے یہاں تنگی و بد تدبیری اور رسول اللہؐ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔[۱]

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی۔ عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خود سری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظامِ سلطنت قائم ہوا، اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظامِ سلطنت قایم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خود سر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوشِ عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہدِ نبوت میں پیش آئے۔

ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال اُلجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پُوچھے۔
فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں۔
عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟
فرمایا: نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو۔
پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے۔
سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟
فرمایا: نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو۔
پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا۔ اس نے پھر پُوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟
فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو۔

---

[۱] ابوداؤد ج ۱، ص ۲۲۰، کتاب الطلاق۔

اتنا سوال وجواب کرکے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم ہیں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا۔ یہ سُن کر حضورؐ نے فرمایا، یہ شخص کامیاب ہوگیا اگر سچا نکلا۔ (بخاری، کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے۔

ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا۔

اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔

اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔

اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟

فرمایا: اللہ عزّ وجلّ نے۔

اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے۔ کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟

فرمایا: ہاں۔

اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے۔

فرمایا: اس نے سچ کہا۔

کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو بھیجا۔ کیا خدا نے آپؐ کو یہ حکم دیا ہے؟

فرمایا: بے شک۔

پھر کہا: آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟

فرمایا: ہاں، سچ کہا۔

اس نے کہا: قسم ہے اُس کی جس نے آپؐ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟

فرمایا: ہاں۔

پھر کہا، آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج کریں۔

فرمایا: ہاں، سچ کہا۔

عرض کی: اس کی قسم جس نے آپؐ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟

فرمایا: ہاں۔

اس نے عرض کی : قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے ، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا ۔

ارشاد ہوا : اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا ۔ (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہؓ حاضر خدمت تھے اور حضورؐ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے ، اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا ، پھر اونٹ سے اُترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا ، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا تم میں محمد کون ہیں ؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے جو ٹیک لگائے ہیں ۔

اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے !

حضورؐ نے فرمایا : ہاں ، کہو ۔

اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا ۔

فرمایا : جو چاہو پوچھو ۔

اس نے کہا : میں تمھارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے ؟

فرمایا : خدایا ہاں ۔

پھر کہا : خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں ؟

فرمایا : خدایا ہاں ۔

پھر کہا : خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں ؟

فرمایا : خدایا ہاں ۔

پھر کہا : خدا ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں ؟

فرمایا : خدایا ہاں ۔

اس نے کہا : میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ آئے ہیں ، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں ، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں ۔ (بخاری ، کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی ، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھیے اور شیفتگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سُنیے :

خیر ! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے ۔ صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار تھے ، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی اُنھوں نے اسی محبت کا

ثبوت دیا۔

براؓ بن عازبؓ ایک صحابی تھے، ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں، تو حضورؐ کے تعلق سے وُہ ان پر گھوم گھام کر نثار ہونے لگے۔ (ابوداؤد، کتاب الحدود ۲ ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوشِ عقیدت کا سب سے بڑی امتحان گاہ میدانِ جنگ ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا حصہ میدانِ جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہؓ نے جس جوش کے ساتھ آپؐ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفارِ قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہؓ بن شعبہ آپؐ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے۔ عروہ گفت گو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپؐ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپؐ کی ریشِ مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپؐ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو۔ عروہ نے اس جوشِ عقیدت سے متاثر ہو کر دُوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعابِ دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں۔ جب آپؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجا لانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں، جب آپؐ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظرِ جاہ و جلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے اور جسم پر ملتے ہیں، جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجا لانے کے لیے پیش دستی کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے، جب آپؐ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے۔ لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے۔[1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ ابن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انھوں نے کہا:

ایانا تريد یا رسول اللہ والذی	یا رسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے
نفسی بیدہ لو امرتنا	اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری
ان نخیضها البحر لاخضناها	جان ہے، اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس
ولو امرتنا ان نضرب	سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم

---

[1] بخاری ج ۱، ص ۳۰، کتاب الشروط۔

اکبادھا الی برك الغماد لفعلنا۔ (مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوۂ بدر)	ڈال دیں گے، اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد[1] پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

غزوۂ اُحد میں جب آپؐ نے کفار کی جمعیت کو ذرہ گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا، اس سے زیادہ جوشِ محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے، انھوں نے کہا:

بابی انت وامی لا تشرف یصیبك سہم من سہام القوم نحری دون نحرك۔ (بخاری، کتاب المغازی، غزوۂ اُحد)	میرے باپ ماں آپ پر قربان، آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھیے، کہیں آپؐ کو کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر، یہ تو صحابہ اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبویؐ کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں۔ فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپؐ نے حضرت عبداللہؓ ابن رواحہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا: "یہ تو بہت ہے۔" اُنھوں نے کہا: اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے:

ھذا الحق بہ تقوم السماء والارض قد رضینا ان تاخذہ بالذی قلت[2]	انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہے ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن اُنھوں نے کہا: اے دشمنانِ خدا! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو محبوب ترین خلائق ہے، اور تم کو میں بندروں اور سُوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں، لیکن تمھاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سُن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قایم ہیں[3]۔

---

[1] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

[2] ابوداؤد ج ۲، ص ۷۵، کتاب البیوع

[3] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۱

زمین کا سنگار

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔

"جتنی چیزیں بھی زمین پر ہیں ہم نے اُن کو زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ انسانوں کا امتحان لیں کہ ان میں سے کون کون اچھے اعمال والا ہے۔"

ہر شے کا زمین کے لیے زینت وجمال ہونا اسلام ہی کی نگاہ نے معلوم کیا۔ زمین پر بچھا ہوا سبزہ زمین کے لیے اپنی خوشنمائی سے زینت ہے اور آسمان کی طرف بلند ہونے والے درخت اُن کی جھومنے والی ڈالیاں، اُن کی سایہ گستر شاخیں اپنے طور پر زمین کی رونق بن رہی ہیں۔ شوخ وشنگ رنگ رکھنے والے پھول، بھانت بھانت کا مزہ دینے والے پھل، عجیب وغریب اشکال کے اوراق، مختلف تاثیرات وخواص رکھنے والے پہاڑ، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفید سفید خیمے کھڑے کرنے والی برف اور میدانوں کی چٹیل زمین پر نرم نرم فرش بچھانے والی ریت، آبشاریں، غار، مرغزار اور جنگل، وادی وہامون آبادیاں اور ویرانے اپنی اپنی حالت، اپنی اپنی وضع، اپنے اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے تمام کرۂ ارضی کے حُسن کو بڑھانے والے جمال کو ترقی دینے والے ہیں۔

یہ سب زمین کا سنگار ہیں۔ یہ سب زمین کی زینت اور زیور ہیں۔ ان کی خوبصورتی کو دکھلانے والا یہی دین الاسلام ہے۔ جو دِیْنُ الحُسن وَالجمال ہے۔

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی ، اور



مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ

محمد اسلم ملک

مکّہ کی قدیم تاریخ

محمّد اسلم ملک

مکہ المکرمہ دنیا کا واحد قدیم ترین شہر ہے جو آج تک آباد چلا آتا ہے ۔ یہ امر کم و بیش متفق علیہ ہے کہ شہر کی بنیاد آج سے تقریباً چار ہزار سال پیشتر ۲۲۰۰ قبل مسیح[1] میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ نے رکھی تھی ۔ تاہم بعض عرب مؤرخین نے شہر کے زیادہ قدیم ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے ۔ بکری[2] کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے شہر مکہ کے عبادت خانہ کو چوتھی مرتبہ تعمیر کیا تھا ۔ اس سے قبل تین دفعہ یہ عبادت خانہ بنا مگر زمانے کی دست بُرد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا ۔ زیادہ محتاط مورخین[3] نے بھی حضرت ابراہیم کی آمد سے قبل وہاں آبادی کے امکانات کا اظہار کیا ہے اور اکثر مستشرقین[4] نے بھی عموماً اسی رائے کو ترجیح دی ہے کہ قبیلہ بنی جرہم جس کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ کا ازدواجی رشتہ قائم ہوا اس جگہ پہلے سے آباد تھا ـــــــــ گو وادیوں اور پہاڑیوں پر منتشر بدویانہ زندگی بسر کرتا تھا : پانی کی دریافت کے بعد چشمہ (زمزم) کے گرد ایک جگہ پر جمع ہو کر اس نے حضری زندگی کا آغاز کیا ۔ تقدم و تاخر کی اس بحث سے قطع نظر ، یہ بات کم و بیش طے شدہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے لیکر آج تک یہ شہر متواتر آباد چلا آ رہا

---

[1] ارض القرآن سید سلیمان ندوی جلد دوم ص ۱۹۸ ۔ نیز دیکھئے ENCYCLO DIA OF RELIGION & ETHICS جلد ہشتم ص ۵۱۱ تحت لفظ مکہ ۔ " یہ تصور کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ ہے ظہورِ اسلام کے بعد پیدا ہوا ؛ اصل میں یہ حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کیا ہوا نہیں " یہ رائے تاریخی شواہد و نظائر کے صریحاً خلاف ہے جس پر کوئی بحث کرنا فضول ہے ۔ تاہم مصنف موصوف کی اختلافی رائے یہاں اس لیے درج کر دی ہے تاکہ معلوم ہو کہ مغرب میں تحقیق کے نام کیسی مضحکہ خیز اور افترا انگیز باتیں گھڑی جاتی ہیں ۔

[2] بکری الدرۃ المکللۃ فی فتح مکہ المشرفہ المبجلہ (طبع مصر) ص ۲۳ ۔

نیز مولوی عبد الشکور پھلواری ، تاریخ مسجد حرام ص ۳

تاہم یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کو چوتھی مرتبہ تعمیر کیا اور یہ کہ اس کی پہلی تعمیر فرشتوں کے ہاتھوں ہوئی جیسا کہ مصنف کا خیال ہے کسی صورت قابل قبول نہیں ۔

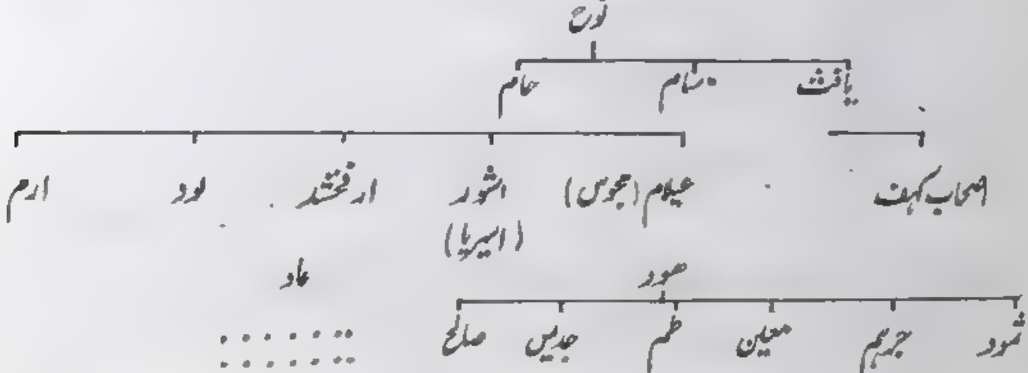
[3] حسنین ہیکل حیات محمدؐ

[4] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اگب) تحت لفظ مکہ ۔

ہے اور اسے مذہبی، سیاسی یا تجارتی لحاظ سے اہمیت اور مرکزیت ہر زمانے میں حاصل رہی ہے۔

مکہ المکرمہ کے بارے میں مزید کچھ لکھنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر عرب کی قدیم تاریخ اور قدیم اقوام احوال کے متعلق بیان کر دیا جائے تاکہ مابعد کے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

امم سامیہ کا مسکن اول جزیرہ نما عرب تھا[5]۔ یہیں سے یہ لوگ نکل کر مختلف اوقات میں کنعان، بابل، حبشہ اور مصر میں پہنچے اور وہاں عظیم الشان تمدنوں کی داغ بیل ڈالی۔ تاریخ میں ان کی چار ہجرتوں کا ذکر ملتا ہے۔ پہلی ہجرت حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال قبل ہوئی جبکہ یہ لوگ عرب سے نقل مکانی کر کے مصر، فنیقیا، بابل اور سریا تک پھیل گئے۔ (ان کی آخری ہجرت ظہور قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئی)[6]۔ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بھی سامی نسل سے تھا اور جن اقوام میں وہ تبلیغ کرتے، سریا، فلسطین، مصر سے ہوتے ہوئے عرب میں پہنچے ان سب کا تعلق بھی اسی نسل سے تھا۔ ابراہیمؑ کی آمد سے قبل نواحِ وادئ مکہ میں بنی جرہم کا جو قبیلہ آباد تھا اس کے متعلق مختلف قیاسات کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ یہ قبیلہ قحطانی تھا اور اس کا ابراہیمؑ سے کوئی نسلی تعلق نہیں تھا[7]۔ مگر یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ قبیلہ بنی جرہم اور حضرت ابراہیمؑ دونوں ایک ہی نسل امم سامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کے نسلی رشتہ کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کے شجرۂ نسب کا مطالعہ ضروری ہے۔ جو توریت کے حوالہ سے مرتب کیا گیا ہے اور جسے ہم نے سید سلیمان ندوی کی کتاب ارض القرآن سے نقل کیا ہے[8]۔



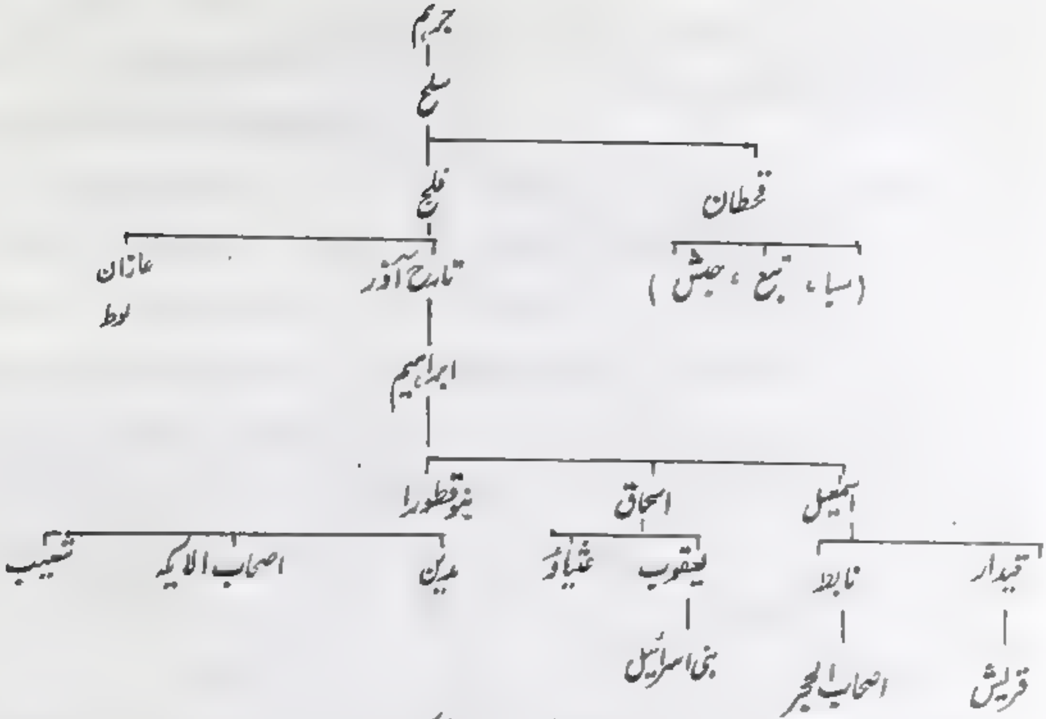
ح۵ ندوی: ارض القرآن جلد اول ص ۱۱۵ - ۱۰۷: توریت کے بیانات۔ یونانی مورخین، جدید تحقیقات اور مغربی ماہرین اثریات کے حوالوں سے بڑی وضاحت کے ساتھ امم سامیہ کا اصلی وطن عربستان ثابت کیا ہے۔

نیز دیکھیے معارف (اعظم گڑھ) جلد ۲۰ - ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۲۶۱ مولوی زبید احمد کا مضمون "لفظ صلوات قرآن شریف میں"

ح۶ ندوی: ارض القرآن جلد دوم ص ۳۸، جلد ۱ ص ۱۲۴ - (یہ ہجرت زیادہ پہلے ہوئی ہوگی کم از کم ۳ ہزار سال ق م کے لگ بھگ)

ح۷ معارف اعظم گڑھ جلد ۲۰ نمبر ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۲۶۱ نیز ندوی۔ ارض القرآن، جلد ۲ ص ۱۹۹

ح۸ جلد ۱ ص ۱۲۴۔



تاہم حضرت ابراہیمؑ اور بنی جرہم کی زبانیں مختلف تھیں۔ ابراہیمؑ کی زبان آرامی تھی اور بنی جرہم کی زبان عربی تھی اگرچہ کہ ظہورِ اسلام کی عربی سے مختلف تھی۔ زمان و مکان کے فاصلوں نے دونوں کی زبانیں مختلف سانچوں میں ڈھال کر ایک دوسرے سے جدا کر دی تھیں۔ تاہم دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں تھا۔ کیونکہ مخزن اور مخرج دونوں کا ایک تھا اور دونوں زبانیں سامی الاصل تھیں[9]۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے بنی جرہم ہی سے عربی زبان سیکھی[10]۔

عربی سیکھ کر عربی طور طریقے اختیار کرنے کی وجہ سے حضرت اسمٰعیل اور اس کی اولاد کو عرب مستعربہ کہا گیا ہے۔ اگر بنظرِ عمیق جائزہ لیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی[11]۔

عام طور پر عبرانی کو امم سامیہ کی قدیم ترین زبان سمجھا گیا ہے۔ عبرانی کو امم سامیہ کی قدیم ترین زبان سمجھنا غلط ہے۔ ان کی قدیم زبان آرامی تھی اور یہی حضرت ابراہیم کی زبان تھی۔ عاد، ثمود اور دیگر اقوام سامیہ اولیٰ کی زبان بھی آرامی تھی۔ کتبات بھی اسی زبان میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اور ماہرین لسانیات اس زبان کو ابتدائی عربی (PROTO - ARABIC) گردانتے ہیں۔ سامی زبانوں کے حلقہ کو سمجھنے کے لیے نیچے دیئے گئے خاکہ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے[12]۔

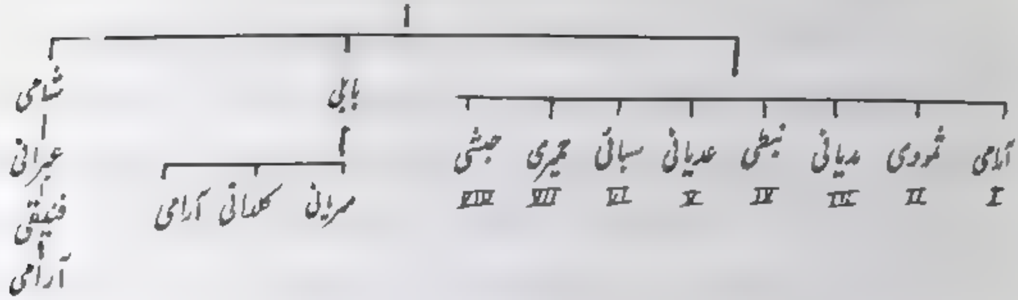
۹۔ سید سلیمان ندوی ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۲۹

۱۰۔ صحیح بخاری۔

۱۱۔ سید سلیمان ندوی ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۲۹

۱۲۔ ایضاً ص ۱۳۰

سامی زبانوں کا حلقہ



یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی زبان اگر السنۂ سامیہ کی ماں نہیں تو اسے ماں کے قریب ہونے کا درجہ ضرور حاصل ہے۔[۱۳]

مگر لفظ عرب زیادہ قدیم نہیں۔ پہلے پہل یہ لفظ ایک ہزار سال قبل مسیح میں سننے میں آیا۔ عبرانی میں اسے عَربا (1723) یعنی بیاباں، صحرا، میدان کہتے ہیں۔ قرآن میں اس کے لیے "وادٍ غیر ذی زرع" کے ہم الفاظ وارد ہوتے ہیں وہ "عرب" کا لفظی ترجمہ ہیں۔ ۸۰۰ ق م میں عربی میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے ——عرب کے نام سے مشہور ہونے سے قبل اس کا نام مدبار تھا، توریت میں حضرت اسمٰعیل کے وطن کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مدبار کے معنی بھی غیر آباد ہونے کے ہیں۔ توریت میں عام طور پر عربستان کا ذکر "پورب کی سرزمین" اور بعد ازاں "پچھم کی سرزمین" کہہ کر کیا گیا ہے۔[۱۴]

اسی ملک عرب کے صوبہ حجاز میں جسے توریت میں فاران کہا گیا ہے مکہ کا شہر آباد ہوا۔[۱۵]

مکہ کی قدیم تاریخ پردۂ اخفا میں ہے اور ہماری معلومات اس قدر ناقص، مبہم اور متضاد ہیں کہ کوئی مربوط تاریخ بیان کرنا کم و بیش ناممکن ہے۔ شہر مکہ کے آباد ہونے سے بہت پہلے اس علاقہ میں عمالیق پھیلے ہوئے تھے۔ بعد ازاں وہاں قبیلہ بنی جرہم آباد ہو گیا۔[۱۶] مگر اس قبیلہ کو وہاں اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جب یمن سے مختلف قبائل نکل کر مشرق اور شمال کی طرف آئے تو اس وقت یمن کا مشہور قبیلہ بنی اُزد (جسے بنی عک نے شکست دے کر نکال دیا تھا) مکہ کی ایک وادی بطن مر میں آکر ٹھہرا۔ اُن کے سردار ثعلبہ بن عمرو نے بنی جرہم سے مطالبہ کیا کہ میدان ان کے سپرد کر دیا جائے جرہم کے انکار پر خون ریز لڑائی ہوئی اور ثعلبہ نے میدان پر زبردستی قبضہ جما لیا۔ مگر بعد ازاں یہ دیکھ کر کہ یہاں وسائل

۱۳- معارف۔ اعظم گڑھ جلد ۲۰ نمبر ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۲۶۰ مضمون از مولوی زبید احمد۔

۱۴- سید سلیمان ندوی، ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۹-۴۷ اور ص ۵۱۔

۱۵- ایضاً جلد ۱ ص ۹۷۔ گستاولی بان نے تمدن عرب میں توریت کے حوالے سے حجاز کا نام ادومیہ لکھا ہے۔

۱۶- عمالیق، عملوق کی جمع ہے۔ اور یہ لفظ عم اور ملوق سے مل کر بنا ہے۔ عم عبری زبان میں قوم کو کہتے ہیں۔ عربی میں لفظ اُمّۃ اسی سے ماخوذ ہے۔ اور ملوق کے معنی عام زندگی کے ہونے ہیں۔ ۲½ ہزار سال ق م میں یہ لوگ مصر کے حکمران تھے۔ بعد میں وہاں سے ان کا اخراج ہوا اور یہ ادھر ادھر بکھر گئے (ارض القرآن جلد ۲ ص ۳۸)

معیشت کی تنگی کے سبب گزراں مشکل ہے نقل مکانی کر کے یثرب چلا گیا[۱۷]۔ یہ میدان شاید وہی ہے جہاں حجاج حج کے لیے خانہ کعبہ کی عمارت کے بالمقابل جمع ہوتے تھے۔ (عرفات میں اجتماع بعد میں شروع ہوا۔ ورنہ قصّی سے قبل وادی مکہ میں ہی حجاج جمع ہوتے تھے) ۔جب حضرت اسماعیل وادی مکہ میں آ رہے تو اس وقت یہاں بنی جرہم کا قبیلہ قرب وجوار کی وادیوں اور پہاڑیوں پر آباد تھا۔ اسی خاندان میں حضرت اسماعیل نے شادی کی اور ان کی نسل بڑھی اور پھلی پھولی۔ مگر بنی جرہم آہستہ آہستہ معدوم ہو گئے اور عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اس خاندان کا صرف ایک مرد عُبید بن شریہ جُرہمی یمن میں موجود تھا۔ جسے امیر معاویہ نے تاریخ لکھنے کا حکم دیا[۱۸]۔ اس کے برعکس خاندانِ اسماعیل حجاز، نجد اور حدود عراق تک پھیل گیا[۱۹]۔ اس بات کی تصدیق یونانی مورخ یوسیفوس نے ۱۰۰ء میں کی کہ حجاز سے لے کر عراق تک اسماعیل کے بارہ بیٹوں کا قبضہ ہے اور یوسف ؑ کو کنویں سے نکالنے والے بھی اسماعیلی تاجر تھے جو سامان لے کر مصر جا رہے تھے۔[۲۰]

پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد حضرت اسماعیل نے جرہم کے سردار مضاض کی بیٹی سے شادی کی ۔ جس کے بطن سے بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ ان میں قیدار اور نابت نے شہرت اور ناموری حاصل کی۔ حضرت اسماعیل نے باپ کے ساتھ مل کر خانۂ خدا کی بنیاد رکھی اور مکہ کا شہر بسایا۔ حضرت ابراہیم ؑ فلسطین میں مستقل طور پر قیام پذیر رہے۔ البتہ مکہ میں وہ تین مرتبہ آئے تیسری مرتبہ انہوں نے لوگوں کو حج کی دعوت دی۔ بنی جرہم سمیت گرد و نواح کے قبائل نے اس دعوت کو قبول کیا۔[۲۱] پھر ہر سال ہزاروں زائرین طواف کے لیے بیت اللہ میں آنے لگے[۲۲]۔ خانۂ خدا کی مجاورت اور خدمت حضرت اسماعیل کے اولاد کے ہاں رہی۔ مگر بعد میں تولیت کا منصب بنی جرہم میں منتقل ہو گیا۔ انتقالِ تولیت کی اصل وجہ کا علم نہیں تاہم ایک روایت ہم تک پہنچی ہے کہ کثرت اولاد کی وجہ سے آل اسماعیل کی تعداد بڑھ گئی، وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہاں گزر اوقات ہو سکتی اُن کی کثیر تعداد نقل مکانی کر کے وہاں سے چلی گئی ۔ بقیہ اولاد صغیر السن تھی، لہٰذا بنی جرہم تولیت خانہ خدا پر قابض ہو گئے۔ تاہم یہ قبضہ پر امن طور پر ہوا۔[۲۳] اگرچہ یہ بات معلوم ہے کہ آل اسماعیل مکہ سے نکل کر دور دراز علاقوں میں چلی گئی مگر اس سبب سے بنی جرہم کے پاس مجاورت کا منصب منتقل ہو جانا کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مزید برآں یہ امر بھی واضح نہیں کہ کس زمانہ میں بنی جرہم کے پاس یہ منصب منتقل ہوا۔ ابن ہشام کی روایت کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت اسماعیل کے انتقال کے فوراً بعد ظہور میں آیا۔ کیوں کہ ابنِ ہشام کے بقول اسماعیل کی اولاد صغیر السن تھی اور ننھال کے ساتھ

۱۷- بلاذری۔ فتوح البلدان صہ ۱۷-۱۶

۱۸- سید سلیمان ندوی ارض القرآن جلد ۲ صہ ۲۰۰ - ۱۹۹

۱۹- ایضاً صہ ۱۵

۲۰- ایضاً صہ ۹۴

۲۱- طبقات ابن سعد جزو ۱

۲۲- القرآن سورۃ الحج آیات ۲۸-۲۷

۲۳- ابن ہشام جلد ۱ صہ ۱۱۱

خوش گوار تعلقات کی وجہ سے وہ انتقال تولیت پر خاموش رہے۔[۲۴] یہ واقعہ چاہے حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے فوراً بعد ہُوا ہو یا بعد میں کسی وقت ظہور میں آیا ہو، اور اس کی وجوہات خواہ کچھ بھی بیان کی جائیں —— جدید عہد کا مؤرخ پس پردہ ان سیاسی محرکات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو اس تبدیلی میں کام کر رہے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ خُدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، ان کا خاندان قابلِ عزت و احترام تھا۔ تاہم ان کے خاندان کو عرب میں سیاسی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بنی جُرہم کے ساتھ ننھیالی رشتہ قائم ہو جانے کے بعد ہی آلِ اسماعیل کو عصبیت حاصل ہوئی۔ تاہم جب بنی جرہم نے دیکھا کہ خدا کے گھر کی رکھوالی کرنے والوں کا کتنا اعزاز اور احترام ہے تو فطری طور پر ان کے دل میں بھی یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کیوں نہ وہ خود اس منصب پر قبضہ جمالیں۔ اس بات کی تصدیق بلاذری کے بیان کردہ اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ بنی جرہم کے سردار مضاض اور سمیدع عمالقی میں جنگ تولیت کعبہ کے تنازعہ پر ہوئی، جس میں مضاض نے شکست کھائی۔[۲۵] سمیدع کو بنی جرہم کا اعزاز دیکھ کر حسد پیدا ہوا تھا۔ یہ مضاض وہ نہیں جو حضرت اسماعیلؑ کے سسر تھے بلکہ یہ غالباً بعد میں کوئی جرہمی سردار گزرے ہوں گے۔ نہیں معلوم بلاذری کی روایت کس حد تک صحیح ہے۔ تاہم اس واقعہ سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ تولیت کے منصب نے حسد و رقابت کے جذبات پیدا کر دیئے اور اس غرض کے لیے سیاسی کش مکش شروع ہو گئی تھی۔ منصب تولیت سے محرومیت کے باوجود حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کی عزت و تکریم میں کوئی فرق نہ آیا اور عہد اسلام تک قریش پورے عرب میں عـــزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ بات یہاں نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ قریش کے احترام اور وقار کو قصی نے آکر دوبارہ بحال کیا —— ورنہ قصی سے پہلے قریش منتشر اور پراگندہ تھے۔ تولیت خانہ کعبہ سے محروم ہونے کے بعد آل اسماعیلؑ مکہ میں مقیم رہی اور ننھیال کے ساتھ ان کے تعلقات خوش گوار رہے۔ مگر اولادِ اسماعیل کو مکہ کی اجتماعی زندگی میں کیا مقام اور رتبہ حاصل تھا، یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے ہے کہ بنی جرہم اور قطورا (اولادِ اسماعیل) کی مکہ پر مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم رہی۔ جو کاروان جس قبیلہ کی طرف سے گزرتا اس کا محصول وہی قبیلہ وصول کرنے کا حق رکھتا تھا۔[۲۶] فطری طور پر یہاں یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ تولیت خانہ خدا کا منصب کیا خالصتاً مذہبی قسم کا تھا یا اس کی نوعیت سیاسی بھی تھی۔ یعنی کیا شہر کی سیاسی بالادستی اس شخص یا خاندان کو از خود حاصل ہو جاتی تھی جو اس مقام پر فائز ہوتا یا یہ کہ اجتماعی زندگی میں اُسے صرف ایک بااثر فرد یا گروہ کی حیثیت حاصل ہوتی؟ واضح شواہد و نظائر کے فقدان کے پیش نظر کوئی قطعی بات کہنا دشوار ہے تاہم صحیح بخاری کی ایک روایت قابل غور ہے کہ حضرت ہاجرہ نے قبیلہ بنی جرہم کو مکہ میں سکونت رکھنے کی اجازت دے دی مگر کہا کہ پانی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔[۲۷] محولہ بالا روایت

۲۴۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ صـ ۱۱۰ ۔

۲۵۔ بلاذری فتوح البلدان جلد ۱ صـ ۵۱ : جن مقامات پر سمیدع اور مضاض نے لڑائی کی تیاری کی تھی وہاں دو مشہور عمارات تھیں۔ جن کے کھنڈرات عہد نبوی تک موجود ہے (نیز ابن ہشام) ۔

۲۶۔ محمد حمید اللہ: رسول اللہ کی سیاسی زندگی (صـ ۹ ـ ۳۸)۔ ۲۷۔ صحیح بخاری ۔

سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خاندانِ اسماعیلؑ کو مذہبی تقدس کی بنا پر سیاسی تغلب حاصل ہو گیا تھا اور وادی مکہ کا میدان جس کے لئے ماضی میں جرہم و اُزد میں لڑائی ہوئی تھی اب بلا شرکت غیرے خاندان اسماعیلؑ کے تصرف اور تسلط میں تھا۔ دوسرے مکہ کی سیادت کے لیے ہم نے ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور بلاذری کے حوالوں سے اور جن غیر مربوط قسم کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تقدس اور خانہ کعبہ کی مجاورت کے ساتھ سیاسی غلبہ و تسلط اس طرح وابستہ تھا کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ تیسرے تمام قدیم شہروں میں عام طور پر مذہبی اور سیاسی قیادت یکجا رہی ہے، خصوصاً جو شہر کسی عبادت خانہ کی وجہ سے آباد ہوئے۔[۲۸] اور سوشیالوجسٹ کی جدید تحقیقات[۲۹] بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ انسانی معاشرے کے ارتقائی مراحل میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ سیاسی اور مذہبی مناصب ایک ذات میں جمع تھے۔

اتنی بات واضح ہے کہ خاندان اسماعیلؑ کچھ دیر کے لیے بلا شرکت غیرے خانۂ خدا کا متولی رہا اور اس وجہ سے سیاسی طور پر بھی مکہ کی سیادت اس کے ہاتھ میں رہی۔ بعد ازاں یہ منصب بنی جرہم کے ہاں منتقل ہو گیا اور ممکن ہے کہ مکمل انتقال سے پیشتر، جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے ہے، کچھ عرصہ کے لیے مکہ پر مشترکہ کنٹرول آل اسماعیلؑ اور بنی جرہم کا رہا ہو۔ بعد ازاں بنی جرہم کو بنی بکر اور بنی عیشان نے یمن کی طرف بھگا دیا اور تولیت ایک مرتبہ پھر آل اسماعیلؑ میں آ گئی۔ جو اس خاندان کے مشہور فرد عدنان کے زمانے تک اسی خاندان میں رہی۔ جرہم کی شکست سے پہلے مورخین نے جرہم کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ ان مظالم کی وجہ سے لوگ تنگ آ گئے۔ بنی بکر اور عیشان کون تھے؟ اور انہوں نے جرہم کو شکست دے کر مکہ کی سیادت اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسماعیلؑ کو کیوں سپرد کر دی؟ ان سوالات کا کوئی ٹھوس جواب موجود نہیں۔ تاہم عدنان کے زمانہ تک مکہ پر مذہبی اور سیاسی تسلط آلِ اسماعیلؑ کا تھا اور بخت نصر نے حملہ کیا تو اس کے مقابلے پر عدنان اور اس کا خاندان ہی نکلا۔ بخت نصر کا حملہ ۵۹۲ ق م میں ہوا۔ اس حملہ میں عدنان مارا گیا مگر اس کا لڑکا بچ گیا۔[۳۰] اور فرار ہو گیا۔ پورا خاندان منتشر ہو گیا۔ یہ مکہ کی تاریخ کا پہلا دور ہے۔ قریش کا جدِ اعلیٰ فہر، جس کے نام کی وجہ سے یہ خاندان مشہور و معروف ہوا، اسی زمانۂ جلاوطنی میں پیدا ہوا۔ اور خاندانِ قریش کا دوسرا اہم فرد قصی جس نے قریش کو خانہ کعبہ کی تولیت اور شہر مکہ کی حاکمیت پر بحال کیا، اسی اخراج کے دور میں پیدا ہوا۔ عدنان سے لے کر قصی کے زمانہ تک خاندان اسماعیلؑ اپنے جد امجد کے بسائے ہوئے شہر سے باہر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر یہ کہنا کہ یہ پورا دور اس خاندان کے لیے مصیبت و ابتلا کا دور تھا، صحیح نہیں۔ تاہم قصی نے بزور شمشیر شہر مکہ کو فتح کر کے خانہ کعبہ کی تولیت پر قبضہ کر لیا اور اپنے خاندان کے منتشر افراد کو مکہ اور اس کے گرد و نواح میں جمع کیا۔ اس لیے اس کا نام "مجمع" پڑ گیا۔ یہ سن ۲۲۰ عیسوی[۳۱] کا واقعہ ہے اور اس

۲۸/۲۹۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز تحت لفظ "ٹاؤن پلاننگ"، "شہر"۔

۳۰۔ سید سلیمان ندوی: ارض القرآن ج ۲ ص ۹۲۔

۳۱۔ GEVALD DE GAURY : RULERS OF MECCA ص ۴۸ نے ۱۸۰ عیسوی لکھا ہے، جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ دیکھیے ڈاکٹر حمید اللہ سیاسی زندگی ص۲۱۔

واقعہ سے مکہ کی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

تاہم جس زمانی ترتیب سے ہم نے مکہ کی قدیم تاریخ کے واقعات اوپر بیان کئے ہیں، یہ قطعی نہیں ہیں۔ سنوں کے بارے زبردست اختلاف سے قطع نظر یہ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں کہ کون کون سے قبائل مکہ کی سیادت اور کعبہ کی تولیت کرتے رہے خصوصاً جبکہ خاندان اسمٰعیل اور قریش جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ "مکہ کے حکمران" کتاب کا مصنف جرہم کی شکست اور اخراج کا سال ۲۰۷ عیسوی تسلیم کرتا ہے اور اکثر یورپین مورخین نے یہی سن لکھا ہے۔ مصنف موصوف کے خیال کے مطابق اس کے بعد بنی خزاعہ کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ مکہ کی تاریخ کا پہلا دور یہاں پر ختم ہوا۔ اور دوسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ پانچویں صدی عیسوی میں جنوبی عرب سے تاجر مکہ میں آ کر آباد ہوئے اور یہ شہر تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔[32] یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مستشرقین شہر مکہ کی قدامت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کے دیئے گئے سن کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ ان کی رائے کس حد تک متعصبانہ ہے۔

یہاں یہ سوال دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ قصیٰ کے مکہ پر قبضہ جمانے سے پہلے مکہ پر "حکمران" قبائل کی حکومت کی نوعیت کیا تھی؟ کیا پورا قبیلہ بحیثیت مجموعی حکمران ہوتا تھا یا اس قبیلہ کے سردار ہی کو حکومت کے تمام فرائض تفویض تھے اور حکمران قبیلہ کی حیثیت سردار کے سامنے محض رعایا کی نہ تھی؟ یا یہ کہ یہ حکومت شخصی طرز کی تھی جس میں قبیلہ کی رائے کو کوئی اہمیت اور عمل دخل حاصل نہ تھا؟ حکومت کرنے کا طریقہ کیا تھا؟ خانہ خدا کی تولیت کا کیا انتظام تھا؟ حجاج اور زائرین کی خدمت کا کیا بندوبست کیا جاتا تھا؟ ان سوالات کا جواب معلوم کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ قصیٰ کے زمانۂ حکمرانی کی اصلاحات کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کیا جا سکے اور معلوم کیا جا سکے کہ قصیٰ نے جو اصلاحات جاری کیں وہ کس حد تک اس کے اپنے ذہن کی اختراع تھیں اور کس حد تک مروجہ طرز حکمرانی کا عکس اور پرتو تھیں۔

جیرالڈ ڈی گاری نے قصیٰ سے پیشتر مکہ کے حکمرانوں کی فہرست اپنی کتاب میں دی ہے۔ جس سے یہی نظر آتا ہے کہ مصنف موصوف تسلیم کرتے ہیں کہ مکہ میں شخصی حکمرانی کا دور دورہ تھا اور یہ کہ حکومت موروثی ہوتی تھی، ان کی دی گئی فہرست حسب ذیل ہے[33]

۱۔ جرہم بن جہلا (JAHLA)	از ۷۴ ق م	تا ۴۴ ق م
۲۔ ابوبلیل بن جرہم	از ۴۴ ق م	تا ۱۴ ق م
۳۔ جرہم بن ابوبلیل	از ۱۴ ق م	تا ۱۶ عیسوی سن
۴۔ عبدالمنان بن جرہم	از ۱۶ عیسوی	تا ۴۶ ء
۵۔ بقیلہ بن عبدالمنان	از ۴۶ ء	تا ۷۶ ء

۳۲- GEVALD DE GAURY : RULERS OF MECCA صـ ۲۸

۳۳- "مکہ کے حکمران" صـ ۳۳

۶- عبدالمسیح بن بقیلہ	؟	(اس کا اصل نام عمرو تھا)	
۷- مواعدہ اکبر MOHADA بن عبدالمسیح	از ۱۰۶ء	تا ۱۳۶ء	
۸- عمرو بن معاذ ۹- حارث بن مواعدہ	از ۱۳۶ء	تا ۱۷۰ء	
۱۰- عمرو بن حارث ۱۱- بشر بن حارث ۱۲- معدالاصغر بن عمرو بن محد	از ۱۷۰ء	تا ۲۰۶ء	

۲۰۷ء میں جرہم کو نکال کر خزاعہ نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ خزاعہ کا سردار عمرو بن لحی تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے مکہ میں بُت پرستی کو رواج دیا[۳۴]۔ خزاعہ کا آخری حکمران حُلیل تھا۔ قصٰی بن کلاب نے اسی سے حکومت حاصل کی[۳۵]۔

قصٰی کے پیش رو حکمرانوں کی حیثیت اور ان کی حکمرانی کی نوعیت بادشاہانہ اور مطلق العنان ہرگز نہیں تھی جیسا کہ جیرالڈ کا خیال ہے۔ حکمران اپنے قبیلے کا سردار اعلیٰ ہوتا تاہم اس کے اختیارات وسیع ہوتے ٹیکس وصول کرتے اور زائرین کی خدمت گزاری اس کا فرض منصبی تھا۔ سرداری کا عہدہ وراثتاً منتقل ہوتا تھا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصب سرداری "شہنشاہیت" کا روپ اختیار کرتی جارہی ہے۔ مگر ہم ان قبائلی سرداروں کو "حکمران" نہیں قرار دے سکتے اور نہ ہی ان کے اختیارات حتمی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ باوجودیکہ حُلیل نے اپنے داماد قصٰی کو تولیت کعبہ کے فرائض اور محاصل کی ادائیگی کے اختیارات لکھ دیئے تھے، مگر قصٰی کو سیادت حاصل کرنے کے لیے (حُلیل کے بعد) خون ریز لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ کیونکہ دیگر سرداران بنی خزاعہ نے حلیل کی تحریر کو قانونی سیاسی دستاویز کے طور پر فیصلہ کن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قصٰی نے اپنی دولت اور قوت کے بل بوتے پر مکہ پر قبضہ کیا تھا مگر اس نے بھی مطلق العنان حکمران بننے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اشراف کے تعاون سے مکہ کا نظم و نسق چلانے کا بندوبست کیا۔ قصٰی کی حیثیت مرکزی تھی اور اس کا مقام و مرتبہ انتہائی اہم تھا۔ تاہم اسے مکہ کا فرمانروا نہیں کہا جا سکتا۔ مکہ یک حکمرانی کے تصور سے ابھی تک ناآشنا تھا بلکہ بعثت نبویؐ سے کچھ پہلے چند ایک طالع آزماؤں نے یک حکمرانی کا منصب حاصل کرنے کی جب کوشش کی تو اہل مکہ نے ان کی کوششیں ناکام بنا دیں۔ کیونکہ مکہ کا مزاج اور ماحول اسے ابھی قبول کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عثمان بن الحویرث مکہ میں زبردست مقبولیت رکھنے کے باوجود جب (رومی حکمرانوں کے بالواسطہ تعاون سے) مکہ میں "حکمرانی" کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو اس کو بے پناہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ اس کا اپنا خاندان اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے[۳۶]۔ رومیوں سے نفرت کا جذبہ بھی کارفرما

۳۴- صحیح بخاری۔

۳۵- سیرت ابن ہشام جلد ۱

۳۶- محمد حمید اللہ : رسول اللہؐ کی سیاسی زندگی ۔

تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تھی کہ مکہ ابھی کسی بادشاہ یا امیر کے تسلط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب صورتِ حالات یہ تھی تو قبل مسیح میں "مکہ کے حکمرانوں" کی فہرست تیار کرنا بڑی زیادتی ہے۔

قصی بن کلاب بن مرہ کی ماں فاطمہ بنت سہل کا پہلا نکاح کلاب سے ہوا اور قصی اور زہرہ دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بعد ازاں دوسرا نکاح ربیعہ بن حرام سے ہوا۔ ربیعہ شام کا باشندہ تھا۔ جو عرب میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اپنے وطن شام واپس چلا گیا اور بیوی اور قصی اور زہرہ کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ قصی کو بڑے ہو کر جب اپنے حسب و نسب کا علم ہوا تو مکہ واپس آیا اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ خوب دولت کمائی اور شہرت حاصل کی۔ مکہ کے سردار حلیل بن حُبشیہ کی لڑکی حبّی سے نکاح کیا۔ حلیل کے مرنے کے بعد کلید کعبہ اور سیادت مکہ پر قصی نے قبضہ جما لیا۔[۳۷] روایات متضاد اور مبہم ہیں۔ تاہم خلاصہ یہ ہے کہ حلیل اہل عرب سے محصول لیتا تھا قصی نے خرید کر لیا۔[۳۸] آیا حلیل نے اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے پر[۳۹] تحصیل محاصل کا پروانہ لکھ دیا تھا یا دھوکہ سے[۴۰] یہ پرونوٹ حاصل کیا گیا تھا؟ آیا حلیل کو فروختگی کا اختیار حاصل تھا یا نہیں اور قانونی طور پر شرُد بیع کے اس معاہدہ کی کیا حیثیت تھی اور یہ کہ حلیل نے اتنے سستے داموں (شراب کے مٹکے کے عوض)[۴۱] محاصل کیوں فروخت کیے۔ یہ سارے سوالات تشنہ جواب ہیں اور تاریخی واقعات ان پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ آیا یہ سودا قصی کو فرزندی میں قبول کرنے کے بعد حلیل نے کیا یا پہلے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے ایک کامیاب تاجر کے طور پر دولت اور شہرت حاصل کی۔ حلیل جو عیاش طبع انسان تھا قصی کا مقروض ہو گیا تو قصی نے اسے مجبور کیا کہ محصول چنگی وصول کرنے کا اختیار اسے لکھ دیا جائے۔ بعد ازاں اس کی لڑکی سے نکاح کیا قصی کی طاقت اور عصبیت بڑھ گئی۔ حلیل جب مرا تو خانہ کعبہ کی تولیت قصی کو لکھ کر دے گیا۔ ممکن ہے کہ حلیل کو محصول چنگی لینے کا اختیار اپنے قبیلے والوں نے سپرد کیا ہو اور دوسرے سرداروں کے سپرد اور فرائض ہوں۔ مکہ میں اس وقت وفاقی یا مشترک حکومت تھی، قبائل بنی خزاعہ، بنی بکر اور بنی صوفہ مل کر کاروبار چلاتے تھے ممکن ہے کچھ اور قبائل بھی نظم و نسق چلانے میں شریک ہوں۔ ہر ایک کے سپرد علیحدہ علیحدہ فرائض تھے۔ مثلاً بنی صوفہ کے بارے میں واضح طور پر اطلاع ہم تک پہنچی ہے کہ وہ مناسک حج ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔[۴۲] عین ممکن ہے کہ تحصیل چنگی کا اختیار قبیلہ بنی خزاعہ کے سپرد ہو۔ اور اس طرح حلیل نے جب محاصل وصول کرنے کا اختیار منتقل کیا تو کسی نے اس کی قانونی حیثیت کو چیلنج نہ کیا ہو؟ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ حلیل کے مرنے کے بعد مکہ کی سیادت کے لیے زبردست کش مکش کا آغاز ہو گیا۔ قصی نے منتشر قریشی قبائل کو اپنی قیادت میں جمع کیا، بنی قضاعہ سے بھی

---

۳۷ - ابنِ ہشام، جلد ۱ ص ۱۲۲

۳۸ - طبقات ابن سعد۔

۳۹ - حسنین ہیکل۔

۴۰ - تاریخ طبری۔

۴۱ - حسنین ہیکل۔

۴۲ - ابنِ ہشام جلد ۱ ص ۲-۱۲۱

مدد مانگی اور شام میں اپنے ماں جائے بھائیوں اذرح وغیرہ سے بھی امداد طلب کی۔ کئی معرکے ہوئے قصٰی کو السطح میں فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی خزاعہ اور ان کے حلیف بنی بکر شکست کھا گئے [43]۔ شکست خوردہ گروہ میں قبیلہ بنی صوفہ بھی شامل تھا جس کے سپرد مناسک حج کی ذمہ داری تھی۔ قصٰی نے مکہ اور تولیت کعبہ پر قبضہ کر لیا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قصٰی نے فیصلہ کن فتح حاصل کر کے دشمن قبائل کی قوت کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس کشمکش کا اختتام صلح نامہ پر ہوا جس کی رُو سے خزاعہ و بکر کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ دیگر شرائط صلح کے بارے میں اگرچہ روایات کا اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ شرائط بھی قصٰی کے حق میں تھیں کم از کم اس زمانے کے اُصول کے مطابق ان شرائط میں بھی قصٰی کی جیت جھلکتی تھی۔[44] ابن سعد کے مطابق خزاعہ و بکر کے مقتولین کا خون بہا نہ دلایا گیا جبکہ قریش کے مقتولین کا خون بہا دلایا گیا۔ اور چونکہ جنگ میں قصٰی کو بالادستی حاصل ہوئی تھی، اس لیے مکہ پر اس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ صلح یعمر بن عوف نے کرائی۔ اس کا نام شداخ پڑ گیا۔[45] کیونکہ اس نے اپنی فہم اور تدبر سے برسر جنگ فریقین کے سلسلۂ قتال کو توڑا (شداخ) تھا۔ اس واقعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جنگ و جدال کا خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ اور یعمر نے جب اس سلسلہ جنگ کو ختم کروا دیا تو اس کا نام شداخ مشہور ہو گیا۔ دوسرے بکری نے نواح کعبہ میں قصٰی کے آ بسنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سکنتم حول البیت هابتکم الناس ولم تستحل قتالکم والھجوم علیکم۔[46] معلوم ہوتا ہے کہ السطح کے معرکہ کے بعد بھی خطرۂ جنگ باقی تھا۔ اور مکہ پر زبردستی قبضہ کر لینے کے باوجود احتمال تھا کہ شکست خوردہ قبائل کہیں مکہ پر دوبارہ حملہ نہ کر دیں اور یہی سبب ہے کہ قصٰی نے جنگ کو دشمن کی فیصلہ کن شکست تک طول دینے کی بجائے، دشمن کی طاقت کم زور کرنے اور مکہ پر زبردستی قبضہ جمانے کے بعد معاہدۂ امن کے ذریعے مخالفین کو بیش بہا رقم بعوض خون بہا ادا کرنے پر فوری رضامندی ظاہر کر کے حاکمیت مکہ اور تولیت کعبہ پر اپنے قبضہ کو قانونی حیثیت دینے کو ترجیح دی۔

قصٰی نے مکہ پر قبضہ ۴۲۲ء میں کیا۔ کعبہ کو از سر نو تعمیر کرایا۔ اور پرانے شہر مکہ میں اپنے خاندان کے افراد کو بسانے کی بجائے خانہ خدا کے گرد چار طرف انھیں آباد کر کے نئے شہر کی بنیاد رکھی۔[47] اپنا مکان بھی وہیں تعمیر کیا۔ یہی مکان بعد میں دار الندوہ کے نام سے مشہور ہوا۔[48] یہ در اصل دار الامارت تھا اور یہی مقام اور حیثیت اس مکان کو قصٰی کے زمانہ میں بھی حاصل ہو گئی تھی۔ مکہ میں داخل ہونے والوں سے عُشر وصول کیا۔[49] حاجیوں کی دیکھ بھال اور بہتری کے لیے انتظامات کئے۔ شہری ریاست مکہ کی

---

۴۳ - ابن ہشام جلد ۱ صـ ۱۲۲ -

۴۴ - طبقات ابن سعد جلد ۱ - نیز ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۲ -

۴۵ - ابن ہشام ص ۱۲۲ -

۴۶ - بکری : الدرۃ المکللۃ صـ ۷۸

۴۷ - مکہ کے حکمران ص ۳۸ -

۴۸ - ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۳ -

۴۵ - طبقات ابن سعد -

داغ بیل رکھی اور نظم و نسق چلانے کے لیے عسکری، عدالتی، مذہبی حصوں میں منقسم چودہ محکمہ جات بنائے اور قریش کے ۱۰ خاندانوں میں ان عہدوں کو بانٹ دیا۔

ا۔ عسکری
i۔ نام عہدہ : عقاب قبہ اعنہ سفارت
ii۔ نوعیت : (علم) (فوجی کیمپ) (سپہ سالاری) (مراسلت)
iii۔ کس خاندان کے سپرد ہوا : بنی اُمیہ بنی مخزوم بنی مخزوم بنی عدی

ب۔ عدالتی
i۔ نام عہدہ : حکومت اشناق
ii۔ نوعیت : (مقدمات کی سماعت اور فیصلہ) (جرمانہ، خون بہا تاوان کی نگرانی)
iii۔ کس خاندان کے سپرد ہوا : بنی سہم بنی تیم

ج۔ مذہبی
i۔ نام عہدہ : سقایہ احوال المجرہ رفادہ خبرگیری عمارہ سدانہ السادہ ندوہ
ii۔ نوعیت : (پانی پلانا) (اوقاف چڑھاوے) (خورد و نوش) (انگشت شیبوں کے نظام کا عہدہ) (کلید کعبہ)
iii۔ کس خاندان کے سپرد ہوا : بنی ہاشم بنی سہم بنی ہاشم بنی نوفل بنی ہاشم بنی غفار بنی جمع بنی اسد

لاوارث کا مال قصیٰ کو مل جاتا[۵۰]۔ عام طور پر کتب تاریخ میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لیے عہدوں کا قیام اور دیگر انتظامات قصیٰ کے اپنے ذہن رسا کی پیداوار ہیں۔ قصیٰ کی بے پایاں عسکری اور انتظامی صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں مگر محولہ بالا بیان کی صداقت کو تسلیم کرنے سے پہلے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ قصیٰ شام سے حجاز آیا۔ اس کے خاندان کے لوگ ابھی تک بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے اور صحراؤں اور پہاڑیوں پر منتشر تھے۔ جبکہ شام کا ملک تہذیبی طور پر بہت ترقی یافتہ تھا۔ مزید برآں قصیٰ نے فتح مکہ کے لیے شام سے عسکری امداد بھی حاصل کی تھی۔ قصیٰ کی تعلیم اور تربیت شام کے متمدن ملک میں ہوئی تھی۔ لہٰذا بدوی قریشی قبائل کو تمدن کا رس قصیٰ نے دیا اور یہ رائے بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ مکہ کے نئے تمدنی دور کا جب آغاز ہوا تو اس پر شام کے تمدن کی چھاپ گہری تھی[۵۱]۔ ظاہر ہے کہ شہری ریاست کے انتظام و انصرام کے لیے بہت سی چیزیں شامی طرز حکومت سے اخذ کی گئی ہوں قصیٰ کے عہد میں شام اور حجاز کے تعلقات سمجھنے کے لیے حدود ملک شام میں ملنے والے اس کتبہ کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ اس کتبہ پر "قصیٰ مالک" کا نام درج ہے۔ یہ نام عدنانی الاصل ہے۔ شام میں یہ نام مروج نہیں رہا مورخین اور ماہرین اثریات نے امکان ظاہر کیا

۵۰۔ محمد حمید اللہ : سیاسی زندگی ص ۳۹

۵۱۔ سید سلیمان ندوی ۔ ارض القرآن جلد ۲ ص ۲-۱۰۱۔

ہے کہ یہ قصیٰ رئیس قریش کے نام کا کتبہ ہے۔[۵۲] شام سے اکتساب کرنے کے علاوہ مکہ کی روایات سے بھی قصیٰ نے بہت سی چیزیں مستعار لیں۔ مثلاً جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے قصیٰ سے قبل مشترکہ قسم کی حکومت مکہ میں قائم تھی اور مختلف خاندانوں کو مختلف کام سپرد کئے ہوئے تھے۔ بنی سوفہ کے ذمہ خانہ کعبہ کی نگرانی اور فرائض حج کی دیکھ بھال تھی۔ بنی خزاعہ محاصل وصول کرتے تھے۔ شاید بنی بکر عسکری خدمت انجام دینے پر مامور ہوں ——— حجاز اور شام کے امتزاج سے قصیٰ نے ایسا نظم و نسق قائم کیا کہ بہت جلد اس کے خاندان؛ قریش کو پورے عرب میں اہمیت حاصل ہو گئی اور مکہ کے شہر کو شرق اوسط میں مرکزیت نصیب ہوئی۔

قصیٰ کا انتقال ۴۸۰ء میں ہوا۔[۵۳]

قصیٰ کے انتقال سے بعثت نبوی تک کے واقعات چونکہ مشہور و معروف ہیں اس لیے یہاں ان کا اعادہ کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ گو اس دور کے واقعات کی تحقیق اور جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہے مگر خوف طوالت سے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

اب شہر مکہ کے بارے میں بیان کیا جائے گا۔ کہ یہ شہر کب آباد ہوا، اس کا تعمیری منصوبہ کیا تھا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے کہ مکہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے جو آج تک آباد چلا آ رہا ہے۔ اس کی قدامت کا بڑا ثبوت اس کے نام کی قدامت ہے۔ ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اس کا نام وہی چلا آتا ہے جو اس کے بانی اور معمار اول حضرت ابراہیمؑ نے تجویز کیا تھا۔ قرآنی شہادت کے مطابق یہ نام "بکہ" تھا۔[۵۴] جو بعد ازاں مکہ کے نام سے مشہور ہوا۔ تاہم بکہ کا نام بھی عہد رسالت مآبؐ اور نزول وحی تک مقامی طور پر مستعمل ہوگا، ورنہ قرآن کو متروک لفظ استعمال کرکے مطالب قرآنی کو چیستان بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

توریت میں مکہ کو "مشا" کہا گیا ہے جو توریت ہی کی دی گئی اطلاع کے بموجب بنی قحطان کی آخری آبادی تھی۔[۵۵] البتہ یہ بات واضح نہیں کہ آیا "مشا" مکہ یا بکہ کی تحریف شدہ صورت ہے یا اس کا تعلق (توریت ہی کے بیان کے مطابق) حضرت اسماعیل کے بیٹے "مسا" سے ہے۔[۵۶] مشہور رومی مورخ بطالمی دوسری صدی عیسوی میں اس شہر کو مکاربا (MACARBA) کہتا ہے۔[۵۷] یہ امر تشریح طلب ہے کہ بطالمی نے "مکاربا" کا نام کیوں استعمال کیا۔ ایک رائے یہ ہے کہ مکاربا کے معنی عبادت خانہ (SANCTUARY) کے ہوتے ہیں

۵۲۔ سید سلیمان ندوی : ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۰۴

۵۳۔ مکہ کے حکمران : صد ۸ میں نے سن ۴۹۰ء دیا ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

۵۴۔ القرآن۔

۵۵۔ سید سلیمان ندوی : ارض القرآن، جلد ۲ ص ۹۷۔

۵۶۔ ایضاً ص ۹۶ نیز دیکھیے ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۰۱ ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے ایک بیٹے کا نام "مشا" لکھا ہے۔ تاہم مسا اور مشا میں کوئی معنوی یا صوتی فرق نہیں۔

۵۷۔ سید سلیمان ندوی : ارض القرآن جلد ۱ ص ۱۱۲۔

اور چونکہ مکہ میں خانہ خدا موجود تھا اس مناسبت سے ٹپالمی نے اسے مکاربا کہا۔[۵۸] دوسرا خیال یہ ہے کہ لفظ مکاربا دراصل مکہ اور ربہ سے مل کر بنا ہے۔ ربہ کے معنی اعظم کے ہوتے ہیں۔[۵۹] عین ممکن ہے کہ ٹپالمی نے مکہ کی بین الاقوامی شہرت جغرافیائی اہمیت اور تجارتی مرکزیت کی وجہ سے اسے "مکہ کا عظیم شہر" کہا ہو۔ ہمارے خیال میں یہ دوسری رائے صحیح اور قرینِ قیاس ہے۔

یہاں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ شہر کا نام بکہ کیوں پڑا۔ اور یہ کہ آیا یہ نام خود حضرت ابراہیمؑ کا اپنا تجویز کردہ تھا یا بعد میں شہر اس نام سے منسوب و معروف ہوا۔ ابن ہشام نے اس ضمن میں مختلف روایات بیان کی ہیں: ان کا خلاصہ یہاں دیا جاتا ہے:

۱۔ کوئی بادشاہ مکہ کی بے حرمتی کا ارادہ کرتا تو فوراً برباد ہو جاتا۔ اور یہ نام اس لیے مشہور ہوا کہ وہ ان سرکشوں کی گردنیں توڑ دیتا تھا جو اس میں کسی برائی کی داغ بیل ڈالتے۔ بک کے معنی گردن توڑ دینا کے ہیں اور دوسرے معنی ہجوم کے بھی ہوتے ہیں۔

۲۔ (بحوالہ ابوعبید) مکہ کے اندر بکہ نام کی وادی ہے اور چونکہ وہاں لوگوں کا بہت زیادہ ہجوم ہوتا تھا اس لیے اسے بکہ کہنے لگے۔

۳۔ (بحوالہ ابوعبید) بکہ بالخصوص کعبۃ اللہ کی جگہ اور مسجد ہی کو کہا جاتا ہے۔[۶۰]

پہلی روایت کے بموجب بکہ صفاتی نام تھا اور اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بکہ کا نام ابراہیمؑ نے تجویز نہیں کیا تھا بلکہ بعد ازاں شہر کی خاص صفت کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔ مگر اس رائے کے قبول کرنے سے پہلے درج ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے:۔

اولاً۔ ابن ہشام نے صفحہ مذکور پر ہی لکھا ہے کہ " زمانۂ جاہلیت میں مکہ میں جو شخص سرکشی کرتا مکہ اسے اپنے اندر سے نکال دیتا اور جو ظلم و زیادتی کرتا وہ وہاں رہ نہیں سکتا تھا اس لئے اس کا نام ناسّہ مشہور ہوا"۔ نسّ کے معنی ہانکنا اور ڈانٹنا ہیں"۔ اس طرح یہ روایت اور روایت ۱ متضاد اور متناقض ہیں۔

ثانیاً۔ بکہ اور اس کے معنی کے متعلق ابن ہشام نے جو روایت (محولا بالا ۱) درج کی ہے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ صرف سُنی سنائی بات بیان کر دی ہے۔ اس لیے اس روایت کی اہمیت کم ہے۔ اب ایک صفت کی وجہ سے دو مختلف نام مشہور ہوئے تو اس روایت کو قبول کرتے ہیں ہمیں تامل ہے جو سند کے اعتبار سے کم تر درجے کی ہے۔

آگے چل کر ابن ہشام نے سند میں جو اشعار پیش کئے ہیں اس میں بکہ کے معنی "ہجوم" کے ہوتے ہیں اور ہمارے خیال میں "سرکشی" کی بجائے بکہ کے یہی معنی زیادہ قرینِ قیاس اور صحیح تر ہیں۔ مکہ کی دفاعی پوزیشن اور مکہ کے سرکش اور جابر حکمرانوں کے پے در پے اخراج کی وجہ سے ناسہ کا صفاتی نام بعد میں مشہور ہو گیا ہو گا اور خود ابن ہشام کی اپنی تحقیق بھی یہی ہے۔ اس لیے انہوں نے

۵۸۔ مکہ کے حکمران صہ ۲۴۔

۵۹۔ ندوی ایضاً صہ ۱۱۲۔

۶۰۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۱۲۔

اپنی رائے پہلے پیش کر دی اور بعد میں غیر تصدیق شدہ بات کو بھی جو بازاری گپ شپ کے بطور مشہور تھی، لکھ دیا۔
"تا تھا"۔ قرآن میں "ببکۃ مبارکۃ" کے الفاظ سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ بکہ کا نام شہر کے مؤسس اول نے تجویز کیا تھا یا کم از کم ابتدا یہی نام مشہور ہوا۔ ابن ہشام کی (محولہ بالا) تیسری روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی وہ خاص جگہ جہاں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے عبادت خانہ تعمیر کیا اسی جگہ کے لئے "بکہ" کا لفظ مخصوص تھا۔

دراصل بکہ جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔[61] ابتدا میں یہ نام صرف خانۂ خدا کے لیے مختص تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ ابراہیمؑ کے پیرو کار اور مقلدین حج اور قربانی کی رسومات ادا کرنے کے لئے وہاں جمع ہوتے تھے — اس میدان میں جو بیت اللہ کے سامنے واقع ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ میدانِ عرفات میں حجاج کا اجتماع بہت بعد کی اختراع ہے۔[62] ورنہ قصیٰ کے زمانہ تک یہ اجتماع عین مسجد اور حرم مقدس کے سامنے ہوتا تھا۔ ابن ہشام کی (محولہ بالا) دوسری روایت کہ وہاں زائرین کا آنا بڑا ہجوم ہوتا تھا کہ وادی کا نام بکہ پڑ گیا، ہمارے خیال کو مزید تقویت پہنچاتی ہے —— سالانہ حج کے اجتماع کے علاوہ سیاسی اور مذہبی لحاظ سے عربوں کو جو وحدت اور مرکزیت خانۂ خدا کی تعمیر سے حاصل ہوئی اس کے لیے بکہ سے بہتر کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نام پوری وادی کے لیے بلکہ اس شہری آبادی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا جو مسجد سے الگ، کچھ فاصلے پر قائم ہو گئی تھی۔

گمان غالب ہے کہ اس شہری نو آبادی میں ہی حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ کا سکونتی مکان واقع ہوگا۔ کیونکہ خانۂ خدا کے متصل یا نزدیک کا علاقہ "حرم" تھا اور وہاں مکان بنانا ممنوع تھا۔ البتہ قصیٰ نے صدیوں پرانی روایت کو توڑا اور بیت اللہ کے متصل اور نزدیک رہائش رکھنے کی اجازت اپنے خاندان کے لوگوں کو عطا کی اس بنا پر کہ وہ مقدس خاندان کے لوگ ہیں اور انہیں کعبۃ اللہ کے نزدیک رہنے کا حق پہنچتا ہے۔[63] حالاں کہ قبل ازیں حدودِ حرم کے اندر رہائش رکھنا اور مکان بنا کر رہنا تقدس اور احترام کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ عجب نہیں کہ اس خرابے میں اللہ کے گھر کے بعد تعمیر ہونے والا پہلا سکونتی مکان خدا پرست اور خدا شناس اسماعیلؑ کا ہو۔ بعد میں اردگرد کی وادیوں میں اور پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے قبیلے بنی جرہم کے بدو اس جگہ مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے۔ پانی کی بہم رسانی، زائرین کے قافلوں، اور تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت کی بدولت حضری زندگی کے کم و بیش تمام اسباب فراہم ہو گئے۔ قرآن کی درج ذیل آیات پر اگر گہری نظر سے غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ نو تعمیر شہر میں نہ صرف دور و نزدیک سے آنے والے قافلۂ حجاج کا تانتا بندھ گیا بلکہ تجارتی سرگرمیوں کو بھی بہت فروغ ملا: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِيَشْهَدُوا

۶۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد ۳ تحت لفظ مسجد۔

۶۲۔ شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ ج ۲۔ ص ۳۱ - ۲۳۰۔

۶۳۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۱۴

منافع لھم ــــــ ۶۴ (اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو تاکہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی رونق اور اسی مناسبت سے اس کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی اور جلد ہی یہ شہر ایک بین الملی حیثیت اختیار کر گیا جہاں بنی جرہم کے علاوہ بھی افراد اور قبائل آکر رہنے بسنے لگے۔ سورۃ الحج کی ان آیات سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ تو تعمیر شہر مکہ میں نو وارد لوگوں کی آمد سے جو مسائل پیدا ہو رہے تھے، انھیں نمٹانے کے لیے ایک اصول طے کر دیا گیا کہ مقامی اور باہر سے آنے والے لوگوں کے حقوق وہاں برابر ہیں۔ زیارت بیت اللہ کے علاوہ سکونت کے لیے بھی یہی اصول کارفرما تھا: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا وَیَصُدُّونَ عن سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی جعلنٰہ للناس سوآء ن العاکف فیہ والباد ط ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم[65]۔ (جن لوگوں نے کفر کیا اور جو آج اللہ کے راستہ سے روک رہے ہیں اور اس مسجد حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے۔ جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (اور ان کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے) اس (مسجد حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔)

ہمارے خیال کی تائید رسول اللہؐ کے ان الفاظ سے بھی ہو سکتی ہے: "۔۔۔۔ حرمہا اللہ لا یحل بیع رباعہا ولا اجارۃ بیوتہا"[66]

مکہ کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے۔ اس کی زمینوں کا بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے۔ اور ایک دوسری روایت کہ عہد عثمانؓ تک مکہ کی زمینیں سوائب (افتادہ یا شاملات) جس کو ضرورت ہوتی وہاں رہتا تھا اور جب ضرورت نہ رہتی، دوسرے کو ٹھہرا دیتا۔"[67]

اسی اصول کے مطابق حضرت ہاجرہؑ نے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق بنی جرہم کو مکہ میں رہائش رکھنے کی عام اجازت عطا کر دی۔ ان دلائل اور تشریحات سے واضح ہوتا ہے کہ شہری منصوبہ بندی (TOWN PLANNING) کے متعلق بیان کردہ متذکرہ صدر اصول حضرت اسماعیلؑ کی زندگی ہی میں طے پا چکے تھے۔ لہٰذا عارضی یا مستقل سکونت رکھنے والوں کے لیے وافر شاملات کی آسانی دستیابی، عاکف و باد کے لیے مساوی حقوقِ شہریت (CIVIL RIGHT AND LIBERTIES) اور بلد امین کا روح افزا ماحول ظاہر ہے، آباد کاروں کے لیے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ لہٰذا شہر نو صرف مذہبی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ آباد کاری کے لحاظ

۶۴۔ القرآن : الحج آیت ۲۸-۲۷۔

۶۵۔ ایضاً ۲۵۔

۶۶۔ مودودی: تفہیم القرآن جلد ۳ ص ۲۱۶ بحوالہ ابراہیم نخعی

۶۷ ایضاً جلد ۳ ص ۲۱۶ بحوالہ مجاہد عن علقمہ بن نضلہ۔

سے بھی "جمع ہونے کی جگہ" (بکہ) بن گیا۔ ہمارے خیال میں بکہ کے اصطلاحی معنی "آبادی" کے ہیں۔ اور ممکن ہے یہ لفظ سلاحقہ یا لاحقہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس طرح بکہ اسماعیلؑ (یعنی اسماعیلؑ کا بسایا ہوا شہر، اسماعیل کا گاؤں اور آبادی)۔ تاہم اس ضمن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ بات کم و بیش ثابت شدہ ہے کہ موجودہ نام ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا اپنا تجویز کردہ ہے[۶۸] یا اسی زمانے میں یہ نام معروف و مشہور ہو چکا تھا۔

یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ دنیا کے سب سے بڑے آبادکار تھے، ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے انہوں نے کئی اقوام و ملل تک پیغام خداوندی پہنچایا اور اسی وجہ سے ان کا نام ابراہیم: قوموں کا باپ پڑ گیا۔ وہ کئی نو آبادیوں کی نیو پہلے بھی ڈال چکے تھے۔[۶۹] مکہ کی طرح ان کی بسائی ہوئی رملہ اور ایلیا کی بستیاں بھی آج تک موجود ہیں۔ اشاعت پیغام خداوندی کے لیے ابراہیمؑ نے اب کی مرتبہ جس جگہ کا انتخاب کیا وہ اپنے محل و قوع سیاسی اہمیت اور دفاعی نقطۂ نظر سے پہلے انتخابوں کے مقابلے میں بہت بہتر ثابت ہوئی۔ یہ کہنا کہ چونکہ اتفاقاً وادی مکہ میں چشمۂ آب اُبل پڑا اس لیے وہاں شہر بسایا گیا کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال میں جگہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا اور شہر کی تعمیر کے وقت باقاعدہ نقشہ ذہن میں رکھا گیا تھا۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق اپنے عہد کی سب سے زیادہ متمدن قوم سے تھا، وہ جس شہر میں پیدا ہوئے وہ تعمیر اور منصوبہ بندی کے لحاظ سے بہت منفرد حیثیت کا حامل ہے۔[۷۰] وہ نو آبادیاں قائم کرنے کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔

۶۸- حسنین ہیکل، حیاتِ محمدؐ

۶۹- طبقات ابن سعد جلد ۱

۷۰- ابراہیمؑ کا شہر اور جسے اُر اور عور بھی لکھا جاتا ہے اور جسے عراق میں "مقبر" کہتے تھے کی کھدائی ۱۹۲۷ء میں سات میٹر تک کی گئی اور وہاں سے سولہ مکانات کی بنیادیں برآمد ہوئیں اور پانچ عام سڑکیں بھی برآمد ہوئیں۔ مکانات اینٹ کے بنے ہوئے تھے، ان میں ایک مکان شاہ لبید عشتاؤ کا بھی ہے جو ۲۰۰۰ قبل مسیح میں حکمران تھا۔ اس شاہی محل پر معمار کا نام بھی کندہ ہے۔ مکانات کی بنیادیں جو اب تک کھڑی ہیں پانچ چھ میٹر بلند ہوں گی۔ چند ستونوں کے آثار بھی ملے ہیں۔ بعض مکانوں کے باورچی خانہ میں اینٹ کا چولہا بھی ملا ہے ہر گھر میں ایک بہت بڑا صحن ہے، جس کے کنارے کنارے مختلف النوع پھولوں کے درخت لگے ہوتے تھے۔ اُور کے باشندے مکانوں کے اندر مردوں کو دفن کرتے تھے کیوں کہ مکانوں کے اندر انسانوں کی ہڈیاں ملی ہیں۔ ایک مکان سے قیمتی کتب خانہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں تاریخ، ادب، علوم ریاضی کی کتابیں ٹھیکروں پر لکھی ہوئی موجود ہیں۔ چند سو میٹر کے فاصلے پر ایک قدیم قبرستان برآمد ہوا ہے جو ساڑھے تین ہزار سال قدیم پرانا ہے۔ مردوں کو کفن پہنا کر چٹائیوں پر لٹا کر قبر میں لٹاتے۔ میت کے سرہانے برتن رکھتے جن کے آثار آج تک موجود ہیں بعض قبروں میں تانبے کے اوزار بھی ملے ہیں جن پر نقش و نگار ہیں۔ دیگر سامان زیبائش کنگھی وغیرہ بھی ملے ہیں جن میں بعض سونے اور چاندی کے ہیں۔ بابلی افواج نے ۱۹۰۰ ق م میں اس شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ بعد میں یہ شہر دوسری جگہ بسایا گیا۔ (معارف اعظم گڑھ: جلد ۲۱: ۱ جنوری ۱۹۲۸ء حصہ ۵۹-۵۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

مکہ کے صفاتی نام کئی ہیں۔ بلد امین[۷۱]۔ باسّہ[۷۲]۔ ام رحم۔ الحاطمہ[۷۳] معطشہ۔ عرس۔ صلاح[۷۴]۔ بطحا[۷۵]۔ ام القریٰ۔ مقدسہ قادسیہ۔ قریۃ النمل۔ معاد۔ ملیبہ۔ عروض[۷۶] وغیرہ۔ یہ نام بعد میں کسی خاص صفت کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

وادی مکہ شمالاً جنوباً ۲ دو میل لمبی ہے اور اس کا عرض کوہ جیاد سے کوہ قیقعان تک ایک میل ہے[۷۷]۔ آجکل شہر کا ممتاز حصہ وہاں آباد ہے جہاں وادی کی پہنائی زیادہ ہے۔ باقی تنگ حصہ وادی میں ایک دہجی کے طور پر سلسلہ آبادی بخط مستقیم چلا گیا ہے[۷۸]۔ حضرت اسماعیلؑ کے زمانے میں شہری آبادی شمال مشرق کی سمت کوہ قیقعان کے نزدیک واقع تھی کیونکہ خانہ خدا اور اس کے اطراف میں رہائش رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا[۷۹] اور جس جگہ اب آبادی ہے اس کا بیشتر حصہ "حرم" سمجھا جاتا تھا خصوصاً بیت اللہ شریف کے نواح میں۔ اور یہ صرف قربانی، حج، طواف اور صلوات کی رسوم و فرائض کی ادائیگی کے لیے مختص تھا۔ شہری آبادی حدودِ حرم کے اندر شامل نہ تھی۔ اور عہد اسلام سے قبل حرم کی حدود صرف خانہ کعبہ کے اندر تک محیط تھیں حتیٰ کہ ارد گرد کے ملحق مکانات بھی حدود حرم میں داخل نہ تھے[۸۰] اس طرح گویا کہ قدیم شہر دو حصوں میں منقسم تھا، مذہبی علاقہ اور شہری آبادی۔ یہ تقسیم قصیٰ کے زمانے تک قائم رہی۔

مگر قصیٰ نے شہر مکہ فتح کرنے کے بعد شہری تقسیم کی خیالی حد بندی ختم کر کے "مذہبی علاقہ" کے اندر دن سکونتی مکانات تعمیر کرنے کی اجازت دے دی اور اس طرح موجودہ شہر مکہ کی بنیاد پڑی۔ قریش کے منتشر قبائل کو پرانی آبادی میں بسانے کی بجائے، قصیٰ نے ان کے لیے نئی بستی بسانا زیادہ بہتر خیال کیا اور خانہ خدا کے چار طرف اس نے اپنی قوم کو قبیلہ وار آباد کر دیا[۸۱]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) البتہ بعض مؤرخین نے قیب جورا کو ابراہیمؑ کا آبائی شہر اور جنم بھومی بتایا ہے۔ یہ شہر ملک مابین النہرین کے شمال مشرق میں واقع ہے اسے دنیا کا قدیم ترین شہر بتایا گیا ہے۔ (معارف جلد ۳۱ ۶ جون ۱۹۳۲ء ص ۶۶-۴۶۵)

۷۱۔ القرآن۔

۷۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۱۲۔

۷۳۔ سر سید احمد خان خطبات احمدیہ ص ۳۳۶

۷۴۔ خلاصہ تاریخ مکہ: مولوی فخر الدین ص ۴۔

۷۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ (گب) تحت لفظ کعبہ ص ۳۶۹

۷۶۔ عبدالشکور: تاریخ مسجد حرام ص ۲۱

۷۷۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ تحت لفظ مسجد۔

۷۸۔ مولوی عبدالشکور: تاریخ مسجد حرام (۱۹۰۵ء) ص ۲

۷۹۔ بکری (۱۹۴۸) ص ۷۸۔

۸۰۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھکس تحت لفظ مکہ ص ۵۱۳ بحوالہ ازرقی

۸۱۔ بکری ایضاً ص ۷۸۔

نئی بستی بساتے ہیں دفاعی اور سیاسی مصلحتیں بھی بلا شبہ کار فرما تھیں، تاہم قدیم پانی کے چشموں کا بیکار ہو جانا بھی ایک وجہ تھی۔ اور ممکن ہے زمزم کی بندش[۸۲] کے بعد آب رسانی کا جو مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، قصی نے پانی کی فراہمی کا کوئی متبادل انتظام کر لیا ہو۔ پہاڑی علاقوں میں عموماً اور حجاز میں خصوصاً زمین کے اندر پانی کے سوتے خشک ہوتے یا اپنی گزرگاہ بدلتے رہتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ پرانا ذخیرہ اب ختم ہو جانے کے بعد خانہ خدا کے اندر یا نزدیک کوئی نیا چشمہ نکل آیا ہو۔ ابن سعد کی روایت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہر مکہ کے اندر قصی کے آباد کردہ شہر ہی میں آٹھ کنویں موجود تھے۔ اور تقریباً ہر قبیلے کا الگ کنواں تھا[۸۳] یہ کنویں عہد رسالت مآبؐ تک قائم رہے۔ یہ کہنا کہ صرف زمزم کا کنواں اندرون شہر واقع تھا اور باقی کنویں بیرون شہر تھے، درست نہیں ہے[۸۴] کیونکہ ابن سعد نے بڑی وضاحت کے ساتھ اور غیر مبہم انداز میں اندرون اور بیرون آبادی کے کنوؤں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا ہے اور سب کنوؤں کے نام گنوائے ہیں۔ بلاذری نے بھی مکہ کے کنوؤں کا علیحدہ باب باندھا ہے[۸۵] اور لکھا ہے کہ قصی سے قبل پہاڑ کے اوپر واقع ایک چشمہ سے پانی لایا جاتا تھا۔ حرم کے نزدیک پہلا کنواں لوی بن غالب نے کھدوایا تھا[۸۶]۔

قبل ازیں حدود حرم شاید کچھ اور تھیں۔ قصی نے جب بیت اللہ کے متصل مکانات بنائے تو غالباً حدود حرم کا تعین از سر نو کیا اور وہ یہ کہ صرف مسجد ہی اب حرم متصور ہوتی تھی۔

قریش شروع شروع میں صرف سیاہ رنگ کے خیموں میں رہتے تھے، بلکہ بعض مؤرخین کا خیال یہ ہے کہ بعثت نبویؐ سے چند پشت پہلے تک مکہ خیموں کا شہر تھا۔ ۱۰۰۰ قبل مسیح میں بھی قیدار (آل اسماعیلؑ) کا ذکر خیمہ والے کہہ کر کیا گیا ہے[۸۷] اگرچہ مکہ میں اجالہ، اجیاد اور باقیقان[۸۸] جیسے قدیم مکانات موجود تھے، تاہم اہل مکہ کی تعمیری روایات قابل فخر نہیں تھیں، ان تمام باتوں کے باوجود اگر قصی کی بسائی ہوئی بستی کی تفصیلات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بستی بے ہنگم اور بلا منصوبہ یونہی کھڑی نہیں ہو گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے مکمل منصوبہ بندی اور تعمیری نقشہ تھا۔ جو جگہ آبادی کے لیے چنی گئی وہاں پانی وافر مقدار میں دستیاب تھا تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اس جگہ ایک بڑا جنگل تھا جسے صاف کر دیا گیا[۸۹]۔ یہی لکڑی بعد ازاں تعمیرات مکانات کے لیے کام میں لائی

۸۲۔ خطبات احمدیہ سر سید ص ۲۱۱۔ نیز ابن ہشام چشمہ زمزم عبدالمطلب کے زمانہ تک بند پڑا رہا حتیٰ کہ کسی کو اس کے محل وقوع کا بھی علم نہ تھا۔ عبدالمطلب نے اس کو دوبارہ کھدوایا۔

۸۳۔ طبقات ابن سعد

۸۴۔ گب : انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۳۶۹۔

۸۵۔ بلاذری : فتوح البلدان ص ۴۴۔

۸۶۔ ایضاً ص ۴۸۔

۸۷۔ ندوی : ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۹۱۔

۸۸۔ بلاذری : فتوح البلدان جلد ۱ ص ۳-۵۲۔ ۸۹۔ ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۳۔

گئی۔ وادی کے نشیب کو مرکز آبادی مان کر کعبہ کے چاروں طرف قریش کے معزز قبائل کو اس طرح آباد کیا گیا کہ وسط میں خانہ خدا اور اس کے ساتھ ملحق قصی کا اپنا مکان : دارالندوہ — اور برابر میں معزز قبائل قریش آباد کیے گئے۔

مرکز اور وسط میں محترم و معزز قریش رہتے تھے، یہ آبادی کا اندرونی حلقہ تھا۔ بیرونی حلقہ میں جو لوگ رہتے تھے، اجتماعی زندگی میں ان کا مقام دوسرے نمبر پر تھا اور شہر کے باہر جھگیوں، خیموں میں عارضی یا مستقل سکونت رکھنے والے خانہ بدوش قبائل زائرین، نووارد اور تیسرے درجے کے شہری شامل تھے[90]۔ مکہ کا جدید شہر ایک لحاظ سے خالص قریش کا شہر تھا۔

شہر کا مرکز وادی کا نشیب (BOTTOM OF THE VALLEY) تھا۔ مرکز (بطحا) میں رہنے کی وجہ سے ان قریشی قبائل کو قریش بطحا کہا جاتا تھا[91] یا قریش الباطن[92]۔ تاہم قریش کے کئی گروہ اور خاندان پہاڑوں اور وادیوں میں ابھی تک منتشر بدویانہ زندگی گزار رہے تھے، ان کا نام قریش الظواہر[93] مشہور ہوا۔ قریش الظواہر مرتبہ، عزت اور تکریم کے لحاظ سے فروتر سمجھے جاتے تھے۔

شہر کے بیچوں بیچ شمالاً جنوباً یمنی اور شامی تجارتی کاروانوں کی آمد اور اخراج کے لیے کشادہ شاہراہ تھی۔ خانہ کعبہ کے سامنے زائرین کے اکٹھ کے لئے ایک بڑا دالان چھوڑ دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں قریش خیموں میں رہتے رہے ہوں گے۔ مگر یہ کہنا کہ عرب میں تعمیری خلا تھا اور عرب کے مکانوں پر جو ہے کی بل کا گمان ہوتا ہے، غلط ہے۔ تعمیرات کا سلسلہ بہت ہی جلد شروع ہو گیا کیونکہ چھت ڈالنے کے لئے کاٹے گئے جنگل کی لکڑیاں، شاخیں وغیرہ موجود تھیں اور دیواروں کی چنائی کے لیے سیاہ پتھر گرد و نواح کے پہاڑوں پر بآسانی دستیاب تھا۔ اہل مکہ کے مکانات قبیلہ وار اور فاصلے فاصلے پر تھے۔ اکثر مکانات کے درمیان دالان تھا۔ ایسا ہی ایک دالان رسول اللہؐ کے مکہ کے آبائی مکان کے سامنے بھی تھا۔ اہلیان مکہ کی تعمیرات کے میدان میں پسماندگی کی اصل وجہ اقتصادی پسماندگی تھی۔ مگر ولادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ایک صدی پیشتر جب کاروانوں کی تجارت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور تاجران مکہ نے خوب دولت کمائی اور اقتصادی انقلاب کے نتیجہ کے طور پر تدریجی معاشرتی تغیر رونما ہونے لگا تو نئے اور جدید مکانات تعمیر ہونے لگے اور خانہ خدا کی عمارت بھی از سر نو نئے نقشہ اور ڈیزائن سے تیار کی گئی۔

۹۰- حسنین ہیکل

۹۱- گب : انسائیکلوپیڈیا - ص ۳۶۸ -

۹۲- سید سلیمان ندوی : ارض القرآن

۹۳- ایضاً

مدینہ کی قدیم تاریخ

محمد اسلم ملک

مدینہ آرامی زبان کے لفظ MADINTA سے مشتق ہے جس کے معنی عملداری میں شامل علاقہ[1] (AREA OF JURISDICTION) کے ہوتے ہیں مگر عام طور پر یہ لفظ بستی یا قریہ کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے[2]۔

جبلِ اُحد اور جبلِ عِیر کے درمیان شمالاً جنوباً اور حَرّہ واقم اور حرّۃ الوبرہ کے درمیان شرقاً غرباً کم و بیش دس مربع میل پر پھیلا ہوا یہ علاقہ انتہائی زرخیز اور شاداب ہے۔ آب و ہوا معتدل اور خوشگوار اور پانی وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ ساحلِ سمندر سے زیادہ فاصلہ نہیں۔ یمن اور شام کے درمیان کی قدیم تجارتی شاہراہ ——— امام المبین[3]، یہیں سے ہو کر گزرتی تھی۔ اور عہدِ رسالت مآبؐ میں قریش مکہ کے رحلۃ الصیف کے کارواں یہیں سے زادِ سفر لے کر آگے بڑھتے تھے۔ جوفِ مدینہ میں پانچ زرخیز وادیاں، مُذینیب، مہزور، زانونا، بُطحان اور قناۃ ——— تھیں۔ وادیوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بستیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ یہ بستیاں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھیں۔ بستیوں کے اس مجموعہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ جب مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے اپنا علیحدہ شہر[4] بسایا۔ یہی شہر مدینۃ الرسولؐ کے نام سے مشہور ہوا اور رفتہ رفتہ یثرب کی طرح اس کا اطلاق جوف کے اندر واقع تمام آبادیوں اور قریوں پر ہونے لگا ——— یہ نام رسالت مآبؐ کے سیاسی غلبہ اور قوت کی یاد بھی تازہ کرتا ہے۔ مدینہ آنے کے بعد جوف کی ساری آبادیاں چونکہ آنجنابؐ کے ماتحت آگئیں اس لیے یہ مدینۃ الرسولؐ کہلائیں، جس کا سیاسی مفہوم تھا "رسولؐ کے زیرِ نگین علاقہ"۔

مدینہ کے کئی نام ہیں۔ بعض کے نزدیک انتیس[29][5]، بعض کے نزدیک تیس[30][6]، بعض کے نزدیک چورانوے[94][7]۔ زیادہ ناموں کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مدینہ کا ہر قریہ علیحدہ نام سے موسوم تھا مثلاً قُبا، بنی حارثہ، بنی ساعدہ، بنی قُریظہ وغیرہ۔ اندازہ ہے

---

[1] شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تحت لفظ "مدینہ" از ایف - بُوہل ص ۲۹۱

[2] ارض القرآن ج ۲ سید سلیمان ندوی

[3] القرآن نیز ارض القرآن ج ۲ ص ۲۶۹

[4] تفصیل آگے آئے گی۔

[5] شیخ رضا - محمد رسول اللہ (اردو ترجمہ) ص ۲۷۲ بحوالہ معجم البلدان (یاقوت)

[6] ایضاً بحوالہ مجد شیرازی بغوی

[7] ایضاً بحوالہ وفاء الوفا (سمہودی)

کہ ہجرتِ رسولؐ کے وقت یہاں کم از کم (مختلف بطون قبائل کی) بائیس قابلِ ذکر آبادیاں تھیں۔ دوسرے اس شہر کو چونکہ رسولِ خداؐ کا شہر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس لیے بوجہ احترام اسے کئی ناموں سے پکارا جانے لگا۔ مبارکہ، منورہ، فاسحہ، بیڈار، طابٌر، طیبہ وغیرہ۔

شہر کب آباد ہوا تاریخی شواہد کی عدم موجودگی کے سبب یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مدینہ کا شہر پہلے پہل کب اور کس نے بسایا تھا؟ اس ضمن میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ شہر بنی جُرہم نے آباد کیا جو حضرت اسماعیل کے معصر تھے (جُرہم کی ایک شاخ) اُزدکو جب عمک نے شکست دے کر وطن سے نکال دیا تو وُہ گھومتے پھرتے مدینہ میں آئے، اس زمانے میں یہودی آباد تھے[۳]

۲۔ دوسری روایت کے مطابق یہ شہر بنی عمالقہ نے آباد کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں یہ شہر نہ صرف موجود تھا، بلکہ اتنی سیاسی اہمیت کا حامل بھی تھا کہ حضرت موسیٰ نے اسے فتح کرنے کے لیے فلسطین سے ایک لشکر روانہ کیا۔[۴]

۳۔ ابن سعد کی ایک روایت سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس جگہ بنو عمالقہ رہتے رہے ہیں۔ اُن کی جائے سکوت جُحفہ تھی مگر ابن سعد ہی کے مطابق عمالقہ سے قبل یہاں عبیل آباد تھے جنہیں نکال کر عمالیق نے قبضہ کیا تھا[۵]۔ عمالیق کو بھی یہاں سے نکلنا پڑا کیونکہ طغیانیوں اور سیلابوں نے ان کی بستی کو تباہ کر ڈالا۔ عربی میں جُحفہ کا مطلب ہے "بہالے جانا"۔

۴۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ شہر کے اصل اور پہلے بانی وہی ہیں[۶]۔ بعض اور مورخین نے بھی اس خیال کی حمایت کی ہے۔[۷]

ان چاروں روایات کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ شہر بہت قدیم زمانے سے آباد ہو گیا تھا۔ قرائن اور نظائر بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ جوفِ مدینہ کا جغرافیائی محلِ وقوع، دفاعی پوزیشن، خوشگوار آب وہوا، بافراط پانی اور زرخیز وادیاں قدیم آبادکاروں کے لیے زبردست کشش رکھتی تھیں۔ مدینہ کا جغرافیائی اعتبار سے عرب سنگستانؔ سے زیادہ قریبی تعلق رہا ہے، جو مہذب اور متمدن اقوام کا قدیم ایام سے مسکن تھا۔ اس بات کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق مدینہ کے پہلے آبادکار، یثرب کو حضرت نوحؑ کی ساتویں پشت کا فرد کہا گیا ہے۔ عمالیق نے ہی

۱؎ صحیح مسلم کتاب الجہاد باب فضائل مدینہ

۲؎ صحیح بخاری و مسلم ایضاً

۳؎ بلاذری ۔ فتوح البلدان ص ۱۶ تا ۱۷ ۔

۴؎ مودودی ۔ تفہیم القرآن ج ۵ ص ۲۷۲ بحوالہ کتاب الاغانی ج ۱۹ ص ۹۴ ۔

۵؎ ابن سعد ۔ طبقات ج ۱

۶؎ مودودی ۔ تفہیم القرآن ج ۵ ص ۲۷۲

۷؎ شبلی نعمانی ۔ سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۵۸ نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مدینہ" نیز محسنِ انسانیت نعیم صدیقی ص ۱۰۔۱۰۹

۸؎ سید سلیمان ندوی ۔ ارض القرآن ج ۲ ص ۹۹-۹۸

پہلے پہل شہر بسایا تھا، جو مصر کے حکمران تھے۔ ان کے عروج کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اندازۃً یہ شہر ۱۶۰۰ قبل مسیح میں بسایا گیا ہوگا[1]۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو مدینہ مختلف اقوام کی آماجگاہ رہا ہے۔ ہر نو وارد قوم نے دوسروں کو دھکیل کر یا زیر کر کے شاداب وادیوں پر قبضہ کر لیا۔ غالباً عاد کے زمانے میں بھی یہاں آبادی موجود تھی، جو حضرت ابراہیم سے بھی پہلے ہو گزرے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت یہاں مستقل آبادی نہ ہو اور بنو عمالقہ ہی نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر کے باقاعدہ ایک قصبہ کی داغ بیل ڈالی ہو۔ عمالقہ کے بعد جُرہم اور عبیل وغیرہ کے قبیلے بھی یہاں آباد رہے ہوں شاید اُنہی کی نسل کے باشندے عہدِ رسالتمآب میں مدینہ میں رہتے تھے[2]۔ گو سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے اُن کی کوئی وقعت نہ تھی بلکہ وہ اپنی انفرادی حیثیت بھی گم کر چکے تھے۔ عہدِ رسالت کے مدینہ میں ایسے کئی قبائل کے نام نظر سے گزرتے ہیں جو یہود کی کسی معروف شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور نہ اوس و خزرج میں سے کسی کے ساتھ ان کا سلسلۂ نسب ملتا تھا مثلاً بنی ثعلبہ۔ اس لیے اکثر مورخین نے انہیں یا تو سہواً یہودی لکھ دیا یا صرف یہ کہہ بات ختم کر دی کہ فلاں جو فلاں[3] قبیلے کے موالی ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ مدینہ کے قدیم آبادکاروں کے باقیات تھے۔

مدینہ کا قدیم نام مدینہ کا سب سے قدیم نام جس کا سراغ تاریخ میں ملتا ہے، یثرب نہیں بلکہ سَلَع ہے۔ توریت میں متعدد مقامات پر مدینہ کا ذکر اسی نام سے کیا گیا ہے[4]۔ سَلَع مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے جو جوفِ مدینہ کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ اس کے دامن میں زمانۂ قدیم کے کھنڈرات عہدِ رسالت مآبؐ تک موجود تھے[5] اور مسجد نبوی بھی کھنڈرات پر تعمیر کی گئی تھی[6] ——— سَلَع یا صَلَع جسے سَلاع اور صلاع بھی لکھا اور پڑھا جاتا ہے، کا مخرج ایک ہی ہے[7]۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے، عربی میں اس کا مترادف رقیم ہے جسے یونانی پیٹرا کہتے تھے[8]۔ حَجَر بھی اسی کو کہتے ہیں۔ سَلَع، صَلَع، رقیم، حَجَر یا پیٹرا کے لفظی معنی "پتھر" کے ہیں مگر مجازاً "قریہ یا بستی مراد لی جاتی ہے[9]۔

---

[1] سید سلیمان ندوی ارض القرآن ج ۲ ص ۱۰۱

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام - بوہل لفظ مدینہ

[3] تاریخ ابن خلدون ج ۱ "وموالی بنی ثعلبہ" جو میثاق مدینہ میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہوتے تھے مگر ان کا علیحدہ نام نہیں۔

[4] کتاب السیاہ ۴۲ باب ۱۱ درس نیز دیکھئے رحمۃ للعالمین سلیمان منصور پوری ج ۱ - نیز مناظر احسن گیلانی

[5] صحیح بخاری

[6] نسائی کتاب الصلوٰۃ عن انس

[7] انتظام شہابی

[8] سلیمان ندوی - ارض ج ۲ ص ۳۲

[9] (اگلے صفحہ پر)

رقیم بہت قدیم شہر تھا۔ بنو اسرائیل کے پڑوس میں واقع ہونے کی وجہ سے اسرائیلیات میں اس کا ذکر بکثرت آیا ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ اسرائیلی اس شہر کو صَلَع یا صلاع کہتے تھے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مدینہ اور رقیم کا ذکر اسرائیلی ادبیات میں خلط ملط ہو گیا ہو۔ کتاب الآغانی کی جس روایت میں مدینہ پر اسرائیلی حملے کا ذکر کیا گیا ہے عین ممکن ہے کہ وہ حملہ رقیم پر کیا گیا ہو۔ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ رقیم پر آلِ اسرائیل نے متعدد حملے کیے۔ پہلا حملہ اس وقت کیا گیا جب بنی ادوم یہاں آباد تھے۔ حملوں کا یہ سلسلہ حضرت داؤدؑ کے زمانے تک جاری رہا تاآنکہ یہ شہر سلطنت داؤدؑ کا جزو بن گیا۔[۱]

یہود کی آمد مدینہ کی قدیم تاریخ پر پردہ پڑا ہوا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کیا کچھ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ یہود کی مدینہ میں آمد کے متعلق بھی یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی اور اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

۱۔ یہودی خود اس بات کے دعویدار ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے آخری زمانہ میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر دے کر انہیں بھیجا گیا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے یہ ہدایت دی تھی کہ فتح حاصل کرنے کے بعد مدینہ کے مشرکوں میں سے کسی ایک متنفس کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ حملے کے بعد یہودیوں نے مدینہ کے بادشاہ کے ایک نوخیز لڑکے کے سوا تمام لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس لڑکے کو لے کر جب فلسطین پہنچے تو حضرت موسیٰؑ وفات پا چکے تھے اور ان کے جانشینوں نے لشکر پر یہ الزام عائد کر کے کہ انہوں نے نبی کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے، سخت تادیبی کارروائی کی دھمکی دی۔ مجبوراً اہلِ لشکر وہاں سے نکل کر مدینہ میں لگ بھگ ۱۲۰۰ قبل مسیح کے آباد ہو گئے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

[۹] عرب کے اکثر قدیم شہروں کے نام کا معنیٰ "قریہ" یا "آبادی" ہوتا ہے۔ مثلاً بکہ، بلد، وادی القریٰ، دومۃ الجندل (پتھر کا بنا ہوا شہر) اور اس کے مقابلے میں دولۃ الحرا (اس شہر کی تعمیر تراشے ہوئے پتھروں کے درمیان لکڑی کے بلاک رکھ کر کی گئی — بلاذری۔ فتوح البلدان ص ۹۲) اور دنیا کے عظیم آباد کار حضرت ابراہیمؑ کے آبائی گاؤں اُر یا عور۔ رقیم، حجر یا ہجر سب کا مطلب آبادی یا بستی ہوتا ہے۔ عور یا اُر کا لفظ سفر کرتے کرتے جنوبی ہندوستان پہنچا تو جب بھی اس کے معنوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی (حمید اللہ — مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ) جو اور لفظوں کے لاحقہ کے طور پر استعمال ہو کر شہر / قریہ کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مثلاً منگلور وغیرہ۔

عرب جس کے معنی ویرانہ (بقول قرآن وادٍ غیر ذی زرع) ہوتے ہیں اس کے باشندے مستقل سکونت اختیار کرتے تو اس کا نام "ہی بستی" پڑ جاتا۔ جس طرح لفظ "ہجر" ہے جو حبشی یا سامی زبان کا لفظ ہے جب کوئی خانہ بدوش بدویت کو خیرباد کہہ کر شہری زندگی اختیار کر لے اسے ہجر کہا جاتا ہے۔ شروع شروع میں عرب کے شہر پتھر سے بنتے ہوں گے اس لیے ان کا نام ہی "پتھر" یا "پتھر کا بنا ہوا شہر" پڑ گیا ہوگا۔ مثلاً دومۃ الجندل، رقیم، صَلَع اور سَلَع۔

[۱] سلیمان ندوی، ج ۲، ص ۳۵

اس روایت میں یہ بات غور طلب ہے کہ یہودی خود بھی مدعی نہ تھے کہ مدینہ میں آباد ہوتے وقت انہیں سیاسی غلبہ یا قدرت حاصل تھی بلکہ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے یہاں سیاسی پناہ حاصل کی تھی۔

۲. بخت نصر کے حملہ (۵۰۰ قبل مسیح) میں جب بنی اسرائیل تتر بتر ہوئے تو اُن کا ایک گروہ مدینہ میں آکر بس گیا۔

۳. ۷۰ء میں فلسطین پر رومی حملے کے بعد ۱۳۲ عیسوی میں جب یہودیوں کو وطن سے نکالا گیا تو یہ مدینہ، تیما، وادی القریٰ وغیرہ میں آکر پناہ گزین ہو گئے۔[1]

مورخین کا ایک طبقہ موخر الذکر رائے کو درست خیال کرتا ہے مگر ان روایات کا تجزیہ کیا جائے تو نہایت دلچسپ پہلو سامنے آئیں گے:

یہودیوں کے فلسطین سے نکلنے کی وجہ یا تو شدید داخلی اختلافات تھے یا حملہ آوروں کی تباہ کاریوں نے انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلسطین سے یہودی مختلف اوقات میں مختلف اسباب کی بنا پر ترکِ وطن کر کے مدینہ اور دوسری جگہوں پر پناہ لیتے رہے۔ بعید نہیں کہ پہلا یہودی قافلہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں یا اس کے بعد کے زمانے میں یہاں پہنچا ہو۔ پھر بخت نصر کے حملے اور رومیوں کی یلغار کے بعد بھی یہودیوں کے گروہ مدینہ میں آ گئے ہوں۔ اس طرح بتدریج ان کی تعداد بڑھتی گئی جمعیت فراہم ہونے کے بعد انہوں نے مدینہ کی سیاست پر قبضہ جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے اور موقع پا کر سیاسی غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ دُوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے یہود کی مدینہ میں آمد کو اسی تاریخ سے شمار کیا ہے اور اس سے پیشتر ان کے مدینہ میں ہجرت کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا حالانکہ مدینہ میں یہودیوں نے پہلے پہل پناہ حاصل کی اور انہیں سیاسی قوت پکڑنے میں کئی صدیاں لگیں مگر اس سے بہت پہلے یہودی یہاں پہنچ چکے تھے ———
شاید سب سے اخیر میں نقلِ مکانی کر کے آنے والے بنی نضیر اور بنی قریظہ تھے۔ یہ یہودیوں کے ۱۲ قبیلوں میں[2] سب سے زیادہ ممتاز[3] اور دولت مند تھے۔ انہیں باقی یہود کے مقابلے میں اپنے حسب و نسب[4] کے خالص ہونے پر فخر تھا۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہود کے وُہ گروہ جو بہت پُرانے زمانے سے مدینہ میں آکر بس گئے تھے، باہمی شادیوں[5] اور معاشرتی ارتباط کی وجہ سے باقی عربوں میں خلط ملط ہو گئے ہوں گے۔

---

[1] مودودی - تفہیم القرآن ج ۵ ص ۱۷۱ — ۳۷۰

[2] ایضاً نیز فلپ کے ہٹی "تاریخِ عرب" وغیرہ۔

[3] شبلی (سیرت ج ۱ ص ۲۵۸)، نے ۱۲ قبائل بتائے ہیں زیادہ صحیح ۱۲ ہے۔

[4] عارف - اعظم گڑھ سیر الصحابہ ج ۱

[5] باہمی شادیوں کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ کعب بن اشرف کی ماں اسدی تھی اور وہ اشراف و سرداران یہود میں شمار ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے فرستادہ لشکر کی روایت مبہم اور خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے البتہ اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے رقیم پر فوج کشی کے لیے مہم روانہ کی، اور یہودی لشکری لوٹ کر واپس گئے تو داخلی اختلافات یا سیاسی انتشار کے سبب وطن سے نکل کر مدینہ (سلع) میں آکر بس گئے اور اسرائیلی روایات میں یہ غلط فہمی سلع (رقیم، اور سلع (مدینہ، کی لفظی (اور معنوی) مشابہت کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں، جیسا کہ ہم نے دیکھا، مدینہ سلع کہلاتا تھا۔

یہود کا بسایا ہُوا شہر یثرب

یہود جب مدینہ میں پہنچے تو یہاں کوئی مستقل قریہ نہ تھا بلکہ مکانات اور آبادیاں منتشر شکل میں تھیں جن کے گرد کھیتی باڑی ہوتی تھی[۱]۔ یہاں کے قدیم باشندوں نے اپنی مدافعت کیلئے چھوٹے قلعے (آطم: آطام) بنائے ہُوئے تھے۔ یہ قلعے یمنی طرزِ تعمیر سے مشابہت رکھتے تھے[۲]۔ یہودیوں نے یہاں آنے کے بعد مضبوط اور مستحکم قلعے تعمیر کیے اور اپنا علیحدہ شہر بسایا۔ اس کا نام 'یثرب' تھا۔ یثرب آرامی زبان کا لفظ ہے۔ یونانی اسے ATTREPPA[۳] کہتے تھے۔ جب یہود کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تو انہوں نے سیاسی غلبہ حاصل کر کے باقی لوگوں کو اپنا مطیع و دستِ نگر بنا لیا اور زرخیز وادیوں پر قبضہ کر لیا[۴]۔ ان کے سیاسی عروج کا آغاز اندازۃً دوسری صدی سے ہوتا ہے۔ شہر کے قدیم باشندوں کا سیاسی انتشار یہودیوں کے غلبہ اور اقتدار کا سبب بنا ہوگا۔ قوت حاصل کرنے کے بعد یہودیوں نے شہر کی بستیوں کو منظم کیا۔ زراعت کو ترقی دی، تجارت کو فروغ دیا۔ رفتہ رفتہ یہود کے آباد کردہ شہر کی مناسبت سے جوف کی ساری آبادیوں کے مجموعے کو بھی یثرب کہا جانے لگا۔ یہی نام عہدِ رسالتمآبؐ تک مشہور و معروف تھا۔ آں حضورؐ نے مدینہ آنے کے فوراً بعد یثرب کا نام بدل دیا[۵]۔ کیونکہ اوّلاً یہ نام یہودیوں کے سیاسی عروج اور غلبہ کی یادگار تھا، ثانیاً یہ لفظ ظلم و تعدّی، بُرائی اور خرابی کے معنی دیتا ہے اور آنجنابؐ کو یہ نام ناپسند تھا کیونکہ آپؐ مجسم رحمت اور سراپا نیکی بن کر آئے تھے۔ قرآن مجید[۶] میں اللہ تعالےٰ نے مدینہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے تو اس واضح تصوّر کے ساتھ کہ یثرب جاہلیت اور بُرائی کا نمائندہ ہے اور مدینہ اسلام اور شوکتِ اسلام کا آئینہ دار۔

---

[۱] مستشرقین (برِل — انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: لفظ مدینہ) کی یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کھیتی باڑی کا آغاز یہود نے کیا اور یہ کہ یہود کی آمد سے پہلے مقامی باشندے خود رو کھجوروں کے باغات پر ہی گزران کرتے تھے مگر کاشتکاری سے نابلد تھے۔ البتہ یہودیوں نے کاشتکاری میں جدّت پیدا کر کے اسے ترقی دی۔

[۲] گستاولی بان: تمدّن عرب (اردو ترجمہ) نیز الفِ بوہل

[۳] ندوی۔ ارض ج ۲

[۴] منٹگمری واٹ "محمدؐ مدینہ میں"۔ تفصیلی بحث اس موضوع پر آگے آئے گی۔

[۵] صحیح مسلم: باب تفاصیل

[۶] القرآن سورہ المنافقون آیت ۸، سورہ توبہ آیت ۱۰۱ (خصوصاً) سورہ الاحزاب: آیت ۱۳/۶۰

جس قریہ کی مناسبت سے جوف کا سارا خطہ یثرب کے نام سے مشہور تھا، وہ قریہ رسالتمآبؐ کے زمانے میں کہیں موجود تھا۔

یثرب کہاں واقع تھا؟

یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یثرب کس جگہ آباد تھا؟ تاہم بوہل کی رائے کے مطابق یہ مدینہ کے موجودہ قصبہ کے انتہائی شمال میں واقع تھا۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

THESE SCATTERED SETTLEMENTS ONLY GRADUALLY BECOME CONSOLIDATED TO A TOWN-LIKE AGGLOMEVATION, WHICH HOWEVER LAY FARTHER NORTH THANTHB LATER TOWN AS THE NAME, YATHRIB, ACCORDING TO SAMHUDI, WAS ESPECIALLY ASSOCIATED WITH A PLACE WEST OF THE TOMB OF HAMZA WHERE THE BANU HARITH SETTLED.[۱]

یعنی وہی جگہ جہاں جنگِ اُحد لڑی گئی۔ عُنیین اور جبلِ اُحد کے درمیان جہاں آپؐ نے تیر انداز مقرر فرمائے تھے غالباً اسی جگہ یثرب کا قصبہ تھا۔ عہد رسالتمآبؐ میں وہاں مکانات اور باغات تھے، جو اَب باقی نہیں رہے۔[۲] یہ بات واضح نہیں کہ آیا یہی مکانات یثرب کے باقیات میں سے تھے یا یثرب کی بربادی کے بعد کہیں قرب وجوار میں کچھ اور لوگوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا تاہم عہد نبویؐ کے لوگوں کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ یثرب کس طرف واقع تھا؟ عموماً بنو حارثہ، بنی وائل، بنی حنظلہ، بنی واقف اور وادیٔ قناۃ اور عنیین کے ساتھ واقع قریوں کو "یثرب کا علاقہ" سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے بھی اس کی طرف لطیف اشارہ کر کے اس کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کیا ہے۔

جنگِ احزاب کے موقع پر خندق کھود کر مدینہ کے تمام قصبات اور آبادیاں محفوظ نہ بنائی جا سکی تھیں خصوصاً انتہائی شمال میں واقع بنی حارثہ، حنظلہ وغیرہ کی بستیاں خندق سے باہر رہ گئی تھیں۔ جنگ کا زور بندھا تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ قرآن نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا[۳]

(جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے اہل یثرب اب ٹھہرنے کا موقع نہیں، پلٹ چلو اور جب ان میں سے ایک فریق اجازت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے۔ مگر، دراصل وہ میدانِ جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے)

---

۱ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ بوہل۔ تحت لفظ مدینہ

۲ محمد حمید اللہ۔ عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۲۱

۳ القرآن سورہ الاحزاب آیت ۱۴

بنی حارثہ وغیرہ نے اپنی بستیوں کے لیے یثرب کا لفظ استعمال کیا ہے یا تو ان کی بستیوں کو یثرب کہا جاتا تھا، یا یثرب کا قریہ اسی طرف کہیں واقع ہوگا۔ موخر الذکر صورت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

یہود نے یثرب کی سکونت کیوں ترک کی؟

یہود کا قصبہ اگرچہ جوفِ مدینہ کے شمالی جانب وادی قناۃ کے نزدیک تھا، مگر ہجرتِ (رسولؐ) کے وقت اکثر یہودی قبائل خصوصاً ذی حشمت قبائل نضیر، قریظہ وغیرہ جوف کے انتہائی جنوب مشرقی سمت وادی مہزور اور وادی زنیئب میں آباد تھے۔ یہ تغیر کیسے رونما ہوا؟ یثرب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، طغیانیوں کے سبب برباد ہوگیا ہوگا۔ اور یہودی وہاں سے نقلِ مکانی پر مجبور ہوگئے ہوں گے۔ معلوم رہے کہ وادی قناۃ اور جبل اُحد کی طرف سیلاب اور طغیانیاں اکثر آتی رہتی ہیں عہدِ نبیؐ کے بعد وہاں اتنے شدید سیلاب آئے کہ شہدائے اُحد کی قبریں اکھڑ گئیں اور شہداؑ کے جسد خاکی ظاہر ہوگئے۔ حضرت حمزہ کا مزار اسی وجہ سے دوسری جگہ بنایا گیا[1]۔ عہدِ رسالت میں وہاں جن آبادیوں کا ذکر ملتا ہے وُہ بھی بہہ گئیں کیونکہ انکا اب وہاں نام و نشان باقی نہیں رہا ہے[2]۔ یہود کی نقلِ مکانی کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے اور وُہ یہ کہ یہودی جب مدینہ آئے تو ایک طویل مدت تک وہ شمال میں اپنے قصبہ یثرب میں مقیم رہے۔ جب انہیں بتدریج سیاسی برتری حاصل ہُوئی تو وُہ جوف کے وسط میں آکر آباد ہوگئے[3]۔ یہود کی یہ جدید آبادی جبلِ سلع کے دامن میں، مدینہ یا اس کے آس پاس کہیں ہوگی۔ جبل سلع اور اس کے ساتھ کی دیگر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو دفاعی نقطۂ نظر سے جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر اقتدار حاصل ہونے کے بعد یہود کی نقلِ مکانی بالکل فطری نظر آتی ہے۔ پھر یہاں کا پانی میٹھا اور زمین بمقابلہ شمالی علاقے کے زیادہ زرخیز اور شاداب ہے۔ علاوہ ازیں نئی جائے سکونت کو سیاسی اعتبار سے جو مرکزیت حاصل ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اوس اور خزرج کی آمد کے بعد یہود اور ان نوواردوں کے درمیان جب اقتدار کی کشمکش شروع ہُوئی تو خزرجیوں نے غیر ملکی امداد اور تعاون سے یہود سے اقتدار چھین لیا۔ زرخیز زمینوں سے انہیں بے دخل کرکے علاقے کے مرکزی قصبہ پر خزرج کی شاخ بنی النجار نے قبضہ کر لیا[4]۔ عہدِ رسالتمآبؐ تک یہ قبیلہ اسی جگہ آباد تھا۔ رسولِ خدا کی آمد کے وقت بنی النجار جن مکانات میں رہائش پذیر تھے وہ بھی شاید یہود کی مِلک تھے جن پر النجار نے قبضہ کر لیا تھا یہُود وہاں سے نکل کر انتہائی جنوب مشرق میں چلے گئے اور اپنی محنت اور جانفشانی سے وہاں کی زمین کو لالہ زار بنا دیا۔ عہدِ رسالت[5] میں یثرب کا یہی خِطّہ زیادہ

---

[1] سیوطی تاریخ الخلفاء

[2] جزل اکبر حدیث دفاع نیز محمد حمید اللہ، عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۳۱

[3] منٹگمری واٹ "ISLAM AND INTEGRATION OF SOCIETY"

[4] طبقات ابن سعد و نیز سیرت ابن ہشام

[5] منٹگمری واٹ "محمدؐ بطور مدبر کے" و نیز "محمدؐ مدینہ میں"

آباد اور شاداب تھا اور انگور، کھجور اور دیگر باغات اسی جانب زیادہ تھے۔ البتہ یہود کا قبیلہ قینقاع بدستور وسطی حصے میں رہتا رہا۔ شاید اس وجہ سے کہ وُہ نضیر اور قریظہ کے شدید مخالف تھا اور بعید نہیں کہ انہوں نے اپنے ہم مذہب اور ہم نسل لوگوں کی مدد کرنے کی بجائے بنی خزرج کو امداد بہم پہنچائی ہو۔ قینقاع کی بستی ہجرتِ نبیؐ کے وقت جبلِ سلع کے مشرق میں اور رسولِ خدا کے نوآباد شہر مدینۃ الرسولؐ سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھی۔ ان کا بازار[1] بڑا بارونق اور لوگ خوشحال اور جنگ جُو تھے۔

اوس اور خزرج کی آمد

اوس اور خزرج کے قبائل یمن سے مدینہ آئے۔ یمن کے علاقہ حصن الاغراب میں جو کتبے دریافت ہُوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پر "اوس" کا لفظ کندہ ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ مدینہ کے اوس کے جدِ اعلیٰ کا نام ہے[2] اور یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ یثرب آنے سے پہلے یہ قبیلے کافی اہمیت رکھتے تھے۔ انہیں یمن کی طرف سے آنے کی وجہ سے قحطانی النسل کہا گیا ہے[3] مگر زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ وُہ عدنانی اور اسماعیلی عرب تھے[4] اور ان کا تعلق بنی اَزد کی ایک شاخ سے تھا[5]۔ اپنی ماں کی طرف منسوب کر کے ان دونوں قبیلوں کو بنو قیلہ بھی کہا جاتا تھا۔ واضح رہے کہ اوس اور خزرج دونوں سگے بھائی تھے۔

سدِ مآرب[6] کی تباہی یا باہمی[7] خانہ جنگیوں کی وجہ سے یہ یمن سے نکلے اور ڈیڑھ دو سال عربستان کے مختلف علاقوں میں گھومنے پھرنے کے بعد ۳۰۰ء[8] کے لگ بھگ یثرب میں آئے۔ یہاں یہود کا غلبہ تھا۔ ایک مدت تک تو بنی قیلہ خاموش رہے مگر جلد ہی یہود اور ان میں اقتدار اور املاک کے لیے کش مکش کا آغاز ہو گیا۔ اس ضمن میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ متضاد اور مبہم ہیں تاہم صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ یہود کے اقتدار کو سب سے پہلے خزرج کے فرد مالک بن عُجلان نے چیلنج کیا۔ اس طرح خزرجیوں نے شاہِ تُبّع ابوکرب[9] یا شاہِ غسان[10] ابو جُبیلہ کی مدد سے یہود سے اقتدار چھین کر اُن کی املاک پر ۴۹۲ء میں

---

[1] مودودی تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۷۲ و نیز نقشہ گر بول (انسائیکلوپیڈیا) میں لکھا ہے کہ بازار قینقاع کی آبادی مغربی سمت میں تھی — مگر یہ رائے درست نہیں دیکھیے لفظ "قینقاع"

[2] سلیمان ندوی ارض القرآن ج ۲

[3] فلپ کے ہٹی، تاریخ عرب، شبلی نعمانی، سیرت وغیرہ

[4] سلیمان ندوی ارض القرآن ج ۲

[5] طبقات ابن سعد

[6] ندوی ج ۲ ص ۲ نیز شبلی نعمانی سیرت ج ۱ ص ۲۰۹

[8] بلاذری، فتوح البلدان ص ۱۷ (عک کے ساتھ خانہ جنگی ہُوئی تو یہ نکل کھڑے ہُوئے) ابن ہشام کے مطابق یمن سے نکلنے کے بعد یہ عک کے علاقے میں داخل ہُوئے تو ان سے جنگ ہُوئی۔ طبقات کے مطابق یثرب آنے سے پہلے یہ طائف، مکہ وغیرہ میں مارے مارے پھرتے رہے۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

خود قبضہ کر لیا۔ اوس نے بھی خزرجیوں کا ساتھ دیا۔ خزرج اور اوس نے یہود کے تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مالک اور اس کے حمایتی شاہِ تبع اور شاہ غسان کی تو مدد کی مگر جب مالک نے عثمان بن الحویرث[۹] قریشی کی طرح اپنی بادشاہت قائم کرنا چاہی تو یہ اس کے خلاف ہو گئے۔ مالک وہاں سے فرار ہو گیا بقیہ عمر اس نے شاہِ غسان کے دربار میں مصاحب بن کر گزاری[۱۰]۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ غسان اپنی سلطنت میں توسیع اور تجارتی شاہراہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور مالک نے اس کے ایما پر یہ کارروائی کی۔ یہود کے تسلط سے اہلِ یثرب کو نجات ضرور مل گئی مگر غسانیوں کے یثرب پر[۱۱] قابض ہونے کا خواب تشنۂ تکمیل رہا۔ یہودیوں کی سیادت اور قوت ختم ہونے کے بعد خزرج کا قبیلہ بنی النجار سب سے زیادہ طاقت ور بن کر ابھرا۔ مرکزی اور زرخیز علاقے پر قبضہ جما کر اپنی قوت کو مستحکم بنانا شروع کر دیا۔ جس کے خلاف اوس والوں کے دل میں حسد اور رقابت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ نتیجۃً اوس اور خزرج کے درمیان اقتدار اور املاک کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی جو ۴۹۷ء سے لے کر ۶۱۵ء یا ۶۱۸ء[۱۲] عیسوی تک وقفوں وقفوں کے ساتھ جاری رہی۔ ان خانہ جنگیوں میں اوس اور خزرج کی مختلف شاخوں اور یہود کے قبائل کی وفاداریاں حالات کے مطابق بدلتی رہیں۔ یثرب کے گرد و نواح کے بدوی قبائل اور شاہانِ حیرہ[۱۳] نے بھی بعض لڑائیوں میں مداخلت کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔

بُعاث

اس خانہ جنگی کے سلسلے کی پہلی لڑائی سُمیر تھی اور آخری معرکہ بُعاث کا تھا۔ بعاث بنی قریظہ کا علاقہ تھا۔ اس لڑائی میں اوس کا سپہ سالار اعلیٰ حضرت اُسَید کا والد حُضَیر کتائب اور خزرج کا عَمرو بن نُعمان بیاضی تھا۔ یہ دونوں لڑائی میں مارے گئے۔ حسبِ سابق یہ لڑائی بھی غیر فیصلہ کن رہی تاہم خزرج کو زبردست ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ان کی فتح ایک دم شکست میں اس لیے بدل گئی کہ شاید اُن کے یہودی حلفاء نضیر و قریظہ نے عین موقع پر غداری کرتے ہوئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور شاید یہی وجہ تھی کہ بنی النجار اور بنی سلمہ (بطون خزرج) نضیر و قریظہ کے پرانے حلیف ہونے کے باوجود ان کی مخالفت میں شدید تھے[۱۵] عبداللہ بن ابی بن سلول —— سردار منافقین —— جو بُعاث میں غیر جانب دار رہا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ، ۸ سلیمان ندوی

۹ طبقات ابن سعد نیز انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (دوہل) تحت لفظ مدینہ اور سیرت ابن ہشام۔ ممکن ہے تبع کی امداد قیصر نیز ثابت نہ ہوتی اور آخر کار شاہِ غسان نے ہی بھرپور مدد کی ہو۔

۱۰ شبلی: سیرۃ ج ۱ ص ۲۵۹ بحوالہ وفاء الوفاء۔ اور شیخ رضا: محمد رسول اللہؐ ص ۲۶۴ بحوالہ ابن الاثیر

۱۱ محمد حمید اللہ۔ رسول اللہؐ کی سیاسی زندگی

۱۲ طبقات ابن سعد نیز سیرت ابن ہشام

۱۳ سلیمان ندوی کے خیال کے مطابق "بُعاث" کا آخری معرکہ ۶۱۵ء میں ہوا جبکہ منٹگمری واٹ ("اسلام") کا خیال ہے کہ لڑائی ۶۱۸ء میں ہوئی۔

۱۴ شیخ رضا: محمد رسول اللہ ص ۲۶۸۔ بُعاث کے معرکہ میں خزرج کے حلیف اشجع اور جُہینہ تھے جبکہ اوس کے حلفاء مُزَینہ تھے نیز دیکھئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ مدینہ

۱۵ منٹگمری واٹ "اسلام" اور "محمد بطور مدبر"

۴ ہجری میں نضیر کے جلاوطن کردیئے جانے کے فیصلہ پر اسی لیے غضبناک[1] ہوگیا تھا کہ شاید یہود کے اس قبیلہ نے لڑائی کے دوران اپنے حلفاء سلمہ و نجار کا ساتھ چھوڑ کر غیر جانبداریت اختیار کر لی تھی۔ فریقین کے اتحادیوں کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یثرب میں قبائلی نظام کی گرفت کمزور ہو چکی تھی۔ بُعاث کے معرکہ میں اوس اور خزرج کی کئی ایک شاخیں یا تو لڑائی سے علیحدہ رہیں مثلاً خزرج میں ابن ابی کا قبیلہ، اور اوس میں بنی حارثہ وغیرہ یا لڑائی میں دوسری جانب سے شرکت[2] کی جیسا کہ بنی اوس کے عبدالاشہل نے خزرج کا ساتھ دیا۔ ایسے بہت سے غیر معروف اور غیر اہم گروہ بھی تھے جن کی لڑائی میں کسی طرف سے کوئی دلچسپی نہ تھی تاہم خانہ جنگی سے پیدا ہونے والی بدامنی سے وہ نالاں ضرور تھے یعنی یہ لڑائی قبائلی اختلاف کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی بلکہ اقتصادی اور سیاسی مفادات کے لیے لڑی جا رہی تھی۔ بُعاث میں جن قبائل کو ہزیمت اٹھانا پڑی اُن کی املاک جوفِ یثرب کے وسط میں تھیں، فتح یاب گروہ کی زمینیں اس کے گرد ہلالی صورت میں جنوب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ غیر جانب دار فریق انتہائی شمال میں نسبتہً کم زرخیز اور شاداب علاقے پر قابض تھا[3] اور یہ شاید اسی لیے لڑائی میں ملوث نہ ہُوا کیونکہ کسی کے ساتھ اس کے مفادات کا تصادم تھا اور نہ براہِ راست کسی گروہ کے ساتھ اس کے اقتصادی مفادات وابستہ تھے۔ البتہ اس فریق کے سرغنہ ابن ابی کے سامنے یہ صورت تھی کہ لڑائی کے بعد اس کے سیاسی غلبہ کی کوئی صورت نکل آئے گی اور غیر جانبدار ہونے کی وجہ سے دونوں متحارب گروہ اس کی سیادت قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ بُعاث میں النجار اور سلمہ کمزور ہو گئے۔ لوگ غیر جانب دار فریق میں کٹ کٹ کر شامل ہونے لگے۔ ابن ابی نے اپنی قیادت کے لیے زمین ہموار دیکھ کر "پادشاہت" کا اعلان کر دیا۔ البتہ یہ بات محلِ نظر ہے کہ ابنِ ابی کی "بادشاہت" کا اعلان متفقہ تھا۔ ابن ابی کی پادشاہی کے متعلق کتب تاریخ و سیَر میں جتنی روایات مذکور ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی بتدریج اپنی قوت بھی بڑھا رہا تھا اور لاقانونیت سے تنگ لوگ اس کی سیادت کو امن کی تلاش میں بتدریج تسلیم بھی کر رہے تھے، مگر معاملہ کہیں راہ میں اٹک گیا کیونکہ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اس کی پادشاہت قائم ہو گئی تھی "شاہی[4] تاج" بنانے میں آخر کتنا عرصہ لگا ہوگا کہ ابن ابی کی پادشاہی کا مسئلہ تین سال تک لٹکا رہا۔ اور اگر یہود کے دوبارہ غلبہ[5] اور تسلط کے بھیانک تصور نے اوس اور خزرج کے تمام بطون کو ابن ابی کی پادشاہی پر متفق کر دیا تھا تو آخر کسی مورخ نے واضح طور پر یہ کیوں نہیں لکھا کہ اس کی پادشاہت قائم اور تسلیم ہو چکی تھی۔ النجار اور سلمہ کے لیے ابن ابی کی پادشاہی کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی

---

[1] سیرت ابن ہشام تاریخ طبرانی

[2] منٹگمری واٹ اسلام

[3] ایضاً

[4] سیرت ابن ہشام

[5] تاریخ ابن خلدون ۔ طبقات ابن سعد

اور نہ انہوں نے اسے قبول کیا۔ وقتی طور پر اگر وہ خاموش رہے تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ شکست کے بعد ان میں مزید قتل و قتال کی ہمت نہ تھی تاہم انہیں اپنی املاک سے زبردستی نکال دیئے جانے کا دھڑکا لگا رہا۔ یہ معلوم کر کے کہ اسلام کا فروغ شروع شروع میں انہی قبائل میں ہُوا جو بُعاث میں شکست کھا چکے تھے، آنحضورؐ سے عقبہ میں سب سے پہلے یہی لوگ ملے[۱] تھے اور آپؐ کی دعوت پر لبیک کہی تھی۔ عقبہ کی پہلی بیعت میں بھی یہی لوگ پیش پیش رہے تھے[۲]۔ حتیٰ کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں بھی حضرت عباس نے اہل یثرب سے تخاطب "اے گروہِ خزرج[۳]!" کہہ کر کیا۔ یہ بدیہی تاریخی حقیقت ہے کہ یثرب میں اسلام لانے والے زیادہ تر افراد کا بنی خزرج کے شکست خوردہ گروہ سے تعلق تھا یا ان کے حلیفی دائرہ میں شامل بطون اوس سے۔ ان میں بنی النجار کا خاندان سب سے آگے تھا اور یہی وُہ خاندان ہے جس کے ساتھ آں حضورؐ کا ننھالی رشتہ تھا۔ یہ آپؐ کے پردادا ہاشم کے سُسرال تھے اور اُن کے ساتھ تجارتی تعلقات بھی رکھتے تھے۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب کی انہوں نے پرورش کی تھی[۴] اور جب سردارانِ مکّہ سے ان کا تنازعہ ہُوا تو انہوں نے اس کی عملی فوجی امداد بھی کی تھی[۵]۔ بُعاث سے پہلے جب بنی الاوس کو شکست ہُوئی تھی تو مکّہ کے کفار (جو آنحضورؐ کی اس زمانے میں شدید مخالفت پر کمربستہ تھے) سے النجار (جو رسول اللہؐ کے رشتہ دار اور حلیف بھی تھے) کے خلاف امداد طلب کرنے کی غرض سے آئے تھے[۶]۔ بعید نہیں کہ شروع شروع میں بنی النجار کے لوگ، بعاث میں شکست کھانے کے بعد (۲ سال قبل از ہجرت)، رسول کریمؐ کے پاس، بنی عبد مناف کی فوجی امداد لینے کیلئے حاضر ہوئے ہوں، مگر رسالت مآبؐ نے اُن کے سامنے دُوسری بہتر صورت یعنی اسلام پیش کر کے یثرب کی ہنگامہ پرور اور آتشین سیاست کا رُخ امن و شانتی، صُلح و خیر اور تعمیر و ترقی کی طرف موڑ دیا ہو۔ تاہم ایک عظیم مدبّر اور سیاستدان ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے قبائلی گروہ بندیوں اور سیاست کے عملی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں فرمایا۔ وُہ قبائل جو ابن ابی کی قیادت کو تسلیم کر چکے تھے اُن سے کوئی تعرض نہ فرمایا مگر ان کی کڑی نگرانی کی اور ساتھ ہی ساتھ میثاقِ مدینہ ایسی شہ کار دستاویز کے ذریعے اہل یثرب کو زیادہ پائدار امن و امان کا مژدہ سنا کر ابن ابی کی قیادت کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ دُوسری طرف وہ قبائل جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی تھی ان کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی فرمائی۔ متعدد موقعوں پر آپؐ نے انصار کے سابق الاسلام قبائل کی خدمات کا اعتراف کرتے ہُوئے فرمایا: "انصار میں بہترین گھرانہ النجار کا ہے، پھر عبدالاشہل کا، اور اس کے بعد بنی ساعدہ کا[۷]"۔

۱؎ و ۲؎ سیرت ابن ہشام۔ ابن اثیر۔ طبری وغیرہ میں ناموں کی جو فہرست دی گئی ہے اس کو سامنے رکھ کر بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آں جنابؐ سے ملاقات کرنے والے لوگ النجار یا ان کے حلفاء تھے۔

۳؎ ترمذی؛ بخاری؛ ابواب ہجرۃ

۴؎ سیرت ابن ہشام

۵؎ طبری و سیرت ابن ہشام ابن خلدون میں تفصیلات ملاحظہ فرمایئے۔

۶؎ طبقات ابن سعد ابوالحیسر اشہلی جو دیگر سردارانِ اوس آئے تھے حُبیر بعاث میں مارا گیا — سیرت ابن ہشام وغیرہ۔

۷؎ صحیح مسلم و بخاری؛ ابواب تفضیل

واضح رہے کہ ان تینوں قبائل نے بعاث میں ایک فریق کے طور پر لڑ کر شکست کھائی تھی۔

قبائلی تقسیم

رسول اللہؐ کی آمد سے پہلے یثرب کی قبائلی تقسیم کچھ اس طرح تھی:

ا۔ یہود کے اکیس کے قریب قبیلے اور اُن کی شاخیں تھیں[1]

ب۔ خزرج کے پانچ بڑے بطون تھے جو مزید کئی شاخوں میں بٹے ہُوئے تھے[2]

ج۔ اوس کے بطون اور شاخوں کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ تھی۔[3]

د۔ مدینہ کے قدیم باشندے اُن کے علاوہ تھے۔[4]

ہ۔ اوس و خزرج میں یہودیت کے فروغ کی وجہ سے عربی نژاد یہود کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا جن کا ذکر ان کی سیاسی و معاشرتی اہمیت کے پیش نظر "صحیفہ مدینہ" میں علیحدہ کیا گیا ہے۔ تاریخ ابن خلدون اور سیرت ابن ہشام کے یہ الفاظ ملاحظہ کریں: وان الیھود بنی عوف انہ مع المومنین وان الیھود بنی ساعدۃ، وان الیھود بنی جشم، وان الیھود بنی ثعلبۃ[5]۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عبداللہ بن ابی نے بھی یہودیت قبول کر لی تھی[6] تاہم اس کے اپنے قبیلے میں اور اس کے حامی قبائل میں یہودیت کے اثرات قوی تھے۔

قبائل کی تقسیم در تقسیم، املاک اور اقتدار کی طویل کش مکش اور نزاع نے یثرب میں عجیب بھیانک فضا پیدا کر دی تھی۔ بعاث کے بعد اگرچہ تین چار سال کا زمانہ بظاہر امن سے گزرا مگر حقیقۃً یہ حالت جنگ سے بھی زیادہ اذیت ناک تھی۔ قتل کی اکا دُکا واردات اکثر ہو جاتی، تنہا کسی کا باہر نکلنا دشوار تھا۔ رات کو کوئی گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ تنگ آ کر لوگوں نے آطام ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی[7] جو قبل ازیں صرف لڑائی کے موقعوں پر پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے جو ایک بار اپنے آطم میں چلا جاتا اسے کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں نئے آطام بڑی تعداد میں تعمیر کیے گئے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے تو یہ قلعے پہاڑ یا حرہ پر ہی بنائے جاتے تھے مگر اب مکان پر ہی برج بنا کر اسے قلعہ بند کیا جانے لگا۔ زیادہ امیر اور طاقت ور قبیلوں کے پاس زیادہ اور مضبوط قلعے ہوتے۔ بنی زید کے چودہ آطام تھے۔ اُحیحہ بن الجُلاح کا آطم سہ منزلہ تھا۔ آطم کے اندر عموماً کنواں بھی ہوتا تاکہ

---

[1] شبلی: سیرت ج ۱ ص ۲۶۰ - زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۱۲ یہود خاندان تھے باقی خاندان یہودیوں کے حلیفی دائرہ میں شامل تھے یا اُن کے دست نگر۔

[2] شیخ رضا: محمد رسول اللہؐ ص ۹۶ - ۲۹۷ نیز سلیمان ندوی: ارض القرآن ج ۲ ص ۷۸ - ۷۷ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ مدینہ۔

[3] شیخ رضا: محمد رسول اللہ " " " " " "

[4] شیخ رضا: محمد رسول اللہ " " " " " "

[5] ابن خلدون: سیرت ابن ہشام

[6] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "ابن ابی"

[7] منگمری واٹ ISLAM AND INTEGRATION OF SOCIETY ص ۱۴ اور ۱۷

محاصرے کے وقت پانی کا مناسب انتظام ہو۔ عام اندازے کے مطابق ہجرتِ رسولؐ کے وقت یثرب میں کم و بیش یک صد قلعے تھے[1]۔

اسفل اور عالی کی بستیاں یثرب کا شہر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ عالی اور اسفل ——— عالی کی بستیاں حرّوں اور پہاڑوں کے اوپر جوف کے گرد وائروی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جنوب میں قُبا، تنیر اور انتہائی جنوب میں جبلِ عیر پر الجدر ——— مشرق میں حرہ واقم پر قریظہ، الجرف، عبدالاشہل، شمال میں خطمہ، وائل، جارتہ، مغرب میں حرہ الوبرہ کے اُوپر جہاں بستیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہُوا تھا، بنو امیہ اور بنی سلمہ رہتے تھے۔ اسفل کی آبادیاں جوف کے وسط میں نشیبی جگہ پر کم و بیش چار مربع میل علاقہ پر پھیلی ہُوئی تھیں۔ بنی ساعدہ، بلدح، بنی مُعلویہ، نقیع الخضمات، بنی النجار، رانج، قینقاع، بنی حرم اسفل کی بستیاں تھیں۔ اس کے علاوہ قابل ذکر مقامات مرید، شحر، ذرنج، مُخراف تھے۔

یثرب کی تعمیرات اور مکانات یثرب گنجان آباد علاقہ تھا۔ اہل یثرب کے مکانات چھوٹے چھوٹے اور باہم ملے ہوئے اور بلوماً اپنی ملوکہ زمینوں میں ہوتے۔ ذُباب سے جبل بنی عُبید تک عمارات کا سلسلہ قلعہ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ آبادیوں اور باغوں کا سلسلہ جنوب مغرب اور مغرب میں پھیلا ہُوا تھا۔ قُبا سے اُحد تک یہود کے محلے تھے[2]۔ مکہ میں دار (بڑے گھر) اور ان کے سامنے عموماً وسیع دالان ہوتا[3] جبکہ یثرب میں بیت (چھوٹے گھر) تھے کیونکہ یہاں جگہ کی قلت تھی۔ یثرب میں مکان کے عموماً دو دروازے ہوتے۔ ایک سامنے اور دوسرا پُشت کی جانب[4]۔ یعنی مکان دو گلیوں کے درمیان میں واقع ہوتا اور مکان کے گرد چار دیواری ہوتی۔ باغ کے گرد اکثر چار دیواری (حائط) بنائی جاتی تھی اس لیے باغ کا نام بھی حائط پڑ گیا[5]۔ اہل یثرب بعض اوقات حائط کے اندر رہائشی مکانات بنا کر رہتے[6]۔ ان کی رہائشی جگہیں عموماً تنگ اور مختصر ہوتیں اور سقیفے (چوک) بھی اسی لیے بنانے گئے تھے کہ اُن کے گھروں میں بیٹھنے کی جگہ تنگ ہوتی تھی[7]۔ تاہم یہ اجتماع گاہ یثرب کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بے پناہ اہمیت رکھتی تھیں۔ نزاع اور خانہ جنگی کے سبب یہاں مکہ کی طرح کوئی مرکزی اجتماع گاہ ———

---

[1] محمد حمید اللہ: عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۲۸،۲۷
[2] محمد حمید اللہ: امام بخاری: صحیح نیز کتاب الاموال امام ابو عبید کتاب الزکوٰۃ
[3] حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۲۹
[4] امام بخاری: ادب المفرد ص ۲۹۸
[5] صحیح مسلم و بخاری: کتاب التفسیر ولیس البر بان تاتوا البیوت من ظہورھا
[6] حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۴۴
[7] صحیح مسلم: (وغیرہ)، کتاب التفسیر۔ ابو طلحہ کا مکان اس باغ کے اندر تھا جو انہوں نے راہِ خدا میں دے دیا۔
[8] صحیح بخاری: ابواب آداب وسلام

دار الندوہ کی طرح کی تنظیم نہ ہو سکی اور نہ قائم ہو سکتی تھی۔ اہل یثرب کی اکثریت بُت پرست اور مشرک تھی۔ ان کی سب سے بڑی دیوی مناۃ —— کا بت خانہ جوف یثرب کے بیرون ساحلِ سمندر کے نزدیک واقع تھا۔ منات، غطفان، جُہینہ، اوس، خزرج اور اکناف اطراف کے مشرک بدوؤں کی مشترک دیوی تھی تاہم یثرب میں بھی چھوٹے چھوٹے بت کدوں کا سراغ ملتا ہے[1] ہر قبیلے کا علیحدہ بُت کدہ تھا اور اس کا مہنت جو عموماً قبیلہ کا سردار بھی ہوتا بت کی نگرانی کرتا[2] اور نذر نیاز وصول کرتا مگر مکہ کے علی الرغم یہاں کوئی بڑی اور مرکزی عبادت گاہ نہ تھی جو سب لوگوں کے لیے یکساں احترام اور کشش رکھتی ہو اور اہل یثرب میں سیاسی انتشار کی ایک وجہ مذہبی عدمِ اتحاد بھی تھی۔ یہود کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے بُت پرستی کا زور خاصا کم ہو گیا۔ اہل یثرب کے نزدیک تبدیلیٔ مذہب کوئی اتنا بھاری جُرم نہ تھا۔ قبائلِ عرب میں سے سینکڑوں افراد کا یہودیت اختیار کر لینے کے بعد قبیلے کے اندر رہتے ہوئے تمام معاشرتی اور تمدنی مراعات بدستور حاصل کرتے رہنا ان لوگوں کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا واضح ثبوت ہے۔ عرب کے اور شہروں میں بھی یہودی آباد تھے مثلاً جُرش۔ طائف جو خالص عربی نژاد بُت پرستوں کے شہر تھے وہاں یہود اور اُن کے باقاعدہ محلے ہونا[3] اور شمالی عربستان میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تبلیغی سرگرمیاں[4] اس بات کا ثبوت ہیں کہ عرب مذہبی معاملات میں اتنے تنگ نظر نہ تھے۔

اہل مکہ کے برعکس یثرب کے رہائشی مکانات پختہ، پتھر کے بنے ہُوئے اور عموماً دُو منزلہ ہوتے۔ مکان یا باغ کی چار دیواری بھی پتھر سے تعمیر کی جاتی[5] حضرت ابوایوبؓ انصاریؓ (جہاں آں حضورؐ نے عارضی طور پر قیام فرمایا) حضرت ابوبکرؓ[6] (جہاں عائشہ صدیقہؓ کی والدہ اُمّ رُمّان رہتیں) عُبید بن عتیک[7]، ابن ابی الحقیق، آنحضرتؐ[8] اور ابن عمرؓ[9] کے مکانات دُو دُو منزلہ تھے الضحیان کا اُطم سہ منزلہ[10] تھا جس کی اوپر کی دُو منزلیں چاندی کی طرح سفید پتھر سے بنائی گئی تھیں اور نچلی منزل

---

[1] تاریخ طبری؛ سیرت ابن ہشام۔ (مسلمان ابھی تک قبا ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ یثربی بُت خانوں سے نذر نیاز کا مال نکال کر لا وارث عورت کو لا دیتے جس کے مکان میں علیؓ ٹھہرے ہُوئے تھے)

[2] سیرت ابن ہشام؛ (عمرو بن الجموح اور قبیلہ خطمہ کی اسلام سے عداوت کی تفصیلات)

[3] محمد حمید اللہ؛ "سیاسی زندگی" نیز میدان جنگ

[4] ہیکل: سیرت (اردو ترجمہ)

[5] حمید اللہ؛ میدانِ جنگ ص ۲۰

[6] صحیح بخاری؛ ابواب ہجرت

[7] ترمذی؛ باب الملک

[8] سیرت ابن ہشام

[9] و [10] بخاری: واقعہ افک نیز ابواب آداب و احکامات

لاوا کے پتھر سے تعمیر کی گئی تھی۔ نچلی منزل آج تک موجود ہے[1]۔ زینہ عموماً کھجور کی لکڑی کا ہوتا جس سے اُترنے چڑھنے میں خاصی دقت ہوتی۔ عتیک زینہ سے گر پڑا اور اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ آنحضورؐ نے شاید کوئی جدت پیدا کی کیونکہ محدثین نے آپؐ کے زینے کے بارے میں لکھا ہے کہ اُترتے چڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا گویا زمین پر چل رہے ہیں۔

یثرب میں تہ خانوں کا بھی رواج تھا جو گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے استعمال کیے جاتے۔ لوگ اپنی قیمتی اشیا، ہتھیار، سامانِ خورد و نوش، زیورات عموماً تہ خانوں میں رکھ دیتے۔ رفاعہ بن زید کا ایک ایسا تہ خانہ تھا۔ اہلِ یثرب پانی جمع کرنے کے حوضوں کو (جب اُن میں پانی نہ ہوتا) عام حالات میں نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتے اور جنگ میں مورچہ، پناہ گاہ اور قید خانے کے بطور استعمال میں لاتے[2]۔

مکہ کے مقابلے میں اہلِ یثرب کی عمارات اور تعمیری روایات شاندار تھیں۔ مکہ میں قصی سے چند پشت قبل تک لوگ خیموں میں رہتے تھے[3]، حتیٰ کہ بعثت نبویؐ کے وقت عرب کے مقدس ترین مقام بیت اللہ کی عمارت کی کوئی چھت نہ تھی[4]۔ تجارتی فروغ کے بعد جب قریشیوں میں دولت کی ریل پیل ہوئی تو بیت اللہ کی عمارت کو گرا کر از سرِ نو بنانے کا منصوبہ بنایا گیا[5]۔ رومانوی معمار بلوائے گئے[6]۔ بڑھئی حبشہ اور قبطا سے آئے[7]۔ دومۃ الجندل کے شہر کی طرح پتھروں میں لکڑی کے بلاک جوڑ کر دیواریں اٹھائی گئیں۔ یہ حبشی طرزِ تعمیر تھا، چھت لکڑی کی ڈالی گئی۔ یہ اپنے زمانے کی مکہ میں تعمیر ہونے والی سب سے زیادہ خوب صورت عمارت تھی جسے دیکھ کر لوگ حیران و ششدر رہ گئے[8]۔ بعید نہیں کہ رؤسائے مکہ نے بھی اسی زمانے میں عظیم الشان عمارات بنائی ہوں۔ اجیاد، باقیقان اور دار اُجالہ[9] کی جگہ دار ارقم جیسے وسیع اور محفوظ مکانات تعمیر ہونے لگے ہوں تاہم یثرب اس لحاظ سے بہت آگے تھا خصوصاً ثروت مند قبائل کے مکانات عمدہ اور خوب صورت تھے۔

---

۱ محمد حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۳۴

۲ ترمذی: باب تفسیر القرآن ۳ محمد حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۳۴

۴ ندوی، ارض القرآن ج ۲ ص ۹۱

۵ تاریخ طبری

۶ ایضاً۔ بعض روایات (ابن ہشام، ابن خلدون) میں تعمیرِ نو کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ طغیانی سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ یہ صحیح نہیں (دیکھیے کریسٹ ویل۔ اور غلام یزدانی کا مضمون ارمغانِ علمی میں "خانۂ کعبہ" پر۔)

۷ غلام یزدانی ص ۲۱۵ (ارمغانِ علمی مضمون خانہ کعبہ)

۸ کریسٹ ویل: EARLY MUSLIM ARCHITECTURE ص ۳ نیز طبری

۹ ایضاً

۱۰ بلاذری: فتوح البلدان ص ۵۲ و ۵۳ پوری تفصیلات ان مکانات کی تعمیر کے بارے میں دی گئی ہیں۔

یثرب میں مقبرے بنانے کا بھی رواج تھا[1]۔ عام طور پر قبر پر کوئی نہ کوئی عمارت یا گنبد بنایا جاتا اور عبارت تحریر کی جاتی تھی[2]۔ ہر محلے کا علیحدہ قبرستان تھا، بسا اوقات گھر کے اندر میت کو دفن کر دیا جاتا تھا[3]۔ یہ غالباً یہودیوں کا رواج تھا۔ قبروں، مقبروں اور روضوں کو پختہ کیا جاتا تھا[4]۔ ظاہر ہے مکانات کی تعمیر میں بھی یہ سامان استعمال ہوتا ہوگا۔

درج بالا شواہد کی روشنی میں کریسٹ[5] ویل کی یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی کہ بعثت نبیؐ کے وقت عربوں کی تعمیری روایات مفقود تھیں اور ان کے رہائشی مکانات پر بل کا گمان ہوتا تھا۔

ہجرت کی نوعیت

ہجرت دراصل رسول کریمؐ کے دفاعی منصوبۂ جنگ کا اہم حصہ تھی[6] جس کے ذریعہ آپؐ نے ایک طرف مکہ، یمن، نجران، حبشہ، شام، بحرین اور یثرب میں منتشر اور پریشان حال مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے یثرب جیسے دفاعی، تجارتی اور اقتصادی اعتبارات سے اہم شہر پر قبضہ جما لیا اور دوسری طرف اپنے پیروکاروں سے بیعتِ حرب (عقبۂ ثانیہ) لے کر کفارِ مکہ کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے میں پہل کی اور کفار نے جوابی کارروائی کے طور پر آپؐ[7] کے قتل کر دینے کی جب قرارداد منظور کرائی تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ معلوم رہے کہ بیعتِ حرب سے قبل بھی اور بعد میں بھی دار الندوہ میں قریش نے اسلامی تحریک کو کچلنے کے سلسلے کئی اجلاس منعقد کیے مگر کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا تھا۔ آنجناب کے قتل کی قرارداد بروایت طبری بیعت کے بعد ایک اجلاس یوم الزحمۃ میں بشکل عام منظور ہوئی ——— اور دیکھا جائے تو آں جناب[8] پر ہاتھ ڈالنا سہل نہ تھا۔ ابولہب بنو ہاشم کی سرداری پر فائز ہونے کے بعد آپؐ کو "جاتی باہر[9]" کر دینے کی کوشش میں ناکام رہا تھا۔ جُبَیر بن مُطعِم جیسے سردارانِ مکہ کے علاوہ پورے عبد المناف اور حلف الفضول کے شرکاء قبائل کی حمایت آپؐ کو آخر دم تک حاصل رہی تھی ——— دار الندوہ میں سردارانِ قریش کی طرف سے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا گیا کہ محمدؐ اور اس کے پیروکار کہیں مکہ پر حملہ نہ کر دیں[10]۔ بیعتِ حرب میں حضرت عباس انصاری کی طرف سے مکہ کو بزورِ فتح کر لینے کی تجویز بھی پیش کی گئی[11]۔ یثرب کے

---

[1] موطا امام مالک: کتاب الجامع (بقیع الفرقد میں روضہ کا ذکر ہے)۔ ترمذی اور ابی داؤد۔ (روضہ خاخ کا ــ جو مدینہ سے چند میل پر تھا)

[2] نسائی: کتاب الجنائز

[3] صحیح بخاری: ابواب الجنائز

[4] نسائی: کتاب الجنائز

[5] کریسٹ ویل: "ارلی مسلم ارکیٹکچر" ص ۲

[6] جنرل اکبر خان: حدیث دفاع [7] منٹگمری واٹ: "اسلام" نیز محمد حمید اللہ: "سیاسی زندگی"

[8] سیرت ابن ہشام و تاریخ طبری۔ (اجلاس میں اس خدشہ کا اظہار کیا گیا کہ پورا خاندان عبد مناف ہم پر کہیں چڑھ نہ بول دے اگر محمد رسول اللہ پر ہاتھ ڈالا گیا۔ [9] منٹگمری واٹ: اسلام

[10] تاریخ طبری [11] ابن ہشام نیز مسلم و بخاری: ابواب ہجرت

مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد بھی مکہ میں بلوائی گئی تھی[1]۔ شاید اس وقت آں حضورؐ مکہ میں ہی اسلامی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ رکھتے ہوں۔
ہجرت، یثرب کی فتح تھی[2] اور رسول اللہؐ نے اس کی طرف پہلے سے اشارہ فرمایا تھا کہ مجھے ایسی بستی میں جانے کا حکم ملا ہے جو باقی تمام آبادیوں کو کھا جائے گی[3]۔ یثرب کے علاوہ آپ کو قنسرین اور بحرین میں سے کسی ایک مقام پر ہجرت کرنے کی اجازت ملی تھی[4]۔ طفیل دوسی نے بھی پیش کش کی[5] مگر آپؐ نے دفاعی پلان کے پیش نظر یثرب میں ہجرت کر جانے کو پسند کیا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب ہر لحاظ سے صحیح تھا اور آپؐ کی جنگی اور سیاسی بصیرت کا نادر نمونہ۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یثرب میں آپؐ بطور فاتح اور حکمران کے وارد ہوئے۔ اس کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ آپؐ کے لیے لفظ "مہاجر[6]" استعمال نہیں ہوتا تھا یعنی آپ کی حیثیت یثرب میں آنے والے دیگر مسلمانوں سے مختلف تھی۔

دار الخلافہ کے لیے جگہ کا انتخاب

یثرب میں آپؐ غیر معروف راستے سے داخل ہو کر عمرو بن عوف کے قریہ قبا میں اُترے جہاں آپؐ کا قیام چار روز رہا[7]۔ چوتھے روز یثرب کے تمام مسلمانوں کو طلب فرمایا۔ وہ ہتھیار سجائے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے۔ ان کی کل تعداد سَو تھی[8]۔ قبا سے چل کر جب بنی سالم کے محلہ میں آئے تو نمازِ جمعہ کا وقت ہو گیا۔ یہاں آپؐ کی امامت میں پہلا جمعہ پڑھا گیا۔ آگے بڑھ کر بنو النجار کے محلہ میں حضرت ابو ایوبؓ کے مکان، جہاں عارضی قیام کا فیصلہ آپؐ پہلے ہی کر چکے تھے[9]، اقامت گزین ہوئے اور مسجد نبویؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجرے تعمیر ہونے تک وہیں رہائش پذیر رہے۔ مگر اس ضمن میں روایات نامکمل اور متضاد ہیں جس کی وجہ سے اکثر مورخین کو مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان سب روایات کا نچوڑ یہ ہے کہ آپؐ نے عارضی قیام کے لیے ننھیال کی آبادی میں ٹھہرنے کا فیصلہ قبا میں ہی

---

[1] ابن خلدون: "مہاجر انصار" کے عنوان کے تحت اکثر مورخین نے علٰحدہ ذکر کیا ہے۔
[2] ابو الکلام آزاد: رسول رحمتؐ (تالیف: غلام رسول مہر)
[3] موطا امام مالک: کتاب الجامع
[4] ترمذی: باب المناقب
[5] صحیح مسلم: باب الہجرت
[6] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مہاجرین از ایف بوہل و ——— A.J. WONSINCK ———
[7] تاریخ طبری و سیرت ابن ہشام۔ (اس کے علاوہ طبری نے اور حوالوں سے دو اور سترہ دن — نسائی: کتاب الصلوٰۃ نے چودہ روز لکھا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے)
[8] طبقات ابن سعد۔ بعض اور کتب میں تعداد چالیس بتائی گئی ہے۔ یہ کل مسلمانوں کی تعداد نہ تھی (دیکھئے محمد حمید اللہ: سیاسی زندگی، اور نعیم صدیقی۔ شاید یہ کل مہاجرین کی تعداد ہو۔
[9] امام بخاری: تاریخ صغیر نیز (شبلی: سیرت ج ۱ ص ۱۵۰ حاشیہ)

کر لیا تھا۔ اس غرض سے النجار کو طلب فرمایا وہ ہتھیار سجا کر معزز مہمان کو لینے کے لیے حاضرِ خدمت ہوئے[1]۔ آپ ان لوگوں کے جلو میں بنی النجار کے محلے میں آئے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں فروکش ہوئے البتہ النجار میں سے کس کے ہاں ٹھہریں اس کے لیے قرعہ اندازی کی گئی۔ یہ قرعہ اندازی قریوں میں کسی ایک قریہ میں ٹھہرنے کے لیے نہیں ہُوئی تھی جیسا کہ بعض روایات میں کہا گیا ہے[2]۔ النجار میں سکونت اختیار کرنے کے فیصلہ کی تائید آنجنابؐ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ مسافر کسی دُوسرے قریے میں جائے۔ اور ٹھہرے تو اپنے قریب ترین رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے کیونکہ وہ اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں[3]۔ اس اعتبار سے واقعی النجار دیگر انصاری مسلمانوں کے مقابلے میں آپؐ پر زیادہ حق رکھتے تھے۔

بعد ازاں آپؐ اونٹنی پر[4] سوار ہو کر یثرب کی مختلف آبادیوں، جگہوں، قبیلوں کا جائزہ لینے کے لیے نکلے۔ صحابہؓ کی پُوری جمعیت آپؐ کے ہمرکاب تھی۔ اس طرح اپنی عسکری قوت کا مظاہرہ کر کے اہل یثرب پر اپنی دھاک بٹھا دی مگر اس سفر کی اہمیت ایک اور لحاظ سے بھی ہے۔ ایک ماہرِ جنگ اور جرنیل، ایک سیاستدان اور مدبّر اور ایک ماہرِ تعمیرات کی حیثیت میں آپؐ یثرب کا معاینہ فرما رہے تھے۔ آپؐ کی عقابی نگاہوں سے یثرب کی زندگی کا کوئی پہلو اور یثرب کا کوئی اہم مقام پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک ماہرِ جنگ کی حیثیت سے آپؐ نے جوف کا دفاعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا، آگے چل کر جہاں آپؐ کو اسلام کے دفاع کی جنگیں لڑنا تھیں، بطور سیاست دان اور مُدبّر مختلف قبائل کی قوت اور اسلام کے متعلق ان کے رویئے کا اندازہ لگایا اور بحیثیت ماہرِ تعمیرات نوزائیدہ اسلامی مملکت کا دارالخلافہ تعمیر کرنے کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب کیا۔ آپؐ اُونٹنی پر سوار جہاں جہاں سے گزرتے لوگ استدعا کرتے کہ یا رسول اللہؐ! ہمارے گھر حاضر ہیں، ہماری تعداد اور قوت زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں قیام فرمائیے۔ آپؐ جواباً فرماتے: خلو سبیلها فانها مامورة —— یہاں تک کہ آپ بنی بیاضہ، بنی ساعدہ، بنی عدی بن النجار (یہ آپؐ کے ننھیال تھے)، بنی مالک بن النجار سے گزرے اور آخرش بنی مالک بن النجار کے ہاں قیام فرمایا کیونکہ اونٹنی اس جگہ بیٹھ گئی[5]۔ یہیں مسجدِ نبویؐ تعمیر کی گئی[6] اور اسلامی حکومت کا دارالخلافہ اسی جگہ پر تعمیر کیا گیا مگر راویوں نے آنجنابؐ کے اس موخرالذکر سفر کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے آپؐ اونٹنی پر سوار ہو کر عارضی قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرنے نکلے تھے حالانکہ اس سفر کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ پھر جس جگہ اونٹنی بیٹھی وہ ویرانہ تھا اور وہاں سے حضرت ابُوایوب کا مکان

---

1. نسائی: کتاب الصلوٰۃ، صحیح بخاری: ابواب مساجد، طبقات ابن سعد
2. صحیح بخاری: ابواب ہجرت
3. صحیح مسلم: ابواب آدابِ سفر
4. طبری و سیرت ابن ہشام، قبا سے نکلتے وقت آپ پیدل تھے اور دیگر صحابہ بھی پیدل چلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اونٹنی پر سوار ہو کر اس وقت نکلے جب آپؐ ابوایوب کے ہاں فروکش ہو گئے تھے۔
5. سیرت ابن ہشام
6. صحیح بخاری: ابی داؤد (ابواب مساجد و صلوٰۃ)

بہت فاصلے پر تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اونٹنی تو اس جگہ بیٹھی ہو اور آپ قیام کرنے کے لیے ڈیڑھ دو میل دور حضرت ابوؓ ایوب کے ہاں گئے ہوں اور یہ بات بھی نہ تھی کہ اونٹنی ابو ایوب کی زمینوں میں اُتری ہو اور اس وجہ سے آپؐ نے زمین کے مالک کے ہاں عارضی قیام کا فیصلہ کیا ہو کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ زمین کے مالک النجار کے دو یتیم بچے تھے۔ تاریخی "تنقید کی کسوٹی پر کوئی روایت بھی پوری نہیں اُترتی۔ اور صحیح رائے یہی ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ کے ہاں قیام پذیر ہونے کے بعد آپؐ نے دارالخلافہ تعمیر کرنے کے لیے اونٹنی پر سوار ہو کر جگہ کا انتخاب فرمایا۔

دارالخلافہ کے لیے منتخب کی جانے والی جگہ کے متعلق جو روایات ملتی ہیں اُن میں زمین کے بارے مختلف باتیں کہی گئی ہیں ان سب روایات کو یکجا کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ جگہ ویران، بنجر، غیر آباد تھی۔ یہاں کھنڈرات اور قبرستان تھے۔ کھجور کے درخت اور کھیتی باڑی اور اُونٹ باندھنے کی جگہ تھی[1] تاہم یہ روایات متضاد نہیں ہیں بلکہ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ حاصل کردہ قطعۂ اراضی بہت بڑا تھا (اور ہونا بھی چاہیے تھا) اس میں کہیں کھنڈرات اور قبرستان تھے تو کہیں باغات اور کھیتی باڑی، کوئی حصہ آباد تھا تو کوئی حصہ غیر آباد۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کے متعلق بھی جو روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، ان میں یہ بات واضح نہیں کہ یہ اراضی النجار کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی یا سارے النجار کی مِلک تھی یا بنو ثعلبہ اس کے مالک تھے[2] اس کی صورت یہ تھی کہ چونکہ قطعۂ اراضی بڑا تھا، اس لیے کوئی ٹکڑا یتیموں کا تھا، کوئی بنو ثعلبہ اور بنی النجار کا خصوصاً قبرستان اور اُونٹوں کا باڑہ "دیہہ شاملات" ہونے کی وجہ سے پُورے قبیلے کی مشترک ملکیت تھے۔ روایات میں یہ بات بھی واضح نہیں کہ کیا آپؐ نے زمین بلا قیمت حاصل کی یا قیمت ادا کر کے حاصل کی[3]، اور یہ کہ زمین کی قیمت کس نے ادا کی؟ اصل بات یہ تھی کہ آپؐ نے بنجر اور غیر آباد (عادی) زمین اور ایسی زمین جو پہلے تو مفادِ عام بلا معاوضہ لے لی (PUBLIC UTILITY) کیلئے استعمال ہوتی تھی مگر اب وہ اس مقصد کے لیے کار آمد نہ رہی تھی مثلاً قبرستان وہ بھی بلا معاوضہ قبضے میں لے لی۔ بعد ازاں سٹیٹ پالیسی یہی رہی کہ تمام عادی زمین آپؐ نے اپنے قبضے میں لے کر حسبِ خواہش اسے تقسیم فرمایا[4]۔ البتہ زمین کے جس ٹکڑے میں کاشت کاری ہوتی تھی اس کا معاوضہ دیا گیا ہوگا۔

یہ وسیع قطعۂ اراضی اسلامی مملکت کا دارالخلافہ اور دارالامارت تعمیر کرنے کے علاوہ ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کو

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ طبری۔ طبقات ابن سعد۔ صحیح مسلم و صحیح بخاری (ابواب مساجد و ہجرت)۔ نسائی و ابی داؤد۔ (ابواب الصلوٰۃ و مساجد) وغیرہ

[2] دیکھیے صحیح بخاری (ابواب مساجد) نسائی: باب الصلوٰۃ۔ سیرت ابن ہشام

[3] دیکھیے سیرت ابن ہشام۔ طبری۔ ابن الاثیر۔ صحیح بخاری وغیرہ

[4] ابو عبید۔ کتاب الاموال ج ۲ ۲۷۲ اور ۲۹۳ (کتاب الزکوٰۃ)، نیز امام ابو یوسف: کتاب الخراج ۲۷۹ مفتی محمد شفیع، "اسلام کا نظامِ اراضی" ص ۷

بسانے کے لیے حاصل کیا گیا تاکہ وہاں بے سروسامانی کی حالت میں گھروں سے نکلنے والے لوگوں کو رہائشی مکانات یا رہائشی پلاٹ فراہم کیے جا سکیں تاہم دارالخلافہ کے لیے کچھ اور جگہیں بھی زیرِ غور آئیں۔ شاید شروع میں آپؐ قبا کو دارالخلافہ بنانا چاہتے تھے[1] اسی وجہ سے ہجرت کر کے یثرب پہنچنے والے صحابہ کو قبا میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا[2]۔ خود بھی یہیں اُترے بلکہ قبا کی بنجر اراضی بھی حاصل کر لی۔ ابن ماجہ کی اس روایت سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آں حضورؐ سے جب کہا گیا کہ آپؐ قبا میں قیام فرمائیں تو (تجویز کو نامنظور کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا قبا میں جو جس جگہ اُتر جائے وہ اُسی کی ہے ——— مگر بعد ازاں یثرب کی آبادیوں کا عمیق جائزہ لینے کے بعد قبا کو دارالحکومت بنانے کے ارادہ کو ترک کر کے اس جگہ کو منتخب کیا جہاں مدینۃ الرسول کی نو آبادی قائم ہوئی۔

یہ انتخاب ہر لحاظ سے موزوں تھا

یہ محض حسنِ عقیدت ہی نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت ہے کہ نیا شہر بسانے کے لیے آپؐ نے جس جگہ کا انتخاب کیا وہ ہر لحاظ سے بہترین انتخاب تھا:

یہ جگہ اسفل میں واقع تھی۔ جبلِ سلع کے نزدیک اور حرۃ کے مرکز میں ہونے کے سبب اس کی دفاعی اور سیاسی پوزیشن مضبوط تھی[3]۔ شہر کے جنوب اور مغرب دونوں اطراف میں بطحان اور ناقابلِ گزر باغات (جن کے گرد چار دیواری ہوتی تھی) کا سلسلہ تھا۔ تیسری جانب سلع اور دیگر چھوٹی پہاڑیاں قدرتی فصیل اور مورچہ کا کام دیتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم الایام سے یثرب میں جن اقوام کو غلبہ حاصل رہا ان کا مسکن قریب قریب اسی جگہ تھا جہاں رسول اللہؐ نے مدینہ کا شہر بسایا[4]۔

اسفل کے قبائل نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور ہجرت کے وقت 'بمقابلہ عوالی کے' یہاں اسلام کے اثرات قوی تھے۔ اسفل کی مسلمان آبادیاں مدینۃ الرسول کے مغرب، جنوب اور مشرق کے اطراف میں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، خصوصاً النجار کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور رسول اللہؐ سے قرابت داری کی وجہ سے اسلام کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے پیش پیش تھا، شہر کے قریب تھا۔ یعنی ہنگامی حالات میں بروقت امداد فراہم ہو سکتی تھی اور اس طرح شہر پر چڑھائی کرنا یا شہر کا محاصرہ کرنا قریب قریب ناممکن تھا جیسا کہ جنگِ خندق میں ثابت ہو گیا۔

عوالی کی کسی بستی کو دارالخلافہ بنانے یا عوالی کے کسی مقام پر نیا شہر بسانے میں دو رکاوٹیں حائل تھیں۔ اوّلاً آپؐ کو جغرافیائی اور سیاسی مرکزیت حاصل نہ ہو سکتی تھی، جو اسفل میں ہوئی۔ ثانیاً عوالی کی بیشتر آبادیوں میں اسلام ابھی تک نہ پھیل سکا تھا، یا پھر وہاں اسلامی اثرات بہت کمزور تھے۔ عوالی جنوب مشرق میں بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی ظفر کے یہودی اور ان کے

---

[1] منٹگمری واٹ "ISLAM INTEGRATION OF SOCIETY" ص ۱۹ نیز ابن ماجہ

[2] سیرت ابن ہشام

[3] جنرل اکبر خاں، حدیثِ دفاع

[4] بحث اُوپر گزر چکی ہے۔

[5] منٹگمری واٹ "اسلام" نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت "مدینہ" و "محمد"

حلفاء کے مساکن تھے۔ مشرقی حرّہ واقم پر سوائے بنی عبدالاشہل کے تقریباً سب غیر مسلم یا مشرک قبائل رہتے تھے۔ انتہائی شمال میں عوالی کی بستیاں بنی حارثہ، حنظمہ، لوذ اللہ، بنی حبیب، بنی وانقف، بنی ضُبیعہ تھیں۔ یہاں کے لوگ ابھی تک نہ صرف مشرک تھے بلکہ اسلام دشمنی میں شدید بھی تھے البتہ جنوب مغرب میں قُبا کی جانب عوالی کی مسلمان آبادیاں تھیں اور دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ کم اہمیت کی حامل نہ تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ قُبا کو ایک موقع پر دارالخلافہ بنانے کا ارادہ کر لیا، مگر جب اس سے بہتر جگہ میسّر آ گئی تو ارادہ بدل دیا۔

حرمِ مدینہ حرم سے مراد ہے ' OPEN CITY ' یعنی ایسا شہر جس کے اندر یا گردونواح میں جنگ ممنوع ہو جیسا کہ آجکل ' روم ' کا شہر ہے۔ حرم نیم مذہبی اور نیم سیاسی اصطلاح ہے۔ حرمِ مدینہ کا مذہبی مفہوم یہ تھا کہ اس حلقہ میں جو شخص جہاں چاہے قیام کر سکتا تھا، وہ امن اور پناہ میں سمجھا جاتا، خواہ وُہ مجرم ہی کیوں نہ ہوتا۔ حرم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ نوزائیدہ مملکتِ اسلامیہ کی حدود کا تعین ہو گیا[1]

رسول اللہؐ نے یثرب جانے کے بعد جوف د کے ایک حصّہ کو حَرم قرار دے کر مکہ والوں کی طرح اہلِ مدینہ کو محفوظ بنانے کے علاوہ اپنی سیاسی پوزیشن بھی مستحکم بنالی۔ اب رسولِ خداؐ کی اجازت کے بغیر مدینہ سے کوئی (کارواں) نہ گزر سکتا تھا۔ اس طرح اہلِ مکہ کی پوزیشن انتہائی کمزور ہو گئی۔ ان کے تجارتی کارواں اب خطروں کی زد میں تھے۔ اگر مکہ والے "حرم مدینہ" کا احترام ملحوظ نہیں رکھتے تو اُن کا حرم بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا[2]۔ دُوسرے 'حرم کی وجہ سے مدینہ میں خانہ جنگی اور انتشار ختم ہو گیا حُرمتِ مدینہ کا پامال کرنے والا، وُہ خواہ کوئی بھی ہو، رسول اللہ کے سامنے جواب دہ تھا۔ صحیفہ کے یہ الفاظ کہ ومن خرج امن ومن قعد امن — غور طلب ہیں۔ اور اس طرح آپؐ کی حکم عدولی ممکن نہ تھی اور قانونی طور پر جوفِ مدینہ کی تمام آبادیاں رسولؐ اللہ کے زیرِ نگین آ گئیں۔

یہ صحیح ہے کہ خلفشار، خانہ جنگی، قتل کی وارداتوں، املاک چھن جانے کا اندیشہ، لاقانونیت اور نراج کی وجہ سے یثرب کے لوگ سخت نالاں تھے۔ انہیں امن اور صلح کی زبردست خواہش اور ضرورت تھی۔ اسی خواہش اور ضرورت کے پیشِ نظر رسولِ خداؐ کے اعلانِ حرم جو دراصل اعلانِ امن (DECLARATION OF PEACE) تھا، کے بعد یثرب کے تمام لوگ، خواہ وہ مسلم تھے یا غیر مسلم، اپنی خود مختاری سے جزواً دست بردار ہونے پر فوراً آمادہ ہو گئے یا کم از کم کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہ کی۔ آنجنابؐ کی دُور اندیشی اور تدبّر کی یہ بہترین مثال ہے کہ مدینہ کے تمام مکین اس اعلان کے ذریعے آپؐ کی سیادت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تاہم اس اعلان کے نافذ العمل ہو جانے کے پسِ پردہ رسولِ خداؐ کی عسکری قوت اور جمعیت کا رعب بھی تھا جس نے اہلِ یثرب کی گردنوں کو اطاعت کے لیے جُھکا دیا۔ اس ضمن میں آپؐ نے جو اعلان، جسے بعد ازاں صحیفہ مدینہ میں ضمنی کے طور پر شامل کیا گیا جاری

---

[1] سیرت ابن ہشام

[2] و [3] محمد حمید اللہ: عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۱۱، ۱۲

[4] محمد حمید اللہ: سیاسی زندگی و مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ نیز منٹگمری واٹ: "محمدؐ مدینہ میں"

فرمایا۔ اس کے الفاظ غور طلب ہیں :

وانهٔ لا یحول هٰذا الکتاب دون ظالم او اثم وان من خرج امن ومن قعد امن بالمدینة الا من ظلم او اثم [1]

مدینہ کو حرم قرار دینے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ داخلی استحکام اور صحیفۂ مدینہ پر مختلف قبائل کے دستخط ثبت ہو جانے کے بعد نہایت واضح الفاظ میں صحیفہ میں حُرمت کا اندراج کیا گیا :

وان یثرب حرامٌ جوفها لاهل هٰذهٖ الصحیفه [2]

حرم مدینہ کی حدود

یہ بات واضح نہیں کہ حرم کی حدود کیا تھیں۔ صحیفہ میں "جوفِ مدینہ" کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ امام ابو یوسف نے لکھا ہے کہ حرم کا رقبہ بارہ مربع میل تھا[3]۔ صحیح بخاری و مسلم کے مطابق جبلِ عیر[4] سے جبلِ ثور تک کا علاقہ حرام تھا۔ یہ علاقہ کم و بیش بارہ مربع میل ہوتا ہے ——— تاہم اندازہ ہے کہ یہ حکم بعد کا ہوگا جبکہ مدینہ میں آنحضور کو کامل اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ محمد حمید اللہ رقمطراز ہیں[5] کہ فتح مکہ کے بعد حدودِ حرم کا ازسرِ نو تعین کر کے کعب بن مالک کی زیرِ نگرانی حسبِ ذیل مقامات پر بُرجیاں یا مُنارے تعمیر کرائے گئے۔ ذات الجیش کے ٹیلے، مُشیرب، مخیض کے ٹیلے، حفیاء، ذی العُشیرہ، تیم۔ یہ سب مقامات ایک دُوسرے سے ایک ایک منزل یعنی بارہ میل کے فاصلے پر تھے۔ جبلِ تیم پر آنحضور کے تعمیر کردہ مُنارے کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں یعنی امام مسلم، امام بخاری اور امام ابی یوسف نے حرم کی جن حدود کا ذکر کیا ہے وُہ فتح مکہ کے بعد کی متعین کردہ ہیں۔ قبل از فتح، حرم کی حد کم اور محدود تھی۔ اگر شروع ایام سے حرم کی سرحدات جبلِ عیر سے جبلِ سلع تک ہوتیں تو کفار نے دو موقعوں، جنگِ اُحد اور جنگِ خندق پر ان حدود کے اندر لشکر کشی کی اور اس طرح گویا حرمت کی پامالی کا ارتکاب کیا ——— اگر واقعی حُرمت کو توڑا گیا ہوتا تو مسلمانوں کی طرف سے لازماً ردِ عمل ہوتا۔ مگر ہمیں کوئی ایسی داخلی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کفار نے حرم کی حدود پامال کیں۔ اور نہ ہی کسی محدث و مورخ نے، ہماری معلومات کی حد تک، اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شروع شروع میں حرم کی حدود مختصر تھیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صحیفہ (جو باختلاف رائے ۲ھ تک مکمل ہو چکا تھا) میں جوفِ مدینہ کو حرام کہا گیا ہے اس تضاد کے بعد دو صورتیں ممکن ہیں : پہلی تو یہ ہو سکتی ہے کہ صحیفہ کے یہ الفاظ اضافی ہوں اور اصل مسودے میں نہ ہوں[6]۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون۔ یہ الفاظ صحیفہ مدینہ میں بطور شق درج کیے گئے ہیں۔

[2] سیرت ابن ہشام

[3] امام ابی یوسف : کتاب الخراج عن مالک بن انس ۲۴۳ ھ

[4] صحیح بخاری و صحیح مسلم

[5] محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدانِ جنگ ص ۱۲-۱۳

[6] دیکھیے وثائق السیاسیہ، محمد حمید اللہ۔ الفاظ درج ہیں۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ "جوفِ مدینہ" سے آنحضورؐ کے زمانے میں وُہ حدود مُراد نہ لی جاتی ہوں جو آجکل لی جاتی ہیں، یعنی عیر اور ثور کی بجائے اس زمانے میں شمال کے طور پر عیر اور سلع کے درمیانی علاقے کو ہی جوفِ مدینہ کہا جاتا ہو اور یہی صورت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ عیر سے سلع کا فاصلہ اندازۃً چار میل ہوگا۔ اگر اس زمانے میں اس جگہ کو جوف نہ بھی کہا جاتا ہو تب بھی یہ واقعہ ہے[1] کہ ابتدائی ایام میں حرم کی حد اتنی ہی تھی۔ اور اس خیال کی تصدیق امام ابی یوسف کی بیان کردہ اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق آنحضورؐ نے فرمان جاری کیا کہ مدینہ میں چار میل کے علاقے میں کھیتی باڑی نہ کی جائے[2] کاشت کاری سے منع کرنے کا حکم محلِ نظر ہے تاہم یہ چار میل حدِ حرم مدینہ تھی اور اتنا ہی رقبہ تھا جہاں ابتداءً اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا عظیم الشان تجربہ کیا گیا۔ دنیا میں اس سے چھوٹی کوئی اور سٹیٹ شاید معرضِ وجود میں کبھی نہیں آئی ہوگی تاہم اسلامی سلطنت کی سرحدات بتدریج بڑھتی رہیں تاآنکہ عیر اور ثور کا درمیانی علاقہ (جوفِ مدینہ) حرم قرار پایا مگر اس وقت تک اسلامی سلطنت پورے جزیرۃ العرب پر محیط ہو چکی تھی۔

اسلام میں اوّلین مسجد

دارالخلافہ مدینۃ الرسول کی تعمیر کا آغاز مسجد النبیؐ سے کیا گیا۔ یہی اسلام کی پہلی مسجد ہے، تاہم کئی مورخین اور محدثین نے مسجدِ قبا کو عہدِ اسلام میں تعمیر ہونے والی اولین مسجد قرار دیا ہے[3] اس اختلافی مسئلہ کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے چند ایک روایات بھی سامنے رہنی چاہئیں تاکہ کسی نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی رہے اور کوئی الجھن باقی نہ رہے۔

۱۔ نقیع الخضمات کی پتھریلی نشیبی جگہ جہاں ہجرت رسول سے پہلے حضرت اسعدؓ بن زرارہ مسلمانوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ بلکہ نمازِ جمعہ کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔

۲۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر جسے بیعت النساء (۲ سال قبل از ہجرت)، کے بعد آں جنابؐ نے یثرب میں اپنا نائب اور معلم بنا کر بھیجا، باجماعت نماز کا اہتمام کراتے رہے تھے۔ جگہ کا نام مذکور نہیں، تاہم اندازہ ہے کہ یہ جگہ قبا میں ہی کہیں تھی کیونکہ مہاجرین کو اسی بستی میں آکر ٹھہرنے کا حکم دیا گیا تھا اور شاید آں حضرتؐ نے قبا میں چار روزہ قیام کے دوران اسی جگہ نماز پڑھی۔

۳۔ بنی سالم کی بستی جہاں رسالت مآبؐ کی معیت میں پہلی نمازِ جمعہ ادا کی گئی۔

۴۔ مسجد النبیؐ کی تعمیر سے قبل جب آپؐ کا قیام حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مکان ہی تھا، آپؐ ہر جگہ نماز ادا فرما لیتے جہاں نماز کا وقت آجاتا۔ البتہ اُونٹ باندھنے کی جگہ پر نماز پڑھنے سے احتراز فرمایا مگر بکریوں کے باڑے میں نماز ادا فرمانے میں اباحت محسوس کی[7]

۵۔ پہلی مسجد بنی زریق ہے جہاں سب سے پہلے قرآن پڑھا گیا۔[8]

---

[1] امام ابی یوسف۔ کتاب الخراج (یہ روایت آنجنابؐ کی زرعی ترقیاتی منصوبے کے خلاف معلوم ہوتی ہے البتہ یہ بات ممکن ہے کہ خود رو درخت یا سبزہ کاٹنے سے منع کیا ہو۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر نیز مسلم۔ ترمذی وغیرہ ابواب مساجد، ہجرت، تعمیر، انسائیکلوپیڈیا لفظ مسجد شبلی ج ۱ ص ۱۹۷ - سلیمان منصور پوری ج ۱ ص ۱۰۵ [6] ابن ماجہ: ابواب المساجد نیز تاریخ طبری

[7] ایضاً نیز صحیح مسلم، ابواب الصلوٰۃ [8] سیرت ابن ہشام

اس کا مطلب یہ تھوڑے ہی ہے کہ ان سب جگہوں پر مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسجد کے لیے جگہیں مختص کر دی گئی ہوں گی اور قبا جہاں مہاجرین کا عارضی کیمپ تھا اقامت صلوات کا ایسا ہی کوئی انتظام کر لیا ہوگا۔ جب آنجنابؐ یہاں تشریف لائے تو اسی مقررہ جگہ پر نماز ادا فرماتے رہے جس طرح کہ بنی سالم کے محلہ میں نمازِ جمعہ ادا فرمائی۔ دوسرے، دیکھا جائے تو چار روز میں مسجد تعمیر کرنا عملاً محال تھا جبکہ اور بھی بے شمار معاملات فوری توجہ کے مستحق تھے۔ تیسرے، اکثر مورخین نے مسجد النبیؐ اور مسجد قبا کی تعمیر کے ذکر کو خلط ملط کر دیا ہے۔ بعض کتب سیر میں بعینہٖ وہی تفصیلات مسجد قبا کی تعمیر کے باب میں درج کی گئی ہیں جو دوسرے اصحاب سیر نے مسجد النبی کے ضمن میں بیان کی ہیں۔ البتہ طبری نے مسجد نبویؐ کی تعمیر کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے چل کر واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ اس سال قبا میں بھی مسجد بنائی گئی۔ چوتھے، مدینہ کی مسجد نبویؐ کو بلحاظِ تعمیر اولیت حاصل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قبائلی عصبیتوں اور گروہی عداوتوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو کم از کم ایک خاص مدت تک دن میں پانچ مرتبہ ایک مرکز پر جمع ہونے کا موقع فراہم کر کے ان میں فکر و عمل کی وحدت اور ایک ملت کے احساس کو اُبھارا جائے۔ پانچویں، مملکتِ اسلامیہ کے دار الخلافہ میں اسلام کی پہلی مسجد تعمیر ہونے کا تصور اسلامی تعلیمات سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس طرح دنیا کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ نئی ملت کا دین اور دنیا، عبادت اور سیاست، امارت اور امامت (صلوٰت) ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے قبا کی بجائے مدینہ کی مسجد ہی کو اسلام کی اولین مسجد ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا تھا کیونکہ اسلامی حکومت کا دار السلطنت قُبا نہیں مدینہ تھا اور عہدِ رسالتمآبؐ میں مسجد النبیؐ کو جو احترام اور تقدس نصیب ہوا (اور ہے) کہ خود رسولِ خدا نے اس مسجد کو بیت المقدس اور بیتِ عتیق کے ہم پایہ قرار دے کر اس کی طرف سفر اختیار کرنے کی اجازت دی[1] اور پھر جس مسجد کو آں حضورؐ نے "میری مسجد" کہا ہو[2] اس مسجد کے مرتبے کو دوسری کون سی مسجد پہنچ سکتی ہے۔ ان حقائق اور دلائل کے پیشِ نظر یہ بات زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید نے قُبا یا کسی اور مسجد کے بجائے مسجد النبیؐ کے بارے ہی میں اسس علی التقوىٰ الخ[3] کے زریں الفاظ کہہ کر اسے خراجِ تحسین پیش کیا اور قولِ رسولؐ کی تصدیق کی ہو۔

مسجدِ نبویؐ کی تعمیر

مسجد کا سنگِ بنیاد رسول اللہؐ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا اور تعمیرات کے کام کی نگرانی حضرت عمار یاسرؓ کرتے رہے[4]۔ جس جگہ مسجد تعمیر ہوئی تھی اسے برابر کر دیا گیا۔ درخت آدھے کاٹ دیئے گئے تھے[5] اور انہیں قبلہ رُخ رکھ کر پتھروں سے بندش کر دی گئی[6]۔ اس طرف سے شاید کوئی پہاڑی ندی گزرتی تھی

---

[1] صحیح بخاری: ابواب مساجد، تفصیل

[2] صحیح مسلم و بخاری ایضاً

[3] القرآن۔ سورہ توبہ آیت ۱۰۸

[4] سیرت ابن ہشام

[5] تاریخ ابن خلدون

[6] صحیح بخاری۔ ابواب المساجد: عن انس

اوراس طرح پیش بندی کے طور پر وہاں پشتہ باندھا گیا۔ مسجد کا صحن شروع میں تنگ تھا مگر اس میں، فتح خیبر کے بعد۔ اضافہ کر کے وسیع اور کشادہ کر دیا گیا[1] اضافی جگہ حضرت عثمانؓ نے خرید کر مسجد میں شامل کی[2] صحن کچا تھا۔ بارش ہوتی تو مسلمانوں کے پاؤں اور کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو جاتے۔ بعد ازاں صحن کے فرش پر باریک کنکریاں لا کر بچھا دی گئیں[3] صحن کے گرد چار دیواری بنائی گئی معلوم رہے کہ اس زمانے میں بیت اللہ کے احاطے کے گرد کوئی دیوار نہ تھی[4] مسجد نبیؐ اور حجراتِ ازواجِ مطہراتؓ کے گرد شارع کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی، یہ ایک طرح کی سرکلر روڈ تھی جو مسجد کے چوطرف گھومتی تھی۔ مسجد کے تین اطراف تین دروازے تھے[5] ایک دروازے کا نام باب[6] القضاۃ (مسلم) اور دوسرے کا نام باب النساء[7] تھا۔ یہ نام شاید بعد میں مشہور ہوئے ہوں۔

مسجد کی عمارت دھوپ میں پختہ کی ہوئی اینٹوں (واحد: لَبِن) سے بنائی گئی البتہ بنیادیں پتھروں سے تیار کی گئیں۔ عمارت زیادہ بلند نہ تھی[8] شروع شروع میں چھت پر سایہ کی غرض سے کھجور کی شاخیں ڈال دی گئیں۔ بعد ازاں مٹی سے اسے لیپ دیا گیا۔ بارش ہوتی تو چھت ٹپکتی اور کیچڑ پھیل جاتی[9] حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں کھجور کی شاخیں گل گئیں تو انہیں بدلوا کر نئی چھت ڈالی گئی۔ حضرت عمرؓ کے دورانِ خلافت صحنِ مسجد میں اضافہ نہ کرنے کے علاوہ چھت بھی بدلوائی گئی۔ مگر اسے ایسا ہی رکھا گیا جیسا کہ عہدِ رسالت میں تھی یعنی سترہ اٹھارہ برس میں مسجد کی چھت کم از کم تین مرتبہ بدلوا کر از سرِ نو ڈلوانے کی ضرورت پیش آئی البتہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں مسجد کی تعمیرِ نو کا جامع منصوبہ بنایا۔ بعض حضرات صحابہؓ کی شدید نکتہ چینی اور مخالفت کے باوجود مسجد کی دیواریں پختہ، چونا گچ اور منقش اٹھائی گئیں۔ چھت ساگوان کی لکڑی کی تیار کی گئی[10] عہدِ رسالت میں جو مسجد کھجوروں کا ایک منڈوا (ومسجدھم ضیقاً، مقارب السقف انما ھو عریش[11]) معلوم ہوتی تھی اب وہاں ایک عظیم الشان عمارت بنا دی گئی۔

مسجد میں چھ ستون کھجور کے تنوں کے کھڑے کیے گئے۔ جن کھجور کے درختوں کو کاٹ کر مسجد کے لیے جگہ صاف کی گئی تھی ان کا پشتہ باندھنے کے علاوہ مسجد کی تعمیر میں بھی انہیں استعمال میں لایا گیا۔ مسجد کے دروازوں کے چوکھٹ پتھروں کے ٹکڑوں اور

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد"

[2] ترمذی: باب المناقب

[3] صحیح بخاری: ابواب الصلوٰۃ

[4] و [5] کریسٹ ویل۔ ص ۲ مسجد کی چار دیواری سات کیوبٹ (CUBIT) اونچی تھی۔ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ "مسجد"

[5] کریسٹ ویل: مسلم آرکیٹکچر۔ ص ۲

[6] صحیح مسلم: ابواب مساجد/صلواۃ

[8] موطا امام مالک: کتاب الصلوٰۃ

[9] کریسٹ ویل ص ۲ اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

[10] صحیح بخاری: کتاب ابواب الصلوٰۃ

[11] ابی داؤد: کتاب الطہارت

[12] ایضاً

کھل کے بنائے گئے۔[1] اگرچہ وضاحت نہیں ملتی، تاہم اندازہ ہے کہ دروازے ایک کواڑ کے تھے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مکان کا دروازہ ایسا ہی تھا۔[2]

شروع ایام میں قبلہ شمال کی طرف (بیت المقدس) تھا اور عمارت بھی اسی سمت تھی۔ تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد شمالی عمارت برقرار رکھی گئی البتہ جنوب میں اور عمارت بنا دی گئی۔ پہلی عمارت نوواردِ مہاجرین، غریب اور نادار اصحاب (صفہ) کے استعمال کے لیے مختص کر دی گئی مگر کریسٹ وِیل[3] کی رائے ہے کہ نادار اصحابؓ کے لیے عمارت جنوب مغربی سمت میں تھی۔ یہ شاید مسجد کی عمارت کا تیسرا ٹکڑا تھا اور شاید مسجد کے اِسی کونے کو حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں بیت بازی اور گپ شپ کے لیے مختص کر دیا ہو۔[4] اس حصہ کو "بُطیحاء" کہا جاتا تھا۔ خیمے مسجد کے اندر لگائے جا سکتے تھے[5] اور غیر مسلم، مشرکوں اور یہود و نصاریٰ کو مسجد میں آنے کی اجازت تھی۔[6]

وضو اور طہارت کے لیے مسجد میں آب رسانی کا مناسب انتظام تھا۔ مسجد کے سامنے والے دروازے کے نزدیک کھجور کے جُھنڈ میں کُنواں تھا۔[7] مسجد میں بہت جلد حمام اور طہارت خانے بھی بن گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ مسجد تعمیر کی گئی وہاں مشرکوں کی قبریں تھیں۔ قبرستان کو مسجد بنانے کے لیے منتخب کرنا محض اتفاق نہ تھا بلکہ رسول اللہؐ کے سوچے سمجھے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ یثرب میں گروہ بندیوں اور تعصبات کے سبب ہر قبیلے کا علیحدہ قبرستان تھا۔ اِن قبرستانوں کو برقرار رکھ کر مسلمانوں کو بھی انہی قبرستانوں میں دفن کرنے کی اجازت دینے سے دو خرابیاں پیدا ہوتیں۔ اوّلاً ملتِ واحدہ کا تصور نہ اُبھر سکتا، ثانیاً صالحین اور مشرکین کے ایک جگہ دفن ہونے سے اُن کے دشترک، ورثاء کے دماغوں میں اسلام اور جاہلیت کا فرق واضح ہو سکتا اور نہ عقیدۂ توحید اور شرک کے درمیان حدِ فاصل کھینچی جا سکتی۔ ایک دُوسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ اُنہیں مخلوط قبرستانوں میں بدلنے کے بجائے آثارِ قدیمہ سمجھ کر باقی رکھا جاتا جس طرح ہمارے ملک میں گوروں کے قبرستان موجود ہیں —— مگر یہ بات بھی مذہبی اور تمدنی مصالح کے خلاف تھی۔ اور اسلام میں ایسے آثارِ قدیم کے باقی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں جن سے معاشرے میں انتشار اور عقیدے میں فساد پیدا ہو۔ عہدِ جاہلیت کے بُت کدوں، دیوی دیوتاؤں کے استھانوں، متبرک مقامات اور مقدس اشیاء پر بھی یہی اصول چسپاں ہوتا ہے۔ لہٰذا رسالت مآبؐ نے بُت کدے اور قبرستان مسمار کرا دینے اور اس جگہ مسجدیں بنا دینے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا

---

[1] کریسٹ وِیل نیز ابی داؤد

[2] دیکھئے ارلی مسلم آرکیٹیکچر ص ۴ نیز انسائیکلو پیڈیا لفظ 'مسجد'

[3] موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ

[4] ابی داؤد، صلوٰۃ

[5] سیرت ابن ہشام: ابن الاثیر۔ صحیح مسلم و بخاری وغیرہ

[6] نسائی، غسل

اور اندازہ ہے کہ ابتدائی زمانۂ اسلام میں مدینہ یا بیرونِ مدینہ جتنی مسجدیں تعمیر ہُوئیں اکثر و بیشتر بُت خانوں کو ڈھا کر یا قبرستانوں کو ہموار کر کے تعمیر کی گئیں۔ مسجد النبیؐ کے علاوہ دو اور واضح مثالیں اس بات کی تصدیق کے لیے موجود ہیں۔ طائف کے اسلامی گورنر حضرت عثمان بن ابی العاصؓ اور (اپنے قبیلے اور وفد کے سردار) طلحہ بن علیؓ حنیفر کو حکم دیا گیا کہ وُہ بُت خانے اور گرجے کو گرا کر وہاں مسجدیں بنا دیں۔ یثرب کے مشرکین کی قبریں پختہ اور چُونے گچ ہوتیں اور اُن پر عمارت یا گنبد ہوتا۔ بعید نہیں کہ مسجدوں کے بنانے میں قبروں کا تعمیراتی سامان اکھیڑ کر استعمال کیا گیا ہو۔ مسجد النبیؐ کی تعمیر کے سلسلے میں یہ روایت ملتی ہے کہ اس کی بنیادیں پتھر سے اٹھائی گئیں (حالانکہ باقی مسجد کچی اینٹوں کی تھی)، ممکن ہے یہ پتھر اکھڑی ہوئی قبروں کے ہوں اور اسی طرح مشرکوں کے بُت کدوں اور نصاریٰ کے گرجوں کا تعمیراتی سامان مسجدیں بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔

مسجد النبیؐ، مدینہ کے عین وسط میں بنائی گئی۔ محلِ وقوع کی وجہ سے بے شمار سیاسی، معاشرتی اور مذہبی فوائد حاصل کئے گئے۔

ازواجِ مطہراتؓ کے حُجرے

مسجد النبیؐ سے ملحق دُو حجرے (چھوٹے مکان[1]) ازواجِ مطہراتؓ کے لیے تعمیر کیے گئے اس وقت آپؐ کی دُو بیویاں تھیں اور دُوسری کی رخصتی بھی مدینہ آنے کے چند ماہ بعد ہُوئی۔ یہ مکانات مسجد کے مشرق میں تھے۔ ازاں بعد مکانات کی تعداد نَو ہو گئی۔ آنجنابؐ کے ہر نئے نکاح کے بعد نیا مکان بنا لیا جاتا۔ حجروں کی چار دیواری کچی تھی اور یہ حُجرے ایک دُوسرے سے متصل تھے[2]۔

یہ مکانات جس میں آپؐ اور آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ رہائش پذیر رہے، آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے جانشین حضرت ابوبکرؓ کو منتقل ہو گئے۔ حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین بنے تو وُہ بھی یہیں رہتے رہے، اور حضرت عثمانؓ نے جب مملکتِ اسلامیہ کی زمامِ اقتدار سنبھالی تو وُہ بھی انہی مکانات میں اقامت گزیں ہُوئے اور یہیں شہید ہُوئے[3] ——— باوجودیکہ ان حضرات گرامیؓ کے اپنے اپنے مکانات بھی تھے مگر وُہ رہتے مسجد کے نزدیک والے مکانوں میں رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا دُو منزلہ مکان سُنح میں تھا۔ حضرت عمرؓ محلہ امیہ بن زید میں سکونت رکھتے تھے اور حضرت عثمانؓ کا مدینۃ الرسولؐ کے بازار میں نہایت شاندار مکان بلکہ محل تھا۔ گویا حُجراتِ ازواجِ مطہراتؓ کی حیثیت ایوانِ صدر (PRESIDENT HOUSE) کی تھی۔ جو تعمیر ہی اس لیے ہُوئے تھے کہ مسلمانوں کا حکمران اس جگہ اقامت گزیں ہو کر معاملات کو بآسانی نپٹا سکے۔ دُوسرے، اسلام میں مذہب اور سیاست ناقابلِ تقسیم ہیں اور رسالتمآبؐ مسلمانوں کے حکمران، منتظم اعلیٰ اور خدا کے رسول تھے تو مسجد

---

[1] ابن ماجہ: کتاب المساجد والجماعت۔ نیز ابی داؤد: طہارت

[2] نسائی: ابواب الاذان

[3] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد" (تاہم کریسٹ ویل نے چار تعداد بتائی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے)

[4] کریسٹ ویل: ارلی مسلم آرکیٹیکچر ص ۵

[5] انسائیکلو پیڈیا "مسجد" (موطا امام مالک: الجامع)۔ عائشہ صدیقہؓ کسی دوسرے مکان میں چلی گئی تھیں۔

مسلمانوں کا عبادت خانہ اور اسلام کی پوری معاشرتی اور سیاسی زندگی کا محور اور مرکز تھی بلکہ اسے دار الامارت کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے ایوانِ صدر کا دار الامارت کے ملحق و متصل واقع ہونا ضروری تھا تاکہ انتظامی امور اور سیاسی و مذہبی معاملات سلجھانے کے لیے سربراہِ مملکت بروقت موقع پر موجود رہے[1]۔ آں جنابؐ کے جدِ اعلیٰ قصی نے فتح مکہ کے بعد جب وہاں شہری ریاست کی داغ بیل ڈالی اور اپنے تعمیری منصوبے پر عمل کرتے ہوئے شہرِ نو بسایا تو بیت اللہ کو از سرِ نو تعمیر کرا کے اپنا مکان (دار الندوہ) اور اپنے اقارب کے مکانات کعبہ کے متصل بنوائے تھے اور قدیم اقوام کا نو آبادکاری کا طریقہ بھی یہی تھا کہ شہر کے وسط میں مقدس عمارت ہوتی اور حکمران، ذی اثر افراد کی رہائش گاہیں اس کے گرد یا متصل ہوتیں[2]۔

آں حضورؐ کے بعد بصرہ، کوفہ اور فسطاط کی نو آبادیاں (COLONIES) بعینہٖ مدینۃ الرسول کے نقشے پر بنائی گئیں[3]۔

آئیے ذرا اس "صدارتی محل" کو بھی دیکھتے چلیں جو مسلمان فرماں رواؤں کے رہنے کے لیے بنایا گیا تھا اور جہاں سرورِ دوجہاں، آقائے نام دار، جنابِ رسولِ مقبولؐ گیارہ سال تک رہائش پذیر رہے اور (آخری تین سال میں) اسی محل میں رہتے ہوئے پورے جزیرۃ العرب پر حکمرانی کرتے رہے۔

یہ مکان کچی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں مدینہ میں پتھروں کو تراش کر مکانات بنانے کا عام رواج تھا، مگر سرمائے اور وقت کی کمی کی وجہ سے اسلامی ریاست ان شاہ خرچیوں کی متحمل نہ ہو سکتی تھی اور جب وسائلِ آمدن وسیع ہو گئے تو اس وقت بھی ان میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہ کیا گیا۔ ہر مکان ایک کمرے اور ڈیوڑھی پر مشتمل تھا جس کے گرد مختصر سی چار دیواری تھی۔ حویلی کا عرض کمرے کے دروازے سے مکان کے دروازے تک چھ، سات ہاتھ تھا۔ مکان کے سامنے بیٹھنے کے لیے چبوترہ بھی تھا۔ ہر کمرے کی اندر سے لمبائی اندازۃً دس ہاتھ اور چوڑائی سات آٹھ ہاتھ تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا کمرہ قبلہ رُخ تھا اور اس کے دروازے کا ایک کواڑ تھا۔ کواڑ کی لکڑی ساگوان کی تھی۔ اس کا عرض ۲ × ۲ فٹ تھا۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ ہاتھ چھت کو لگتا تھا[5]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے شاید اس لیے یہ فرمان جاری کیا کہ مکانات کی چھتیں اونچی مت[6] بناؤ۔ شروع میں مکانات کے دروازے مسجد میں بھی کھلتے تھے مگر بعد ازاں انہیں بند کرا دیا گیا[7]۔ تاہم حضرت

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ مسجد [2] مکہ کے حکمران ص ۲۸

[3] انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنز تحت لفظ "CITY AND TOWN PLANNING" از LEWIS MAMFOVAL جلد دوم ۔ ص ۴۵۱ ۔ ۴۵۱

[4] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد"

[5] ایضاً ۔ کریسٹ ویل نیز ترمذی، کتاب التفسیر

[6] امام بخاری: ادب المفرد $\frac{۳۳۴}{۱۰}$ ۔ $\frac{۲۱۲}{۴}$

[7] ابی داؤد، کتاب الطہارت عن عائشہ ۔ کریسٹ ویل

عائشہؓ کے مکان سے ایک چھوٹی سی کھڑکی مسجد میں باقی رکھی گئی جو وصالِ نبیؐ تک رہی۔ کچے مکانات کو جب لپائی یا مرمت کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہؐ یہ کام بسا اوقات خود انجام دیتے۔ کبھی کوئی صحابی ہاتھ بٹا لیتا۔ مدینہ میں رہنے والے صحابہؓ کے مکانات بھی کچے تھے۔ صحابہؓ بھی لپائی اور مرمت خود کر لیا کرتے تھے۔ آں جنابؐ کی یہ سادگی اور قناعت اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھی۔

قرآن میں رفیع الشان اور عظیم عمارات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ بلند اور منقش عمارات نہ بنانے لگیں گے اور یہ کہ ماسوائے ضرورت کے مکان تعمیر کرنے میں کوئی بھلائی نہیں۔ تاہم آپؐ کے ایک دو منزلہ مکان کا بھی تذکرہ ملتا ہے جہاں آپؐ ایلاء کے ایام میں عزلت گزیں رہے۔ اس مکان کا زینہ نہایت کشادہ تھا۔ اترتے چڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا گویا زمین پر چل رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ مکان آپؐ کو یہود کے اخراج کے بعد ان کی کسی بستی میں فئے کے طور پر ملا ہو اور آپؐ نے خود اپنے لیے تعمیر نہ کیا ہو جیسا کہ کریسٹ ویل نے کہا ہے:

"THE PROPHET HAD NO ARCHITECTURAL AMBITIONS.."

شاید اسی دو منزلہ مکان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ منتقل ہو گئیں۔ وصالِ نبیؐ کے بعد ان کا وسیع مہمان خانہ، جس کا ذکر کتب احادیث و سیر میں ہے (ادب المفرد: بخاری) اسی مکان میں تھا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ عائشہ صدیقہؓ کے مکان کا کمرہ ہی آپؐ کی آرام گاہ بنا۔

مسجد النبیؐ اور ازواجِ مطہراتؓ کے حجرات کی تعمیر کا کام کم و بیش ایک سال ہوتا رہا اور ہجرت کے دوسرے سال ماہِ صفر یا اگست/ستمبر ۶۲۳ عیسوی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

دار الخلافہ کی تعمیر کا منصوبہ ہجرت کی فرضیت کے حکم کے بعد مدینہ میں مہاجرین کا سیلاب اُمڈ پڑا اور آخر کار مدینہ میں مقامی باشندوں کے مقابلے میں مہاجرین کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ ان نوواردوں کی آبادکاری (Rehabilitation) کے متعلق آں حضورؐ نے شروع دن ہی سے ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ بدقسمتی سے

---

۱ نسائی۔ صحیح مسلم۔ ابی داؤد (طہارت۔ اعتکاف وغیرہ)

۲ و ۳ ادب المفرد ۲۱۳

۴ القرآن، سورۃ الشعراء: آیات ۱۲۸، ۱۲۹ سورۃ الفجر: آیات ۲-۱۴ سورۃ الحجر: ۸۵-۸۴

۵ ادب المفرد ۲۱۲/۱، ۲۱۶/۱

۶ ترمذی ۷ تاریخ طبری

۸ منٹگمری واٹ: اسلام ص ۹۳

۹ صحیح بخاری: ابواب ہجرت

مورخین نے اس موضوع پر ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ اس منصوبے کی جزئیات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے رسول اللہؐ نے نو آبادی (COLONIZATION) اور شہری منصوبہ بندی (TOWN PLANNING) میں عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ نو واردوں کی اتنی بڑی تعداد (FLUX OF IMMIGRANTS) کو اتنے محدود وسائل کے باوجود رہائش اور کام کی فراہمی کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ پھر مختلف نسلوں، طبقوں، علاقوں اور مختلف معاشرتی و تمدنی پس منظر رکھنے والے لوگ مدینہ میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ ان سب کو سماجی لحاظ سے اس طرح جذب کر لینا کہ ان میں غریب الدیاری اور بیگانگی کا احساس اُبھرے، نہ مدینہ کے ماحول میں کوئی خرابی پیدا ہو اور نہ قانون شکنی اور اخلاقی بے راہروی کے رجحانات جنم لیں ـــ جیسا کہ عام طور پر ایسے حالات میں ہوتا ہے ـــ رسول کریمؐ کا ایسا زندۂ جاوید کارنامہ ہے جو ماہرینِ عمرانیات کے لیے خاص توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے۔ جدید شہروں میں آبادی کے دباؤ سے پیدا ہونے والے تمدنی، سیاسی اور اخلاقی پیچیدہ مسائل سے نپٹنے کے لیے سیرت النبیؐ سے ماہرین بلاشبہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کو سب سے پہلے رسالتمآبؐ نے اس راز سے آگاہ کیا کہ محض سنگ و خشت کی عمارات کے درمیان میں کوچہ و بازار بنا دینے کا نام شہری منصوبہ نہیں[1] بلکہ ایسا ہم آہنگ اور صحت مند تمدنی ماحول فراہم کرنا بھی ناگزیر ہے جو جسمانی لذت، رُوحانی بالیدگی، دماغی اطمینان اور قلبی سکون عطا کر کے اعلیٰ انسانی اقدار کو جنم دے اور تہذیبِ انسانی کے نشو و نما کا سبب بن سکے۔

دارالخلافہ کی تعمیر کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب اور اس غرض کے لیے وسیع قطعۂ اراضی پہلے ہی حاصل کر لیا گیا تھا۔ مسجد اور ازواجِ مطہراتؓ کے لیے مکانات بن جانے کے ساتھ دارالخلافہ کی تعمیر کا پہلا مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ دُوسرے مرحلے کا آغاز نو وارد مہاجرین کی اقامت اور سکونت کے لیے مختصر مکانات (QUARTERS) کی تعمیر سے کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ تعمیرات کے اس دُوم مرحلہ جاتی منصوبے پر ایک سال یا اس سے کچھ زاید عرصہ لگ گیا۔ ورنہ صرف مسجد اور دُو حجرے بنانے کے لیے کسی صورت میں بھی ایک سال کا عرصہ نہیں لگ سکتا تھا۔ خصوصاً جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی عمارت بہت مختصر سی تھی اور دُو حجرے، ایک ایک کمرے پر مشتمل تھے اور بروایت ابن ہشام و طبری وغیرہ مسجد اور حجروں کی تعمیر میں تقریباً سب مسلمانوں نے شرکت کی اور بڑے جوش و جنوں کے ساتھ کام کیا[2]۔ اس صورت میں مسجد اور حجروں کی تعمیر کو بہت جلد مکمل ہو جانا چاہیے تھا ـــــ پھر ایک سال کی مدت کیسے صرف ہُوئی؟ روایات اس بارے میں خاموش ہیں اور مورخین نے بھی اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ اتنا زیادہ وقت منصوبے کے دُوسرے مرحلے کو عملی جامہ پہنانے میں صرف ہُوا اور منصوبے کے دُوسرے حصّے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تمام مہاجرین اور انصار بھی جوش اور

---

[1] انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز لفظ "شہر و شہری منصوبہ بندی" از ولیم۔بی۔منرو ص ۱۸۲

[2] طبری سیرت ابن ہشام ـ صحیح بخاری وغیرہ۔

ولولے کے ساتھ کام کرتے رہے جس کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے۔

مہاجرین کی آبادکاری

شہرِ نو، مدینۃ الرسول، ایک لحاظ سے "مہاجر بستی" تھی۔ گو سارے مہاجر وہاں اقامت نہ رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ عوالی کی بستی سُنح میں رہتے تھے[1]، اور حضرت عمر فاروقؓ بنی امیہ کے قریہ میں بس گئے تھے[2]۔ اور مدینہ میں بھی انصار کے اکا دُکا مکانات موجود ہونے کے شواہد ہیں۔ ایک انصاریہ کا کشادہ مکان (دار)[3] مدینہ کے کہیں ایک کنارے پر تھا[4]۔ ہوسکتا ہے جب مدینہ کی آبادی بڑھی ہو تو مکانات اور تعمیرات کا سلسلہ پھیل کر عہدِ رسالت مآبؐ ہی میں قریب کی آبادیوں بنی ساعدہ، بنی النجار وغیرہ سے مل گیا ہو ورنہ ریاست کی پالیسی یہ تھی کہ مدینہ کی کالونی میں صرف مہاجرین کو بسایا جائے۔ عوالی میں رہنے والے بنوسلمہ کے قبیلے نے جب مدینہ آکر آباد ہونے کی درخواست کی تو آپؐ نے اسے نامنظور کردیا اور انہیں اپنے قریہ ہی میں رہنے کی ہدایت کی[5]۔ ریاست کی نوآبادی سکیم کا یہ بھی ایک اہم حصہ تھا کہ اللہ کی راہ میں وطن چھوڑ کر مدینہ آنے والے کٹے پٹے، بے سروسامان اور بے یار و مددگار مہاجروں کے قافلوں کو جائے رہائش سرکاری طور پر فراہم کی جائے بلکہ ان نوواردوں کو سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا اور ان کے کھانے اور دیگر ضروریات کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا جاتا۔ بعد ازاں ان لوگوں کو مستقل رہائش کے لیے جگہ یا مکان مہیا کرنا بھی حکومت کا فرض تھا۔ گویا مہاجرین کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی اسلامی حکومت کے سپرد تھی اور ہم دیکھیں گے حکومت اس بہت بھاری ذمہ داری سے مالی عسرت اور اقتصادی وسائل کے فقدان کے باوجود، کس طرح خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوئی۔

مہاجرین کی عارضی رہائش کا انتظام مسجد کے اندر کیمپ لگا کر یا صفہ میں کیا جاتا۔ اگر مہاجرین کی تعداد زیادہ ہوتی یا قافلہ پورے قبیلے پر مشتمل ہوتا تو انہیں عموماً شہر کے باہر خیموں میں ٹھہرایا جاتا ——— تاآنکہ مستقل رہائش کا معقول انتظام نہ ہوجاتا ——— ایک حبشی عورت اسلام لانے کے بعد مدینہ میں آئی تو اسے مسجد میں خیمہ لگا کر یا چھوٹے حجرے میں ٹھہرایا گیا[6]۔ اسی طرح ایک بدو جو بعد میں مرتد ہو کر مدینہ سے بھاگ گیا[7]، مسجد میں رکھا گیا تھا۔ بنی اسد کا (پورا) قبیلہ جب ہجرت کر کے آیا تو وہ شہر کے جنوب مشرق میں بقیع الغرقد میں اُترا اور خیمے لگا کر رہتا رہا[8]۔ اسی طرح حضرت ابوموسیٰؓ اور اُن کے ساتھی حبشہ سے دوسری ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو شہر کے مغرب کی سمت میں بطحان کے نزدیک ان کا کیمپ لگایا گیا[9]۔

آبادکاری (REHABILITATION) کے دو طریقے اختیار کیے گئے، اوّلاً یا تو کسی ذی ثروت انصاری کو کہہ دیا جاتا کہ

---

1 ابن ماجہ: باب وفات الرسول نیز طبقات ابن سعد
2 طبقات ابن سعد
3 سیرت ابن ہشام
4 ابن ماجہ: باب المسجد
5 ترمذی، کتاب التفسیر سورۃ یاسین نیز ابن ماجہ، مسلم، بخاری وغیرہ
6 و 7 صحیح بخاری: ابواب المساجد
8 موطاء امام مالک، کتاب الجامع و ابن ماجہ ابواب المساجد (فی الخروج یوم العیدین من طریق ....)
9 صحیح مسلم: ابواب الصلوٰۃ (عیدین)

وہ ایک مہاجر کی رہائش کا اپنے ہاں انتظام کرے ——— مگر خیال ہے کہ صرف شروع کے ایام میں ایسا کیا گیا جبکہ اسلامی ریاست صحیح طرح صورت پذیر ہوئی تھی اور نہ منظم اور رسولِ خدا انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ بہت جلد یہ طریقہ ترک کر دیا گیا کیونکہ بعد کے واقعات میں اس طرح کے رشتۂ مواخاۃ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ثانیاً ریاست مہاجرین اور خصوصاً افلاس زدہ مہاجرین کے لیے چھوٹا سا مکان (QUARTER) خود فراہم کرتی۔ مہاجروں کو ٹھہرانے کے لیے عموماً بڑے بڑے مکانات تعمیر کیے گئے۔ کنواروں کے لیے ایسے مکانات علیحدہ تھے[1] اور شاید عیال داروں کے لیے علیحدہ۔ یہ مکانات کئی کمروں پر مشتمل تھے ایک کمرہ ایک خاندان کو دیا جاتا۔ البتہ ایسے مکانات میں باورچی خانہ وغیرہ مشترکہ ہوتا[2]

بعض لوگوں کو علیحدہ کوارٹرز بھی مہیا کیے گئے۔ حضرت صہیبؓ کو ایک ایسا مکان ملا تھا[3] جو دو کمروں اور ایک ڈیوڑھی پر مشتمل تھا۔ شاید حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسی لیے یہ حکم جاری فرمایا کہ کوفہ و بصرہ کے لوگ تین کمروں سے زیادہ کا مکان نہ بنائیں اور عام سپاہیوں کے لیے سرکاری خرچ سے جو مکانات تعمیر کیے گئے وہ بھی تین ہی کمروں پر مشتمل تھے[4]۔ صہیبؓ کے مکان اور حضرت عمرؓ کے فرمان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے مدینہ کی کالونی میں سرکاری طور پر علیحدہ رہائش کے لیے جو مکانات بنوائے وہ تین کمروں کے تھے۔ حضرت عمار یاسرؓ[5]، حضرت اسامہ بن زیدؓ[6] اور حضرت ابوہریرہؓ[7] کو بھی سرکاری کوارٹر دیئے گئے۔ خالد بن ولیدؓ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے مگر انہیں مکان کہیں مسجد النبیؐ کے نزدیک (متصل) فراہم کیا گیا[8]۔ شاید اس مکان کا پہلا مکین کسی اور جگہ منتقل ہوگیا ہوگا اور نقل مکانی کی ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دیگر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ مدینہ کی شدید آب و ہوا تھی جس کی وجہ سے لوگ مرتد ہو کر ہجرت سے پلٹ جاتے۔ یہاں تک کہ آنجنابؐ کو یہ اعلان جاری کرنا پڑا کہ معاشی تنگی اور شدتِ بخار سے عاجز آ کر جس نے مدینہ کو چھوڑا اللہ مدینہ کو اس سے بہتر آدمی دے گا۔[9]

حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت عباسؓ اور حضرت جعفر طیارؓ کی صورت میں واقعی مدینہ میں اپنے عہد کے بہترین لوگ رونق افروز ہوئے۔ رسول اللہؐ کے آلاٹ کردہ کوارٹر پر آلاٹی کا مستقل حقِ ملکیت قائم ہو جاتا، تاآنکہ مالک نقل مکانی، ارتداد وغیرہ کی وجہ سے حقِ ملکیت سے خود دستبردار نہ ہو جاتا۔ (صہیبؓ کے مقدمہ کی تفصیل صحیح بخاری: احکامات میں دیکھئے۔ یہ مقدمہ مروان کے سامنے پیش ہوا تھا جب کہ وہ مدینہ کا گورنر تھا)

---

[1] تاریخ طبری: اس کا نام کنواروں کا مکان پڑ گیا تھا۔

[2] ادب المفرد: امام بخاری ۳۰۹ [3] صحیح بخاری: احکام

[4] شبلی نعمانی: الفاروق ص ۲۳۵ (۱۹۷۱ء)

[5] ابن ماجہ: کتاب الصلوٰۃ [6] و [7] سنن ابی داؤد

[8] موطا امام مالک: اعتکاف

[9] صحیح بخاری: ابواب ہجرت، فضائل مدینہ نیز موطا امام مالک، جامع

یہ بات واضح نہیں ہے کہ مکانات کی تعمیر اور آبادکاری کی سکیم پر اُٹھنے والے اخراجات حکومت نے کس طرح برداشت کیے ہوں گے۔ خصوصی چندہ یا رضاکارانہ ٹیکس (جسے بعدازاں عُشر اور زکوٰۃ کے نام سے مستقل کر دیا گیا) کے ذریعے یہ رقم جمع کی جاتی ہو گی یا پھر مہاجرین سے جن لوگوں کی حالت قدرے بہتر ہوتی انہیں تعمیر شدہ مکان دینے کی بجائے حاصل کردہ اراضی (ACQUIRED LAND) میں سے رہائشی پلاٹ فراہم کر دیا جاتا اور مکان وغیرہ بنانا اس کی ذمہ داری ہوتی۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس زمانے میں جس طرح کے مکانات بنتے ان کے بنانے کے لیے سرمایہ کی نہیں محنت (LABOUR) کی ضرورت تھی، جو آپؐ کے پاس بافراط موجود تھی۔ لہٰذا اس غرض کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

شہر کی توسیع

تعمیرات کا یہ سلسلہ بہت دیر تک برابر جاری رہا، یہاں تک کہ بنی قینقاع کے اخراج (۲ ہجری) کے بعد مکانات کی خاصی تعداد مسلمانوں کے ہاتھ آجانے کے سبب رہائشی قلت بہت حد تک دُور ہو گئی مگر یہ مسئلہ ختم نہ ہوا کیونکہ رہائشی سہولتوں کے مقابلے میں نوواردوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اس لیے ۵ سال ہجری (بنی قریظہ کی فتح) تک یہ مسئلہ سنگین نوعیت کا تھا۔ اس کے بعد اسلامی حکومت کے آمدنی کے وسائل بھی پیدا ہو گئے، مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی قدرے سنبھل گئی، یہودیوں کے بہت سے مکانات بھی مل گئے لہٰذا معاملہ کی سنگینی بڑی حد تک کم ہو گئی تاہم آبادکاری کا کام فتح مکہ (۸ ہجری) اور اس کے بعد بھی جاری رہا۔ فتح کے ساتھ ہی چونکہ ہجرت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہو گیا اس لیے مدینہ میں مہاجرین کی آمد کا سلسلہ رُک گیا۔ تاہم کئی لوگ بعد از فتح مکہ بھی مدینہ میں آکر آباد ہوئے[1] اور حصولِ تعلیم وغیرہ کے لیے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہا۔[2]

---

[1] فتح مکہ کے بعد ہجرت کر کے آنے والے لوگوں میں حضرت عباسؓ، حضرت امیر معاویہؓ و ابوسفیانؓ مشہور ہیں۔ ان حضرات کی مہاجرت کی مورخین و محدثین نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت عباسؓ اسلام فتح مکہ سے بہت پہلے لا چکے تھے اور بعض مصلحتوں کی وجہ سے آں حضورؐ کے حکم سے مکہ ہی میں ٹھہرے رہے یا یہ کہ وہ فتح سے قبل ہی نکل کر مدینہ کی طرف آ رہے تھے یا یہ کہ ابوسفیان وغیرہ کو آنحضورؐ نے خصوصی طور پر ہجرت کی اجازت دی۔ اور بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ فتح مکہ کے بعد اعلان معافی کر دیا گیا لہٰذا قریش کے لوگ ہجرت کر کے آسکتے تھے (تفصیل کے لیے دیکھئے زاد المعاد، ابن قیم، مدارج النبوت وغیرہ۔ یہ سب توجیہات قابلِ قبول نہیں ہیں اور تاریخی تنقید کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتیں۔ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ مورخین نے فرضیتِ ہجرت کی تنسیخ کے حکمنامہ کو امتناع ہجرت کا حکم سمجھ لیا حالانکہ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ قبل از فتح اسلام لانا اور ہجرت کرنا لازم و ملزوم تھا۔ بغیر ہجرت کے کسی کا اسلام قبول ہی نہیں کیا جاتا تھا (القرآن، الانفال: ۷۲۔ ام ابی یوسف، ابی عبید، بخاری و مسلم) سوائے اس کے رسول اللہؐ بعض سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر کسی کو خصوصی اجازت دے دیں (حمید اللہ: سیاسی زندگی)۔ مگر فتح کے بعد اسلام لانے کے ساتھ ہجرت کرنے کی شرط اڑا دی گئی۔ جو شخص اسلام لانے کے بعد ہجرت کرنا چاہتا اس کے لیے کوئی شرعی امر مانع نہ تھا کیونکہ آنحضورؐ کا یہ اعلان کہ لا ہجرت بعد الفتح (بخاری، مسلم، ابی داؤد)، تحریم تنزیہی کے زمرے میں آتا ہے۔ [2] مصنف کا مضمون "عہد نبویؐ کا نظام تعلیم" اسلامی تعلیم جلد ۶ شمارہ ۱

اخیر عہدِ نبویؐ میں مدینہ کا شہر مغرب میں بطحان تک، مشرق میں بقیع الفرقد تک، اور شمال مشرق میں بنی ساعدہ کے مکانات تک پھیل چکا تھا اور رسول اللہؐ نے اب وہاں مزید مکانات تعمیر کرنے سے روک دیا۔ شہری منصوبہ بندی کے ضمن میں آنجنابؐ کا یہ اقدام زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جنہیں جدید صنعتی شہروں کی گھمبیر، اخلاق باختہ اور انتشار انگیز معاشرت کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اسی لیے آپؐ نے شہرِ نو (مدینہ) کو ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہونے دیا اور اس شہر کی زیادہ سے زیادہ حد پانچ سو ہاتھ[2] مقرر کی اور فرمایا کہ شہر کی آبادی اس حد سے بڑھ جائے تو نیا شہر بسائیں[3]۔ اور آپؐ نے اپنی زندگی میں ہی اس اصول پر عمل کرتے ہوئے دو اقدام کیے، ایک یہ کہ اضافی آبادی کو یا تو اور زمینوں میں منتشر کرنے کا حکم جاری کیا تاکہ اس طرح ایک طرف زرعی انقلاب برپا کیا جا سکے اور دوسری طرف نئے لوگوں کی رہائش کے لیے گنجائش نکالی جا سکے مثلاً حضرت سلمہ بن اکوعؓ[4] کا بہت مشہور واقعہ ہے کہ آپؐ نے اُسے زمینوں پر آباد ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ حضرت سعدؓ کو عقیق میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی طرح جوفِ مدینہ کے قریوں میں اور مدینہ کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے متعلق آپؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ (دیہاتوں میں رہنے اور کھیتی باڑی کرنے کے باوجود) اعراب کی طرح نہیں ہیں کیونکہ یہ (جنگ کے لیے) طلب کرنے پر فوراً آجاتے ہیں (لہٰذا غنائم اور فئے میں برابر کے حصے دار ہیں) آپؐ کی اس پالیسی کا آئینہ دار ہے[5]۔ اور دوسرے یہ کہ قریظہ و نضیر کی مفتوحہ بستیوں یا جوفِ مدینہ کے دیگر قریوں میں پھیلا دیا تاکہ ایک جانب معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہونے کے امکانات ختم ہو جائیں اور دوسری طرف صحت مند اور تعصبات سے پاک معاشرت تخلیق کی جا سکے۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ رسالتمآبؐ نے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ آج کل چین اور کچھ مغربی ممالک میں ٹاؤن پلاننگ کے انہی زرّیں اصولوں پر جنہیں رسولِ خداؐ نے چودہ سو سال پہلے آزمایا تھا عمل کر کے معاشرتی ہیجان اور تہذیبی انتشار کی شدت کو کم کرنے میں ایک حد تک نمایاں کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں[6]۔

گلی، کوچے آں جنابؐ سے پیشتر مدینہ میں ناجائز تصرفات عام تھے۔ آپؐ نے اس سے سختی سے منع کر دیا[7]۔ گلی یا کوچے کی کم سے کم چوڑائی، جھگڑا ہو جانے کی صورت میں سات ہاتھ (۷ ذرع) مقرر کی[8]۔ جوفِ مدینہ کی آبادیوں

---

[1] نسائی: کتاب الصلوٰۃ
[2] روزگارِ فقیر، فقیر وحید الدین ج ۱
[3] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۵۲۹
[4] صحیح مسلم: ابواب ہجرت ابی داؤد وغیرہ
[5] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز لفظ شہر و شہری منصوبہ بندی ولیم منرو نیز رسالہ سوشیالوجی جلد ۶، شمارہ ۱ جنوری ۱۹۶۲ء مضمون STABILITY A CHANGE IN A SHENTY TOWN از ALISON M. MACQVEN نیز کتاب URBANIZATION IN LATIN AMERICA از PHILLIP HAUSER آبادی کو منتشر کر دینے کے بارے جدید نظریات کی تلخیص انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز میں دیکھیے تحت لفظ شہری منصوبہ بندی
[6] LEWIS MAMORD از ص ۶۹-۴۵۵
[7] ابی عبید: کتاب الاموال
[8] صحیح مسلم: ترمذی

میں گلیاں عام طور پر تنگ ہوتی تھیں اس لیے مدینہ کی کالونی میں بھی گلی کوچے تنگ مگر سیدھے تھے۔ باوجودیکہ آپؐ کا اور دیگر صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے مکانات مختصر تھے مگر آپؐ نے کشادہ مکانات کو پسند کیا اور فرمایا کہ خوش بخت ہے وُہ شخص جس کی جائے رہائش وسیع اور پڑوسی نیک ہو[1]۔

شہر میں پینے کے پانی کی بہم رسانی کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا۔ مدینہ میں اگرچہ پانی کی قلت نہ تھی۔ چند گز زمین کھودنے پر پانی کا چشمہ اُبل پڑتا، تاہم پینے کے لیے میٹھے پانی کے کُنویں اور چشمے بمشکل دستیاب ہوتے۔ حضرت عثمانؓ نے جو خود بھی مدینہ کی نوآبادی میں رہتے تھے، آں حضورؐ کے حکم کے مطابق اہلیانِ مدینہ کے لیے یہودیوں سے میٹھے پانی کا کنواں بئر رومہ خرید کر وقف کر دیا[2]۔ بعد ازاں رسول اللہؐ نے سرکاری طور پر بھی کنویں کھدوا کر مسلمانوں کی مشکل حل کر دی۔ آپؐ کے تیار کردہ ایسے ایک کنویں کا نام غرس[3] تھا۔ ایک اور کنواں مسجد نبیؐ کے سامنے کھجور کے درختوں کے نیچے بھی تھا[4]۔

حمام اور طہارت خانے

عربوں میں صفائی اور طہارت کا کوئی تصور نہ تھا۔ وُہ پاخانہ پھرنے کھُلی جگہ جاتے تھے[5] حتیٰ کہ یہودی جو اعلیٰ تہذیب و تمدن کے علمبردار اور دعویدار تھے، بیت الخلاء کے تصور سے ناآشنا تھے[6]۔ وُہ غسل کرتے تو کئی مرد مل کر اور بالکل برہنہ ہو کر اور دورانِ غسل ایک دُوسرے کے جسم کو دیکھتے[7]۔ بیت الخلاء اور حمام ترقی یافتہ معاشرت اور شہری زندگی کا ضروری جزو ہیں۔ آنجنابؐ نے عرب کے بادیہ نشینوں اور یہود و نصاریٰ جیسے مہذب لوگوں کو اسلوبِ زندگی بتاتے ہُوئے بیت الخلاء اور حمام کو رواج دیا اور اس ضمن میں ایسے آداب سکھائے جو عربوں کی حد تک ہی نہیں پوری نوعِ بشری کے تہذیبی ارتقار کی سمت میں اہم قدم تھا۔

دراصل اسلام جسم و جان کی پاکیزگی اور ظاہر و باطن کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے[8]۔ وضو، طہارت، غسل جنابت، جمعہ کا غسل (واجب) کے احکامات اسی سلسلے کی کڑیاں اور تکمیلی مراحل تھے۔ شروع شروع میں جب آپؐ غسل فرماتے تو آپؐ کی کوئی بیوی یا غلام[9] آپؐ پر کپڑا تان کر پردہ کر دیتا یہاں تک کہ آپؐ نے اس ضمن میں عام حکم جاری فرمایا کہ غسل کرتے

---

[1] امام بخاری: ادب المفرد ۲۲

[2] ابن ماجہ: باب غسل النبیؐ

[3] صحیح مسلم: باب انک بخاری وغیرہ

[4] صحیح بخاری: باب فضائل

[5] نسائی: باب غسل

[6] نسائی: طہارت

[7] صحیح بخاری: ابواب غسل و طہارت

[8] القرآن، سورۃ مدثر: آیت ۴۱۲۔ یہ سورۃ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور اس کا نمبر بلحاظ وحی دوسرا ہے جس میں صفائی کی تلقین زور دار انداز سے کی گئی۔

[9] صحیح بخاری: ابواب غسل و طہارت (میمونہؓ نے پردہ کیا)۔ موطا امام مالک: صلوٰۃ (عائشہؓ/فاطمہؓ نے پردہ کیا)

[10] نسائی: باب الغسل (آپؐ کے غلام ابو السمح نے پردہ کیا)

ذات پردہ کرو[۱]۔ حتیٰ کہ حمام میں بھی تہبند باندھنے کی تلقین کی[۲] اور مسجدیں بنا کر وہاں طہارت خانے تعمیر کرنے کی ہدایت جاری کی۔ یہ اسلام کے قومی مزاج اور آپؐ کے اس فرمان[۳] کے بعد گھر گھر غسل خانے بن گئے۔ ہر مسجد کے ساتھ طہارت خانے تعمیر کیے گئے[۴]۔ یہ احکامات مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی صادر کیے جا چکے تھے کیونکہ مسجد نبی کے بالمقابل طہارت خانے اور غسل خانے شروع دن ہی سے موجود تھے۔ حتیٰ کہ عہد نبیؐ ہی میں پبلک حمام بن گئے تھے[۵] اور اس کی مزید تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق کوفہ، بصرہ (جو بعینہٖ مدینۃ الرسول کے نقشے پر بنایا گیا تھا) میں پبلک حمام کا ذکر ابتدائی ایام میں بھی ملتا ہے[۶]۔

بیت الخلاء

صفائی کی طرح شرم و حیا بھی اسلامی تعلیم کا جزوِ لازم ہے۔ آنجنابؐ حسب عربوں کے جاہلی طریقے کے مطابق اجابت کو جاتے تو بہت دُور نکل جاتے حتیٰ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے[۷]۔ اور عورتوں کی طرح سراپا شرم و حیا بن کر اجابت فرماتے[۸]۔ مدینہ آنے کے بعد بہت دنوں تک (واقعہ افک، غزوہ بنی مصطلق ۵ ہجری) ازواج مطہراتؓ اور مومنات پاخانہ پھرنے شہر سے باہر کھلی جگہ پر جاتی رہیں[۹]۔ آخر کار رسولِ خداؐ نے اس ضمن میں اصلاح کا آغاز فرمایا۔ یہودی وغیرہ مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ تمہارا رسول تمہیں پیشاب کرنے کا بھی طریقہ سکھاتا ہے[۱۰] اور اس میں شبہ نہیں عرب کے خاک نشینوں کو فرماں روائی کے انداز بتانے کے ساتھ ساتھ آں جنابؐ نے طہارت اور اجابت کے آداب بھی سکھائے اور ان آداب میں ایسی ایسی حکمتیں، مصلحتیں پوشیدہ ہیں کہ اُن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہوگا۔

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ اخیر عہد نبویؐ میں مدینہ کے ہر گھر میں بیت الخلاء، طہارت خانہ اور غسل خانہ موجود تھا۔ آں حضورؐ کے گھر میں بھی ٹٹی خانہ[۱۱] تھا جس کا رُخ قبلہ کی طرف تھا۔ آپؐ کا یہ فرمان کہ نہانے کی جگہ پیشاب نہ کرو[۱۲] اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آپؐ نے طہارت خانے اور بیت الخلاء علیحدہ علیحدہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور غسل خانے بھی الگ بنانے کو کہا۔ یہ بات معلوم رہے کہ عہدِ رسالت میں شام میں حمام اور بیت الخلاء کا رواج تھا[۱۳]۔

البتہ ایک بات معلوم نہیں ہو سکی کہ مدینہ کے ٹٹی خانوں کی صفائی کا کیا انتظام تھا۔ کیا مدینہ کے اندر یا گرد و نواح میں کوئی ایسا طبقہ موجود تھا جو صفائی کا کام انجام دیتا تھا؟ گو تاریخی شواہد موجود نہیں مگر قرائن اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔

---

۱ و ۲ نسائی، باب الغسل (آپؐ کے غلام ابو السمح نے پردہ کیا)

۳ و ۴ ابن ماجہ، ابواب مساجد

۵ ابی داؤد، طہارت

۶ بلاذری، فتوح البلدان ج ۲ ص ۲۸۱

۷ صحیح بخاری و مسلم

۸ نسائی، باب طہارت

۹ صحیح مسلم، باب افک نیز بخاری وغیرہ

۱۰ نسائی، طہارت

۱۱ ابی داؤد، طہارت (عن ابن عمر)

۱۲ ابی داؤد، طہارت (عن ابن عمر)

۱۳ بخاری، ابواب الغسل و طہارت

قبرستان اور عید گاہ

رسول اللہؐ نے مشرکوں کے تمام قبائلی قبرستانوں کو مسمار کرا کر مسلمانوں کا علیحدہ قبرستان "جنت البقیع" مقرر کیا جو شہر کے مغرب میں بطحان کو عبور کر کے حرۂ الوبرہ کے نزدیک واقع تھا آں جنابؐ نے جاہلیت کے تمام رواجات کو بھی منسوخ کر دیا۔ اونچی یا طویل قبر بنانے، قبر پر عمارت یا گنبد تعمیر کرنے، اور اسے چونا گچ کرنے یا اس پر کسی قسم کی تحریر لکھنے سے سختی سے روک دیا۔ میت کو گھر کے اندر یا نزدیک دفن کرنے سے بھی منع کر دیا کیونکہ یہ طریقے اسلام کے صریحاً خلاف تھے[۱]

قبرستان کے نزدیک جنازگاہ تھی اور عیدگاہ کے لیے وہیں کثیر بن صلت کے مکان کے نزدیک جگہ مختص کی گئی[۲] (۱ ہجری)، شروع میں اس جگہ پر کوئی عمارت وغیرہ نہ تھی، بعد ازاں چھوٹی سی چار دیواری بنا دی گئی جس کے آثار آج تک موجود ہیں۔ یہ آثار مدینہ شہر کی چار دیواری (جو بہت بعد میں بنائی گئی تھی) سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر ہیں[۳]

آں جنابؐ عید پڑھانے کے بعد قربانی بھی وہیں عیدگاہ کے نزدیک دیا کرتے تھے[۴]

باغات

مدینہ باغوں کی سرزمین کہلاتا تھا اور یہاں کے لوگ باغات کے بہت شوقین تھے۔ اسی وجہ سے رسالتمآبؐ نے شہر اور مسجد کی تعمیر کے وقت یہ کوشش کی کہ وہاں موجود کھجور کے درختوں کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ دیگر روایات کے مقابلے میں ابن خلدون کی یہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ نصف اشجار کٹا دیئے جو شہتیر باندھنے کے لیے کام میں لائے گئے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد النبیؐ، حجرات برائے ازواج مطہرات، اور دیگر عمارات بنانے کے لیے بھی یہ درخت کام آئے ہوں گے ——— باقی نصف کے قریب درختوں کو رہنے دیا گیا۔ مسجد النبیؐ کے دروازے کے قریب کھجور کے درختوں کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے جہاں غسل خانہ اور طہارت خانہ بھی تھا اور کنواں بھی اسی جگہ تھا۔ ثمامہ بن اثال نے اسلام لانے کے لیے غسل اسی جگہ کیا۔ مسجد النبیؐ کے بڑے دروازے کے بالمقابل حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کا

---

۱ اجتماعی احکامات کے لیے دیکھئے مسلم، ابن ماجہ، بخاری، ابی داؤد کے ابواب، جنائز، غسل، قبور وغیرہ

۲ صحیح بخاری : صلوٰۃ

۳ محمد حمید اللہ : میدانِ جنگ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ مسجد و مدینہ

۴ آں جنابؐ کے قربانی کا جانور اتنے دُور ذبح کرنے میں کچھ مذہبی مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ قدیم زمانہ سے عبادت کے تصوّر کے ساتھ قربانی جزوِ لاینفک رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مشرق و مغرب اور زمانہ قدیم و جدید میں جتنی عبادت گاہیں بنیں، ان کے ساتھ قربان گاہ ضرور تعمیر کی گئی۔ یہ قربان گاہیں مدوّر شکل میں عبادت خانے کے ساتھ متصلاً ہوتیں۔ اسلام میں یہ قربانی کسی شخص کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا کے لیے ہے۔ اگر رسالتمآبؐ قربانی کا جانور گھر میں ذبح فرماتے جو کہ مسجد کے متصل تھا تو بعد میں اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا تھا اس لیے آپؐ نے احتیاط فرماتے ہوئے ذبح عیدگاہ میں فرمانے کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر غلام یزدانی کا مضمون "مکہ" (دائرہ معارف علی) ملاحظہ کیجئے جس میں مکہ کی قربان گاہ کے متعلق محققانہ رائے قائم کی گئی ہے۔

وسیع اور شاداب باغ بئرحاء تھا۔ جہاں آں جنابؐ اکثر تشریف لے جاتے۔ بعید نہیں کہ شہر میں اور بھی باغات ہوں۔[1]

خندق ایرانی اثرات کے تحت اگرچہ عرب کے کئی ایک شہروں کے گرد فصیل تھی[2] مگر یثربی تعمیرات پر یمنی یا حبشی اثرات[3] زیادہ تھے لہٰذا وہاں فصیل کی بجائے یمنی طریق دفاع کے مطابق قلعے (اطم: آطام) تھے[4] حتیٰ کہ یہود کے آباد کردہ شہر یثرب کے گرد بھی فصیل نہ تھی۔[5] آں حضورؐ نے بھی کوئی فصیل نہ بنائی البتہ جنگِ احزاب کے موقع پر شمالی جانب حرۂ واقم سے جبلِ سلع تک خندق کھود کر شہر کا دفاع کیا۔ دیگر لوگوں نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے طور پر خندق کو عیدگاہ کے مغرب سے گزار کر کافی دُور قُبا تک بڑھا دیا۔ خندق کو چونکہ بطحان نالہ میں سے گزارا گیا تھا اس لیے بطحان خصوصاً طغیانی کے ایّام میں خندق میں سے ہو کر بہنے لگی۔ ایسی ہی ایک طغیانی سے عہدِ عثمانی میں مدینہ شہر کے مغربی حصّے کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔[6]

مدینہ میں نکاسیٔ آب کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں آیا کیونکہ شہر اونچی ڈھلوانی جگہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اگر کہیں سے کوئی پہاڑی ندی نالہ گزرتا تھا تو وہاں پُشتے باندھ کر عمارات اور تعمیرات کو محفوظ بنا دیا گیا تھا۔

گلیوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ عرب چراغ کے استعمال سے واقف نہ تھے حتیٰ کہ ایک مدت تک گھروں میں بھی چراغ نہ جلتے تھے۔ بعد ازاں مسجدوں میں رات کے وقت روشنی کا معقول انتظام کر دیا گیا۔ شروع شروع میں خشک لکڑیاں جلا کر، بعد ازاں چراغ کا انتظام کیا گیا۔[7] مدینہ میں ایک ریسٹوران کا سراغ بھی ملتا ہے جو حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ چلاتے تھے۔[8]

حضرت ابوبکرؓ کا پارچہ بافی کا کارخانہ سُنح میں تھا۔[9] سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ابوبکرؓ کا کارخانہ سلع میں تھا۔ یا تو یہ دُوسرا کارخانہ تھا یا پھر یہ املا کی غلطی ہے۔

سرکاری مہمان خانہ آں حضورؐ کے جدِ اعلیٰ قصی نے زائرین بیت اللہ کے قیام و طعام کا شہری مملکتِ مکہ کی طرف سے سرکاری انتظام کیا تھا اور اس غرض کے لیے اہلیانِ مکہ پر خصوصی ٹیکس عائد کیا تھا۔ مہمان دارالندوی میں ٹھہرائے جاتے یا کھلے میدان میں خیمے لگا کر رہتے۔ گھروں میں ٹھہرانے کا بھی انتظام کیا جاتا، تاہم آنحضرتؐ کے زمانہ سے کچھ پہلے قریشِ مکہ نے عربوں کی مہمان داری کی شاندار روایات کے برعکس زائرین کو گھروں میں عارضی رہائش اور ان کے لیے طعام اور طواف کا مخصوص لباس (حمسی)، فراہم کر کے روپے بٹورنے کا ذریعہ بنا لیا۔ سرکاری لنگر خانہ اگرچہ بند نہ ہوا تھا تاہم زیادہ تر حجاج قیام و طعام کا

---

[1] صحیح بخاری۔ نسائی۔ ابن ماجہ: ابواب تفسیر القرآن: لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ الخ

[2] طائف اور جرس کے گرد فصیل تھی۔ طائف کی فصیل ایرانی انجنیئروں نے بنائی تھی۔ طائف کے نزدیک جرس تھا۔ طائف کے ایران کے ساتھ تجارتی روابط بہت گہرے تھے۔ طائف کا معنیٰ "گھیرا" ہوتا ہے۔ شہر کا نام اس لیے طائف "گھرا ہوا شہر" پڑ گیا (کریسٹ ویل۔ محمد حمید اللہ، مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ)

[3] لی بان — تمدن عرب (اردو ترجمہ)   [4] سید سلیمان ندوی: ارض القرآن ج ۲ ص ۲۹۰، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ مدینہ

[5] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام "مدینہ"   [6] محمد حمید اللہ: میدانِ جنگ   [7] صحیح بخاری نیز سلیمان ندوی

[8] سلیمان ندوی بحوالہ استیعاب   [9] محمد حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ۔

انتظام ذاتی طور پر ادائیگی کر کے (PAYING GUEST) کرتے۔[۱] عرب میں دستور تھا کہ قبیلہ کا شیخ مالِ غنیمت کا چوتھا حصہ وصول کرتا اور اگر کوئی تجارتی قافلہ اس قبیلے کی سرحدات سے گزرتا یا حدود میں اُترتا تو اُس سے عُشر بطور محصول چنگی کے وصول کیا جاتا۔[۲] اس رقم سے ضروری اخراجات پُورے کرنے کے علاوہ قبیلے کے مہمانوں کے لیے طعام کا انتظام شیخ کیا کرتا تھا اور مہمان کو عموماً چوک میں ٹھہرایا جاتا۔ مکہ میں قبیلہ کی چوک کو نادی اور یثرب میں سقیفہ کہا جاتا تھا۔ قصیّ نے چونکہ مرکزیت کا آغاز کیا اس لیے وہاں دارالندوہ قائم ہوا۔ اور نادی کی چونکہ کوئی اہمیت نہ رہی اس لیے وہ ختم ہو گئیں۔ تاہم بعثتِ نبویؐ کے وقت مکہ کے قرب وجوار کے قبائل کے ہاں ایسے چوک اور اجتماع گاہ موجود تھے۔[۳]

ہجرت کے بعد رسول اللہؐ قبائلی سرداروں کی طرح چوتھ[۴] لیتے اور زمین کی پیداوار پر عُشر بھی وصول کرتے تھے۔[۵] گو اس وقت عشر کی حیثیت ایک رضاکارانہ چندہ کی سی تھی۔ مدینہ ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین آں جنابؐ کے مہمان تھے اور ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری آپؐ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ابتدائی ایام میں مسجد النبیؐ مہمان خانہ کا کام دیتی رہی۔ وہاں ٹھہرنے والے لوگوں کے کھانے کا انتظام آپؐ (پبلک فنڈ سے) خود فرماتے۔ کتبِ احادیث میں متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اصحاب صفہ کا کھانا آپؐ کے گھر سے آتا۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ چند اصحابؓ کو چھوڑ کر جو وہاں مستقلاً اقامت گزیں تھے، اصحاب صفہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی جو وہاں عارضی طور پر ٹھہرے ہُوئے ہوتے۔ ایک ایسے مہمان کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے لیے بستر تک کا بندوبست بھی آپؐ نے کیا۔ عُسرت اور تنگ دستی کے ابتدائی ایام میں مہمان داری کے فریضہ سے اگر آپؐ خود عہدہ برآ نہ ہو سکتے تو مہمان کو یا تو کسی صاحبِ استطاعت مخیر مسلمان کے حوالے کر دیا جاتا یا تعداد زیادہ ہونے کی صورت[۶] میں بالخصوص چندہ کی اپیل کر کے مہمانوں اور مسافروں کے طعام اور دیگر ضروریات کا انتظام کیا جاتا۔ بعد ازاں قرآن مجید نے ابن السبیل کا انقلابی[۷] نظریہ پیش کر کے زکوٰۃ[۸] کے اخراجات کی ایک مد ابن السبیل کے لیے مختص کر دی جن میں اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے والے کے علاوہ زائرین حرمین، طالبانِ علم اور سفیر۔ حتیٰ کہ کاروبار یا نجی کام کے لیے سفر اختیار کرنے والے ہر قسم کے مسافر شامل تھے اور یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مہمان تھے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر عرب قبائل جن کے ساتھ آپؐ کے معاہدات ہُوئے اُن میں ایک شق مسلمان مسافروں کو کم از کم تین روز تک طعام و قیام کی سہولت دینے کے بارے میں بھی درج ہے۔[۹]

دیارِ یہود کے مسخر ہونے کے بعد سرکاری مہمان خانہ مسجد النبیؐ سے وہاں منتقل کر دیا گیا تاہم مسجد النبیؐ بھی اس مقصد کے لیے

۱، ۲، ۳ محمد حمید اللہ: MUSLIM CONDUCT OF STATE نیز "سیاسی زندگی"

۴ القرآن، سورت الانفال، آیت ۱ رکوع ۵ جنگ بدر کے بعد اتری۔ قبل ازیں آں جنابؐ غزوات میں حاصل ہونے والے غنائم کا عرب کے جاہلی طریقے کے مطابق چوتھا حصہ ہی وصول کرتے رہے مثلاً ابن جحش کا سریا۔

۵ ابوعبید، کتاب الاموال ۶ قبیلہ بنی اسد کے لیے رقم اسی طرح فراہم کی۔ ابی داؤد / نسائی: ابواب زکوٰۃ وصدقات

۷ عبدالرحمان طاہر سورتی، مقدمہ کتاب الاموال (اردو ترجمہ) ۸ القرآن: سورۃ توبہ، آیت ۶۰

۹ امام ابی یوسف: کتاب الخراج۔ وثائق السیاسیۃ محمد حمید اللہ معاہدات جذام۔ قبائل دومۃ وغیرہ

اخیر عہدِ نبوی تک استعمال کی جاتی رہی۔ وفودِ طائف اور نجران وغیرہ آئے تو یہیں ٹھہرتے[1] شاید معزز مہمانوں کے ٹھہرانے کے لیے علیحدہ انتظام دیارِ قریظہ میں کیا جاتا اور عام مہمان مسجد میں ہی ٹھہرائے جاتے۔ حضر موت کے وفد کا سردار وائل بن حجر حرہ کی بستی (نام کا تذکرہ نہیں ہے۔ اندازہ ہے بنی قریظہ کی بستی ہی ہوگی) میں لے جائے گئے۔ امیر معاویہ کڑکتی دھوپ میں ننگے پاؤں، پاپیادہ اسے چھوڑنے گئے تھے جبکہ وائل گھوڑے پر سوار تھا[2]۔ اسی طرح طائف کے وفد کو بھی دو جگہوں پر ٹھہرایا گیا۔

ابن سبا بن عبدالقریٰ خزاعی کا مکان بطور جیل خانہ اور حوالات کے استعمال ہوتا جہاں آپؐ غیرارادی[3] قاتل، مقروض[4] وغیرہ کو قید رکھتے۔

مدینہ کی مساجد

دارالخلافہ مدینہ میں مرکزی مسجد کی تعمیر کے بعد حوالئِ مدینہ کی بستیوں میں بھی مسجدیں بہت جلد بننے لگیں[5] تاہم ایک مدت تک مدینہ اور اس کے قرب و جوار کی آبادیوں کے لیے صرف مسجد النبیؐ ہی اقامتِ صلوٰۃ کا کام دیتی رہی۔ بنی سلمہ کے لوگوں نے جب نماز کی سہولت کے پیشِ نظر اپنے قریہ سے اُٹھ کر مدینہ میں آباد ہونے کی التجا کی تو آپؐ نے یہ کہہ کر اسے منظور نہ کیا کہ نماز کے لیے دور سے چل کر آنے کا ثواب زیادہ ہے۔ سیاسی اور معاشرتی انتشار کے شکار لوگوں میں ملتِ واحدہ[6] کا تصور ابھارنے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مرتبہ ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا، تاکہ قبائلی رقابتیں اور جاہلی تعصبات کی دیواریں منہدم کر کے اسلامی اخوت کی عمارت اٹھائی جا سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی ہجرت سے پیشتر تقریباً ہر قریہ میں لوگوں نے نماز کے لیے الگ جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ گمان غالب ہے کہ خاندانی عداوتوں کی وجہ سے یثربی مسلمان آں جنابؐ کی تشریف آوری سے پیشتر ایک جگہ جمع ہو کر نماز ادا نہ کر سکے تھے اور پہلا موقع تھا کہ (قبا یا) محلہ بنی سالم میں رسولِ خداؐ[7] کی معیت میں مسلمانوں نے باہم مل کر نماز پڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت نگاروں اور محدثین نے اس واقعہ کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے اور حاضر مسلمانوں کی تعداد بھی گنوائی ہے۔ ان خاندانی اور پشتینی عداوتوں کا ختم کرنا انتہائی ضروری تھا اور ان کا توڑ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہو سکتی تھی یا آپؐ کی مسجد۔

ایک دفعہ جب مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور فکری تبدیلی مکمل ہوگئی تو پھر حوالئِ مدینہ کی دیگر بستیوں کو نہ صرف مسجد بنانے کی اجازت مرحمت[8] فرمائی بلکہ اس کے لیے ترغیب بھی دی۔ وہ بستیاں جو کاملاً دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں، وہاں کے لوگوں کی سہولت اور آسانی کے پیشِ نظر مسجدیں بنانے کی اجازت دی گئی کیونکہ اقامتِ صلوٰۃ کے لیے دن میں پانچ مرتبہ چل کر مسجد النبیؐ میں حاضر ہونا بڑا کٹھن اور تکلیف دہ فریضہ تھا۔ بعض بستیاں مدینہ کی مسجد سے چار میل[9] کے فاصلہ پر تھیں مثلاً قبا ——— اور اسی لیے

---

[1] سیرت ہشام، طبری [2] تاریخ ابن خلدون

[3] و [4] محمد حمید اللہ، مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ [5] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لفظ مسجد (مودودی: تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۳۲ رقمطراز ہیں کہ غزوۂ تبوک تک مدینہ میں صرف دو مسجدیں تھیں مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

[6] ترمذی، کتاب التفسیر نیز صحیح مسلم و صحیح بخاری [7] ابن ماجہ: ابواب المساجد والجماعت [8] صحیح بخاری۔ (اوپر دیکھیے حدودِ حرم)

قُبا غالباً پہلی بستی تھی جسے مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ملی اور اسی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ مسجد قُبا مسجد النبیؐ سے پہلے تعمیر کی گئی۔ (تفصیلی بحث اوپر گزر چکی ہے)۔ کچھ آبادیاں اور قریے ایسے بھی تھے جہاں ابھی تک چند افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ ایسی آبادیوں میں مسجدیں بنانے کی ترغیب و تحریص کی گئی[۱] تاکہ اس طرح وہاں اسلام کے اثرات کو تقویت پہنچے۔

ہر قبیلے کو مسجد بنانے کی اجازت دینے کا مطلب یہ بھی تھا کہ "اسلامی دولتِ مشترکہ" میں شامل ہر یونٹ کی داخلی خودمختاری کو تسلیم کر لیا گیا ہے[۲] اور پیہم داخلی خلفشار کی وجہ سے اہلِ یثرب چونکہ اسی طرح کے نظام کے عادی ہو گئے تھے اس لیے سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ فیصلہ دُور اندیشانہ اور مستحسن تھا۔ قبیلے کی معاشرتی اور سیاسی زندگی سقیفہ کے گرد گردش کرتی تھی۔ ہر محلہ میں مسجد بن جانے کے بعد سقیفہ کی اہمیت بتدریج کم ہو گئی ——— پھر آں جنابؐ نے لوگوں کو سقیفہ میں جمع ہونے سے روک دیا۔ لوگوں کی طرف سے جب یہ عذر پیش کیا گیا کہ اس کے علاوہ بیٹھنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ہوتی تو آپؐ نے وہاں بیٹھنے کی تو اجازت دے دی[۳] مگر اس کی کچھ شرائط طے کر دیں[۴]۔ اس طرح قبائلی اجتماع گاہیں اور چوکیں وصالِ نبویؐ تک قائم رہیں مگر ان کی سیاسی و معاشرتی اہمیت قریب قریب ختم ہو گئی۔ محلّے کی سطح تک ان کی جگہ محلّے کی مسجدوں نے لے لی اور مرکزی طور پر اختیارات زیادہ سے زیادہ ذاتِ رسولِ مقبولؐ میں مرتکز ہو گئے اور مسجد النبیؐ مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی، سیاسی اور عسکری، تعلیمی اور تہذیبی زندگی کا محور بن گئی۔

مسجدوں کی تعمیر کے ضمن میں اگلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ایک حکمنامے کے ذریعے ہر مسلمان آبادی کے لیے مسجد بنانا لازمی قرار دے دیا[۵]۔ یہ حکم فتح مکہ یا سورۂ براۃ کے نزول کے بعد جاری کیا گیا ہوگا۔

تحویلِ قبلہ کے اعلان (۱۶ یا ۱۷ ماہ بعد ہجرت) کے وقت تک مدینہ میں کئی ایک مسجدیں بن چکی تھیں۔ تحویل کا حکم بنی سلمہ کی مسجد میں اترا ——— جس کی وجہ سے اس کا نام قبلتین (دو قبلوں والی مسجد) پڑ گیا۔ یہ حکم خداوندی دیگر مساجد میں آں جنابؐ کے فرستادہ منادی نے پہنچایا۔ مگر بعض مسجدیں اتنی دُور تھیں کہ اُن تک یہ خبر دُوسرے روز پہنچی[۶]۔ حوالیٔ مدینہ میں مساجد تعمیر ہو جانے کے باوجود وصالِ نبیؐ تک جمعہ صرف مسجد النبیؐ میں ادا ہوتا تھا۔ شاید دوسری کسی بستی کی مسجد کو جمعہ کا اہتمام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد النبیؐ میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے لوگ عوالی کے دُور دراز قصبات سے آتے تھے اور اسی واسطے احادیث میں یہ روایت درج ہے کہ مسجد النبیؐ کے بعد پہلی مسجد جہاں نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا وہ بنی عبدالقیس کی مسجد ہے، جو صوبہ بحرین کے شہر جواثا میں تھی[۷]۔

---

[۱] ابن ماجہ : ابواب مساجد

[۲] و [۳] ترمذی؛ کتاب الآداب

مساجد عن عائشہ، ترمذی؛ کتاب الصلوٰۃ۔

[۴] صحیح بخاری؛ کتاب الصلوٰۃ، باب جمعہ

[۵] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام : تحت لفظ مسجد

[۶] ابی داؤد؛ طہارت عن سمرہ بن جندب نیز ابن ماجہ باب تطہیر

[۷] صحیح مسلم، ابواب الصلوٰۃ

قبیلے کی مسجد بنانے کی ذمہ داری قبیلے کا سردار عموماً اپنے سر لے لیتا یا تعمیر میں پیش پیش رہتا۔ مسجدیں بنانے میں ابو اُمامہ، اسعد بن زُرارہ، عُتبان بن مالک اور سعد بن خُزیمہ کے نام کتبِ احادیث و سِیَر میں واضح طور پر آئے ہیں۔ یہ سب حضرات اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ مسجد النبیؐ کی طرح محلّے کی مسجدوں میں بھی عہدِ رسالت ہی میں توسیع اور اضافے ہوتے رہے[1]۔ ہر نئی تعمیر ہونے والی مسجد کا افتتاح رسولِ خداؐ وہاں خود نماز پڑھوا کر کرتے[2] اور گاہے گاہے آں جنابؐ ان مساجد کا دورہ کر کے[3] وہاں کی تعلیمی، معاشرتی سرگرمیوں کا معاینہ کرنے کے علاوہ عدالتی فیصلے بھی کرتے۔

عہدِ نبویؐ میں جوفِ مدینہ میں کل نو مسجدیں تھیں[4]۔ پیڈرسن نے مسجد نبویؐ سمیت آٹھ[5] مساجد کے نام گنوائے ہیں۔ خیال ہے کہ نویں مسجد مسجد الضرار ہوگی جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے، جسے آں حضورؐ نے گرا دیا اور اس کے تعمیر کرنے والے منافقین کو سزا دی۔

۳۔ قبا ——— محلہ عمرو بن عوف میں تھی۔ سعد بن خزیمہ نے سباء نامی عورت سے زمین خرید کر مسجد بنائی۔ مسجد بنانے سے پہلے اس جگہ پر گدھے باندھے جاتے تھے[6]۔

۴۔ بنی قریظہ ——— یہ یہود کی بستی تھی۔ ان کے اخراج (۹ ہجری) کے بعد جب مسلمان مہاجرین کو وہاں بسایا گیا تو شاید انہوں نے وہاں مسجد بنائی ہوگی۔

۵۔ بنی حارثہ ——— شاید، یہ مسجد بھی جنگِ خندق کے بعد تعمیر کی گئی ہوگی کیونکہ بنی حارثہ خندق کے بعد اسلام لائے تھے۔

۶۔ بنی ظفر ——— یہ یہود کا ایک قریہ حرّہ واقم پر تھا۔ اندازہ ہے کہ یہ مسجد بھی بعد میں بنی ہوگی۔

۷۔ بنو وائل ——— یہ قبیلہ بھی خندق کی جنگ کے بعد اسلام لایا۔ یہ مسجد بھی بعد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ بنی حَرام
۹۔ بنی زُرَیق } ——— یہ مسجدیں ابتدائی زمانے میں بنائی گئی ہوں گی۔

تاہم اس فہرست میں اضافہ کیا جا سکتا ہے:

۱۰۔ بنو سلمہ ——— یہ قبیلہ سابق الاسلام اور یہود کا سخت مخالف تھا۔ ان کا ایک مدّت سے یہ تقاضا تھا کہ یہود کے قبلہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے کی بجائے مسلمانوں کا علیحدہ قبلہ ہونا چاہیے۔ اس تقاضے کے اور آں حضورؐ کی خواہش کے جواب میں یہ حکم بنی سلمہ کی مسجد میں اُترا[7]۔ یہ مسجد سواد بن غنیم

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان ص ۲ [2] نسائی، صلوات، ابن ماجہ، مساجد فی الدار، بلاذری: فتوح ص ۲
[3] صحیح مسلم و بخاری [4] مودودی: تفہیم القرآن
[5] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ 'مسجد' از جے پیڈرسن [6] ترمذی: صلوات
[7] منٹگمری واٹ: 'اسلام'

بن کعب بن سلمہ نے بنوائی تھی۔

۱۱۔ عمرو بن سلمہ جس مسجد کے امام سات سال کی عمر میں مقرر ہوئے۔ یہ مسجد مدینہ سے شام جانے والے راستہ پر تھی[1]

۱۲۔ بنی عبد الاشہل ——— اس مسجد میں آں حضورؐ نے کئی مرتبہ نماز پڑھوائی[2]

۱۳۔ بنی معٰویہ ——— یہ اسفل کی بستی تھی۔ یہاں بھی رسولِ خداؐ نے متعدد مرتبہ نماز ادا کی[3]

۱۴۔ مسجد بنی سلیم[4]

۱۵۔ مسجد خیف ——— یہ جوف مدینہ میں تو واقع نہ تھی، مگر حج کو جاتے وقت راستے میں پڑتی تھی۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا[5]

۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ، حضرت عتبان بن مالکؓ[6] اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی مساجد یہاں یہ حضرات امامت کے فرائض انجام دیتے تھے ——— تاہم ان تینوں مسجدوں کے بارے میں یہ بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ اوپر درج کی گئیں مسجدوں کے علاوہ تھیں۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کو گھروں کے اندر مسجدیں بنانے کی ترغیب دی[7]۔ تاکہ صبح و شام اللہ کی پاکی اور عظمت گھروں میں بیان کی جاتی رہے اور اس ضمن میں آں جنابؐ کے اس فرمان کے بعد کہ فرائض کے علاوہ نماز کے لیے بہترین جگہ گھر ہے ——— مدینہ میں کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جہاں مسجد نہ بنا لی گئی ہو۔ ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے اس عنوان کا علیحدہ باب باندھا ہے "مساجد فی الدار"۔ تاہم یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ گھر کے اندر سب سے پہلی مسجد بنانے کا شرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہوا۔ انہوں نے مکہ ہی میں اپنے گھر میں مختصر سی مسجد نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کے لیے بنالی تھی[8]

مدینہ کی فوجی چھاؤنی

مدینہ کا شہر بنیادی طور پر ایک فوجی مستقر تھا۔ وہاں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے بلا استثناء فوجی خدمت انجام دینا لازم تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی غزوہ یا سریا پر مجاہدین کا صرف ایک حصہ روانہ کیا جاتا، اور باقی لوگوں کو شہری دفاع اور نگہداشت یا دیگر امور کی بجا آوری کے لیے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ اور دیکھا جائے تو مدینہ کے مخصوص حالات اور داخلی و بیرونی خطرات اور خدشات کے پیشِ نظر ایسا کرنا تھا بھی ناگزیر۔ مہم پر بھیجے جانے والے مجاہدین کے ناموں کی باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی[11]۔ غنائم میں سے بڑا حصہ شرکاء کو دیا جاتا، اور قدرے کم ایک حصہ ان لوگوں کو بھی ملتا جو لڑائی کے

---

[1] ابی داؤد: صلوات عن عمرو بن سلمہ
[2] ترمذی: احکامات، ابن ماجہ: صلوات
[3] موطأ امام مالک: صلوات عن ابن عمر
[4] بلاذری: فتوح البلدان ص ۵
[5] ابن ماجہ: صلوات
[6] ابی داؤد: مساجد
[7] ابن ماجہ: مساجد فی الدار
[8] نسائی: صلوات، ابن ماجہ: صلوات
[9] القرآن، سورۃ الاحزاب، آیت ۳۴
[10] ابی داؤد: مساجد عن عبداللہ بن مسعود
[11] صحیح مسلم: کتاب الجہاد، بخاری: عن حذیفہ وغیرہ یہ نام کہیں ۵۰۰/۷۰۰/ ۱½ ہزار (ترمذی) تک لکھے پائے گئے۔

دوران مدینہ میں مقیم رہتے [۱] آں حضورؐ کا یہ فرمان کہ دو آدمیوں میں سے ایک جہاد کے لیے نکلے اور لڑتا ہوا شہید ہو جائے یا زندہ واپس لوٹے اور دُوسرا گھر میں رہتے ہُوئے مدافعت کرے دونوں کا اجر برابر ہے [۲] انتہائی اہمیت کا حامل اور غور طلب ہے۔ اجر سے یہاں مالی منفعت بھی مراد ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر عام لام بندی کا اعلان اور لڑائی سے گریزاں (DEFAULTERS) مسلمانوں کا کورٹ مارشل (COURT MARTIAL) ظاہر کرتا ہے [۳] کہ مدینہ ایک فوجی چھاؤنی (CANTONMENT) تھی، اور اس کے مکین فوجی خدمت کے لیے کسی وقت بھی طلب کیے جا سکتے تھے۔ اخیر عہد نبویؐ میں تمام فوجیوں کا باقاعدہ رجسٹر تیار کر لیا گیا تھا جس کے دو حصے تھے، ایک میں مجاہدین کے ناموں کا اندراج تھا اور دُوسرے میں منافقین کا — جو بلانے پر اکثر حاضر ہو جاتے مگر ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

القرآن نے مسلمان مجاہدین کو مشرکین سے قتال کے لیے گھوڑے رکھنے کی ترغیب [۴] دی اور رسول اللہؐ کے اس ضمن میں متعدد فرمودات ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو رِباطِ الخیل رکھنے اور سدھارنے کے لیے بار بار اُبھارا گیا [۵]۔ جنگی گھوڑوں پر زکوٰۃ معاف کر دی [۶]۔ اسلامی حکومت کو جب مالی وسائل میسر آ گئے تو سرکاری گھوڑوں کا بھی انتظام کیا گیا اور ان کے چرنے کے لیے بقیع کی چراگاہ مختص کر دی گئی [۷] جو خالصۃً سرکاری چراگاہ تھی [۸]۔ اندازہ ہے کہ غزوہ بنی قریظہ سے قبل یہ چراگاہ قائم ہو چکی تھی۔ جن مجاہدین کو سواری کی ضرورت ہوتی اور وہ خود انتظام نہ کر سکتے تو سرکاری گھوڑوں میں سے اُسے سواری مہیا کی جاتی [۹]۔ غزواتِ نبویؐ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی لشکر میں گھوڑوں کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی اور دو سے بڑھ کر سینکڑوں تک پہنچ گئی [۱۰]۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ عرب میں گھوڑا بڑی تعیش کی چیز سمجھا جاتا تھا اور اس زمانے کے طریقِ حرب و ضرب کے لحاظ سے گھوڑوں پر مشتمل رسالہ (CAVALARY) کو زبردست اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ رباط الخیل میں آں جنابؐ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی حکومت ایک

---

[۱] ابی عبید: کتاب الاموال

[۲] صحیح مسلم: ابواب جہاد عن ابو سعید خدری

[۳] دیکھیے جنرل اکبر خاں: حدیث دفاع نیز صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ

[۴] القرآن - الانفال آیت ۶۰۔ (واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃٍ و من رباط الخیل ترھبون بہٖ عدو اللہ و عدوکم و اٰخرین من دونھم.....)

[۵] صحیح بخاری، مسلم، ابی داؤد (ابواب الجہاد)

[۶] ابی یوسف: کتاب الخراج و ابی عبید: کتاب الاموال

[۷] و [۸] صحیح بخاری

[۹] ابن ماجہ: کتاب جہاد (غزوۂ تبوک و حنین)

[۱۰] بدر میں صرف دو گھوڑے تھے (سیرت ابن ہشام) دیکھئے جنرل اکبر خاں: حدیث دفاع و محمد حمید اللہ: سیاسی زندگی، میدان جنگ

قابلِ رشک اور ناقابلِ شکست رسالہ کھڑے کرنے میں کامیاب ہو گئی جو سرکاری اور نجی گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ لڑائی کے لیے گھوڑوں کو سدھایا جاتا۔ گھڑ دوڑ کے باقاعدہ مقابلے ہوتے۔ تربیت یافتہ گھوڑے مسجد السبق سے ثنیۃ الوداع تک (پانچ میل) دوڑتے۔ غیر تربیت یافتہ گھوڑوں کی دوڑ کے لیے کم فاصلہ (۲/۱ ۲ میل) مقرر تھا۔ فوج کے لیے مختص انہی میدانوں (MILITARY GROUNDS) میں تیر اندازی (چاند ماری)، تیراکی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے بھی مقابلے ہوتے۔ بحیثیت سپہ سالارِ اعلیٰ (SUPREME MILITARY COMMANDER) آں حضرتؐ ان فوجی مشقوں کا معاینہ فرماتے اور اعلیٰ کارکردگی پر حوصلہ افزائی کے انعامات بھی عطا فرماتے۔ یہ مشقیں باقاعدگی سے منعقد ہوتیں[1]

عہدِ رسالت مآبؐ کے آخری دنوں میں الجرف کو لشکر کی اجتماع گاہ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ الجرف ایک فوجی مستقر (MILITARY CANTONMENT) تھا یا نہیں۔ تاہم یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے یہیں اکٹھی ہوتی، مجاہدینِ جنگ کی تیاریاں کر کر کے یہاں پہنچتے اور کوچ کی مقررہ تاریخ تک وہیں ٹھہرے رہتے۔ جب لشکر واپس لوٹتا تو (آپؐ کی ہدایت کے مطابق) سیدھا اپنے گھروں میں جانے کی بجائے[2] لشکری یہاں جمع ہوتے اور ایک رات یا دن کا ایک حصہ وہاں قیام کرنے کے بعد انہیں منتشر ہونے کی اجازت دی جاتی۔ اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کا یہیں اجتماع ہوا[3]۔ رسالت مآبؐ کی اچانک علالت کی وجہ سے اسکی روانگی ملتوی کر دی گئی حتیٰ کہ وصالِ نبویؐ تک لشکر وہیں رُکا رہا[4]، عہدِ صدیقِ اکبرؓ اور حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانۂ خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی الجرف چھاؤنی کا کام دیتا رہا۔ یہاں تک کہ بصرہ اور بعد ازاں کوفہ، فسطاط کی چھاؤنیوں میں لشکرِ اسلام کو ٹھہرانے کا انتظام کر لیا گیا۔ عہدِ صدیقیؓ میں شامی محاذِ جنگ کی کمان جب فیلڈ مارشل ابو عبیدہ بن جراح کے سپرد ہوئی تو وہ یکم صفر ۱۳ ہجری کو الجرف میں آ گئے[5]۔ فوج گروہ در گروہ وہاں آ آ کر جمع ہونے لگی۔ حضرت ابو عبیدہ کو مع افواج کے وہاں کافی دیر تک رُکنا پڑا (کیونکہ مطلوبہ تعداد فراہم نہ ہو رہی تھی)، جب لشکر کی تعداد چوبیس ہزار تک پہنچ گئی تو انہوں نے محاذِ جنگ کی طرف کوچ کیا۔ اسلامی لشکر جسے الجرف میں بعض اوقات کئی کئی روز تک ٹھہرنا یا رُکنا پڑ جاتا (غزوۂ تبوک ——— لشکر ابو عبیدہ ——— وغیرہ) وہاں اس کے قیام کے لیے کیا انتظامات تھے۔ کیا بنی النضیر کے خالی مکانات اس مقصد کے لیے مصرف میں لائے جاتے یا فوج عارضی کیمپ لگا کر رہتی تھی۔ یہ بات واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔

جُرف: ندی یا دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جس کے نیچے کی مٹی کو دریا نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور وہ گرنے کے

---

[1] محمد حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ، سیاسی زندگی، میدانِ جنگ۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے علاوہ جنرل اکبر خاں (حدیثِ دفاع و دیگر کتابیں)، اسلامی طریقِ جنگ وغیرہ) نے گرانقدر کام کیا ہے۔ محمود خطاب شیت کی کتاب: "آں حضورؐ بحیثیت سپہ سالار" (اردو ترجمہ) ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ نیز بخاری و مسلم کے ابواب (مساجد و عیدین)

[2] نسائی: جہاد، بخاری: الآداب

[3] محمد حسین ہیکل "محمدؐ"

[4] طبقات ابن سعد

[5] بلاذری: فتوح البلدان ص ۱۰۸

قریب[1] ہو۔ الجرف بنی النضیر کا علاقہ تھا[2]۔ وہاں زیادہ ٹیلے تھے[3]۔ یہ علاقہ جرف کے جنوب مشرقی گوشے میں اس جگہ واقع تھا جو پیچھے کو پچکی ہوئی تھی۔ دفاعی نقطۂ نظر سے یہ جگہ انتہائی اہم اور محفوظ تھی۔ فوجی پریڈ کے میدان اس کے قریب واقع تھے۔

مدینہ کا بازار مدینہ میں خرید و فروخت کی سہولت کے لیے علیحدہ منڈی یا بازار بنایا گیا۔ خیال ہے کہ یہ منڈی بنی قینقاع کے اخراج (۲ ہجری) کے بعد قائم ہوئی ہوگی[4]۔ کیونکہ اس سے پیشتر عبدالرحمان بن عوف اور دوسرے تجارت پیشہ مسلمان اپنا کاروبار قینقاع کے بازار میں کرتے تھے[5] ——— قینقاع کے اخراج کے ضمن میں فوری سبب بننے والا واقعہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ابھی تک (۲ ہجری) مسلمان خرید و فروخت کے لیے قینقاع کے بازار میں جاتے تھے اور یہ وضاحت کہ مسلمان عورت جس کی یہودی سناروں نے بے عزتی کی[5] ——— زیورات بنانے کے لیے گئی تھی، اس لحاظ سے غور طلب ہے کہ اخراج کے پس پردہ مسلمانوں کے تاجر گروہ کی تجارتی رقابت بھی کارفرما تھی۔

مدینہ کا بازار مسجد النبیؐ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا، کیونکہ عہد عثمانی میں نماز جمعہ کے لیے تیسری اذان بازار کے ایک مقام زوراء سے دی جاتی تھی[6] ——— معلوم ہوتا ہے کہ بازار ایک جگہ اور کسی خاص ترتیب سے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ دکانیں اِدھر اُدھر منتشر شکل میں موجود تھیں۔ حضرت عثمانؓ کے رہائشی مکان کے نزدیک جو دکانیں تھیں انہیں مقاعد کہا جاتا تھا[7]۔ ایک دوسری جگہ دارِ ابی جہم کے نزدیک جہاں دکانوں کا جھگھٹا سا تھا بلاط کے نام سے مشہور تھی۔ ایک تیسری جگہ مسجد کے صدر دروازے کے غالباً نزدیک ہی زوراء کہلاتی تھی۔ بازار کے یہ حصے مسجد النبی کے چوطرف بکھرے ہوئے تھے۔ بازار خاصا وسیع و عریض تھا اور اخیر عہد نبویؐ میں نہایت بارونق اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ تجارت کے فروغ کے لیے جناب رسالتمآبؐ نے زبردست کوششیں کیں جس میں سب سے اہم آپؐ کا یہ فرمان تھا کہ "مدینہ کی منڈی میں کوئی خراج نہیں ہے[8]" زمانہ جاہلیت میں خفارہ کا نظام اور قدم قدم پر محصول چنگی[9] کی وجہ سے تجارت میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔ آپؐ نے مختلف سیاسی اور عسکری مصالح کے پیش نظر یہ حکم صادر فرمایا جو دور رس نتائج کا حامل تھا اور دراصل اس طرح آپؐ نے صرف چنگی کی لعنت ہی ختم نہ کی بلکہ جزیرۃ العرب کی تسخیر کے بعد تمام ملک میں، مدینہ کی طرح آزادانہ درآمدات اور برآمدات کی اجازت دے کر بین الاقوامی آزاد تجارت کی داغ بیل ڈالی اور جدید تحقیقات نے اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ آزاد بین الاقوامی تجارت نہ صرف اقوام ملل کے لیے بلکہ پوری نوع بشری کی مادی ترقی کے لیے ضروری ہے جس کے ذریعے بین الاقوامی طور پر اشیاء کی قیمتیں متوازن رکھ کر عوام کو فائدہ بھی پہنچایا جا سکتا ہے اور اقوام بھی خوشحال بن سکتی ہیں[10]۔

---

[1] القرآن، سورۂ توبہ آیت ۱۰۹، نیز تفہیم القرآن سورہ ہذا جلد دوم [2] بلاذری، فتوح البلدان ص ۳۰ [3] صحیح بخاری

[4] منٹگمری واٹ: "محمد مدینہ میں" [5] صحیح مسلم، ابواب ہجرت، بخاری وغیرہ [6] موطا امام مالک: صلوٰۃ

[7] ابن ماجہ: صلوات [8] بلاذری، فتوح البلدان ص ۵ [9] تفصیلات کے لیے دیکھئے: محمد حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ، نیز سیاسی زندگی۔

[10] تفصیلات کے لیے دیکھئے ECONOMICS: AN INTRODUCTION TO ANALYSIS POLICY از GEORGE - LEYLAND BACH صفحات ۹۱۱-۱۹-۹۱۵ - ۹۲۰

فخرِ موجوداتؐ (آنحضرتؐ کی مکّی زندگی)

ابوالجلال ندوی

حضرت رسولِ خدا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کو جو عقیدت ہے سو ہے، ایک بے عقیدہ انسان کا بھی یہ ضروری فرض ہے، اس عظیم شخصیت کے حالات غور اور توجہ کے ساتھ پڑھے، جس نے پُوری دنیا کے فکر و تصوّر کا انداز بدل دیا۔ عرب جیسی ایک قوم کو سارے جہان کی سیادت بخش دی۔ آخر یہ تو دیکھنا ہی چاہیے۔ اس ذات نے کیا کر دکھایا، جس کی وجہ سے اس کی بارگاہ میں صرف جنید و شبلی ہی نہیں، ابنِ سینا اور فارابی بھی باادب سر بزانو نظر آتے ہیں۔ ایک ان پڑھ، اُونٹ اور بکریوں کے چرواہے نے ایک کتاب دی، ایک دین عطا کیا، ایک طرزِ حیات سکھائی، ایک نئی سیاست دی، نیا نظامِ حکومت دیا، ایک زندہ حکمت اور سرگرم عمل دانش بخشی۔ ایسے ضوابط دیئے جو پوری دنیا میں انسانوں کے ایک گروہ کا چودہ سو برسوں تک ہر مشکل اور تاریخ کے ہر نئے موڑ پر ساتھ دیتے رہے۔ آخر کیا بات ہے کہ دنیا کی ہر ملّت کے مصلحین تو یہ کہتے ہیں کہ ماضی میں کچھ دھرا نہیں ہے، حال کو دیکھو اور مستقبل کو تصنیف کرو۔ لیکن اس مصلح کے ماننے والوں کو نہ صرف اس کے معتقدین بلکہ انسانیت کے بہی خواہ و دیگر مفکرین بھی پندرہ سو برس پیچھے ہی کی طرف مڑنے کی رائے دیتے ہیں۔

دنیا کے اور تمام بانیانِ مذاہب کی سیرتیں بھولے بسرے ماضی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں روپوش ہیں۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ کی سیرتیں ہی نہیں بلکہ ان کے واقعی کبھی موجود ہونے تک کی شہادتیں محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن دنیا میں ایک ہی قابلِ اقتدار ہستی ایسی گزری ہے، جو تاریخ کے روزِ روشن میں گزری۔ اس کے سارے احوال مستند طور پر محفوظ ہیں۔ وُہ دنیا کا کامیاب ترین انسان تھا۔ اس کی سیرت کسی ہومر، کسی بیاس اور کسی والمیک کے شاعرانہ تخیلات کی مخلوق نہیں ہے بلکہ خود اس کے ساتھ رہنے سہنے والوں اور اس کے سوانح حیات میں برابر کے شریک کئی ہزار انسانوں کی زندہ شہادتوں سے ثابت ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیانی زمانہ میں جتنے رواۃ گزرے، سب کو ایک شخص بخوبی جان اور پہچان سکتا ہے۔ دنیا میں ایک ہی شخص کی سیرت ایسی ہے جس کی صداقت پر پورا وثوق کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ہم کو ایک ایسی کتاب دی ہے، جو پندرہ صدیوں تک ہماری تمام معاشی، معاشرتی، سیاسی، علمی اور فکری ضرورتوں میں کام دیتی رہی ہے۔ اس ہادیِ اقوام کے علاوہ کسی اور ہادی کی سیرت کو اٹھائیں، تو وہ معجزات اور کرامات کا انبار نظر آئے گی۔ ان خارقِ عادت کارناموں کو سُن کر ہم حیرت کر سکتے ہیں، ان کی تعظیم کر سکتے ہیں، ان پر ایمان لا سکتے ہیں، مگر ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیحؑ کے معجزے ہم نہیں دکھا سکتے، لیکن حضرت رسولِ خداؐ کے احوال پر جب ہم غور کریں گے، تو ہم کو ان کی زندگی میں قابلِ عمل اسباق ملیں گے۔ اس لیے ایک انسان اگر بے عقیدہ ہے، تب بھی اسے چاہیے کہ اس سراپا اعجاز سیرت پر غور کرے۔ آپ کی سیرت خود اپنے ہر قاری کو اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتی ہے۔ بدعقیدہ سے بدعقیدہ انسان بھی اگر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح حیات کو پڑھے گا اور آپؐ کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، تو وُہ ہرگز بدعقیدہ نہیں رہ سکے گا۔

محمد رسول اللہؐ کی سیرت اور آپؐ کی تعلیمات کا ہر پہلو بذاتِ خود ایک مستقل موضوعِ سخن بن سکتا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم کسی مخصوص پہلو کو نمایاں کرنا نہیں چاہتے۔ آپؐ کی مکی زندگی کے چند حوادث کو تاریخی ترتیب سے پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے تاکہ ایک نظر میں ایک شخص آپؐ کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لے۔ پھر بطورِ خود آپؐ کو اور آپؐ کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ میرے اس مضمون کے مخاطب نہ خوش عقیدہ لوگ ہیں، نہ بدعقیدہ لوگ، میں صرف خالی الذہن افراد کی توجہ ایک قابلِ غور زندگی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ایامِ قبل نبوت

کسی شخص کے حالات بخوبی سمجھنے کے لیے اس شخص کے ملک اور زمانہ کے عام حالات کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے لیکن بخوفِ طوالت اس پر مفصل گفتگو کو ہم یہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

آج سے ۱۴۲۵ برس پہلے مکہ میں دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۵۳ ق۔ھ کی صبح کو ایک خوشخبری نے قریش کے ایک ایک فرد کا چہرہ روشن کر دیا۔ عربی دستور کے مطابق ایک نوجوان ابھی ایک یا ڈیڑھ سال پہلے دیوتا کے حضور ذبح کیا جانے والا تھا۔ اس نوجوان پر اہلِ مکہ کو ترس آ گیا۔ ایک کاہنہ کے مشورہ سے اونٹوں پر اور اس نوجوان پر قرعہ ڈالا گیا۔ کئی بار کے قرعہ کے بعد طے کیا گیا کہ اس جوان کے بدلے سو اونٹ قربان کر دیے جائیں تو دیوتا راضی ہو جائے گا۔ اس نوجوان کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس نوجوان کی شادی ایک شریف خاتون آمنہ بنت وہب سے ہوئی۔ بی بی کو حاملہ چھوڑ کر یہ نوجوان شام کو گیا۔ لیکن پھر زندہ لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ اس نوجوان کی وفات کے چند ہی دنوں بعد یتیم عبداللہ پیدا ہونے کی خوشخبری اہلِ مکہ نے سنی اور تقریباً ہر شخص کی زبان پر یہ ترانہ تھا:

بارك فيك الله من غلام   يا ابن الذى من حومة الحمام

نجا بعون الملك العلام   فدى غداة الضرب بالسهام

بمائة من ابلٍ سوام

(تو نہایت ہی مبارک لڑکا ہے، اے اس شخص کے بیٹے، جو موت کے منہ سے خداوند قدوس کی اعانت سے بچ گیا تھا۔ قرعہ کے روز اس کے فدیہ میں سو اونٹ قربان کیے گئے)

یہ فرزندِ عبداللہ اپنی صورت شکل سے بعینہٖ وہ شخص تھا، جس کا حلیہ سنا کر حضرت سلیمان نے فرمایا تھا:

خِلُّو محمدیم زہ دودی

وزہ روعی بنوتِ یروشلیم

(وہ سراپا ستودہ ہے، یہ ہے میرا محبوب، اور یہ ہے میری جان، اے یروشلم کی بیٹیو!)

اس بشارت کو نہ جانتے ہوئے اتفاق سے ماں اور دادا دونوں نے اس مولود مسعود کا نام محمدؐ رکھا۔ دادا نے صورت دیکھتے ہی خوش ہو کر پیش گوئی کر دی کہ اِنّ لابنی ھذا لشاناً (میرا یہ بیٹا ایک شاندار ہستی ہوگا)

عرب کے شرفاء کے دستور کے مطابق آپؐ کو اپنی ماں کا دودھ یا تو نصیب ہی نہ ہوا یا محض چند یوم۔ سب سے پہلے آپؐ کو آپؐ کے سب سے بڑے چچا ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے دودھ پلایا، جسے اس خوشی میں ابولہب نے آزاد بھی کر دیا۔ پھر آپؐ کو بنو سعد بن بکر کی ایک خاتون حضرتِ حلیمہ سعدیہؓ کے حوالہ کیا گیا، وہ آپؐ کو لے کر اپنی وادی میں چلی گئیں۔ یتیم عبداللہ کی فطرت میں خدا نے عدل رکھ دیا تھا۔ حضرت

حلیمہؓ کو نہایت حیرت تھی کہ عجیب بچہ ہے۔ آپ نے کبھی دونوں چھاتیوں کو منہ نہ لگایا۔ ایک چھاتی ہمیشہ اپنے دودھ بھائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ حضرت حلیمہؓ سے مروی ہے کہ دودھ چھڑانے کے بعد آپ نے جب باقاعدہ بولنے شروع کیے، تو سب سے پہلے جو بول آپ کی زبان سے نکلے، وہ یہ تھے:

اللہ اکبر کبیرا ٥ والحمد للہ کثیرا ٥ وسبحان اللہ بکرۃ واصیلا ٥

نہایت حیرت کی بات یہ تھی کہ ایامِ جاہلیت میں یہ فقرے کسی کی زبان سے نہیں نکلے تھے۔ سب سے پہلے یتیم عبداللہ کی زبان سے یہ کلمے ادا ہوئے۔ ان کلموں کو ادا کرتے وقت آپ کی عمر صرف دو یا ڈھائی سال کی تھی۔ دودھ چھڑانے کے بعد حضرت حلیمہؓ آپ کو آپ کی والدہ کے پاس لے گئیں مگر مکہ کی آب و ہوا ان دنوں خراب تھی، اس لیے حضرت آمنہؓ نے آپ کو حضرت حلیمہؓ کے ساتھ دوبارہ واپس کر دیا۔ حضرت حلیمہؓ کو دودھ پلانے اور آپ کی پرورش کی اُجرت دی جاتی تھی، اس لیے آپ سے حضرت حلیمہؓ کوئی کام نہ لے سکتی تھیں۔ لیکن تین سال کے بچے کی غیرت قابلِ توجہ ہے۔ آپ نے حضرت حلیمہؓ کو مجبور کر کے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے بھائی اور بہن تو دن بھر بکریاں چراتے پھریں اور میں ان کی محنت میں شریک نہ ہوں۔ مجبوراً آپ کو بکریاں چرانے کی اجازت دی گئی۔ آپ کا بکریوں کے ساتھ چراگاہوں میں جانے کا سلسلہ شروع ہوتے ہی حلیمہؓ کی بکریوں کی تعداد روز افزوں ہوتی گئی۔ دودھ دینے والی بکریاں زیادہ دودھ دینے لگیں، بکرے تر و تازہ ہونے لگے۔ چراگاہ کی ہریالی بھی قدرتاً بڑھنے لگی اور بنو سعد خوش ہوگئے: ؎

لقد بلغت بالہاشمی حلیمہ	مقاماً علا فی ذروۃ العز والمجد
وزادت مواشیہا واخصب ربعہا	فقد عم ہذا السعد کل بنی سعد

(اس ہاشمی کی برکت سے حلیمہؓ نے عزت و شرف کا اونچا مقام پا لیا۔ اس کے مویشی زیادہ ہوئے، اس کا گھر سُدھر گیا اور یہ خوش بختی تمام بنی سعد کو عطا ہوئی)

عمر شریف جب چھ برس کی ہوئی، تو حضرت آمنہؓ نے اپنے پاس بلا لیا اور آپ کو اپنے ساتھ لے کر مرحوم شوہر کی قبر دیکھنے کے لیے مدینہ گئیں۔ ان کے ساتھ آپ کی خادمہ اُمّ ایمن بھی تھیں۔ محلہ بنی نجار میں جہاں حضرت عبداللہ کی قبر تھی، ایک ماہ قیام کیا۔ واپسی میں بمقام ابوآ ماں نے بھی داغِ مفارقت دے دیا، وہیں مدفون ہوئیں۔ حضرت اُمّ ایمن آپ کو مکہ میں واپس لائیں۔ حضرت عبدالمطلبؓ جو آپ کے دادا تھے، اب ماں کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔

عمر شریف سات برس کی ہوئی، تو آپ کو آشوبِ چشم ہو گیا۔ عکاظ کے پاس ایک راہب رہتا تھا، علاجِ چشم کے لیے مشہور تھا۔ حضرت عبدالمطلبؓ آپ کو اس راہب کے پاس لے گئے۔ راہب نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ لڑکا تو ہو بہو وہی ہے جس کو حضرت سلیمانؑ خلقو محمدیم کا لقب دے چکے تھے، اس نے حضرت عبدالمطلبؓ سے کہا کہ اس بچے کا خاص خیال رکھنا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے اس کو ایک عظیم الشان کام کے لیے جنم دیا ہے، جو کام سابق انبیاء انجام دیتے تھے۔

شمہ ق ھ میں جب آپ کی عمر شریف آٹھ برس کی تھی، آپ کے دادا عبدالمطلبؓ نے بھی وفات پائی اور آپ کی پرورش کا بار حضرت ابُوطالب کو اٹھانا پڑا۔ حضرت ابوطالب تمام بنو عبدالمطلب میں سب سے کم آمدنی اور زیادہ خرچ والے تھے۔ اگرچہ وہ

آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے اور آپؐ سے کوئی مشکل کام نہ لینا چاہتے تھے مگر آٹھ سال کے بچے کی ہمت قابلِ داد ہے۔ آپؐ نے غریب چچا پر اپنا پورا بار ڈالنا پسند نہ کیا۔ چچا سے باصرار اجازت لے کر روساے قریش کی بکریاں اُجرت پر چرانا شروع کیں۔ ہر بکری کی چرائی آپ کو ایک قیراط چاندی ملا کرتی تھی مگر نہیں معلوم کہ یہ قیراط ماہوار ملتی تھی یا سالانہ۔ اس طرح آپؐ آٹھ برس کی عمر ہی سے چچا کے مالی بوجھ کو ہلکا کرنے میں شریک تھے۔

۴۳ ق ھ میں آپ کو ایک عجیب صورتِ حال کا احساس ہوا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک روز حضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا چیز آپؐ نے سب سے پہلے دیکھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری عمر دس سال اور چند ماہ کی تھی اور میں ایک صحرا میں تھا، دو شخص نظر آئے، ان کے جیسے چہرے اور ان کا جیسا لباس میں نے کبھی نہ دیکھا، ان کے بدن سے جیسی خوشبو پھیلتی تھی اس قسم کی خوشبو میں نے کبھی نہ سونگھی تھی، ایک نے دوسرے سے کہا کیا یہ شخص وہی ہے۔ پھر دونوں نے میرے پاس آکر میرے بازوؤں کو پکڑا مگر ان کی گرفت کا مَس میں نے محسوس نہ کیا۔ پھر انھوں نے مجھے لٹایا، مگر میں نے لٹانے کا دباؤ محسوس نہ کیا۔ پھر ایک نے کہا کہ اس کا سینہ چاک کرو، دوسرے نے سینہ چاک کیا، لیکن مجھے چیرنے پھاڑنے کا درد محسوس نہ ہوا اور نہ خون نکلا، پھر اس نے کہا کہ اس کے اندر سے غل وحسد یعنی کینہ اور ڈر نکال دو۔ اس نے جمے ہوئے لہو کا سا ایک لوتھڑا نکال کر پھینک دیا۔ پھر پہلے نے کہا کہ اس کی جگہ رأفت و رحمت رکھ دو۔ اس نے چاندی جیسی ایک چیز اندر رکھ دی۔ پھر دونوں نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کو جھٹکا دیا اور کہا کہ اٹھ کر دوڑو۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ اس کے بعد میں اپنے دل میں چھوٹے پر ترس اور بڑے پر رحم محسوس کرنے لگا۔ یہ تھا آپؐ کا سب سے پہلا احساس جسے بعد میں آپؐ نے امرِ نبوت کا پہلا شعور قرار دیا، لیکن ابھی تک آپؐ کو اس کا وہم تک نہ تھا کہ میں خدا کا نبی مقرر ہونے والا ہوں۔

انہی دنوں کا ایک اور عجیب واقعہ یہ ہے کہ بوآنہ نام ایک بُت کی پرستش کا دن آیا۔ قریش سال میں ایک دن رات بھر اس بُت کے گرد بیٹھ کر جاگا کرتے اور تبرک کے لیے اسے چھوتے اور قربانیاں گزارتے تھے، آپؐ کی عمر اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اب آپؐ کو بھی اس مذہبی رسم میں شریک ہونا چاہئے تھا۔ حضرت ابوطالب وغیرہ نے آپؐ کو ساتھ لے جانا چاہا۔ آپؐ نے جانے سے انکار کیا۔ لوگ زبردستی آپ کو ساتھ لے گئے۔ بُت کے قریب جانے ہی کو تھے کہ آپؐ کی حالت غیر ہو گئی اور بیہوشی سی طاری ہو گئی۔ بعد میں آپؐ نے اپنے چچاؤں کو بتایا کہ گورے رنگ کے ایک مرد طویل کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے ڈانٹ رہا ہے اور کہتا ہے کہ محمدؐ! دور ہی رہنا، قریب نہ آنا، اسے ہرگز نہ چھونا۔ لوگ آپؐ کو اٹھا کر گھر لے آئے۔ پھر کسی نے آپؐ کو ایسی رسموں میں شرکت کے لیے نہیں کہا۔

۴۰ یا ۴۱ ق ھ میں جب کہ عمر شریف تیرہ یا چودہ برس کی تھی، ایک قافلہ تجارِ قریش کا شام کو روانہ ہونے لگا۔ اس قافلے میں حضرت رسولِ خداؐ کے چچا حارث بن عبدالمطلب اور حضرت ابوطالب بھی روانہ ہونے لگے۔ آپؐ نے حضرت ابوطالب کی اونٹنی کی مہار تھام لی اور کہا: "چچا جان! آپ مجھے کس کے پاس چھوڑے جاتے ہیں؛ میرا نہ تو باپ زندہ ہے نہ ماں"۔ یہ سن کر حضرت ابوطالب نے آپؐ کو اپنی اونٹنی پر بٹھا لیا۔ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ بصریٰ پہنچے، وہاں ایک خانقاہ تھی جو دیر بحیرا کہلاتی تھی، اس میں ایک راہب رہا کرتا تھا جس کو بحیرا کہا جاتا تھا۔ یہ نام نہ تھا، عبرانی لفظ ۲، ۱، ۴، بحیر کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کے معنی وہی ہیں جو عربی میں مصطفیٰ یا مرتضیٰ کے ہیں۔ کسی بڑے عہدہ کے لیے جو منتخب کیا جاتا تھا اسے بحیر کہا جاتا تھا۔ اس راہب کا نام جرجیس تھا، وہ نسلاً عرب تھا اور

بنو عبد القیس میں سے تھا اور نصرانی مذہب کا تھا، اس کی خانقاہ کے سامنے ایک سایہ دار درخت تھا۔ قریش کا قافلہ تجارت یہاں دم لیا کرتا تھا۔ اس سال سے پہلے کبھی اس راہب نے قافلہ قریش تک آکر ان سے بات چیت نہیں کی تھی۔ لیکن اب کی بار وُہ اپنے دَیر سے نکل کر خود قافلہ میں آیا اور اہل قافلہ کو اپنی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی۔ عربی دستور تھا کہ لوگ ضیافتوں میں کم عمر بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لیجاتے تھے آپ کو سامانِ قافلہ کے پاس چھوڑ کر خانقاہ میں گئے، تو جرجیس نے پوچھا، کیا سب اہلِ قافلہ آگئے؟ لوگوں نے کہا، ہاں۔ البتہ ایک کم عمر چھوکرے کو سامان کے پاس چھوڑ دیا گیا ہے۔ جرجیس نے کہا، میں سمجھتا ہوں کہ وُہ لڑکا تم ہی لوگوں میں سے ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بنی عبد المطلب میں سے ایک ہے۔ تب جرجیس نے کہا: میرے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ ایک عالی نسب لڑکا میرے دستر خوان سے الگ رہے۔ حارث بن عبد المطلب اٹھے اور آپؐ کو بھی لے آئے۔ آپؐ جب آئے تو اس نے بہت غور سے آپؐ کو دیکھا اور بار بار دیکھا، تو قریش کہنے لگے کہ نہایت عجیب بات ہے ان لمحمد عند الراھب لقدرا۔ یعنی اس راہب کے دل میں محمدؐ کی بڑی قدر ہے۔ جب لوگ واپس جانے لگے، تو اس نے آپؐ کو روک لیا۔ حضرت ابو طالب بھی رُک گئے۔ راہب نے آپؐ کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔ آنکھ، کان، ناک پر غور کرنے کے بعد پشت کھولنے کے لیے کہا۔ پشت مبارک پر دونوں مونڈھوں کے درمیان ایک بڑا مسّا تھا، جس کو بالوں نے چھپا رکھا تھا، جو اس مسّے کے گرد اُگے ہوئے تھے۔ اس مہر کو غور سے دیکھا۔ پھر اس مسّے کا بوسہ لے لیا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نے مختلف باتیں پُوچھیں، خصوصاً آپؐ کی نیند کا حال پُوچھا۔ سوال کرتے وقت اُس نے آپؐ کو لات وعزّٰی کی قسم دی کہ جو پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتانا۔ آپؐ نے لات وعزّٰی کے نام سے سخت نفرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ مجھے نہ معلوم کیوں ان بتوں اور دیوتاؤں سے سخت نفرت محسوس ہوتی ہے۔ پھر اس نے حضرت ابو طالب سے پوچھا کہ اس لڑکے سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ حضرت ابو طالب آپؐ کو برابر میرا بیٹا کہا کرتے تھے۔ آپ نے یہی جواب دیا تو جرجیس نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ شخص وہی ہے، جو میں خیال کرتا ہُوں تو اس کے باپ اور ماں میں سے کسی کو اس وقت زندہ نہ ہونا چاہیے۔ تب حضرت ابو طالب نے اپنا صحیح رشتہ بتایا اور آپؐ کے حالات سنائے۔ جرجیس نے کہا: بالکل ٹھیک۔ ابُو طالب میں تم کو صلاح دیتا ہوں کہ اپنے بھتیجے کو لیکر فوراً مکہ واپس چلے جاؤ کیونکہ تمہارے بھتیجے کو ایک بڑی شان حاصل ہونے والی ہے۔ اگر اس کو کچھ یہود نے دیکھ لیا، اور وُہ بات جان لی، جو میں جان گیا ہُوں، تو اسے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

اس روایت کی بنا پر بعض یورپی قیاس باز یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ قرآن میں کتب سابقہ کے جس قدر مضامین اور قصّے ہیں، وُہ سب آپ کو اسی راہب سے معلوم ہُوئے۔ آدمی کتنا احمق ہوتا ہے۔ مخالفت پر اترتا ہے تو ایسی ایسی باتوں کو واقعہ مان لیتا ہے، جو ناقابلِ تصور ہونے کے باوجود اس کی مخالفانہ ذہنیت کی بھی ہم نوائی کر سکتی ہوں۔ چند ساعت میں بحیرا نے تمام کتب سماویہ کے اسرار بارہ تیرہ برس کے ایک کم عمر چرواہے کو سکھا دیے اور اس نے سیکھ لیے۔ کس قدر ناممکن تصور ہے۔ بعض یورپ زدہ "مسٹر" قسم کے مدعیان عقل وزیرکی اس روایت کو اس لیے غلط بتاتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بحیرا نے صورت دیکھتے ہی یہ جان لیا ہو کہ یہ شخص آئندہ نبی مبعوث ہونے والا ہے اور یہ کیسے اس نے جان لیا کہ یہود اس لڑکے کو دیکھیں گے تو مار ہی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ آخر کیوں مار ڈالنا چاہتے تھے؟ ایسے "عقل پرستوں" کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت سلیمان نے اپنے محبوب کا حلیہ بیان کر کے اس کو

خلومحدیم (سراپا محمد) کا نام دیا تھا اور فرمایا تھا کہ،
عینی تشنہ ولبی عرقول د ودی۔

یعنی میرا محبوب کہے گا کہ:
"میری آنکھ سوتی ہے اور میرا دل جاگتا ہے"

اس جواب کو سننے کے لیے بحیرا نے آپ سے آپ کی نیند کا حال دریافت کیا تھا۔ آپ کی پشت مبارک پر جو ایک خاص شناخت تھی جس کا ذکر آپ کا جسمانی حلیہ بیان کرنے والے خاتمِ نبوت کے نام سے کرتے ہیں۔ اس نے خصوصیت کے ساتھ اس پر اس لیے غور کیا کہ حضرت یشعیاہ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ خدا اب بنی اسرائیل سے اپنا منہ چھپا لے گا (یشعیاہ ۸–۷) وہ تاریکی میں کھدیر سے جائیں گے:

لیکن وہ لوگ جو تاریکی میں چلتے ہیں، بڑی روشنی دیکھیں گے اور ارضِ صلموت[1] کے باشندوں پر نور چمکے گا (۹، ۲) ہمارے لیے ایک لڑکا تولد ہوگا ہم کو ایک بیٹا دیا جائے گا۔

ویھی ھمشرہ عل شکمو ویقرا شمو فلئ یوعصرا ل حبتو رابی عدشد شلوم۔

اور نشانِ حکومت اس کے شانوں کے درمیان ہوگا۔ اس کا نام ہوگا عجیب واعظ خداوند جبار کا۔ ہدایت کا باپ، سلامتی کا شہزادہ (۹ : ۶)

اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی حد نہ ہوگی۔ وہ تختِ داؤد کا اور اس کی مملکت کا تب سے ابد تک بندوبست کرے گا اور صداقت اور عدالت سے اسے قیام بخشے گا۔ رب الافواج کی غیرت مندی ایسا کرے گی (۹ : ۷)

مشرہ اسم آلہ شرہ (شری = سیادت) کا شکم مونڈھوں کے درمیان کا حصہ۔ آج کل کے مترجمین مشرہ کا ترجمہ حکومت اور شکم کا ترجمہ کاندھا کرتے ہیں۔ بحیرا نے دیکھا کہ اس کے سامنے ہوبہو حضرت سلیمان کا محبوب بیٹھا تھا جسے انھوں نے خلومحدیم کا نام دیا تھا۔ اس لڑکے کا نام بھی محمد تھا۔ اس کے شانوں کے درمیان ہمشرہ موجود تھا۔ بحیرا کو معلوم تھا کہ آل داؤد میں سے وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یہویقیم کی نسل سے ہیں اور یرمیاہ ۲۲ : ۱۹ و ۲۲، ۳۰ و ۳۶ : ۳۰ کے مطابق نسل یہویقیم ہمیشہ کے لیے تختِ داؤد سے محروم ہو چکی ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ تختِ داؤد کا موعود وارث خداوند جبار کا عجیب واعظ، امن وسلام کا شہزادہ ابی عد یہی لڑکا ہے، جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہود اس کو دیکھیں گے، تو حسد سے مجبور ہو کر اسے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے جس طرح ان کے اسلاف کئی انبیاء کو قتل کر چکے ہیں۔

روایت ہے کہ جب حضرت ابوطالب آپ کو واپس لے جا چکے، تو کچھ یہود بھی اس راہ سے گزرے، بحیرا سے ملے۔ آپ کا

---

[1] صلموت: عیسائی ترجمہ "موت کا سایہ" صحیح ترجمہ: ظلمات یعنی تاریکی

ذکر مذکور چھیڑا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں اپنے ارادۂ قتل کو بھی ظاہر کیا۔ جرجیس نے ان کو سمجھایا کہ اس ارادہ سے باز آؤ کیونکہ اگر واقعی یہ لڑکا وہی ہے، تو تم اسے قتل نہ کر سکو گے۔ اور اگر یہ وُہ نہیں ہے، تو پھر قتل کی وجہ کیا ہے۔ جرجیس کے سمجھانے سے یہودیوں کا وہ طبقہ بات مان گیا اور انھوں نے آپؐ کا پیچھا نہ کیا۔

۳۸ ق۔ھ میں جب کہ آپؐ کی عمر ۱۶ برس کی ہوئی، تو اب آپؐ نے تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۵ برس کی عمر تک آپؐ بکریاں اور اُونٹ اجرت پر چراتے تھے اور یہی آپؐ کا ذریعہ معاش تھا۔ ۱۶ برس کی عمر میں سب سے پہلا تجارتی سفر آپؐ نے اپنے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے ہمراہ یمن کی طرف کیا۔ اس سفر میں آپ کے ساتھیوں نے بہت کامیاب تجارت کی۔ آپؐ کے تجارتی مشاغل نے آپؐ کو ان بہت سی خرابیوں سے واقف کرا دیا جو عربی اصول تجارت میں داخل تھیں۔ احادیث میں بیع و شرا سے متعلق جو اوامر و نواہی ملتے ہیں، ان کے پس پشت سے آپؐ کے تاجرانہ تجربات بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اس سفر کے بعد آپ نے اور بھی سفر کیے ہوں گے مگر ان سفروں کا حال ہم کو نہیں معلوم۔ ۳۴ ق ھ جب کہ آپ کی عمر ۲۰ برس کی تھی، حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ جن کی عمر اس وقت ۱۸ برس کی تھی، آپ نے ملک شام کی طرف دوسری بار بغرض تجارت سفر کیا۔ اسی سفر نے حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی زندگی بھر کا رفیق بنا دیا۔ اب کے سفر میں یہ خاص واقعہ پیش آیا کہ آپؐ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کسی ضرورت سے آپؐ سے الگ ایک طرف کو جا رہے تھے اُدھر سے ایک راہب آ رہا تھا، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ وُہ صاحب جو درخت کے تلے بیٹھے ہیں، ان کا کیا نام ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب۔ راہب نے کہا: بالکل ٹھیک ہے۔ ان کو محمدؐ ہی ہونا چاہیے۔ غالباً اس نے بھی آپ کی صورت اور حلیہ دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ یہ شخص حضرت سلیمان کا "خلو محدیم" ہی ہو سکتا ہے۔

۳۴ ق ھ میں ایک روز حضرت رسولِ خداؐ نے حضرت ابوطالب سے کہا: چچا جان! کئی راتوں سے مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ دو شخص آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہ تو وہی ہے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔" حضرت ابوطالب نے آپ کو تسکین دی کہ یہ محض خواب ہے۔ پھر آپؐ کو ایک شب ایسا محسوس ہُوا کہ ان دونوں نے آپؐ کا سینہ چیر کر قلب مبارک کو دیکھا۔ پھر کہا، یہ قلب تو بالکل پاک صاف ہے۔ حضرت ابوطالب سے اس کا بھی ذکر کیا۔ اب حضرت ابوطالب گھبرا گئے۔ آپؐ کو لے کر ایک راہب کے پاس علاج کے لیے گئے۔ اس راہب نے آپؐ کے قدموں کو غور سے دیکھا۔ پھر پشت کھول کر اس چیز کو غور سے دیکھا جس کا ذکر سفر یشعیاہ میں ہمشرہ کے نام سے آیا ہے۔ راہب نے کہا: عبدمناف! تمہارا فرزند اچھا خاصا ہے۔ اس کو کوئی مرض نہیں۔ اس کو جو شخص نظر آیا ہے، وُہ کوئی شیطان نہیں ہے بلکہ دلوں کو ٹٹولنے والا فرشتہ ہے۔ جاؤ اطمینان رکھو۔ تمہارا فرزند ایک عظیم انسان ہونے والا ہے۔

۲۸ ق ھ میں حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی خدمات مستعار لیں اور اپنا مال تجارت آپ کے حوالے کیا اور اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ شام کی طرف روانہ کیا۔ اس سفر میں بھی آپ نے اسی درخت کے پاس قیام کیا جہاں پہلے قیام کیا تھا اور بحیرا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب کے بار ایک دُوسرے راہب سے ملاقات ہُوئی، جس کا نام نسطور تھا۔ اس نے بھی حضرت رسول اللہؐ سے وہی باتیں دریافت کیں، جو بحیرا نے پوچھی تھیں۔ پھر وُہ کہنے لگا: "وہی، وہی قسم ہے انجیل کی۔" پھر آپؐ کو غور سے دیکھنے لگا۔ خزیمہ بن حکیم السلمی کو کچھ بُرے ارادہ کا خوف ہُوا اور تلوار سونت کر راہب کی طرف لپکے۔ راہب اپنے صومعہ میں بھاگ گیا اور دروازہ بند کر کے اس نے اہلِ قافلہ سے کہا: تم لوگ ناحق

ڈر گئے۔ واللہ میں اس شخص کا دشمن نہیں ہُوں بلکہ مجھے اس شخص سے بڑی محبت ہے۔ اس کی بابت جو میں جانتا ہُوں تم نہیں جانتے۔ اس شخص کو بہت جلد ایک بڑا رتبہ حاصل ہونے والا ہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد میسرہ سے آپ کی بابت بہت سی باتیں معلوم کرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے جو کہ ۴۰ برس کی تھیں اور بیوہ تھیں، پیغام نکاح بھیجا اور حضرت ابو طالب کے مشورہ سے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا۔

آغازِ نبوت

شادی کے بعد جس طرح ہر شخص کی زندگی کا رُخ بدل جایا کرتا ہے، اسی طرح اس واقعہ کے بعد آپ کی زندگی نے ایک نیا موڑ بدلا۔ اب تک آپ اُجرت لے کر لوگوں کی بکریاں اور اونٹ چراتے تھے۔ پھر اُونٹ لے کر مکہ کے تاجروں کا مال لے کر ادھر ادھر سفر کرتے تھے اور مال فروخت کرتے تھے۔ اب یہ کام ترک کر دیے اور حضرت خدیجہؓ کی تجارت کی نگرانی فرمانے لگے اور مستقل طور پر مکہ میں قیام کیا۔

حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ آپ کی تمام اولادیں پیدا ہُوئیں۔ اب آپ کا وقت زیادہ تر خدا کی طرف توجہ اور تبتل الی اللہ میں صرف ہونے لگا۔ مکہ میں درس و تدریس کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آپ کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ آپ اگرچہ جبلی طور پر ایک موحد اور ایک مومن کامل تھے، لیکن آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ میرا جبلی میلان ہی سچا دین ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ" اس (قرآن) سے پہلے تجھے نہیں معلوم تھا کہ الکتاب کیا ہے اور الایمان کیا ہے" (شوریٰ) "اس سے پہلے یقیناً تمھیں خبر نہ تھی" (یوسف) ذریت ابراہیم کے ہر طبقے کے لیے جن میں قریش بھی داخل ہیں، یہ بات کلمہ باقیہ کی نوعیت رکھتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ کی ذات کے سوا میں تمہارے تمام معبودوں سے بیزار ہوں (زخرف) اتنی بات آپ کو بھی معلوم تھی اور آپ کا طبیعی میلان اسی کلمہ باقیہ کی طرف تھا۔ لیکن اللہ نے آپ کو جبلی طور پر ان لوگوں میں داخل کر رکھا تھا، جن کے متعلق فرمایا تھا:

> "یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور شب و روز کے آگے پیچھے آنے میں، ان اصحابِ دانش کے لیے نشانیاں ہیں، جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو، کھڑے ہیں تو کھڑے، بیٹھے ہیں تو بیٹھے، بستروں پر ہیں تو بستروں پر اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں۔" (آل عمران ۱۹۰ و ۱۹۱)

اطمینان کی زندگی نصیب ہونے کے بعد آپ کاروبار سے فراغت کے اوقات میں اسی طریقہ پر عمل کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو بزم و انجمن سے الگ تنہائی میں تحنث (حنث، گناہ سے بچنے بچانے) کا شوق پیدا ہو گیا اور آپ کئی کئی راتوں کا توشہ لے کر غارِ حرا میں چلا جایا کرتے تھے اور وہاں تحنث فرمایا کرتے تھے۔

اللہ نے کوئی شے بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ہر مخلوق کو خدا نے ایک نہ ایک کام کے لیے پیدا کیا ہے، جسے وہی جانتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کا مقصودِ خلقت دُوسرے انسان کے مقصودِ تخلیق سے مختلف ہوتا ہے، جسے خدا ہی جانتا ہے۔ انبیاء کے طبقہ کو اس نے ہدایتِ خلق کے لیے پیدا کیا۔ اس عمومی مقصودِ تخلیق کے علاوہ ہر نبی کا ایک جدا مقصود ہوتا ہے، جس کا علم ابتدا میں خدا ہی کو ہوتا ہے۔ مگر جو کارنامے انجام دے کر نبی چل بستا ہے، وہ کارنامے اس مقصودِ ربانی کو ظاہر کر دیتے ہیں جس کے لیے ایک خاص نبی کو خدا نے پیدا کیا اور اسے تربیت دی۔ کوئی شے جس کو کسی مصرف کے لیے بنایا جاتا ہے، وہ اپنے اطوارِ تخلیق کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچ کر ہی اس قابل ہوتی ہے کہ اپنے مقصودِ خلقت کو انجام دے۔ ہر نبی علم الٰہی میں ازل سے نبی ہوتا ہے، لیکن فرائضِ نبوت کو انجام دینے کی استعداد اسے زندگی کے ایک

خاص نقطۂ عروج تک پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔ خدا نے ہر نبی کو ایک مخصوص درجہ کے علم لدنی اور حکمت لدنیہ سے نوازا ہے۔ فرمایا: کلا اتیناہ حکما و علما (انبیاء) ہم نے ہر ایک کو دانش اور علم عطا کیا۔ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں فرمایا:

ولما بلغ اشدہ اتیناہ حکماً و علما و کذٰلک نجزی المحسنین (یوسف ۲۲)

اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا، تو ہم نے اس کو ایک دانش اور ایک علم دیا اور یونہی ہم اور محسنوں کو جزا دیتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے تذکرے میں فرمایا:

ولما بلغ اشدہ واستوی اتیناہ حکما و علما و کذٰلک نجزی المحسنین۔ (قصص ۱۴)

اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا اور قوی ہو گیا، تو ہم نے اسے ایک دانش اور ایک علم دیا اور دیگر محسنوں کو بھی ہم یونہی اجر دیا کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں دانش و علم سے مراد وہ دانش و علم ہے، جو غیر نبی کو بھی نیکوکاری کے انعام کے طور پر یا موجودہ زمانے کے الفاظ میں عمدہ عملی تجربات کی وجہ سے عطا ہوتا ہے۔ حضرت رسولِ خدا کو بھی ان آیتوں کے بنائے ہوئے قانونِ الٰہی کے مطابق اپنی توانائی کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچنے پر خدا نے لاہوتی دانش و علم سے نوازا۔ آپؐ کے پاس انسان کی لکھی ہوئی کتاب تو کوئی نہ تھی، لیکن کتاب قدرت کھلی ہوئی تھی۔ آسمان و زمین کی ساخت پر خدا کو یاد رکھتے ہوئے آپ نے غور کیا اور اللہ نے آپؐ کو علم و دانش سے نوازا۔ حضرت موسیٰؑ کو علم و دانش سے نوازنے کے ذکر کے بعد خدا نے ان کے مدین کو روانگی کا ذکر کیا، جہاں وہ آٹھ یا دس برس بکریاں چراتے رہے۔ حضرت رسولِ خداؐ نے تین برس کی عمر سے تیرہ برس کی عمر تک بکریاں چرائیں۔ حضرت موسیٰؑ کو یہ کام بھرپور جوانی کے ایام میں کرنا پڑا۔ آٹھ یا دس برس بعد جب وہ مصر کو واپس ہونے لگے تو خدا نے کوہِ طور پر ان کو پیغمبری سے نوازا اور ان سے کلام کرتے ہوئے ان سے فرمایا کہ تمہارے اوپر میں نے فلاں فلاں مہربانیاں کی ہیں:

فلبثت سنین فی اھل مدین ثم جئت علی قدر یا موسیٰ واصطفیتک لنفسی۔

پھر تو کئی برس مدین والوں میں مقیم رہا، پھر تو اے موسیٰ ایک انداز پر آیا اور میں نے تجھے اپنے لیے چن لیا۔

حضرت موسیٰؑ کو ایک خاص عمر تک پہنچنے پر روحانی توانائی کا وہ مرتبہ حاصل ہوا، جس کے بعد آپ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصودِ تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہوئے۔ دوشنبہ، ۱۱ رمضان ۱۳ ق۔ھ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی قویٰ نے اس مقررہ حدِ کمال کو حاصل کر لیا۔ جس کے بعد آپؐ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصودِ تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہو گئے اور غارِ حرا کے اندر آپؐ پر قرآن کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ آپؐ سے "جئت علی قدرٍ یا محمدؐ" فرمانے کی بجائے خدا نے فرمایا:

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔

ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔

قدر کی رات سے مراد آپؐ کی زندگی کی وہ رات ہے جس میں آپؐ نے بارِ نبوت اٹھانے کے لیے درکار توانائی اور صلاحیتِ کاملہ

ڈر گئے۔ واللہ میں اس شخص کا دشمن نہیں ہُوں بلکہ مجھے اس شخص سے بڑی محبت ہے۔ اس کی بابت جو میں جانتا ہُوں تم نہیں جانتے۔ اس شخص کو بہت جلد ایک بڑا رتبہ حاصل ہونے والا ہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد میسرہ سے آپ کی بابت بہت سی باتیں معلوم کرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے جو کہ ۴۰ برس کی تھیں اور بیوہ تھیں، پیغام نکاح بھیجا اور حضرت ابو طالب کے مشورہ سے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا۔

آغازِ نبوت

شادی کے بعد جس طرح ہر شخص کی زندگی کا رُخ بدل جایا کرتا ہے، اسی طرح اس واقعہ کے بعد آپ کی زندگی نے ایک نیا موڑ بدلا۔ اب تک آپ اُجرت لے کر لوگوں کی بکریاں اور اونٹ چراتے تھے۔ پھر اُونٹ لے کر مکہ کے تاجروں کا مال لے کر ادھر ادھر سفر کرتے تھے اور مال فروخت کرتے تھے۔ اب یہ کام ترک کر دیے اور حضرت خدیجہؓ کی تجارت کی نگرانی فرمانے لگے اور مستقل طور پر مکہ میں قیام کیا۔

حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ آپ کی تمام اولادیں پیدا ہُوئیں۔ اب آپ کا وقت زیادہ تر خدا کی طرف توجہ اور تبتّل الی اللہ میں صرف ہونے لگا۔ مکہ میں درس و تدریس کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آپ کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ آپ اگرچہ جبلی طور پر ایک موحد اور ایک مومن کامل تھے، لیکن آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ میرا جبلی میلان ہی سچا دین ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ "اس (قرآن) سے پہلے تجھے نہیں معلوم تھا کہ الکتاب کیا ہے اور الایمان کیا ہے" (شوریٰ) "اس سے پہلے یقیناً تمھیں خبر نہ تھی۔" (یوسف) ذریت ابراہیم کے ہر طبقے کے لیے جن میں قریش بھی داخل ہیں، یہ بات کلمہ باقیہ کی نوعیت رکھتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ کی ذات کے سوا میں تمہارے تمام معبودوں سے بیزار ہوں (زخرف) اتنی بات آپ کو بھی معلوم تھی اور آپ کا طبعی میلان اسی کلمہ باقیہ کی طرف تھا۔ لیکن اللہ نے آپ کو جبلی طور پر ان لوگوں میں داخل کر رکھا تھا، جن کے متعلق فرمایا تھا:

> "یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور شب و روز کے آگے پیچھے آنے میں، ان اصحابِ دانش کے لیے نشانیاں ہیں، جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو، کھڑے ہیں تو کھڑے، بیٹھے ہیں تو بیٹھے، بستروں پر ہیں تو بستروں پر اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں۔" (آل عمران ۱۹۰ و ۱۹۱)

اطمینان کی زندگی نصیب ہونے کے بعد آپ کاروبار سے فراغت کے اوقات میں اسی طریقہ پر عمل کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو بزم و انجمن سے الگ تنہائی میں تحنث (حنث، گناہ سے بچنے بچانے) کا شوق پیدا ہوگیا اور آپ کئی کئی راتوں کا توشہ لے کر غارِ حرا میں چلا جایا کرتے تھے اور وہاں تحنث فرمایا کرتے تھے۔

اللہ نے کوئی شے بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ہر مخلوق کو خدا نے ایک نہ ایک کام کے لیے پیدا کیا ہے، جسے وہی جانتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کا مقصود خلقت دُوسرے انسان کے مقصود تخلیق سے مختلف ہوتا ہے، جسے خدا ہی جانتا ہے۔ انبیاء کے طبقہ کو اس نے ہدایتِ خلق کے لیے پیدا کیا۔ اس عمومی مقصود تخلیق کے علاوہ ہر نبی کا ایک جدا مقصود ہوتا ہے، جس کا علم ابتداءً میں خدا ہی کو ہوتا ہے۔ مگر جو کارنامے انجام دے کر نبی چل بستا ہے، وہ کارنامے اس مقصود ربانی کو ظاہر کر دیتے ہیں جس کے لیے ایک خاص نبی کو خدا نے پیدا کیا اور اسے تربیت دی۔ کوئی شے جس کو کسی مصرف کے لیے بنایا جاتا ہے، وہ اپنے اطوار تخلیق کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچ کر ہی اس قابل ہوتی ہے کہ اپنے مقصود خلقت کو انجام دے۔ ہر نبی علم الٰہی میں ازل سے نبی ہوتا ہے، لیکن فرائضِ نبوت کو انجام دینے کی استعداد اسے زندگی کے ایک

خاص نقطہ عروج تک پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔ خدا نے ہر نبی کو ایک مخصوص درجہ کے علم لدنی اور حکمت لدنیہ سے نوازا ہے۔ فرمایا: کلا اتیناہ حکما و علما (انبیاء) ہم نے ہر ایک کو دانش اور علم عطا کیا۔ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں فرمایا:

ولما بلغ اشدہ اٰتیناہ حکماً و علما وکذٰلك نجزی المحسنین (یوسف ۲۲)

اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا، تو ہم نے اس کو ایک دانش اور ایک علم دیا اور یونہی ہم اور محسنوں کو جزا دیتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے تذکرے میں فرمایا:

ولما بلغ اشدہ واستوی اٰتیناہ حکما و علما وکذٰلك نجزی المحسنین۔ (قصص ۱۴)

اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا اور قوی ہوگیا، تو ہم نے اسے ایک دانش اور ایک علم دیا اور دیگر محسنوں کو بھی ہم یونہی اجر دیا کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں دانش و علم سے مراد وہ دانش و علم ہے، جو غیر نبی کو بھی نیکوکاری کے انعام کے طور پر یا موجودہ زمانے کے الفاظ میں عمدہ عملی تجربات کی وجہ سے عطا ہوتا ہے۔ حضرت رسولِ خداؐ کو بھی ان آیتوں کے بتائے ہوئے قانون الٰہی کے مطابق اپنی توانائی کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچنے پر خدا نے لاہوتی دانش و علم سے نوازا۔ آپؐ کے پاس انسان کی لکھی ہوئی کتاب تو کوئی نہ تھی، لیکن کتاب قدرت کھلی ہوئی تھی۔ آسمان و زمین کی ساخت پر خدا کو یاد رکھتے ہوئے آپ نے غور کیا اور اللہ نے آپؐ کو علم و دانش سے نوازا۔ حضرت موسیٰؑ کو علم و دانش سے نوازنے کے ذکر کے بعد خدا نے ان کے مدین کو روانگی کا ذکر کیا، جہاں وہ آٹھ یا دس برس بکریاں چراتے رہے۔ حضرت رسولِ خداؐ نے تین برس کی عمر سے تیرہ برس کی عمر تک بکریاں چرائیں۔ حضرت موسیٰؑ کو یہ کام بھرپور جوانی کے ایام میں کرنا پڑا۔ آٹھ یا دس برس بعد جب وہ مصر کو واپس ہونے لگے تو خدا نے کوہِ طور پر ان کو پیغمبری سے نوازا اور ان سے کلام کرتے ہوئے ان سے فرمایا کہ تمہارے اوپر میں نے فلاں فلاں مہربانیاں کی ہیں:

فلبثت سنین فی اھل مدین ثم جئت علی قدر یا موسی واصطنعتك لنفسی۔

پھر تو کئی برس مدین والوں میں مقیم رہا، پھر تُو اے موسیٰ ایک انداز پر آیا اور میں نے تجھے اپنے لیے چُن لیا۔

حضرت موسیٰؑ کو ایک خاص عمر تک پہنچنے پر روحانی توانائی کا وہ مرتبہ حاصل ہوا، جس کے بعد آپ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصودِ تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہوئے۔ دوشنبہ ۱۷ رمضان ۱۳ ق۔ھ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی قویٰ نے اس مقررہ حدِ کمال کو حاصل کر لیا۔ جس کے بعد آپؐ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصودِ تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہوگئے اور غارِ حرا کے اندر آپؐ پر قرآن کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ آپؐ سے "جئت علی قدرٍ یا محمدؐ" فرمانے کی بجائے خدا نے فرمایا:

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔

ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔

قدر کی رات سے مراد آپؐ کی زندگی کی وہ رات ہے جس میں آپؐ نے بارِ نبوت اٹھانے کے لیے درکار توانائی اور صلاحیتِ کاملہ

حاصل کرلی۔ اس رات کی بابت کافی طویل بحث کی جاسکتی ہے، جسے ہم اس موقع پر زیرِ بحث لانا نہیں چاہتے۔

پہلی وحی علق ۱ تا ۵ ہے۔ توراۃ میں جہاں جہاں حضرت ابراہیمؑ کی نماز کا ذکر ہے، ان الفاظ میں ہے کہ ویقرا بشیم یہوہ (تکوین: پرانا عہد نامہ) عربی میں اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے قرا باسم ربہ یعنی اس نے رب کا نام پڑھا۔ علق کی پہلی آیت اسی سنّتِ ابراہیمیؑ کے احیاء کا حکم دیتی ہے۔ خلاصہ اس سورۃ کا یہ ہے: اپنے رب کا نام پڑھ، نماز سے جو منع کرتا ہے، اس کا کہا نہ مان بلکہ اپنے رب کو سجدہ کر اور اس کا تقرب حاصل کر۔ اگرچہ علق کی باقی چودہ آیتیں بہت بعد میں اُتریں مگر ربطِ آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقراء باسم ربك دراصل حکمِ نماز ہے۔

ایامِ وحی والہام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوشنبہ، ۱۱ رمضان ۱۳ ق ھ سے دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک ۹ یوم کم ۶۲ برس کی عمر پائی۔ جملہ ایامِ حیات ۲۲۳۱۷ دن تھے، ان میں سے ۱۴۳۵۷ دن نزولِ قرآن سے پیشتر گزرے۔ نزولِ قرآن کی جملہ مدت ۷۹۶۰ یوم تھی۔ ان ایام میں سے ۴۴۱۷ یوم آپؐ مکہ میں قیام پذیر رہے۔ روزِ ہجرت سے لے کر وفات تک کی جملہ تعدادِ ایام ۳۵۴۳ یوم تھی۔ اس مضمون میں ان آخری دنوں کے احوال پر ہی ہم نظر ڈالیں گے۔

بعض روایات کی بنا پر، جن پر تبصرہ کرنے کا محل نہیں ہے، یہ مشہور ہے کہ علق ۱ تا ۵ کے بعد کچھ عرصہ وحی رکی رہی۔ پھر سورۂ مدثر کی ابتدائی آیتیں اتریں۔ لیکن واقعہ کچھ اور ہے۔ ابتدائی آیتوں کے اترنے کے بعد آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو غارِ حرا کا ماجرا سنایا اور تشویش ظاہر کی۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی کہ آپؐ میں فلاں فلاں اخلاقی خوبیاں ہیں۔ اس لیے خدا ہرگز آپؐ کو خائب و خاسر نہ کرے گا۔ پھر وہ آپؐ کو اپنے ابن عم حضرت ورقہ کے پاس لے گئیں، جو ایامِ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ عبرانی میں انجیل لکھا کرتے تھے۔ ان کے سامنے آپؐ نے غارِ حرا کا ماجرا سنایا کہ ایک فرشتہ سامنے کھڑا ہے۔ اس نے تین بار کہا کہ اقراء (پڑھ)۔ آپؐ نے ہر بار جواب دیا کہ میں قاری نہیں ہوں۔ تینوں بار آپؐ کا جواب سُن کر اُس نے آپؐ کو چمٹایا اور زور سے معانقہ کیا۔ چوتھی بار اس نے علق ۱ تا ۵ پڑھ کر سُنائی۔ حضرت ورقہ نے تمام حالات سُن کر فرمایا کہ یہ تو وہی ناموس تھا جو حضرت موسیٰؑ کے پاس بھی آیا تھا اور پیشگوئی کی اور وعدہ کیا کہ ایک وقت آئے گا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دے گی، میں اس وقت تک زندہ اور قوی رہا، تو آپ کی ضرور مدد کروں گا۔ حضرت ورقہ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔

آغازِ دعوت

ان آیتوں کے اترنے کے بعد آپؐ عموماً مکہ سے نکل کر غاروں میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب ان دنوں دس برس کے لڑکے تھے اور آپؐ کے زیرِ تربیت تھے، وہ بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔

ایک روز حضرت ابوطالب نے اپنے دہ سالہ فرزند اور چہل سالہ بھتیجے کو ایک غار میں چھپ کر نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا: یہ کیا دین ہے جس کا میں تم دونوں کو عامل دیکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ ہمارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے۔ ہم دونوں ملتِ ابراہیمؑ کے مطابق خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ حضرت ابوطالب نے حضرت علیؓ سے کہا کہ تم اپنے ابن عم کی روش پر ہو، اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا ابن عم تم کو خیر ہی کی تعلیم دے گا۔ اس کے بعد بتدریج مکہ والوں کو علم ہوگیا کہ محمد بن عبداللہ بھی جنھیں کسی نے آج تک دیوتا کو پوجتے نہیں دیکھا ہے، غاروں میں چُھپ چُھپ کر ایک نادیدہ خدا کو پوجتے ہیں۔ جب تک لوگ آپؐ کو محض صابی (بے دین) باور کرتے تھے کسی

کسی نے آپ کو دین اشیاع پر عمل کی طرف دعوت نہ دی۔ لیکن یہ معلوم کر لینے کے بعد محمدؐ بن عبداللہ بھی ایک معبود کے پرستار ہیں تو لوگ آپؐ کو اپنے دیوتاؤں کی طرف بلانے لگے۔ اسی سلسلے میں سورہ کافرون اور بعض دیگر سورتوں کی آیتیں، جو سورہ کافرون کی ہم مضمون ہیں، نازل ہوئیں۔ سورہ کافرون میں خدا نے فرمایا:

"ولا انتم عابدون ما اعبد"

یعنی اور دتم پُوجو گے اسے جسے میں پوجتا ہوں۔

مشرکین کے لیے یہ نہایت حیرت کی بات تھی کہ وہ کون دیوتا ہو سکتا ہے، اجسے پُوجنے سے ہم انکار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے آپؐ سے کہا کہ نسب لنا ربک۔ یعنی ہم کو اپنے رب کا نسب سناؤ۔

خدا نے حکم نازل فرمایا:

قل ھو اللہ احد ○ اللہ الصمد ○ لم یلد و لم یولد ○ ولم یکن لہٗ کفواً احد ○

جواب دے کہ وہ اللہ ہے اکیلا ہے، اللہ حاجت روا بے حاجت ہے، نہ کسی کا باپ ہے، نہ بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کی برابری والا ہے۔

اس مختصر سی سورہ میں عزیر پرستوں، مسیح پرستوں، ملائک پرستوں، جنات پرستوں، اولیاء پرستوں، کواکب پرستوں، غرض دنیا کے تمام معلوم مذاہب کو حرفِ باطل قرار دے دیا۔ شیخ سعدی نے غالباً اسی سورہ کی وجہ سے کہا تھا: ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

یعنی ایک یتیم نے، جو ابھی قرآن ختم نہ کر چکا تھا کئی ملتوں کے کتب خانے بے کار اور ناخواندنی بنا کر رکھ دیے۔

پہلا مسلمان

اب کفار نے طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کیں اور ان کے جواب میں آیتیں اترنے لگیں۔ ان مباحث کے دوران میں بتدریج کئی صالح افراد نے حضرت رسولِ خداؐ کے مسلک کو قبول کر لیا۔ اہلِ علم کے درمیان بحثیں ہیں کہ سب سے پہلے کون مسلمان ہوا۔ حضرت علیؓ کو ناز تھا کہ حضرت رسولِ خداؐ کے بعد پہلا مسلمان میں ہُوں۔ ان کا ناز غلط نہ تھا، لیکن چونکہ وُہ بچے تھے، اہلِ مکہ نے ان کے اسلام کو کوئی اہمیت نہ دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے واقعی حضرت علیؓ اور زید بن حارثہ کے بعد اسلام قبول کیا لیکن خود عہد صحابہ میں انھیں کو "اوّل الناس صدق الرسلا" کہا جاتا تھا، یعنی پہلا شخص جس نے رسولوں کی تصدیق کی۔ پہلے مرد مسلم جنھوں نے علانیہ دلیری کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان کیا، حضرت ابوبکرؓ ہی تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے روزِ اول ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے دل نے چپکے سے پہلی ہی وحی سُن کر آپؐ کی تصدیق کر دی ہو۔ لیکن اس تصدیق کو زبان سے ظاہر کرنے میں انہوں نے بھی کچھ دنوں تامل سے کام لیا۔ سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ کے مضمون سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ کی جدوجہد ایک زمانہ تک بظاہر ناکام ثابت ہو رہی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا دُکھ تھا۔ سُورہ اعلیٰ میں خدا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور فرمایا:

فذکر ان نفعت الذکری ○ سیذکر من یخشی۔ (اعلیٰ)
سو تو سمجھاتا رہ سمجھانے سے ضرور فائدہ ہوگا۔ جو خدا ترس ہے وہ ضرور سمجھے گا۔
اس آیت کے نزول کے بعد سب سے پہلے جس شخص نے پیغمبرؐ کے دین و مسلک کو قبول کرنے کا اعلان کیا، وہ حضرت ابوبکرؓ تھے
دل سے تو کئی افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ مگر اقرار اسلام میں متامل تھے اور عذر پیش کرتے تھے کہ:
ان نتبع الھدیٰ معک نتخطف من ارضنا۔ (قصص)
اگر آپ کے ساتھ جو ہدایت ہے، اس کا ہم اتباع کر لیں، تو ہم کو ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا۔
حضرت ابوبکرؓ بھی دل سے قبولِ اسلام کے بعد کچھ دنوں متامل رہے۔ یہاں تک کہ وہ چالیس برس کے ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ ۵۱ ق ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱ ق ھ میں چالیس برس کے ہوئے، تو انھوں نے علانیہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ ان کے اسلام کی داستان روایتوں کی سند سے پیش کرنے کی بجائے قرآن مجید کی ایک آیت پیش کرنا مناسب ہے، جس میں خدا نے فرمایا ہے:

ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرھاً و وضعتہ کرھا وحملہ وفصالہ ثلثون شھراً۔
حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی
وعلی والدتی و ان اعمل صالحا ترضٰہ واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیک و انی من المسلمین۔

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے (کیونکہ) اس کی ماں دکھ کے ساتھ اسے پیٹ میں لیے رہی اور اس نے دکھ کے ساتھ اسے جنا اور اس کے حمل کی اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ تھی۔ پھر جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا اور چالیس برس کا ہوگیا، تو اس نے دعا کی کہ میرے پروردگار! مجھے توفیق و تربیت دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر بجا لاؤں، جو تو نے مجھ پر اور میری اماں اور باپ پر کیا ہے اور یہ کہ میں کوئی بھلا کام کروں، جس سے تو راضی ہو جائے اور میری خاطر اولاد کو سدھار دے۔ میں نے تیری طرف توجہ کی اور میں مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔

اس آیت میں صریحاً ایک ایسے انسان کا ذکر ہے جس نے چالیس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے سوا شرکائے بدر میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی عمر ابتدائی ایام تبلیغ میں چالیس برس کی رہی ہو۔ ان کی دعا کا حضرت سلیمان کی دعا سے مقابلہ کیجیے جو نمل ۱۹ میں منقول ہے "رب اوزعنی" سے لے کر "ترضٰہ" کے الفاظ بالکل ایک ہیں۔ "واصلح" سے "المسلمین" تک کی بجائے حضرت سلیمانؑ نے "وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین" کہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی توبہ اور اپنے اسلام کا اظہار کرنے کے بعد اپنی اولاد کے لیے دعا کی تھی کہ ان کو صالح بنا دے۔ والدین ان کے صالح تھے، دل سے اسلام قبول کر چکے تھے البتہ ابھی علانیہ اعلان نہیں کیا تھا۔ اولاد نے ابھی تک اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ لیکن خدا نے آپ کی دعا قبول کی چنانچہ یہی ایک گھرانا تھا، جس کے تمام افراد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت سلیمانؑ نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے کوئی نیک کام کرنے کی توفیق دے جس سے تو راضی ہو جائے، تو اللہ نے ان کو ملکۂ سبا کو مسلمان بنا لینے کی توفیق دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہی دعا کی اور اللہ نے آپ کو

بھی یہ توفیق دی کہ آپ نے کئی افراد کو زمرۂ مسلمین میں داخل کیا۔

سابقین اوّلین خود حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست سمجھانے سے حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابوبکرؓ مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اعلانِ اسلام کے بعد حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ کو مسلمان کیا۔ پھر ان لوگوں کے اسلام کے بعد حضرت عثمان بن مظعونؓ حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد اور حضرت الارقمؓ بن ابی الارقم مسلمان ہوتے۔ انھیں ایّام میں حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت عمارؓ، ان کی ماں سُمیّہؓ اور ان کے باپ یاسر مسلمان ہوگئے۔ ایک مدت تک قریش کو صرف حضرت ابوبکرؓ کے اسلام کی خبر تھی اور اصحاب نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا اور غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے ایسا کیا۔ رفتہ رفتہ قریش کو اس کا پتا چل گیا کہ کئی اشخاص مسلمان ہوگئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد سب سے پہلے حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت عمارؓ، حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ نے دلیری دکھائی اور علانیہ اسلام کو قبول کیا۔ اب کفار کو فکر لاحق ہوئی کہ اس نئے مذہب کو کسی نہ کسی طرح دبا دینا ضروری ہے۔ ابتدا میں محض استہزاء اور مذاق کے زور سے تحریکِ اسلامی کو مٹا دینا چاہا تھا کہ وہ:

> کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون ○ واذا مروابھم یتغامزون ○ واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین ○ واذا راوھم قالوا ان ھؤلاء لضالون ○
>
> مومنوں پر ہنستے تھے، ان کے پاس سے گزرتے تھے تو آنکھیں مارتے تھے۔ اپنے اہل و عیال کے پاس لوٹتے تو گپیں مارتے لوٹتے تھے اور جب ان کو دیکھتے تھے کہتے کہ یہ گمراہ لوگ ہیں۔

لیکن زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ:

> فتنوا المومنین والمومنات۔ (بروج)
>
> مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستانے لگے۔

مسلمانوں کو قبولِ اسلام کی وجہ سے جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں، ان کی تفصیل کے لیے یہ مضمون کافی نہیں ہے۔ بس اتنا سمجھیے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنا معمولی قسم کے دلیر کا کام نہ تھا۔ یہ کلمہ وہی شخص زبان سے ادا کر سکتا تھا، جس کو ماں سے، باپ سے، بھائی سے، بیٹے سے، بی بی سے، پورے قبیلے سے کٹ جانے کی جرأت ہوتی۔ مال و متاع سے محروم ہونے کی ہمت ہوتی۔ موت قبول کرنا عرب کے لیے کوئی مشکل امر نہ تھا لیکن طرح طرح کی اذیتوں، ذلتوں کو سہنے کے لیے تیار ہو کر ہی ایک شخص یہ کلمہ علانیہ زبان پر لا سکتا تھا۔

انذارِ عشیرہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّ وجہد سے بہتیرے افراد نے اسلام قبول کر لیا آپ کا اپنا گھرانا تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک حضرت علیؓ کے سوا جن کو بچے ہونے کی وجہ سے قریش کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، اب تک کسی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا آپ کو بےحد رنج تھا۔ سنہ ق ھ میں سورۂ شعراء نازل ہوئی، جس کی ابتداء میں خدا نے فرمایا:

لعلك باخع نفسك الا يكونوا مومنين۔
شاید تو اس غم میں اپنا گلا گھونٹ لے گا کہ لوگ مسلمان نہیں ہوتے۔
اس سورہ میں آپ کو تسلّی دینے اور غیر مسلموں کی بعض باتوں کے جواب دینے کے بعد خدا نے فرمایا:

وانذر عشيرتك الاقربين ۝ واخفض جناحك لمن تبعك من المومنين ۝ فان عصوك فقل انى برئ مما تعملون ۝

اور اپنے نہایت قریبی خاندان والوں کو خبردار کر اور مومنوں میں سے جو تیرا تابعدار ہو جائے، اس کے لیے اپنے بازو جھکا دے۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں، تو بس اتنا کہہ دے کہ میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد آپ نے پہلے حضرت عبدالمطلب کی تمام اولاد کو اپنے گھر میں دعوت دی اور ان کو سمجھایا مگر ایک حضرت علیؓ کے سوا کسی نے اسلام اس وقت قبول نہ کیا۔ لیکن اس مجلس میں جتنے شریک تھے، ان میں سے ابولہب، عتیبہ بن ابی لہب اور طالب بن ابی طالب کے علاوہ ہر شخص کو خدا نے کلمۂ اسلام قبول کرنے کی ایک نہ ایک وقت توفیق دی۔ حضرت ابو طالب کی بابت اختلاف ہے کہ انھوں نے اسلام کے کلمہ پر وفات پائی یا کلمۂ کفر پر۔ اگرچہ زیادہ مستند روایتیں ان کے اسلام قبول نہ کرنے کی شاہد ہیں۔ مگر میرا میلانِ طبع شیعی روایتوں کی صحت کی طرف ہے۔ آلِ رسولؐ کی طرف جتنی روایتیں منسوب ہیں، وہ اسی بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ حضرت ابو طالب نے حضور صلعم کی پرورش آپ کی نو برس کی عمر سے کی۔ آپ کی عمر جب ۵۰ برس کی ہوئی، اس وقت تک برابر آپ کے لیے سینہ سپر تھے۔ حضرت علیؓ کو اسلام پر قایم رہنے کی وصیت انھوں نے کی تھی۔ آپ کے ساتھ ان کو بیحد محبت تھی۔ اپنے ایمان کو مصلحتاً عوام سے وہ چھپاتے رہے ہوں، تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ جن روایتوں سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، ان کی تاویل ہم کر سکتے ہیں کہ مومن آلِ فرعون کی طرح وہ اپنا ایمان چھپاتے تھے۔ بہرصورت چار افراد خاندان کے علاوہ، جن میں حضرت عبدالمطلب کے بیٹے، پوتے، پوتی، بیٹی، نواسا، نواسی وغیرہ ۲۶ افراد خاندان کو خدا نے اسلام کی توفیق دی ان میں سے خصوصیت کے ساتھ حضرت جعفر بن ابی طالب کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جو اس مجلس میں تو نہیں تھے مگر اس کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ مسلمان ہو گئے۔

اس مجلس کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک فرد کو آواز دے کر بلایا۔ ہر خاندان سے لوگ آ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ بتاؤ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج آ رہی ہے، جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم لوگ یقین کرو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ضرور یقین کریں گے۔ کیونکہ تمہاری کوئی بات ہمارے علم میں آج تک جھوٹی نہیں ثابت ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تب میں تم کو ایک عذاب شدید سے آگاہ کرتا ہوں اور آپ نے عذابِ آخرت کی تشریح کی۔ ابولہب نے کہا، تبالك الهذا ادعوتنا۔ یعنی بُرا ہو تیرا کیا تُو نے ہم کو اسی لیے بلایا ہے۔ پھر وہ سب کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے کفار نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی ظالمانہ کارروائیوں کی انتہا کر دی۔ بہتیرے مسلمانوں کے لیے ایمان کو سلامت رکھتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ناممکن ہو گیا۔

رجب ۵ ق-ھ میں آپ نے اجازت دی اور حضرت عثمانؓ بن مظعون کی قیادت میں گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک قافلہ حبش کو روانہ کیا۔ قریش نے اس قافلہ کا پیچھا کیا کہ سب کو گرفتار کر لائیں۔ لیکن ساحل پر پہنچنے کے ساتھ مسلمانوں کو ایک جہاز مل گیا اور پیچھا کرنے والوں کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے یہ لوگ حبش کو روانہ ہو چکے تھے۔ شعبان یا رمضان میں سورۂ نجم نازل ہوئی جس کے اندر واقعۂ معراج کا ذکر ہے۔ یہ سورہ مجمع عام میں پوری سنائی گئی۔ آخری آیت سن کر مسلمانوں کے جس قدر افراد مکہ میں رہ گئے تھے انہوں نے سجدہ کیا۔ ان کے ساتھ ایک کافر کے علاوہ دوسرے تمام کفار نے بھی سجدہ کیا۔ قصہ طویل ہے۔ یہ مضمون تطویل کا متحمل نہیں کیونکہ باوجود اختصار طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اس واقعہ کی خبر حبش میں سارے اہل مکہ کے مسلمان ہو جانے کی نوید بن کر پہنچی۔ شوال ۵ ق ھ میں مہاجرین حبش سے واپس آ گئے۔ مگر یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیے پہلے سے زیادہ انگارا بنی ہوئی تھی۔ اس لیے ۵ ق۔ھ کے خاتمہ سے پہلے ہی دوبارہ ان لوگوں کو حبش جانا پڑا اب کی بار چالیس سے کچھ کم مردوں اور گیارہ عورتوں کا قافلہ حبش کو روانہ ہو گیا۔ جہاں کچھ لوگ ۱ھ تک اور کچھ لوگ ۷ھ تک مقیم رہے۔ اب کی بار قافلۂ مہاجرین کے سردار حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب تھے۔ ان لوگوں کے حبش پہنچتے ہی عبداللہ بن ابی زمعہ اور عمرو بن عاص کی قیادت میں قریش کا ایک وفد دربارِ نجاشی میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارے کچھ مجرمین آپ کے ملک میں بھاگ آئے ہیں ان کو گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کیا جائے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر ان سے ان کا عذر پوچھا، تو حضرت جعفرؓ نے ایک نہایت بلیغ تقریر کی۔ ایام جاہلیت کے احوال بیان کیے۔ پھر حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کیا۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ سنایا، اور کہا کہ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے خدا کو واحد بے شریک مان لیا۔ اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ جن خبیث کاموں کے ہم عادی تھے، ان سے توبہ کی۔ ہماری قوم چاہتی ہے کہ ہم پھر اسی خبیث مسلک پر لوٹ جائیں جس کے ہم عادی تھے۔ اس لیے انہوں نے ہم کو ستایا، دکھ دیا، مجبور کیا اور اپنے نئے مسلک پر قائم رہتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ہمارے لیے ناممکن ہو گیا، تو ہمارے نبیؐ نے آپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کا حکم دیا۔ نجاشی نے قریش کے وفد سے پوچھا کہ کیا اس کے علاوہ ان کا کوئی اور جرم بھی ہے؛ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ ان میں سے کوئی آبق غلام تو نہیں ہے؛ لوگوں نے کہا: نہیں۔ تب اس نے قریش سے کہا: جب یہ آزاد ہیں، تو پھر آزاد ہیں، میں ان کو تمہارے حوالہ نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں سے کہا: اذھبوا فانتم الطلقاء۔ (جاؤ تم لوگ آزاد ہو)۔ قریش نے کہا کہ یہ لوگ حضرت مسیحؑ کے حق میں جو مانتے ہیں، وہ بھی تو ان سے پوچھیے؛ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے کہا کہ اچھا بتاؤ کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؛ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی ۲۸ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ نجاشی اور اس کے دربار کے کئی آدمیوں کا یہ حال تھا کہ ان کے آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تربتر ہو رہی تھیں۔ اسی واقعہ کی طرف سورۂ قصص میں خدا نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے؛

الذین اٰتینٰھم الکتاب من قبلہ ھم بہ یومنون ○ واذا یتلیٰ علیھم قالوا اٰمنا بہ انہ الحق من ربنا انا کنا من قبلہ مسلمین۔ (قصص ۵۳)

جن لوگوں کو اس کے قبل سے ہم نے الکتاب (کی سمجھ) دی ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جب وہ کتاب ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے رب کی جانب سے سچی بات یہی ہے۔ ہم تو اس کے قبل سے مسلمان ہیں۔

نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ رجب ۹ھ میں اس نے وفات پائی۔ عین بروزِ وفات خدا نے حضرت رسولِ خداؐ کو اور آپ نے مسلمانانِ مدینہ کو نجاشی کے جاں بحق ہو جانے کی خبر دی۔ آپ نے میدان میں نکل کر اپنے صحابہ کے ساتھ اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ تاریخِ اسلام میں پہلی غائبانہ نماز جنازہ یہی تھی۔ اس نماز جنازہ میں جو لوگ شریک تھے، ان میں حسب ذیل اصحاب کے نام معلوم ہیں،

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عامرؓ بن ربیعہ، حضرت ابو قتادہؓ، حضرت سہیلؓ بن حنیف، حضرت عبادہؓ بن صامت۔ اس باب میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب آپؐ نے نجاشی کے مرنے کی خبر دی تو بہتوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اللہ نے پردہ اٹھا دیا۔ مدینہ میں بیٹھے ہوئے لوگ تختِ حبش پر نجاشی کو بیٹھا دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی معجزہ نہ تھا۔ شہدِ نبوت کا منظر لوگوں کی آنکھوں میں ۱۰ برس بعد تازہ ہو گیا تھا۔

وفدِ قریش حبش سے ناکام واپس آیا۔ قریش کا قہر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اور بھڑک گیا۔ لوگوں نے کہا یہ تو غضب ہو گیا۔ نجاشی تک محمدؐ کا مرید ہو گیا ہے۔ اب اسلام سے نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پیغمبر کو قتل ہی کر دیا جائے۔ لیکن بنو عبد مناف سے خطرہ تھا کہ وہ ثار (خون کے بدلے خون) کا مطالبہ کریں گے۔ بنو عبد مناف کے گھرانے چار تھے: (۱) بنو ہاشم، (۲) بنو مطلب، (۳) بنو امیہ، (۴) بنو نوفل۔ قریش نے ان چاروں گھرانوں سے کہا، یا تو محمدؐ کو قتل ہونے کے لیے ہمارے حوالے کر دو، یا باہم سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بنو امیہ اور بنو نوفل نے عام قبائل قریش کی حمایت اور دوستی کو ترجیح دی مگر بنو ہاشم اور بنو مطلب میں سے ایک ابولہب کے علاوہ ہر شخص نے اعلان کر دیا:

فلا واللہ نسلمہ لقومٍ ولمّا نعقض فیھم بالسیوف۔

قسم ہے خدا کی تلواروں سے فیصلہ کیے بغیر اسے ہم کسی قوم کے حوالے نہ کریں گے۔

اب طے پایا کہ کوئی ایک شخص قتل کی ذمہ داری تنہا اپنے اوپر اٹھا لے تاکہ ایک خون کا بدلہ ایک ہی خون ہو۔ اس کام کی ذمہ داری عقبہ بن ابی معیط نے اٹھائی۔ ایک دن اس نے آپ کو تنہا دیکھ لیا، اپنی چادر کو رسی جیسا بنایا اور پھانسی کا پھندا بنا کر آپؐ کے گلے میں ڈال دیا اور پھندے کو کسنے لگا۔ اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ آ گئے، لپک کر عقبہ بن ابی معیط کو دھکا دیا، وہ گر پڑا اور آپؐ کی گردن سے پھندا نکال دیا۔ کچھ مسلمان اور پہنچ گئے اور آپؐ کو ارقم بن ابی ارقم کے گھر لے کر چل دیے۔ عقبہ بن ابی معیط کے طرفداروں نے اب حضرت ابوبکرؓ کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ بیہوش ہو کر گر گئے۔ آپ کے خاندان بنو تیم کو خبر ہو گئی۔ وہ آئے اور آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر پہنچا دیا۔ حالت ایسی تھی کہ سب نے یقین کر لیا کہ تھوڑی ہی دیر بعد جاں بحق ہو جائیں گے۔ لیکن بالآخر آپ کو ہوش آ گیا۔ ہوش آتے ہی آپؓ نے سب سے پہلے حضرت رسولِ خداؐ کی خیریت دریافت کی اور اپنی والدہ کو، جو مسلمان تو تھیں مگر اعلان اسلام نہیں کیا تھا، حضرت عمرؓ کی بہن کے پاس، جو مسلمان ہو چکی تھیں، مگر ابھی کسی کو ان کے اسلام کی خبر نہ تھی، بھیج کر حضرت رسولِ خداؐ کا خفیہ مستقر معلوم کر کے دار الارقم میں حاضر ہوئے، اور آپ کے ساتھ یہیں ٹھہر گئے۔ ایک ماہ تک آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ اسی گھر میں روپوش رہے۔

دار الارقم قدیم تاریخ مسلمانوں اور اسلام کی ہم کو بتاتی ہے کہ اسلام نے ہمیشہ مظلومی کے زمانہ میں ترقی پائی ہے۔ سچائی کو جتنا ہی دبایا جاتا ہے، اتنی ہی ابھرتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے اسلام کی قوت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ جو لوگ سختی سے

اسلام کی بیخ کنی میں حصّہ لیتے تھے، ان کے دلوں میں بھی اسلام کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب آپؐ دارالارقم میں داخل ہوئے تو مشکل سے آٹھ نو آدمی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ۳۰ یوم آپؐ نے یہاں قیام کیا۔ اس مدت میں شرکائے دارالارقم کی تعداد ۳۸ ہوگئی۔ گویا ہر روز ایک مسلمان کا اضافہ ہونے لگا۔ پہلے خود حضرت رسولِ خداؐ اور حضرت ابوبکرؓ ایک ایک مردِ صالح کی تلاش میں نکلتے تھے اور جب کوئی سعید روح مل جاتی تھی تو اسے سمجھا بُوجھا کر مسلمان کرتے تھے۔ لوگ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی کچھ دنوں اعلان سے احتیاط برتتے تھے کیونکہ ان دنوں لَآ اِلٰہ اِلّا اللہ بولنا معمولی دل اور گُردے والے کا کام نہ تھا۔ یہ کلمہ بولنا صرف جان کے لیے خطرناک نہ تھا بلکہ انسان کو اپنے ماں باپ، بھائی، اولاد سب سے کٹ جانا ہوتا تھا۔ خود اپنی کمائی کے مال و متاع سے بھی محروم ہو جانا پڑتا تھا۔ موروثی مال کا تو ذکر ہی کیا، اپنے سارے دوستوں کو دشمن بنا لینا تھا۔ اس لیے لوگ قبولِ اسلام کے بعد بھی اعلان سے محتاط رہتے تھے مگر اس واقعہ نے ہر سعید رُوح کے اندر مردانہ ہمت پیدا کر دی۔ پہلے کنواں پیاسے کے پاس جاتا تھا، اب پیاسا کنویں کے پاس آنے لگا۔ لوگ چپکے چپکے آنحضرتؐ کا پتا دریافت کرتے تھے اور دارارقم میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے اور اسی گھر کو اپنا مسکن بنا لیتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت رسولِ خداؐ کے اوپر قربان ہو سکنے کے شرف کا جب موقع ملے، قربان ہو جائیں۔ دارارقم مسلمانوں کا پہلا دارالاجتماع کو صفا پر تھا۔ یہ تیس دن مسلمانوں کے لیے نہایت مبارک ثابت ہوئے۔ حضرت رسولِ خداؐ کے ساتھ ہر گھڑی بیٹھے اور دینِ اسلام کے نکات کو سمجھنے کا روزانہ موقع ملا۔ ڈر اور خوف نے دلوں کو خالی کر دیا۔ ایمانوں میں جرأت پیدا ہوئی۔ روزانہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگتے تھے کہ ہم کھل کر نکلیں اور دھڑلے سے اسلام کی تبلیغ کریں۔ لیکن حضرت رسولِ خداؐ ان کو ابھی کچھ دنوں اور محتاط رہنے کی ہدایت دیتے تھے۔

اسلامِ حمزہؓ ایک دن ایسا ہوا کہ ابوجہل نے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا دیکھ لیا، آپؐ کے ساتھ نہایت بدتمیزی سے پیش آیا۔ کیا باتیں کیں؛ یہ نہیں معلوم، مگر حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کی ایک لونڈی سُن رہی تھی اس نے جا کر حضرت حمزہ کو ساری باتیں سنائیں۔ حضرت حمزہؓ کو، جو اب تک نہایت خوشی سے دشمنانِ رسولؐ کی باتوں اور کارروائیوں کو برداشت کرتے تھے، وُہ باتیں سُن کر غصّہ آگیا۔ ابُوجَہل کے پاس پہنچے اور اسے بُری طرح ڈانٹا اور اُسے کہا کہ اب کبھی ایسی جرأت نہ کرنا، کیونکہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں بھی مسلمان ہُوں۔ یہ کلام اُن کی زبان سے غصّہ میں نکل گیا تھا۔ پھر اپنے دل کو ٹٹولا، تو معلوم ہُوا کہ وہ واقعہ ان کے دل کی آواز تھی۔ اس لیے خوشی کے ساتھ دارارقم میں آکر کلمۂ اسلام پڑھ کر مسلمان ہوگئے اور اپنے اسلام کا اعلان حسبِ ذیل اشعار کی صورت میں کیا:

حمدت اللہ حین ھدی فوادی	الی الاسلام والدین الحنیفی
الدین جاء من رب عزیز	خبیر بالعباد بھم لطیف
اذا تلیت رسائلہ علینا	تذرف دمع ذی اللب الحصیف
واحمد مصطفیٰ فینا مطاع	فلا تغشوہ بالقول العنیف

خدا کا شکر ہے، اس نے میرے دل کو ہدایت دی، میں نے اسلام اور دینِ حنیف قبول کر لیا۔ یہ دین پروردگار توانا نے بھیجا ہے، جو اپنے بندوں کا خبرگیر ہے، ان پر مہربان ہے، جب اس کے رسالے ہم کو پڑھ کر سنائے

جانتے ہیں، استوار دانش والے کا آنسو بہنے لگتا ہے اور احمدؐ ہمارے درمیان برگزیدہ ہے، قابلِ اطاعت ہے،
اس لیے دیکھو اسے کبھی سست نہ کہنا۔

اسلامِ عمرؓ

حضرت حمزہؓ کے اسلام نے دارارقم کے شرکاء کی تعداد ۳۹ کر دی۔ جن غلاموں نے اسلام قبول کیا تھا، چونکہ اپنے آقاؤں کا ساتھ نہ چھوڑ سکتے تھے، وہ دارارقم میں نہ تھے۔ حضرت حمزہؓ کے اسلام کے بعد قریش کو حمزہؓ ہی جیسے بہادر کی فکر ہوئی تاکہ وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر کاٹ لائے۔ اس کام کے لیے حضرت عمرؓ کو تیار کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ کسی قدر طویل ہے اور بہت دلچسپ ہے۔ مگر مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اسلام کی حقانیت کے وہ اب سے پہلے قائل ہو چکے تھے مگر آبائی دین کی محبت ابھی غالب تھی۔ اس لیے تلوار سونت کر وہ آپ کو قتل کرنے کے لیے نکلے۔ راہ میں ان کو خبر ہو گئی کہ ان کی بہن اور بہنوئی بھی مسلمان ہو چکے ہیں، پہلے ان کا قصہ تمام کر دینا چاہا۔ بہن کے گھر پہنچے اور بہن اور بہنوئی کو مار مار کر زخمی کر دیا۔ لیکن بہن کو لہو لہان دیکھ کر دل نرم پڑ گیا۔ بہن نے کہا: مار ڈالو مگر کلمہ لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ سے نہیں پھر سکتی۔ اب حضرت عمرؓ کا دل اور ہی ہو گیا۔ بہن سے وہ صحیفہ مانگا، جو پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے کہا، تم ناپاک ہو اور یہ صحیفہ ناپاکوں کو نہیں دیا جا سکتا۔ اُٹھے اور فوراً غسل کیا۔ پھر صحیفہ لے کر پڑھا اور بے ساختہ کلمۂ شہادت زبان سے نکل گیا۔ حضرت خبابؓ بن الارت، جو کہ ان کو قرآن پڑھا رہے تھے اور حضرت عمرؓ کو دیکھ کر ایک کوٹھڑی میں چھپ گئے تھے، باہر نکل آتے اور فرمایا: ابھی کل حضرت رسولِ خدا نے دُعا کی تھی، خدایا! عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام (ابوجہل) دو میں سے کسی کو اسلام کی عزت عطا کر کے میری مدد فرما۔ خدا نے آپ کے حق میں یہ دُعا قبول کر لی۔

پھر وہ حضرت عمرؓ کو لے کر دارارقم میں پہنچے اور کارکنانِ قضا و قدر نے غلغلہ بلند کیا کہ: ؎

آمد آں یارے کہ ما مے خواستیم

عمر نکلے تھے کہ فرزندِ عبداللہ کا سر کاٹ لیں مگر اب خود عمر کے لب تھے اور فرزندِ عبداللہ کا پاؤں۔ سورۂ انفال مدنی سورہ ہے، اس میں خدا نے فرمایا:

یٰآیہا النبی حسبك الله ومن اتبعك من المومنین۔

اے نبی تیرے لیے اللہ کافی ہے اور جتنے مومنوں نے تیرا اتباع کیا۔

غالباً یہ آیت بھی مدنی ہے۔ لیکن مفسروں کی روایت کے مطابق یہ آیت حضرت عمرؓ کے اسلام کے عین بعد نازل ہوئی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

غلاموں کی رہائی

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام کا زمانہ ۶ق۔ھ کے ابتدائی ایام کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے بعد مسلمانوں نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی۔ اب تک آپ کا دائرۂ تبلیغ صرف شہر تک محدود تھا۔ خدا نے ام القریٰ ومن حولہا یعنی مکہ اور اردگرد والوں کو سمجھانے کا حکم سورۂ قصص اور سورۂ انعام میں اتارا۔ سب سے زیادہ مصیبت میں وہ مسلمان تھے، جو آزاد نہ تھے۔ اب "فک رقبہ" (غلاموں کی آزادی) کے لیے جد و جہد کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری دولت اس کام کے لیے وقف کر دی اور تمام غلاموں کو، جو مسلمان ہو چکے تھے، ان کے مالکوں سے

خرید کر آزاد کر دیا۔ ان آزاد ہونے والے غلاموں میں سب سے محترم نام حضرت بلالؓ کا ہے۔ ان کو گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر تپتا ہوا پتھر رکھ دیا جاتا تھا، کوڑے مارے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ توحید سے انکار کرنے ہی پر جان بخشی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ مردِ خدا احد احد چلاتا تھا پانی بھی پینے کی خواہش ظاہر نہیں کرتا تھا۔ حضرت رسولِ خداؐ کا اپنے ماننے والوں پر جو اثر تھا، اس کا مقابلہ ان بزرگوار پر مسیحیت کے اثر سے کیجیے، جن کو عیسائیوں کے خیال کے مطابق آسمان کی اور جنت کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم افضل انبیاء ہیں، بے بنیاد نہیں ہے۔ کہاں کوئی مصیبت سے بغیر محض مصیبت کے خوف سے حضرت مسیحؑ کے خلاف کلمۂ کفر بول کر جان بچانا اور کہاں تپتی ریت پہ تپتے پتھر سے دبے ہوئے کوڑے کھانے والے کا احد احد پکارنا۔ حضرت پطرسؓ کو ہم بُرا نہیں کہتے کیونکہ ان کی نظیر ہم کو حضرت عمارؓ بن یاسر میں ملتی ہے، لیکن پھر بھی فرق ہے۔ کیونکہ حضرت عمارؓ نے باپ اور ماں کی مظلومانہ موت دیکھی۔ اسی مظلومانہ موت کے منہ میں پھنس کر جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر زبان سے کہہ دیا جسے خدا نے جیسا کہ سورہ نحل میں ہے، معاف کر دیا۔ حضرت پطرسؓ کو حضرت مسیحؑ کے اٹھ جانے کے بعد تو ضرور بلالی ایمان عطا ہوا، لیکن حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں ان کا ایمان حضرت عمار کے ایمان جیسا بھی نہ تھا۔ لیکن اگر ہم آج کے مسلمانوں کا ایمان بالرسول اور نصرانیوں کا ایمان بالمسیح ایک ترازو پر رکھیں اور ہم کو شرم اور غیرت خدا نے دی ہو، تو شاید مر ہی جانا پڑے گا۔

حصارِ شعب

سنہ ق۔ھ اگرچہ مسلمانوں کے لیے نہایت سخت دور تھا، لیکن اب سب مومنوں کے دل بلالؓ کے سے ہو گئے تھے، اب کوئی مصیبت ان کے لیے مصیبت نہ تھی۔ ہر شخص اسلام کا پُرجوش مبلغ تھا۔ اطراف و اکناف سے لوگ اسلام کی حقیقت معلوم کرنے کو آنے لگے۔ قریش کو نہایت فکر لاحق ہو گئی۔ محرم سنہ ق۔ھ میں تمام اہل مکہ نے جن میں بنو امیہ اور بنو نوفل دو خاندان بنو عبد مناف کے بھی شریک تھے، مسلمانوں اور بنو ہاشم اور بنو مطلب سے جو مسلمان نہ ہونے کے باوجود حضرت رسولِ خداؐ کے لیے سینہ سپر رہتے تھے، ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے اور ان سب کو شعب ابی طالب میں قید ہو جانے پر مجبور کر دیا اور ایک عہد نامہ مقاطعہ لکھ کر خانہ کعبہ میں اس کو لٹکا دیا۔ دو سال تک ان کو شعب ابی طالب میں قید رہنا پڑا۔ اس زمانہ میں جو شدتیں اور تکلیفیں ان کو برداشت کرنی پڑیں، ان کی تشریح طویل ہے۔ صرف ایامِ حج میں ان لوگوں کو شعب سے نکلنے کا موقع تھا۔ ایامِ حج میں چونکہ کسی پر ظلم کرنا مشرکین مکہ بھی ناروا سمجھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو اسلام کی تبلیغ کا اچھا موقع ملتا تھا۔ دُور دُور سے حج کے لیے جو لوگ آتے تھے، وہ بھی اس نئے دین کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ شعب ابی طالب کے زمانہ میں خدا نے وہ سورتیں نازل کیں، جن میں ان تمام لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے، جن کے پاس کوئی الہامی نوشتہ نہ تھا۔ شعب ابی طالب سے رہائی کے بعد اہلِ کتاب کے درمیان بھی تبلیغ کے احکام نازل ہوئے۔

حصارِ شعب کے ٹوٹنے کی صورت یہ ہوئی کہ ایک روز رسولِ خداؐ نے اطلاع دی کہ قریش نے جو معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر محفوظ کر رکھا ہے، اللہ کے نام کے علاوہ تحریر کا ایک ایک حرف دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ حضرت ابو طالب ہمت کر کے شعب میں سے نکلے خانہ کعبہ کے پاس آئے۔ قریش نے سمجھا کہ اب ہمت جواب دے چکی ہے، ہماری شرطیں مان لیں گے، لہٰذا خوشی سے ان کا استقبال کیا۔ حضرت ابو طالب نے حضرت رسولِ خداؐ کا بیان ان کو سنایا۔ قریش نے کہا: اگر یہ بیان غلط ثابت ہوا تو تم کو ہماری شرط ماننی پڑے گی

اور صحیح ثابت ہُوا تو آج سے مقاطعہ ختم کر دیا جائے گا، کیونکہ یہ خدائی فیصلہ ہے۔ کاغذ تلاش کیا گیا تو خبر حرف بحرف صحیح تھی، اس لیے معاہدہ منسوخ کیا گیا۔ محرم سنہ ق۔ھ میں حصار شعب سے لوگ باہر نکلے۔

انشقاق قمر انبیاء اور اولیاء کے تذکروں میں عموماً معجزات اور کرامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بہت سے معجزات کتب سیرت میں مروی ہیں۔ لیکن قرآن پاک کے اندر خدا نے معجزوں کو دلیلِ نبوت نہیں قرار دیا ہے۔ بہتیری آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ کفار بار بار معجزوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن اس مطالبہ کو کسی نہ کسی جواب کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے بہتیرے اصحاب ان آیتوں کی دلیل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آپ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ سورۂ انعام میں خداوند عالم نے فرمایا کہ:

وقالوا لولا نزل علیہ اٰیۃ من ربہ قل ان اللہ قادر علی ان ینزل اٰیۃ ولکن اکثرھم لا یعلمون۔ (انعام)

اور انھوں نے کہا: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی (معجزانہ) آیت کیوں نہ اتاری گئی۔ جواب دے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ کوئی آیت نازل کر دے۔ لیکن بہتیرے لوگ نہیں جانتے (کہ کیا بات کس بات کی دلیل ہوتی ہے)

واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن جاءتھم اٰیۃ لیؤمنن بھا قل انما الاٰیات عند اللہ وما یشعرکم انھا اذا جآءت لا یؤمنون۔ (انعام: ۱۰۹)

اور ان لوگوں نے اللہ کی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی (معجزانہ) آیت آجائے گی تو وہ اس پر ایمان لائیں گے اور تم لوگ نہیں جانتے کہ جب وُہ آئے گی، تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے۔

واذا جآءتھم اٰیۃ قالوا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ۔ (انعام: ۱۲۴)

اور جب ان کے پاس ایک آیت آگئی، تو کہنے لگے ہم اب بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ ہم کو بھی اس کا مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔

ان آیتوں کے باوجود جو لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی معجزے سرزد ہُوتے، وُہ غلطی پر ہیں۔ البتہ خدا نے معجزوں کو دلیلِ نبوت نہیں مانا ہے۔ کیونکہ مُردہ جلا دینا جس طرح کسی کے اچھے وکیل ہونے کی دلیل نہیں اسی طرح مُردہ جلا دینا اس بات کی بھی دلیل نہیں کہ میں جو تعلیم دیتا ہُوں، وُہ برحق ہے۔ دلیل اور مدلول میں رابطہ ہونا چاہیے۔ مُردہ جلانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسی طرح قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کردے گا، مگر اس بات کی دلیل نہیں کہ جھُوٹ بولنا بُری بات ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معجزے سرزد ہُوتے، ان میں سے ایک کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ خدا نے فرمایا:

اقتربت الساعۃ وانشق القمر وان یروا اٰیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر

قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند میں شگاف پڑ گیا۔ اور اگر یہ لوگ کوئی آیت دیکھیں گے، تب بھی اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ چلتا ہُوا جادو ہے۔

اس آیت کی بنا پر کفار نے وہ قسم کھائی تھی، جو انعام ۱۰۹ میں مذکور ہے۔ ان کے قسم کھانے کے بعد ایک رات حضرت رسولِ خدا نے لوگوں کو بلا کر چاند کی طرف انگلی کی اور فرمایا: دیکھو تو۔ لوگوں نے دیکھا کہ چاند پھٹ کر دو ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ ۵ ق۔ ھ کا ہے۔ روایتوں میں اس واقعہ کی تفصیلات ملیں گی۔

قرآن کا دعویٰ تھا کہ چاند میں شگاف پڑ گیا ہے۔ یہ دعویٰ نہ تھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ جِرمِ فلک کا حادثہ صرف یہ تھا کہ اس میں کسی زلزلہ کی وجہ سے شگاف پڑ گیا۔ لیکن جب لوگوں نے اس کا قابلِ دید ثبوت مانگا، تو آپؐ نے چاند کی طرف اشارہ کیا تو ان کو ایسا نظر آیا، کہ چاند پھٹ کر دو چاند ہو گیا۔ جِرمِ فلک پر گزرنے والے حادثے کا آنکھوں سے نظر آنیوالا منظر ایک ثبوت تھا۔ جِرمِ فلک میں جب شگاف پڑا تو اس کے اندر کوئی چیز دخان جیسی نکل کر متموج ہو گئی اور اس کے تموج نے چاند کو دو کر کے دکھا دیا۔ اس موقع پر ایک شعر نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، جسے میری چشم دید گواہی سمجھیے: ؎

تیری موجوں میں چھپا ہے رازِ وانشق القمر
رودِ گنگا تیری گودوں میں بکھر جاتا ہے چاند

۳ ق۔ ھ میں حضرت ابو طالبؓ اور حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ حضرت رسولِ خدا نے اس سال کو عام الحزن کا نام دیا۔ شوال یا ذی قعد ۳ ق۔ ھ میں آپ نے زید بن حارثہ کو ساتھ لیا اور بغرضِ تبلیغ طائف کو روانہ ہوئے۔ لیکن سرزمینِ طائف آپ کے لیے مکہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ بنو ثقیف نے آپ کی باتیں سننے سے انکار کر دیا اور کہا: "کیا اللہ کو رسول بنانے کے لیے کوئی اور شخص نہیں ملا۔ پھر انھوں نے چھوکروں کو اکسا دیا کہ یہ شخص مجنون ہے، اب تم جانو اور یہ مجنون جانے۔ آپؐ جدھر گزرتے، لونڈے آپ کو پتھر مارتے تھے۔ حضرت زیدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بددعا کے لیے عرض کی۔ آپؐ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور خدا سے عرض کی:

"میرے پروردگار! میری قوم کو راہِ راست دکھا دے کیونکہ یہ بے علم لوگ ہیں۔"

لونڈوں سے جان بچا کر کسی طرح ایک باغ کی دیوار کے زیرِ سایہ بیٹھ گئے۔ اس باغ کے مالک دو رئیس تھے۔ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ۔ کفرِ شدید کے باوجود آپؐ کی حالتِ زار پر ان کو رحم آگیا۔ باغ کے مالی عداس کو، جو ان کا غلام تھا، انھوں نے ایک طبق میں کچھ خوشے انگور کے آپؐ تک لے جانے کو کہا۔ جناب عداس ایک نصرانی عالم تھے۔ بدقسمتی سے غلام بن کر پلے تھے۔ یہ بزرگ جب خوشہ لے کر آپؐ کے پاس پہنچے، تو عتبہ اور شیبہ نے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ جناب عداس آپؐ کے سر کو، ہاتھوں کو اور پاؤں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ دونوں نے عداس کو بلا کر سوال کیا کہ عداس تم یہ کیا کر رہے تھے۔ عداس نے جواب دیا:

"میرے آقا! روئے زمین پر آج اس شخص سے اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے مجھے وہ بات بتائی ہے، جو ایک نبی ہی بتا سکتا ہے۔"

اس کے بعد آپؐ وہاں سے مکہ کو لوٹ آئے۔

۲ ق۔ ھ کے ماہِ حج سے اسلام کی تاریخ کا نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ مدینہ سے آکر چھ افراد نے ایک گھاٹی کے اندر

اسلام قبول کیا۔ ۲ سنہ ق۔ ھ کے ماہِ حج میں یہ لوگ تجدیدِ بیعت کے لیے چھ مزید مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے آئے اور ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا، اور آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ تعلیمِ قرآن کے لیے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو روانہ کیا۔ سنہ ۱ ق۔ ھ کے ماہِ حج میں ۷۰ انصار نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آنے کی دعوت دی اور مکہ سے لوگوں نے یکے بعد دیگرے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ چند دنوں کے بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا واھجرھم ھجراً جمیلا اور آپ نے جمعہ یکم ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کو مکہ چھوڑ دیا۔

تین یوم آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ دوشنبہ ۵ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کو غار سے نکلے اور دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کو مدینہ پہنچے۔ اس روز سے اسلامی تاریخ کا کچھ اور ہی رنگ ہوگیا۔

مدنی زندگی

سید مناظر احسن گیلانی

جن کوتاہ بینوں نے "دل" کا اقرار کیا تھا، لیکن "دماغ" پران کو اب تک شک تھا، اب ان ہی تنگ نظروں کے لیے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، جس میں "دل" سے زیادہ "دماغ" ہی کی نمایش ہوگی تاکہ وہ وہمی شوشہ بھی مٹ جائے جس کے آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لیے چھپنے والے چھپ رہے ہیں۔

اور دیکھو کہ دماغی تجربات بیّنہ کی اسی کش مکش سے وُہ ترشی بھی نچوڑی جائے گی جس سے ان خود بینوں کا نشہ پھاڑا جائے گا، پھٹ جائے گا، جن کے پاؤں "سربلندی وعلو" کے خمار کے ہاتھوں جاننے کے بعد بھی ماننے سے اب تک ڈگمگا رہے ہیں، تاکہ حجت پُوری ہو:

لیھلك من ھلك عن بینۃ و یحیی من حی عن بینۃ۔	جو مرنا چاہے وُہ کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر مرے اور جو جینا چاہے وُہ بھی کُھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر جیئے۔

(القرآن)

مدنی زندگی کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا ہے کہ "ھو انی علی الناس" کے فریادی کو "اناس" اور "ناس" کے ساتھ جو کچھ ہیں سب پر اس کو زن بخشا جارہا ہے، یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا، سلع پہاڑ کے دامن میں سب اسی پر رد کیے جارہے ہیں، بھوکوں کے لیے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں، پیاسوں کے لیے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں، گاتے ہیں، بجاتے ہیں، باہم ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، ابھی ابھی جس کی جمادی چٹانیں ھلم الی یارسول اللہ کے ساتھ پکار رہی تھیں، اسی کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ بڑھ کر ٹھیک اسی طرح؛

یارسول اللہ ھلم الی القوۃ والمنعۃ۔	اے اللہ کے رسول! زور اور حفاظت کی طرف آئیے۔

عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں، مال حاضر کرتے ہیں، تو یہ مدینہ کا نہیں بلکہ قرن الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس عمل کا ردِ عمل "ملاءِ اعلیٰ" سے شروع ہوا تھا، یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور رہے جو "مکہ" میں بھی ظاہر ہوا، "ثور" میں بھی ظاہر ہوا۔

"ثور" سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، "قبا" میں بھی ظاہر ہوا، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لیے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا تاکہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے پہلا کام یہی کرے، اور اب مدینہ میں بھی اسی ردِ عمل کا ظہور ہورہا ہے، آئندہ ہوتا رہے گا، اسی کا ظہور "کوفہ" میں بھی ہوگا، "دمشق" میں بھی ہوگا، "بغداد"

میں بھی ہوگا، "غرناطہ" و "قرطبہ" میں بھی ہوگا" قاہرہ" میں بھی ہوگا" غزنی میں بھی ہوگا" دہلی میں بھی ہوگا، اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کی نمود ہے، اسی لیے "مدنی زندگی" کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو "مکہ" ہی کے آثار ہیں جنھیں تم اب "مدینہ" میں دیکھ رہے ہو، بلکہ "مدنی" زندگی میں تم کو وہ باتیں تلاش کرنی چاہییں جن میں "دل" سے زیادہ "دماغ" کا "اخلاق" سے زیادہ "عقل" کا تجربہ ہو۔

"مکہ" میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس "دل" سے بہتر کوئی دل نہیں، اسی طرح ان باتوں کا مطالعہ "مدینہ" میں کرو، جن کو دیکھ کر کہا جائے کہ اس "دماغ" سے بہتر کوئی "دماغ" نہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اس کے ساتھ "صفہ" کا مدرسہ بنایا گیا، لیکن کیا صرف مسجد نبوی بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے، پھر اس میں بڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت قدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہنچیں، سب سے پہلے وہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیو کھود دیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہیے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے جہاں وہ آباد ہوتا ہے، تعمیری تکلفات کی وجہ سے دقت نہ ہو اس لیے سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وہ رکھا گیا جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے، ہر جگہ گاڑ سکتا ہے، آخر تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد مدرسہ کے ساتھ ہو" علم دین " ہے، "دین علم" ہے، عملاً اس نمونہ سے اس کی تعلیم دی گئی۔

میں نہیں کہتا کہ اس مسجد و مدرسہ کے بنانے میں یہ مصالح بھی پیش نظر نہیں تھے، یا آیندہ مسلمانوں کو اس نمونہ کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے، لیکن دیکھا گیا پر سوچا نہیں گیا، آخر مسجد عرب میں بنتی ہے، عرب میں کعبہ موجود تھا، جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا، لیکن بایں ہمہ اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔

لوگ سمجھے کہ صرف قبلہ مقرر ہوا، لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ "وطنیت" کا جو بت عرب میں صدیوں سے پوجا جاتا تھا، اور اس زور و شور سے پوجا جاتا تھا کہ اس کا پجاری اپنے سوا سب کو "عجم" اور گونگا سمجھتا تھا، دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ جب قرآن میں ہے کہ ابتداءً عربوں پر یہ "غیر ملکی" قبلہ گراں گزرا تو یہی غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرانیوں کے برداشت کا انھوں نے عہد کیا تھا، جھجکے مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے، اور جو لادا گیا لاد لیا، سترہ مہینے تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کے لیے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے عرب سے الگ کیے گئے، لیکن اب عرب نہیں بلکہ عرب اور غیر عرب خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا ہے، سترہ مہینے کے بعد قبلہ بدلتا ہے، اور بجائے سلیمان کی ہیکل کے سلیمانؑ و داؤدؑ اسحاقؑ و اسماعیلؑ کے باپ ابراہیمؑ کے بنائے کعبہ کو قبلہ ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۔

اور جہاں سے تم نکلے اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف منہ موڑ دو، اور جہاں کہیں (اے مسلمانو!) تم ہو اپنے چہروں کو اس طرف موڑ دو۔

کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کیے گئے ہیں وُہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں، پہلے غیر عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا، اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو مٹا کر نہ عرب ہی رہا نہ غیر عرب رہا بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آگئی، کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا، اور بسیط زمین اسی دیوار کا صحن قرار پایا، یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اسی کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، ایشیا بھی اس کو کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے، یورپ میں بھی جب اس کو نماز کی ضرورت ہوتی ہے تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، راورسٹ اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے، اور "بحرِ محیط" اسی صحن کا ایک حوض بحرِ قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے، ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اس نظریہ کی عملی شکل میں مشق کرتا ہے، اس کو یہی بنایا گیا ہے، صحیح حدیث میں ہے؛

جعلت لی الارض مسجداً۔ پُوری زمین میری مسجد بنائی گئی ہے۔

وطنیت" کے اس صنم اکبر کو توڑنے کے ساتھ اب "قومیت" اور "نسلیت" کا بُت سامنے آتا ہے، کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں، جب سنتے ہیں یا کہتے ہیں کہ "مدینہ" میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا، ان میں عقد مواخات قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا، مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار، کعبہ کے کلید بردار تھے، اور انصار قبیلہ اوس وخزرج کے کسان اور کاشت کار تھے، حالانکہ دونوں انسان تھے لیکن جس طرح آریائی نسل والوں نے سامی نسلوں کو اور سامی نسلوں نے تورانی نسلوں کو، یا برہمنوں نے شودروں کو بے رنگوں نے رنگینوں کو پھیکوں نے نمکینوں کو، آدمی کی نہیں بلکہ گھوڑوں کی اولاد بیل کی نسل سمجھا، اور اسی قسم بلکہ ان سے بدتر سلوک انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ روا رکھا جو ان کے ہم نسل ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑا ناز تھا، نسبی فخر ایک دیوتا تھا جو صدیوں سے ان میں پُوجا جاتا تھا، اور اس طرح پُوجا جاتا تھا کہ غیر قریشی عربوں کے ساتھ یہ لوگ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے، جس طرح آج بھی اُجلے کالوں کے ساتھ دُعا تک مانگنے میں اپنی ذلت سے ڈرتے ہیں، قریشی اس قبرستان میں بھی دفن ہونا ننگ خیال کرتے تھے، جس میں کوئی غیر قریشی بیچارہ دفن ہوتا، جس طرح آج بھی شودروں کی مسان برہمنوں، چھتریوں کے مرگھٹ سے دُور ہوتی ہے، یہی مواخات کا گزر تھا، جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا۔ قریشی سردار انصاری کسان کے آگے جھکا ہوا تھا، وہ اس کے ہاتھ چُومتا تھا، اور یہ ان کے قدم لیتا تھا، یہ اس کو اپنا سب کچھ بلکہ تم نے سنا ہوگا طلاق دے کر ایک بیوی تک دینے پر اصرار کرتا تھا اور وُہ شکریہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔

اور یُوں مخلوقات بلکہ اپنے خود ساختہ مخلوقات کے پنجوں سے آزاد ہو کر مدینہ والوں نے اپنے کھوئے ہوئے ربِّ قیوم کو پالیا تھا اسی کے بعد منادی کرا دی گئی کہ اب دنیا ایک ہے، اس کا معبود ایک ہے، ان کا رسول ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے، ان کا کعبہ ایک ہے۔

اور دیکھو کہ دن کے پانچ وقتوں میں کڑک کڑک کر گرج گرج کر بلند میناروں سے پکارنے والے مشرق میں مغرب میں، زمین کے آخری کناروں تک یہی پکار رہے ہیں، پکارتے رہیں گے، کیا ناقوس سے، بوق سے، قرنا سے، گھنٹوں سے، طبل سے، نقاروں سے یہ بات ممکن تھی، جس کی ابتداءً اذان کے عجیب وغریب ندائی طریقہ سے اسی کے بعد زمین پر اسلام کی سب سے پہلی مسجد میں کی گئی، متعدد وطنوں کا بُت ٹوٹ گیا، متعدد نسلوں کا صنم چُور چُور ہو گیا۔

جو توڑے گئے جٹ گئے، جو بکھیرے گئے تھے سمٹ گئے، الغرض جو ایک تھے وُہ ایک ہی ہو گئے اور اسی یکتائی کا خلاصہ وُہ ہے جس کا اعلان اذان کی شکل میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے، محض فکر و خیال میں نہیں، بلکہ واقع میں عملی طور پر مدینہ میں دنیا کا یہ نقشہ قائم ہو گیا، انسانیت کی آزادی کا یہی عالمگیر نقشہ تھا جس کو عالم پر منطبق کرنے کے لیے "کافۃ للناس" کا بشیر و نذیر اب "کافۃ الناس" کی طرف بڑھتا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اس کو اختیار تھا کہ "قرن الثعلب" کے پاس اس کو جو اخشبین (۲ پہاڑ) دیئے گئے تھے، ان ہی کو لے کر آگے بڑھتا، لیکن یہ تو پھر دل کا امتحان ہو جاتا، حالانکہ اب تو صرف "دماغ" ہی کا تجربہ کرانا مقصود ہے، دکھایا جاتا ہے کہ جس کے دماغ کے یہ کارنامے ہیں، اس کو مجنوں کہنے والے کیا خود مجنوں نہیں ہیں، جس کی عقل، جس کے فہم کے یہ کرشمے ہیں، اس کے عقلی توازن میں نقص نکالنے والے کیا ایسے بدبخت خود عقلی توازن سے محروم نہیں ہیں۔

راستہ اگر صاف ہوتا تو اس وقت جو کچھ دکھانا ہے، کامل طور پر دکھایا نہیں جا سکتا تھا، لیکن دیکھو! راہ میں کانٹوں کے جو گھنے جنگل چپ و راست اوپر اور نیچے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں وُہ قصداً ان ہی میں گُھس کر نکلتا ہے، اور کتنے شاندار طریقہ سے نکلتا ہے۔

بیابان کے ایک نخلستانی قصبہ کے ان کسانوں کی آبادی سے یہ تحریک عالم کی طرف یلغار کرتی ہے، جو یہودی ساہوکاروں کے سود در سود کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، ان کی زمینوں میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے، لیکن جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے ساتھ یہودی قرض خواہوں کے گھر اُٹھ کر چلا جاتا ہے، زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس چھوٹی سی آبادی کے دو خاندان اپنی خانہ جنگی میں رہے سہے جوانوں اور سرداروں کو بھی کھو چکے ہیں، ان کے ساتھ اپنے دھن سے وطن سے بچھڑے ہوئے کچھ لوگ اور بھی شریک ہیں، جن کی تعداد سَو سے زیادہ نہیں ہے، ان کا یہ حال ہے، دُوسری طرف سارا عرب ایک کمان بن کر اس تحریک کو اور تحریک والوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہمیشہ کے لیے نیست و نابُود کرنے پر تلا ہوا ہے، یہودی اپنی مہاجنی کی کساد بازاری سے گھبرا کر ان تمام قلعوں اور قلعوں والوں کو مخالفت کے نقطہ پر جمع کر رہے ہیں، جن کا سلسلہ مدینہ سے شروع ہو کر شام کے حدود تک پھیلا ہوا ہے، مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ بتدریج مخالفت کی یہ آگ بڑھتے بڑھتے اس وقت کی سب سے بڑی مشرقی طاقت

(ایران) اور سب سے بڑی مغربی قوت (روم) دونوں طاقتوں کو مدینہ کی بربادی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

رومیوں کے گھوڑے مدینہ سے تھوڑی دُور کے فاصلہ پر غسانیوں کی حدود پر ہنہنا رہے ہیں اور کسریٰ کے چپراسی وارنٹ لیے مدینہ پہنچ کر دھمکا رہے ہیں کہ مدینہ کے کسانوں کے سردار کو دربارِ شاہی میں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے " یہ ایران کے شہنشاہ کا فرمان ہے جو یمن کے گورنر باذان کے توسط سے مدینہ تک پہنچا ہے۔

یہ اس وقت کا سماں ہے، جس وقت مدینہ میں " دماغ " کے تجربہ کے لیے نسلِ انسانی کو دعوت دی جاتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے۔

قیدار کی ساری حشمت جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا کہ ایک سال ٹھیک مزدوروں کے ایک سال کے اندر بھُس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے، علو و کبریائی کا جو نشہ ان کے قدم کو چھنے نہیں دیتا تھا پھٹ کر ہوا ہو گیا، جو سب سے بڑا تھا، سب سے چھوٹے کے ہاتھوں قتل ہوا قریش کے ستر سورما مارے گئے اور یُوں قیدار کی حشمت خاک میں مل گئی۔

وہی عرب جو ایک کمان سے تیر بن کر اس کونے کے پتھر پر گرے تھے، جیسا کہ کہا گیا تھا جو اس پر گرتا ہے' چُور چُور ہو جاتا ہے، چُور چُور ہو کر اس طرح بدلے کہ جو دشمن تھے' وہ دوست ہو گئے۔

جن پر تلوار چلائی وہ نہیں، بلکہ جنھوں نے تلوار چلائی اُنھوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا، جنھوں نے بازاروں میں پھیلایا تھا کہ جو کچھ پھیلایا گیا تلوار کے زور سے پھیلایا گیا، مکہ میں جن سے چھینا گیا تھا، سب کچھ چھینا گیا، پانی چھینا گیا، کھانا چھینا گیا، گھر چھینا گیا، دَر چھینا گیا، اور آخر میں جینے کا حق بھی چاہا گیا تھا کہ چھینا جائے، اور کتنوں سے چھینا گیا، دہکتی ہوئی آگ، چمکتی ہوئی تلواروں، کھنچے ہوئے کمانوں کے نیچے سے بھاگے ہُوئے، پھر چمکتی ہوئی تلواروں اور کھنچی ہوئی کمانوں' تنے ہوئے نیزوں کے ساتھ فتح کا پھریرا اڑاتے ہُوئے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، لیکن لیتے ہوئے نہیں، دیتے ہوئے، اکڑتے ہوئے نہیں جھکے ہوئے بدلہ چکاتے ہوئے نہیں، حطّہ و عفو کرتے ہوئے:

اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ ۔	شہر کے دروازہ میں سر جھکائے اور حطّہ (یعنی گناہوں اور قصوروں کو جھاڑتے ہوئے معاف کرتے ہوئے) داخل ہونا۔

کی تعمیل کرتے ہوئے، تغفیر کرتے ہوئے، رحم و کرم، صفح و اعراض، مغفرت و درگزر، امن و امان کے پھول برساتے ہُوئے:

الیوم یوم بر و وفاء الیوم انتم الطلقاء۔	آج صلہ رحمی اور وفا کرنے کا دن ہے، آج تم لوگ آزاد کیے گئے۔

کے موتی نچھاور کرتے ہوئے زمین پر انسانوں کے لیے جو پہلا گھر، مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی، صرف خالق کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا، اس میں لا الٰہ الا اللہ الحمد للہ وحدہ نصر عبدہ وحزب الاحزاب وحدہٗ کہتے ہوئے سربسجود

ہو گئے، ابراہیمؑ کا بیت ایل پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کی گندگی سے پاک ہو گیا، اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی، بت پرست، یہودی، عیسائی، صابئی، عقل پرست سبھی ہیں، ان مختلف اقوام و قبائل کے باہمی انتشار، جنگ و جدال کو ختم کر کے ایک پُر امن آئینی نظامِ سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلا دیا، لیکن واقعہ صرف اسی قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل و عریض سرزمین کا پایۂ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہو گیا تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں وثنیوں (عربی ہندوؤں) یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں سب میں سے امن و امان کی اس جد و جہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے ان کی تعداد کروڑ، لاکھ بلکہ دو ہزار چار ہزار بھی نہیں، اتنی بھی نہیں جتنی "نیو یارک" کی سڑکوں یا "لندن" کی شاہراہوں پر موٹر کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں، یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جو فہرست تیار ہوتی ہے، بلکہ کل لے دے کر سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے، یہ ہے "خونی پیغمبر" کا بہایا ہوا خون یا قصابوں کی وہ دکان جس کے شور سے گنبد گرداں بھی تھرا اٹھا ہے، غیر تو غیر اپنے بھی پریشان ہیں۔

اُف! پراگندہ یاد آنکھوں سے بد اندیشوں کو صرف وہیں خون نظر آیا جہاں سے انسانیت کی مُردہ لاش میں زندگی کا خون دوڑایا گیا، جہاں موت ہے، مُردوں کو، دل کے مُردوں کو وہاں زندگی نظر آ رہی ہے اور جہاں سے صرف زندگی ہی بٹ رہی ہے انصاف کرنے والوں نے کیسا انصاف کیا، جب موت کی وادی کے نام سے انھوں نے دنیا میں اس کا پروپیگنڈا کیا، ایک ہزار اٹھارہ تعداد تو اس وقت ہے جب اس میں بلاوجہ بنی قریظہ کے ان یہودیوں کو بھی شریک کر لیا جائے، جن کو خود ان کی کتاب اور ان کی شریعت نے ان ہی کی مرضی سے اپنے ہی قانون کی رُو سے اس وقت ناپید کیا، جب سمجھا گیا کہ اس چھوٹی سی جماعت کی زندگی سے سارے عرب بلکہ ممکن ہے کہ عرب کے اطراف کی بڑی جماعت کی موت پیدا ہو گی، آخر جب کروڑوں مقتولوں والی عالمگیر جنگ کی آگ یہودی پھونک کی سلگائی ہوئی مانی جاتی ہے، تو اگر ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ سمجھا گیا تو کیا غلط سمجھا گیا اور صرف یہی نہیں، اسی ایک ہزار اٹھارہ میں بیچارے ان شہید معلّموں کو بھی شمار کر لیا گیا ہے، جن کو نجد والے اپنے ملک میں وعظ و تلقین، تعلیم و تذکیر کے لیے لے گئے، اور معونہ نامی کنوئیں پر ستر آدمیوں کو شہید کر دیا گیا ان ہی میں وہ دس مبلّغ بھی ہیں جنھیں بے دردی کے ساتھ بلاوجہ رجیع کے مقام پر ذبح کر دیا گیا، یہ تو مسلمانوں کی طرف سے شہید ہوئے، اسی طرح فریقِ ثانی کے ان مقتولوں کو بھی اسی تعداد میں شریک کر لیا گیا ہے جو بجرم قصاص یا ڈاکہ یا چوری مارے گئے یا گرفتاری کے سلسلہ میں قتل ہوئے، لوگ سوچتے نہیں، ورنہ دس سال کی اس طویل مدت میں اگر جنگ کا اطلاق کسی معرکہ یا مہم پر ہو سکتا ہے، تو وہ "بدر" ہے، جس میں بائیس مسلمانوں اور ستر قریش کے، اسی طرح "اُحد" میں ستر مسلمانوں اور تیس قریشیوں کے آدمی کام آئے بشرطیکہ ہزار پندرہ سو آدمیوں کے مجمع اور ان کی باہمی آویزش کا نام بجائے جھڑپ کے جنگ اور "بیٹل" رکھا جائے۔

بہرحال قریشیوں سے جو کچھ چھیڑ چھاڑ ہوئی، وہ اسی پر ختم ہو گئی نہ "خندق" میں بازارِ قتال گرم ہوا، نہ مکہ میں خونریزی ہوئی اس کے بعد ایک دو معرکے یہودیوں سے ہوئے، جن میں خیبر سب سے اہم ہے، اس میں اٹھارہ مسلمان شہید اور ترانوے یہودی مارے گئے۔ "عیسائیوں" سے "موتہ" میں گھمسان کی جنگ ہوئی، لیکن اس گھمسان میں بھی مسلمانوں کے

کل بارہ شہیدوں کا حال معلوم ہوا، اس کے سوا کچھ ڈاکوؤں کا تعاقب ہے، چوروں کا پیچھا کیا گیا، باغیوں کی سرکوبی کے لیے کوئی دستہ روانہ کیا گیا تھا، جس میں اکثر مواقع میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، بہرحال اگر خالص لڑائی اور جہاد کے شہیدوں اور مقتولوں کا حساب کیا جائے تو ان کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ اس کل دس سال کی مدت کے اندر سارے ملک عرب میں ان شاءاللہ ثابت نہ ہوگی، حالانکہ مقابلہ میں عرب کے وحشی قبائل، طاقتور جمہوریتیں، اور بعض سلاطین بھی تھے لیکن جس کو طائف کے بعد سب کچھ دے دیا گیا تھا، کیوں سوچا جاتا ہے کہ اس کو کیوں کر ملا، اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا، جس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے کلمۂ دعوت و دعویٰ لا الٰہ الا اللہ کی دلیل ہے، آخر ان واقعات میں بھی اسی کو کیوں ڈھونڈا جاتا۔

الغرض یہ ہیں کل دس سال اور وہ سارے جنگ و جدال جن کے خون کا افسانہ ہزارہا بوقلموں رنگوں سے رنگین کر کے دنیا کو سنایا جاتا ہے۔

اب دیکھو کہ جہاں انسان مسجود ملائکہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی، اس کی جان تو بڑی چیز ہے، اس کے کپڑے کا دھاگا بھی رات کی اندھیریوں میں کوئی نکال نہیں سکتا، امن و امان کا دور دورہ ہے عالم پر منطبق کرنے کے لیے انسانی زندگی کے جس آئین و دستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں گاڑا گیا تھا اس کے پیچھے چلے آتے ہیں، بے تابانہ چلے آتے ہیں، آدم کے بچے ہر چہار طرف سے چلے آتے ہیں، فوج در فوج چلے آتے ہیں، وفود کا تانتا بندھ جاتا ہے۔

پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قایم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے۔ وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا کھرا گدا ہے، نہ حاجب ہیں نہ دربان ہیں، امیر بھی آتے ہیں اور غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے عجب دربار سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں، مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتا تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔

صوفی کہتے ہیں، خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تحنث (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے گا، بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس کو جو کہہ دیا جاتا ہے پورا ہوتا ہے۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لیے کہ وہ سب کے لیے آیا تھا۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔

یہ تو عرب کے لیے ہوا، عرب ہی کے اندر دیکھو کہ عرب کے باہر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دس سال کے عرصے میں مشرق کی سب سے بڑی قوت "پرشین ایمپائر" اور مغرب کی سب سے بڑی طاقت "رومن امپائر" کے ساتھ

اطراف و جوانب کے سلاطین کو بھی چونکا دیا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے جاگ جاؤ، جو جاگا اس نے پایا، جو سویا اس نے کھویا، کسریٰ نے خط پھاڑا، اس کا ملک پھاڑ دیا گیا، "قیصر" بھی پھاڑ دیتا، اور خدا کرتا کہ وہ پھاڑ دیتا تو وہ بھی پھٹ جاتا، لیکن معاملہ کو ملتوی کر کے اس نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی موت کو ملتوی کرالیا۔ اور اتنا ملتوی کیا کہ گویا وہ فوج آج تک واپس نہیں ہوئی۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپس ہوگی۔ جیسے رومیوں کی طرف روانہ کر کے دماغ کے ان عجیب و غریب تجربات دینے والا پاک وجود پھر "دل" کے حالات میں مستغرق ہو کر اس بستر پر لیٹ گیا جس پر لیٹنے کے بعد پھر اُٹھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، اللھم صل علیہ وسلم۔

دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب پڑوسی سے قرض کر کے آیا تھا، اور جو چادر اس وقت مرض واپسیں کے مریض پر پڑی ہوئی تھی، جب بعد کو دیکھا گیا تو صرف پھٹا ہوا ایک ایک سیاہ کمبل تھا، جس کے اُوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے اس کی زرہ میں صاع جَو پر ایک یہودی ساہوکار کے یہاں گرو تھی۔

جاننے کے بعد نہ ماننے کے لیے جھوٹ کے بلوں میں پناہ پکڑنے والو! سوجھ رہا ہے، دیکھ رہے ہو، جو اس بستر پر لیٹا ہوا ہے، انصاف کے خونیو! کیا یہی تھا کہ وہ فقیر ہے، جس کے متعلق تمہاری گندی زبانوں نے غل مچایا کہ وہ مدینہ کا بادشاہ ہو گیا تھا اور کیا آج ہی اس کا یہ حال ہے، دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے روز دھواں اُٹھتے دیکھا؛ ایسے بادشاہ کس دُنیا میں گزرے ہیں جن کے منہ کو جَو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؛ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینے تک صرف پانی اور خشک چھوہاروں پر زندگی گزاری ہے؛ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؛ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں پیسنے کا گٹھا اور گردن میں پانی بھرنے کے نشان دیکھے گئے؛ ایسی شاہزادی زمین کے کس خطہ میں پائی گئی، جس کو جس کے بچوں کو دو دو تین تین دن بھوک کی شدت میں دن کو رات اور رات کو دن کرنا پڑا ہے؛

بادشاہوں کا قصر کیا اسی کو کہتے ہیں، جن کے کھجوروں کے پتوں کی چھت سے بھی آدمی کا سر لگتا ہو؛

"مدینہ" کے بادشاہ کا شاہی محل تو اس وقت بھی موجود ہے، اس کے طول و عرض کو تو اب بھی ناپ سکتے ہو، باہر میں اس کے کچھ بھی ہو، لیکن اندر تو اس کا وہی ہے، جو پہلے تھا۔

بہر حال دس سال تک "دماغ" کا بھی اسی طرح کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا، جس طرح تیرہ سال تک "دل" کے مشاہدات پیش کیے گئے۔

اور تم دیکھو کہ اسی عرب میں ایک طرف ان کا نشہ اتارا گیا، جن کی بڑائی میں خدا کی کبریائی کی بھی گنجائش نہ تھی، تو دوسری طرف ان ہی میں ایک اور نشہ پیدا ہو گیا کہ خدا کی بڑائی کے سوا ان کے اندر کسی کی بڑائی باقی نہ رہے، یہی وہ گروہ تھا، جو "سینا" کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملائکہ قدوسیوں کی شکل میں نظر آیا، وہی دھونی جس کی

دلیلیں مسلسل خود اپنے اندر سے اس دعوے کا مدعی اعلان سے پہلے چمکا رہا تھا، اسی دعوے کے نسخہ کو ان پر بھی پیش کیا گیا، جنھوں نے جان کر اس کو مانا تھا، یہ نسخہ ان کو پلایا گیا۔

اور کسی جنگل یا پہاڑ کے غاروں میں نہیں، تلوار کی چھاؤں میں اس کی مشق کرائی گئی۔ پلا کر بھی دکھایا جاتا تھا، اور چھڑا کر بھی دکھایا جاتا تھا "بدر" میں جب پی کر اُترے تو اس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے اور "احد" میں جو کچھ ہوا ان ہی کی بدولت ہوا جن سے پینے میں کچھ کوتاہی ہوئی، مگر جب فتح ہوا تو سب اسی نشہ میں سرشار تھے، "حنین" میں جب میدان چھوٹا، تھوڑی دیر کے لیے چھوٹا، تو تم اس کے میدان کے نقشے میں اور اس کی گھاٹیوں، پہاڑیوں میں اس کے اسباب کو کھوجو۔ لیکن میں کیا کروں کہ قرآن نے اس نشہ کی کمی کا ان میں نشان دیا ہے جس کا ان کو تجربہ کرایا جا رہا تھا۔

تم کہتے ہو کہ وہ ان تیر اندازوں سے بھاگے جو اندر نہیں بلکہ باہر گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے، اور قرآن کہتا ہے، کہ وہ "مجاریٹی" اور اکثریت کے اس اعتماد سے بھاگے جو ان کے اندر چھپا ہوا تھا۔

یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلن تغن عنکم شیئا۔	اور حنین کے دن جب اپنی کثرتِ تعداد نے تم کو مغرور کر دیا۔ لیکن یہ کثرتِ تعداد تم کو فائدہ نہ پہنچا سکی۔

کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے!

اگر یہ مقصود نہ تھا تو جس کو طائف سے واپسی کے بعد سب کچھ مل چکا تھا، اس کو اس "لاؤ" اور اس "لشکر" کی کیا ضرورت تھی، یوں بھی تو اس کا داہنا ہاتھ عجیب وغریب کمالات دکھاتا تھا، یہ غرض نہ ہوتی تو کیا صرف اسی سے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا، اور جب جی چاہا تو کیا خاک کی مٹھی سے اسی نے وہی کام نہیں لیا جو "ہوٹزرز" کے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔

اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ خون بہاتا تھا، جس کا خون بہایا گیا، جس کی داڑھی خون سے دھوئی گئی، جس کے دانت توڑے گئے، جس کی پیشانی میں "زرہ" کی کڑیاں چھپائی گئیں، نابینا ؤ! اسی پر الزام دھرتے ہو کہ اس نے خون بہایا۔

چورو! کوتوال ہی کو اُلٹے ڈانٹتے ہو، بکف چراغ ہو کر ڈانٹتے ہو، حالانکہ تریسٹھ سال کی طویل مدت عمر میں کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ خونیوں میں پلنے والے اس انسان نے خون تو کیا کسی کا بال بھی توڑا تھا۔

اُف! اگر وہ خون بہانا چاہتا تو پھر ہزاروں کے خون کو صرف ایک کے خون سے کیوں بچاتا، قطرہ بہا کر سمندر کو کیوں باندھتا، یہی یہودی جن کا خون ہر زمانہ اور ہر ملک میں تقریباً ہر صدی میں ارزاں رہا ہے اور اب تک ہے، جب خون کے مستحق ہو چکے تھے، اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے، لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور رافع بن حقیق، دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا، بہت بڑا خیر وہ شر ہے، جس کے ذریعہ سے کسی عظیم وجلیل شر کا سدِباب ہوتا ہو، قصاص میں زندگی ہے، آخر اس قانون میں اور کیا ہے، بلاشبہ ان دو توں کی موت میں ان تمام

یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی، جو ان کے بعد زندہ رہے، پھلے پھولے، ورنہ جو منصوبے ان دونوں نے پکائے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عرب سے یہودیوں کا اسی وقت نام و نشان جاتا رہتا، جیساکہ ہمیشہ اسی قسم کے بدباطن یہودیوں نے اپنی قوم پر ہر ملک میں ہر زمانہ میں زندگی تلخ کی ہے۔ جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ بنی قریظہ کی چھوٹی جماعت اگرچہ ان ہی کی شریعت ان ہی کے حکم سے مٹائی گئی، لیکن اسی کے ساتھ کیا اس چھوٹی جماعت کی موت میں عرب کے سارے یہودیوں کی زندگی مستور نہ تھی، سنگ دل اور ظالم ہے وہ جراح جس نے ایک انگلی کے لیے پورے جسم کو سڑنے دیا۔

آخر میں ان تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے کہ یہی دس سال کا زمانہ ہے، اس کے بھی چند سال گزر چکے ہیں، اور اب وہی جو عرب کے لیے بھی تھا، عجم کے لیے بھی تھا، مردوں کے لیے بھی تھا اور عورتوں کے لیے بھی تھا، زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں کی یہ آخری جماعت پیدا کی گئی ہے، سارے جہان کی عورتوں کے لیے قیامت تک نسلِ انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں ان سب کے لیے ان کی تعلیم کے لیے تربیت کے لیے ان کے نمونہ کے لیے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے، شاید قدرت کی طرف سے تھا اور اس کی کون سی بات قدرتی نہ تھی کہ جہاں سے دنیا کے اس عالمگیر نقشے، اور حیاتِ انسانی کے کامل دستور العمل کا جھنڈا اٹھایا جاتا ہے، وہ نہ "لندن" ہے نہ "پیرس" حتیٰ کہ "بمبئی" بھی نہیں اور "کلکتہ" بھی نہیں بلکہ سوچو تو بیابان کی اس کوردہ آبادی کی تمدنی و عمرانی لحاظ سے وہ حیثیت بھی نہیں جو ہندوستان کے معمولی اضلاعی شہروں اور قصبوں کی ہے، لیکن دنیا کے اسی دور افتادہ، ویران، ریگستان، نخلستان میں حیرت ہے کہ سارے جہان کے "مذاہب و ادیان" اس لیے اس کے آگے پیش ہو جاتے ہیں کہ تردید و تکذیب نہیں بلکہ سب کی تصدیق، سب کی تصحیح، سب کی تکمیل عملی شکل میں ممکن ہو کر وہ "مکذب" نہیں بلکہ "مصدق" تھا اور یہی اس کے دعویٰ کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔

ہندو مذہب تو "وثنیت" کی شکل میں "مکہ" ہی میں موجود تھا۔ "مدینہ" آنے کے بعد اس کے آگے دنیا کا دوسرا عالمگیر مذہب "یہودیت" بھی سامنے آگیا اس کے ساتھ خود "مدینہ" میں اطرافِ "مدینہ" میں وہ "نصرانیت" بھی موجود تھی جس کے زیرِ اثر دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس وقت بھی تھا، اور اس وقت بھی ہے، اس کے حلقہ میں "مجوسی" اور ایران کے آتش پرست زردشتی بھی شریک تھے، اور ارد گرد میں ایک فرقہ "صابئوں" کا بھی تھا، جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب کے ان "صابئوں" کا تعلق "بودھ مذہب" کے "سادھوؤں" سے تھا، یا ان کے سوا کوئی اور فرقہ تھا جسے دنیا اب نہیں جانتی ہے۔

الغرض کوہستان کی اس چھوٹی سی بستی میں یہودیت، عیسائیت، ہندویت یا وثنیت، مجوسیت، اور اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ بودھیت اپنے ان تمام مفاسد کے ساتھ موجود تھی، جن کے دھونے اور جن سے پاک کرنے کے لیے وہ اٹھایا گیا تھا، پس اس نے ان سب کو دھویا، ان سب کو پاک کیا، صاف کیا، جس میں جو کمی تھی سب کو پورا کیا اور قیامت تک کے لیے پورا کیا۔

اور جس طرح دنیا کے ہر مذہب کے مردوں میں قدرت نے اس کو کچھ لوگ دیئے، دیکھو کہ قریب قریب کچھ اسی طرح سے زندگی کے آخری دنوں میں تقریباً دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کی عورتوں میں سے ایک ایک نمائندہ اس کی خدمت میں قدرت ہی کی جانب سے حاضر کی جاتی ہے، عورتیں اس کی خدمت میں اگر عورتوں کی حیثیت سے آتیں تو کیا وجہ تھی کہ جب مکہ میں ہر قسم کی یہی عورتیں اس کے آگے پیش کی گئیں تو اس بزرگ خاتون کے مقابلہ میں جو عمر میں ان سے پندرہ سال بڑی تھیں، پچاس سال کی عمر تک کسی کو پسند نہیں کیا، پچیس سال کی جوانی سے پچاس سال کی عمر تک تم میں کون نہیں جانتا کہ بجز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آپ نے کسی سے نکاح نہیں فرمایا، جو نکاح کے وقت چالیس سال کی ہو چکی تھیں اور اس سے پیشتر ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا' جو عورت کو عورت کی حیثیت سے اپنے گھر میں لاتا ہے، کیا چالیس سال کی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی پوری زندگی گزار سکتا ہے۔

ہاں! جب سب کچھ ہو چکا "دل" کا بھی تجربہ ختم ہو چکا "دماغ" کے تجربات بھی دنیا کے سامنے آچکے قتل وخون، فتنہ و فساد کا متلاطم سمندر ملک عرب، امن وامان، راحت و آسائش کی چھاؤں کے نیچے زندگی کی قیمت حاصل کرنے لگا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ عرب کا اکثر حصہ ہمیشہ سے کسی غیر عرب کا محکوم نہ تھا، لیکن باہم ان میں بڑوں نے چھوٹوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور پھر سب مل کر وہمی مخلوقات کی غلامی کی رسیوں میں گھسیٹے جا رہے تھے، اس غلامی سے ان کو حقیقی آزادی میسر آئی' انسانیت اپنے فطری مقام سے ہٹ کر موچ کھائی ہوئی ہڈی کے مانند بے چین تھی، بے کل تھی، پھر اس کو اپنا وہ اصلی مقام نصیب ہوا جس پر پہنچے بغیر قلوب انسانی مطمئن نہیں ہو سکتے ایسی صورت میں پھر یہ کیسا بد اندیشہ اور خبیث خیال ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے ایک پورے طبقہ، نصف حصہ کو محروم رکھا جاتا، یہ سچ ہے کہ ان کا، ان بے زبانوں کا کسی نے خیال نہیں کیا، رحم کی نگاہ کسی کی ان پر نہیں پڑی، لیکن کیا کہتے ہو، کہ "رحمۃ للعالمین" کی نظرِ کرم سے بھی یہ بے چاریاں محروم رہتیں، جس طرح اب تک تھیں، ایسا نہیں ہو سکتا تھا' جو سب کے لیے تھا' وہ سب ہی کے لیے ہوا، اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا، اس نے بے سمجھ، خام فہم، ناتجربہ کار عورتوں کا انتخاب نہیں کیا کہ ان کو دوسروں کے لیے نمونہ بنانا تھا' اور دیکھو! وقت بھی کم ہے، فرصت تنگ ہو رہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ چن چن کر مختلف طبائع اور مزاج، مختلف مذاہب اور ادیان کی سن رسیدہ، فہمیدہ و سنجیدہ بیوہ عورتیں جو زندگی کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ، پاک منتخب جماعت کو مختلف اسباب و وجوہ کے پردہ میں قدرت نے اس کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا' جب اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا، اس کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ تھا' کھل چکا تھا، کہ فتح ہوتا ہے' خدا کی زمین کا "مرکز" جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوتا ہے، جس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ "غیب" اور اس کے "آیاتِ کبریٰ" جس وقت کھولے گئے تھے، آخر میں بانی "کعبہ" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیکھنا اسی کی دلیل تھی کہ کعبہ کی تطہیر اس کا آخری کام ہوگا "مرکز" اور "ام القریٰ" پر قبضہ دلانا اصل کام تھا، اس کے بعد مفصلات اور "ام القریٰ" کے "قریٰ" جو کعبہ کے چاروں طرف زمین کے آخری حدود تک پھیلے ہوئے ہیں، ان کا کام آنے والوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور اسی غیبی مکاشفہ میں نہیں، بلکہ مسلسل ایسے مکاشفے مختلف پیرایوں میں ہو رہے تھے، جن کا مطلب یہی تھا کہ کام ختم ہو رہا ہے، پس اس کام کو کامل و پرختم کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ چند

عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اسی کو اپنے سر لینا پڑا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورتیں خدمت مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی، لیکن "دماغ" کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا۔

ہیکل کی خدمت کے لیے عمران کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی، پھر دیکھو! اس ایک کنواری کے آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، بطریقوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ خدانخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دی جاتی جو باہر میں مردوں کو حاصل تھی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد کو آدم رو ابلیسوں کے لیے قرب و نزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ نہیں موجود ہے، اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے فتنے برپا کیے، خدانخواستہ اگر "نیم بیضہ" بھی میسر ہو جاتا تو پھر سیخ میں کتنے ہزار مرغ کھنچے جاتے، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟

الغرض ان عورتوں کو "بیوی" کا مقام عطا کیا اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ اس نے پیش کیا، جس کا "دماغ" عالمگیر حکومت، عالمگیر سیاست، ہمہ گیر تعلیم و تربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں کے سلجھانے میں اسی وقت مصروف تھا، جس وقت "عائلی" اور "خانگی" زندگی کی ژولیدگیوں کو بھی بکشادہ پیشانی حل کر رہا تھا، اور اس آسانی کے ساتھ حل کر رہا تھا کہ خواہ اس کی مدت کتنی ہی کم ہو، لیکن بداندیشوں یا وہ خیالوں کو دور سے زندگی ایسی سلجھی ہوئی خوشگوار لذیذ نظر آئی کہ بدبختوں نے اپنے اندر برے خیالات پکائے، گویا سچ مچ اس خیر میں کوئی شر نہیں، اور اس راحت میں کوئی زحمت نہیں تھی، ایک بیوی کے تعلقات کی شیرینی کو مسلسل تلخیوں سے بدلنے والے کیا یہ سوچ سکتے ہیں؟ البتہ اس کا اندازہ وہ ضرور کر سکتے ہیں کہ چند بیویوں سے تعلقات کو خوشگوار رکھنا فطرت انسانی کا اعجاز نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بلاشبہ یہی ایک "عائلی" تجربہ بھی ان بد دماغوں اور بدعقلوں کے لیے کافی ہے، جو جاننے کے بعد ماننے سے اس لیے ہچکچاتے تھے کہ "دل" میں تو نہیں لیکن "عقل" اور "دماغ" کے نظم میں ان کو بدنظمی کا اندیشہ ہوا، جس کی زندگی کا ہر شعبہ شخصی، عائلی، خاندانی، قومی، سیاسی، صرف ضبط اور نظم ہے، اس کے متعلق یہ وسوسہ خود سوچنے والوں کی کیا عقلی بدنظمی کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ یہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے اس قلیل حصہ کا کوئی دقیقہ، کوئی نکتہ ایسا نہ تھا جو نگاہ سے اوجھل ہو دیکھ چکے کہ دنیا کی عورتوں کے لیے جو نمونہ بنائی گئیں، ان میں سے سب کی سب سن رسیدہ تجربہ کار بیوہ عورتیں ہیں، جیسا کہ مردوں کے لیے جو جماعت نمونہ بنائی گئی ان میں بھی زیادہ تر تجربہ کار، سرد و گرم چشیدہ لوگ تھے، ایک ایک ان میں ایسا تھا جو ملکوں پر بھاری، قوموں پر گراں ثابت ہوا۔

لیکن دقیقہ سنجیوں، نکتہ نوازیوں کے اس سلسلہ میں انتہا اس وقت ہوتی ہے، جبکہ ایک طرف اگر مردوں کے نمونہ میں ایک ایسا نمونہ ہے، جس کا "دل" جس کا "دماغ" جس کا "ظاہر" جس کا "باطن" ہر قسم کے اجنبی اثرات سے

قطعاً آزاد ہے، اسی صحبت میں اس نے آنکھیں کھولیں، ان ہی کی گود میں اس نے ہوش سنبھالا۔ آخر وقت تک وہ اسی حال میں رہا۔
پھر جس طرح مردوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکل میں ایسا نمونہ دیا گیا جو دو سال کی عمر سے اس وقت خدمتِ مبارک سے علٰحدہ ہوئے جب لوگوں نے مرقدِ انور سے ان کو نکلتے دیکھا، کیا ظلم نہ ہوتا اگر بے زبان عورتوں کو اس بے نظیر، ناگزیر نمونہ سے محروم رکھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ بلکہ بعض بوڑھی عورتوں کے اسی مجمع میں، ایک وہ طاہرہ طیبہ، صدیقہ، کنواری بیوی صاحبہ بھی ہیں جن کو آپ نے اپنے زیرِ اثر سات ہی سال کی عمر سے لے لیا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا "دل" ان کا "دماغ" کسی غیر نبوی اثرات کو غیر شعوری طور پر جذب کرے، نویں سال کی عمر میں اپنی رفاقت میں لے لیا، عموماً سفر و حضر میں ساتھ رکھا، پھر دیکھو کہ جس طرح مردوں کے اس "مظہرِ عجائب و غرائب" وجود سے دنیا کو اگر وہ سب کچھ ملا جو کسی دوسرے سے نہیں ملا تو کیا ٹھیک اسی طرح اس عجیب و غریب ذہن و ذکا کا فضل و کمال، تقویٰ و عفت کے سرچشمہ سے دنیا کو جو دولت تقسیم ہوئی صرف عورتوں ہی میں نہیں کہ وہ تو ان کا گروہ ہی تھا، غالباً مردوں کو بھی کسی دوسرے سے اتنا نہیں ملا؟
محدثین سے پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں؟
الغرض ہر قسم کے شکوک و شبہات، وساوس و اوہام کی تاریکیوں، ادنیٰ سے ادنیٰ تاریکیوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا دعوے کا وہ آفتاب جس کی صبح کا سپیدہ حرا کے دامن سے پھوٹا تھا "مکہ" کے افق سے چڑھتا ہوا تئیس سال کی مدت میں مدینہ کے سمت الراس پر پہنچ کر انتہائی کمال و جمال کے ساتھ دیکھو کس شان، کس آن کے ساتھ چمک رہا ہے، آفتاب! دعویٰ کا یہ عجیب و غریب آفتاب جس کے طلوع سے پہلے بھی روشنی تھی، اور جس کے ساتھ بھی روشنی ہے، جس کے باہر بھی روشنی ہے، جس کے اندر بھی روشنی ہے۔ وہ خود بھی نور ہے، جس سے نکلا وہ بھی نور ہے، "نُوْرٌ عَلٰی نُوْر" کا یہی نورانی نظارہ جس کو دنیا کی آنکھوں کے نور نے کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اب ہمیشہ دیکھتی رہے گی، سب کو دکھایا جائے گا، سب دیکھ رہے ہیں، "ظاہر" کے "باطن" کے "دل" کے "دماغ" کے تجربات بینہ کی شعاعوں سے "آسمانی علم" اور "لاہوتی عرفان" کا یہ آفتاب دمک رہا ہے، چمک رہا ہے، بلکہ سچ پوچھو! تو جھمک رہا ہے، لہک رہا ہے، چھلک رہا ہے۔
عرب کا وسیع صحرا اس کے لیے تنگ ہے، وہ بڑھنا چاہتا ہے طوفان کی طرح بڑھنا چاہتا ہے، آندھی کی طرح بڑھنا چاہتا ہے، اور دیکھو کہ وہ بڑھ گیا، چڑھ گیا، ساری دنیا پر پھیل گیا اور اب تک اسی آب و تاب، جاہ و جلال کے ساتھ کائنات، ساری کائنات کے افق پر اسی طرح چمک رہا ہے، جس طرح وہ اس وقت چمک رہا تھا، جب وہ عرب سے نکلا تھا، یقین و قطعیت کی تیز اور ٹھنڈی روشنی میں اس کو آج والے بھی اسی طرح پا رہے ہیں، جس طرح کل والوں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا، جس وقت وہ ان کو، ان کی ایک بڑی جماعت کو اپنی زندگی کے عمیق سے عمیق، باریک سے باریک پہلوؤں کا کھلے بندوں علانیہ تجربہ کرا رہا تھا۔
گلیلی جھیل کے چند ماہی گیر یا مگدھ دیش کے گداگر بھکشو نہیں بلکہ ہزارہا انسان ایسے انسان جن پر اس عہد کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی تھیں ان میں بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ ان میں کمانڈر بھی تھے، اور دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر ان میں دماغ والے بھی تھے، سب سے زیادہ بیدار دماغ والے، ان میں دل والے بھی تھے، سب سے زیادہ

روشن دل والے، الغرض انسانیت کی جتنی اونچی سی منزلیں سوچی جا سکتی ہیں۔

تجربہ کاروں کی یہ جماعت ان کی آخری بلندیوں پر ساری دُنیا کے آگے مضبوطی کے ساتھ قدم جما کر اس کا ثبوت پیش کر رہی تھی کہ اس وقت کی دنیا میں ان سے اُونچا کوئی نہیں ہے کہیں نہیں ہے۔

نبوت! اور کیسی عجیب نبوت! تجربہ! اور کیسا عجیب تجربہ! کتنا روشن تجربہ، کتنا نکھرا ہوا صاف تجربہ، ہر قسم کی آلائشوں اور کدورتوں سے پاک وصاف تجربہ، کتنی عظیم دانائیوں کا پرکھا ہوا تجربہ، کتنی نازک ذہانتوں کا جانچا ہوا تجربہ، کتنی روشن فطرتوں کا ناپا ہوا تجربہ، کتنی بے رعب، بے جھجک طبیعتوں کا بے لاگ تجربہ، کتنے متوازن معتدل دماغوں کا نپا تلا تجربہ، چند نہیں فوج در فوج، نسل آدم کی غٹ کی غٹ، جوق در جوق افراد کا تجربہ، اتنے افراد کا تجربہ کہ دنیا کے کسی مسئلہ یا حقیقت کے لیے نہ آج تک انسانوں کی اتنی بڑی جماعت اکٹھی ہُوئی، اور نہ شاید آئندہ ہو سکتی ہے۔

تجربات و مشاہدات کا یہی حیرت انگیز ذخیرہ تھا جس کی حفاظت و نگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں یا کسی مدرسہ کے معلموں یا کسی انجمن کے ممبروں یا کانفرنس کے دفتریوں یا کسی افسانہ نگار مورخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ زمین پر رُوئے زمین پر اس زمانہ کی جو سب سے بڑی قاہرہ سلطنت تھی اس نے اپنا پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت و تبلیغ قرار دیا؛ اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا، درمیان کے جتنے مقدمات تھے وہ صرف اسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے، دنیا کی اس سب سے بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشر و اشاعت کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا۔

طاقت کی ان آہنی زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سرپرستی میں اس کی تاریخ کا آغاز ہوا، اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح ایک حکومت دُوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی حالانکہ زمانہ کی اس طویل و دراز مدت میں زمین کے مختلف علاقوں میں باہم ان سلطنتوں کے دُوسرے اغراض و مقاصد میں خواہ جس قدر بھی اختلاف رہا ہو، لیکن اس "آسمانی ودیعت" ان درخشاں تجربات، "بینہ" ان "عینی مشاہدات" کی غور و پرداخت، تبلیغ و حفاظت میں، سب کے نقاط و ارادے قطعی طور پر متحد تھے، بلکہ ہر حکومت نے کوشش کی کہ سعادت کے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ حصہ اس کو مل سکے اس کے حصول میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے، اس کے لیے مدارس کھولے گئے، خانقاہوں کا جال بچھایا گیا، مجلسیں ترتیب دی گئیں، حلقے قایم ہُوئے، تصنیف و تالیف کا باب کھولا گیا اور بڑے بڑے عظیم پیمانوں پر کھولا گیا، ایسے پیمانوں پر کھولا گیا کہ شاید دنیا کے کسی ایک فن، ایک علم کے متعلق نہ کبھی دنیا میں اتنے بڑے بڑے عظیم الشان مدرسے کھلے نہ تصنیفی کوششوں کا اتنا عظیم حصہ انسانی تاریخ میں کسی ایک علم یا فن کو ملا، جتنا کہ اس عجیب و غریب نبوت کے تجربات و مشاہدات کو ملا، اور یوں ہی مسلسل بغیر کسی انقطاع اور کسی وقفہ کے ایک قرن سے دُوسرے قرن تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک نبوت کا یہ لازوال ابدی، سرمدی، قیم خزانہ منتقل ہوتا رہا، اور اس وقت تک ہو رہا ہے، ہوتا چلا جائے گا، صرف یہی نہیں بلکہ ہر پچھلے طبقہ میں تم دیکھو گے کہ نبوت کے اس تجربہ کی گواہی ادا کرنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا، اور کیسا اضافہ؟ ایک اور دو کی نسبت نہیں، ایک اور تین کی نسبت نہیں، دُگنے اور تگنے کی حد تک کا اضافہ نہیں؛ بلکہ بلا مبالغہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا، اور بڑھ رہا ہے، بڑھتا رہے گا، تا اینکہ ساری نسلِ انسانی

اسس کی گواہ بن جائے۔

اور اسی تدریجی اضافہ کی نسبتوں کے ساتھ سلطنتوں کے پُر جلال پُرشوکت جلو، بادشاہوں کے شاہانہ اور کڑے پہرے، علما، کی سخت ترین ماہرانہ چوکسی، فقر صوفیہ کی باوقار پُرعظمت نگرانی اور اُمتِ مرحومہ اسلامیہ کی فطری بیدار دماغی، طبعی ذکاوتِ حسی کے حصار میں صدیوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے، اور کہنا چاہیے، اس کے سوا جو کچھ کہا جائے گا، جھوٹ ہو گا کہ ایک لمحہ، ایک پل کے ادنیٰ ترین حصہ کے انقطاع کے بغیر ٹھیک اسی آن بان، اسی سج دھج کے ساتھ اُمت کے ان افراد کو ملتا رہا۔ اس وقت تک مل رہا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وُہ اپنے رسول کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہ ان کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سیکنڈ کے لیے ان سے اوجھل ہوا اور نہ وُہ اپنے رسولؐ سے غائب ہوئے سعادتِ صحبت سے بہرہ مند اگر کہہ سکتے تھے اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ وُہ اپنی نمازوں میں وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسولؐ پڑھتا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)، وہ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جُھکتے ہیں جس طرح وُہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وہ پیشانی رکھتا تھا، تو قسم ہے اسس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جن کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، ہر قرن، ہر صدی بلکہ اس وقت بھی جہاں کہیں ہیں قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی وُہی پڑھتے ہیں جو ان کا رسولؐ پڑھتا تھا، اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وُہ رکھتا تھا۔ سبھوں نے تو خدا کی تصویر کھینچی، لیکن ایسا کون ہے، جس کی بندگی کی تشکیل اس طرح کی گئی، "ہو بہو" "من وعن" جیسا کہ وُہ تھا وُہ متشکل کیا گیا، کیا جا رہا ہے اور کامل یقین کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اسس کے ساتھ قطعاً وہ واقعات پیش نہیں آئے، ہاں! جس طرح پہلوں کی کتاب چھینی گئی ان کو ان کے رسولوں اوتاروں سے جُدا کیا گیا، کیا کوئی دکھا سکتا ہے، ان کے ساتھ بھی سال دو سال کے لیے نہیں روز دو روز، گھنٹے دو گھنٹے، سیکنڈ دو سیکنڈ کے لیے کبھی (لا فعلہ اللہ) ایسا واقعہ پیش آیا، اور جس نے دنیا کے کسی گوشہ میں کبھی ایسا ارادہ کیا، کیا مسلسل نہیں دیکھا گیا کہ جس نے چھیننا چاہا، وہی چھینا گیا، جس نے جُدا کرنے کا خیال پکایا، وہی جُدا کیا گیا، یہی ہوتا رہے گا، جس پر یہ گریں گے وُہ بھی ٹوٹے گا، اور جو ان پر گرے گا وہ چکنا چُور ہو گا، پھٹے ہوئے نہیں بلکہ تاریخ کے کھلے ہُوئے مسلسل اوراق میں یہی لکھا ہوا ہے یہی لکھا جائے گا۔ بہرحال یہ سلسلہ یُوں ہی جاری رہا، تا ایں کہ بالآخر تاریخ کے اس عجوبہ طراز عہد میں نسلِ انسانی داخل ہو گئی، جس میں ہر بعید قریب، ہر دور نزدیک بلکہ شاید ہر غائب حاضر ہو گیا، مکانی فاصلے حذف ہو گئے اور وہی دنیا جو کبھی متعدد دنیا سمجھی جاتی تھی، ایک دنیا بلکہ اگر کہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک بستی ہو گئی، زمانی مسافتیں کم ہو گئیں بلکہ شاید زمانہ کے تین قسموں اور تین حصوں میں سے ایک حصہ ماضی کا تقریباً قابلِ ذکر نہیں رہا کہ اب جو گزرتا ہے، وہ نہیں گزرتا ہے، اور جو غائب ہوتا ہے، حاضر ہی رہتا ہے، وہی نہیں جنھیں دنیا میں کچھ اہمیت حاصل ہے بلکہ دنیا کی اونیٰ ادنیٰ پیداوار جو کبھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جاتی تھی وہ بھی اب انمٹ ہو گئی قدرت نے اپنی پوشیدہ طاقتوں کا خزانہ، پریس، تار، برق، لاسلکی فون وغیرہ کی شکلوں میں فیاضی کے ساتھ وقفِ عام فرما دیا ہے، آخر آج کون گن سکتا ہے، ان ذرائع اور وسائل کو جن کے ذریعہ سے دنیا کے حوادثات و واقعات، تحریریں، تقریریں محفوظ ہو رہی ہیں، بزن و بازار میں آج یہ چیزیں ماری ماری پھرتی ہیں اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو میسر ہیں، آج کوئی "امانت کی اندر سبھا" اور "شرر" کے ناول کو

مٹا نہیں سکتا پھر یہ اندیشہ اب کون کرسکتا ہے کہ تجربات کے ان ذخیروں کو اب دُنیا کا کوئی حادثہ فنا کر سکتا ہے ؟

ان سازوسامانوں کے بعد کس قدر عجیب ہے ، اگر کہا جائے کہ جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب میں پیدا ہوئے تھے، وہ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے ، اور جس کی ولادت چھٹی صدی ہجری میں ہوئی تھی ، وُہ چھٹی صدی ہی میں ہوئی تھی ۔

اس زمانہ کے جب ہر غائب کو حاضر اور ہر بعید کو قریب سمجھا جاتا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ پھر ان تمام غائبوں میں جو سب سے زیادہ حاضر اور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے ، کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ہے ، ان تمام بعیدوں میں جو سب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ ' خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے ۔

آخر ہم میں کون ہے ، جس کے دماغ میں اپنی پیدائش ، طفولیت ، شباب ، کہولت ، خلوت ، جلوت کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہوں ، جتنی تابناکی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے ، جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا ۔ لیکن جس کے ظہور کی شدت ہر پچھلی صدی میں پہلی سے زیادہ محسوس کی گئی ، کی جا رہی ہے ۔ اور ان شاءاللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشتدادی کیفیت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے ، ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے ۔

اور شاید اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے ، کہ اس کے بعد نبوت کا دعویٰ دور از کار ہے ، اس دعویٰ کا ہر مدعی خالتو ، اور زمین کی پشت کا بالکل غیر ضروری بار ٹھہرایا گیا ، چھٹی صدی عیسوی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا' دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا ۔

اور جن بدبختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہُوک اُٹھتی ہے' یا اٹھوائی جاتی ہے ، تم دیکھو ! خلافِ دستورِ بنی آدم کتنی بدسلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اس کو دُر دُراتے' دھتکارتے رہے ، اُٹھنے کو تو یہ اُٹھ جاتے ہیں ، لیکن چند مغالطی پینتروں کے بعد ہی ان کو خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں کوئی کام نہیں ، بنی آدم کی بستیوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ، پھر یُوں ہی بازاری بے روزگاروں کی طرح بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے بھٹکاتے بہ ہزار حسرت و ناکامی' نامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے مدفون ہو گئے ، تاریخ شاہد ہے کہ بوالہوسیوں کے بھپاروں سے بے چین و مدہوش ہو ہو کر اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا بھی تو قدرت کے اُنھیں ہاتھوں نے جلتی ہوئی گھاس کے خاکستر کے مانند اس کو وہیں بٹھا دیا ، چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے ، حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار پانچ سو سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہو ۔

اگرچہ کھلے کھلے صاف غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادی بھی کر دی گئی تھی ، اور نبوت و رسالت کے سلسلہ میں یہ پہلی منادی تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں کے پاس کوئی نہیں آئے گا ، یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے ، وہی پاش پاش ہو جاتا ہے ، اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے ۔

بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا ، جب بھی آخر دنیا کیا کرتی ۔ آنے والے تو ہمیشہ اسی وقت آتے ہیں ، ان میں

آتے ہیں، جب جانے والا بھی جا چکے، لیکن ایسا آنے والا، جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا، بڑھ رہا ہے، گنجایش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا آئے۔

جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات و کمالات کے ساتھ بھیجا گیا اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطے میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح مشرق میں وہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور اور غریبوں کے کلبھائے ویجور دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے، اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کے لیے برابر ہے، سب کے لیے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے جس میں سب سانس لیتے، اور وسعت کون و مکان کا وہ نور ہے، جس میں سب چلتے ہیں، پنپتے ہیں، پھُولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی، اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے، روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت تک کیا تھا، جواب نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی، لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گرداب سے نجات پا چکی؟

بلاشبہ جنھیں اس کی برکت میسر آئی ہے، ان میں اکثروں کا ان کا جو مرتد یا منافق نہیں ہیں، ان کا بیڑہ خطرہ سے ان شاء اللہ نکل چکا ہے، لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے؟

پھڑ پھڑا رہے ہیں، ہندوستان کے ایک قطعۂ اراضی میں اتنے پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ ان کا شمار صد و ہزار سے نہیں بلکہ کروڑوں سے کیا جاتا ہے، اور یہ تو صرف ہندوستان کا حال ہے، اس ملک سے باہر بھی کیا کام پورا ہو گیا ہے؟

آباد جزیروں کے اس جنگل میں جہاں آفتاب نکلتا ہے اور مشرق کا وہ گنجان خطہ جہاں بنی نوع انسان کی سب سے بڑی آبادی ہے، کیا چین و جاپان کے ان باشندوں کی اپنے مالک سے صلح ہو چکی ہے؟ یقیناً ایک گروہ وہاں بھی ایسا پیدا ہو چکا ہے جس نے مخلوقات کی بندگی کا جُوا گردن سے پھینک کر حقیقی اور سچی زندگی حاصل کی ہے، لیکن کون نہیں جانتا کہ ان ممالک کی اکثریت ابھی اسی طرح اپنے مالک سے رُوٹھی ہوئی ہے، جس طرح اس کے آبا و اجداد رُوٹھے ہوئے تھے۔ غریب مشرق تو پسماندگان کا ملک ہے، لیکن جن کی پیش گامیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جا رہا ہے، کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ سیدھی ہو چکی ہے "باپ بیٹے" کے قدیم افسانے کو تو چھوڑو، لیکن جن خلقتوں کی ایجاد و تخلیق کی انھیں توفیق بخشی گئی، بجائے توفیق بخشنے والے کے خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں؟ یقیناً ان کے قلوب ان جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں، جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوقات کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں، اور آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا، تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، اسٹیم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکاچوند نہیں لگائی ہے، بزرگوں کے کارناموں، سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے

اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا، تو پچھلوں کے لیڈروں، زعیموں اور قائدوں کے کاموں نے ان کے "اسٹیچو" اور فوٹو کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت وفلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو، ہنستے ہو، جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان خالق سے ٹوٹ کر چالیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جکڑا ہوا تھا، مگر کوئی ہوتا جو ان نت نئے دیوتاؤں کی فہرست بتاتا، جن کے ساتھ فرزانہ ودانا یورپ کی روح اس طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے، آخر بتایا جائے ان دونوں نئے اور پرانے طبقوں میں کیا فرق ہے، خالق سے یہ بھی دور وہ بھی دور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چور وہ بھی چور۔ کچھ فرق اگر ہے تو صرف اسی قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے اور نئوں کے معبود بھی نئے ہیں، پرانوں کے پرانے معبودوں میں عجائب وغرائب اور نت نئے فوائد نظر آتے تھے۔ اور نئوں کو نئی مخلوقات میں عجائب وغرائب نت نئے فوائد نظر آرہے ہیں، مظاہر احترام اور تعظیم کے بیرونی قالبوں کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو ناپ لیا جا سکتا ہے۔ اگر قلبی احساسات اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا کہ پرانوں کے دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا، نئوں کے قلوب میں معبودوں کے متعلق وہی کچھ بلکہ شاید کہ اس سے زیادہ ہو۔

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر بپھر جاتے تھے، نئوں کے سامنے جا کر آج خدا کا تنہا کیا بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو، پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے، اور منہ سے کتنے تولے کف کے اڑ اڑ کے بیچارے نام لینے والے کے چہرے پر پڑتے ہیں، تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگوؤں میں، تذکروں میں، کیا نئوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کا نام لیے بغیر کبھی گزرتا ہے، برق کا، بھاپ کا، تار کا، ریل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، فیکٹریوں کا، ملوں کا، بنکوں کا، سرمایوں کا، ان کی مختلف شکلوں، مثلاً انشورنسوں، ریلیوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج دلچسپی کے ساتھ جس ذوق، شوق کے ساتھ لیا جاتا ہے، مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق وشوق کے ساتھ بِسْمِ اللّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہ، لا الٰہ الا اللّٰہ کا ذکر کبھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں تو ان ہی خداؤں کی، نعت بھی لکھتے ہیں تو ان ہی کی، پھر میں کیا غلط سمجھا جب میں نے کہا کہ جو پرانے تھے وہی نئے ہیں، چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس وقوانین کے آگے یہ بھی محو رقص ورامشگری ہیں وہ ان کا بھجن گاتے تھے، یہ ان کا شکر کرتے ہیں۔

اَتَوَاصَوْا بِہٖ بَلْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ۔

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا، جو سب سے اونچا تھا وہ سب سے نیچا اور اسفل سافلین کے درجہ پر پہنچایا گیا۔

بلاشبہ یہی ہوا۔ یہی ہونا بھی چاہیے کہ خالق ایک ہے اور مخلوقات لامحدود ہیں پس جس نے ایک کو چھوڑا، اس کو ہر ایک سے جوڑنا پڑے گا، جو ایک سے نہیں ڈرے گا اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا جو جھکنے ہی کے لیے ہے، اس کو جھکنا ہی پڑے گا۔

لیکن ایک کے آگے جھکا تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں، ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، اِنس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے، اور میں کیا دکھاؤں کہ جو دکھا نہیں جا سکتا، اس کے آگے۔

یہی وہ عذاب ہے، جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا چکھ رہے ہیں، برضا و رغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی، پر انوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا، بلیشک اس کے صلہ میں انھیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا، آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبانوں میں کیوں اقرار کر رہے ہیں، جس نے بندر کو معبود بنایا، کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رُسوا کیا، لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کرکے بندر کے مولود مسعود ہونے پر فخر کیا، کتابیں لکھیں، دلائل قائم کیے، کر رہے ہیں، کیا انسانیت کی خواری میں اُنھوں نے کوئی کمی کی ہے اور صحیح تو یہ ہے جو ہر چیز کی قیمت لگاتے ہوئے یکایک چیخ اُٹھتے ہیں کہ نفسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے، سب انسان کے لیے ہیں، لیکن انسان کسی کے لیے نہیں، کسی مقصد کے لیے نہیں، کیا اس نے انسانیت کو ان عفونتوں اور غلاظتوں سے بدتر نہیں ٹھہرایا، جن سے انسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں، جب اُنھوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کے لیے نہیں ہے، تو کیا اس کے بعد یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کسی کے لیے بھی ہے، "پانی کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہوں؟" "ہوا" کیوں رُک جائے گی، اگر آدمی نہ ہوں؟ آفتاب میں کیا داغ آجائے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ حتّٰی کہ سڑک کے کسی سنگریزہ اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے، اگر کوئی نہ ہو، تمہارے بڑے نہ ہوں، چھوٹے نہ ہوں، کوئی نہ ہو، بے شک سب ان کے لیے ہیں، لیکن مخلوقات کے اس طویل و عریض سلسلہ میں انسان کسی کے لیے نہیں، اب اگر وہ خالق کے لیے ہی نہیں ہے تو اس سے زیادہ عبث و بے نتیجہ فضول و مہمل، بیہودہ ہستی اور کس کی ہو سکتی ہے؟ اس رسوائی سے بڑی رسوائی اس ہتک سے بڑی ہتک اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور یہ ایمان کا حال ہے، عمل کے میدان میں ان جاہلوں کے پاس کیا تھا، جو آج کے عالموں کے پاس نہیں ہے۔

عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا ہے، جاہل شراب پیتے تھے، مردار کھاتے تھے۔ زنا کرتے تھے، سُود خوار تھے، جواری تھے، ایک کا خون دُوسرا پیتا تھا، املاق و افلاس کے اندیشہ سے لڑکوں کو لڑکیوں کو گور میں زندہ دفن کر دیتے تھے، لیکن یہ قصہ کن کا سُنایا جا رہا ہے، کیا عرب کے جاہلوں کا، یا یورپ کے عالموں کا؟ وہاں کیا دکھاتے ہو، جسے یہاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، عرب سے باہر ایران میں ایک طرف "مزدک" زر، زمین، زن کو سب سے چھین کر سب کو دے رہا تھا اور دُوسری طرف "مانی" اور اس کے شاگرد ہاتھوں میں استرے لیے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ بُرائیاں آتی ہیں، ان ہی کا قلع قمع کر دیا جائے وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے، یہی ان کا فلسفہ تھا، لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا، آج یورپ کے ایک حصہ میں پھر وہی "مزدک" زندہ ہو کر "بالشویک" کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے، جو اس نے کیا تھا، اور دُوسری طرف "برتھ کنٹرول" کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا نہیں جا رہا ہے۔

ایک راستوں کو ڈھاتا اور دُوسرا بند کرتا ہے، اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ صحیح ہے کہ ہندوستان میں بُدھ مت کے فلسفہ نفس کشی نے بڑی گندی شکلیں اختیار کی تھیں، "دام مارگی" پیدا ہوئے تھے، "مانگ ودیا دام مارگی" تک پائے جاتے تھے "اگھوری" ہونا آتما کی بڑی پاکی تھی، لیکن آج گندگیوں میں صفائی کے مدعی بن کر جو لت پت ہیں، "اگھوریوں" کو بھی ستے ہو، اگر ان کا حال سنایا جائے بے پردگی و عریانی نے جنسی لذتوں کو جس حد تک بے جان کیا ہے، اس میں جان ڈالنے کے لیے آج مغرب کا "اگھوری" جو کچھ کر رہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کے سامنے مشرق کا اگھوری بھی شرمندہ ہے، الحاصل جو کچھ اس وقت تھا، جہاں تک سوچو گے کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اس کو پاؤ گے، پس آنے والا کیسے جا سکتا تھا، جب تک کہ وہ سب نہ جاتے، جس کے لیے وہ آیا تھا، بلکہ اس کی ضرورت تو اس کے بعد بھی رہے گی کہ یہ تو تخریب ہے، لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے؛ اور یہی میرا مقصد تھا، جب میں نے کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا کہ "یہی وہ آنے والا ہے، جو آنے ہی کے لیے آیا۔" پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے، اس کی ضرورت موجود ہے، ان کو دیکھ کر اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ نہیں گیا، اور جب تک اس کی ضرورت ہے، نہیں جائے گا؛ تھا، ہے، رہے گا، ابد تک رہے گا اور اس کے لیے یہی مقدر ہے،

فَاللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ النَّبِيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَعَلٰى ذُرِّيَّتِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ كَمَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ فِي الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ؏

پس اے اخوانِ عزیز!

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (القرآن)

کوشش کرو اللہ کی طرف بلانے میں کوشش کا پورا حق ادا کرتے ہوئے اسی نے (اے امت اسلامیہ) تم کو چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں فرمائی، یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے اسی نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ رسول تمہارے نگراں رہیں گے اور تم دنیا کے نگراں رہو گے، پھر لوگو! نماز قایم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور زور سے پکڑ لو اللہ کو وہی تمہارا آقا ہے، پھر کتنا اچھا آقا ہے، کتنا اچھا مددگار۔

جب جانے کے لیے آنے والے آتے رہے، اشخاص چُنے جاتے تھے، لیکن جب وُہ آیا جو آنے ہی کے لیے آیا تو اس کے

طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں بلکہ ایک اُمت ہی چُنی گئی، پہلے شخص مبعوث ہوتے تھے، اب ایک اُمت ہی مبعوث ہے۔ یہی اس امت کا "اصل منصب" اور "فرض حقیقی" ہے، جب تک وہ اس "منصب" پر قایم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے اس وقت تک ان کے رسولؐ بھی اس امت کے نگراں رہیں گے، لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے۔ اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے ہو تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا۔

یہ امت مجتبیٰ و مبعوثہ ہر قوم میں ہے، ہر ملک میں ہے، پس جو جہاں ہے وہ وہیں مبعوث ہے، اس کی قوم اسی ملک کے باشندے ہیں، مصیبت کی گھڑی وہی تھی جب اپنی قوم کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکلا، حالانکہ اگر حضرت نوحؑ کے منکر ان کی قوم تھی، حضرت ہودؑ کے کافر ان کی قوم تھی، قریش رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگ تھے تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں، مصریوں کی قوم مصر کے قبط نہیں، یورپ کے عیسائی یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں ہیں، پس جب تک:

حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

نہ ہو تھک کر بیٹھنے کے کیا معنے ہو سکتے ہیں، وثیقہ ہے کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔	اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سارے دین پر وہ غالب ہو۔

اور دیکھو کہ لامذہبیت پر مذہبیت غالب ہے، چند پیشہ ور کتاب سازوں یا سبق فروش معلموں کو جانے دو، جو سادس باقی کی روٹی کھاتے ہیں، عام فطرت انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے، جس طرح ہمیشہ سے تھی آخر اگر مذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے، تو جس یورپ کے متعلق یہ سُنایا جاتا ہے، کیوں نہیں وہاں کے باشندوں نے لامذہب ہونے کا اعلان کیا ہے۔

سچ یہ ہے، کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے اس میں اتنی تنگی یا پستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے، کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر وہ اپنی زندگی گزارے، کہاں سے آیا ہُوں، کہاں جا رہا ہُوں؟ کیوں آیا ہُوں؟ چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جواب نہیں ہیں، کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔

بہرحال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لامذہبوں سے زیادہ، بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے، اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے، کسی کو نہیں ہے۔ پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہُوا کہ لامذہبیت پر مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب، اس لیے سب پر اسلام غالب ہے۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول علیہ السلام کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں،

اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے، تو کیا حال ہوگا جب دنیا کے نگران بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے۔ کچھ نہیں، کوئی کام نہیں، جب تک اصل کام نہ ہوگا، کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی، بہت آرام لے چکے۔ تھکن مٹ چکی، کام بہت باقی ہے، ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے، اور "درا" کی اس "بانگ" پر چل پڑتے: ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے
(اقبال)

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

رسول کی اتباع کرو تاکہ ہدایت یاب ہو

(الأعراف، ۱۵۸)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ترجمہ: نذیر حق

نوٹ : جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مشرق و مغرب کے علوم کے فاضل اور اسلامی علوم کے مسلّمہ عالم تسلیم کیے جاتے ہیں اسلامی تاریخ بالخصوص سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی گہری اور وسیع نظر ہے اور اکثر و بیشتر مصادر و مآخذ ان کے سامنے ہیں، لیکن بایں ہمہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے سلسلے میں چند مشہور اور مقبول عام تاریخوں سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا اندازہ اپنا ہے اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش اور تاریخِ وفات کے ضمن میں نئی تاریخیں رقم فرمائی ہیں۔ جمہور اہلِ اسلام اور مورخین نے ۱۲ ربیع الاول[1] عام الفیل یوم ولادت کے لیے اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری یوم وصال کے لیے رقم کی ہے۔ ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کو ان اور بعض دُوسری تاریخوں سے بر بنائے حساب و تاریخی شواہد اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح سالِ پیدائش (عیسوی سنین) کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر صاحب اپریل ۵۷۱ء کے بجائے جون ۵۶۹ء کو ترجیحاً انتخاب کرتے ہیں۔

---

[1] ۹ ربیع الاول بھی ولادت باسعادت کے لیے بیان اور منتخب کی گئی ہے۔

باب ۱

تعارف

۱- ۱۷ جون ۵۶۹ء ——— یہ پیر کا دن تھا۔ اس روز دُنیا کے دُور افتادہ مقام مکہ میں جو صحرائے عرب میں واقع ہے، ایک بچہ تولد ہُوا۔ دوست تو کیا، دشمن بھی اس بات کی تردید کرنے سے قاصر ہیں کہ اس بچے نے کیا مذہب اور کیا سیاست، تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود اس کی تعلیمات آج بھی نہ صرف زندہ و تابندہ ہیں بلکہ وسعت پذیر بھی ہیں اور اس کے پیرو کار بین الاقوامی امور میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے ساتھ دنیا کے تین برِاعظموں پر حکمران ہیں۔ یہ بچہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔

۲۔ حضرت عبداللہ اور بی بی آمنہ کے فرزند ارجمند محمد رسولؐ عربی کے سوانح نگار کو آنحضرتؐ کے بارے میں دستاویزات کی کمی سے نہیں کثرت کے باعث مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسے آنحضرتؐ کو جو رسولِ خدا تھے ایک ایسے قائد اور رہنما کی حیثیت سے دیکھنا ہوتا ہے جو اپنی تعلیمات کی بنیاد نزولِ وحی پر استوار کرتا ہے۔ اپنے پیش رو مرسلین کے برعکس محمدؐ محض ایک مکمل دینی نظام کے بانی ہی نہ تھے بلکہ وہ بیک وقت ایک حکمران، قانون ساز، فاتح، سالک اور معلّمِ اخلاق بھی تھے۔ مزید برآں وہ ایک ایسی ہستی ہیں جن کے الفاظ اور اعمال ان کی اُمت کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں، خواہ اس کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے، معاشرت سے ہو یا اخلاق سے، لازوال قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فطری طور پر ان کے سوانح میں غیر معمولی اور مافوق الفطرت امور کا ذکر بھی آئے گا۔

۳۔ **نسب اور ولادت** ۔ قرآن حکیم اور انجیل مقدس دونوں متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم (۱۸۰۰ ق م) کے دو بیٹے اسمٰعیل اور اسحاق تھے۔ انجیل چونکہ خاندانِ اسحاق کی تاریخ ہے لہٰذا اس میں اسمٰعیل کا ذکر اس کے سوا کہیں نہیں کہ وہ اپنے والد گرامی حضرت ابراہیم کی تدفین کے وقت اسحاق کے ساتھ تھے۔ قرآن چونکہ ایک اسماعیلی پیغمبر پر نازل ہوا ہے لہٰذا اس میں بعض ایسی تفاصیل بیان کی گئی ہیں جن کا ذکر انجیل میں نہیں ملتا۔ یہ تفاصیل یہاں قابلِ ذکر ہیں۔ ازمنہ قدیم میں دستور یہ تھا کہ پہلا پھل خواہ وہ گھر کے پالتو جانور کے بچے کی صورت میں ہو یا فصل کی صورت میں، اللہ کی راہ میں دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ پہلا بیٹا بھی خدا کی راہ میں قربان کرنے کا رواج تھا (جیسا کہ انجیل میں ہے: کتاب خروج ۱۳/۲ اور ۱۲۔ حزقی ایل ۲۰۔۲۶) بعد میں یہ رواج بدل دیا گیا اور بیٹے کی جگہ کسی اور مال کی قربانی شروع ہو گئی (کتاب خروج ۳۴/۱۹۔۲۰) تاہم آثارِ قدیمہ سے ثابت ہے کہ شروع شروع میں پہلا بیٹا اللہ کی راہ میں ذبح کیا جاتا تھا۔ ابراہیم کو بھی، جب ان کے ہاں بڑھاپے میں پہلا بیٹا پیدا ہوا، اس دستور پر عمل کرنا پڑا جب اللہ کی طرف سے رؤیا میں ان کا بھولا ہوا فرض ———

بیٹے کی قربانی ——— یاد دلایا تو انھوں نے کسی پس و پیش یا جنبشِ لب کے بغیر اس پر عمل کیا۔ اللہ کو ان کی فرض سے یہ لگن اور ادائے بندگی اس قدر پسند آئی کہ اس نے معجزانہ طور پر نہ صرف بچے کو بچا لیا بلکہ اس کے عوض انھیں دوسرے بیٹے اسحاق کے تولد کی خوشخبری بھی سنائی (قرآن ۳۷ - ۱۱۲) البتہ اسماعیل کے عوض ایک دنبے کی قربانی عمل میں لائی گئی۔ ابراہیم کی طرف سے دنبے کی قربانی کی یہ رسم عربوں میں زمانہ قبل از اسلام تک جاری رہی - گویا یہ رسم ابراہیم کے پہلوٹھی کے بیٹے اسمٰعیل کی اولاد میں جاری تھی، اسحاق کے خاندان میں نہیں۔

۴ - ابراہیم نے اسماعیل کو ان کی والدہ محترمہ بی بی حاجرہ سمیت اس جگہ منتقل کر دیا تھا جو بعد میں مکہ کہلائی۔ اس صحرا میں چشمۂ زمزم ان کی زندگی کی ضمانت تھا ——— اور اسحاق اپنی والدہ محترمہ بی بی سارہ کے ساتھ فلسطین میں جاگزین رہے۔ ابراہیم دونوں ممالک میں باری باری آتے جاتے رہے۔ یہ ابراہیم ہی تھے جنھوں نے کعبۃ اللہ کی تعمیر نو کی اور رب واحد کے گھر کے حج کی بنیاد رکھی۔ حضرت اسماعیل کے وقت سے قصیّ تک جو محمدؐ کے اسلاف کی پانچویں پشت تھے کوئی بات قابلِ ذکر نہیں۔ مکہ شہر یا مملکت پر یکے بعد دیگرے مختلف قبائل کی عملداری رہی : پہلے جرہم حکمران تھے، پھر ایاد' اور بعد میں خزاعہ کی حکمرانی قائم ہوئی تاہم حکمرانوں میں ردّ و بدل کے باوجود اسماعیل کے اخلاف مکہ میں ہی رہائش پذیر رہے۔ قصیٰ کے وقت سے ہم مکہ کی تہذیب اور سیاسی اصلاحات کے بارے میں یقینی طور پر بہتر معلومات رکھتے ہیں جن کے مطابق مکہ میں استبدادی بادشاہت و مطلق العنانی کے بجائے جمہوریت. نظامِ شوریٰ اور منتخب افراد کی حکومت کا نظام رائج ہوا۔ ابن قتیبہ تو بازنطین (استنبول) کے ساتھ اپنے تعلقات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ بظاہر اس کا تعلق تھیوڈوسس اول (۳۹۵ - ۳۷۹) سے معلوم ہوتا ہے۔ قصیٰ کے بیٹے عبد المناف نے تعلقاتِ خارجہ کو خصوصاً تجارت کے سلسلہ میں مزید فروغ دیا اور بازنطین، ایران، حبشہ اور کندہ (یمن) کے فرمانرواؤں کے ساتھ تاریخی معاہدہ " ایلاف " کیا۔ جس کی یاد کو قرآن نے دوام بخشا ہے۔ میثاق ایلاف کے تحت مناف کو کئی ممالک میں تجارتی کاروان لے جانے کا اختیار مل گیا۔ ابن سعد کے مطابق بازنطینی سلطنت میں ان کے قافلے انقرہ تک جاتے تھے۔ عبد المناف کے پوتے عبد المطلب کے زمانے میں بین الاقوامی صورتِ حال انتہائی نازک ہو گئی۔ یمن کا خاندان کندی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور ان کی جگہ حبشہ والوں نے لے لی۔ بعد میں انھوں نے اپنے سردار ابرہہ کی قیادت میں مکہ پر فوج کشی کی۔ ہاتھی اور ایک بڑی فوج کے مقابلہ میں فطرت مکہ والوں کی مدد کو آئی۔ ابرہہ شکست کھا کر پسپا ہو گیا اور ایسے وبا میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ پھر ایرانیوں نے یمن پر حملہ کر کے ابرہہ کے خاندان سے حکومت چھین لی۔ انھوں نے ابتدا میں تو یمن کے تخت پر ایک یمنی شہزادے کو بٹھایا۔ عبد المطلب اس شہزادے کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے کے لیے ایک وفد لے کر یمن گئے مگر ایرانیوں نے بعد میں اس شہزادے کو بھی تاج و تخت سے محروم کر دیا۔ اس کے بعد یمن مدائن (جسے طیسفون بھی کہتے تھے) کا ایک صوبہ یا کالونی بن کر رہ گیا۔

۵ - عبد المطلب نے مکہ میں کعبہ کے سامنے زمزم کا چشمہ پھر سے جاری کیا جسے ایک مقامی جنگ میں پسپائی کے دوران خزاعہ قبائل نے بند کر دیا تھا۔ عبد المطلب نے منت مانی کہ اگر ان کے ہاں بارہ بیٹے پیدا ہوئے تو وہ ایک بیٹے کو

اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ جب ان کی خواہش پوری ہو گئی تو انھوں نے ایک بیٹے کی قربانی کا سامان کیا۔ بارہ بیٹوں میں سے قربانی کے لیے بذریعہ قرعہ اندازی عبداللہ کا انتخاب کیا گیا۔ مگر خاندان کے اعزہ اور دوستوں نے عبدالمطلب کو تسلیم کرلیا کہ وہ عبداللہ کو قربان کرنے سے قبل کسی کاہن سے مشورہ کریں۔ چنانچہ اس دَور کی ایک نامور کاہنہ سے رابطہ پیدا کیا گیا، جس نے اس مشکل کا معقول حل پیش کر دیا۔ اس کاہنہ نے تجویز پیش کی کہ قرعہ اندازی کے ذریعے بیٹے کے عوض روایتی خون بہا کی ادائیگی کا تعین کرلیا جائے اور اگر قرعہ بیٹے کے نام پر ہی نکلے تو خون بہا میں اضافہ کر کے دوبارہ قرعہ اندازی کی جائے۔ چنانچہ دس اونٹوں اور عبداللہ کے درمیان قرعہ اندازی کی گئی مگر قرعۂ فال عبداللہ کے نام پڑا۔ اب اُونٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ بڑھتے بڑھتے اونٹوں کی تعداد سَو ہو گئی تو قرعہ میں اُونٹ نکل آئے۔ عبدالمطلب نے جو دیانت داری سے اپنی منت پوری کرنا چاہتے تھے، تین بار قرعہ اندازی کرائی مگر تینوں بار عبداللہ کا نام نکلا۔ چنانچہ سَو اُونٹ قربان کر دیے گئے۔

۶۔ حضرت عبداللہ کی شادی مکہ میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ کا نام آمنہ تھا اور ان کا تعلق بنو زہرہ سے تھا۔ ان سے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا جسے آگے چل کر پیغمبرِ اسلامؐ کا اعزاز حاصل کرنا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بیٹے کی پیدائش سے چند ہفتے قبل وفات پاچکے تھے لیکن بعض مسلمہ سوانح نگاروں کا قول ہے کہ حضرت عبداللہ کی وفات بیٹے کی پیدائش کے چند ہفتے بعد ہوئی تھی۔ عبداللہ شمال کی طرف تجارتی سفر پر گئے ہوئے تھے اور جب وہ مدینہ میں تھے جو ان کی دادی کا شہر بھی تھا، موت نے انھیں آلیا۔ ان کی تدفین مدینہ میں ہی عمل میں آئی۔ ان کا روضہ جو ترک حکومت نے تعمیر کیا، آج بھی سعودی حکومت کے دور میں موجود ہے[1]۔

۷۔ عظیم شخصیتوں کی ولادت کے دور میں ہمیشہ غیر معمولی واقعات رونما ہوتے ہیں، خواہ ان کا تعلق مستقبل کے عظیم ہیرو کی اس دنیا میں آمد سے ہو یا نہ ہو۔ زرتشت آگ کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے آتشکدوں میں آگ سدا روشن رکھی جاتی ہے مگر پیر ۱۷ جون ۵۶۹ء کی رات کو مدائن کے عظیم ترین آتشکدہ میں آگ بجھ گئی جو صدیوں سے روشن چلی آ رہی تھی۔ اسی رات ایک زلزلہ آیا جس سے ایرانی شہنشاہ کے محل کے چودہ کنگرے گر گئے۔ اسی طرح کے اور بھی واقعات رونما ہوئے۔ بی بی آمنہ بیٹے کی پیدائش کے وقت تنہا تھیں۔ اچانک انھوں نے چند دراز قد خواتین کو دیکھا جو اس مشکل وقت میں ان کے پاس آئیں۔ جب بی بی آمنہ نے ان سے دریافت کیا تو ان میں سے ایک نے کہا "میں فرعون کی بیوی آسیہ ہوں" (جس نے حضرت موسیٰ کی جان بچائی تھی جنھیں ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کے سپرد کر دیا گیا تھا) دوسری خاتون مریم والدہ عیسیٰ مسیح تھیں جبکہ باقیماندہ خواتین جنت کی حوریں تھیں۔ (جب نئی نبوت ایک نئی وزارت معرضِ وجود میں آتی ہے تو قبل ازیں یہ فریضہ سرانجام دینے والے اس کے استقبال کے لیے آتے ہی ہیں۔ ایک خاتون کے ہاں ولادت کے وقت حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ تو نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ آسیہ اور مریم

---

[1] چند سال قبل اس جگہ سڑک تعمیر کر دی گئی ہے۔

ان کی نیابت کے لیے آگئیں) پھر فرشتوں نے اپنے پروں سے حضرت آمنہ کے جسم کو ڈھانپ لیا تاکہ انھیں ٹھنڈی ہوا نہ لگے۔ جلد ہی بچہ تولد ہوا جو فطرۃً مختون تھا۔ وہ سجدے کی حالت میں زمین پر گر گیا اور انگشتِ شہادت یوں اٹھائی گویا خدا کی وحدانیت کا اعلان کر رہا ہو۔ بچہ ایک لمحہ کے لیے سفید رنگ کے بادل میں گم سا ہو گیا۔ پھر غیب سے ندا آئی: "اسے مشرق و مغرب میں پھراؤ اور سمندروں میں لے جاؤ تاکہ تمام مخلوق جس میں فرشتے، درند، پرند، مچھلیاں اور دوسرے شامل ہیں اپنے نئے پیغمبر کو پہچان لیں۔" جب یہ بادل تحلیل ہو گیا تو بچہ سامنے آ گیا۔ پھر اسے ایک اور بادل نے اپنی آغوش میں لے لیا اور آواز آئی "اسے تمام سابق پیغمبروں کی خوبیوں سے نوازو، اسے خلقِ آدمؑ دو، شیثؑ کا علم، نوحؑ کی جرأت، ابراہیمؑ کی طرح خدا کی محبت، اسمٰعیلؑ کی زبان دانی، اسحاقؑ کی سی تسلیم و رضا، صالحؑ کی خطابت، لوطؑ کی عقل و دانش، یعقوبؑ کا علمِ غیب، حُسنِ یوسفؑ، موسیٰؑ کی استقامت، صبرِ ایوبؑ، یونسؑ کی سی اطاعت، جُہدِ یوشعؑ، لحنِ داؤدیؑ، دانیالؑ کی سی محبت، الیاسؑ کی عظمت، یوحنا استطباغی کی پاکبازی اور عیسیٰؑ کی بے نیازی عطا کرو اور اسے پیغمبروں کی تمام خوبیوں کے رنگ میں رنگ دو۔" یہ بادل بھی چھٹ گیا اور بچہ پھر سامنے آ گیا۔ پھر تین افراد جو در اصل فرشتے تھے آئے اور اسے نقرئی سلفچی میں تین بار غسل دیا۔ پھر اسے سفید ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر چند لمحوں کے لیے اپنے پروں میں دبا کر حرارت پہنچائی اور پھر اسے اس کی ماں کے حوالے کر کے غائب ہو گئے۔ مسلم قدیم مصنفوں نے ایسے ہی دل نشین انداز میں آں حضورؐ کی ولادت کا نقشہ کھینچا ہے۔

۸ ۔ بی بی آمنہ نے بیٹے کا نام محمدؐ رکھا، جیسا کہ ایامِ حمل کی ابتدا میں انھیں خواب میں حکم دیا گیا تھا۔ یہ بچے کے دادا تھے جنھوں نے ازراہِ شفقت اُسے احمدؐ کہنا شروع کیا۔ عرب میں دستور تھا' جو بیسویں صدی میں بھی موجود ہے کہ شہروں میں پیدا ہونے والے بچے رضاعی ماؤں کے سپرد کر دیے جاتے تھے تاکہ وہ صحرا کی کھلی اور تازہ ہوا میں پرورش پا سکیں۔ طائف کے قبیلہ ہوازن کی حلیمہ کو جو (ولادت باسعادت کے) چند روز بعد مکہ مکرمہ سے گزری اس بچے کو گود لینے کا شرف حاصل ہوا، جس کے لیے وہ کبھی پشیمان نہیں ہوئیں کیونکہ یہ بچہ اپنے ساتھ ناقابلِ بیان خوشحالی لے کر آیا۔ جب حلیمہ نے بچے کو پہلی بار اپنا دودھ پلایا تو اس نے محض ایک چھاتی سے دودھ پینے پر اکتفا کی۔ اور کبھی دوسری چھاتی کو منہ تک نہ لگایا اور اسے اپنے رضاعی بھائی کے لیے چھوڑ دیا۔ (پیغمبروں کو بچپن ہی سے امین ہونا چاہیے) وہ کوئی چار سال صحرا میں رہا۔ اس دوران وہ اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات کے لیے مکہ مکرمہ آتا رہا۔ اس موقع پر دائی حلیمہ کو بچے کی پرورش کا عوضانہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ بچہ علاقائی میلوں ٹھیلوں (عکاظ وغیرہ) میں بھی اپنی رضاعی ماں کے ساتھ جاتا رہا۔ ایک روز بچے کی بڑی رضاعی بہن شیماؓ اسے اٹھا کر جا رہی تھی۔ راستے میں اس نے بچے کو اتنا گدگدایا کہ وہ بُرا مان گیا اور غصے میں آ کر لڑکی کو کندھے پر اتنے زور سے کاٹا کہ دانتوں کے مستقل نشان پڑ گئے۔ اس واقعہ کے کوئی پچپن سال بعد جب بوڑھی شیماؓ کو اسلامی فوج کے ایک دستے نے پکڑ کر حضور اکرمؐ کے روبرو پیش کیا تو اس نے بتایا کہ وہ رسول اللہؐ کی رضاعی بہن ہے۔ اس موقع پر اس نے رسولِ خداؐ کو بچپن کا یہ واقعہ بھی یاد دلایا۔ رسول اکرمؐ

کو اپنی رضاعی بہن کے کندھے پر دانتوں سے کاٹنے کا واقعہ یاد آگیا اور فطرت کے عین مطابق انھوں نے اپنی رضاعی بہن سے وہی سلوک کیا جو ایک مشفق اور محبت کرنے والے بھائی کو بہن سے کرنا چاہیے۔

۹۔ حلیمہ بچّے کو رواج کے مطابق مقررہ وقت سے زاید اپنے پاس رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈلیتی تھی۔ ایک روز حلیمہ کا بیٹا صحرا میں بھاگتا ہوا گھر آیا اور اسے بتایا کہ صحرا میں چند افراد آئے جنھوں نے اس کے مکی بھائی کا سینہ چاک کر دیا۔ حلیمہ اور اس کا شوہر خوفزدہ ہو کر صحرا کی طرف بھاگے۔ جب وہ موقع پر پہنچے تو محمدؐ ایک چٹان پر بیٹھے آسمان کی طرف تک رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ان اجنبی افراد نے ان کا سینہ چاک کیا، ان کا دل باہر نکالا اور دل پر سے ایک سیاہ دھبّہ کاٹ کر یہ کہتے ہوئے دُور پھینک دیا کہ یہ شیطانی حصّہ تھا۔ پھر انھوں نے ان کے دل کو دھو کر صاف کیا، اسے اپنی جگہ پر رکھا، چھاتی کا چاک بند کیا اور آسمان کی طرف اُڑ گئے۔ اور جب ان کی رضاعی ماں موقع پر پہنچی تو وہ ان افراد کو ہی آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز دیکھ رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد دائی حلیمہ نے سوچا کہ اس غیر معمولی اور معجزاتی بچّے کو اس کی والدہ ماجدہ کے سپرد ہی کر دینا چاہیے تاکہ مستقبل میں کسی اور پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

۱۰۔ پھر آمنہ بیٹے کو لے کر اس کے والد کی قبر پر گئیں جو مدینہ میں تھی۔ بنو نجار نے جو عبد المطلب کی ننھیال تھی' اپنے مکی اعزّہ سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ آمنہ بھی بنو نجار میں کوئی دو سال رہیں۔ اس دوران نوعمر محمدؐ نے ایک قریبی تالاب میں تیرنا سیکھا۔ انھیں بعد میں بھی مدینہ میں قیام کی بعض تفصیلات یاد تھیں۔ انھیں ان لڑکوں اور لڑکیوں کے نام بھی یاد تھے جن سے مل کر وہ کھیلا کرتے تھے۔

۱۱۔ مدینہ سے مکّہ واپسی پر بی بی آمنہ کا ابوا کے مقام پر وصال ہو گیا۔ ان کی خادمہ اُمِّ ایمن بچّے کو لے کر واپس مکّہ پہنچی اور ان کے دادا عبد المطلب کے سپرد کر دیا۔ مکّہ کے یہ معمر سردار اپنے پوتے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ چند سال بعد جب عبد المطلب اللہ کو پیارے ہوگئے تو محمدؐ جن کی عمر صرف آٹھ سال تھی' اپنے پیارے اور محبت کرنے والے دادا کی میّت کے پیچھے روتے ہوئے چلتے رہے۔ دادا کی وفات کے بعد آنحضورؐ کے حقیقی چچا ابُوطالب نے انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ مگر اب اس نوعمر لڑکے کو اپنے لیے روٹی خود کمانا تھی وہ اپنے ایک ہمسایہ ابُومُعیط کی بھیڑیں چرانے لگے اور یُوں اپنے خاندان کے وسائل میں معمولی اضافہ کا باعث بنے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے چچا کی کپڑے وغیرہ کی دکان میں بھی ہاتھ بٹانے لگے اور بالآخر ان کی جگہ دکانداری ہی کرنے لگے، کیونکہ وہ ابوطالب کے بیٹوں کی نسبت زیادہ ذہین و فطین اور قابلِ اعتماد تھے۔

۱۲۔ ان کی عمر نو سال تھی جب ان کے چچا ایک تجارتی قافلہ لے کر فلسطین کی طرف گئے۔ ابُوطالب نے یہ دیکھ کر کہ ان کا بھتیجا پیارے چچا سے عارضی جدائی پر کتنا پریشان ہے' انھیں بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں فلسطین عیسائی خانقاہوں کا گہوارہ تھا۔ ان خانقاہوں کے عیسائی راہب مسافروں کی بے لوث خدمت کے بجائے ان میں عیسائیت کی تبلیغ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی راہب بُحیرہ نے ابوطالب اور ان کے رفقا کو

کھانے پر مدعو کیا، محمدؐ بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر بُحیرہ نے کس زبان میں بات کی ہمیں علم نہیں، غالباً اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اپنے مہمانوں سے، جن میں وہ کمسن بچہ بھی شامل تھا، خطاب کیا۔ مگر ایک فرانسیسی مستشرق کی پروازِ تخیل ملاحظہ ہو کہ اس نے ایک پوری کتاب "بُحیرہ ——— قرآن کا مصنف" کے عنوان سے سپردِ قلم کی ہے۔ کیا یہ معجزہ رونما ہو سکتا ہے کہ نو سال کی عمر کا ایک بچہ قرآن پاک کی ۱۱۴ سُورتیں چند منٹ میں حفظ کر لے اور پھر ایک نسل کے بعد ان قرآنی سُورتوں کو یہ کہہ کر اپنی اُمت کے رُوبرو پیش کرے کہ یہ اللہ کا کلام ہے؟

۱۳۔ غالباً یہ اسی دَور کا معمولی سا واقعہ ہے جو نہایت سنگین نتائج کا حامل بنا، ایک روز ابو طالب اور ابو لہب دونوں بھائی کسی بات پر جھگڑے اور بالآخر لڑنے لگے۔ ابُو لہب نے ابو طالب کو زمین پر گرا لیا، ان کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور انھیں زدوکوب کرنے لگا۔ محمدؐ بھی موجود تھے، وہ اپنے سرپرست کی امداد کو آئے اُنھوں نے ابُولہب کو دھکا دے کر گرا دیا اور یُوں ابوطالب کو موقع فراہم کیا کہ وُہ زمین سے اُٹھ کر ابولہب کو گرا سکیں۔ ابوطالب نے ابولہب کو گرا لیا اور اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ ابولہب کو شدید غصہ آیا اور وُہ پکارا، "اے محمدؐ! میں بھی تو ابُوطالب ہی کی طرح تمھارا چچا ہُوں، تم نے اس کی مدد کی ہے، میری مدد کیوں نہیں کی؟ اللہ کی قسم میرے دل میں تمھارے لیے کبھی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوگا، کبھی نہیں۔" اور درحقیقت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابولہب کے دل میں اپنے بھتیجے کے لیے تعصب اور نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔

۱۴۔ چند سال بعد ایامِ حج کے دوران مکہ میں لڑائی چھڑ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محمدؐ نے دورانِ جنگ اپنے ایک چچا حمزہ کو ڈھال کے ذریعے تحفظ دیا جبکہ خود حمزہ دشمنوں پر تیر برسا رہے تھے۔ جبکہ ایک روایت یہ ہے کہ اس جنگ میں محمدؐ نے دشمن قبیلہ کے سپہ سالار مطلب الاسینا کو نیزے سے زخمی کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ قبیلہ بھی طویل عرصہ تک اسلام کا سخت دشمن بنا رہا۔

۱۵۔ حج کے متبرک مہینوں میں خونریزی مکہ مکرمہ کے متعدد صاحبِ ضمیر افراد کے لیے سوہانِ روح تھی۔ الزبیر جو آنحضورؐ کے سب سے بڑے تایا اور خاندان کے سربراہ تھے، آگے بڑھے اور مکہ کے ایک معزز رئیس عبداللہ ابن جدعان کے ہاں ایک اجلاس عام طلب کیا، اس اجلاس میں ایک منشور تیار کیا گیا جو تاریخ میں "حلف الفضول"[1] کے نام سے موسوم ہوا۔ اس معاہدہ کے تحت یہ عہد کیا گیا کہ معاہدہ کے ارکان ہر اس شخص کی مدد کریں گے جس سے زیادتی کی جائے گی۔ حضور اکرمؐ بھی جو اب نوجوان تھے، اس معاہدہ میں پیش پیش تھے۔ بعد میں جب حضورؐ پر نبوت نازل ہوئی اور انھیں صحرائے عرب میں پیغمبرِ خدا تسلیم کر لیا گیا تو بھی آں حضرتؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس (معاہدے کے رُکن کی حیثیت سے) اعزاز سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں خواہ مجھے اللہ کے لیے سُرخ اُونٹوں کا پُورا گلّہ کیوں نہ پیش کیا جائے۔ آج بھی اگر کوئی شخص اس معاہدے کے تحت مجھے (مدد کے لیے) پکارے تو میں بھاگ کر اس کی امداد کو پہنچوں گا۔" اس معاہدے میں ہاشم، مطلب، زہرہ اور

---

[1] "حلف الفضول" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس معاہدے میں پہلے جو تین افراد شامل ہوئے تھے ان کے ناموں کا ایک جزو لفظ "فضل" پر مبنی تھا۔ لہٰذا اس معاہدے کو "حلف الفضول" کہا جانے لگا۔ (مترجم)

تیم کے قبائل شامل تھے۔

۱۶ - غالباً قبائلی رقابت کی وجہ سے سعد ابن سہام "حلف الفضول" میں شامل نہ ہوئے مگر وہ اسی نوع کا کوئی ادارہ انتظام کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بنو زہرہ سے خوشگوار تعلقات تھے جو رسولِ خدا کی والدہ محترمہ کا قبیلہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں قبائل نے مل کر "حلف الصلاح" (معاہدۂ صلح) کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اگر بنو قریش یا ان کے حلیف احابیش[1] (ان کا ملک حبشہ سے کوئی تعلق نہیں) میں سے کسی کے درمیان کوئی تنازعہ ہو تو وہ فریقین میں مفاہمت کرائیں گے۔ بنو زہرہ چونکہ دونوں معاہدوں میں اہم حیثیت کے مالک تھے۔ اس طرح غالباً ان دونوں معاہدوں میں بھی ایک طرح کا ربط موجود تھا۔

شادی اور عائلی زندگی

۱۷ - محمدؐ اب چوبیس سال کے ہو گئے۔ تجارت اور لین دین کے امور میں دیانت اور بے داغ کردار کے باعث لوگوں نے انھیں امین کا لقب دیا۔ ان کے چچا اور سرپرست ابو طالب اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ ان کے لیے سفرِ تجارت ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اب یہ محمدؐ کی ذمہ داری تھی کہ وہ سالانہ قافلوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں سامان تجارت لے کر جائیں۔ ایک نہایت توانگر اور متمول بیوہ خدیجہؓ بڑے اشتیاق سے اپنا مال تجارت آنحضورؐ کے سپرد کرنے پر رضامند ہو گئیں کہ وہ ان کے غلام کے ساتھ فلسطین جائیں۔ محمدؐ فلسطین گئے اور اپنی ذہانت، مہارت اور دیانت داری کے باعث حضرت خدیجہؓ کی توقعات سے دوگنا زائد منافع کما کر واپس پہنچے۔ وہ بھی ایک دیانت دار خاتون تھیں۔ انھوں نے حضور اکرمؐ سے اس سفر کے عوض جو معاوضہ طے کیا تھا اس سے دوگنا رقم انھیں ادا کی۔ دونوں کی یہ روشناسی احساسِ رفاقت اور پھر حضرت خدیجہؓ کے لیے جذبات کا روپ دھار گئی۔ محمدؐ بہت شرمیلے اور اتنے غریب تھے کہ عرب کی اس متمول خاتون سے شادی کے لیے نہ کہہ سکے۔ چنانچہ خاتون نے اپنی سہیلیوں سے مشورہ کیا اور ایک سہیلی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ محمدؐ کے سامنے خدیجہؓ سے شادی کی تجویز رکھے۔ اور وہ رشتہ طلب کریں۔

۱۸ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب معاشرے میں خواتین کو نہایت بلند مقام حاصل تھا۔ عبدالمطلب کی والدہ سلمیٰ النجاریہ کے بارے میں ابن ہشام لکھتا ہے کہ وہ جب بھی شادی کرتیں یہ شرط طے کر لیتیں کہ انھیں کسی بھی وقت اپنے شوہر کو طلاق دینے کا حق حاصل رہے گا۔ یہ بھی درست ہے کہ عرب میں بیٹیوں کو پیدائش کے بعد دفن کرنے کے واقعات ہوئے ہیں۔ لیکن ایسے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر یہ واقعات انفرادی نوعیت کے ہیں اور ان کا منبع بھی عورت کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تکریم کا رجحان ہے۔ انسانی منطق بھی عجیب ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہر فرد دوسرے سے برسرِ پیکار ہو، والدین چاہتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی وقت دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہوں اور نہ ہی کوئی شہدہ انھیں اغوا کر کے ان کے ناموس کو

---

[1] احابیش غیر عرب تھے اور عرب میں بطور حبشہ و سیاہ کے رہتے تھے۔ (مترجم)

بتہ لگاتے ۔ جہاں تک خدیجہ کا تعلق ہے درج ذیل تفصیلات سے زمانہ قبل از اسلام میں مکّہ کے رسم و رواج کا اظہار ہوتا ہے ، حضور اکرمؐ سے شادی کا معاملہ پہلے آنحضورؐ اور حضرت خدیجہ کی پیامبر کے درمیان طے ہوا ۔ حضور اکرمؐ کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ خدیجہ کا رشتہ طلب کریں تو وہ اظہارِ رضامندی کر دیں گی ۔ (مورخوں کا کہنا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے حُسن و جمال اور تموّل کی بنا پر مکّہ کے متعدد با اثر افراد ان سے شادی کی پیشکش کر چکے تھے مگر انھوں نے ہر پیشکش مسترد کر دی تھی) چنانچہ محمدؐ اپنے چچاؤں ، دوسرے اعزّہ اور دوستوں کے ساتھ حضرت خدیجہ کے گھر گئے ۔ محفل میں پہلے آنحضورؐ کے چچا اٹھے اور مختصر تقریر کی: "آپ سب محمدؐ کو جانتے ہیں ۔ اہلِ قریش میں کوئی نوجوان ان کا ہم پلّہ نہیں ۔ وہ عزّ و شرف ، نیابت اور دانش میں اہلِ قریش کے تمام نوجوانوں پر فضیلت رکھتے ہیں ۔ ان کے پاس مال و زر کے انبار نہیں تو کیا ، آپ سب جانتے ہیں دولت اور مال و زر دُھوپ چھاؤں کی طرح آنی جانی ہے ۔ دولت آتی ہے چلی جاتی ہے ۔ محمدؐ خدیجہ بنتِ خویلد کے طور اطوار بیحد پسند کرتے ہیں اور وہ بھی ان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہیں "۔ اس کے بعد خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد کھڑے ہوئے اور دُوسری باتوں کے علاوہ اُنھوں نے کہا " محمدؐ عمدہ نسل کے اُونٹ کی مانند ہیں جسے بٹھانے کے لیے مہار کھینچنا ضرور نہیں ہوتا "۔ چونکہ حضرت خدیجہ کے والد انتقال کر چکے تھے اس لیے عمرو بن اسد نے اس جوڑے کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا ۔ دونوں نے شادی کی پہلی رات ابوطالب کے گھر پر گزاری ۔ پھر خدیجہ شوہر سمیت اپنے گھر میں منتقل ہو گئیں ۔ اس بات میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ اس وقت محمدؐ ۲۵ سال کے تھے ۔ جہاں تک خدیجہؓ کا تعلق ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی تھیں جبکہ متعدد دُوسرے مورخوں کا کہنا ہے کہ ان کی عمر صرف ۲۸ سال تھی ۔ موخر الذکر افراد کے خیال کی اس حیاتیاتی حقیقت سے توثیق ہوتی ہے کہ آنحضورؐ سے حضرت خدیجہؓ کے ہاں سات بچے ، تینؑ بیٹے اور چارؑ بیٹیاں پیدا ہوئیں و قاسمؓ ، طاہرؓ ، طیبؓ ، زینبؓ ، رقیہؓ ، اُمِّ کلثومؓ اور فاطمہؓ ۔

۱۹ ۔ اس طرح محمدؐ کو اپنے پیارے چچا ابُوطالب سے علیحدہ ہونا پڑا ۔ اور ابوطالب اپنے کثیر عیال کے لیے روزی کمانے میں ایک معاون سے محروم ہو گئے ۔ مگر محمدؐ اس صورتِ حال سے بے خبر نہ تھے ۔ وہ نہ صرف ابوطالب کے ایک بیٹے علیؓ کو اپنے پاس لے گئے بلکہ اپنے دوسرے چچا عباسؓ کو بھی ابُوطالب کے دُوسرے بیٹے کو گود لینے پر رضامند کر لیا اور یوں اپنے چچا پر خاندان کا بوجھ ہلکا کیا ۔

۲۰ ۔ یہ قدرتی امر تھا کہ محمدؐ تجارت جاری رکھیں اور یُوں اپنی اہلیہ کے تموّل میں اضافہ کریں ۔ مورخ بتاتے ہیں کہ جب بھی کوئی حقدار حضورِ اکرمؐ کے سامنے آتا ——— ایک قحط کے دوران ان کی رضاعی ماں حلیمہ آئیں ، دوسرے یتیم ، بیوائیں اور بے نوا مسافر ——— وُہ انھیں امداد کے لیے اپنی اہلیہ کے پاس بھیجتے اور وہ ہمیشہ ایسے افراد کی کھلے دل سے امداد کرتیں ۔ اس حقیقت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خواتین (عرب میں) اپنے مال و دولت پر مکمل اختیار رکھتی تھیں اور ان کے شوہر بھی ان کی مرضی کے بغیر ان کی دولت صرف کرنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے ۔ پیغمبرِ خدا تجارت کی غرض سے متعدد بار یمن گئے ۔ وُہ کم از کم ایک مرتبہ عُمان بھی گئے جو قبیلہ عبدالقیس کا علاقہ تھا ۔ غالباً وہاں وہ دبا کے بین الاقوامی تجارتی میلے کے

سلسلے میں گئے تھے جس کے بارے میں ابن الکلبی لکھتا ہے : "پھر عُمان میں سُوہار کا میلہ لگتا تھا ۔ وہ مشقر سے یکم رجب کو روانہ ہوئے اور ۲۰ رجب کو سُوہار پہنچے ۔ میلہ پانچ دن جاری رہا اور عُمان کے حکمران الجُلندہ ابن المستکبر نے (تاجروں پر) عُشر نافذ کر دیا اس کے بعد دبا میں تجارتی میلہ منعقد ہُوا جو عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک ہے ۔ سندھ ، ہند (ہند و پاک) چین کے تجار اور مشرق و مغرب کے سوداگر اس میلہ میں شریک ہوئے ۔ یہ تجارتی میلہ رجب کے آخری روز شروع ہوتا تھا لیکن بن باقاعدہ بھاؤ تاؤ کے بعد ہوتا ۔ الجُلندہ ابن المستکبر (شاہِ عُمان) نے یہاں بھی تاجروں پر بطور کسٹمز ڈیوٹی عُشر نافذ کر دیا جیسا کہ اس نے سوہار کے میلہ میں کیا تھا ۔ اس کا رویہ دُوسری ولایتوں کے بادشاہوں سے مختلف نہ تھا ۔" اس دلچسپ پیراگراف سے بطور جملہ معترضہ ہی سہی ، یہ باعثِ اطمینان بات سامنے آتی ہے کہ عرب کی ایک منڈی میں ہندی تاجر بھی شامل ہوتے تھے ۔ اگر رسولِ خدا نے ظہورِ اسلام سے قبل اس تجارتی میلہ (منڈی) میں شرکت کی ہے ، جیسا کہ ابنِ حنبل کی ایک روایت سے ظاہر ہے ، تو ابن ہشام کی بیان کردہ ایک اور حدیث بھی بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے وہ یہ کہ جب یمن کے قبیلہ بل حارث کا ایک وفد مدینہ منورہ میں رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ قبولِ اسلام کا اعلان کرے تو حضورِ اکرم نے ان کی بابت پُوچھا : "یہ کون لوگ ہیں جو وضع قطع سے ہندی (رجال الہند[1]) نظر آتے ہیں ۔" پیراگراف میں چینیوں کا ذکر بھی ہے ۔ المسعودی نے غیر مبہم الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ (چینی) کشتیوں میں آیا کرتے تھے ۔ وہ بحرین ، عمان اور ابولہ (بصرہ) بھی جاتے تھے ۔ ممکن ہے رسولِ خدا کی ان سے وہیں ملاقات ہوئی ہو ۔ اور آنحضرت کو نہ صرف چینیوں کی صنعت و حرفت نے متاثر کیا ہو بلکہ وہ اس لئے بھی متاثر ہوئے ہوں کہ یہ لوگ کتنی دُور سے آتے تھے ۔ حضور کی مشہور حدیث "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے ، کیونکہ حصولِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے ۔" شاید اسی تاثر کا اظہار ہے ۔ ایک آخری نکتہ یہ ہے ، مکی تاجر نہ صرف عرب میں اس طرح کی منڈیوں اور تجارتی میلوں میں شریک ہوتے تھے بلکہ ان کے تجارتی قافلے حبشہ ، عراق اور شام ہی نہیں ، انقرہ تک مار کرتے تھے جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں ۔

۲۱ ۔ رسولِ خدا نے دُور دراز مقامات کا جو سفر اختیار کیا ہے اس کی کچھ تفصیل بے جا نہ ہوگی ۔ پہلے دبا کو لیجئے : ابن حنبل رقمطراز ہیں جب قبیلہ ابوالقیس کا وفد رسولِ خدا سے ملاقات کے لیے مدینہ آیا تو آں حضور نے ان کے ملک اور لوگوں کے بارے میں متعدد سوالات پوچھے ۔ حضورِ اکرم کے سوالات پر وہ لوگ ششدر رہ گئے اور پکار اُٹھے : "آپ تو ہم سے بہتر ہمارے ملک کو جانتے ہیں ۔" اس پر رسولِ خدا نے جواب دیا : "میں وہاں کافی عرصہ قیام کر چکا ہوں ۔" رسول اللہ کے سوانح نگاروں نے واضح طور پر اور بار بار حضور کے سفرِ یمن ، شام و فلسطین کا ذکر کیا ہے ۔ یمن کو خلیج باب المندب حبشہ سے جدا کرتی ہے ۔ مکہ کے لوگ اکثر اس خلیج کو پار کر کے حبشہ جاتے تھے اور اسی طرح حبشہ کے لوگ عرب اور مکہ آیا جایا کرتے تھے ۔ اوائل اسلام میں مکی مسلمان ہجرت کر کے بھی حبشہ گئے تھے جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے) بعض جدید

---

[1] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ استعمال کیے تھے ۔

مصنفوں کا قیاس ہے کہ خود رسول اللہؐ بھی حبشہ گئے ہوں گے اور ان کی نجاشی سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ ان کے اس قیاس کی بنیاد اس تعارفی خط کا طرزِ تخاطب ہے جو حضور پاکؐ نے اپنے عم زاد جعفر ابن ابو طالب کو شاہِ نجاشی کے نام دیا تھا۔ یہ خط خاصا بے تکلفانہ ہے اور طبری کے مطابق اس میں لکھا ہے: "میں آپ کے پاس اپنے عم زاد جعفر کو چند اور مسلمانوں کے ہمراہ بھیج رہا ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچیں ان کی مہمان نوازی کیجئے اور ان پر ظلم نہ ہونے پائے۔ او کما قال

۲۲۔ اسی طرح کا ایک اور چھوٹا سا مگر پُراثر واقعہ ہے جس سے رسول اللہؐ کا اخلاقِ حسنہ اور معاشرتی رویہ اجاگر ہوتا ہے۔ ایک نوعمر عرب لڑکا مکہ کی منڈی میں بطور غلام فروخت ہوا۔ اس کا نام زید بن حارث تھا۔ اور اس کا تعلق شمالی عرب کے ایک بڑے قبیلہ کلب سے تھا۔ اس لڑکے کو بنو کلب کے ایک ہمسایہ قبیلہ نے ایک تصادم کے دوران گرفتار کر لیا اور مکہ لا کر فروخت کر دیا۔ یہ لڑکا بڑا حسین اور دانشمند تھا۔ بی بی خدیجہؓ نے اسے خرید لیا اور اسے اپنے شوہر کی خدمت میں بطور ذاتی ملازم کے پیش کیا۔ اس لڑکے کا غمزدہ باپ جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا، بیٹے کی تلاش میں دور دور تک مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا کہاں ہے۔ وہ بھاری رقم لے کر مکہ پہنچا تاکہ زرِ فدیہ ادا کر کے بچے کو آزاد کرائے۔ جب وہ رسولِ خداؐ سے ملا تو حضورؐ اس کی بپتا سے بے حد متاثر ہوئے۔ رسول اللہؐ نے کہا "بچے کو یوں واپس خریدنے کی نسبت ایک اور بہتر طریقہ بھی ہے وہ یہ کہ میں خود بچے سے پوچھے لیتا ہوں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے تو آپ ایک کوڑی ادا کئے بغیر اپنے بیٹے کو لے جا سکتے ہیں"۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے زید کو بلایا۔ وہ فوراً ہی حاضرِ خدمت ہوا اور اپنے باپ کو پہچان لیا۔ جب رسولِ خداؐ نے زید سے جانے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بلا توقف جواب دیا "آپ نے مجھ سے جو محبت بھرا سلوک کیا ہے اس کے بعد میں آپ کے ہاں بطور غلام رہنے کو اپنے باپ کے گھر بطور آقا زندگی گزارنے پر ترجیح دیتا ہوں"۔ رسولِ خداؐ اس رقت انگیز جواب سے بیحد متاثر ہوئے انہوں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اسے کعبہ کے احاطہ میں لے گئے اور سرِعام اعلان کیا: "میں زید کو آزاد کرتا ہوں اور آج سے اسے گود لیتا ہوں۔" زید کے والد حارث گو خالی ہاتھ لوٹے مگر ان کا دل اپنے بیٹے کی پرورش کے ضمن میں اطمینان سے پُر تھا۔

۲۳۔ حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہروں سے دو بچے تھے۔ ایک شوہر سے بیٹا تھا اور دوسرے سے بیٹی۔ دونوں کا نام "ہند" تھا۔ دونوں بچے اپنے اپنے والد کے خاندان میں ہی رہتے تھے اور کبھی کبھار اپنی ماں سے ملنے آتے تھے، جہاں سے انھیں محبت کے ساتھ تحائف بھی ملا کرتے تھے۔ بیٹا ہند ابن ابی ہالہ اپنے سوتیلے والد (رسول خداؐ) سے بیحد مانوس ہو گیا تھا اور آگے چل کر وہ اسلام میں حضور اکرمؐ کے حُلیہ شریف کے بارے میں سب سے بڑا راوی قرار پایا۔ وہ نہایت ہی دلنشیں انداز میں حضورؐ کا سراپا بیان کرتا ہے: "...... اُن کا مُنہ یاقوتوں سے بھرا ہوا صندوقچہ تھا۔ ان کا چہرہ چودھویں کے چاند سے زیادہ حسین تھا"۔ ہند کے اس بیان میں بلاشبہ حضورؐ سے غیر معمولی محبت اور احترام پوشیدہ ہے۔

۲۴۔ تجارت کے بارے میں یہ حقائق کو تجارتی قافلوں کی قیادت کرتے تھے۔ شادی سے قبل محمدؐ نے کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص سائب سے شراکت کی، جو بعد میں بیان کرتا ہے: "میں محمدؐ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ وہ جب سامانِ تجارت

لے کر مکّہ سے باہر جاتے تو واپسی پر وہ میرے سامان کی خرید و فروخت کا مکمل حساب پیش کرتے۔ یہاں تک کہ وہ بیرونِ ملک سے آتے ہی گھر جا کر آرام کرنے یا اپنے اہلِ خاندان سے ملاقات سے قبل ہی میرے پاس آ جاتے۔ اس کے برعکس جب مالِ تجارت لے کر ملک سے باہر جانے کی میری باری ہوتی تو میری وطن واپسی پر وہ میرا استقبال کرتے مجھ سے صرف میری صحت اور تندرستی کے بارے میں دریافت فرماتے۔ وہ مال کے سلسلے میں کبھی ایک حرف زبان پر نہ لاتے۔ مشترکہ کاروبار کے سلسلے میں ہم دونوں کے درمیان کبھی اختلافِ رائے نہیں ہُوا۔"

روحانی تحقیق کا محرک

۲۵ - مکّہ غیر اہلِ کتاب کا مذہبی مرکز تھا۔ مکّی ایک خدا کو تو مانتے تھے مگر ساتھ ہی وہ بُتوں کی پُوجا بھی کرتے تھے جنھیں وہ "خدا کے حضور شفیع" قرار دیتے تھے۔ کعبہ اور حج کعبہ جو اُن کے جدِ امجد ابراہیمؑ نے شروع کیا تھا، جاری تھا، کعبۃ اللہ کی عظمت ہر سُو مسلّم تھی۔ جزیرہ نمائے عرب کے ہر حصّہ سے لوگ ہر سال حج کے لیے مکّہ آتے تھے جس کا ناقابلِ تردید ثبوت ان قبائلی وفود کی فہرست سے ملتا ہے جن سے حضور اکرمؐ نے مدینہ کو ہجرت سے قبل ملاقات کی تھی۔

۲۶ - کعبہ کے اندر اور باہر لاتعداد بُت رکھے گئے تھے۔ ان میں سے ہُبل کو سب سے بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس بت کو کعبۃ اللہ کی چھت پر جگہ دی گئی تھی۔ ہُبل کو فلسطین کے مقام مآب سے لایا گیا تھا۔ اسے خرید کر لایا گیا، کسی نے بطور تحفہ پیش کیا یا کسی اور صورت میں آیا ہمیں علم نہیں۔ یہ پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا تھا اور غالباً دوسرے بتوں سے خُوبصورت تھا۔ روایات کے مطابق کعبہ میں ۳۶۰ بُت رکھے گئے تھے جو غالباً سال کے پُورے دنوں کے مساوی تھے۔ وہاں بعض قبائل کے مخصوص بُت بھی تھے جیسے لات، منات وغیرہ، اور مکّی ان سب کی تعظیم کرتے تھے۔

۲۷ - کہا جاتا ہے کہ مکّہ کے غیر اہلِ کتاب کعبہ میں حج کی نماز ادا کرتے تھے۔ ان میں (مذہبی) رواداری پائی جاتی تھی۔ ہر شخص جس طرح چاہے، رکوع یا سجود کے ذریعے عبادت کر سکتا تھا۔

۲۸ - بُتوں کی پُوجا کے بارے میں بعد میں ایک مسلمان نے بتایا: "قبل از اسلام میں مکّہ میں بطور غلام مقیم تھا۔ میرا آقا ہر صبح مجھے کچھ مکھن اور دُودھ کا ایک جگ دیتا جو مجھے بطور نذر منات کے سامنے رکھنا ہوتا تھا۔ میرا آقا اکثر مجھے متنبہ کرتا "یہ مکھن وغیرہ خود مت کھانا ورنہ بُت تمھیں اس بے حُرمتی کی سزا دے گا۔" خدا کی قسم میں روزانہ دیکھتا تھا کہ جُونہی میں بُت کے سامنے مکھن اور دُودھ رکھ کر پیچھے ہٹتا، ایک کتّا آتا، دُودھ اور مکھن چاٹ کر بُت پر پیشاب کرتا اور چلا جاتا۔"

۲۹ - کعبہ کے سامنے دو بُت تھے، ان میں ایک مرد اساف کا اور دُوسرا عورت نائلہ کا تھا۔ ان کی بابت یہ کہانی مشہور تھی کہ وہ دونوں تخلیہ چاہتے تھے۔ انھیں کوئی اور مناسب جگہ نہ ملی تو وہ کعبہ میں آ گئے اور گناہ کی واردات سے متبرک کعبہ کو آلُودہ کر دیا۔ خدا نے انھیں اسی آن اور اسی جگہ سزا دی اور انھیں پتھر میں بدل دیا۔ بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ ان دونوں کے اجسام جو پتھر بنا دیے گئے تھے کعبہ کے احاطہ میں موجود ہیں تاکہ دُوسرے ان سے عبرت پکڑیں۔ زمانہ

قبل از اسلام میں جہالت اور ضلالت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان دونوں بُتوں کی بھی پُوجا کرتے تھے اور انھیں حاجت روا تصوّر کرتے تھے (غالباً یہ بات غیر ملکیوں کے بارے میں ہے جو ان دونوں بُتوں کی اصل سے ناواقف تھے) بہرحال لوگ وہاں جانوروں کی قربانی کرتے اور ان کا لہو حجرِ اسود پر چھڑکتے تھے۔

۳۰۔ کعبہ کی دیواروں پر روغنی تصاویر بنی ہوئی تھیں، ان میں ابراہیمؑ، اور کنواری مریمؑ کی تصویر بھی شامل تھی جس کی گود میں بچّہ (عیسیٰ مسیحؑ) تھا۔ کعبہ میں ابراہیمؑ کی تصویر کی موجودگی اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل کے مکّی ابراہیمؑ کو جانتے اور ان کی تکریم کرتے تھے۔

۳۱۔ ہر گھر میں بھی الگ بُت یا کوئی اور چیز بطور معبود موجود تھی، جیسا کہ درج ذیل مختصر کہانی سے ظاہر ہے: جب رسولِ خدا نے مکہ فتح کر لیا اور لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ ابُوسفیان کی بیوی ہِندہ بھی وہاں موجود تھی۔ وُہ اپنے گھر میں موجود بُتوں کو مار مار کر توڑ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: "ہم ایک مدّت سے تمہاری بدولت دھوکہ کھاتے رہے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ بھی ظہورِ اسلام سے قبل جب آنحضورؐ سے ان کی شادی ہوئی، رات کو سونے سے قبل بُتوں کی تعظیم بجا لاتی تھیں مگر جب رسولِ خدا نے انھیں بتوں کی بے بضاعتی کے بارے میں بتایا تو انھوں نے اسے ترک کر دیا۔

۳۲۔ عرب میں کعبہ کی خانۂ خدا کے شایانِ شان تکریم کی جاتی تھی۔ دُوسری باتوں کے علاوہ کعبہ کے اندر اور باہر پردے لگائے جاتے تھے جن میں اللہ کا گھر مستور رہتا تھا۔ کعبہ کے متولی ان پردوں کو لوبان وغیرہ جلا کر خوشبو میں بسائے رکھتے تھے۔ ۶۰۵ء میں ایک روز طوفان آیا اور آگ کی چنگاریاں اُڑ کر خانۂ خدا پر گریں جس سے پردوں میں آگ لگ گئی اور کعبہ کی پُوری عمارت جل گئی۔ طوفانِ باد کے بعد موسلا دھار بارش ہُوئی جو آخری ضرب ثابت ہُوئی اور کعبۃ اللہ زمیں بوس ہو گیا

۳۳۔ فطری طور پر (مکّہ کے) لوگوں نے اس مقدّس عمارت کی تعمیرِ نو کا قصد کیا۔ طوفانِ باد نے سمندر کو بھی نہیں بخشا تھا۔ ایک جہاز جو مصری سامان لے کر یمن جا رہا تھا، طوفان میں گھر کر تباہ ہو گیا۔ لیکن اس کے بعض مسافروں کی جانیں کسی نہ کسی طرح بچا لی گئیں۔ جہاز کی تباہی کی اطلاع ملتے ہی مکّہ کے لوگ جہازیوں کی مدد کو پہنچے۔ انھوں نے نہ صرف جہاز کا تباہ شدہ سامان خرید لیا بلکہ جہاز میں لدے ہوئے سامان پر روایتی عشر (کسٹمز ڈیوٹی) بھی معاف کر دیا۔ انھوں نے جہاز کی تباہ شدہ لکڑی تک خرید لی۔ (ان کا خیال تھا کہ جہاز کی لکڑی کعبہ کی چھت تعمیر کرنے کے لیے استعمال ہو سکے گی) جہاز کے مسافروں میں ایک قبطی ترکھان باقوم بھی تھا جس نے کعبہ کی تعمیر میں مدد دینے کی ہامی بھر لی۔

۳۴۔ مکّہ کے ہر شہری کو تعمیرِ کعبہ کے لیے چندہ دینے کو کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ اس متبرک عمارت کی تعمیر کے لیے صرف نیک کمائی سے امداد دی جائے۔ طوائفوں اور سُود خوروں سے کہا گیا کہ وہ تعمیرِ کعبہ کے اخراجات میں حصّہ نہ ڈالیں۔

۳۵۔ مگر تعمیرِ کعبہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ تعمیرِ نو سے قبل رہی سہی عمارت کو گرانا اور ملبہ صاف کرنا ضروری تھا۔ خانۂ خدا کی شکستہ دیوار پر بھی ضرب لگانے کا تصوّر ان لوگوں کے لیے خوفناک تھا۔ مزید برآں کعبہ کے اندر ایک گہرا گڑھا تھا جس

میں زیارتِ کعبہ کو آنے والے افراد نذر نیاز پھینکتے تھے۔ بلسا اوقات بعض عاقبت نااندیش چور بھی خانۂ خدا میں گھس کر اس گڑھے سے جو ہاتھ لگتا چُرا کر لے جاتے۔ اس نوع کا ایک واقعہ ابُو لہب سے بھی منسوب کیا جاتا ہے، جب وہ نوجوان تھا اس کے پاس رقص و شراب کی ایک دعوت کے لیے رقم نہ تھی چنانچہ اس نے کعبۃ اللہ میں چوری کی۔ اس نذر و نیاز کی وجہ سے ایک اژدہا بھی اس گڑھے میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔ جب اس گڑھے کی چھت نہ رہی تو یہ اژدہا وقتاً فوقتاً گڑھے کے کنارے پر آ بیٹھتا جس کے نتیجے میں خوف و ہراس پھیل جاتا۔ انہی دنوں جب لوگوں میں کعبہ کے باقی ماندہ کھنڈرات کو گرانے یا نہ گرانے کے بارے میں صلاح مشورے جاری تھے، ایک مارخور پرندہ کہیں سے آیا وہ سیدھا اژدہا پر جھپٹا اور اسے اٹھا کر آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو گیا۔ اس پر مکّہ کے لوگ بیحد خوش ہوئے۔ جو لوگ کعبہ کے کھنڈرات کو گرا کر صاف کرنے کے حق میں تھے، ان کی پوزیشن بیحد مضبوط ہو گئی۔ انھوں نے کہا "خدا چاہتا ہے کہ ہم اس کے گھر کی تعمیرِ نو کریں، اُسی نے کعبہ کو اژدہا سے نجات دلائی ہے۔" چنانچہ ایک معمر اور معزز مکّی آگے بڑھا اور کعبہ کے کھنڈرات کو صاف کرنے کی غرض سے پہلی ضرب لگائی۔ چند ضربوں کے بعد وُہ ٹھہر گیا اور بولا "آج کی رات انتظار کر لو، اگر کل صبح تک کچھ ظہور میں نہ آیا تو ہم دل و جان سے تعمیرِ نو کا کام شروع کر دیں گے۔" اور حقیقتاً رات کے وقت کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ روایت ہے کہ جب دیواروں کو بنیادوں تک کھود دیا گیا تو نیچے سبز رنگ کا پتھر آ گیا جو دانتوں کی طرح مضبوطی سے بچھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں یہ کعبہ کی بنیاد تھی جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت بھری گئی تھی۔ مکّہ والے اس بنیاد کو نہیں چھیڑنا چاہتے تھے بلکہ اس کی وجہ سے خانۂ خدا کے صحیح طول و عرض اور سمت کا بھی تعین ہو گیا۔ دراصل کعبہ کی دیواریں شمال جنوب اور مشرق مغرب نہیں بلکہ شمال مشرق اور جنوب مغرب میں۔

۳۶۔ مکّہ کے ہر شخص نے ملبہ صاف کرنے اور کعبہ کی تعمیرِ نو میں حصہ لیا البتہ خواتین اس کام میں شریک نہ تھیں۔ رسولِ خدا تعمیر کے لیے پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ وہ اپنے کندھے پر بھاری پتھر رکھ کر لاتے تھے، اُنھوں نے کندھے پر کوئی کپڑا وغیرہ نہیں رکھا تھا جس کے باعث ان کا کندھا زخمی ہو گیا۔ کعبہ کی چاروں دیواروں کی تعمیر کا کام مکہ کے مختلف قبائل کے سپرد کیا گیا تھا۔

۳۷۔ کعبہ کے دروازے کے بائیں طرف ایک کونے پر سیاہ رنگ کا ایک پتھر نصب تھا جو عمارت کے دوسرے تمام پتھروں سے رنگ میں جُدا تھا۔ یہ پتھر طواف کے لیے نقطہ آغاز کا کام دیتا تھا۔ یہ کھوکھلا اور باہر سے بیضوی شکل کا پتھر تھا۔ حجاج (دورانِ طواف) اس پتھر کی طرف ہاتھ اٹھا کر عقیدت سے چُومتے تھے اور کعبہ کے سامنے قربان کیے جانے والے جانوروں کا خون بھی اس پر چھڑکا جاتا تھا۔ یہ پتھر زمین سے کوئی ایک میٹر کی بلندی پر ہے۔ جب تعمیرِ کعبہ کے دوران اس پتھر کو مقررہ مقام پر نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو تنازعہ پیدا ہو گیا کہ اس پتھر کو نصب کرنے کا اعزاز کسے ملنا چاہیے۔ پتھر دو دیواروں کے مقامِ اتصال پر نصب کیا جانا تھا لہٰذا کوئی قبیلہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ پتھر اس کے دائرہ تعمیر میں نصب کیا جائے گا۔ ہر قبیلہ "حجرِ اسود" کی تنصیب کا اعزاز حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ مدِمقابل قبیلہ کو پتھر کی تنصیب سے باز رکھنے کے لیے فریقین نے تلواریں سونت لیں۔ ایک معمر و انشور آگے بڑھا اور لوگوں کے جذبات کو مزید بھڑکنے سے روکتے ہوئے بولا۔ "اس پاک زمین پر خونریزی کیونکر ممکن ہے۔" پھر اس نے تجویز پیش کی کہ اس پتھر کی تنصیب کا

کام اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ کل صبح جو شخص سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں آئے وہ بطور ثالث فیصلہ دے کہ یہ اعزاز کسے حاصل ہو۔ اگلی صبح رسول اللہؐ سب سے پہلے کعبہ میں آئے، ہر شخص نے ان کا خیر مقدم کیا "امین آرہا ہے، امین آرہا ہے۔" جب آنحضورؐ کو اس تنازعہ کا علم ہُوا تو اُنھوں نے ایک چادر منگوائی۔ "حجرِ اسود" کو اس چادر میں رکھا اور کہا کہ تمام قبائل کا ایک ایک نمائندہ آگے بڑھ کر چادر کو اٹھائے۔ یوں حجرِ اسود کو اس مقام تک لایا گیا جہاں اسے نصب کیا جانا تھا تو حضورؐ نے خود پتھر اٹھایا اور معینہ مقام پر نصب کر دیا۔ ہر شخص مطمئن ہو گیا۔ مکہ کے شرفا میں ایک خاندان الجدیر (معمار) کا نام آتا ہے۔ یہی وُہ خاندان ہے جسے کعبہ کی دیکھ بھال اور بوقتِ ضرورت تزئین و مرمت کا کام سونپا گیا۔ یقیناً اس خاندان کے بانی نے کعبہ کی تعمیرِ نو کے کام میں فنی مشورے دیے ہوں گے۔ یہ کام جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ البتہ تباہ شدہ مصری جہاز سے خریدی جانے والی لکڑی کعبہ کی چھت کے لیے پُوری نہ نکلی۔ چنانچہ انھوں نے پُورے خلوص سے فیصلہ کیا کہ کعبہ کا ایک برآمدہ سا ہونا چاہیے جس پر کوئی چھت نہ ہو اور لوگوں کو کعبہ کے اس حصہ میں ہر وقت داخل ہونے کی اجازت ہو جبکہ بقیہ عمارت جس میں دروازہ نصب ہو، سال کے مقررہ اوقات میں ہی کھولی جائے غالباً کعبہ کے اس حصہ میں داخلہ کی فیس مقرر تھی۔ کعبہ کا یہ کھلا حصہ جو حطیم (یا حجر) کہلاتا ہے غالباً وہی گڑھا ہے جہاں قبل ازیں لوگ نذر نیاز پھینکا کرتے تھے۔ یُوں کعبہ ایک چوکور کمرہ بن گیا جس کے ایک طرف نیم مدوّر سی تعمیر بھی موجود ہے جس کے باعث کعبہ "دل" کی طرح معلوم ہوتا ہے کعبہ کے لیے دل کی تشبیہ کوئی حیرت بات نہیں۔ مشہور حدیث قدسی ہے: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نہ تو زمین میں سما سکتا ہُوں اور نہ آسمان میں، البتہ میرا مکان اگر ہے تو قلبِ مومن ہے۔" تو اللہ کا گھر بھی دل کی شکل کا ہی ہونا چاہیے۔ یہ ایک حیرت خیز اتفاق ہے کہ لفظِ "کعبہ" عربی میں مربع اور مدوّر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۳۸۔ کعبۃ اللہ کی عمارت کا بیرونی حصہ اگر ۳۶۰ بتوں سے سجایا گیا تھا تو اس کے اندر دیواریں تصاویر سے مزین کی گئی تھیں۔ یقیناً یہ تصاویر نہایت خوب صورت ہوں گی —— ہم ان کے بارے میں پھر بیان کریں گے —— مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ تزئین کس نے کی تھی۔ ممکن ہے دیواروں پر تصویریں بنانے والا کوئی عیسائی ہو کیونکہ ایک دیوار پر کنواری مریم اور ان کے بیٹے مسیح کی تصویر آبی رنگوں سے بنائی گئی تھی۔ مورخوں کے مطابق فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ نے کعبہ کی دیواروں کو ان تصاویر سے پاک کرا دیا تھا۔ لیکن ان کے بچے کھچے آثار کوئی نصف صدی بعد تک بھی نظر آتے رہے۔ جب عبداللہؓ ابن زبیر نے کعبہ کی عمارت کو گرا کر از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اس پر ایک حیرت انگیز حقیقت کی یاد تازہ ہوتی ہے: بخاری اور دُوسرے ذرائع کے مطابق حجرِ اسود بابا آدمؑ جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابتدا میں اس کا رنگ سفید تھا مگر حجاج میں سے گنہگار افراد کے چھُونے سے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ ابن عبد ربہ نے (العقدُ الفرید میں) اس کی مکمل تفصیل دی ہے۔ وہ روایت کرتا ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: "گناہ گاروں کے ہاتھوں کے لمس اور قربانی کے جانوروں کا خون ڈالے جانے سے (حجرِ اسود کا) رنگ سیاہ پڑ گیا۔" وُہ مزید لکھتا ہے کہ جب عبداللہؓ ابن زبیر کے دور میں کعبۃ اللہ کی عمارت از سرِ نو تعمیر کی گئی تو دیکھا گیا کہ حجرِ اسود در اصل سفید رنگ کا ہے، البتہ اس کا بیرونی مدوّر سرا سیاہ پڑ چکا تھا۔ یہ سیاہ حصہ

تقریباً تین کیوبٹ[1] تھا۔

۳۹ ۔ محمدؐ ۲۵ کے سن کو پہنچ چکے تھے۔ اس وقت اللہ واحد کا پاک گھر لاتعداد بُتوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے حضور پاکؐ کی نیک رُوح کو اس سے صدمہ پہنچا ہوگا۔ چنانچہ وہ اس حقیقت پر غور کرنے لگے کہ آیا خود اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بُت کو خدا اور واجب تعظیم تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد کیا ظہور میں آیا ہم نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں، کہ قرآن (۸ - ۳۵) اُن کے انداز عبادت کو نفرت آگیں لہجے میں "محض ہاتھ باندھنا اور سیٹیاں بجانا" قرار دیتا ہے۔ (بعض خانقاہوں میں آج بھی بت پرستی میں یہ عناصر موجود ہیں۔ شور مچانے اور ہاتھ باندھنے کا مقصد [illegible]ں کو ڈرا کر بھگانا لیا جاتا ہے)۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زید ابن عمرو ابن نوفل جو عمر ابن الخطاب کے اعزہ میں سے تھے، جیسے حق کے متلاشی نے نہ صرف بت پرستی ترک کر دی تھی بلکہ وہ بُتوں کو پیش کی جانے والی قربانی کے جانور کا گوشت کھانا بھی حرام تصور کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: "اے خدا! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تجھے کون سا انداز بندگی پسند ہے تو میں وہی انداز اختیار کروں۔ لیکن چونکہ میں لاعلم ہوں تو میں تیرے سامنے سجدہ کو ترجیح دیتا ہوں، وہ بھی اس حالت میں کہ میرا چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین پر رکھی ہوں۔"

۴۰ ۔ محمدؐ زید کے قریبی دوست تھے۔ وہ مذہبی اور روحانی امور پر خود غور و فکر کے ساتھ دوستوں سے بھی تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ ہمیں ان مذہبی مباحث کی تفصیل معلوم نہیں۔ مگر روایت ہے کہ آنحضورؐ جن دوستوں کے پاس اکثر آتے جاتے تھے ان میں ایک عیسائی غلام عداس بھی تھا جو اپنے آقا کی دُکان چلاتا تھا (واضح رہے کہ خود رسولِ خداؐ بھی تاجر تھے)۔

۴۱ ۔ جب (مذہب کے معاملہ میں) حضورؐ کی بے چینی بڑھی تو انھوں نے رمضان کا پُورا مہینہ مشہور غارِ حرا میں گزارنے کا فیصلہ کیا جو مکّہ کی نواحی پہاڑی جبل النّور میں واقع ہے۔ (یہ بات حیرت انگیز ہے کہ حرا کے معنی "تحقیقات" اور جبل النور کے معنی "روشنی کا پہاڑ" ہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ نہ صرف رسولِ خدا کے دوست زید ابن عمرو ابن نوفل بلکہ حضورؐ کے دادا عبد المطلب بھی کبھی کبھار عبادت کے لیے غارِ حرا میں چلے جایا کرتے تھے۔ رسولؐ خدا نے کچھ کھانے پینے کا سامان ساتھ لیا اور غارِ حرا میں چلے گئے۔ اس سامان میں سے وہ قریب سے گزرنے والے مسافروں کی خدمت بھی کرتے رہے۔ پھر ان کی محبوب اہلیہ بی بی خدیجہؓ بھی وقتاً فوقتاً کھانے پینے کا سامان غار میں پہنچاتی رہیں۔ ایک ماہ تک (غار میں) غور و فکر کے بعد، جس کی کوئی تفصیل ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ حضورؐ واپس آ گئے۔ انھوں نے واپسی پر سب سے پہلے کعبہ کا سات بار طواف کیا اور پھر اپنے گھر گئے۔

۴۲ ۔ غارِ حرا میں اس قیام سے حضورؐ کو اتنی مسرت حاصل ہوئی کہ انھوں نے اسے اپنا سالانہ معمول بنا لیا ہم متواتر پانچ سال تک دیکھتے ہیں کہ آنحضورؐ سال میں ایک بار دنیاوی زندگی حتیٰ کہ بال بچوں سے بھی علیحدگی اختیار کر کے ایک ماہ کے لیے غارِ حرا میں چلے جاتے، جہاں وہ یکسوئی سے خدا کی عبادت کرتے اور ان سوالات پر غور و فکر کرتے جو

---

[1] ایک قدیم پیمانہ جو ۱۸ سے ۲۲ انچ تک ہوتا تھا۔ (مترجم)

ان کے ذہن میں پیدا ہوتے۔ ممکن ہے وہ سوال یہ ہوں، کائنات کا خالق کون ہے؟ انسانی زندگی کا مقصد وحید کیا ہے؟ اور بعد از مرگ کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ۔

۴۳۔ خوش قسمتی سے مجھے اس غار کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہے۔ جبل النور مکہ کے شرقی نواح میں شہر کے وسط سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ حجاج جب منیٰ میں جاتے ہیں تو یہ پہاڑی ان کے بائیں ہوتی ہے۔ یہ مخروطی شکل کی بلند پہاڑی ہے جو آس پاس کے سلسلۂ کوہ سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ جدہ سے مکہ آنے والے بھی جبل النور کو دیکھتے ہیں اور اس کی بلندی سے متاثر ہوتے ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ پہاڑی پر چڑھائی کے دوران میں نے ایک چھوٹا سا حوض دیکھا جو چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ حوض ترکوں کی عملداری میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جب کبھی بارش ہوتی ہے تو یہ حوض پانی سے بھر جاتا ہے جو کچھ عرصہ تک جنگلی جانوروں کے پینے کے کام آسکتا ہے۔ غارِ حرا پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور ایسی چٹانوں سے عبارت ہے جو ایک دُوسری کے اُوپر کھڑی ہیں۔ اس کے اندر سے مٹی بھر چکی ہے اور بڑے بڑے پتھر اس کی دیواروں اور چھت کا کام دیتے ہیں۔ اندر سے غار اتنی بلند ہے کہ اس میں سیدھا کھڑا ہونا ممکن ہے۔ غار کا طول و عرض بھی اتنا ہے کہ ایک انسان اس میں سہولت سے لیٹ سکتا ہے اور سو سکتا ہے۔ غار کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہے۔ قدرتی طور پر اس کا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف ہے۔

۴۴۔ مکہ وسیع المشرب شہر تھا، گو وہاں بُت پرستوں کی اکثریت تھی مگر وہاں ایسے افراد بھی تھے جو "سچائی" کی تلاش میں دہریے ہو گئے یا عقلیت پسندی وغیرہ کے چکر میں پڑ گئے۔ مکہ میں دو افراد کے عیسائیت قبول کرنے کی روایت بھی ملتی ہے اُن میں سے ایک تو بازنطینی عیسائیوں کی مدد سے مکہ کی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دُوسرا خود کو غسان کے ظالم حکمران سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ مکہ کے ملحدوں کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ وُہ ایک خدا پر یقین رکھتے تھے۔ مگر محشر اور یومِ قیامت پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔ محمدؐ ابھی جوان ہی تھے، ان کی عمر صرف ۲۵ سال اور ان کی محبوب زوجہ کی ان سے کوئی تین سال زاید تھی۔ لیکن حضورؐ کے دل میں الہیاتی علم کی پیاس روز بروز بڑھ رہی تھی۔ حضورؐ کی طبع گرامی میں اس تبدیلی کے بعد بی بی خدیجہؓ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۴۵۔ رسولِ خدا کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انہی دنوں جب حضورؐ روحانی طور پر متحرک تھے اور ان کا بیشتر وقت عبادت اور غور و فکر میں گزرتا تھا، انھیں غیر معمولی تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی عقب سے انھیں پکار رہا ہے، اور جب وُہ پلٹتے تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا۔ وہ جب درختوں اور چٹانوں کے پاس سے گزرتے تو شجر و حجر انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے محسوس ہوتے۔ قدرتی طور پر آنحضورؐ خوفزدہ سے رہنے لگے۔ یہ انہی دنوں کی کیفیت ہے جب انھیں غارِ حرا میں قیام کرتے کئی سال گزر چکے تھے۔ دراصل یہ سب کچھ اس عظیم لمحہ کی تیاریوں کا ایک حصہ تھا جو رسولِ خدا پر وارد ہونے والا تھا یعنی نزولِ وحی، جس کے ذریعے ان پر اللہ کا کلام نازل ہونا تھا، جس کا عام انسان جو عام سی مادی زندگی گزار رہا ہو متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یُوں ابن اسحاق کی درج ذیل روایت کی پُر مغز توجیہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جو اس نے

پہلی وحی کے بارے میں بیان کی ہے :

اللہ کا جدید ترین منشور

۴۶ ۔ رسولِ خداؐ کو متواتر غارِ حرا میں جاتے پانچواں سال تھا ۔ یہ ماہِ رمضان کے آخری دن تھے ۔ ایک رات جب حضورؐ غار میں محوِ استراحت تھے ، انھوں نے انتہائی عجیب خواب دیکھا ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ اُن سے ملاقات کے لیے آیا جس کے پاس ایک دستاویز تھی جو سلک کے قیمتی کپڑے میں ملفوف تھی ۔ اس فرشتے نے کہا : " اے محمدؐ ! میں جبرائیل ہوں ، خدا نے اپنا پیغام آپ تک پہنچانے پر مجھے مامور کیا ہے ۔ اسے پڑھیے " " مگر میں تو اُمّی ہُوں اور پڑھ نہیں سکتا " حضورؐ نے جواب دیا ۔ اس پر جبرائیلؑ نے حضورؐ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور انھیں اس زور کے ساتھ دبایا کہ حضورؐ نے سوچا کہ اُن کا دم گھُٹ جائے گا ۔ پھر جبرائیلؑ نے انھیں چھوڑ دیا اور دوبارہ کہا " اسے پڑھیے " حضورؐ نے پہلے والا جواب دُہرایا تو جبرائیل نے پھر حضورؐ کو بازوؤں میں لے کر پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ بھینچا ۔ پھر انھیں چھوڑ کر تیسری بار پڑھنے کو کہا ۔ مگر آنحضورؐ کا جواب حسبِ سابق تھا ۔ فرشتوں کے سردار نے تیسری بار رسولِ خداؐ کو انتہائی شدت سے اپنے بازوؤں میں دبایا اور پھر چھوڑ کر کہا :

> " پڑھو اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ ، جس نے پیدا کیا ، جس نے انسان کو
> خون کے ایک قطرے سے پیدا کیا ، پڑھ اور تیرا پروردگار بہت بڑا کرم کرنے والا ہے
> جس نے سکھایا ساتھ قلم کے ، سکھایا انسان کو جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا ۔ "

(القرآن ۹۶/۱-۵)

۴۷ ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کا پہلا نزول ۲۷ رمضان کو ہوا ۔ لیکن آنحضورؐ کے ایک عظیم سوانح نگار السہیلی نے جس روایت کو ترجیح دی ہے اس کے مطابق اوّل نزولِ وحی پیر ، ۱۷ رمضان المبارک ۱۳ ق ھ[1] بمطابق ۲۲ دسمبر ۶۰۹ء کو ہوا ۔

۴۸ ۔ کیا رُوح پرور تصور ہے ۔ ایک اُمّی مگر نہایت دیانت دار اور پاکباز تاجر کو علم و فضل کا پیغمبر قرار پانا تھا ، اور منکشف کرنا تھا کہ ہر تہذیب اور ثقافت کی ترقی و بقا کا راز قلم اور تحریر میں مضمر ہے ۔ اگر پرانے تصورات معلوم ہو جائیں تو آنے والے ان میں نئے نظریات کا اضافہ کرتے ہیں اور افراد کے اجتماعی تجربات انسانیت کے عروج کا نشان ہیں جو اسے باقی مخلوق سے ممتاز کرتے ہیں ۔

۴۹ ۔ ہمارے ذرائع معلومات کے مطابق پھر جبرائیل نے ایک چٹان پر پاؤں مارا جس سے چشمہ اُبل پڑا ——— خواب جاری ہے ——— پھر اس نے حضورؐ کو وضو کرنا سکھایا ، اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح دو رکعت نماز کے ساتھ اللہ کی بندگی

---

[1] قبل از ہجرت

کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر وہ غائب ہو گیا۔

۵۰۔ محمدؐ بیدار ہوئے، وہ اس قدر خوف زدہ تھے کہ انھوں نے فوری طور پر واپس گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر کی سرد رات ایک اور وجہ تھی جس کی بنا پر انھوں نے اچانک گھر لوٹتے ہی اپنی زوجہ مطہرہ سے کہا "مجھ پر کمبل ڈال دو، مجھ پر کمبل ڈال دو۔" بالآخر جب ان کے حواس بجا ہوئے تو انھوں نے غار میں پیش آنے والے واقعات سے اپنی اہلیہ کو آگاہ کیا اور کہا: "مجھے خدشہ ہے کہ میں بھی ان کاہنوں اور نجومیوں میں شامل ہو گیا ہوں جن سے مجھے سخت نفرت ہے۔" محبت کرنے والی بیوی نے اپنے شوہر کو دلاسہ دیا اور یہ کہہ کر ڈھارس بندھائی کہ "آپ ہر حاجت مند اور غریب سے محبت، شفقت اور فیاضانہ سلوک کرتے رہے ہیں خدا آپ کے ساتھ ہے یقیناً اللہ آپ کو شیطان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

۵۱۔ اگلی صبح کو وہ حضورؐ کو اپنے عم زاد ورقہ ابنِ نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائی تھے ——— ایک اور روایت کے مطابق بی بی خدیجہؓ نے حضورؐ کو ابوبکرؓ کے ساتھ معمر دانشور ورقہ کے پاس بھیجا ——— ابوبکرؓ آنحضورؐ سے (غالباً کسی تجارتی معاملہ میں) ملاقات کے لیے آئے تھے ——— جب رسولِ خدا نے ورقہ کو پیش آمدہ واقعات سے آگاہ کیا تو وہ بے اختیار پکار اٹھا: "قدیس فوق قدیس، قدیس فوق قدیس۔ اگر آپؐ نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تو پھر آپ اُسی تجربہ سے گزرے ہیں جس سے وادیِ سینا کے پہاڑ پر موسیٰؑ دوچار ہوئے تھے اور جہاں انھیں تورات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اگر میری زندگی مزید کچھ عرصہ وفا کرے، جب آپ کے لوگ آپ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑیں گے، اللہ کی قسم میں آپ کا ساتھ دوں گا اور آپ کی مدافعت کروں گا۔" "کیا وہ اس (تجربہ) پر مجھے ظلم کا نشانہ بنائیں گے؟" رسولِ خداؐ نے نہایت بھولپن سے پوچھا۔ ورقہ نے جواب دیا: "پیغمبر کی مخالفت ضرور کی جاتی ہے۔"

۵۲۔ آہستہ آہستہ حضورؐ پرسکون ہو گئے۔ پھر غارِ حرا کے تجربہ کے بارے میں غور و فکر ان کے لیے باعثِ مسرت بن گیا۔ پھر انھیں جبرائیل کی آمد کا انتظار رہنے لگا۔ وہ اسی واردات کو پھر محسوس کرنا چاہتے تھے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا ان کا اشتیاق تشویش کا روپ دھارنے لگا۔ تین سال کا طویل عرصہ گزر گیا تو مایوسی نے انھیں گھیر لیا۔ مخالفین طعن و تشنیع سے زخموں پر نمک چھڑکنے لگے۔ ایک معمر عورت نے جو حضورؐ سے سخت نفرت کرتی تھی اور جو ان کے چچا ابولہب کی اہلیہ تھی یہاں تک کہہ دیا کہ "تمھارے شیطان نے تمھیں ٹھکرا دیا ہے اور وہ تم سے ناراض ہو گیا ہے۔" یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ صبر کا دامن حضورؐ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، وہ جذبات کی رَو میں بہہ گئے اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ایک پہاڑی کی آگے کو بڑھی ہوئی چٹان پر چڑھ گئے تاکہ ناقابلِ برداشت حد تک دُکھی زندگی کا خاتمہ کر سکیں، جیسا کہ بخاری نے روایت کی ہے، عین اس وقت جبرائیل ظاہر ہوا اور بولا: "نہیں، آپ خدا کے پیغام بر ہیں، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بھولے نہیں، صرف اتنی سی بات ہے کہ آپ اللہ پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتے۔" پھر جبرائیل نے قرآن پاک کی یہ آیات حضورؐ کو پہنچائیں:

"قسم ہے چڑھتے دن کی اور رات کی جب (وہ) ڈھانپ لے (ہر چیز کو)، نہیں چھوڑ دیا تیرے رب نے

> تجھ کو اور نہ ہی (تجھ سے) نفرت کرتا ہے اور البتہ جو بعد میں ہوگا (آخرت میں) بہتر ہے تمھارے لیے موجودہ (زندگی) سے، اور البتہ تمھارا رب عطا کرے گا تمھیں جلد پس تم راضی ہو جاؤ گے، کیا نہیں پایا اس نے تمھیں ایک یتیم اور پھر فراہم کیا (تمھارے لیے) ٹھکانا اور پایا تجھے اپنی محبت میں خود رفتہ اور پھر تمھیں (سیدھی) راہ دکھائی اور پایا تجھ کو حاجت مند (دوسروں کا) اور پھر غنی (بے نیاز) کیا (دوسروں سے) پس جو یتیم ہو اس پر ظلم مت کر اور جو سائل ہو اسے مت ڈانٹ (بھگا) اور تیرے پروردگار نے (تمھیں) جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا ذکر کر۔" (قرآن ۹۳/۱-۱۱)

"اور تیرے پروردگار نے (تمھیں) جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا ذکر کر" یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ لوگوں کو ایمان اور نیکی کی طرف بلاؤ۔ اس سے بڑی فیاضی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس راستے کی نشان دہی کر دی جائے جو اس (خدا) کی طرف جاتا ہے صرف خدائے واحد پر ایمان اور غیر اللہ کو مسترد کرنا ایک طرف، خیرات، فیاضی، کمزوروں اور ناداروں کی امداد دوسری طرف۔ یہ دونوں "قطب" تھے جن میں اسلام کا کرہ قائم ہونا تھا۔ اور محمد رسول اللہؐ اس عظیم کام کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ دنیا میں ایک نیا دین وجود میں آ گیا

باب ۲

نیا دین کیوں ؟

۵۳ - آئیے ہم ذرا ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کریں کہ دنیا میں اتنے ڈھیر سارے ادیان کی موجودگی میں نئے دین کی کیا ضرورت تھی ؟

۵۴ - مذہب ، اگر عام لوگوں کے لیے نہیں تو کم از کم نیک نہاد افراد کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے ۔ انسان کے بے تابانہ سوالوں کا جواب صرف اور صرف مذہب ہی فراہم کرتا ہے : میرا خالق کون ہے ؟ اس نے آخر مجھے کیوں تخلیق کیا ؟ موت کے بعد میرا کیا بنے گا ؟ وغیرہ ۔ گو لوگوں کی مختصر تعداد ان سوالات کی تحقیق و جستجو کو اپنی زندگی کا مقصد گردانتی ہے مگر یہ سوالات زندگی کے کسی مرحلے میں ہر شخص کے ذہن میں پیدا ضرور ہوتے ہیں ۔ ان سوالات کا تعلق ناقابلِ ادراک اور ماورائی امور سے ہے ۔

۵۵ - روزِ ازل سے گر نہیں تو ایک طویل عرصہ سے انسان کو اس بات کا ادراک ہے کہ وہ خود اپنا خالق نہیں ہے ۔ اس کے والدین یا ان کے والدین کے سوا بھی کوئی ہستی ضرور ہے جس نے اسباب و علل کی یہ کائنات تخلیق کی ۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انسان اسے دیکھ نہیں سکتا ، مگر اسے واجب الوجود تسلیم کرنے پر مجبور ہے ۔ انسان نے جلد ہی یہ راز بھی پالیا کہ تمام انسان یکساں صلاحیتوں کے مالک نہیں اور نہ ہی ان کی عادات و اطوار میں یکسانیت ہے ۔ ایسے لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہے جو بے لوث ، مخیّر ، صادق اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے ہوں اور جن کی فطرت ہی راہِ خدا میں ان کی رہنمائی کرتی ہے اور اس جد وجہد میں ان کا تحفظ کرتی ہے ۔ اگرچہ چند مفاد پرست انھیں اللہ کے پیغمبروں کی رہنمائی کرنے سے روکتے ہیں ، تو دوسری طرف بتدریج لوگوں کی بڑی تعداد ان کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے جو بسا اوقات ان کی حمایت میں لڑنے مرنے پر بھی تیار ہو جاتی ہے ۔ باعث انحطاط ذلت سے گلو خلاصی کے لیے نئی کوششوں اور نئی نسلوں کے افراد کی از سرِ نو جد وجہد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ نوعِ انسانی کا پُرانا ریکارڈ ہم تک نہیں پہنچا ۔ مذہب کے شعبہ میں نئی نسلوں کو جو کچھ (پرانی نسلوں سے) ملا ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں انسانوں کی رہنمائی کے لیے آنے والے کہتے تھے : میں خدا کا ، تمھارے خالق کا پیام لایا ہوں جو اس نے مجھ پر نازل کیا ہے تاکہ میں اِسے تم تک پہنچا سکوں ۔

۵۶ - ابن العربی[1] نے " فتوحاتِ مکیہ " میں رسولِ خدا کی ایک دلچسپ حدیث نقل کی ہے ۔ فرماتے ہیں : " دُنیا میں

---

[1] اسلام کے عظیم فلاسفر محی الدین ابنِ عربی صاحبِ " فتوحاتِ مکیہ "

ایک لاکھ آدم ہو گزرے ہیں اور ہم ان میں سے سب سے آخری کی اولاد ہیں۔" ایک اور دلفریب روایت ہے: "ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے کہا: مجھے اپنا کوئی معجزہ دکھائیے۔ خدا نے موسیٰؑ کو ایک خاص مقام پر پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ ایک صحرا تھا جہاں کوئی متنفس نہ تھا صرف ایک گڑھا تھا۔ موسیٰ نے گڑھے میں ایک کنکری پھینکی۔ اچانک گڑھے میں سے آواز آئی: "کون ہو بھئی؟" موسیٰؑ نے اپنا تعارف کرایا اور آدم تک اپنا شجرۂ نسب بیان کیا —— اور موسیٰؑ کو اپنے وسیع علم پر فخر تھا —— مگر اسی نظر نہ آنے والے کی آواز آئی "تم کس آدم کی بات کرتے ہو، کیونکہ ہر دس ہزار سال بعد کوئی نہ کوئی یہاں آتا ہے اور اس گڑھے میں ایک کنکری پھینکتا ہے جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو وہ بالکل وہی نام اور نسب بیان کرتا ہے جو تم نے کیا ہے اور یہ گڑھا ان کنکریوں سے بھرا جا رہا ہے۔"

۵۷ ۔ سو ہزار آدم! نوعِ انسانی لاکھ بار صفحۂ ہستی سے محو ہوئی اور پھر وجود میں آئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہم اپنے آدم کی طرف آتے ہیں۔ اسلامی روایات کے مطابق ان پر الہامی کتابوں کا نزول ہوا ہے۔ اور ایک حدیث رسولؐ سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ آدم کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزرے ہیں۔ اور وہ (رسول اللہ) آخری نبیؐ ہیں۔ سبھی پیغمبروں نے خدا کی وحدانیت کی ازلی صداقت اور حیات بعد ازممات کی تبلیغ کی ہے۔

۵۸ ۔ ہم حضرت آدمؑ یا ان کے بیٹے حضرت شیثؑ پر نازل ہونے والی کتب کے مندرجات سے لاعلم ہیں۔ ہم تک جو قدیم ترین ریکارڈ پہنچا ہے وہ حنوک کے بارے میں ہے جنھیں ہم حضرت ادریسؑ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اسلامی روایات میں انھیں تحریر کا موجد بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ "عہد نامہ جدید" میں یہودہ کے خط کے مطابق:

> "ان کے بارے میں حنوک (ادریس) نے بھی پیشگوئی کی تھی جو آدم کی ساتویں پشت میں تھے۔ انھوں نے کہا "دیکھو خداوند اپنے لاکھوں مقدسوں کے ساتھ آیا ہے تاکہ سب آدمیوں سے انصاف کرے اور سب بے دینوں کو ان کی بے دینی کے ان سب کاموں کے باعث جو اُنھوں نے بے دینی سے کیے ہیں، اور ان سب سخت باتوں کے سبب جو بے دین گنہگاروں نے اس کی مخالفت میں کہی ہیں قصوروار ٹھہرائے۔"

مسیحی شارحین کے مطابق اس خط میں کسی آنے والے کے متعلق پیش گوئی کی گئی ہے تاہم حنوک کی باقیماندہ تعلیمات ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

۵۹ ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں متداول ادیان زرتشت، برہمنیت (ہندومت)، بدھ مت، صابئیت، یہودیت اور عیسائیت تھے جو دوسرے مذاہب سے زیادہ اہم اور ملکی عوام کے لیے آسانی سے قابلِ رسائی تھے۔ ان مذہبوں کو آسمانی اور انسانوں کی جاری کردہ اصنام پرستی نیز دہریت سے بہتر تصور کیا جا سکتا تھا۔ مگر ان مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب پیغمبرِ اسلام کے حقیقت پسند ذہن کو کیوں مطمئن نہ کر سکا؟

زرتشتی مذہب

۶۰ ۔ اُس دور میں رائج مذاہب میں سے زرتشتی (یا زردشتی) مذہب غالباً قدیم ترین تھا مگر مکہ میں اس مذہب کا پیرو کار کوئی نہ تھا، تاہم مشرقی اور جنوبی عرب میں بہت سے زرتشتی

(آتش پرست) آباد تھے، جہاں مکہ کے تجارتی قافلے بکثرت آتے جاتے تھے۔ زرتشت کی کتاب "اوستا" جو "زندی" زبان میں تھی ناپید ہو چکی تھی بلکہ اوستا کی شرح جو بہت بعد میں "پازند" زبان میں لکھی گئی تھی، اور جس کے اوراق جستہ جستہ ہم تک پہنچے ہیں نہ صرف نظرانداز ہو چکی تھی بلکہ زرتشتوں اور مزدکیوں کے درمیان مذہبی جنگوں میں تباہ ہو چکی تھی۔ ممکن ہے زرتشت ایک خدا "اہورا — مزدا" — کی تعلیم دیتا ہو، لیکن عرب اسے ثنویت[1] اور نوید ولداس (تزویج محرمات[2]) کا بانی تصور کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ عقاید اس مذہب کی حقیقی تعلیمات میں شامل نہ ہوں، مگر ساتویں صدی عیسوی کے اوائل تک یہ مذہب اتنا بگڑ چکا تھا کہ اس نے آگ کی پوجا کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کے پیرو کار دو خداؤں یزدان (نیکی کا خدا) اور اہرمن (بدی کا خدا) پر ایمان رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ان دونوں خداؤں کے درمیان مسلسل جنگ جاری ہے۔

۶۱۔ چنانچہ مذاہب کے بارے میں آنحضورؐ کا رویہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان کے دل میں خدا کی تعظیم اس قدر تھی کہ وہ یہ تصور ہی نہ کر سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ "بدی" پیدا فرما سکتے ہیں۔ مگر ثنویت میں اہرمن کا جو تصور ہے اس کے مطابق دو خداؤں میں مسلسل جنگ جاری ہے جس میں فتح عموماً یزدان کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خالق کو بواسطہ خوش کرنے کے لیے اس کی تخلیق کی تعریف بیان کی جائے۔ آنحضورؐ کے وقت میں آگ سے زیادہ طاقتور کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ ہر چیز کو جلانے اور تباہ کرنے پر قادر تھی۔ چنانچہ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کا ایک مظہر تصور کیا جا سکتا تھا ان کے خیال میں آگ کی تعظیم دراصل اس کے خالق کو تعظیم دینے کے مترادف تھی اور یہی تو بت پرستی تھی۔ حتیٰ کہ قدیم سے قدیم اور کٹر سے کٹر بت پرست کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا بت اس کا خدا ہے بلکہ وہ اسے خدا کی علامت، اس کے کسی وصف کا اظہار یا مظہر ہی تصور کرتا ہے۔ حقیقی رشتہ داروں کے درمیان شادی کو ہمیشہ ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت آدم جو اس دنیا کے پہلے انسان تھے اور جن کی اہلیہ ہمیشہ دو بچوں کو جنم دیتی تھیں، ایک حمل کی لڑکی کی شادی دوسرے حمل کے لڑکے سے کرتے تھے۔ ایک ہی حمل سے پیدا ہونے والے بہن بھائی کی شادی نہیں کی جاتی تھی۔ اور بعد کی نسلوں میں عم زاد بہنوں یا دور کی رشتہ دار لڑکیوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اگر جڑواں بہن بھائی کے درمیان شادی رواج پا جاتی تو نسل انسانی پرندوں اور چوپایوں کی نسلوں کی طرح غیر متحرک ہو کر رہ جاتی اور توام پیدائش معمول بن جاتی۔ چنانچہ انسانی ذہن کا ارتقا اور بلندی دور پار کے رشتہ داروں کے درمیان باہمی ازدواج کی مرہون منت ہے۔ کچھ بھی ہو، زرتشتوں (مجوسیوں، پارسیوں اور مزدکیوں) کا تزویج محرمات ایک ایسی اختراع تھی جسے قابل نفرت تصور کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے پورے زرتشتی مذہب کی مذمت کی جاتی تھی۔ وہ جس انداز میں جانوروں کو ذبح کرتے تھے عرب اس سے بھی نفرت کرتے تھے۔

---

[1] وہ عقیدہ جس میں دو مستقل جوہر پائے جاتے ہیں مثلاً اہرمن اور یزدان۔

[2] ایک عقیدہ جس کے مطابق حقیقی بہن، بیٹی اور ماں سے شادی کسی اور سے شادی کی نسبت بہتر اور بہتر تصور کی جاتی ہے۔

۶۲ - جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ زرتشت ایک خدا، فرشتوں، اللہ کے منتخب بندہ کے لیے الہام (یا وحی) جنّت اور دیگر امور پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کی کتاب اویستا جو "ژند" زبان میں تھی کے ایک قول کے مطابق (یشت ۱۳- XX VIII - ۱۲۹) اس نے ایک بُت شکن کی آمد کی پیشگوئی کی ہے جس کا نام سوشیانت (سب پر رحم کرنے والا) اور استوات اریات (لوگوں کو پستی سے بلندی پر پہنچانے والا) ہوگا۔

برہمنیت (ہندومت)

۶۳ - قرآن حکیم میں براہِ راست ہندوستانی برہمنیت کا ذکر نہیں آیا۔ اور درحقیقت پیغمبرِ اسلام کے ظہور کے وقت ہندومت اور اس کے مدِمقابل مذہب بدھ مت کے دوران موت وحیات کی کشمکش جاری تھی۔ پیغمبرِ خدا ہندوستانیوں کو تو ضرور جانتے تھے مگر یہ کہنا محال ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہب کے بارے میں بھی کچھ جانتے تھے۔ قرآن حکیم میں یہودیوں کے طلائی بچھڑے کی جو داستان بیان کی گئی ہے اس کے مطابق اس گوسالہ کا خالق سامری نام کا ایک زرگر تھا (بائبل کا یہ کہنا کہ اس گوسالہ کا خالق حضرت موسیٰؑ کا بھائی ہارون تھا درست نہیں) اسی ضمن میں چھوت چھات کا بھی ذکر آتا ہے (قرآن ۲۰/ ۸۵-۹۷) یہ دونوں (گاؤ پوجا اور چھوت چھات برہمنیت کے خواص ہیں۔ سامری ان کے سرداروں کا ایک گروہ ہیں اگر گاؤ پوجا ان کی نمایاں خصوصیت ہے تو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے چھوت چھات کا غیر انسانی تصور بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ پھر قرآن پاک زبرالاولین (قدیم لوگوں کی حکایات پر مبنی کتب) کا بھی ذکر کرتا ہے (۲۶/ ۱۹۶) یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ ہندو برہمنوں کی متعدد مذہبی کتب ہیں وہ ان سب کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ ان میں پُران (جس کے لغوی معنی قدیم کتاب کے ہیں) بھی شامل ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ اور ہندوستانی شہزادے رام کی کہانیوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ ابراہیمؑ کو ان کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ جب وہ اپنی اہلیہ سارہ کے ساتھ مصر پہنچے تو وہاں کے بادشاہ نے جو ایک بد اخلاق ظالم تھا، سارہ کو زبردستی اٹھوا لیا اور اپنے محل لے گیا۔ مگر ایک معجزے کی بدولت سارہ کی عزت بچ گئی اور وہ شاہی تحائف کے ساتھ واپس اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ مصری بادشاہ کی بیٹی حاجرہ بھی تھی جو آگے چل کر حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ بنی۔ انجیل کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا اصل نام "ابرام" تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ابراہیم (بابائے قوم) کا خطاب دیا تھا۔ ہندوستانی شہزادہ رام کو بھی اس کے باپ نے ملک سے نکالا تھا۔ جب وہ جنگل میں جلاوطنی کے دن پُورے کر رہا تھا تو سیلون (لنکا) کا بادشاہ (راون) اس کی خوبصورت بیوی سیتا پر عاشق ہوگیا اور اسے زبردستی اغوا کر کے لے گیا۔ سیتا بھی اپنی عزت بچانے میں کامیاب رہی۔ اس نے بعد میں ایک بڑی آگ میں سے صحیح وسلامت گزر کر ثابت کر دیا کہ وہ عفت مآب تھی۔ (ابراہیمؑ بھی آگ سے محفوظ رہے تھے) "پُران" کے علاوہ برہمنوں کی مذہبی کتابوں کے ایک سیٹ کو "وید" کہا جاتا ہے جس کا مصنف (بقول ان کے) برہما (خدا) ہے۔ ابراہیمؑ کی کتابوں کا تو قرآن میں بھی ذکر ہے اور برہما اور ابراہیمؑ کے درمیان نمایاں مشابہت پائی جاتی ہے۔ میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا انجیل میں مذکور قُضَاۃ (خداوند کی جنگوں) کی کتاب (تعداد ۲۱/ ۲۴) کو مہابھارت اور گیتا میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے؟

۶۴ - بہرحال، برہمنیت کے پجاری گو ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں مگر وہ خدا کے مظاہر کی بھی پُوجا کرتے ہیں خواہ وہ اس کی تخلیق ہو یا اس کی کسی خصوصیت کا اظہار ہو۔ برہمنوں کے مطابق دیوتاؤں کی تعداد چالیس کروڑ ہے ——— دیوتاؤں کی تعداد ان کے پجاریوں سے زائد ہے ——— اور گائے دیوتاؤں کے اس ہجوم کی سردار ہے۔ وہ اگر جانوروں مثلاً ناگ اور ہنومان (بندر) کی پُوجا کرتے ہیں تو وہ درختوں، پتھروں، دریاؤں، (دریاؤں کے) منبع اور سنگم، سورج، چاند اور لاتعداد دُوسری اشیا کے سامنے بھی سر جھکاتے ہیں۔ پھر وہ علم، موت اور دولت وغیرہ کو بتوں کی صورت میں بطور دیوتا پیش کرتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔

۶۵ - سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ برہمنیت ایک خاندان (برہمن) تک محدود ہے اور کوئی دُوسرا شخص ہندو نہیں ہو سکتا۔ وہی ہندو کہلانے کا حقدار ہے جو ہندو خاندان میں جنم لے۔ اس مذہب کا ایک مخصوص پہلو عقیدۂ تناسخ (اواگون) ہے۔ ایسے شخص کے لیے، جو کسی عالمگیر مذہب کا جویا ہو، ایسا مذہب جو پوری انسانیت کو اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دے سکے، ہندومت (برہمنیت) کی طرف رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۶۶ - دوسرے قدیم مذاہب کی طرح ہندومت بھی کسی آنے والا کا منتظر ہے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی کتاب اتھر وید میں اِس آنے والا کا نام نری شنسا استی وشیاتی یعنی محمود جس کی تعریف و توصیف کی جائے' بتایا گیا ہے۔ اس کی گاڑی کو اُونٹ کھینچیں گے وہ اتنی تیزی سے رواں دواں ہوں گے کہ وہ آسمان کو چھُو رہے ہوں گے، وغیرہ۔ ہندوؤں کی ایک اور کتاب وشنو پُران کے باب ۲۴ میں کہا گیا ہے کہ ویدوں (حقیقی علم کی کتب) کی تعلیمات پسِ پُشت ڈال دی جائیں گی، قانونی ادارے عضوِ معطل ہو کر رہ جائیں گے اور تاریک دَور کا انجام قریب ہو گا تو خدا کا آخری اوتار ایک جنگجو کی شکل میں آئے گا۔ وہ سنبلہ دِیپ (ریت کا جزیرہ) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہو گا۔ اس کے باپ کا نام وشنو یاسا (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ ——— جس پر ہر طرح اعتماد کیا جا سکے) ہو گا۔ وغیرہ۔

بدھ مت

۶۷ - بدھ مت کا آغاز ہندو برہمنیت کی بُت پرستی کے خلاف بطور احتجاج کیا گیا۔ یہ کوئی مکمل نیا مذہب نہیں تھا بلکہ بُت شکنی کا ایک اصلاحی اقدام تھا۔ چنانچہ اس میں متعدد دیگر مذاہب کی خصوصیات شامل تھیں۔ مثلاً بدھ مت "تناسخ" پر بھی یقین رکھتا ہے۔ بدھ مت خیرخیرات، ترکِ دنیا اور گیان دھیان کی تعلیم دیتا ہے جس کے ذریعے انسان کو ازخود حقیقی علم حاصل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ مت کا بانی ریاست کپل وستو کے بادشاہ سدودھن کا بیٹا بدھ شکی مُنی تھا۔ ایک دن اس نے جنازہ جاتے دیکھا۔ وہ اتنا متاثر ہُوا کہ گھر بار اور بال بچّوں کو چھوڑ کر نکل گیا اور رہبانیت اختیار کر لی۔ ایک روز جب وہ بڑ کے ایک درخت کے نیچے گیان میں بیٹھا تھا اسے نروان حاصل ہُوا۔ گوتما بدھ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی مگر اس کے اقوال جو اس کے چیلوں نے جمع کیے ہم تک پہنچے ہیں۔ وہ خدا کے بارے میں خاموش ہے۔ وہ ترکِ دُنیا اور نفس کُشی کی تلقین کرتا ہے، گو بدھ نے بت شکنی کی تعلیم دی ہے مگر اس مذہب کے ظہور کے وقت موجود بت تراشوں نے خود مہاتما بدھ کے بُت تراشنا شروع کر دیے اور بُدھ مت کے انتہائی محتاط پیروکار اپنے گرو کا

بُت توڑنے اور یُوں اپنے آقا کی بے حُرمتی کی جُراٴت نہ کر سکے۔ چنانچہ بُدھ مت بھی دُوسرے بت پرست مذاہب کی طرح بت پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ یُوں خود مہاتما بدھ کے بُت کی پرستش کی جانے لگی۔

۶۸ ۔ یہ مذہب ہندوستان اور چین کے بڑے حصّے میں پھیل گیا اور اس طرح پیغمبر اسلام کے ظہور کے وقت آپ ایک بڑے مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔ قرآن حکیم یا حدیث پاک میں اس مذہب کا براہِ راست کوئی تذکرہ نہیں۔ تاہم قرآن پاک کے متعدد قدیم اور جدید مفسرین نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ انجیر کا درخت (جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورہ ۹۵ آیت ایک میں آتا ہے) غالباً بڑ کے اس درخت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے نیچے مہاتما بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا۔ اس کی جائے پیدائش کپل وستو کی وجہ سے غالباً ایک پیغمبر کو ذوالکفل (کفل یعنی کپل سے آنے والا) کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس پیغمبر کے بارے میں، جس کا ذکر قرآن پاک میں دو بار آیا ہے، قرآن یا حدیثِ پاک میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، نہ ہی دیگر اسلامی کتب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

۶۹ ۔ ایسا مذہب جس میں بُت پرستی شامل ہو اور جو ترکِ دنیا لازم قرار دے، عوام کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ کیونکہ ترکِ دُنیا تو مُٹھی بھر افراد کا مقدر ہی ہو سکتی ہے۔

۷۰ ۔ یہ عجیب بات ہے کہ مہاتما بدھ نے بھی کہا ہے کہ اس نے مذہب کو مکمل نہیں کیا بلکہ ایک متریا یا میتیا (سب پر رحم کرنے والا) ابھی آنا باقی ہے[۱]۔

صابئیت

۷۱ ۔ قرآن پاک میں اس مذہب کا نام تو آیا ہے مگر اس کی کوئی زیادہ تفصیل نہیں دی گئی۔ تاہم سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ صابئیت بعض الہامی کتاب پر مبنی ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب حضرت نوحؑ پر نازل ہوئی ہو، جیسا کہ دورِ جدید کے صابی دعویٰ کرتے ہیں۔ اب اس کتاب کا تو کوئی وجود نہیں البتہ اس کے مندرجات کا لُبِ لباب روایاتی انداز میں محفوظ ہے اور اس مذہب کے پیروکاروں میں مروّج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صابئیت کے پیروکار ستاروں کی پُوجا کرتے ہیں اور ان کے اثرات پر یقین رکھتے ہیں کبھی سات ممالک میں اس مذہب کے پیروکاروں کے معبد موجود تھے اور ان کے نام سات سیاروں کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔ المسعودی کے مطابق صابی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مکہ مکرمہ کا معبد (کعبہ) زحل کے زیرِ اثر ہے جس کے لغوی معنی "دوام" کے ہیں۔

یہودیت

۷۲ ۔ قرآن پاک میں جن قدیم مذاہب کا ذکر آتا ہے، ان میں یہودیت کی سب سے زیادہ تفصیل دی گئی ہے یہودیت حضرت موسیٰ کا دین تھا۔ قرآن یہودیوں کی کتاب تورات کو الہامی تسلیم کرتا ہے۔ مسلمان اور یہودی دونوں توحید پرست ہیں اور مسئلہ توحید میں ان کے درمیان کوئی نزاع نہیں۔ مزید برآں قرآن پاک میں متعدد بار، غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ خدا یہودیوں کو دوسری تمام قوموں سے برتر تصور کرتا تھا۔ فطری طور پر اس بات کا تعلق حضرت موسیٰ

---

[۱] بُدھ تعلیمات ——— جو مہاتما بُدھ کے اقوال پر مبنی کتاب ہے۔

کے دورِ پیغمبری سے اور اس زمانے سے ہے جب یہودی دینِ موسوی کی حرف بحرف پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت محمدؐ کے دور میں دنیا بھر میں یہودیوں پر جو ظلم وستم توڑے جا رہے تھے، قرآن حکیم میں ان کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اللہ کے قوانین کی مسلسل خلاف ورزی کی تھی۔

۷۳۔ ایسی قوم سے کوئی بنا رسول صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ اوّل ان کی الہامی کتاب نبی آخر الزمان کی آمد کی پیشگوئی کرتی ہے ـــ حضورِ اکرمؐ کے ظہور کے وقت یہودی اس نبی آخر الزمانؐ کے منتظر تھے ـــ اور دوئم ان کی اس الہامی کتاب کا پوری طرح تحفظ نہیں کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ توراۃ پر جو گزری وہ المناک روایت ہے۔ اس مقدس کتاب کو پہلے بنوخد نصرؔ[1] نے پھر انطوشس طیلوس اور دُوسروں نے اسے تباہ کیا۔ یُوں تورات کا آخری نسخہ تک صفحۂ ہستی سے مِٹ گیا۔ اس کے کوئی ایک سو سال یا اس سے بھی زاید عرصہ بعد محض یادداشت سے تورات کو از سرِ نو مرتب کرنے کی سعی کی گئی۔ جدید مغربی دانشوروں کی تحقیق کے مطابق تورات کا جو متن موجود ہے اس میں ابہام، آمیزش اور متعدد اہمل اور بے جوڑ باتیں شامل ہیں۔

۷۴۔ جہاں تک حضرت موسیٰؑ کی طرف سے ایک اور پیغمبر کی بعثت کی پیش گوئی کا تعلق ہے وہ مندرجہ ذیل الفاظ پر مشتمل ہے:

"میں انھی میں سے تمھاری طرح (اے مُوسیٰ) ایک پیغمبر پیدا کروں گا، اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا، اور وہ ان سے صرف وہ بات کرے گا جس کا میں اسے حکم دوں گا۔ (باب تثنیہ[2] (تورات))

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودیت ایک سچا دین تھا۔ لیکن اب وہ فرسُودہ ہو چکا تھا اور اس میں سختی بہت تھی۔ پھر خود یہودی آخری نبی کی بعثت کے منتظر تھے اور اسے برملا تسلیم کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بالکل نئے اور زیادہ نرم احکامات لے کر آنے والا تھا۔

عیسائیت

۷۵۔ حضورِ اکرمؐ نے عیسائیت کو دُوسرے ادیان کی نسبت، بعض مستثنیات کے ساتھ رحیم تر پایا۔ قرآن پاک از خود تسلیم کرتا ہے کہ عیسیٰ کلام اللہ تھے، روح اللہ تھے، وہ مسیح تھے، خدا کے رسول تھے ـــ اور جو کسی بھی دوسرے مذہب نے عیسائیوں کے بارے میں تسلیم نہیں کیا ـــ وہ ایک عفت مآب کنواری کے بطن سے پیدا ہوئے گو ان کا کوئی باپ نہ تھا، وہ اللہ کا ایک معجزہ تھے جو اس کی قدرتِ مطلقہ کا اظہار تھا۔ قرآن یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ پر کتاب ـــ انجیل ـــ نازل کی۔ اس کے باوجود عقیدہ تثلیث، حضرت عیسیٰؑ کو "خدا کا بیٹا" قرار دینا اور مریم پوجا (عیسائیوں کا ایک فرقہ حضرت مریم کے بُت کی پُوجا کرتا ہے) کے باعث آنحضرت محمد صلعم کو اس مذہب میں بُت پرستی نظر آئی۔ قرآن حکیم نے اس بات پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں کو

---

[1] بعض تاریخی کتب اور حوالوں کی کتابوں میں اسے بخت نصر بھی کہا گیا ہے۔ (مترجم)

[2] انجیل کے عہد نامہ قدیم میں اسے باب "استثنا" کہا گیا ہے۔

خداوند (ارباب [1]) قرار دے دیا ہے ۔حقیقت تو یہ ہے کہ کلیسا ، کلیسا کی لاتعداد کونسلوں اور ارکانِ کونسل کی تاریخ کو مدِ نظر رکھا جائے تو اسں (قرآن پاک کی) سرزنش سے مفر ممکن نہیں ۔حضرت عیسیٰؑ نے غیر مبہم اور پُر زور الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ (متی ۔ ۵/ ۱۷) وہ تورات اور دیگر انبیاء کی کتب کی تنسیخ کے لیے نہیں آئے (جن کا ذکر انجیل میں موجود ہے) بلکہ وہ ان پر عمل کرانے آئے ہیں ۔ اور جو کوئی بھی ان احکام سے رُوگردانی کرے گا ، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دے گا ، وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں سے گر جائے گا ۔اس کے برعکس سینٹ پال نے نہ صرف اس کی تعلیم دی کہ " عیسیٰ تورات کو منسوخ کرنے والے ہیں " (رومیوں کے نام خط ۔ ۱/ ۴) بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تصدیق کی کہ :

> " کیونکہ روح القدس نے اور ہم نے مناسب جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں ۔ کہ تم بتوں کی قربانیوں سے ، اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو ۔ اگر تم ان چیزوں سے خود کو بچائے رکھو گے تو سلامت رہو گے ۔" (رسولوں کے اعمال ۱۵/ ۲۸)

یوں لحمِ خنزیر اور شراب کو تو حلال قرار دے دیا گیا ، مگر یومِ سبت اور ختنہ کی رسم منسوخ قرار پائی ۔ تورات کے تمام نسخے بھی پسِ پشت ڈال دیے گئے ۔ یہ سب بُرائیاں حضرت مسیح کے حواریوں کی زندگی میں ہی مسیحیت میں راہ پا گئیں ۔ بعد میں عقیدۂ تثلیث کو جنم دیا گیا ۔ مسیح کو خدا کا بیٹا اور اسی مادہ کی تخلیق قرار دے دیا گیا جس سے بقول ان کے مسیح کا " باپ " عبارت ہے ۔صلیب کو مذہب اور عقیدہ کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا ۔ مسیح اور مریم کی شبیہ اور مُورتیاں پورے مذہبی جوش و خروش سے تیار کی گئیں اور انھیں رواج دیا گیا ۔

۷۶ ۔ یہ یاد کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں کہ حضور سرورِ کائنات ؐ کے ذہن میں حضرت عیسیٰ کا تصور " خاندان اسرائیل کی گمشدہ بھیڑ " تک محدود ہو گیا تھا ۔ (متی کی انجیل ۔ ۱/ ۶ ، قرآن ۳/ ۴۸ ۔ ۹) یا ایسے شخص کا تصور تھا جو کہتا تھا " بچوں کی روٹی کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں " (متی ۔ ۱۵ ۔ ۲۴ ۔ ۶) مگر محمد (صلعم) تو کسی ایسی چیز کے متمنی تھے جس میں گم ہوں افلاک وہ " رحمت برائے دو عالم " کے قائل تھے ۔

۷۷ ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ پر جو وحی نازل فرمائی تھی ، حضرت عیسیٰ اسے ضبطِ تحریر میں لانا نہیں چاہتے تھے یا وہ اپنے پیروکاروں کو اسے ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم نہ دے سکے تاکہ اسے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا جا سکے ۔ چنانچہ انجیل کے بعض حصص حضرت عیسیٰ کے بعض حواریوں کی یادداشت میں محفوظ رہے ۔جب ان حواریوں ، ان کے جانشینوں یا پیروکاروں نے بعد میں اپنی اپنی یادداشتیں قلمبند کیں یا اپنے رسول کی سوانح ترتیب دی تو انھوں نے اسے ہی انجیل کا نام دے دیا ۔ گو ستر انجیلوں کا سراغ ملتا ہے مگر کلیسا نے ان میں سے صرف چار کو شرفِ قبولیت بخشا ہے جبکہ باقی سب کو وضعی قرار دے دیا گیا ہے ۔ قدرتی طور پر ان لاتعداد سوانح میں تضاد بھی موجود ہے ۔ انجیل کا آرامی

---

[1] سورہ توبہ ، آیت ۳۱ ۔

زبان میں نسخہ جو انجیل کی اصل زبان ہے، ناپید ہو گیا۔ اب اس کا صرف یونانی ترجمہ رہ گیا جو مروج ہے۔

۷۸۔ انجیل کے عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح کی جو سوانح شامل ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ کی تقریروں کے بعض اقتباسات دیے گئے ہیں۔ گو ان کی تبلیغ کا دور تین سال سے زاید نہیں، وہ جانتے بھی تھے کہ ان کا انجام قریب ہے، اور انھوں نے اگرچہ مغموم مگر غیر مبہم انداز میں کسی آنے والے کی پیشگوئی کی جو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا جو ان سے ادھورا رہ گیا ہے:

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا ہی تمھارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ . . . . . مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ ـــ روحِ حق ـــ آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے تو کچھ نہ کہے گا۔ لیکن (اللہ کی طرف سے) جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا۔ اور وُہ تمھیں مستقبل کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لیے کہ وہ جو کچھ مجھ سے سنے گا وہی تمھیں بتائے گا۔ (یوحنا - ۱۶/ ۷-۱۴)

۷۹۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ہندوؤں کی کتب کے مطابق خدا کا آخری اوتار ایک جنگ جُو کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس کی وجوہ حضرت عیسیٰ نے ایک مثال میں بیان کی ہیں (متی ۲۱/ ۳۳ - ۱۴، مرقس ۱۲/ ۱-۹، لوقا ۲۰/۹ - ۱۶) اور ہم ذیل میں سینٹ مرقس کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

"پھر وہ ان سے تمثیلوں سے باتیں کرنے لگا کہ ایک شخص نے تاکستان (انگوروں کا باغ) لگایا اور اس کے چاروں طرف باڑ بھی لگا دی۔ انگوروں کے عرق کے لیے حوض بنایا۔ ایک بُرج تعمیر کیا۔ اسے ٹھیکے پر باغبانوں کے سپرد کیا۔ اور خود کسی دور دراز ملک میں چلا گیا۔ پھل کا جب موسم آیا تو اس نے اپنے ایک ملازم کو تاکستان کے ٹھیکیدار کے پاس بھیجا تاکہ پھل میں سے اس کا حصہ وصول لائے۔ مگر انھوں نے اسے پکڑ کر خوب پیٹا اور اُسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ پھر اس نے ایک اور ملازم کو (اسی مقصد کے لیے) بھیجا۔ مگر انھوں نے اس پر سنگ باری کر کے اس کا سر پھوڑ دیا۔ اور اسے بے عزت کر کے بھگا دیا۔ پھر اس نے ایک اَور کو بھیجا تو انھوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس نے مزید کئی ملازم بھیجے، انھوں نے بعض کو پیٹا اور بعض کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ایک باقی تھا جو اس کا پیارا بیٹا تھا۔ بالآخر اس نے یہ کہتے ہوئے اسے بھی بھیج دیا کہ وہ میرے بیٹے کا تو پاس کریں گے۔ مگر ان باغبانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہی تو اصل وارث ہے آؤ اس کا بھی کام تمام کر دیں تو یہ میراث ہماری ہو جائے گی۔ پس انھوں نے اسے قابو کر لیا اور اس کا کام تمام کر ڈالا، اور اس کی لاش تاکستان سے باہر پھینک دی۔ اب تاکستان کا مالک کیا کرے گا؟ وُہ آئے گا باغبانوں کو تباہ و برباد کر دے گا اور تاکستان دوسروں کے حوالے کر دے گا۔"

تاکستان کا مالک کائنات کا مالک ہے۔ اس نے جو ملازم یکے بعد دیگرے ارسال کیے وہ اس کے فرستادہ

رسول ہیں۔ بیٹا مسیح ہے۔ اور حملہ آور فوج کا سالارِ اعلیٰ "رسول حرب" ہے۔

۸۰۔ حضور اکرمؐ کے زمانے میں متداول ادیان کا یہ مختصر سا خاکہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی حضورؐ کو اطمینانِ قلب سے ہمکنار نہیں کر سکتا تھا۔ خوب تر کی تلاش اور جستجو ان میں بڑھتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں رسول اللہؐ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا جس نے بالآخر اسلام کی عظیم عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

۸۱۔ مگر آئیے حالات و واقعات کو خود اپنی کہانی سنانے کا موقع دیتے ہیں۔

باب ۳

پیغام اور اس کے متعلقات

۸۲۔ جب محمدؐ رسول اللہ پر دوسری بار وحی کا نزول ہُوا، جس میں انھیں یقین دلایا گیا کہ خدائے واحد نے انھیں فراموش نہیں کیا ——— بلکہ اس کے برعکس یہ اللہ تعالیٰ ہی تو تھا جس نے حضورؐ کی اس وقت رہنمائی فرمائی جب آپؐ خود اس کی محبت میں از خود رفتہ تھے ——— اور انھیں حکم دیا گیا کہ "اور تیرے پروردگار نے (تمھیں) جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا ذکر کر" (قرآن ۹۲/۱۱) تو آنحضورؐ اپنا تمام غم بھول گئے، ان کے شبہات محو ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کے پیغام (کی تبلیغ) پر مرکوز کر دی۔ اور دل و جان سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ (اللہ تعالیٰ کا) یہ پیغام بتدریج ایک مکمل نظریہ حیات کے قالب میں ڈھل گیا تاہم اس کے بنیادی نکات میں کوئی تبدیلی نہ آئی؛ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

۸۳۔ مختصراً اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا قانون ساز ہے اور محمدؐ تمام دنیا خصوصاً بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی ترسیل کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اللہ صرف ایک ہے، اسی نے ہمیں بنایا ہے، وہی ہماری پرورش کرتا ہے۔ اسی کے حکم سے موت آتی ہے اور وہی ہماری دُنیاوی زندگی کا حساب لے گا اور پھر جیسے بھی وُہ چاہے گا سزا یا جزا دے گا۔ انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ چنانچہ اسے زندگی کے تمام شعبوں میں، خواہ یہ مسلک کا معاملہ ہو یا عقیدہ کا، معاشرتی رویّہ ہو یا کچھ اور، اپنے خالق و مالک کے احکام کی پابندی کرنی چاہیے۔ اگر اس کے برعکس ہو تو اللہ تعالیٰ مختارِ کل ہے، وہ ہمیں موت کے بعد جِلانے اور پھر سزا دینے پر بھی قادر ہے۔

۸۴۔ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان دو ایسے محور ہیں جن پر دینِ محمدی قائم ہے۔ خدا ہر حالت میں اور ہر جگہ موجود ہے، وہ غیر مرئی ہے اور انسانی ادراک اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہمیں اس کا پیغام پہنچانے اور اس کی مرضی سے آگاہ کرنے کے لیے کسی ایلچی یا رسول کا تقرر ناگزیر تھا۔ پیغمبر کی بعثت ناگزیر ضرورت بن گئی۔ اُس کے احکام سے عمداً روگردانی کی روک تھام کے لیے سزا و جزا بھی ضروری تھی۔ اس ضمن میں بعض باتیں ناگزیر ہیں؛

پیغمبر پر ایمان

۸۵۔ ہر مواحد کسی بحث یا تامل کے بغیر اس بات پر متفق ہے کہ ہمیں اپنے خالق کے احکام پر بلا چُون و چرا عمل کرنا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ تو غیر مرئی ہے اور انسانی ادراک سے ماورئی، چنانچہ اس کی مرضی یا حکم کس طرح معلوم کیا جائے؟ سبھی اتفاق کرتے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ خود اپنے احکام ہم پر واضح نہ کر دے۔ انسان کے لیے خود ان احکام سے آگاہی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ عملی طور پر تمام مذاہب کا بھی اس امر پر اتفاق ہے،

کہ دوسرے تمام حیوانات کے لیے ان کی جبلت کافی ہے مگر حیوان ناطق (انسان) محض جبلت کی رہنمائی قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ مشینی انداز میں عمل نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی عقل و دانش کی روشنی میں استدلال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف امور پر مختلف انسانوں کا ردِ عمل جدا جدا ہوتا ہے۔ انسان قوتِ استدلال سے مالا مال ہونے کے باعث اُسی بات پر اتفاق کرتا ہے جس کا وہ قائل ہو جائے ——— خواہ وہ از خود قائل ہو یا کوئی دُوسرا انسان اسے دلیل سے قائل کرلے ——— وُہ اگر انتہائی سنگین تعصب کا شکار نہ ہو تو وہ استدلال کے بعد اپنے فیصلے بھی بدل لیتا ہے۔ دوستوں پر اعتماد کی بدولت وہ اپنے خیر اندیش رفقا کی رائے کو اولیت بھی دیتا ہے، بچّہ (ابتدا میں) ماں کی ہر بات پر عمل کرتا ہے پھر وہ والد کے احکام کو اولیت دیتا ہے اور بوجوہ اسی کی اطاعت کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔ باپ کے بعد وہ اپنے استاد، استاد کے بعد حکمران اور روحانی پیشوا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کے اِس رویّہ کے پس منظر میں "سزا و جزا" کا تصور ہی کارفرما ہوتا ہے۔ جب ماں کسی نافرمان بچے کو سدھارنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو والد سامنے آتا ہے، پھر سکول کا استاد اور رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ملک کے حکمران سے جا ملتا ہے جسے زندگی یا موت پر اختیار حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ سزا و جزا محض دنیاوی درجہ رکھتی ہے اور دنیاوی اعمال کا احاطہ کرتی ہے۔ روحانی رہبر اسی کی رُوح کو تقدس سے ہمکنار کرتا ہے اور اسی ضمن میں سب سے بڑا محرک اللہ تعالیٰ کا خوف ہے جو حیات بعد از ممات پر قادر ہے اور بندے کو دوبارہ زندگی دے کر نافرمانی کی سزا دے سکتا ہے۔ سب سے بڑا روحانی رہبر خود اللہ کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔

۸۶۔ اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کے نزول اور دوسروں تک ترسیل کے لیے روحانی اعتبار سے بلند ترین شخصیت کا انتخاب کرتا ہے۔ تاہم خدا اور اس کے پیغمبر کے درمیان تعلقات کی مختلف انداز میں تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ بعض مذاہب مثلاً زرتشتیت، برہمنیت وغیرہ منتخب شخصیت (پیغمبر) کو خدا کی تجسیم قرار دیتے ہیں: یعنی خدا اُس انسان میں حلول کیے ہوتا ہے۔ برہمن ہندو اسے اوتار کا نام دیتے ہیں جو اوپر سے نازل ہوتا ہے اور خدا اس کے وجود میں سمویا ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے بعض فرقے مثلاً توحید پرست اسے صرف خدا کہہ کر پکارتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ خدا کے یہ اوتار (جو انسانی روپ میں خدا متصور ہوتے ہیں) بھی دوسرے انسانوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں وہ کھاتے پیتے ہیں اور سوتے جاگتے ہیں، وہ بیمار بھی ہو جاتے ہیں اور دیگر فانی انسانوں کی طرح بالآخر موت ہی ان کا مقدر ہوتی ہے۔ لہٰذا اوقات وہ شہید کر دیے جاتے ہیں۔ "خدا" اتنا لاچار مجبور ہو اور عام انسانوں کی طرح فنا کے گھاٹ اُتر جائے، عقلِ سلیم اسے تسلیم نہیں کرتی۔ مگر یہ ممکن ہے کہ کوئی سالک راہِ خدا میں اپنی ذات کی نفی کر دے، پھر اللہ کا فضل اس کے شاملِ حال ہو اور وہ فنا فی اللہ ہو جائے لیکن خدا کے نبی کے رتبہ پر فائز ہونا اس سے کہیں عظیم تر مقام ہے اور یہ مقام کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ ہر ولی فنا فی اللہ تو ہو سکتا ہے مگر ہر فنا فی اللہ کے رسول کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دُوسرے مذاہب میں اس منتخب شخصیت کو "نبی" کہا جاتا ہے۔

۸۷۔ "نبی" کے بارے میں اسلامی اور یہودی نظریات میں بڑا بُعد ہے۔

۸۸۔ انجیل کے عہد نامہ قدیم کے مختلف حصّوں میں لفظ "نبی" کا استعمال ایسے بے ہنگم انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری پریشان ہوجاتا ہے۔ مثلاً: خدا نے شاہ ابی ملک کو خواب میں بتایا کہ "ابراہیمؑ نبی" ہے اس کی بیوی واپس کردو، وہ تیرے لیے (نیک) دعا کرے گا۔" (پیدائش ۲۰/۷) "خداوند نے موسٰی سے کہا: دیکھو میں نے تجھے فرعون کے لیے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا "نبی" ہوگا۔ (خروج ۷/۱) "اور موسٰی نے قوم کے بزرگوں میں سے ستّر شخص اکٹھے کرکے ان کو خیمہ کے گرد کھڑا کردیا۔ تب خداوند ابر میں ہوکر اترا اور اس نے موسٰی سے باتیں کیں اور اس روح میں سے جو اس میں تھی، کچھ لے کر اسے ان ستّر بزرگوں میں ڈالا۔ چنانچہ جب روح ان میں آئی تو وہ "نبوت" کرنے لگے۔ لیکن بعد میں کبھی نہ کی۔ مگر ان میں سے دو شخص لشکرگاہ میں رہ گئے ایک کا نام اِلداد اور دوسرے کا میداد تھا.... اور لشکرگاہ میں ہی "نبوت" فرمانے لگے..... اور یشوع نے کہا اے میرے مالک موسٰی اُن کو روک۔ موسٰی نے اسے کہا کیا تجھے میری خاطر رشک آتا ہے۔ کاش! خداوند کے سب لوگ "نبی" ہوتے اور خداوند اپنی رُوح ان سب میں ڈالتا (گنتی ۱۱/۲۴-۲۹) موسٰی نے اسرائیلیوں کو بتایا: اور خدا نے مجھ سے کہا:...... میں انہی میں سے تمہاری طرح ایک "نبی" پیدا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا (باب استثنا ۱۸/۱۷-۱۸)"...... اور اس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی "نبی" موسٰی کی مانند پیدا نہیں ہوا" (باب استثنا ۳۴/۱۰) "اور سب بنی اسرائیل نے جان لیا کہ سموئیل خدا کا "نبی" مقرر ہوا ہے"۔ (۱-سموئیل ۳/۲۰) "..... کیونکہ جس کو اب نبی کہتے ہیں اس کو پہلے غیب بین کہتے تھے"۔ (۱-سموئیل ۹/۹) ایک غیر ملکی حملہ کے دوران بنی سموئیل نے ایک شخص ساؤل ابن قیس کو بطور بادشاہ منتخب کرلیا اور اسے کسی جگہ جانے کا حکم دیا..... "اور بعد اس کے تو خدا کے پہاڑ کو پہنچے گا جہاں فلستیوں کی چوکی ہے۔ اور جب تو شہر میں داخل ہوگا تو "نبیوں" کی ایک جماعت جو اونچے مقام سے اتری ہوگی، تجھے ملے گی اور ان کے آگے ستار اور دف اور بانسلی (بانسری) اور بربط ہوں گے اور وہ سب "نبوت" کرتے ہوں گے۔ تب خداوند کی رُوح تجھ پر زور سے نازل ہوگی اور تو ان کے ساتھ نبوت کرنے لگے گا، اور بدل کر اور ہی آدمی ہوجائے گا (۱-سموئیل ۱۰/۵-۶، ۱۰-۱۱) ...... اور داؤد بھاگا اور اس رات بچ گیا۔ اور ساؤل نے داؤد کے گھر پر قاصد بھیجے کہ اس کی تاک میں رہیں اور صبح کو اسے مار ڈالیں.... اور داؤد رامہ میں سموئیل کے پاس آیا اور ساؤل کو خبر ملی کہ داؤد رامہ میں ہے اور ساؤل نے داؤد کو پکڑنے کو قاصد بھیجے اور انھوں نے جو دیکھا کہ "نبیوں" کا مجمع نبوت کررہا ہے اور سموئیل ان کا پیشوا بنا کھڑا ہے تو خدا کی روح ساؤل کے قاصدوں پر نازل ہُوئی اور وہ بھی "نبوت کرنے لگے۔ اور جب ساؤل تک یہ خبر پہنچی تو اس نے اور قاصد بھیجے اور وہ بھی "نبوت" کرنے لگے اور ساؤل نے پھر تیسری بار اور قاصد بھیجے اور وہ بھی "نبوت" کرنے لگے۔ تب وہ آپ رامہ کو چلا...... اور خدا کی روح اس پر بھی نازل ہوئی اور وہ چلتے چلتے نبوت کرتا ہوا رامہ کے (علاقہ) نیوت میں پہنچا اور اس نے بھی اپنے کپڑے اتارے اور وہ بھی (اسی طرح) سموئیل کے آگے "نبوت" کرنے لگا اور اس سارے دن اور ساری رات ننگا پڑا رہا۔ اس لیے یہ کہاوت چلی: "کیا ساؤل بھی "نبیوں" میں سے ہے!" (۱-سموئیل ۱۹/۱۰-۲۴) ایک بوڑھے نبی نے خدا کے احکام سے سرتابی کی اور اسے شیر نے ہلاک کردیا۔ (۱-سلاطین ۱۳/۱۱-۲۴)

بت پرست بادشاہ اخی اب نبی ایلیاہ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس کی تلاش میں تھا۔ ایلیاہ اتفاقاً شاہی محل کے نگران سے ملا اور اسے کہا کہ وہ ایلیاہ کے بارے میں شاہ کو اطلاع دے دے۔ شاہی محل کا نگران ایک خدا ترس شخص تھا، اور وہ ایسا کرنے میں متامل تھا، اس نے کہا: "کیا میرے مالک کو جو کچھ میں نے کیا ہے نہیں بتایا گیا کہ جب ایزبل نے خداوند کے "نبیوں" کو قتل کیا تو میں نے خداوند کے نبیوں میں سے سو آدمیوں کو لے کر پچاس پچاس کر کے ان کو ایک غار میں چھپایا اور ان کو روٹی اور پانی سے پالتا رہا۔ (ایلیاہ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے بادشاہ آجاتا ہے اور ایلیاہ اسے حکم دیتا ہے)۔۔۔۔ اس لیے اب تو قاصد بھیج اور سارے اسرائیل کو اور بعل کے ساڑھے چار سو "نبیوں" کو اور یسیرت کے چار سو نبیوں کو جو ایزبل کے دستر خوان پر کھاتے ہیں، کوہ کرمل پر اکٹھا کر۔ (۱۔ سلاطین ۱۸/۱۳-۱۹)

"پھر داؤد اور لشکر کے سرداروں نے آصف اور ہیمان اور یدوتون کے بیٹوں میں سے بعضوں کو خدمت کے لیے الگ کیا تاکہ وہ بربط اور ستار اور جھانجھ سے نبوت کریں (۱۔ تواریخ ۲۵/۱) "کاہن" اور "نبی" بھی نشہ میں چور اور مے میں غرق ہیں۔ وہ رویا میں خطا کرتے ہیں اور وہ عدالت میں لغزش کھاتے ہیں۔" (یسعیاہ ۲۸/۷)".......اور نبیوں نے بعل کے نام سے نبوت کی اور ان چیزوں کی پیروی کی جن سے کچھ فائدہ نہیں"۔ (یرمیاہ ۲/۸)"..... نبی جھوٹی نبوت کرتے ہیں اور کاہن ان کے وسیلہ سے حکمرانی کرتے ہیں۔ اور میرے لوگ ایسی حالت کو پسند کرتے ہیں۔ اب تم اس کے آخر میں کیا کرو گے"۔ (یرمیاہ ۵/۳۱) نبی یرمیاہ کہتا ہے: "تب خداوند نے مجھے فرمایا کہ" انبیا "میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے نہ ان کو بھیجا اور نہ حکم دیا اور نہ ان سے کلام کیا۔ وہ جھوٹی رویا اور جھوٹا علم غیب بیان کرتے ہیں......" (یرمیاہ ۱۴/۱۴) "اور ایک نبی کے وسیلہ سے خداوند اسرائیل کو مصر سے نکال لایا اور نبی ہی کے وسیلہ سے وہ محفوظ رہا" ہوسیع ۱۲/۱۳) نبی عاموس نے کہا:"...... میں نہ نبی ہوں نہ نبی کا بیٹا بلکہ چرواہا اور گولر کا پھل بٹورنے (اتارنے والا) ہوں۔ (عاموس ۷/۱۴)" اور اے لڑکے (یوحنا کی طرف اشارہ ہے) تو خدا تعالیٰ کا نبی کہلائے گا"۔ (لوقا ۱/۷۶،

".... یسوع ناصری کا ماجرا جو ایک نبی تھا" (لوقا ۲۴/۱۹)۔

۸۹۔ انجیل کے مطالعے کے بعد یہ تعین کرنا محال ہو جاتا ہے کہ دراصل "نبی" کسے کہتے ہیں۔ اور قاری کچھ سمجھنے کے بجائے بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ انجیل کے مطابق ابراہیم، موسیٰ، یوحنا اصطباغی اور عیسیٰ مسیح نبی ہیں تو وہ بھی "نبی" ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں ("جھوٹی نبوت کرتے ہیں") اور وہ بھی "نبی" ہیں جو اپنی زبان سے تصدیق کرتے ہیں کہ "میں نبی نہیں ہوں"۔

لہ انجیل کی مختلف آیات میں لفظ "نبی" اور "نبوت" کو جس بے ہنگم انداز میں استعمال کیا گیا ہے فاضل مصنف نے اس کی وضاحت کے لیے انجیل کے مختلف حصوں کے جزو پیش کیے ہیں ان کا اردو ترجمہ بائبل سوسائٹی کی "انجیل مقدس" سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

۹۰۔ قرآن حکیم کے مطابق نبی اپنے وقت کا سب سے متقی شخص اور اللہ کا سب سے زیادہ فرمانبردار بندہ ہوتا ہے۔ اسے نزولِ وحی یا القا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا پیغام موصول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ان پیغامات کو بسا اوقات یکجا کر کے ایک قانونی ضابطہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ نبی کے ذریعے بعض اوقات سابقہ الہامی کتاب منسوخ کر دی جاتی ہے اور اس کی جگہ نئی کتاب لے لیتی ہے۔ مگر بعض حالتوں میں نبی اپنے پیش رو پر نازل ہونے والی کتاب کی ہی پیروی کرتا ہے۔ فطری طور پر صاحبِ کتاب نبی دوسرے نبی سے افضل تر ہوتا ہے تاہم خدا کے پیغامبر کی حیثیت میں تمام نبیوں کا مرتبہ مساوی ہے۔ قرآن پاک میں "نبی" کے لیے مختلف متبادل الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں نبی (پیغمبر) رسول (قاصد) مرسل (ایلچی) بشیر اور مُبشِّر (بشارت دینے والا) نذیر اور مُنذر (ڈرانے والا) اور ہادی (رہنما) شامل ہیں۔ قرآن پاک میں نبی کے لیے دیے گئے کسی بھی خطاب کو حضرت آدم سے حضور اکرمؐ تک ہر نبی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۹۱۔ قرآن حکیم اور حدیث پاک دونوں حضرت محمد رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی قرار دیتے ہیں۔

آخرت پر ایمان

۹۲۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حشر اور یومِ قیامت پر ایمان انسان کے لیے نیکی کرنے اور بُرائی سے اجتناب کی ترغیب کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ دنیا میں ایسے فرشتہ صفت انسان بھی موجود ہیں جو اپنا فرض پوری دیانت داری سے ادا کرتے ہیں اور اس کے لیے انھیں کسی وعدے یا وعید کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر ان کی تعداد نہایت محدود ہے۔ ایسے شیطان کے بھائی بھی ہیں جو تمام تر نگرانی اور سختی کے باوجود معاشرہ میں خلل ڈالتے ہیں اور اصول و قواعد کو تہس نہس کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ بنی نوع انسان میں غالب ترین اکثریت ایسے افراد کی ہے جن کی معمولی سی بھی نگرانی کی جائے تو وہ ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ کسی انعام کا وعدہ یا سزا کی وعید بھی ان کے رویہ پر کسی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ نسلِ انسانی کی یہی وہ غالب اکثریت ہے جن کے لیے تمام مذاہب اور تمام اصول و قوانین وجود میں آئے ہیں۔ بلا شبہ مادی سزا کا تصور مفید ثابت ہوتا ہے، مگر برائی کی ترغیب، خصوصاً ایسی صورت میں جب انسان یہ سمجھے کہ اس کا پردہ فاش نہیں ہوگا، یا وہ اتنا طاقت ور ہو کہ اسے دنیا کی کسی عدالت سے سزا کا خوف نہ ہو (مثلاً کسی ملک کا حکمران) زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے۔ حشر کے بعد یومِ قیامت اور حساب کتاب کا تصور دنیا کے طاقتور ترین حکمران کے لیے بھی سدِ راہ بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص از خود نماز ادا کرتا ہے جبکہ اسے کوئی حکم دینے والا بھی نہیں ہوتا یا کوئی شخص وزارتِ خزانہ کی طرف سے غلطی کے باوجود پورا ٹیکس ادا کر دیتا ہے۔ اسلام دونوں طرح کی تحذیر عمل میں لاتا ہے۔ سزا دینے والے بھی موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی انسان کے دل میں یہ خوف بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ اسے یوم قیامت کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ ظاہر ہے جسمانی اور روحانی سزا و جزا کی دوہری تحذیر محض روحانی یا محض مادی سزا و جزا کی نسبت زیادہ موثر ثابت ہوگی۔ یہ کہنے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ روحانی تحذیر پر ایمان مادی سزا کے تصور سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے، اور جب

جسمانی طور پر نگرانی ممکن ہی نہ ہو تو روحانی تحذیر ہی انسان کو برائی سے روکنے کا واحد ذریعہ رہ جاتی ہے، خصوصاً کسی نبی کے ابتدائی دور میں جب اسے ارشاد و تبلیغ کے نازک کام میں پوری آبادی کے نظریات اور تخیلات کی مخالفت کرنا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ قرآن پاک کی ابتدائی سورہ حیات بعد الممات، یومِ حساب اور یومِ حشر کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔

صلوٰۃ ۹۳۔ رواج کسی حکم پر عمل درآمد کے لیے بہترین مبلغ ثابت ہوتا ہے۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ جبرائیل نے رسولِ اکرمؐ کو سب سے پہلے وضو اور نماز سکھائی۔ چنانچہ پیغمبرِ خدا لوگوں سے پوچھ سکتے تھے کہ: "تم دن اور رات کے چوبیس گھنٹے اپنی ذات کے لیے کام یا آرام میں صرف کرتے ہو، مگر اپنے خدا اور مالک کی بندگی اور اس کے حضور میں حاضری کے لیے کتنا وقت دیتے ہو؟" انھوں نے قوم سے کسی فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے سے قبل ذاتی مثال پیش کی۔ ہر مذہب حتیٰ کہ بت پرستی میں بھی عبادت کا ایک طریقِ کار ہوتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اسلام کا طریقِ عبادت کیا ہے۔

۹۴۔ پیغمبرِ اسلام نے وضو کو نصف ایمان قرار دیا ہے اور اس کی معقول وجوہ ہیں۔ اسلام بنی نوع انسان کی دنیاوی زندگی اور حیات بعد از ممات میں بہبود کا خواہاں ہے۔ چنانچہ اس مذہب کو اپنے پیروکاروں کے لیے ایسے احکام صادر کرنے چاہئیں جو ان کی جسمانی اور روحانی صحت کے لیے مفید ہوں۔ بظاہر دنیاوی احکام میں بھی اُخروی بہتری کا پہلو ہونا چاہیے اور کوئی بظاہر دینی کام دنیاوی فائدے سے یکسر عاری نہیں ہونا چاہیے۔ وضو کا مقصد انسان کے جسم اور لباس کی طہارت ہے جس کی طبی اور معاشرتی اہمیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کی علامتی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ وضو میں انسان پہلے جسم کے پوشیدہ حصوں کی طہارت کرتا ہے، پھر ہاتھ دھوتا ہے، کُلّی کرتا ہے، ناک صاف کرتا ہے، چہرہ دھوتا ہے اور پھر بازو، سر، کان اور آخر میں پاؤں دھوتا ہے۔ ہمارے یہ تمام اعضا کسی گناہ یا جرم کے ارتکاب کا ذریعہ بنتے ہیں: جماع، تحریر و تقریر، سُونگھنا، اپنے چہرے (موجودگی) سے کسی پر ناجائز دباؤ ڈالنا، زدوکوب کرنا، سوچ وبچار، سماعت اور غیر قانونی آمدورفت —— یہ وہ بڑے بڑے فعل ہیں جن کا ہم اپنے ان اعضاء کے ذریعے ارتکاب کرتے ہیں۔ ان اعضا کو دھونے کا مطلب ماضی کے سہو پر معذرت اور اللہ کے فضل و کرم سے مستقبل میں ایسے سہو کے ارتکاب سے بچنے کا عزم ہے۔ اگر یہ "معذرت" اور پھر "عزم" نصف ایمان ہے تو باقی نصف اس عزم پر استقامت اور ماضی کے سہو سے پہنچنے والے نقصان کی ممکن حد تک تلافی ہے۔

۹۵۔ بُدھ مت میں عبادت مراقبہ میں کھڑے رہنا ہے۔ یہودی تورات کی تلاوت کرتے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، ہم اندھے ہیں اور دیکھ نہیں سکتے تاہم اس تک رسائی کے خواہاں ہیں۔ اندھے کی تو محض الفاظ کے ذریعے ہی رہنمائی کی جاسکتی ہے چنانچہ اللہ کے کلام کی پیروی ہمیں صاحبِ کلام تک پہنچا سکتی ہے۔ دورِ جدید کی ایک تشبیہ کے مطابق خدا ماورئی ہستی ہے اس کے الفاظ آواز اور زبان کی قید سے آزاد ہیں۔ اگر ہم کلام اللہ کو موجودہ دور میں بجلی کی رَو تصور کر لیں جو غیر مرئی اور بے رنگ بھی ہے لیکن وہ بلب کو روشن کرتی ہے اور ویسا ہی

رنگ اختیار کر لیتی ہے جس رنگ کا بلب رَو سے منسلک ہو۔ بلب خدا کے نبی ہیں اور اللہ کا کلام ان کے رنگ (نبی کی زبان) میں نازل ہوتا ہے۔ اگر کوئی بجلی کی رَو کے راستے سفر کرے تو وہ یقیناً جنریٹر تک پہنچ جائے گا جہاں سے یہ رَو پھوٹتی ہے۔ تقلید پسند اور کیتھولک عیسائیوں نے کلام اللہ کی تلاوت کا یہودی طریقہ اپنا لیا ہے اور اس پر "ہم مشربی" کا اضافہ کیا ہے: وہ عبادت کے وقت معمولی خوراک اور شراب نوشی کرتے ہیں۔ یہ رسم حضرت عیسٰی کے آخری عشائیہ کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جس سے عیسائیوں کا مطلب مسیح کی شخصیت سے اشتراک یعنی ان میں سمو جانا ہے (اور ان کے ہاں مسیح سے مراد خدا ہے)۔

۹۶ - قرآن حکیم بھی تصدیق کرتا ہے (۱۷/۴۴) کہ کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد و ثنا نہ کرتی ہو۔ ستارے، کوہ و جبل، اشجار، جانور (۲۲/۱۸) پرندے جو قطاروں میں پرواز کرتے ہیں (۲۴/۴۱) رعد بھی (۱۳/۱۳) گھٹتے بڑھتے سائے (۱۶/۴۸) اور پانی (۸/۱۱) جس سے طہارت (وضو) کی جاتی ہے، ہر چیز (اس کی ثنا کرنے والوں میں) شامل ہے۔ اس کائنات میں موجود اشیا کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: جمادات، حیوانات اور نباتات۔ مسلمانوں کی نماز پہاڑوں کی طرح استقامت سے ایستادہ رہنے (جمادات) جانوروں کی طرح رکوع میں جھکنے (حیوانات) اور نباتات کی طرح، جن کے منہ ان کی جڑیں ہوتی ہیں، سجدہ ریزی پر مشتمل ہے۔ نماز میں بآوازِ بلند اللہ کی تکبیر کا اقرار کیا جاتا ہے (اللہ اکبر) مختلف رکعتوں میں ایک ہی عمل ستاروں کی گردش کی مانند دُہرایا جاتا ہے۔ مختلف رکعتیں سائے کی طرح بڑھتی اور گھٹتی ہیں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ نماز میں قرآن پاک (کلامِ اللہ) کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یوں مسلمان دورانِ نماز اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے وہ اپنے خالق کے اتنا قریب ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے (التحیات میں تشہد اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے مترادف ہے جس طرح رسول اللہؐ نے معراج کی شب میں اللہ سے کلام کیا تھا۔ مسلمانوں کی نماز کائنات میں موجود ہر چیز کی عبادتوں کا حسین امتزاج ہے اور یوں تمام مذاہب کے طریقِ عبادت کو اسلام کے خصوصی طریق کار میں سمو دیا گیا ہے۔

۹۷ - دوسرے مذہبی فرائض روزہ وغیرہ کا ذکر بعد میں آئے گا۔ شروع شروع میں روزانہ صبح اور سہ پہر کی صرف دو نمازیں تھیں۔ تہجد پیغمبر ادا کرتے تھے مگر یہ دوسروں پر واجب نہ تھی۔

باب ۴

تبلیغِ اسلام اور اس کے نتائج

۹۸۔ تبلیغِ اسلام کا عظیم کام خود رسول اللہ کے گھر سے شروع ہوا۔ ان کی اہلیہ، بچے، گھریلو ملازم اور لے پالک بیٹے (زید اور علی) آسانی سے نئے دین کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ ہرگز دروغ گوئی نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی بے لوث خدمت ان کا شعار تھا۔ اس کے بعد تبلیغ کا دائرہ رسولِ خدا کے دوستوں تک وسیع کیا گیا۔ خصوصاً حضرت ابو بکرؓ کو دعوتِ اسلام دی گئی جس کے بعد وہ اسلام کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ ان کی کوششوں سے مکہ میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی دولت ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے میں صرف کی جو اسلام قبول کر چکے تھے اور بت پرستی ترک کرنے پر ان کے آقا انھیں جبر و تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس کے بعد پیغمبرِ اسلام کے اعزہ اور اہلِ قبیلہ کو اسلام کی دعوت دینے کا مرحلہ آیا۔ حضورِ اکرمؐ کے لیے یہ سب سے مشکل کام تھا۔ ان لوگوں کا قبولِ اسلام کفار کی اس طعنہ زنی کے مسکت جواب کے لیے ضروری تھا کہ "تو اس کے تو رشتہ داروں نے جو اسے نہایت قریب سے جانتے ہیں، اس کی دعوت پر لبیک نہیں کہی"۔ نوجوانوں کے برعکس ——— جو ہمیشہ انقلاب پسند رہے ہیں ——— معمر افراد قدامت پرست ہوتے ہیں اور انھیں نئے نظریے کا قائل کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ رسول پاکؐ کے قبیلہ کے سردار ابو طالب جو ان کے حقیقی چچا بھی تھے، حضورؐ سے بیحد محبت کرتے تھے۔ مگر ان کے لیے اپنے سے چھوٹے، اپنے بھتیجے کی دعوت پر باپ دادا کا مذہب ترک کرنا آسان نہ تھا۔ یہ ان کی انا کے منافی تھا۔ ان کے بعد قبیلہ میں ابُولہب کا مرتبہ تھا، وہ بھی آنحضورؐ کا چچا تھا۔ ذاتی وجوہ کی بنا پر وہ نبی کریمؐ کا سب سے بڑا دشمن بن چکا تھا۔ ابو طالب نے تو صرف آنحضورؐ کی دعوتِ اسلام قبول کرنے سے ہی احتراز کیا تھا مگر ابو لہب نے اپنے تمام وسائل رسولِ خداؐ کی دشمنی اور مخالفت کے لیے وقف کر دیے۔ اگر رسولِ خدا اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے اجتماع میں اپنی دعوت پیش کرتے تو ابو لہب طنزیہ گفتگو اور توہین آمیز رویہ سے کام خراب کر دیتا۔ اگر رسول اللہ قبیلہ سے باہر ارشاد و ہدایت کے لیے کام کرتے تو ابُولہب ہمیشہ موجود ہوتا اور سخت بیہودگی کا مظاہرہ کرتا۔

۹۹۔ یہ سوچ کر کہ میرے رشتہ داروں کے تعصبات اور پس و پیش ایک روز ختم ہو جائے گی، رسولِ خداؐ نے شہر کے دوسرے لوگوں پر توجہ مرکوز کر دی۔ ان کی دعوت پختہ عمر کے افراد کی نسبت نوجوانوں میں تیزی سے مقبول ہونا شروع ہوئی۔

۱۰۰۔ اس سے غیر متوقع مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے: معمر افراد کی دعوتِ اسلام سے بے اعتنائی اس وقت فعال دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ جب ان کے اپنے نوعمر بچوں اور دوسرے نوجوان رشتہ داروں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جب معزز اور شریف خاندانوں کے نوجوانوں مثلاً فراس ابن النضر، ابُوحذیفہ ابن عُتبہ، ہشام ابن العاص، الولید

ابن الولید وغیرہ پُرجوش طریقہ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے تو ان کے والدین نے اسے اپنی توہین تصور کیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے بیٹوں پر ظلم و تشدد روا رکھا بلکہ رسولِ خدا کے متبرک کام میں کھلے بندوں رخنہ اندازی کرنے لگے۔ اسلام قبول کرنے والے غلاموں، مردوں اور خواتین کی حالت فطری طور پر سب سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اپنے بچوں کی طرح ان پر تو کوئی رحم کھانے کو تیار نہ تھا۔ رسولِ خدا کی طرف سے یہ تصدیق کہ بُت پرست جہنم کا ایندھن بنیں گے، ان لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن جب یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان (بت پرستوں) کے آباؤ اجداد بھی جہنم میں جائیں گے تو وہ نئے دین کی حمایت کیسے کر سکتے تھے۔ مگر (رسولِ خدا کے) اس اعلان پر اشتعال و دشمنی محض بچگانہ حرکت تھی: کیا اس طرح رسولِ خدا خود اپنے اسلاف کی بھی مذمت نہیں کر رہے تھے؟

۱۰۱۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضورؐ کی نبوت کا شہرہ مکے سے نکل کر ارد گرد کے علاقوں میں دُور دور تک پھیل گیا رسولِ خدا ایامِ حج میں، جب عرب کے ہر حصہ سے قافلے حج کے لیے مکہ مکرمہ آتے تھے، خوب تبلیغ کرتے۔ اور شہر میں لوگوں کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے۔ چنانچہ بہت سے نئے لوگ جذبۂ تجسس کے تحت بھی رسولِ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے:

۱۰۲۔ ابوذر جو کبھی راہزن تھا۔ ایک روز اس نے ایک قافلے پر حملہ کیا۔ جب حملہ کی شکار خواتین اور معصوم بچوں کی آہ و بکا اس کے کانوں میں پڑی تو اس کا ضمیر جاگ اُٹھا۔ وُہ اپنے کردار پر سخت نادم تھا۔ انہی دنوں اسے اتفاق سے معلوم ہوا کہ مکہ میں بلند اخلاق کی ایک تحریک چلائی جا رہی ہے۔ وہ وادیِ بدر سے طویل فاصلہ طے کر کے مکہ پہنچا اور اسلام قبول کر لیا۔ پھر پیغمبرِ اسلام کے ایما پر وہ واپس اپنے علاقہ میں پہنچ کر اسلام کی تبلیغ میں مشغول ہو گیا۔

۱۰۳۔ یمن کا ایک باشندہ اسلام کے خلاف کفارِ مکہ کے پراپیگنڈہ سے اس قدر متاثر اور خوفزدہ ہُوا کہ وہ جب مکہ آیا تو اس نے اپنے کانوں میں کپڑے کی کترنیں ٹھونس لیں تاکہ وُہ پیغمبرِ اسلام کی جادو اثر تقریر نہ سُن سکے۔ مگر جلد ہی اسے اپنے اس منفی اور احمقانہ رویّہ کا احساس ہو گیا، اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ وُہ اپنے آپ سے بولا، اس (پیغمبر) کی بات سُن لینے میں حرج ہی کیا ہے؟ میں اتنا باشعور تو ہُوں کہ اس کی باتوں کا خود تجزیہ کر سکوں۔ اور پھر اسلام کے سیدھے سادے اور معقول اصولوں نے اسے اس قدر متاثر کیا کہ اس نے اسلام کو گلے لگا لیا۔ اسی طرح حبشہ سے مکہ آنے والے بعض افراد نے بھی جو غالباً تاجر تھے، اسلام قبول کر لیا۔

۱۰۴۔ حضور اکرمؐ کے نوجوان چچا امیر حمزہؓ کا قصہ ذرا مختلف ہے: ایک روز وہ صحرا میں سیر و شکار کی مہم سے واپس آئے تو ان کی خادمہ نے انھیں بتایا کہ اُس روز ابُو جہل نے ان کے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔ حمزہؓ نے ابوجہل کے اقدام کو اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزتی سے تعبیر کیا۔ وُہ سیدھے ابوجہل کی طرف گئے، شکار سے واپسی کے وقت کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے ایک لفظ کہے بغیر اسی کمان سے ابوجہل کو زدو کوب کرنا شروع کر دیا۔ ابوجہل سخت زخمی ہو گیا۔ حمزہؓ نے اسے پیٹتے ہوئے کہا: تمھاری زیادتیوں اور ناانصافیوں کو دیکھ کر میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

۱۰۵۔ حضرت عمرؓ (خلیفہ دوم) کا قبولِ اسلام اپنی نوعیت کا ایک اور منفرد واقعہ ہے۔ اس وقت وُہ تیس کی

عمر کو پہنچنے والے تھے۔ وُہ اپنی پسند و ناپسند میں نہایت کٹّر تھے۔ یہ جانے بغیر کہ اسلام کیا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے، وہ مسلمانوں کو سزا دینے میں پیش پیش تھے خواہ وہ ان کے خاندان کے افراد ہوں یا کوئی اجنبی۔ ایک روز انھوں نے یہ عزم کیا کہ وُہ رسولؐ اللہ کو قتل کر دیں گے تاکہ اس نئی مصیبت کو بیخ و بُن سے اکھاڑا جا سکے۔ انھوں نے ہتھیار سنبھالے اور رسولِ خداؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ان کا ایک عزیز انھیں ملا۔ عمر نے اسے اپنے عزم سے آگاہ کیا۔ ان کا یہ عزیز خفیہ طور پر حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ وُہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ عمر کے ساتھ حُجت نا ممکن ہے۔ اور وہ اپنے عزم پر ضرور عمل کریں گے۔ اس نے کہا: عمر! محمدؐ کے قبیلہ کے ساتھ جنگ مول لینے سے قبل اپنے گھر کی خبر لو۔ تمھاری بہن اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس غیر متوقع اطلاع سے عمر غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور سب کچھ بھول کر سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے پر پہنچ کر اُنھوں نے اندر سے قرآن حکیم کی تلاوت کی آواز سُنی یہ انھیں ملنے والی اطلاع کا بیّن ثبوت تھا۔ انھوں نے اس غضب ناک انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا کہ اندر بیٹھے ہوئے لوگ خوف زدہ ہو گئے، قرآن پڑھانے والے کو جلدی سے چھپا دیا گیا اور عمر کے بہنوئی نے دروازہ کھولا۔ "یہ تم کیا تلاوت کر رہے تھے؟" انھوں نے غصہ میں پُوچھا۔ "کچھ بھی تو نہیں، ہم تو بات چیت میں مصروف تھے" جواب ملا۔ عمر کا غصہ شدید تر ہو گیا اور اُنھوں نے اپنے بہنوئی کو ضرب لگائی۔ ان کی بہن شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھی اور خود بھی لہولہان ہو گئی۔ اتفاق سے اسے بھی ضرب آ گئی تھی، عمرؓ اشرافِ مکہ میں سے تھے اور وہ کسی خاتون خصوصاً اپنی پیاری بہن پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انھیں اس کا شدید رنج تھا۔ اس وقت بہن نے عمر پر ایک جذباتی ضرب لگائی۔ "ہاں ہم اسلام قبول کر چکے ہیں تم جو چاہو کر لو" وہ زخمی شیرنی کی مانند دھاڑی۔ عمر کا غصہ کافور ہو گیا۔ وُہ عاجزی سے بولے: "مہربانی کر کے مجھے وُہ دکھاؤ جس کی تم لوگ تلاوت کر رہے تھے۔" ان کی بہن ابھی غصے میں تھی، وہ بولی: "تم کافر ہو، پلید ہو اور تم اس حالت میں متبرک اوراق کو نہیں چھُو سکتے۔" "میں اب تمھارے دین کا دشمن نہیں" عمر بولے "مجھے بتاؤ کہ ان اوراق کو کیسے چُھوا جا سکتا ہے؟" اس پر بہن نے تڑ سے جواب دیا: "جاؤ پہلے غسل کر کے اپنے جسم کو پاک کرو۔" عمر نے اپنی بہن کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ وُہ سب کچھ بھول گئے جو اب تک ہوا تھا۔ جب وہ غسل خانے سے نکلے تو ان کی بہن نے انھیں قرآن حکیم کے چند پارے دیے۔ عمر نے قرآن حکیم کے ان اوراق کا مطالعہ کیا۔ وہ قرآن کے پیغام سے اتنے متاثر ہوئے کہ بول اٹھے: "اسلام قبول کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟" اس موقع پر قرآن کا معلّم جو گھر کے اندر ہی چُھپا ہُوا تھا نکل آیا اور بولا: "دو ایک روز قبل رسولِ خدا نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی تھی یا اللہ! ابو جہل یا عمر کو دائرۂ اسلام میں داخل کر کے میری مدد فرما۔ مجھے یقین ہے اے عمر! تم رسولِ خداؐ کی اسی دعا کی برکت سے اسلام کی نعمت سے نوازے جا رہے ہو، میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں اپنے نبیؐ کے پاس لے چلتا ہوں۔" (اس وقت حضور اکرمؐ ایک صحابی ارقم کے گھر میں چھپے ہوئے تھے جو ایک پر جوش مگر خاموش نو مسلم تھے) جب لوگوں نے (ارقم کے گھر کے دروازے پر) عمرؓ کی آواز سُنی تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے مگر رسولِ خدا نے فرمایا: "ڈرو مت، وہ اکیلا ہے اور تم خاصی تعداد میں ہو۔" جب عمرؓ اندر آئے تو حضور اکرمؐ نے ان سے پر جوش مصافحہ کیا اور فرمایا: "عمر! تم کب تک غلط راہوں پر چلتے رہو گے؟"

اس کے جواب میں عمرؓ نے بآوازِ بلند مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ موقع پر موجود مسلمانوں نے بے اختیار نعرۂ تکبیر بلند کیا اللّٰہ اکبر (اللہ عظیم ترین ہے) آس پاس کے گھروں میں لوگ حیران ہو گئے کہ ارقم کے خاموش سے گھر میں کیا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، " کافر تو کھلے بندوں بت پرستی کرتے ہیں ہم کیوں چھپ کر اس اللہ کی عبادت کریں۔" چنانچہ مسلمان ایک جلوس کی صورت میں کعبۃ اللہ میں گئے جس کی قیادت حضرت عمرؓ کر رہے تھے۔ انھوں نے کعبہ کے صحن میں سرِعام نماز ادا کی۔ حضرت عمرؓ کی نماز میں شمولیت کسی بھی قسم کے ناگوار ردِ عمل کو روکنے کے لیے کافی تھی۔ نماز کے بعد مسلمان خاموشی سے لوٹ آئے۔

۱۰۶۔ کافروں کے خاندانوں کے نوجوان اور غلام ہی نہیں ان کے متعلقین (زیر دست) اور ان کے لئے پالک بھائی (موالی) تک ان کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ عمار ابن یاسر کو جو یمنی الاصل تھے اور ابوجہل کے قبیلہ مخزوم کے زیر دست تھے، اتنی اذیت اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ وہ خود کو اس اذیت سے بچانے کے لیے کچھ بھی کہنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ایک روز وہ رسولِ خدا کے پاس آئے اور بتایا کہ اسلام سے لاتعلق اور کفر کا اقرار کرانے کے لیے ان پر کس طرح تشدد کیا جاتا ہے۔ نبیِ خداؐ نے کہا" کوئی بات نہیں، جب تک تم دل سے مسلمان ہو زبان سے ایسا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا۔" یاسمٰ (عرف سمیہ) جو عمار کی معمر والدہ تھیں اپنے بیٹے پر تشدد برداشت نہیں کر سکتی تھیں، ایک مرتبہ انھوں نے ابوجہل کو بُرا بھلا کہا اور اس کی بے عزتی کر دی۔ ابوجہل غصے میں آگیا اور اس نے اپنا نیزہ بوڑھی خاتون کے پیٹ میں گھونپ کر انھیں قتل کر دیا۔ عمار کی والدہ کے نام یاسمٰ سے جسے جدید ترکی میں یاموک کہا جاتا ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترکی نژاد تھیں۔ وہ اسلام کی پہلی خاتون شہید ہیں۔ ان کا تعلق کسگر سے تھا (جو ایران کے خطہ زندورد کا ایک علاقہ ہے)

۱۰۷۔ رسولِ خدا کی ذات بھی کافروں کی طرف سے اذیت کا نشانہ بنتی رہتی تھی۔ ان کے دروازے پر کانٹے اور کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ ان کی گلی میں خصوصاً اس وقت کانٹے بچھا دیے جاتے تھے جب حضورِ اکرمؐ رات کو دیر سے گھر لوٹتے تھے اور گلیوں میں روشنی نہیں ہوتی تھی۔ جب آں حضورؐ کعبہ میں نماز ادا فرماتے اور سجدے میں ہوتے تو شرپسند کافر ان کے سر یا پیٹھ پر بھاری پتھر یا قربان کیے جانے والے جانوروں کی اوجھڑی رکھ دیتے تھے۔ وعلیٰ ہٰذالقیاس

۱۰۸۔ انسانی فطرت ایک سربستہ راز ہے اور (مختلف امور پر) افراد کا ردِ عمل یکساں نہیں ہوتا۔ رُکانہ مکہ کا ایک پیشہ ور پہلوان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنا شہ زور تھا کہ اگر وہ کسی جانور کی کھال پر کھڑا ہو جاتا اور بہت سے افراد اس کھال کو کھینچتے تو کھال پھٹ جاتی مگر رُکانہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ایک روز وہ رسولِ خدا کے پاس گیا اور بولا" اگر تم مجھے پچھاڑ لو میں تمھیں اللہ کا نبی مان لوں گا۔" بعض روایات کے مطابق اس نے اس کشتی پر اپنی بھیڑوں کے غلہ کا ایک تہائی بطور شرط پیش کرنے کا بھی اعلان کیا۔ مقابلہ ہُوا اور اسے شکست ہو گئی مگر اسے اطمینان نہ ہوا اور اس نے دوبارہ مقابلہ کی استدعا کی۔ جب رسولِ پاکؐ نے اسے متواتر تین بار پچھاڑ دیا تو اس نے رونا شروع کر دیا، اور بولا: " میں

اپنی تمام بھیڑوں کے شرط میں ہار جانے کے متعلق اپنی بیوی سے کیا کہوں گا!" رسولِ خداؐ نے اپنی عالی ظرفی کے باعث اس کی تمام بھیڑیں واپس کر دیں۔ مگر رسولِ اسلامؐ کی مہربانی پر خوشگوار ردِ عمل کے بجائے وہ پھر بھاگ کر کافروں کے ٹولہ میں پہنچ گیا۔ اور ان سے بولا، "محمدؐ کو نقصان نہ پہنچاؤ، اسے محفوظ رکھو، اگر تمھیں کبھی کسی بیرونی قبیلہ سے مقابلہ درپیش ہو تو تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے پاس ایک ایسا جادوگر ہے جس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا۔ خدا کی قسم! محمدؐ محیر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے وہ اس دور کا عظیم ترین جادوگر ہے۔"

۱۰۹۔ ابوجہل تو اور ہی طرح کے احساس میں مبتلا تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا: میں جانتا ہوں محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں، درست ہے۔ مگر قبل ازیں اُن کا قبیلہ خیرات وغیرہ کرتا تھا تو ہم بھی اسی طرح کرتے تھے۔ جب وہ پُر تکلف دعوتوں کا اہتمام کرتے تو ہم بھی جواب میں شاندار دعوت کر دیتے غرضیکہ ان کا قبیلہ شان و شوکت کے اظہار کے لیے جو بھی عمل کرتا ہم اس کے جواب میں پورے اُترتے، اب محمدؐ کا قبیلہ فخر سے کہتا ہے کہ "اللہ نے ہمارے ہاں نبی مبعوث فرمایا ہے"۔ بھلا ہم اپنے قبیلہ میں نبی کہاں سے لائیں۔ نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا کہ محمدؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔

۱۱۰۔ مکہ میں نیک دل اشراف کی بھی کمی نہ تھی۔ جب کبھی آوارہ لڑکے (بڑوں کے ایما پر) گلیوں میں آنحضورؐ کا تعاقب کرتے، ان پر پتھر وغیرہ پھینکتے اس وقت اگر رسولِ خداؐ ابوسفیان کے گھر کے قریب ہوتے تو حضورؐ اس گھر میں پناہ حاصل کر سکتے تھے ابُوسفیان خود آوارہ چھوکروں کو ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ جب یہ آوارہ منش لڑکے بھاگ جاتے تو حضورِ اکرمؐ اپنی راہ لیتے۔ ایک روز بزدل اور کمینے ابوجہل نے رسولِ خداؐ کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو جو چھوٹی سی تھیں، دیکھا۔ اس نے حضرت فاطمہؓ سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ اس ملعون کو کوسے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس پر ابوجہل نے حضرت فاطمہؓ کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا اور وہ رونے لگیں۔ ابوسفیان ادھر سے گزر رہے تھے، انھوں نے بچی سے رونے کا سبب پوچھا۔ جب حضرت فاطمہؓ نے انھیں ماجرا بتایا تو ابوسفیان نے بچی کو بازو سے پکڑ لیا۔ وہ سیدھے ابُوجہل کے پاس گئے اور اس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیے، پھر انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ وہ ابوجہل کے منہ پر تھپڑ ماریں اور اپنا بدلہ چکائیں۔ سیدہؓ نے ابُوجہل کو تھپڑ لگایا اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ فطری بات ہے کہ جب رسول اللہؐ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ ابُوسفیان کے لیے اظہارِ تشکر کیے بغیر نہ رہ سکے۔

۱۱۱۔ مکہ کا معاشرتی ڈھانچہ ایسا تھا کہ لوگ قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ گو داخلی اور خارجہ امور میں مکہ کے تمام قبائل ایک وفاق کی طرح اجتماعی طور پر عمل کرتے تھے مگر داخلی معاملات میں ہر قبیلہ مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھا۔ ہر قبیلہ کے اندر زبردست اتحاد اور ہم آہنگی تھی۔ وہ سب دُکھ سُکھ میں ایک دُوسرے کے ساجھی تھے، گویا "ایک سب کے لیے اور سب ایک کے لیے" کا اصول ان میں کار فرما تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر کسی ایک قبیلے کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ آسانی سے کسی دُوسرے قبیلے کے کسی فرد کو نقصان پہنچا سکے۔ رسولِ خداؐ کا قبیلہ بڑا طاقت ور تھا۔ نہ صرف یہ کہ بنو ہاشم تعداد میں بہت زیادہ تھے بلکہ ان کا عم زاد قبیلہ بنو المطلب کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی تھا۔ بنو ہاشم کا ایک اور طاقتور قبیلہ بنو خزاعہ سے بھی قریبی اتحاد تھا۔ پھر ان کے مدنی رشتہ دار جن کا تعلق بنو نجار سے تھا ہر وقت رسولِ خداؐ کے خاندان کی

امداد کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ آنحضورؐ کے مخالفین اس وقت تک رسولِ خداؐ سے دشمنی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے جب تک بنو ہاشم کے سردار جناب ابوُطالب رسولؐ اللہ کے پشت پناہ تھے۔ ابو طالب نے چونکہ اسلام قبول نہیں کیا تھا، لہٰذا کفارِ مکّہ کو توقع تھی کہ وہ ایک دن اپنے بھتیجے کی مخالفت شروع کر دیں گے۔ کفارِ مکّہ کا ایک وفد ابو طالب کے پاس آیا اور ان سے کہا: ”آپ کا بھتیجا محمدؐ شہر میں غیر ضروری طور پر کشیدگی پھیلا رہا ہے۔ اس نے خاندانوں میں پھوٹ ڈال دی ہے اور دوستوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اگر وہ اس طرح روپیہ پیسہ چاہتا ہے تو ہم اسے مطلوبہ رقم ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اگر وُہ شادی کا خواہشمند ہے تو ہم شہر کی حسین ترین دوشیزہ اس کے عقد میں دے دیتے ہیں۔ اگر وہ اقتدار چاہتا ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں مگر صرف ایک شرط پر کہ وہ ہمارے معبودوں (بتوں) کو بُرا بھلا کہنے اور ہمارے اسلاف کے مذہب کی توہین کا سلسلہ بند کر دے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سمجھ لو کہ تم اپنے قبیلہ کے خلاف پورے مکّہ کے لوگوں کی متحدہ دشمنی کو دعوت دے رہے ہو۔“ جناب ابو طالب نے اس معاملہ پر غور کا وعدہ کر لیا۔ پھر انھوں نے رسولؐ اللہ کو پوری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مکہ کے لوگوں کی پیشکش مسترد کرنے سے قبل دوبارہ غور کر لیں۔ لیکن نبیِ خداؐ نے فوراً جواب دیا: ”اگر وُہ (مکّی کفار) میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں تو بھی میں اسلام کی دعوت میں ایک ذرہ برابر تبدیلی کرنے کو بھی تیار نہیں جس کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ اللہ عظیم ترین ہے۔ وُہ میری ہر طرح حفاظت کرے گا۔“ حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے چچا سے رخصت ہو گئے مگر جناب ابو طالب نے انھیں آواز دے کر واپس بُلایا اور انھیں بتایا کہ وُہ کبھی اپنے بھتیجے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

۱۱۲۔ کفار کا ایک اور وفد آیا اور مصالحت کی تجویز پیش کی: ”ہم محمدؐ کے خدا کی عبادت کے لیے تیار ہیں۔“ انھوں نے کہا ”مگر محمدؐ کو بھی ہمارے معبودوں کی عبادت کرنا ہوگی۔ اس طرح ان دونوں میں سے جو بھی سچا ہوگا وہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا۔ اور اس طرح دوہری بندگی سے ہم میں سے کسی کو کچھ نقصان بھی نہ ہوگا۔“ اس پر رسولِ خداؐ نے قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات پڑھتے ہوئے کفار کی تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا:

”کہہ دو اے کافرو!
نہ میں تمھارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں
اور نہ ہی تم میرے معبود کی عبادت کرتے ہو
اور نہ میں تمھارے معبودوں کی عبادت کروں گا
اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کروگے
تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین“ (۱۰۹/ ۱-۶)

۱۱۳۔ کفارِ مکّہ اس پر اور بھی مشتعل ہو گئے اور انھوں نے اسلام کے نام لیواؤں پر مظالم کا سلسلہ تیز تر کر دیا۔ رسولِ خداؐ نے جب دیکھا کہ وُہ اپنے پیروکاروں کو جن کا تعلق دوسرے قبائل سے ہے تحفظ نہیں دے سکتے تو انھوں نے

ان لوگوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کو کہا۔ رسولِ خداؐ نے انھیں بتایا کہ "حبشہ کا بادشاہ انصاف پسند ہے۔ اس کی قلمرو میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔" ممکن ہے نبی کریمؐ کو شاہِ حبشہ کے بارے میں کسی تجارتی سفر کے دوران یہ باتیں معلوم ہوئی ہوں۔ حضورؐ شام، فلسطین، اومان (عُمان) اور یمن کا سفر کر چکے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرتؐ کسی تجارتی سفر کے دوران یمن سے باب المندب عبور کر کے حبشہ بھی گئے ہوں۔ پیغمبرِ خدا کے ایک خط میں جس کا ذکر علامہ طبری نے کیا ہے۔ لکھا گیا ہے: "میں نے اپنے عم زاد جعفر کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ چند اور مسلمان بھی ہیں، اگر وہ آپ کے پاس آئے تو اس سے حُسنِ سلوک کریں اس پر ظلم نہ کریں۔" یہ ایک تعارفی خط معلوم ہوتا ہے جو رسولِ خداؐ نے اپنے عم زاد جعفر ابن ابوطالب کو اس وقت دیا تھا جب وہ ہجرت کر کے شاہِ نجاشی کے دربار میں گیا تھا۔ جب حبشہ میں ہجرت کر کے جانے والے مسلمانوں سے حُسنِ سلوک روا رکھا گیا تو مکّہ سے مزید مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ اس سے کفارِ مکّہ کے غیظ و غضب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

۱۱۴ء مکّہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ رُونما ہُوا جس سے غلط فہمی نے جنم لیا۔ ایک روز رسولِ خدا نماز کے دوران قرآن حکیم کی بعض آیات (۵۳/ ۱۹-۲۰) بآوازِ بلند تلاوت فرما رہے تھے۔ ان آیات میں مکہ میں پُوجے جانے والے دو بڑے بتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے "کیا تم لات اور عزّیٰ کو دیکھتے ہو۔۔۔۔" اس کے بعد بعض لوگوں نے سُنا "وہ عظیم معبود ہیں اور وُہ اپنے پُوجنے والوں کی شفاعت کر سکتے ہیں۔" بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ شیطان نے کہے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے رسولِ خدا نے یہ الفاظ سوالیہ انداز میں کہے ہوں (درحقیقت قرآن پاک میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن کا آغاز تو سوالیہ الفاظ سے نہیں ہوتا مگر ان میں سوال پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ۴-۹، ۶-۷، ۱۱۵-۔ تاہم اوپر جن الفاظ کا ذکر ہے وہ قرآن حکیم میں موجود نہیں ہیں) پھر رسولِ خدا رکوع میں جھکے اور بعد ازاں سجدہ میں چلے گئے۔ جو لوگ رسولِ خدا سے دور کعبہ کے صحن میں نماز ادا کر رہے تھے اُنھوں نے حضور پاکؐ کی قرأت براہِ راست نہیں سُنی تھی بلکہ ایک مکّی مکبّر کی آواز ان تک پہنچی تھی جس نے حضورؐ کی زبان مبارک سے ادا ہونے الفاظ کو غلطی سے "مثبت" سمجھا اور بتوں کی "کبریائی اور شفاعت" پر مشتمل الفاظ کو بآوازِ بلند دُہرا دیا۔ پھر رسولِ خدا کی اقتدا میں رکوع اور پھر سجدہ میں چلا گیا۔ جب یہ بات پھیلی اور رسولِ خدا کو بھی اس کا علم ہُوا تو انھوں نے بتوں کی تعریف کی تردید کی۔ گو غلط فہمی تو دُور ہو گئی مگر اس کے بعد کفارِ مکہ کے غیظ و غضب کی آگ اور بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ اُنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا جو شاہِ نجاشی سے ملا۔ کفّار کے وفد نے شاہ کے درباریوں کو رشوت دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا اور مطالبہ کیا کہ اسلام کے پیروکاروں کو حبشہ سے نکال باہر کیا جائے۔ شاہِ نجاشی نے مہاجرین کو بھی طلب کیا اور ان کا موقف سنا اس نے کفارِ مکہ کی سازش کی بُو سُونگھ لی اور ان کا غیر منصفانہ مطالبہ یکسر مسترد کر دیا۔

۱۱۵ء حبشہ کے مشن میں ناکامی کے بعد کفارِ مکّہ نے جناب ابوطالب پر دباؤ بڑھانا شروع کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دیں۔ ایک وفد ان سے ملا جس نے کہا "محمدؐ آپ کا حقیقی بیٹا تو نہیں محض لے پالک ہو سکتا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔ ہم اس (محمدؐ) کے عوض آپ کو مکّہ کا خوب صورت اور ذہین ترین نوجوان پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے اپنا

بیٹا بنالیں۔" اس پر ابوطالب نے انھیں طنز وحقارت سے لبریز جواب دیا " میں تو اپنا بیٹا تمھارے حوالے کر دوں تاکہ تم اس کی گردن مار سکو، لیکن تمھارے بیٹے کو پالنے پوسنے کے لیے اپنے پاس رکھ لوں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

۱۱۶۔ اب کفارِ مکہ نے مشاورت کی اور جنگ کا خطرہ مول لیے بغیر ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ مکہ کے تمام اسلام دشمن قبائل، ان کے قریبی علاقہ کے اتحادیوں خصوصاً احابیش[1] نے رسولِ خدا کے خاندان کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا "کوئی شخص رسول اللہ کے خاندان کے کسی فرد سے بات چیت نہیں کرے گا، نہ ان کے ہاتھ کوئی شے فروخت کرے گا نہ ان سے خریدے گا اور نہ ہی ان کو اپنی لڑکی کا رشتہ دے گا نہ ان کا رشتہ قبول کرے گا۔" چنانچہ حضور اکرمؐ کا قبیلہ مکہ سے نکل کر ایک الگ تھلگ نواحی علاقہ میں چلا گیا جہاں بچوں اور خواتین پر کفارِ مکہ کی تیراندازی یا سنگ باری کی آسانی سے مدافعت کی جا سکتی تھی۔ ابولہب جس کی قسمت میں ہدایت نہیں لکھی تھی اپنے قبیلہ سے جُدا ہو گیا اور اس نے کفارِ مکہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ مکہ میں ہی رہا (جہاں غالباً اس کی معمولی سی دکان تھی) حضورؐ کے خاندان کے بائیکاٹ کا فیصلہ باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور تحریری معاہدہ کعبہ کی ایک دیوار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ بائیکاٹ مسلسل کئی سال جاری رہا اور اس دوران فدایانِ رسول کو ناقابلِ برداشت مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس دوران رسولِ خدا کے قبیلہ میں بیاہی جانے والی خواتین مثلاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ وغیرہ کے عزیز و اقارب چوری چھپے اناج وغیرہ محصورین کو بھجواتے تھے۔ ایامِ حج میں یہ لوگ بیرونِ مکہ سے آنے والے تاجروں سے ضرورت کی اشیا خرید سکتے تھے۔ مگر ان کے آمدنی کے تمام وسائل ختم ہو چکے تھے، ان کی تجارت تباہ ہو گئی اور صرف اخراجات کا بار رہ گیا۔

۱۱۷۔ ایک روایت ہے کہ ایک روز رسولِ خدا نے اپنے رفقا کو بتایا کہ کفار نے اُن کے بائیکاٹ کا جو معاہدہ کعبہ میں لٹکا رکھا تھا، اسے دیمک چاٹ گئی ہے۔ پوری دستاویز پر صرف "اللہ" اور "محمد" کے نام باقی رہ گئے ہیں۔ ابوطالب نے کفارِ مکہ کو بھی اس سے آگاہ کیا۔ مکیوں نے جا کر دیکھا تو رسولِ خدا کی بات درست پائی۔ وہ سخت متعجب ہوئے مگر ان پر کوئی مثبت اثر نہ ہُوا۔ بائیکاٹ کے خلاف بعض انفرادی کوششیں مؤثر ثابت ہوئیں۔ ان میں سے ایک شخص جو بھوک اور پیاس سے بلکتے بچوں کی آہ و بکا برداشت نہ کر سکا، اپنے ایک معتمد دوست سے ملا اور اس سے مشورہ کیا۔ اس کا دوست بھی بچوں پر یوں ظلم وستم کا مخالف تھا، مگر کوئی آواز بلند کرنے سے قبل مزید افراد کا تعاون حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کوششیں جاری رہیں اور مختلف قبائل کے چھ ہم خیال افراد مل گئے۔ اُنھوں نے ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا تاکہ اس سلسلے میں پیش رفت کے لیے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔ اگلی صبح کو ان میں سے ایک نے کعبہ میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ وہ (رسولِ خدا کے قبیلہ کے) بائیکاٹ کا مخالف ہے۔ ابوجہل نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس پر وہ چھ ہم خیال افراد باری باری اُٹھے انھوں نے اعلان کیا کہ ان کے قبیلے بائیکاٹ کے معاہدے سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ اس پر عمل درآمد کے پابند نہیں ہیں۔

---

[1] ان احابیش کو حبشہ کے لوگوں سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ حبشی تو تھے مگر ان کا تعلق عرب قبیلہ بنوکنعان سے تھا۔

۱۱۸ - اس کے بعد حضورِ اکرمؐ کا خاندان واپس مکّہ آگیا۔ تنگدستی اور عُسرت کے ان سالوں میں متعدد افراد کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے جو رسولِ خدا کی شریکِ حیات تھیں، داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے بعد جناب ابو طالب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے جو رسولِ خدا کی سب سے مضبوط پشت پناہ تھے۔ اب ابو لہب قبیلہ کا سردار بن گیا۔

۱۱۹ - کچھ وقت خاموشی اور رنج والم میں گزر گیا۔ مکّہ کی ایک معمر خاتون سودہ قبولِ اسلام کے بعد اپنے شوہر سمیت حبشہ چلی گئی تھیں۔ سودہ کا شوہر سُکران حبشہ میں قیام کے دوران عیسائیت کی طرف مائل ہو گیا۔ مگر سودہ تمام تر دباؤ اور ترغیب وتحریص کے باوجود اسلام پر استقامت سے ڈٹی رہیں۔ سکران کا انتقال ہو گیا تو سودہ مکّہ لوٹ آئیں۔ رسولِ خدا نے اس معمر خاتون کی استقامت کو سراہا۔ رسولِ خدا نے ان سے نکاح کی تجویز پیش کی اور انھوں نے یہ اعزاز بخوشی قبول کر لیا۔ ظاہر ہے سودہ خاتون کا کوئی بچہ نہ تھا۔ چنانچہ وُہ رسولؐ اللہ کے بچّوں کی نہایت پیار اور محبت سے دیکھ بھال کرتی تھیں۔

۱۲۰ - ابولہب زیادہ دیر تک رسولِ خدا کے خلاف دِلی نفرت کو چھپا نہ سکا۔ اس نے جلد ہی حضورِ اکرمؐ کے سماجی بائیکاٹ کا بہانہ ڈھونڈ لیا اور انھیں باغی قرار دے دیا۔ اب کوئی بھی شخص کسی خوف وخطر کے بغیر حضورؐ کی جان لے سکتا تھا۔ ان حالات میں کسی اور قبیلہ کی پناہ حاصل کرنے کے بجائے رسولِ خدا نے ہجرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا۔ طائف کا قصبہ مکّہ سے دو دن کی مسافت پر تھا۔ وہاں حضورؐ کے ماموں رہتے تھے۔ آپ ان لوگوں کو آزمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے بیوی بچّوں کو گھر میں چھوڑ کر آں حضور اپنے وفادار ملازم زید ابنِ حارث کے ہمراہ طائف گئے، انھوں نے اپنے ماموں سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ جب اُنھوں نے طائف کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دی تو ان کا ردِ عمل غیر متوقع طور پر کفارِ مکّہ سے بھی زیادہ سخت اور مخالفانہ تھا۔ انھیں فوری طور پر شہر سے نکل جانے کو کہا گیا۔ آوارہ چھوکرے اُن کے پیچھے لگ گئے۔ اُنھوں نے شدید سنگباری کر کے رسولِ خدا اور ان کے ملازم کو شدید زخمی کر دیا۔ رسولِ پاکؐ نے ایک شخص کو باغ کے دروازے پر کھڑے دیکھا جس نے انھیں پناہ دی اور اللہ کے رسولؐ پر سنگباری کرنے والے آوارہ منش لڑکوں کو تعاقب کر کے بھگا دیا۔ یہ باغبان ایک عیسائی غلام تھا۔ اس نے رسولِ خدا کی مہمان نوازی کی اور انھیں کچھ پھل کھانے کو دیئے۔ حضورِ انورؐ نے پھل کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھی تو عیسائی غلام کو ان کے بارے میں کرید ہوئی۔ چنانچہ اس نے رسولِ خدا سے مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں آوارہ چھوکروں کا ہنگامہ فرو ہو گیا تو خدا کے نبیؐ واپس مکّہ آگئے۔ راستے میں حضورؐ نے رات نخلہ کے مقام پر بسر کی۔ اُنھوں نے نماز ادا کی اور بے یار و مددگار مصائب میں مبتلا رہنے پر اللہ میاں سے شکوہ بھی کیا۔ وُہ مایوس تو ہرگز نہیں تھے اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اسلام کا عظیم پیغام جو اللہ تعالیٰ نے انھیں ودیعت فرمایا تھا لوگوں تک پہنچانے کی ہمت بھی دے۔ پیغمبرِ خدا نے اس رات جو دعا مانگی اس کا متن جُوں کا توں محفوظ ہے اور مسلمان اسے بے حد متبرک تصور کرتے ہیں۔ خدا نے اپنے نبیؐ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور رسولِ خداؐ پر قرآن پاک کی ۷۲ ویں سورہ "جن" نازل ہوئی۔ اس سے حضورؐ کی حوصلہ افزائی

بھی ہُوئی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مطلع کیا کہ اُس رات کچھ جن رسولِ خدا کے قریب سے گزرے اُنھوں نے رسولؐ اللہ کو قرآن حکیم کی تلاوت کرتے سُنا۔ جنوں پر انکشاف ہُوا کہ مُوسیٰ کے بعد وہ نئے نبیؐ مبعوث ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسلام قبول کیا اور یہ عزم لے کر چلے گئے کہ وہ دُوسرے اجنّہ میں اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ سورہ جن کے آغاز میں ہی کہا گیا ہے: "مجھے بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن پاک سنا . . . . " اس کا یہ مطلب ہے کہ خود رسولِ خدا (اُس رات) اپنے آس پاس ان غیر مرئی ملاقاتیوں کی موجودگی سے لاعلم تھے۔

۱۲۱۔ پیغمبر واپس مکّہ کے نواح میں غارِ حرا کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ انھوں نے ایک پیامبر اپنی والدہ محترمہ کے ایک قریبی عزیز کے پاس بھیجا کہ وہ رسولِ خدا کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ مگر اس عزیز نے انکار کر دیا۔ پھر انھوں نے اپنی نئی اہلیہ سودہ کے ایک عزیز کو آزمایا جو رسولِ خدا کے خاندان کے بائیکاٹ کا زبردست مخالف رہا تھا اور چوری چھپے انھیں کھانے پینے کی اشیا بھی بھجوایا کرتا تھا۔ اس نے پیغمبر کو پناہ دینے کی ہامی بھر لی۔ اس نے اپنے خاندان کے چند دیگر افراد کے ساتھ ہتھیار سنبھالے اور غارِ حرا میں گئے تاکہ رسولِ خدا کو بحفاظت مکّہ لا سکیں۔ اس نے کعبہ کے صحن میں للکار کر کہا کہ اس نے محمدؐ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔

معراج

۱۲۲۔ مکّہ میں کسی مفید کام کے لیے نہ گنجایش تھی اور نہ ہی اس کی کوئی اُمید تھی۔ رسولِ خدا اپنا بیشتر وقت عبادت اور غور و فکر میں گزارتے تھے۔ مکّہ میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے فروغ کی گنجایش نہیں تھی بلکہ جو لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے اُن کے لیے آزادانہ عبادت اور اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی بھی مفقود تھی۔ طائف سے واپسی کے فوراً بعد آنحضورؐ جناب ابُوطالب کے گھر گئے، غالباً وہ اپنے پیارے چچا کے اہلِ خانہ کو طائف کے رشتہ داروں کے ناروا سلوک کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ رسولِ خدا کو یقیناً ابوطالب کی یاد نے ستایا ہو گا جن کی زندگی میں انھیں ہر طرح سے تحفظ حاصل تھا۔ آپ نے رات اپنے مرحوم چچا کے ہاں بسر کی۔ وہاں اُنھوں نے ایک متبرک خواب دیکھا:

۱۲۳۔ رسولؐ اللہ نے دیکھا کہ گویا وہ کعبۃ اللہ کے صحن میں موجود ہیں۔ جبرائیل آئے اور رسولؐ اللہ کو جگا کر اللہ کا پیغام پہنچایا۔ خدا نے اپنے نبی کو عرش پر ملاقات کی دعوت دی تھی۔ جبرائیل رسولِ پاکؐ کی سواری کے لیے جنّت سے براق لائے تھے۔ رسولِ خدا براق پر سوار ہو کر آسمانوں کو روانہ ہوئے جبکہ جبرائیل ان کے پائلٹ کے طور پر آگے آگے محوِ پرواز تھا۔ ایک لمحے میں رسولؐ اللہ پہلے آسمان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جبرائیل نے رسولؐ اللہ کی آمد کا اعلان کیا اور پہلے آسمان کے دربان نے تصدیق کے بعد در وا کر دیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ نے رسولؐ اللہ کا استقبال اپنے بیٹے کی حیثیت سے پدرانہ محبت اور فخر کے ساتھ کیا جو کسی بھی باپ کو اپنے عظیم بیٹے پر ہو سکتا ہے۔ رسولِ خدا کو پہلے آسمان کے عجائبات کی سیر بھی کرائی گئی۔ بعد ازاں سب دوسرے، تیسرے، چوتھے اور بالآخر ساتویں آسمان پر پہنچے۔ ہر آسمان پر ایک یا دو پیغمبروں نے نبی آخر الزماںؐ کا استقبال کیا،

ان میں عیسٰی مسیح، یوحنا، اصطباغی، ہارون اور موسٰی وغیرہ شامل تھے۔ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ رسول اللہ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دوسرے مرسلین نے تو حضورؐ کا اپنے بھائی کی طرح استقبال کیا جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کا خیر مقدم اپنے بیٹے کے طور پر کیا۔ انھوں نے یوں سرفراز کیے جانے پر انھیں مبارک باد دی۔ ہر آسمان پر رسولِ خدا کو ناقابلِ بیان عجائبات دکھائے گئے۔ پھر یہ مختصر سا قافلہ ایک بلند مقام پر پہنچا جہاں بیری کی طرح کا ایک درخت (سِدرہ) ناقابلِ عبور سرحد کا نشان فاصل بناتا ہے۔ جبرائیل نے یہ کہہ کر رسولِ خدا سے واپسی کی اجازت طلب کی کہ "اگر میں اس حد سے آگے گیا تو اللہ کا نور مجھے جلا کر خاک کر دے گا۔ آپ چونکہ مدعو ہیں لہٰذا آپ آگے جا سکتے ہیں۔" پھر جبرائیل نے حضورؐ انور کو آگے جانے کا راستہ بتلایا۔ مختلف نشانیوں کی مدد سے رسولِ خدا ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں انھوں نے صریرِ خامہ سنی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام وصول کر کے متعلقہ ہستیوں تک پہنچائے جاتے تھے۔ رسولؐ اللہ آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ وہ حظیرۃ القدس تک پہنچ گئے۔ جب ان کے اور خدا کے درمیان دو کمانوں کے مساوی یا اس سے بھی کم فاصلہ (قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی) رہ گیا تو وہ ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور تحیۃ (پُرنیاز و پُرخلوص سلام) پیش کیا فوراً ہی جواب ملا:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔

رسولِ خدا نے التحیات (سلام و نیاز) جاری رکھا اور دوسروں کو اللہ کی مہربانیوں اور عنایات میں شریک کرنے کی خاطر مزید کہا:

اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔

"پھر خدا نے اپنے بندے پر وحی نازل کی جو وہ نازل کرنا چاہتا تھا۔" (قرآن ۵۳/۱۰)

اس نے اگر موسٰیؑ پر سینائی میں دس احکام نازل فرمائے تھے تو اس نے محمدؐ پر بارہ احکام نازل فرمائے (قرآن ۱۷/۲۳-۳۹) جو زیادہ جامع ہیں اور نہایت عمدہ ضابطۂ اخلاق وضع کرتے ہیں:

۱۔ اور حکم دیا تیرے پروردگار نے کہ نہ عبادت کرو مگر اللہ کی،

۲۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان (حُسنِ سلوک) کرو......،

۳۔ اور دے قرابت داروں کو حق ان کا۔ اور ضرورت مندوں کو اور مسافروں کو......،

۴۔ اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر نہ رکھ اور نہ ہی اسے بالکل ہی کھول دے......، (نہ تو اسراف کر اور نہ ہی کنجوسی کو اپنا)

۵۔ اپنے بچوں کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کر......،

۶۔ اور زنا کے قریب بھی مت جا......،

۷۔ اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کر......،

۸۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر جس طریقہ سے کہ بہتر ہو جب تک وُہ اپنی قوت (اکثر بت) کو پہنچے ......'
۹۔ عہد کو پُورا کرو......'
۱۰۔ اور ناپ تول کر دو تو پُورا ناپو اور صحیح ترازو سے تول کر دو۔
۱۱۔ اور جس بات کی تجھے خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ، بیشک کان، آنکھ اور دل سے (ان کے کاموں کے بارے میں) باز پرس ہوگی۔
۱۲۔ اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل.......۔

خدا نے یہ بات منظور کرتے ہوئے کہ اس کے فضل و کرم کا سزاوار صرف نبیؐ کو ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کے نیک بندوں کو بھی اس میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ فرمایا کہ نیک بندے دن میں پچاس بار نماز ادا کر کے (عبادت کر کے) میری رحمت کے خزانہ میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے (ملاقات کے بعد) رسولؐ کو واپس زمین پر جانے کی اجازت دی تو خدا نے عرش کے خزانہ میں سے ایک قیمتی تحفہ اپنے نبی کو ودیعت کیا۔ رسول اکرمؐ کی ایک حدیث کے مطابق اس تحفہ کا ذکر قرآن پاک کی دوسری سورہ کی آخری دو آیات میں کیا گیا ہے۔ ہم پڑھتے ہیں "خدا کسی شخص کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔" بھلا نوعِ انسانی کے لیے، اپنی تمام تر کمزوریوں کے پیشِ نظر اس سے بہتر اور کون سا تحفہ ہو سکتا ہے! اگر خدا ہماری استطاعت کے مطابق ہم پر فرائض عائد نہ کرتا بلکہ جو احکام چاہتا نافذ کر دیتا تو روزِ قیامت ہم کہاں کھڑے ہوتے؟ عرش بریں سے واپسی پر جبرائیل نے آنحضورؐ کو دوزخ اور جنت کی سیر کرائی۔ وہ جنت الفردوس میں مختلف پیغمبروں سے بھی ملے جنھوں نے شاندار اعزاز پانے پر رسولِ خدا کو مبارکباد دی۔ حضرت موسیٰؑ کو جب معلوم ہُوا کہ مسلمانوں کے لیے دن میں پچاس نمازوں کا حکم ہُوا ہے تو انھوں نے اپنی قوم کے تلخ تجربہ کا ذکر کیا اور رسولؐ اللہ سے کہا کہ وُہ نمازوں کی تعداد میں کمی کے لیے بارگاہِ ایزدی میں استدعا کریں۔ چنانچہ رسولِ خدا کی بار بار درخواست پر اللہ تعالیٰ نے پچاس کی جگہ پانچ نمازوں کا حکم فرمادیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ نے یہ وعدہ فرمایا کہ ان پانچ نمازوں کا اجر پچاس نمازوں کے برابر ہی ہو گا۔ (قرآن ۶/۱۹۰) اور تب اللہ کے نبیؐ نے اعلان کیا کہ:

"نماز مومن کی معراج ہے۔"

ایک اور روایت کے مطابق "نماز ہر مسلمان کے لیے خدا کا قرب (کا ذریعہ) ہے"۔ البتہ خدا کے حضور ہر شخص کے لیے خدا کی قربت کا درجہ (اللہ کے نزدیک) اس کے تقویٰ کے مطابق جُداگانہ ہوگا۔ جو لوگ اسلامی طریقِ عبادت (نماز) کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دورانِ نماز بندہ اپنے خالق سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتا ہے (التحیات للہ) پھر جب اسے روحانی طور پر اپنے مالک کی حضوری حاصل ہوتی ہے (تشہد) وہ بالکل اسی طرح عمل کرتا ہے جیسے رسولؐ اللہ نے شبِ معراج میں حضوری کے وقت کیا تھا۔ رسولِ خدا واپسی پر پہلے بیت المقدس میں اُترے جہاں تمام سابق پیغمبر آپ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ یہاں دو رکعت نفلِ شکرانہ ادا کیے گئے تمام پیغمبروں کی متفقہ درخواست پر حضور اکرمؐ نے امامت فرمائی۔ اور

وہاں سے رسول اللہؐ مکہ میں واپس اپنے بستر پہ پہنچ گئے۔

۱۲۴۔ خدا چونکہ ہر جگہ موجود ہے لہٰذا کسی مادی فاصلے کو طے کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن پاک نے معراج کے لیے لفظ "رؤیا" (خواب) استعمال کیا ہے۔ خود رسولِ خدا فرماتے ہیں معراج کے وقت "میں نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھا"۔ چند سال بعد حضورؐ کی محبوب اہلیہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپؐ سے واقعہ معراج کی تفصیل دریافت کی۔ ظاہر ہے حضرت عائشہؓ دوسرے صحابہ کی نسبت حضورؐ کے قریب تر تھیں لہٰذا وہ اس تفصیل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتی تھیں۔ اُن سے روایت ہے کہ "یہ ایک روحانی سفر اور خواب تھا"۔ علامہ المقریزی نے لکھا ہے: "حضورؐ کے دو صحابیوں حذیفہؓ اور معاویہؓ نے بھی غیر مبہم انداز میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔" تاہم عبداللہ ابنِ مسعود سے مروی ہے کہ معراج ایک جسمانی سفر تھا۔ معراج کی نوعیت (جسمانی یا روحانی) خواہ کچھ بھی ہو یہ ایک عظیم ترین تجربہ تھا جو کسی انسان کو حاصل ہوا۔ حضرت ادریسؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ اور متعدد دُوسرے مرسلین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی تجربہ سے گزرے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو وادیٔ سینا میں کوہِ طور پر اللہ کی تجلّی دکھائی گئی۔ مگر محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے حظیرۃ القدس کی بلندیوں تک پہنچنے کی اجازت سے سرفراز فرمایا۔ ہمیں سفرِ معراج کو محض سیر و تفریح پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی روحانی غایت پر نظر رکھنی چاہیے۔ روایات کے مطابق معراج کا عظیم ترین واقعہ ۲۷ رجب المرجب کو پیش آیا تھا۔

۱۲۵۔ اگلے روز جب حضورؐ نے سفرِ معراج کا اعلان فرمایا تو ہر شخص کا ردِ عمل اس کی افتادِ طبع کے مطابق تھا۔ حضرت ابوبکرؓ تو اتنے پُر یقین تھے کہ اُنھوں نے رسولِ خدا سے تصدیق کیے بغیر ہی اس واقعہ کو درست قرار دیا جس کے بعد حضور اکرمؐ کے دربار سے اُنھیں "صدیق" کا خطاب ملا۔ کفّار نے اس واقعہ کو جھوٹ گردانا اور تمسخر اڑایا۔ کفار میں سے چند ایک نے جو سفرِ تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جا چکے تھے، کہا کہ بیت المقدس کا نقشہ بیان کیا جائے۔ وُہ یہ بھول گئے کہ خود محمدؐ بھی تو حضرت خدیجہؓ کے کاروانِ تجارت کی نگرانی کرتے ہوئے بیت المقدس سے آگے بصرہ تک جا چکے تھے۔ کفار نے بعض اور احمقانہ سوالات بھی کیے۔ وہ اس امر کو خاص طور پر حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ محمدؐ کو خواہ رؤیا میں ہی کیوں نہ ہو، خدا نے شرفِ ملاقات بخشا ہے۔ اس کے بعد کفّار کی دشمنی اور مسلمانوں پر ان کے مظالم میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ایک یمنی الطفیل الدوسی نے واقعہ معراج کے فوری بعد مکہ کا دورہ کیا۔ اس نے بلا تعصب اسلام کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا کہ اسلام نہایت معقول مذہب ہے اور بُت پرستی سے کہیں ارفع و برتر ہے اس نے نہ صرف یہ کہ فوری طور پر اسلام کی حقانیت کا اقرار کر لیا بلکہ اسلام کا ایک پرجوش مبلغ بن کر یمن لوٹا۔ چند سال بعد وُہ پھر مدینہ منورہ میں رسولِ خدا کی خدمت میں حاضری کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ اس کے قبیلہ کے اسّی کے لگ بھگ خاندان بھی تھے جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ جب طفیل نے مکہ میں اسلام قبول کیا تو اس نے رسول اللہؐ کو یمن آنے کی دعوت نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ یمن میں ذوالکفین نامی بت خانہ تھا جسے کعبہ کا مدِ مقابل تصور کیا جاتا تھا۔ اس بت خانہ کے محافظ خاندان پر قبیلہ کا طفیل جیسا ادنیٰ فرد بھلا کیسے فوقیت حاصل کر سکتا تھا۔

باب ۵

یثرب ——— مدینۃ النبیؐ

۱۲۶۔ پناہ کی تلاش جاری رہی۔ ایامِ حج کے دوران ہم دیکھتے ہیں کہ منیٰ کے میدان میں رسولِ خدا ایک قبیلہ کے وفد سے دوسرے قبیلہ کے وفد کے کیمپ میں جاتے ہیں، وہ حج پر آنے والوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ ان قبائلی نمائندوں کو ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ اُن کی پناہ میں تبلیغِ اسلام کا موقع فراہم کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ رسول اللہؐ ان سے بظاہر یہ ناقابلِ یقین وعدہ بھی کرتے ہیں کہ " اگر تم اسلام قبول کر لو تو بہت جلد تم دُنیا کی دَو بڑی سلطنتوں ——— بازنطینی اور ساسانی ——— کے مالک بن جاؤ گے "۔ ابولہب جو حضورؐ کا جانی دشمن اور چچا تھا، حضورؐ کے پیچھے جا کر ان قبائلی نمائندوں سے ملاقات کرتا اور انھیں انتباہ کرتا کہ اگر انھوں نے محمدؐ کو پناہ دی تو انھیں شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ابولہب رسولِ خداؐ پر طرح طرح کے بُہتان بھی باندھتا۔ روایت ہے کہ اُس روز رسولِ خداؐ نے پندرہ کے لگ بھگ قبائل کے نمائندوں سے رابطہ پیدا کیا۔ ان لوگوں نے مختلف ردِ عمل کا اظہار کیا۔ بعض نے تو پیغمبرؐ کو جھڑک کر کیمپ سے نکال دیا۔ اور بعض نے نرم الفاظ میں بہانے بنا کر ٹال دیا، مگر رسولِ خدا نے حالات کی پروا کیے بغیر اسلام کی دعوت جاری رکھی۔ رسولِ خدا کی سولھویں کوشش اُمید کی کرن بن کر چمکی۔ حضورِ اکرمؐ کی اس کامیاب کوشش پر مزید روشنی ڈالنے سے قبل یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رسولِ خداؐ نے جن پندرہ قبائل سے بے سُود رابطہ قائم کیا تھا وُہ پُورے جزیرہ نمائے عرب کے نمائندہ تھے۔ ابنِ ہشام کی روایت کے مصداق ایامِ حج میں شمالی، جنوبی، مشرقی، مغربی اور وسطی عرب سے لوگ مکہ مکرمہ آتے تھے جو اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ حج کعبہ عرب کے چند قبیلوں تک محدود نہ تھا بلکہ پُورا عرب اس پر اعتقاد رکھتا تھا۔ کعبۃ اللہ کی اس روحانی برتری سے مکّہ کے تجار خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ چونکہ مکّہ کے علاقہ میں نہ تو زراعت ہوتی تھی، نہ صنعت و حرفت کا وجود تھا اور نہ ہی کوئی اور دلکشی تھی جس کے سہارے مکّہ کو عرب کا بین الاقوامی تجارتی شہر بنایا جا سکتا۔

۱۲۷۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، منیٰ میں رسول اللہؐ کی سولھویں کوشش کامیابی کا پیغام لائی۔ مدینہ کے کوئی چھ افراد پر مشتمل گروپ جن کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا (یہی قبیلہ جس سے رسولؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ محترمہ تعلق رکھتی تھیں)، منیٰ میں حجامت بنوا رہا تھا جو حج کی آخری رسم ہے۔ وُہ بڑے جُمرہ کے قریب الگ تھلگ جگہ پر بیٹھے ایک دوسرے کے بال کاٹ رہے تھے۔ قبیلہ خزرج نے حال ہی میں مدینہ کے ایک اور قبیلہ اوس پر جو ان کے عم زاد اور مدمقابل تھے۔ شاندار فتح حاصل کی تھی (ان دنوں بنو اوس کا ایک وفد کفارِ مکّہ سے فوجی معاہدہ کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا) یہودیوں کے

ہمسایہ ہونے کے باعث بنوخزرج دوسرے عرب قبائل کی نسبت الہامی کتب، وحیِ نبی اور متوقع نبی آخرالزماں کی آمد کے تصورات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ تھے۔ جب رسولِ خداؐ نے ان کے سامنے خوش الحانی سے قرآن حکیم کی آیات کی تلاوت کی اور اپنی نبوت کے بارے میں وضاحت کی تو مدینہ کے ان افراد کو یاد آیا کہ کس طرح (ان کے ہمسائے) یہودی جو ان کے مقابلے میں مجبور و لاچار تھے، طنزاً کہا کرتے تھے کہ "کچھ عرصہ انتظار کرو جلد ہی اللہ کا آخری نبی آنے والا ہے اور اس کی معیت میں ہم تم لوگوں پر بالادستی حاصل کرلیں گے۔" مدینہ والوں نے محسوس کیا کہ رسولِ خداؐ نے ان کے سامنے جو کچھ بیان کیا ہے اور جس انداز میں دعوتِ اسلام پیش کی ہے، اس کے پیشِ نظر نبی آخرالزماں کے ظہور کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا تو ہم پیش قدمی کرکے موقع سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں! مدنی وفد کے ارکان نے سوچا جلد ہی انھوں نے تبادلۂ خیال کیا تو انھوں نے اپنے اندر اتفاق رائے پایا چنانچہ انھوں نے نہ صرف فوری طور پر اسلام قبول کرلیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ واپس یثرب (مدینہ) جاکر اسلام کی تبلیغ کریں گے پھر اس کے جو نتائج ہوں گے آئندہ سال اسی جگہ ان سے رسولِ خداؐ کو آگاہ کریں گے ..... اور اگلے ایامِ حج "اچھی فصل" کی خوشخبری لے کر آئے۔

۱۲۸۔ بنواوس اور بنوخزرج کے درمیان خونی معرکوں نے صاحبِ فکر اہلِ مدینہ کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ فاتح اور عددی اعتبار سے برتر بنوخزرج اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علاقہ میں اپنی بالادستی قائم کرتے اور یوں یثرب میں مستحکم امن کے قیام کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سربراہ قبیلہ ابنِ اُبَی کو یثرب کا بادشاہ قرار دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کا طلائی تاج بنوانے کے لیے زرگر کو آرڈر بھی دے دیا تھا۔ بنواوس اپنے بھائیوں کے ساتھ مہلک جنگوں سے سخت برگشتہ تھے۔ مگر وہ ابنِ اُبَی کی بادشاہت قبول کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔ حج سے واپس آنے والے بنوخزرج کے چھ افراد امن اور بھائی چارے کا جو پیغام لے کر آئے تھے جلد ہی شہر میں پھیل گیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بنوخزرج کے علاوہ بنواوس بھی اسلام قبول کرنے لگے۔ مدینہ میں اسلام کے ان چھ مبلغوں کے سر یہ سہرا بھی ہے کہ انھوں نے بنواوس پر اپنی فوجی برتری کو فراموش کردیا اور اسلام قبول کرنے والے بنواوس کے افراد کو بھائیوں کی طرح گلے لگا لیا۔ چنانچہ اگلے موسمِ حج میں بارہ خاندانوں نے اپنے نمائندے بھیجے تاکہ منیٰ میں رسولِ خداؐ کی خدمت میں سلامِ نیاز پیش کرسکیں۔ ان میں سے نو کا تعلق بنوخزرج سے اور تین کا بنواوس سے تھا۔ انھوں نے پیغمبرؐ کے رُوبرو حلفِ وفاداری اٹھایا اور وعدہ کیا کہ "وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا سے اجتناب برتیں گے۔ (غربت و تنگدستی کے خوف سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے اور نہ (خواتین) بہتان کی اولاد لائیں گی جسے وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے بنی ہوئی) بنالیں۔ نہ کسی نیک بات میں آپ (اے محمدؐ) کی نافرمانی کریں گے (قرآن ۶۰/۱۲) اس کے بعد اللہ کے نبیؐ نے مدینہ میں اپنے بارہ نقیب (نمائندے) نامزد کیے اور ان میں سے ایک کو نقیب النقباءُ (ان کا سربراہ) مقرر کیا ـــــ آنے والے سالوں کے دوران بھی جب پورا مدینہ مشرف بہ اسلام ہوگیا ان نقیبوں کی تعداد بارہ ہی رہی ـــــ مدنی وفد کے ارکان نے رسول اللہؐ سے استدعا کی کہ انھیں اسلام کے آداب

سکھانے کے لیے کسی معلّم کی خدمات فراہم کی جائیں۔ چنانچہ رسولِ خداؐ نے مصعبؓ ابن عُمیر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ (اُس کے بھائی ابوالروم کی والدہ یونانی النسل تھی، ممکن ہے وہ دونوں حقیقی بھائی ہوں۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں اور بازنطینیوں کی جنگوں کے باعث یونانی لڑکیاں اور لڑکے بطور غلام خریدے اور فروخت کیے جاتے تھے۔ ایسے کئی غلام اور لونڈیاں عرب گھرانوں میں موجود تھیں۔ عکرمہ ابن ابوجہل کے گھر میں ایک یُونانی غلام موجود تھا۔ طائف کے بعض گھرانوں میں بھی یونانی النسل غلام اور لونڈیاں موجود تھیں)

۱۲۹۔ مصعبؓ نے مدینہ میں جو کام کیا اس سے مدینہ کے اُس دور کے معاشرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہاں اسلام کے ہمدردوں نے مصعبؓ کو بتایا کہ فلاں شخص کو قابو کرنا انتہائی مشکل ہوگا۔ لیکن اگر وہ اسلام قبول کرلے تو آپ کی راہ میں پھر کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ یہ جانتے ہی مصعبؓ نے اُس شخص کے باغ کا رُخ کیا وہ کھجوروں کے ایک جُھنڈ میں بیٹھ گیا اور خوش الحانی سے قرآن حکیم کی تلاوت شروع کر دی۔ اس شخص کے قبیلہ کے بعض افراد محض مصعبؓ کی خوش الحانی سے متاثر ہو کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جب قبیلہ کے سردار کو اپنے باغ میں ایک شخص کی مداخلت بے جا کا علم ہوا تو وہ نیزہ لہراتا ہوا پہنچ گیا۔ اس نے گرج کر مصعب سے کہا "تم میری اجازت کے بغیر میرے باغ میں کیوں داخل ہوئے، دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمھیں نیزے میں پرو دوں گا۔" مصعب اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور میٹھی آواز میں بولا "آپ بالکل درست فرماتے ہیں، مگر آپ میری بات سُن لیں، اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری تو میں فوراً دفع ہو جاؤں گا۔" سردار نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بولا: "تمھاری بات منصفانہ ہے، کہو کیا چاہتے ہو؟" تب مصعب نے نہایت ہی خوش الحانی سے قرآن پاک کی چند آیات کی تلاوت کی۔ اکھڑ عرب سردار اس سے بے حد متاثر ہوا، اس نے مصعب سے دریافت کیا "یہ تم کیا تلاوت کر رہے ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟" مصعب نے اسے بتایا "یہ قرآن پاک کی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمدؐ پر نازل فرمائی ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں، وہ قرآن کے مبلّغ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ صرف ایک ہے، خدا کے بنائے ہوئے بُتوں کی پُوجا روا نہیں، یہ کائنات خدا نے ہی بنائی ہے، قرآن کا مقصد سب سے انصاف، احسان اور ایک خدا کی اطاعت ہے۔" عرب سردار کے لیے اتنا ہی کافی تھا وہ بول اٹھا "ان اصولوں سے وابستگی کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟" مصعب نے اسے بتایا کہ اسے رسولؐ اللہ پر ایمان لانا ہوگا۔ چنانچہ اس نے نیزہ اکھاڑا اور اسی جوش و خروش سے واپس چلا گیا جس طرح مصعب کا سُن کر وہاں آیا تھا۔ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو جس کا وہ سردار تھا، اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ جب قبیلہ کے سارے افراد غلام اور ملازم جمع ہو گئے تو اس نے چلّا کر سوال کیا "میں کون ہُوں؟" اسے یُوں غصّے میں دیکھ کر اس کے اہلِ قبیلہ نے جواب دیا "آپ ہمارے سردار ہیں، عقل و دانش میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں اور آپ بڑے شُجاع ہیں۔" تب اس نے اپنا نیزہ ہوا میں لہرایا اور بولا "اگر تم نے ابھی اور اسی وقت اسلام قبول نہ کیا جس کی تعلیم وہ مکی مصعب دیتا ہے تو میں تمھارا سب سے بڑا دشمن ثابت ہُوں گا۔" اور سُورج غروب ہونے سے قبل پورا قبیلہ اسلام سے مشرف ہو چکا تھا۔

جمعہ کا پہلا اجتماع

۱۳۰۔ مصعب کی کامیابیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر رسولِ خدا کو اپنی کامیابیوں سے تحریری طور پر مطلع کرتا رہتا تھا۔ غالباً وہ اپنے خطوط میں حضورِ اکرمؐ سے مزید ہدایات اور ایسے سوالوں کے جوابات بھی طلب کرتا رہتا تھا جو مدنی لوگ اس سے دریافت کرتے تھے یا کر سکتے تھے۔ ایک روز اسے پیغمبر کا ایک خط موصول ہوا جو اس کے ایک سابقہ خط کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔ رسول اللہؐ کے خط میں لکھا تھا: "ہر جمعہ کو ——— اس روز جب یہودی اگلے دن یومِ سبت منانے کی تیاری کرتے ہیں ——— دوپہر کے بعد مسلمانوں کی نماز با جماعت کا اہتمام کرو اور خود اس کی امامت کرو۔ چنانچہ پہلے جمعہ کی نماز میں بارہؔ افراد شریک ہوئے۔

۱۳۱۔ اس وقت نہ مکہ اور نہ ہی مدینہ ایک مسلمان ملک تھا تاہم مدینہ میں مسلمانوں کو اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنے کی آزادی میسر تھی۔ چنانچہ ایک غیر مسلم ملک میں جیسا کہ مدینہ ان دنوں تھا، رسولِ خدا نے نمازِ ظہر کی جگہ جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ روایات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مصعبؓ نے پہلی نمازِ جمعہ کے دوران خطبہ دیا تھا یا نہیں۔ تاہم جلد ہی جب رسولِ خدا ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہ باقاعدگی سے خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

مدینہ کو ہجرت کا فیصلہ

۱۳۲۔ جب حج کا اگلا موسم آیا تو پانچ سو مدنی حجِ بیت اللہ کے لیے مکہ کو روانہ ہوئے۔ مصعبؓ بھی ان میں شامل تھا۔ یہ سب مسلمان نہیں تھے بلکہ ان میں صرف ۷۴ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں دوؔ خواتین بھی شامل تھیں جن میں سے ایک کے ہاں مکہ میں ولادت بھی ہوئی۔ چاند کی چودھویں شب کو منیٰ میں مدینہ سے آنے والوں کے ساتھ اللہ کے نبی کی ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ مدینہ کے لوگ ایسی رازداری سے منیٰ میں پہنچے کہ ان کے ساتھ آنے والے غیر مسلموں اور ان کے کیمپ میں مقیم دیگر افراد کو بھی اس کی ہوا تک نہ لگی۔ وہ یکے بعد دیگرے رسولِ خدا کی خدمت میں پیش ہوئے، اسلام لانے کا اقرار کیا اور یہ کہتے ہوئے حضورؐ سے "بیعتؔ" کی: "ہم اسی طرح آپ کا تحفظ کریں گے جس طرح ہم اپنے اہلِ خانہ کا تحفظ کرتے ہیں، خواہ اس کے لیے ہمیں اسود و احمر (ساری دنیا) سے جنگ ہی کیوں نہ کرنا پڑے، ہم ہر صورت میں آپ کا ساتھ دیں گے خواہ آپ کے مدِمقابل ہمارے رشتہ دار ہوں یا کوئی اجنبی۔" پھر انھوں نے رسولِ خدا کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ رسولِ خدا کے میزبان ہوں گے اور ہر طرح سے ان کی حفاظت کریں گے۔ اس وقت رسولِ خدا کے ساتھ ان کے نہایت دانشمند چچا حضرت عباسؓ بھی تھے انھوں نے مدنی مسلمانوں کی پیشکش کا جواب دیتے ہوئے کہا: "یقیناً تمھیں ساری دنیا سے جنگ کا سامنا ہوگا۔ اگر تم نے مدینہ جانے کے بعد محمدؐ کو بے یار و مددگار چھوڑنا ہے تو بہتر ہے انھیں مدعو نہ کرو، کیونکہ وہ یہاں اپنے خاندان کی پناہ میں ہیں۔ . . . . ."

---

[1] یہ دوسری بیعتِ عقبہ کہلاتی ہے۔

اس پر مدنی مسلمانوں نے اپنے خلوص کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ رسولؐ خدا کو دعوت دے کر جن خطرات سے دوچار ہو سکتے ہیں، ان کا انھیں پوری طرح احساس ہے۔ رسولِؐ خدا مدنی مسلمانوں کے اظہارِ وفاداری سے مطمئن ہو گئے اور فرمایا: "آج کے بعد تمھارا خون میرا خون ہے۔ تمھارا خون بہنے کا مطلب میرا خون بہنا ہے۔ میں تمھارا ہوں اور تم میرے ہو۔"

۱۳۳۔ کفارِ مکّہ کو بھی منیٰ کے واقعات کی سن گن ملی مگر وہ اس کی تصدیق نہ کر سکے تاہم انھوں نے محسوس کیا کہ خطرہ بڑھ رہا ہے۔ شمال میں ان کی تجارت کے راستے مدینے سے ہو کر گزرتے تھے جو منقطع ہو سکتے تھے۔ مدنی قبائل کی مدد سے مستقبل میں مکہ پر فوج کشی بھی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ کفارِ مکّہ کے چند نمائندے مدنی حجاج کے کیمپ میں آئے اور پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اتفاق کی بات ہے کہ انھوں نے مدینہ کے غیر مسلموں سے رابطہ قایم کیا جنھوں نے حلفاً بتایا کہ انھیں کسی ایسے واقعہ کا علم نہیں اور یہ کہ ان کے علم کے بغیر ایسا کوئی اجتماع منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سچے بھی تھے۔ اس پر مکی کفار کے نمائندے مطمئن ہو گئے تاہم بعد میں انھیں مدنی مسلمانوں اور رسولِؐ خدا کے درمیان عہد و پیمان کا علم ہو گیا۔ مگر اس وقت تک مدینہ کے مسلمان منیٰ سے جا چکے تھے۔ تاہم ایک مدنی مسلمان ان کے ہتھے چڑھ گیا جسے انھوں نے خوب دق کیا لیکن بعد میں یہ محسوس کر کے اسے چھوڑ دیا کہ اس کی موت کی صورت میں اس کا سارا قبیلہ کفارِ مکّہ کے خلاف سرگرم ہو جائے گا۔

۱۳۴۔ مکہ کے مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں خاموشی سے مدینہ روانہ ہونے لگے جہاں انھیں خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ کوئی دو ماہ کے عرصہ میں رسولِؐ خدا، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے اہلِ خانہ کے سوا کوئی مسلمان مکّہ میں نہ رہا۔ البتہ وہ مسلمان مکہ میں موجود تھے جنھیں زبردستی روک لیا گیا یا ان کے خاندان والوں نے انھیں قید کر رکھا تھا۔ ان میں کچھ تو نوعمر بچے تھے اور باقی غلام وغیرہ تھے۔ ایک بہت اچھا مسلمان بھی مکہ میں تھا وہ زرگر تھا اور اس نے خاموشی سے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اس شہر میں مقیم رہا۔ اغلباً وہ رسولِؐ خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے مکّہ میں مقیم تھا تاکہ حضور کو مکّہ کے حالات و واقعات سے باخبر رکھ سکے۔ البلاذری کے مطابق وہ مسلمانوں کے لیے خفیہ طور پر کام کرتا تھا۔ مدینہ سے جو خفیہ ایجنٹ مکہ بھیجے جاتے تھے وہ انھیں پناہ دیتا تھا۔ رسولِؐ خدا کے چچا عباسؓ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں تاہم ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ مقدس چشمہ زمزم کے محافظ و نگران اور مکّہ شہر کی حکمران کونسل کے معزز رکن تھے۔

۱۳۵۔ کفارِ مکّہ نے ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے والے مسلمانوں کی املاک ضبط کر لیں۔ انھوں نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی جو تاریخ میں یوم الزحمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلس مشاورت میں ایک قرارداد منظور کی گئی: "محمدؐ کو قتل کر دیا جائے مگر اس قتل میں کوئی ایک یا دو افراد نہیں بلکہ مکّہ کے تمام قبائل سے منتخب نوجوان شامل ہوں گے۔ چونکہ قتل کی ذمہ داری لاتعداد قبائل پر عاید ہو گی اس لیے پیغمبر کا قبیلہ قاتلوں کے خلاف اعلانِ جنگ سے باز رہے گا اور خون بہا پر اکتفا کے لیے مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ خون بہا مشترکہ فنڈ سے ادا کر دیا جائے گا۔" کفار کا یہ منصوبہ اتنا خام تھا کہ اسے خفیہ رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ ایک روز حضورِ اکرمؐ کی ایک خالہ بھاگی بھاگی آئی اور رسولؐ خدا کو سب کچھ بتا دیا ——— غالباً اس نے یہ سب

اپنے شوہر کے خاندان والوں سے سنا تھا —— کہ رسولِ خدا کو رات کے وقت قتل کرنے کی سازش تیار کر لی گئی ہے۔

۱۳۶۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ نبی اکرمؐ اسی وقت حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور انھیں بھی اس سازش سے آگاہ کیا دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مکہ سے ہجرت کریں گے۔ یہ ربیع الاوّل کے ابتدائی دن تھے اور راتیں چاند کی روشنی سے منور نہیں ہوتی تھیں فیصلہ کے مطابق دونوں کو رات کے اندھیرے میں مکہ سے نکل کر ایک نواحی پہاڑی کے غار (غارِ ثور) تک جانا تھا۔ وہاں رات بسر کرنے کے بعد اس وقت مدینہ کو روانہ ہونا تھا۔ جب مکہ میں ان کی تلاش کی مہم سرد پڑ جائے۔ ابوبکرؓ نے سواری اور رہنما کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔ رسولِ خدا نے اپنے ئے پالک بیٹے علیؓ کو حکم دیا کہ وہ رات کے وقت ان کے بستر پر سو جائے۔ رسولِ خدا نے وہ تمام امانتیں بھی حضرت علیؓ کو سونپ دیں جو مکہ کے لوگوں نے آنحضورؐ کے پاس جمع کرا رکھی تھیں تاکہ یہ اصل مالکوں تک پہنچائی جا سکیں حضرت علیؓ نے یہ فرض ادا کرنے کے بعد مدینہ پہنچنا تھا۔ ان انتظامات کے بعد رسولِ خدا حضرت ابوبکرؓ کے گھر آ گئے۔ کافی رات گئے وہ مکان کے عقبی حصہ میں ایک کھڑکی کے ذریعہ باہر نکلے اور کوہِ ثور پر چڑھنے لگے۔ راستے میں ابوبکرؓ کو ایک دوست نے پہچان لیا مگر وہ کوئی شبہ پیدا کیے بغیر آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ روایات کے مطابق جب وہ دونوں غارِ ثور کے دہانے پر پہنچے تو صدیق اکبرؓ پہلے غار میں داخل ہوئے تاکہ غار کو صاف کر سکیں۔ انھوں نے اپنا جُبہ پھاڑ کر غار کے اندر موجود سوراخ بھی بند کیے مبادا ان میں سے کوئی سانپ نکل آئے۔ مگر ان کی یہ احتیاط ناکام رہی، ایک سوراخ میں سے سانپ نکل آیا اور اس نے ابوبکرؓ کی ایڑی میں ڈس لیا۔ اُنھوں نے تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کی مگر آنسو ان کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے زانو پر سر رکھے استراحت فرما رہے تھے۔ چند آنسو رسولِ خدا کے چہرہ مبارک پر گرے اور وہ نیند سے بیدار ہو گئے۔ جب رسولِ خدا کو علم ہوا تو انھوں نے سانپ کی ڈسی ہوئی جگہ پر اپنا لعابِ دہن ملا جس سے حضرت ابوبکرؓ کی تکلیف جاتی رہی۔ اسی اثنا میں ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بُن دیا۔ اگلی صبح کو کبوتروں کے ایک جوڑے نے غار کے دہانے میں گھونسلا بنا لیا اور اس میں انڈے دے دیے۔ یہ انتظام کیا گیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ایک صاحبزادی غار میں روزانہ کھانا پہنچائے گی اور ان کا ایک بیٹا روزانہ رات کو انھیں مکہ کی صورتِ حال سے آگاہ کرے گا۔ رسولِ خدا اور حضرت ابوبکرؓ کی رُوپوشی سے ان کے اہلِ خانہ کو کچھ پریشانی تو ضرور ہوئی مگر کوئی سنگین واقعہ رُونما نہیں ہُوا۔ کفارِ مکہ نے رسولِ خدا کی جگہ ان کے اہلِ بیت کو سزا دینے سے گریز کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو نوجوان پیغمبرؐ کے قتل پر مامور کیے گئے تھے وہ تمام رات ان کے گھر کے باہر کھڑے رہے۔ لیکن اندر داخل نہیں ہوئے حالانکہ ان کی راہ میں کوئی رُکاوٹ نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ علی الصبح جب رسولِ خدا نمازِ فجر کی ادائیگی کے لیے کعبۃ اللہ جائیں گے تو وُہ ان پر حملہ کر کے انھیں تہِ تیغ کر دیں گے۔ غالباً عرب کے رواج یا توہم پرستی کی وجہ سے انھیں حضورؐ کے گھر میں داخل ہونے کی جُرأت نہیں ہوئی۔

۱۳۷۔ کفارِ مکہ نے اب حضورؐ کی تلاش شروع کی۔ اُنھوں نے ایک کھوجی کی خدمات حاصل کیں اور رسولِ خدا کے نقشِ پا کی مدد سے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ یہ کھوجی نقشِ پا کی مدد سے کفارِ مکہ کو غارِ ثور کے دہانہ تک لے گیا، مگر وہاں مکڑی کے جالے اور کبوتر کے انڈے دیکھ کر کفار دھوکا کھا گئے۔ تین دن کی تلاش و جستجو کے بعد کفارِ مکہ کو یقین

ہوگیا کہ رسول اللہؐ مکہ کے آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے رسول اللہؐ کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کردیا، مگر اس کے بعد نگرانی نرم ہوگئی۔ جب پیغمبرؐ نے غار کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو دو اونٹ اور ایک رہنما جن کا انتظام حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا آ گئے۔ اور یُوں یہ ننھا سا قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہُوا۔ قافلہ کا رہنما جان بوجھ کر معروف راستوں سے ہٹ کر چلتا رہا، جن پر کفارِ مکہ کے حلیفوں سے مڈبھیڑ کا امکان تھا تاہم سراقہ بن مالک مُدلجی نے انھیں دیکھ لیا اور انھیں پہچان لیا۔ دراصل وہ اس انعام کے لالچ میں آگیا جس کا اعلان کفارِ مکہ نے کر رکھا تھا۔ وہ ایک توہم پرست شخص تھا، اس نے رسولِ خدا اور ان کے رفیق کو نقصان پہنچانے کی سوچنے سے قبل تیر سے فال نکالی تو فال نفی میں تھی، چنانچہ انعام واکرام کے لالچ کے باوجود وہ اس قافلے کی راہ روکنے سے گریزاں رہا۔ پھر جب وہ گھوڑے کے ریت میں ٹھوکر کھانے کے سبب گر گیا تو اس نے نہ صرف رسولِ خدا اور ان کے رفیق کی راہ روکنے کا خیال کلی طور پر ترک کر دیا بلکہ ان سے معافی مانگی اور انھیں اپنا مہمان بنانا چاہا مگر اس کی پیش کش شکریہ کے ساتھ مسترد کر دی گئی۔ رسولِ خدا اور صدیق اکبرؓ کو آٹھ دن تک طویل سفر کرنا پڑا۔ کسی روز انھیں اپنے زادِ سفر سے بہتر کھانے پینے کو مل جاتا۔ راستے میں ایک معمر خاتون اُمِ معبد کے خیمے میں انھوں نے ایک بوڑھی بکری دیکھی جو چلنے سے بھی معذور تھی اور چراگاہ تک بھی نہیں جا سکتی تھی، اُس روز معجزانہ طور پر اس بکری نے اتنا دودھ دیا جو رسولِ خدا کے قافلہ کے علاوہ معمر خاتون کے خاندان کے لیے بھی کافی تھا۔ اثنائے راہ میں ایک اور واقعہ رُونما ہُوا: ینبوع کے قریب بنو اسلم کے لوگوں نے قافلہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کی اس وقت رسولِ خدا بنو اسلم کے علاقہ سے گزر رہے تھے۔ مگر قبیلہ کا سردار قرآن حکیم کی دلکش آیات سُنتے ہی مسلمان ہوگیا جس کے بعد اس نے رسولِ خدا اور ان کے رفقا کو "گارڈ آف آنر" پیش کیا۔ قبیلہ کے محافظ اس قافلہ کو اپنی حدود کے آخر تک چھوڑ آئے۔

۱۳۸۔ رسولِ خدا کی ہجرت کی اطلاع مدینہ پہنچ چکی تھی، شہر کے لوگ بے چینی سے ہادیِ برحق کے منتظر تھے۔ وہ روزانہ مدینہ کے جنوب میں قُبا کے قریب ایک بلند پہاڑی پر جسے ثنیات الوداع کہا جاتا ہے، جمع ہوتے اور تمام دن انتظار کرتے۔ ایک روز ——— پیر ۱۲ ربیع الاوّل/ ۳۱ مئی ۶۲۲ء ——— جب لوگ مایوس ہو کر پہاڑی سے واپس جا چکے تھے شہر میں ایک بلند مینار سے کسی نے دُور سے ایک مختصر قافلہ شہر کی سمت بڑھتے دیکھا۔ چنانچہ لوگ دوبارہ رسول اللہؐ کے استقبال کے لیے جمع ہُوئے انہوں نے اپنا بہترین لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اور وہ پُوری طرح مسلح تھے لڑکوں اور لڑکیوں نے دفیں سنبھالیں وُہ ایسی مسرت اور خلوص سے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، ہم آہنگ ہو کر ایک استقبالیہ نظم گا رہے تھے: ؎

طلع البدر علینا　　من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا　　ما دعا للہِ داع
ایھا المبعوث فینا　　جئت بالامر المطاع

(چودھویں کا چاند ہمارے سامنے نکلا ثنیات الوداع سے

جب تک اللہ سے دعائیں کی جاتی رہیں، اس وقت تک اس کا شکر ادا کرنا ہم پر فرض ہے
اے! کہ اللہ نے تمھیں ہمارے لیے بھیجا۔ تُو ایسے احکام لایا جن کی اطاعت فرض ہے)

۱۳۹۔ قُبا کے قریب پہنچ کر رسولِ خداؐ نے کھجوروں کے ایک جُھنڈ میں کچھ دیر آرام کیا۔ یہاں ایک کے بعد لوگوں کا دُوسرا گروہ آتا رہا اور رسولِ خداؐ کی خدمت میں سلامِ نیاز پیش کر کے ان کا خیر مقدم کرتا رہا۔ فوراً ہی رسولِ خداؐ نے دُوسرے لوگوں سے مل کر یہاں ایک جھونپڑی تعمیر کی جو مسجد کا کام دیتی تھی۔ رسولِ خداؐ پانچوں وقت نماز کی امامت فرماتے۔ اپنا باقی وقت وہ تبلیغِ اسلام میں صرف کرتے، لوگوں کو نیکی اور احسان کی تلقین فرماتے اور عام لوگوں کے جن میں مدینہ کے انصار اور مکہ کے مہاجر شامل تھے مسائل حل کرنے کی سعی فرماتے۔ مکی مہاجرین کے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چند روز بعد رسولِ خداؐ قُبا کے نزدیک اپنے عارضی مستقر سے نکلے تاکہ اپنے مستقل قیام کا انتظام کر سکیں۔ وہ ناقہ پر سوار تھے۔ ہر قدم پر ایک وفد آتا اور رسولِ خداؐ سے اپنے ہاں قیام کی استدعا کرتا، وہ ایک ہی جواب دیتے: "میری ناقہ میرے قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرے گی اسے نہ روکو، وہ جس جگہ چاہے گی بیٹھ جائے گی۔" ناقہ چلتی رہی اور کئی کلومیٹر سفر کے بعد ایک کھلی جگہ پر بیٹھ گئی۔ رسولِ خداؐ نے اسے ایڑ لگا کر اٹھایا تو وُہ چند قدم چل کر واپس آئی اور پھر اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ کو اپنے نبیؐ کے قیام کے لیے پسند فرما لیا تھا جس جگہ اونٹنی پہلے بیٹھی ہوئی تھی اور اٹھائے جانے کے بعد جہاں تک جا کر واپس اپنی جگہ آ گئی تھی۔ زمین کا وہ ٹکڑا تھا جسے پیغمبرؐ کو اپنے لیے منتخب کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ قطعہ زمین خرید لیا تاکہ وہاں ایک مسجد اور چند کمرے بنائے جا سکیں جن میں رسول اللہؐ اور ان کے اہلِ بیت رہ سکیں۔ اس قطعۂ زمین کے قریب ایوب سلطان (ابو ایوبؓ انصاری جو اب استنبول میں ابدی نیند سو رہے ہیں) کا مکان تھا۔ وہ رسولِ خداؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ کے قبیلہ میں سے تھے۔ اس غیر متوقع اور اللہ کے فرستادہ مہمان کی آمد پر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ رسولِ خداؐ کا سامان اپنے گھر لے گئے اور اپنے گھر کی تعمیر تک رسولِ خداؐ ابو ایوبؓ انصاری کے مہمان رہے۔

مہاجرین کی آبادکاری

۱۴۰۔ سینکڑوں کی مسلمان مدینہ میں پناہ لے چکے تھے۔ ان کی یہاں کوئی جائیداد وغیرہ نہ تھی۔ انھیں مقامی معیشت میں کھپانا وقت کی اشد ضرورت تھی۔ خود رسول اللہؐ کو بھی ایک حد تک یہی مسئلہ درپیش تھا۔ وہ مکہ سے کچھ رقم لائے تھے جس سے انھوں نے متعدد اونٹنیاں اور بکریاں خریدیں جن سے ان کے اہلِ بیت اور گھر میں آنے والے مہمانوں کی ضروریات بخوبی پُوری ہونے لگیں: کھانے کے وقت جو شخص بھی موجود ہوتا رسولِ خداؐ اسے کھانے میں شریک کر لیتے۔ متعدد مدنی مسلمانوں نے اپنے اپنے باغ میں ایک ایک کھجور کا پھل حضورؐ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ بعد میں رسول اللہؐ نے مدینہ، خیبر اور فدک میں زرعی زمینیں خریدیں۔ یہ زمینیں مُسلم ریاست کی ملکیت تھیں، ان کی پیداوار سے رسولِ خداؐ اپنی اور اپنے اہلِ بیت کی ضروریات پوری کرتے اور جو کچھ بچ جاتا وہ بیت المال کے سپرد کر دیتے تاکہ نادار اور ضرورت مند مسلمانوں کی حاجت پُوری کی جا سکے۔ مدینہ کا ایک خاندان رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے اپنا دس سالہ بیٹا انس حضورؐ کی خدمت میں بطور ملازم پیش کیا۔ یہ خاندان

اپنے اس فرزند پر فخر کرتا تھا کیونکہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں لکھ پڑھ سکتا تھا۔

۱۴۱۔ مکی مہاجروں کی فلاح و بہبود کے ضمن میں رسولِ خداؐ نے ایک اجلاس عام طلب کیا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ مدینہ کے بادسیلہ اور متمول مسلمان ایک ایک مکی کو اپنا بھائی بنالیں۔ دونوں بھائیوں کے خاندان مل کر کمائیں اور کھائیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ترکہ میں بھی حصہ دار ہوں۔ رسولِ خداؐ کی تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ انھوں نے خود انفرادی خوبیوں کی بنا پر ایک ایک مکی اور ایک ایک مدنی کا انتخاب کر کے انھیں بھائی بھائی[1] بنا دیا۔ یہ انتظام کئی سال تک جاری رہا۔ مکی مسلمان طفیلی بن کر رہنے کے خواہشمند نہیں تھے۔ جب انھوں نے محنت سے کافی دولت پیدا کر لی تو انھوں نے اپنے مکی بھائیوں کی املاک ان کے سپرد کر دیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر آزادانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔

۱۴۲۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے: حضرت عمرؓ نے اپنے مدنی بھائی سے کہا "ایک دن میں آپ کے باغ کو سینچنے کا کام کروں گا اور آپ دربارِ رسالت میں حاضری دیں۔ اس روز جو آیاتِ قرآنی نازل ہوں، سیاسی اور معاشرتی فیصلے کیے جائیں اور جو کچھ بھی پیش آئے شام کو مجھے سب کچھ بتائیں۔ اگلے روز آپ باغ میں کام کریں اور میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں رہوں اور جو کچھ گزرے آپ کو بتاؤں۔ ایک اور مکی عبدالرحمان ابنِ عوف کو اس کے مدنی بھائی نے کہا: "یہ میری جائداد ہے، اس کا نصف آپ کی ملک ہے۔ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے آپ ایک کا انتخاب کریں، میں اسے طلاق دے دوں گا اور آپ اس سے شادی کر لیں...." اس پر ابنِ عوف نے کہا "خدا آپ کو آپ کی املاک اور اہلِ خانہ مبارک کرے مجھے صرف مقامی منڈی کا راستہ بتادو...." عبدالرحمان ابنِ عوف منڈی میں گئے، انھوں نے کچھ اشیا ادھار خریدیں اور اسی وقت فروخت کر دیں، انھوں نے دن میں یہ عمل کئی بار دہرایا۔ شام تک کی خرید و فروخت کے بعد انھوں نے اتنا کما لیا کہ نہ صرف دکانداروں کا تمام قرضہ بیباق کر دیا بلکہ ان کے پاس رات کے کھانے کے لیے کافی پیسے بچ گئے۔ چند روز بعد وہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے نیا قیمتی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے نئی نئی شادی کی ہے۔ جلد ہی عبدالرحمان بن عوف کا شمار مدینہ کے متمول ترین تاجروں میں ہونے لگا۔ وہ بڑے مخیّر اور غریب پرور تھے، اور اسلام کی سربلندی کے ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔

مکیوں کا ردِ عمل

۱۴۳۔ کفارِ مکہ نے رسولِ خداؐ کے یوں بچ کر مدینہ چلے جانے کا بہت بُرا منایا۔ انھوں نے ایک وفد مدینہ بھیجا اور مطالبہ کیا کہ رسولِ خداؐ کو مدینہ سے نکال دیا جائے یا ان کے سپرد کیا جائے۔ انھوں نے دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مدینہ والوں کو سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ کفارِ مکہ کا یہ وفد بے نیلِ مرام واپس گیا مگر ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ اب کچھ ہو کر رہے گا اور ہمیں اپنے دفاع اور سلامتی کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہییں۔ اس واقعہ کے دو اہم اور دوررس نتائج نکلے: مدنی ریاست کا آئین مرتب ہوا اور مدینہ کے

---

[1] تاریخِ اسلام میں اس واقعہ کو "مواخات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

اردگرد ایک بفر سٹیٹ کا قیام عمل میں آیا۔

مدنی ریاست رسولِ خدا نے مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک عام اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس آنحضورؐ کے ذاتی ملازم اُنس کے والد کے گھر پر ہوا۔ امام بخاری کے مطابق رسولؐ اللہ نے اس اجلاس میں تجویز پیش کی کہ مدینہ کے لوگوں میں باہمی تنازعات کے خاتمہ اور کسی بیرونی حملہ آور کی حوصلہ شکنی کے لیے مدینہ کی ایک ریاست قائم کی جائے۔ یہ ریاست ایک کنفیڈریشن ہو جس کے تمام یونٹوں کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہو۔ کسی جُرم کے بارے میں سزا کے خلاف ریاست کے سربراہ سے اپیل کی جا سکے گی۔ سربراہِ مملکت کو جنگ یا امن کے دنوں میں کسی مہم کے لیے افراد کے قطعی انتخاب کا اختیار ہوگا۔ سماجی تحفظ کے لیے بھی ایک مضبوط نظام قائم کیا گیا۔ خون بہا کی صورت میں بھاری رقم متعین کی گئی جو اس صورت میں ادا کرنا ضروری تھی جب قتل کے مجرم کو سزائے موت نہ دی جائے۔ دشمن سے جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

معاہدے کی تمام دفعات پر اتفاق رائے کے بعد انھیں ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ یہ معاہدہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے[1] جو کسی سربراہِ مملکت نے جاری اور نافذ کیا ہے۔ اس تاریخی دستاویز کی تفصیل درج ذیل ہے جو "میثاق النبی" کے عنوان سے معروف ہے:

میثاق النبیؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

یہ تحریری معاہدہ مدینہ کے مندرجہ ذیل طبقوں کے درمیان ہے:

ا۔ محمد نبی رسول اللہ

ب۔ مسلمان قریشِ مکہ از ساکنین شہر مدینہ

ج۔ مدینہ کے مسلمان

د۔ مدینہ کے یہودی

ہ۔ مدینہ کے نصرانی

و۔ مدینہ کے غیر مسلم

---

[1] دنیا کے پہلے تحریری دستور یا آئین کی حیثیت سے یہ معاہدہ جسے "میثاق النبی" بھی کہا جاتا ہے بے حد اہم دستاویز ہے جو ہم تک لفظ بلفظ پہنچی ہے۔ اس معاہدہ کا متن اسی مصنف (علامہ محمد حمید اللہ، پیرس) کی عربی کتاب "مجموعہ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ راشدہ" جس کا اردو ترجمہ "سیاسی وثیقہ جات از عہدِ نبوی تا بہ خلافتِ راشدہ" کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے، میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

دفعہ اول — متذکرۃ الصدور ہر شش گروہ سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔
دفعہ دوم — ان میں سے ہر ایک گروہ فرداً فرداً مندرجہ ذیل امور کا ذمہ دار ہے اور اس دفعہ میں مدینہ کے مندرجہ ذیل گروہ بھی شامل ہیں:

۱۔ بنو عوف	۲۔ بنو حارث از قبیلہ خزرج
۳۔ بنو ساعدہ	۴۔ بنو جشم
۵۔ بنو نجار	۶۔ بنو عمرو بن عوف
۷۔ بنو نبیت	۸۔ بنی اوس

دفعہ سوم — ۱۔ کوئی گروہ دیت کی مقررہ حدوں میں تخفیف کی راہ پیدا نہ کرے۔
۲۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے مظلوم حلیف (موالی) کے مقابلے میں اپنے حلیف (موالی) کی ناحق حمایت نہ کرے۔
۳۔ جو شخص باہم ادائے دیت میں سفارش کی راہ پیدا کرنے کی سعی کرے اس شخص کے خلاف دوسرے مسلمانوں کو ورثائے قتیل کی مناسب طرفداری کرنا ہوگی۔
۴۔ جو مسلمان خود یا اس کا بیٹا جماعت میں فساد اور تفرقہ پیدا کرنے میں ساعی ہو، اس کے خلاف تمام مسلمانوں کو یک جا ہو کر یہ فتنہ فرو کرنا ہوگا۔
۵۔ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کافر مارا جائے تو دوسرے مسلمان کا کافر کی حمایت میں مسلمان پر جور و تعدی کرنا خلافِ معاہدہ ہوگا۔
۶۔ اگر کافر مسلمان کے درپے ہو تو کسی مسلمان کو ایسے کافر کی حمایت نہ کرنا ہوگی۔
۷۔ مسلمانوں کا ہر فرد یکساں طور پر خدا کی پناہ میں ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوستدار ہیں۔
دفعہ چہارم — ۱۔ مسلمان کے لیے کسی یہودی کے ایسے معاملہ میں مدد کرنے کا کوئی حرج نہیں جس سے وہ یہودی مسلمان کے انصاف پر اطمینان حاصل کر سکے۔
۲۔ مسلمان کے لڑائی میں شہید ہونے کے بعد کسی دوسرے مسلمان پر اُس کی ذمہ داری عاید نہ کی جائے گی۔
۳۔ تمام مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔
۴۔ کوئی مسلمان کسی مشرک کو مسلمان کے خلاف پناہ نہ دے گا۔ نہ کسی ایسے مال کا ضامن ہوگا جو مشرک نے ناجائز طور سے مسلمان کے مال سے حاصل کیا ہو، اور نہ کوئی مسلمان مشرک کی حمایت میں مسلمان کے درپے ہوگا۔
۵۔ مومن کے قتل ناحق پر اگر ورثائے قتیل رضامندی سے دیت لینے پر مائل نہ ہوں تو قاتل کو جلاد کے حوالے کیا جائے گا۔
۶۔ جو مسلمان اس معاہدہ میں شامل ہے، اگر وہ دل سے خدا تعالیٰ اور روزِ محشر پر ایمان لا چکا ہے تو اسے کسی مفسد کی

حمایت نہ کرنا ہوگی۔ مفسد کو پناہ دینا بھی اس کی حمایت میں شامل ہے۔ ایسے بے انصاف مسلمان پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی لعنت اور عذاب ہے، جس عذاب کے بدلے میں اس سے کوئی بدل قبول نہ کیا جائے گا۔

ذیل دفعہ (نمبر ۷) بلا استثنا تمام مسلمانوں پر لاگو ہے۔

۷ ۔ مسلمان اپنے باہمی تنازعات میں خدا اور محمد (رسول اللہ) کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہوں گے۔

یہود شرکائے معاہدہ کے لیے ۱ ۔ مسلمانوں کی جنگوں میں ان کی مالی اعانت کرنا ہر یہودی پر واجب ہوگا۔

۲ ۔ قبیلہ عوف کے تمام یہود کو مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق کی حیثیت سے مل کر رہنا ہوگا۔ مسلمان اور یہودی دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند رہیں گے۔

۳ ۔ یہ ذمہ داری بنو عوف کے غلاموں پر بھی ان کے آقاؤں کی مانند عاید ہوگی اور عدم پابندی کی صورت میں ان کے آقا ان کی طرف سے جواب دہ ہوں گے۔ سرکشی کی صورت میں نہ صرف بنو عوف کے مرد بلکہ ان کے بال بچوں پر بھی مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔

۴ ۔ اس دفعہ میں مدینہ کے مندرجہ ذیل یہود بھی شامل ہیں:

۱ ۔ بنو نجار ۲ ۔ بنو حارث

۳ ۔ بنو ساعدہ ۴ ۔ بنو ثعلبہ اور ان کے حلیف

۵ ۔ بنو جشم ۶ ۔ جُفنہ جو بنو ثعلبہ کی شاخ ہے

۷ ۔ بنو شطبیہ

الغرض یہ دفعہ ہر یہودی قبیلہ کے حلیفوں پر لاگو ہے۔

۵ ۔ ان میں سے کوئی فرد یا شاخ یا قبیلہ اس دفعہ سے محمد (صلعم) کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ قرار نہیں پا سکتا۔

۶ ۔ نہ ان میں سے کوئی فرد یا جماعت کسی کو مجروح کرنے پر مواخذہ سے بری الذمہ قرار پا سکتا ہے۔

۷ ۔ ان میں جو فرد یا جماعت قتلِ ناحق کا ارتکاب کرے اس کا وبال اس کی ذات اور اہل و عیال سب پر آسکتا ہے۔

۸ ۔ اِن (یہود) میں سے کسی پر ناحق ایسی تہمت پر اس کا ناصر اور حامی خدا ہے۔

۹ ۔ مسلمان اور یہود دونوں اپنے مصارفِ زندگی کے خود کفیل ہوں گے۔

۱۰ ۔ دونوں میں سے جو فرد اس قرارداد سے منحرف ہوگا دُوسرا فریق اس باغی پر قابو حاصل کرنے میں پہلے فریق کا معاون ہوگا۔

۱۱ ۔ یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے گروہ اور فرد کے ساتھ صلح اور نصیحت پر عامل رہیں گے اور صلح و نصیحت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی درمیان نہ آنے دیں گے۔

۱۲ ۔ فریقین میں سے کوئی فرد یا جماعت دوسرے فریق کی حق تلفی گوارا نہ کرے گی البتہ ایک دوسرے گروہ کے مظلوم کی حمایت کرنا اس کا فرض ہوگا۔

۱۳۔ مسلمان جب تک اپنے دشمنوں سے مصروفِ پیکار رہیں یہود ان کی مالی اعانت کرتے رہیں گے۔

۱۴۔ شہر مدینہ میں ایک دُوسرے فریق کے ساتھ جنگ کرنا حرام ہے۔

۱۵۔ ہر فرد اپنے ہمسائے کی طرفداری اپنے نفس کی مانند کرتا رہے گا۔

۱۶۔ اس معاہدہ کے پابند افراد اور گروہ باہمی اختلاف اور تنازعہ کا مقدمہ خدا اور اس کے رسول محمد (صلعم) کے سامنے پیش کریں گے۔

۱۷۔ شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت قریشِ مکہ کو اپنے ہاں پناہ نہ دے گی اور نہ قریشِ مکہ کے کسی حلیف کی حمایت کرے گی۔

۱۸۔ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریق کی حمایتی ہوگی۔

۱۹۔ شرکائے قرارداد کسی جماعت کی طرف سے دشمن کے ساتھ مصالحت میں دوسرے گروہ میں شریک نہ ہوں گے۔

۲۰۔ دشمن سے صلح کی صورت میں اگر کسی نوع کی منفعت ہوگی تو مسلمانوں کی مانند دوسرے شرکائے قرارداد بھی اس سے نفع اندوز ہوں گے۔

۲۱۔ البتہ جو شخص اپنے دین سے منحرف ہو جائے اس کے لیے یہ دروازہ بند رہے گا۔

۲۲۔ جنگی حالت میں فریقِ معاہدہ کے ہر فرد کو مالی اعانت میں اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا۔

۲۳۔ قبیلہ اوس کے یہود اور ان (یہود) کے موالی (حلیف) بھی اس قرارداد کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح وہ قبائل جن کا نام بنام ذکر اوپر آچکا ہے۔

حرفِ آخر ۱۔ اس معاہدہ کی خلاف ورزی ظالم اور مفسد کے سوا اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

۲۔ جو شخص مدینہ میں خلوص اور امن کے ساتھ سکونت رکھے اور وُہ شخص جو مدینہ سے خلوص اور امن کے ساتھ کسی اور جگہ نقلِ مکانی کرنا چاہے ان دونوں پر کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن فساد اور شرارت کرنے کے لیے قیامِ مدینہ اور یہاں سے ترکِ اقامت دونوں پر گرفت ہے۔

۳۔ جو شخص دوسروں کے ساتھ بھلائی کا طلب گار ہے خدا تعالیٰ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے خیر اندیش ہیں۔

دفاعی معاہدے ۱۴۵۔ داخلی امن مستحکم ہو جانے کے بعد رسولِ خدا نے مدینہ سے باہر آباد قبائل سے رابطہ پیدا کیا۔ پیغمبر نے ان قبائل سے خاص طور پر تعلق پیدا کیا جن کے علاقوں میں سے قریشِ مکہ کے تجارتی قافلے گزر کر عراق، شام یا مصر کی طرف آتے جاتے تھے۔ رسولِ خدا ان قبائل کے ساتھ بیرونی حملہ کے خلاف باہم فوجی امداد کی بنیاد پر دفاعی معاہدے کرنے میں کامیاب رہے۔ معاہدہ کے مطابق مسلمانوں کے فوجی دستے ان قبائل کے علاقوں میں گشت کرنے کے مجاز تھے مگر کافروں کو ایسا کرنے کی اجازت نہ تھی۔

۱۴۶۔ جن قبائل کے ساتھ رسولِ خداؐ نے معاہدے کیے ان میں ضمرہ، جہینہ اور مزینہ نامی قبائل شامل تھے۔ یہ قبائل علی الترتیب مدینہ کے جنوب، شمال اور مغرب میں آباد تھے۔ بڑے شہر عموماً آس پاس آباد خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل کی مصنوعات اور پیداوار کی منڈیاں ہوتے ہیں۔ مدینہ کے اردگرد رہنے والے ان قبائل کی معیشت کا انحصار بھی مدینہ کی منڈی پر تھا اور ان کے سامنے اس کا کوئی متبادل بھی نہ تھا۔ ممکن ہے زمانہ قبل از اسلام کے دوران اہلِ مدینہ اور بعض نواحی قبائل کے درمیان بھی معاہدے موجود رہے ہوں، جیسا کہ قبیلہ جُہینہ کے سردار کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے: مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ اس کے علاقہ میں گیا تاکہ قریشِ مکہ کے ایک تجارتی قافلے کی راہ روک سکے، مگر علاقہ کے قبائلی سردار مجدی ابن عمرو نے جو دونوں فریقوں کا دفاعی حلیف تھا مداخلت کی اور مسلمانوں کا فوجی دستہ کارروائی کے بغیر ہی واپس مدینہ آگیا۔

۱۴۷۔ بنو ضمرہ ابوذر غفاریؓ کا قبیلہ تھا جو ظہورِ اسلام کے شروع میں ہی ایمان لائے تھے۔ بنو ضمرہ سے مسلمانوں کا جو دفاعی معاہدہ ہوا ممکن ہے اس میں ابوذر غفاریؓ کا اثر و رسوخ بھی کارفرما رہا ہو۔ اس معاہدہ میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ اگر مذہب کی بنیاد پر جنگ شروع ہو جائے تو بنو ضمرہ اس میں شریک نہ ہوں گے گو بنو ضمرہ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے، مگر انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بنو ضمرہ، بنو غفار، بنو رُبعہ اور بنو زُرعہ جو قبیلہ جہینہ کی شاخیں ہیں، سے کیے جانے والے معاہدات کے متن ہم تک پہنچے ہیں مگر مزید جنوب میں آباد بنو مدلج کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کا متن معلوم نہیں ہو سکا تاہم اس معاہدہ کی دفعات یقیناً دیگر معاہدوں کے مطابق ہی ہوں گی۔ بنو مدلج کے سراقہ کا رویہ —— جس نے سفرِ ہجرت کے وقت رسولِ خداؐ اور ان کے رفقا کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی —— نہایت ہمدردانہ تھا۔ اور جب رسولِ خداؐ کفارِ مکہ کے ایک تجارتی قافلہ کے خلاف کارروائی کے لیے العشیرہ گئے تو سراقہ نے پورے فوجی دستہ کے اعزاز میں نہایت پُرتکلف دعوت دی، اس دعوت کی وجہ سے مسلمانوں کا قیمتی وقت ضائع ہو گیا اور دشمن کے تجارتی کاروان سے ان کی مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔

۱۴۸۔ ایسے دفاعی معاہدوں کے ذریعے رسولِ خداؐ نے "اسلامی ریاست" کی سلامتی اور دفاع کو روز افزوں مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ معاہدوں کی وجہ سے پُرامن طور پر کام کرنے کی راہ ہموار ہو گئی اور دینِ اسلام ان قبائل میں سرایت کرنے لگا جن سے رسول اللہؐ نے دفاعی معاہدے کیے تھے۔ جلد ہی بنو ضمرہ میں سے اسلام کو بہترین سفیر میسر آیا۔ یہ عمرو بن امیہ الضمری تھے۔ وہ رسولِ خداؐ کے اس قدر وفادار تھے کہ ابھی انھوں نے اسلام بھی قبول نہیں کیا تھا جب رسول اللہؐ نے جنگِ بدر کے بعد انھیں اپنا سفیر بنا کر حبشہ کے شاہ نجاشی کے دربار میں بھیجا تاکہ وہاں اسلام کے خلاف کفارِ مکہ جو سازشیں کر رہے ہیں ان کا توڑ کیا جائے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۴۹۔ جب مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے دفاعی اور دوستانہ معاہدے مکمل ہو گئے تو رسولِ خداؐ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کفارِ مکہ پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ قریشِ مکہ کے تجارتی قافلے شمال کی طرف سفر کرتے وقت انھی علاقوں سے گزرتے تھے جن علاقوں کے قبائل سے مسلمانوں نے معاہدے کر رکھے تھے۔ رسولِ خداؐ کا یہ اقدام اخلاقی اعتبار سے بالکل درست تھا۔ کفارِ مکہ نے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مسلمانوں کی املاک ضبط کر لی تھیں۔ فریقین حالتِ جنگ میں تھے دُنیا بھر

میں یہی دستور ہے کہ دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کیا جائے، قتل کیا جائے اور دشمن کی املاک لوٹ لی جائیں۔ کفارِ مکہ اپنی تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کو مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں صرف کر رہے تھے۔ رسولِ خدا نے تو کفارِ مکہ سے صرف یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسلامیانِ مکہ کے زیرِ اثر علاقوں میں سے آمدورفت بند کر دیں۔ ان کے تجارتی قافلوں پر چھاپے تو محض ایک سزا تھی، کفار نہ اسلامی علاقے میں سے گزرتے اور نہ ہی ان کے کاروان خطرے میں پڑتے۔

باب ۶

مکّہ سے تعلقات

۱۵۰۔ مکّہ بنجر علاقہ ہے، نہ وہاں زراعت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی صنعت کا وجود ہے۔ لوگوں کا واحد ذریعۂ روزگار تجارت ہے۔ اُن دنوں یمن کی یورپ سے تجارت شام کے ذریعے ہوتی تھی اور تجارتی قافلے مکّہ سے ہو کر گزرتے تھے۔ مکہ والوں کے تجارتی قافلے سردیوں اور گرمیوں میں (القرآن ۱۰۶/۲) ان کے لیے خوشحالی اور آسودگی کا پیام لاتے تجارت کی غرض سے محض یمن تک جانا بے سُود تھا جب تک شام تک کا سفر اختیار نہ کیا جائے اور وہاں یمنی مصنوعات کا لین دین نہ کیا جائے۔ اگر ان تجارتی قافلوں کا مدینہ کا راستہ بند کر دیا جاتا تو ان کے مفادات پر سخت زد پڑتی۔ چنانچہ مکی بزورِ شمشیر مدینہ کا راستہ کھولنا چاہتے تھے۔ یہ بات ہی مسلمانوں کے ساتھ کفارِ مکّہ کے مسلح تصادم کا باعث بنی۔ پہلی جنگ بدر میں ہُوئی اور اس کے بعد دو جنگیں (جنگِ اُحد اور جنگِ خندق) مدینہ میں لڑی گئیں۔ آخری جنگ مکّہ میں ہُوئی جو مسلمانوں کے لیے فتح کی خوشخبری کی پیغامبر ثابت ہُوئی۔

۱۵۱۔ محض یہ پابندی کہ کفارِ مکّہ کے قافلے اسلامی سرزمین میں سے نہ گزریں، کافی نہ تھی۔ چنانچہ جونہی مدینہ کے آس پاس آباد قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدے مکمل ہو گئے، رسولِ خدا نے مسلم فوج کے دستے ان علاقوں میں بھیجنے شروع کیے تاکہ کفارانِ مکّہ کے ایسے قافلوں کو ہراساں کیا جا سکے جو مسلمانوں کی عاید کردہ پابندی کا احترام نہ کریں اور مسلمانوں کی علاقائی حدود کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں۔ کھلے صحرا میں یہاں آبادی کم ہوتی ہے، کسی علاقے میں مداخلت آسان ہوتی ہے خصوصاً مکّی قافلوں کے لیے یہ کام اور بھی آسان تھا کیونکہ وہ شب میں سفر کرتے تھے۔ علاقہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے تجارتی راستوں پر کنٹرول اور بھی مشکل تھا۔ چنانچہ دس میں سے ایک مسلم گشتی دستہ کافروں کے کسی تجارتی قافلہ سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا۔ قافلوں پر چھاپہ مارنے کے لیے ان کی نقل و حرکت کی بالکل صحیح اطلاع ناگزیر ہوتی ہے۔ شروع شروع میں مسلمانوں کو پوری اطلاعات نہیں مل رہی تھیں۔ جب اسلامی علاقہ میں توسیع ہُوئی اور مسلمانوں کا اثر و نفوذ بڑھا تو دشمن کے قافلے ایک ہی رات میں اسلامی علاقہ سے گزر نہیں سکتے تھے جس کے باعث تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا کنٹرول موثر ہو گیا۔ مگر یہ سب کچھ تحمل اور مسلسل نگرانی سے ممکن ہو سکا۔

۱۵۲۔ فطری طور پر کفارِ مکّہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جب انھیں اطلاع ملی کہ ان کے ایک بڑے تجارتی قافلہ کا بدر کی گھاٹی میں تعاقب کیا جا رہا ہے تو انھوں نے ایک بڑی فوج جمع کی تاکہ مسلمانوں کو سبق سکھایا جا سکے لیکن وُہ بُری طرح ناکام رہے۔ (جنگِ بدر میں) مسلمانوں نے رسولِ خدا کی قیادت میں دشمن کو جو تعداد میں ان سے تین گنا تھا تہس نہس کر دیا۔ ستر کافر کھیت رہے اور تقریباً اتنے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں جنگی قیدی بن گئے۔ بعد میں انھیں فدیہ لے کر

رہا کر دیا گیا۔ مگر رسولِ خدا کی طرف سے اس نرم رویّہ کا کوئی مفید اثر نہ ہوا، کافروں کے دل نہ بدلے بلکہ وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ اُنھوں نے اپنے حلیفوں سے فوجی امداد حاصل کی اور کرائے کے سپاہی بھرتی کیے۔ انھوں نے شاہِ نجاشی کے دربار میں ایک اور وفد بھیجا تاکہ اسے اہلِ اسلام کے خلاف بھڑکا کر ان مسلمانوں کو حبشہ سے نکلوایا جائے جو وہاں پناہ گزیں تھے۔ حضور پاکؐ کو بھی ——— غالباً مکّہ میں اپنے وفادار ایجنٹوں کے توسط سے ——— اس کی اطلاع مل گئی، چنانچہ اُنھوں نے اپنا ایک خصوصی سفیر عمرو بن اُمیّہ الضمری جو بنو ضمر کا سردار تھا، شاہِ حبشہ کے دربار میں بھیجا اور اس طرح کفارِ مکّہ کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ شاہِ نجاشی کو ایک بار ملک میں بغاوت اور خانہ جنگی کی وجہ سے ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا تھا اور اس نے جلاوطنی کا یہ عرصہ بنو ضمر کے پاس گزارا تھا (السہیلی) ممکن ہے اُسی وقت سے عمرو ابن امیہ الضمری کے شاہ نجاشی سے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔

۱۵۳۔ اسی اثنا میں مشرکینِ مکّہ نے مدینہ پر فوج کشی کر دی، چنانچہ مسلمانوں اور کافروں میں کوہِ اُحد کی وادی میں جنگ ہوئی۔ دشمن فوج کی تعداد مُسلم فوج سے چار گنا تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچایا مگر جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ ایک ہی جھڑپ کے بعد دشمن پسپا ہوگیا اور مکّہ لوٹ گیا، تاہم کفّار کے تجارتی راستے بدستور مسدود رہے۔ مکّی تجّار نے راستہ میں تبدیلی کی اور صحرائے نجد میں سے گزر کر عراق پہنچنے کی کوشش کی مگر مسلم فوج کے ایک دستے کے بہادرانہ حملہ کے بعد جس میں کفّار کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، مکّی تاجروں کو اس راستے پر دوبارہ سفر کی جُرأت نہ ہوئی۔ اس طرح دشمنانِ اسلام کی تجارت بند ہو کر رہ گئی۔ دشمن کا مستقبل تاریک ہوگیا انھیں روز افزوں مایوسی نے گھیر رکھا تھا کہ اچانک انھیں امید کی کرن نظر آئی اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا کیونکہ انھوں نے ایک مسلم خاتون کی بے حُرمتی کی تھی اور جب ایک مسلمان اس خاتون کی مدد کو آیا تو بنو نضیر نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مسلم حکومت نے جب مجرموں کے خلاف کارروائی کرنا چاہی تو بنو نضیر نے ہتھیار سنبھال لیے اور مزاحمت کی۔ مدینہ سے نکلنے کے بعد بنو نضیر نے خیبر کو اپنا مسکن بنایا اور مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع سازش میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے مکّہ سے دفاعی معاہدہ کیا اور بنو غطفان اور بنو سلیم سے کرایہ کے فوجیوں کی خدمات حاصل کیں تاکہ مسلمانوں پر بیک وقت حملہ کیا جا سکے۔ کفّارِ مکّہ نے بھی اپنے حلیفوں اور دوستوں سے کمک طلب کی۔ کفّار کی فوج مدینہ کے محاصرہ کے لیے آئی، اس کی تعداد مسلمانوں سے آٹھ گنا سے بھی زیادہ تھی۔ اب وہ محض ایک آدھ جھڑپ پر اکتفا کرنے کو تیار نہ تھے پیغمبرِ اسلام کو کفّارِ مکّہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع کافی عرصہ پہلے مل چکی تھی اور وہ شہر کے دفاع کے لیے موثر انتظامات کر چکے تھے رسول اللہ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی۔ خواتین اور بچّوں کو ان قلعہ بندیوں میں منتقل کر دیا جو شہر کے اندر کافی تعداد میں موجود تھیں، یہ قلعہ بندیاں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں بھیڑوں کے ریوڑ بھی رکھے جا سکتے تھے۔ جنگ شروع ہوگئی، دشمن نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا مگر کئی ہفتے گزرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، فوجِ کفّار کے رسد کے ذخائر اور گھوڑوں کے لیے چارہ ختم ہوگیا۔ پھر حج کا زمانہ آگیا جس کے بعد عاشورہ محرم تھا جس کے دوران جنگ ممنوع تھی۔ مکّی بھی ان دنوں خونریزی سے

گریز کرتے تھے۔ پھر وہ حج کعبہ کے لیے مکہ آنے والوں سے جو کمائی کرتے تھے وہ اس سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان دنوں جنوری کا سرد موسم تھا۔ ان تمام عوامل نے مل کر اہلِ مکّہ کو مدینہ کا محاصرہ ختم کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ گھروں کو لوٹ گئے۔

۱۵۴۔ کفارِ مکّہ کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی مایوس کن تھی۔ انھیں نوشتۂ دیوار صاف نظر آرہا تھا۔ انھی دنوں مکّہ میں قحط رُونما ہوا کیونکہ بارش نہیں ہوئی تھی۔ پیغمبرِ اسلام نے قحط زدہ افراد کی امداد کے لیے پانچ سو اشرفیاں مکہ بھجوائیں۔ انھوں نے مکّہ کے سردار ابوسفیان کو کھجوروں کی بھاری مقدار بھی بھجوائی اور اسے کہا کہ وہ ان کھجوروں کے بدلے کھالیں بھجوا دے جو وہ تجارتی راستے بند ہونے کی وجہ سے برآمد نہیں کرسکا تھا۔ یہ باور کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ رسولِ خدا نے ابُوسفیان کو یقین دلایا تھا کہ اس کے تجارتی قافلوں کو بلا روک ٹوک اسلامی سلطنت کے راستوں سے گزرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ درحقیقت چند ہفتے بعد جب رسولِ خدا حُدیبیہ کی مہم پر گئے جو مکّہ کے نواح میں ہے، تو ابوسفیان مکّہ میں موجود نہ تھا بلکہ وُہ شام میں تھا جہاں اس نے بیت المقدس میں رومی بادشاہ ہرقل سے ملاقات کی۔ ہرقل ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد اظہارِ تشکر کے لیے بیت المقدس آیا تھا۔ انھی دنوں رسولؐ اللہ نے ابوسفیان کی بیٹی اُمِ حبیبہؓ سے نکاح بھی کیا۔ وُہ اسلام قبول کر چکی تھیں اور حبشہ میں پناہ گزیں تھیں۔ ان کا شوہر جو شرابی کبابی انسان تھا حبشہ جا کر عیسائی ہو گیا۔ ام حبیبہ نے اپنے شوہر کی طرف سے ہر قسم کے دباؤ کے باوجود عیسائیت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام پر استقامت سے قائم رہیں۔ ام حبیبہؓ کا شوہر نشہ کی حالت میں ڈوب کر مر گیا۔ اسلام سے اُمِ حبیبہؓ کی محبت اور اللہ کی راہ میں استقامت سے متاثر ہو کر ہی رسولؐ خدا نے ان سے شادی کی پیش کش کی انھوں نے نبی کی ازواج میں شامل ہونے کا شرف بخوشی قبول کر لیا اور یُوں وہ اہلِ اسلام کی ماں قرار پائیں۔ اب محمد صلعم کے داماد تھے کوئی اجنبی نہ تھے۔ اس کے دل میں اسلام سے نفرت اور دشمنی میں کمی واقع ہوئی۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ قرآن پاک کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

> "شاید کہ اللہ تم میں اور ان میں کہ جن سے تمھیں دشمنی ہے دوستی قایم کر دے۔ اور اللہ قادر ہے اور اللہ بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

۱۵۵۔ ان تمام واقعات کے اثرات بالآخر اسلام کے حق میں نکلے رسولِ خدا نے اس طرح راہ ہموار کرنے کے بعد اعلان کیا کہ وُہ حجِ بیت اللہ کے لیے مکہ جا رہے ہیں۔ کیا کفارِ مکّہ کے لیے یہ فخر و مباہات کا مقام نہ تھا کہ ان کا "بت خانہ" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہوں میں بھی مقدس ہے، جبکہ رسولؐ اللہ ان کے بتوں کے اولیں دشمن تھے۔ اور کیا اس سے کفارِ مکہ کے دلوں میں اسلام کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا ہوگا؟ رسولؐ اللہ حدیبیہ پہنچے جو مکہ کے نواح میں ہے انھوں نے قریشِ مکّہ کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر چند روز کے لیے مکہ میں پُرامن داخلہ کی اجازت طلب کی تاکہ وُہ حج کا فریضہ ادا کرسکیں۔ اس پر مکّہ والوں نے بات چیت کے لیے ایک وفد رسولِ خدا کی خدمت میں بھیجا۔ معاہدۂ امن کوئی مشکل امر نہیں تھا کیونکہ رسولؐ خدا قریشِ مکّہ کی انا کی خاطر ان کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

رسولِ خدا اس سے دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے :

اوّل امن، اور دوم قریشِ مکہ سے یہ وعدہ کہ مسلمانوں اور کسی تیسری طاقت کے درمیان جنگ کی صورت میں وہ غیر جانب دار رہیں گے۔

گو مکی جانتے تھے کہ مسلمان ان سے جس غیر جانب داری کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کا تعلق خیبر کے یہود سے ہے لیکن علاقائی امن اور تجارتی راہداری کی بحالی کا لالچ اتنا بڑا تھا کہ مکی معاہدہ پر رضامند ہو گئے۔

معاہدہ میں کہا گیا تھا :

الف۔ رسولِ خدا اس سال حج نہیں کریں گے بلکہ ایک سال بعد آئیں گے اور مکّہ میں صرف تین روز قیام کریں گے۔

ب۔ افراد کی واپسی کا یک طرفہ نظام ہوگا : اگر کوئی مکی مدینہ جا کر رسولِ خدا کے پاس پناہ حاصل کرے تو رسولِ خدا اسے مکہ والوں کو لوٹا دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان اسلام ترک کر کے مدینہ سے مکہ میں پناہ گزین ہو جائے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔

ج۔ فریقین میں دس سال کے لیے جنگ ممنوع ہوگی مگر مسلمانوں کو مکہ اور طائف جانے کی آزادی ہوگی۔ اسی طرح مکی تجار کے قافلے اسلامی مملکت کی حدود سے گزر کر شام جا سکیں گے۔

د۔ فریقین، معاہدہ کے ایک فریق کی کسی تیسری طاقت کے ساتھ جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہیں گے۔

ھ۔ دوسرے قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اور وہ جس فریق کے ساتھ چاہیں شامل ہو سکیں گے۔

(چنانچہ بنو خزاعہ نے رسول اللہؐ کے ساتھ اور بنو بکر (احابیش) نے قریشِ مکہ کے ساتھ اس معاہدہ میں شمولیت اختیار کر لی)

۱۵۶۔ اس معاہدہ کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے :

(i) مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان خفتہ رابطے بیدار ہو گئے اور فریقین کے درمیان بات چیت کو فروغ ملا۔ اس ضمن میں حضرت خالدؓ ابن ولید اور حضرت عمروؓ ابن العاص کی مثال بہترین ہے جنھوں نے اس واقعہ کے بعد اسلام کا دامن تھاما۔

(ii) مکّہ میں بیسیوں مسلمان جنھیں ان کے والدین یا سرپرستوں نے نظر بند کر رکھا تھا یا زبردستی روک رکھا تھا معاہدہ حدیبیہ کی دفعہ ۳ کے باوجود بھاگ کر مدینہ پہنچنے لگے۔ معاہدہ کی اس دفعہ پر عمل درآمد کی بعض تفصیلات کا بیان محلِ نظر ہوگا۔ مقامِ حدیبیہ پر رسولِ خدا کے کیمپ میں ایک مکی ابو جندل ابن سہیل بن عمرو آیا اور سیاسی پناہ طلب کی لیکن اس کے والد کے مطالبہ پر اسے مکہ واپس بھیج دیا گیا۔ رسولِ خدا نے اس سلسلے میں صرف یہ کیا کہ ابو جندل کے والد سے یہ عہد لے لیا کہ اسلام قبول کرنے کی پاداش میں وہ اپنے بیٹے پر تشدد نہیں کرے گا۔ رسول اللہؐ جب واپس مدینہ جا رہے تھے

تو ایک اور مکی مسلمان ابوبصیر انھیں راستے میں ملا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر رسولِ خدا کی پناہ میں آیا تھا۔ ابوبصیر کے خاندان کے دو افراد بھی اس کے فوراً بعد رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسولؐ خدا نے ابوبصیر کو ان کے سپرد کر دیا۔ اثنائے راہ میں ابوبصیر نے اپنے ایک محافظ کو قتل کر دیا اور واپس اسلامی فوج میں آگیا۔ دُوسرا مکی بھی واپس آیا اور رسول اللہ کو تمام واقعہ بتایا۔ حضورؐ کے تیور پہچان کر ابوبصیر کھسک گیا اور غائب ہو گیا جس کے بعد ابوبصیر کو واپس لے جانے کے لیے مکہ سے آنے والے محافظ کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ صلح حدیبیہ کے بعد مکی تاجروں کے قافلے شام کو آنے جانے لگے تھے۔ ابوبصیر اسلامی فوج سے نکل کر بدر کی ایک گھاٹی[1] میں جاگزین ہو گیا۔ وہ جب بھی کسی مکی کافر کو ادھر سے گزرتے دیکھتا تو اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے اسے ختم کر دیتا۔ ابوبصیر کی کامیابیوں کا سُن کر مکّہ سے متعدد مسلمان فرار ہو کر بدر کی گھاٹیوں میں پہنچ گئے۔ اب ابوبصیر کے پاس ایک مضبوط فوجی دستہ[2] جمع ہو گیا اور وہ کفارِ مکہ کے تجارتی قافلوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا جو یہاں سے گزر کر شام جاتے تھے۔ اس میں رسولِ خدا کا کوئی قصور نہ تھا۔ چنانچہ قریش جب ابُوبصیر اور اس کے رفقا کی تاخت کی تاب نہ لا سکے تو انھوں نے رسولِ خدا کی خدمت میں عریضہ پیش کیا کہ وہ معاہدہ کی دفعہ "۴" سے دستبردار ہوتے ہیں اور اس کے عوض رسولؐ اللہ ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کو مدینہ بلالیں۔ چنانچہ رسولِ خدا نے بخوشی اس دفعہ کی تنسیخ کی منظوری دے دی۔ معاہدہ میں اس ترمیم سے قبل مکہ سے دو خواتین بھی رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہُوئیں۔ اسلام میں کتنی کشش تھی ان خواتین میں سے ایک عقبہ ابن ابو معیط کی بیٹی تھی جو مکہ میں پیغمبر کا جانی دشمن تھا اور بدر میں گرفتاری کے بعد اس کا سر قلم کیا جا چکا تھا۔ اسی عقبہ کی نوجوان ناکتخدا بیٹی نے چپکے سے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ پہنچ گئی۔ اس کے دو بھائی بھی مدینہ آئے اور اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس پر رسولِ خدا نے جواب دیا: "اس دفعہ کا تعلق مردوں سے ہے خواتین سے نہیں"۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بہن کی واپسی پر اصرار نہ کیا۔ ایک اور خاتون جو در اصل مدینہ کی رہنے والی تھی مگر اس کی شادی مکہ میں ہُوئی تھی اپنے خاندان کو چھوڑ کر مدینہ آگئی۔ اس ضمن میں رسولِ خدا نے اس کے حق مہر کی رقم اس کے خاوند کو ادا کرا دی۔ اسلام میں کسی مسلمان خاتون کی شادی غیر مسلم سے نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی کوئی مسلم خاتون غیر مسلم شوہر سے ازدواجی تعلقات برقرار رکھ سکتی ہے۔ مسلمان مردوں کو بھی اہلِ کتاب کے سوا کسی غیر مسلم عورت سے شادی کی ممانعت ہے۔

(iii) صلح حدیبیہ کے بعد خیبر کے یہودی مکی حلیفوں کی امداد سے محروم ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی جس کے بعد تیماء، وادی القرا اور فدک وغیرہ کے علاقے اسلامی مملکت میں شامل کر لیے گئے۔

(iv) رسولِ خدا نے غیر ملکی فرمانرواؤں کو خطوط لکھے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ خطوط ہرقل، کسریٰ

---

[1] جس جگہ ابوبصیر جاگزین ہوئے وہ مقام عیص کہلاتا ہے۔ عیص کے قریب ہی وہ شاہراہ تھی جس سے گزر کر کفارِ مکہ کے قافلے شام کو جاتے تھے۔ (مترجم)

[2] معتبر روایات کے مطابق ایسے مسلمانوں کی تعداد ستر تھی۔

اور شاہِ نجاشی کے علاوہ متعدد دوسرے حکمرانوں کو بھیجے گئے۔ اسلام کو محض جزیرہ نماعرب تک محدود تو نہیں رہنا تھا! یہ ایک المناک واقعہ ہے کہ رسولِ خدا کے ایک سفیر کو بازنطینی سلطنت کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا۔ اور بازنطینی فرمانروا ہرقل نے اس جرم کے مرتکب شہزادہ کو سزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس کی سلطنت اللہ کی سزا کی حقدار ہو چکی تھی۔ افسوسناک بات تو یہ تھی کہ عیسائی قبل ازیں اسلام کے استنے مخالف نہ تھے۔ اپنی دانش، سائنسی ترقی اور علم و فہم کے باوجود وہ اسلام کے بارے میں انتہائی غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن تصورات رکھتے تھے۔

(۷) اہلِ مکہ اور رسولِ خدا کے حلیفوں کے درمیان خونریز معرکہ ہوا۔ یہ دونوں قبیلے بعد میں معاہدہ حدیبیہ میں شامل ہوئے تھے۔ بعض احمق مکیوں نے خفیہ طور پر اپنے حلیف قبیلہ کو افرادی قوت اور اسلحہ کی امداد فراہم کی تاکہ وہ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ کو ختم کر سکے۔ اس قبیلہ کے بیشتر افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ مکیوں کی طرف سے یہ صلح نامہ کی کھلی خلاف ورزی تھی جو خاموشی سے برداشت نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ اور مکیوں کے اذہان میں نفسیاتی تبدیلی قابلِ غور ہے۔

۱۵۷۔ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ پر کفارِ مکہ کے حلیف قبیلہ کے حملہ کی خبر جب رسولِ خدا کو ملی تو انھوں نے مدینہ کی سرحدیں بند کر دیں اور حکم دیا کہ کوئی شخص مدینہ سے باہر نہیں جائے گا۔ اس سے مدینہ کے اندر رونما ہونے والے حالات کی خبر شہر کی حدود سے باہر نہ نکل سکی۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ایک بہت بڑی فوجی مہم کی تیاری کا حکم دیا مگر یہ نہ بتایا کہ اسلامی فوج کا ہدف کیا ہوگا۔ پھر اُنھوں نے مدینہ کے آس پاس کے مسلم قبائل کو اسلامی فوج میں شمولیت کے لیے ہر طرح تیار رہنے کا حکم بھیجا تاہم انھیں بھی منزل سے آگاہ نہ کیا گیا۔ اسلامی فوج جس کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی رسول اللہؐ کی سرکردگی میں مدینہ سے نکلی، رسولِ خدا ادھر ادھر سے ہوتے ہوئے چل رہے تھے تاکہ مختلف قبائل کے فوجی دستوں کو جن کی تیاری کا وہ حکم دے چکے تھے اسلامی فوج میں شریک کرتے جائیں۔ پوری فوج میں کسی کو علم نہ تھا کہ وہ شمال کو جا رہے ہیں یا جنوب کو یا ان کے سفر کی سمت مشرق ہے۔ قبائل کے فوجی دستوں کی شمولیت سے اسلامی فوج کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ چلتے چلتے بالآخر حضورِ اکرمؐ نے مکہ کے نواح میں پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ فوجی دستور کے مطابق بہت سے سپاہی مل کر تمام فوج کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں۔ مگر رسولِ خدا نے حکم دیا کہ اُس رات ہر سپاہی الگ آگ جلائے اور اپنا کھانا خود تیار کرے۔ مکہ کی پہاڑیوں پہ آباد خاندانوں نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں دس ہزار کے لگ بھگ مقامات پر آگ جل رہی ہے۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ مسلمانوں نے پچاس ہزار سپاہ پر مشتمل فوج سے مکہ پر حملہ کر دیا ہے۔ سردارِ مکہ ابو سفیان جاسوسی کی غرض سے خود دامنِ کوہ میں اُترا، مگر مسلمانوں کے ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کر لیا جس کے بعد مکہ میں دفاعی اقدامات میں رابطہ پیدا کرنے والا کوئی نہ رہا۔

اگلی صبح رسول اللہؐ نے اپنی فوج کو متعدد یونٹوں میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ ہر یونٹ الگ راستے سے مکہ میں داخل ہو اس طرح

---

[1] اسلام کے اس شہید سفیر کو عیسائی سردار شرحبیل نے موتہ (شام) کے قریب شہید کیا تھا۔ سفیر کا نام حارثؓ بن عمیر تھا۔ (مترجم)

مکیوں کے فرار کے تمام راستے بھی مسدود کر دیے گئے۔ رسولِ خدا نے تمام کمانڈروں کو سختی سے حکم دیا کہ وہ صرف اس وقت اپنے دفاع میں ہتھیار استعمال کریں جب ان پر حملہ کیا جائے۔ جب اسلامی فوج کی پیش قدمی شروع ہوگئی تو رسولِ خدا نے ابو سفیان کو رہا کر دیا جو از حد حیران و پریشان تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسلامی فوج کے نقیب شہر بھر میں یہ منادی کرتے پھر رہے تھے کہ جو شخص اپنے گھر میں ہی رہے گا اسے امان ہے، جو شخص کعبہ کے صحن میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے بھی امان ہے، جو شخص اپنے ہتھیار مسلم فوج کے حوالے کر دے گا یا ابو سفیان کے گھر میں پناہ حاصل کرے گا اس کے لیے بھی امان ہے۔ (اس آخری رعایت سے نہ صرف ابو سفیان بلکہ کفارِ مکہ بھی ہکا بکا رہ گئے) اسلامی فوج مکہ میں پھیل گئی اور خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے مکہ کی آبادی پر اداسی طاری تھی۔ جلد ہی رسول اللہؐ کی طرف سے شہر بھر میں اعلان کیا گیا کہ لوگ کعبۃ اللہ میں جمع ہو جائیں جہاں محمد رسول اللہ ان سے خطاب کریں گے۔ لوگ خوف و ہراس اور تجسس کے ملے جلے جذبات لیے کعبہ میں جمع ہو گئے۔ رسولِ خدا اپنی فوج کے جلو میں آئے، وہ سراپا انکسار تھے اور اپنی اونٹنی کی پشت پر ہی اللہ کے حضور سجدہ میں گرے ہوئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ کعبۃ اللہ کی عمارت میں داخل ہوئے، انھوں نے دیواروں پر بنی ہوئی تمام تصاویر کو مٹانے کا حکم دیا۔ ایک معروف روایت کے مطابق حضورؐ نے فرمایا "تمام (تصاویر) دھو ڈالو سوائے اس کے" یہ کہتے ہوئے انھوں نے حضرت مریم اور ان کے بچے کی تصویر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ کعبہ سے باہر آئے اور اپنے موذن بلالؓ حبشی کو کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا۔ کفارانِ مکہ کے ایک سردار عتاب بن اسید نے جو اس موقع پر موجود تھا اپنے قریب کھڑے ایک اور کافر سے کہا "خدا کا شکر ہے میرا باپ مر چکا ہے ورنہ یہ کالا گدھا (اس کا اشارہ حضرت بلالؓ کی طرف تھا) کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر جو آوازیں نکال رہا ہے وہ اسے کبھی برداشت نہ کرتا۔" رسولؐ پاک نے کعبہ میں مسلمانوں کو نماز پڑھائی۔ پھر وہ کفارِ مکہ سے مخاطب ہوئے۔ رسول اللہؐ نے انھیں اس سلوک کی یاد دہانی کرائی جو کفارِ مکہ نے اکیس سال کے دوران پیغمبرِ خدا سے روا رکھا تھا۔ پھر رسول اللہؐ نے سوال کیا "اب تم مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟" فطری طور پر ان کے سر شرم سے جھک گئے۔ رسولِ خدا مشرکین مکہ کے قتلِ عام، انھیں غلام بنانے یا کم از کم ان کی املاک ضبط کرنے کا حکم دے سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ نہایت حلیمی سے بولے "آج کے دن تم پر کوئی جبر نہیں، جاؤ تم آزاد ہو"۔ رسول پاکؐ کے اس فیصلے کا مشرکین مکہ پر زبردست اثر ہوا اور عتاب بن اسید آگے بڑھ کر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "اے محمد (صلعم)! میں عتاب بن اسید ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔" رسولِ خدا نے بھی ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہا "جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمھیں مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں"۔ جلد ہی رسولِ خدا واپس روانہ ہو گئے اور انھوں نے اپنا ایک سپاہی تک مکہ میں نہ چھوڑا۔ اپنے اس فیصلہ پر حضورؐ کو کبھی پشیمان نہیں ہونا پڑا۔

۱۵۸۔ مزید آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے اس رویہ پر بھی غور کیا جائے۔ مکہ کو جس بات کی سزا دی گئی، اس میں مکہ کی تمام آبادی کا قصور نہیں تھا۔ کم از کم اخلاقی طور پر مکہ کو یوں فتح کرنا زیبا نہ تھا۔ رسولِ خدا صرف یہ چاہتے تھے کہ مکہ کا نظام بدل جائے اور ایسے لوگوں کو عنانِ حکومت سونپی جائے جو غیر جانبداری اور سنجیدگی سے

اسے سنبھال سکیں۔ چنانچہ انھوں نے عتاب بن اَسید کو مکہ کا گورنر مقرر کر دیا اور خود مدینہ لوٹ گئے۔ انھوں نے مکہ والوں میں ذہنی تبدیلی کے لیے حسبِ استطاعت سب کچھ کیا۔ ایک فاتح کی حیثیت سے پیغمبر کا رویہ اتنا فراخدلانہ تھا کہ کیوں کا تعصب اس کی لہر میں بہہ گیا۔ مکہ مشرف بہ اسلام ہو گیا اور از خود اسلامی مملکت کا ایک حصہ بن گیا۔ مکہ کو کسی مفتوحہ شہر کی طرح زبردستی فاتح مملکت میں ضم نہیں کیا گیا۔

۱۵۹۔ صرف عتاب بن اَسید ہی حضورؐ کے رویہ سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام نہیں ہوا، ایک اور سردار صفوان رسولِ خداؐ کے پاس آیا اور بولا "میں اسلام قبول کرنا نہیں چاہتا، مجھے غور و فکر اور فیصلہ کے لیے دو ماہ کی مہلت درکار ہے۔" رسولؐ خدا نے فرمایا "میں تمھیں چار مہینے دیتا ہوں۔" بہت سے دوسرے مثلاً عکرمہ ابن ابو جہل مکہ سے فرار ہو گئے، انھیں بجا طور پر اپنی بداعمالیوں کی سزا ملنے کا خطرہ تھا۔ رسولِ خداؐ نے ان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ بعض لوگوں کو رسولِ خداؐ نے قیمتی تحائف دیے۔ ظاہر ہے ایسے سلوک کے بعد ان کے دلوں میں اسلام کے لیے اندھی نفرت کا قایم رہنا ممکن نہ تھا۔

۱۶۰۔ رسولؐ خدا کی مختصر تقریر نفسیاتی طور پر انتہائی مؤثر ثابت ہوئی۔ پورا شہر صرف ایک رات میں حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ کمی اسلام کے نہایت وفادار پیروکار ثابت ہوئے۔ کوئی دو سال بعد جب رسول اللہؐ کا وصال ہوا اور متعدد علاقوں کے لوگ اور کئی قبیلے مرتد ہو گئے۔ مکہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ثابت ہوا اور پورے عرب کے لیے تالیفِ قلب کا باعث بنا رہا۔

۱۶۱۔ مکہ کے مملکتِ اسلامیہ میں شامل ہونے کے صرف ایک ہفتہ بعد رسولؐ خدا کو طائف سے شورش کی اطلاع ملی جو مکہ کے مشرق میں ہے۔ وہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طور پر نکل کھڑے ہوئے اور مکہ سے دو دن کی مسافت پر جنگِ حُنین لڑی گئی۔ دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں نے علی الصبح ملگجے اندھیرے میں اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ جدھر منہ تھا ادھر بھاگ نکلے۔ اس سنگین صورت حال کو پیغمبرِ خدا کی ذاتی جرأت، بہادری اور ٹھنڈے دل و دماغ کی وجہ سے سنبھالا جا سکا۔ رسول اللہؐ کے ساتھ ایک درجن کے لگ بھگ جاں نثار تھے جنھوں نے پیغمبر کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ان میں ایک دلیر خاتون اُمِ عمارہ بھی شامل تھی جو امید سے تھی۔ ان جاں نثاروں کی جرأت اور مردانگی کی وجہ سے میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ صورت حال کچھ سنبھلی تو فرار ہونے والے مسلمان بھی واپس آ گئے۔ دشمن کو پسپا ہونا پڑا۔ اور اس کی چھاؤنی، خاندان، بیویاں اور بچے، مویشیوں کے گلّے اور دوسری املاک —— جنھیں وہ احمق میدانِ جنگ میں اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے —— مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ فتح کے بعد ام عمارہ بڑے فخر کے ساتھ رسولؐ خدا کے حضور پیش ہوئی اور بولی "اے رسولِ خدا! یہ مرد تو ناپسندیدہ نکلے۔ وہ بزدلی سے میدانِ جہاد سے فرار ہوئے ان سب کو موت کی سزا دی جانی چاہیے۔" رسولِ اکرمؐ مسکرائے اور ام عمارہ کی بہادری کی تعریف کی اور اس کے لیے دُعا کی۔ اس پر اُمِ عمارہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ (کہا جاتا ہے کہ لڑائی کے آغاز پر امِ عمارہ کے پاس صرف ایک خنجر تھا۔ اس نے اپنے خنجر سے دشمن کے ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ اتارا، اس سے تلوار چھینی اور پھر اس تلوار سے کافروں کے ساتھ جنگ کرتی رہی)

۱۶۲۔ جنگ کے بعد رسولِ خداؐ نے بنی ہوازن (جنھوں نے شورش بپا کی تھی) کا طائف تک پیچھا کیا۔ وہ چند

روز طائف میں مقیم بھی رہے تاہم بعد میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ محاصرے کے بجائے امن کا حربہ استعمال کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مکہ لوٹ آئے جہاں سے وہ مدینہ چلے گئے۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ زیادہ مفید ثابت ہوا۔

۱۶۳۔ اس کے کوئی دو ماہ بعد ایامِ حج میں یہ عجیب و غریب بات سامنے آئی کہ مسلمان تو کعبۃ اللہ کو دینِ اسلام کے مرکز کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور عرب کے کونے کونے سے آنے والے کفار خانۂ خدا میں بُت پرستی کی رسوم بھی ادا کر رہے ہیں۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مکہ کو جبراً اسلامی مملکت میں ضم نہیں کیا گیا تھا بلکہ رسولِ خداؐ نے شہر کی حکومت تبدیل کرنے پر اکتفا کی تھی۔ عتّاب بہترین گورنر ثابت ہوا۔ مسلمان اور مشرکین دونوں ہی اس کے معترف تھے۔ تاہم جلد ہی جب مکہ میں تمام لوگ دینِ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تو صورتِ حال بالکل بدل گئی۔

۱۶۴۔ ایک سال بعد رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ایامِ حج کے دوران اپنی نیابت کے لیے مکہ بھیجا۔ اس موقع پر انھوں نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ کوئی کافر بُت پرستی کی غرض سے کعبۃ اللہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ حجاج مکیوں کے لیے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھے جیسا کہ زمانۂ حال میں سیاح مختلف ممالک کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم (۹/۲۸) نے اہلِ مکہ کو یقین دلایا کہ وہ حجاج کی تعداد میں متوقع کمی کے متعلق تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بعد مسلم حجاج کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ اس سے قبل کعبہ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے بعد کے سال میں تو عرب کے لوگ قرآن کے الفاظ کے مطابق (۱۱۰/۱-۳) گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مالیاتی اصلاحات

۱۶۵۔ اسی سال (۹ ہجری) کے دوران رسولِ خداؐ نے اسلامی ریاست کے شعبۂ مالیات میں انقلابی اصلاحات نافذ کیں۔ اُس وقت تک مملکتِ اسلامیہ کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتی تھی بلکہ عوام کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں سے احسان کریں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال صرف کریں۔ چنانچہ لوگ اپنے مال کا ایک حصہ راہِ خدا میں صرف کرنے کے لیے رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جسے حضورؐ اپنی مرضی کے مطابق صرف کرتے تھے۔ مملکت کے بعض غیر مسلم علاقے خراج ادا کرتے تھے۔ مگر ان وسائل سے کسی بحران کے وقت اُمت کی ضروریات پُورا کرنا ممکن نہ تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے مسلمانوں کے ایک سفیر کو بازنطینی سلطنت کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ سفیر کے قتل کا انتقام لینے کے لیے رسول اللہؐ نے تین ہزار سپاہ پر مشتمل ایک مہم روانہ کی۔ دشمن سے موتہ کے مقام پر جنگ ہوئی، دشمن کی فوج اسلامی فوج سے ۳۲ گنا زیادہ تھی۔ اسلامی فوج کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اسلامی فوج کی واپسی کے بعد رسولِ خداؐ نے جنگِ تبوک کی تیاری شروع کی۔ اس جنگ کے لیے تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج تیار کی گئی۔ اتنی بڑی مہم کے لیے بھاری مقدار میں روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ محض رضاکارانہ امداد سے اتنی بڑی مہم کے اخراجات پُورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے دی جانے والی خیرات کو باقاعدہ شکل دی گئی۔ چنانچہ مختلف اشیا پر کم از کم ٹیکس عاید کیا گیا۔ فصلوں، تجارتی سرمایہ، درآمد و برآمد، مویشیوں کے گلّوں اور کانوں وغیرہ پر فیصد کے حساب سے ٹیکس (زکوٰۃ) عاید کیا گیا۔ ٹیکس کی ادائیگی کے لیے سال میں ایک مہینہ بھی مقرر کر دیا گیا۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ

منکرین زکوٰۃ سے زکوٰۃ بذریعہ طاقت وصول کی جائے گی۔ دینی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ ایک دینی فریضہ اور نیک کام تھا تاہم اسے سرکاری ٹیکس کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس ٹیکس کے لیے قدیمی نام زکوٰۃ (صدقہ بھی) برقرار رکھا گیا، تاہم صاحبِ استطاعت اصحاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض قرار دی گئی۔

۱۶۶۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ قرآن حکیم ایسی اشیا جن پر زکوٰۃ واجب ہے اور زکوٰۃ کی شرح کے بارے خاموش ہے لیکن قرآن حکیم اسلامی حکومت کے اخراجات کے اصولوں اور سرکاری آمدنی سے متمتع ہونے والوں کی ٹھیک ٹھاک تفصیل بیان کرتا ہے۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ ٹیکس عاید کرنے کا اختیار عوام کے نمائندوں کے سپرد کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے دور اور اس دور کی ضروریات کے مطابق ٹیکس عاید کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔ سرکاری آمدنی کے خرچ کی مدات سے تعلق رکھنے والی قرآنی آیت میں کہا گیا ہے:

"زکوٰۃ مفلسوں کے لیے ہے اور محتاجوں (غیر مسلموں میں) کے لیے۔ اور ان کے لیے جو اس (کی وصولی) کا کام کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ اور اسیروں اور غلاموں کی گردن چھڑانے (آزاد کرانے) کے لیے، اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے کے لیے، اور اللہ کی راہ میں (صرف کرنے کے لیے) اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا (فرض) ہے، اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔" (توبہ ۶۰)

۱۶۷۔ صرف زکوٰۃ کے لیے یہ آٹھ مدات نہایت جامع ہیں اور فلاحی ریاست کی بنیاد ہیں۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ "فُقرا" سے مراد مسلمانوں میں غریب لوگ اور مساکین سے مراد ملک کے غیر مسلم باشندوں میں نادار لوگ ہیں۔

۱۶۸۔ وہ جو "ٹیکس کے لیے کام" کرتے ہیں، ان میں ٹیکس اکٹھا کرنے والے، آڈٹ کرنے والے، اسے مقررہ انداز میں تقسیم کرنے والے اور اس تمام کام کی نگرانی کرنے والے شامل ہیں۔ درحقیقت اس سے مراد مملکت کی پوری مشینری ——— سول اور فوجی ——— ہے۔

۱۶۹۔ "تالیف القلوب" سے مراد مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہیں۔ درحقیقت اس کا اشارہ سیاسی مقاصد کے لیے مملکت کی خفیہ سروس اور نومسلموں کی طرف ہے۔

۱۷۰۔ ان دنوں ملک سے مسلم یا غیر مسلم شہریوں کو، جنھیں دشمن نے قید کر لیا ہو، فدیہ دے کر چھڑانا نہایت ہی اہم تھا۔ پھر اس آیت میں یہ دلچسپ فرض بھی مملکت کو سونپا گیا ہے کہ وہ معاوضہ دے کر غلاموں کو آزاد کرائے۔ یہ کام عام لوگوں کی طرف سے راہِ خدا میں مال صرف کر کے غلاموں کو آزاد کرانے کے علاوہ ہے۔

۱۷۱۔ جن قرضداروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ غریب لوگ نہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بلکہ ان سے مراد ایسے افراد ہیں جو اچانک کسی وجہ سے قرضے کے بوجھ تلے دب گئے ہوں۔ خلیفہ عمرؓ نے اس مقصد کے حصول کے لیے بلا سود

قرضوں کا اہتمام کیا تھا۔

۱۷۲۔ "اللہ کی راہ میں اخراجات" سے مراد سب سے پہلے مملکت کے دفاعی اخراجات ہے۔ اس کے بعد رفاہی کام جیسے مساجد کی تعمیر اور سکولوں کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔

۱۷۳۔ "مسافروں" یا سیاحوں کے لیے سڑکوں، پلوں، پولیس، صحت وصفائی کے نظام اور میزبانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کا سفر آسان ہو سکے۔

تکمیل دین

۱۷۴۔ ۱۰ھ کے آخر تک پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام قبول کر چکا تھا۔ کہیں کہیں یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کی چھوٹی موٹی آبادیاں اپنے اپنے مذہب پر قائم تھیں۔ لیکن وُہ اسلامی مملکت کی بالادستی تسلیم کرتے تھے جو رواداری اور ان کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی پر گامزن تھی وہ حکومت کی اس پالیسی کا دلی خیر مقدم کرتے تھے کیونکہ حکومت ان کے ضمیر کی آواز کو کچلنے کے حق میں نہیں تھی۔ ہر فرقہ اسلامی حکومت کے تحفظ میں اپنے معتقدات کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا ——— اس سے قبل ان فرقوں کو ملک کے حکمرانوں کے دین پر چلنا پڑتا تھا خواہ وُہ ایران میں ہوں یا بازنطینی سلطنت میں ——— پھر وسیع اسلامی مملکت ان کی زرعی پیداوار اور مصنوعات کے لیے ایک کُھلی منڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت یمن سے عراق کے انتہائی جنوبی صوبوں تک اور فلسطین پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔

۱۷۵۔ یہ تھے وُہ حالات جن میں رسول اللہؐ نے خرابیٔ صحت کے باوجود حج بیت اللہ پر جانے کا قصد کیا۔ پیغمبرِ خدا کے حج پر آنے کا سُن کر بھاری تعداد میں اہلِ اسلام مکہ پہنچ گئے اور یوں اہلِ مکّہ کا یہ وسوسہ غلط ثابت ہُوا کہ کعبہ میں غیر مسلموں کے داخلہ پر پابندی کے باعث حجاج کی تعداد میں کمی ہو جائے گی (اور ان کی آمدنی متاثر ہو گی) حج کے موقع پر رسولِ خداؐ نے میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار حجاج کے روبرو خطبہ دیا۔ ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔ (اگر ان مسلمانوں کو بھی ملا لیا جائے جو اس سال حج کے لیے مکہ نہ پہنچ سکے تو اندازہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد پانچ سے دس لاکھ تک تھی)

نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو ارکان ادا کیے وہ مسلمانوں کے لیے قواعدِ حج قرار پائے، اور صدیاں گزرنے کے باوجود ان میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ حجاج میدانِ عرفات میں جمع ہوئے جہاں جبلِ رحمت سے نبی پاکؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا ——— اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ——— پھر رسولِ خداؐ مزدلفہ میں رات گزارنے کے بعد منیٰ میں آئے۔ یہاں اُنھوں نے جمرات کو کنکر مارے اور قربانی دی۔ پھر وہ مکّہ آئے، اللہ کے گھر کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر وہ دوبارہ منیٰ میں گئے۔ تین دن کے بعد وہ دوبارہ مکّہ آئے اور طوافِ وداع کیا۔ اس کے بعد وُہ مدینہ لوٹ گئے جہاں صرف تین ماہ بعد ان کا وصال ہو گیا۔

خطبہ حجۃ الوداع

۱۷۶۔ رسول پاکؐ نے جبلِ رحمت پر سے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ درحقیقت اسلامی تعلیمات کا

لُب لباب ہے اور انسانیت کے لیے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ خطبہ من و عن پیش کیا جائے:

"سب تعریف اللہ کے لیے ہے، ہم اسی کی ثنا کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں، اسی سے بخشش کی استدعا کرتے ہیں اور اسی سے عفو کے طالب ہیں۔ ہم اپنی رُوح کی بُرائیوں اور اپنی بداعمالیوں کے خلاف اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ ضلالت میں مبتلا کر دے اسے کوئی سیدھی راہ نہیں دکھاسکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ واحد ہے وہ لاشریک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

اے اللہ کے بندو! میں تمھیں حکم دیتا ہُوں کہ اللہ سے ڈرو اور میں تمھیں تلقین کرتا ہوں کہ اللہ ہی کی عبادت کرو۔ اور میں شروع کرتا ہوں ساتھ بھلائی کے۔

اما بعد! لوگو، سُنو میری بات تاکہ میں تمام معاملات تم پر واضح کرسکوں۔ کیونکہ میں نہیں جانتا شاید میں آپ کو آئندہ سال اس جگہ دوبارہ نہ مل سکوں۔

لوگو! تمھارے خون، مال اور تمھاری عزتیں ایک دُوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں ———— اس وقت تک جب تک تم اپنے خدا سے نہیں ملتے ———— جیسا کہ تمھارے لیے آج کا دن، یہ شہر اور یہ مہینہ حرمت والا ہے۔ کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟ اے اللہ! گواہ رہنا۔

جس کسی کے پاس کوئی امانت ہے وہ اسے اس کے مالک کو لوٹا دے۔

جاہلیت کے زمانہ کا سُود (قرضوں پر) ختم کر دیا گیا۔ مگر تمھیں اپنے سرمایہ پر حق حاصل ہے نہ تم ظلم کروگے اور نہ ظلم برداشت کروگے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ سُود ختم ہونا چاہیے۔ پہلا سُود اپنے خاندان کا میں مٹاتا ہوں یہ سُود میرے چچا عباس ابن عبدالمطلب کا ہے۔

میں ایامِ جاہلیت کے قتل کے تمام جھگڑے ملیامیٹ کرتا ہُوں۔ پہلا خون (جو میں معاف کرتا ہُوں میرے بھتیجے) عامر ابن ربیعہ ابن الحارث ابن عبدالمطلب کا ہے۔

میں ایامِ جاہلیت کی تمام رسوم کو ختم کرتا ہوں ماسوائے تولیت کعبہ کے اور (حجاج کی پینے کا پانی فراہم کرنے کے۔

قتل عمد کا قصاص لیا جائے گا۔ قتل غیر عمد وہ ہے جس میں کوئی لاٹھی یا پتھر لگنے سے ہلاک ہو جائے۔ اس صورت میں ایک سو اُونٹ دیت مقرر ہے جو اس سے زیادہ طلب کرے گا وہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں سے ہوگا۔ لوگو! سنتے ہو کیا میں نے تم تک (اللہ کا حکم) پہنچا دیا ہے؟ یا اللہ گواہ رہنا۔

اما بعد، لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ تمھاری سرزمین پر اس کی

پُوجا کی جائے گی۔ مگر وہ اس پر بھی مطمئن ہو گا کہ یہاں کے سوا (باقی دنیا میں) اس کی پُوجا کی جائے اور ایسے امور میں اس کی تابعداری کی جائے جن سے تم نفرت کرتے ہو۔ چنانچہ اپنے دین کے معاملات میں شیطان سے ہشیار رہو۔

لوگو! ماہِ کبیسہ کُفر پر مستزاد ہے۔ اور جو کفر کا ارتکاب کرتے ہیں، گمراہ کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک سال تو (کسی مہینہ کو) غیر متبرک قرار دیتے ہیں مگر ایک سال اسے متبرک تسلیم کرتے ہیں تاکہ وہ (مہینوں کی) تعداد پوری کر لیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور اسے باحرمت قرار دے سکیں جسے (مہینہ کو) خدا نے غیر متبرک کہا ہے۔ دراصل وقت (کی گردش) اسی صورت حال پر ہے جو اس روز تھی جب خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ خدا کے نزدیک اُس تجویز کے مطابق صرف بارہ مہینے ہیں جس روز اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان میں سے چار مہینے مقدس ہیں، ان میں سے تین ایک ساتھ آتے ہیں، اور چوتھا الگ ہے۔ مثلاً ذیقعد، ذوالحجہ اور محرم، اور ماہِ رجب جو قبیلۂ مُضر کا ہے جو جُمادی الآخر اور شعبان کے درمیان پڑتا ہے۔ کیا میں نے (تم تک) اللہ کا حکم پہنچا دیا ہے۔ اے اللہ گواہ رہنا۔

امّا بعد، لوگو! تمھاری بیویوں کا تم پر حق ہے، اور ان پر تمھارا حق ہے۔ بیویوں پر تمھارا حق اتنا ہے کہ وہ تمھارے بستر کو کسی غیر مرد سے آلودہ نہ کریں (ناجائز جنسی تعلقات کو نرم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے) اور ایسے (لوگوں کو) تمھارے گھروں میں داخل نہ ہونے دیں جنھیں تم ناپسند کرتے ہو، اِلّا تمھاری اجازت ہو۔ انھیں (عورتوں کو) کوئی معیوب کام نہیں کرنا چاہیے اگر وہ ایسا کریں تو خدا نے تمھیں یہ اختیار دیا ہے کہ تم انھیں سرزنش کرو، ان سے بستر میں علٰحدگی اختیار کرو، اور (اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں) انھیں ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو۔ اگر وہ باز آجائیں تو تم پر واجب ہے کہ انھیں اچھا کھلاؤ اور رواج کے مطابق اچھا پہناؤ۔ عورتوں کے معاملہ میں فراخ دلی سے کام لو کیونکہ درحقیقت وہ تمھاری قیدیوں کی طرح ہیں، ان کی کوئی املاک نہیں اور تم نے انھیں خدا کی امانت کے طور پر قبول کیا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی اُن (عورتوں) کے وجود سے حظ اٹھاتے ہو، سو خواتین کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو، اور ان سے نیک سلوک کرو۔ لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟ اے خدا گواہ رہنا!

لوگو! تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور کسی شخص کے لیے دوسرے بھائی کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کی جائداد پر قبضہ کرنا خلافِ قانون ہے۔ لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟ اے خدا گواہ رہنا!

پس میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ میں تم میں وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، وہ چیز ہے اللہ کی کتاب (قرآن) اور

اس کے رسولؐ کی سنت۔ لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) پہنچا دیا ہے؟ اسے خدا! گواہ رہنا۔

لوگو! تمھارا خدا ایک ہے اور تمھارا جد بھی ایک ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ شخص ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ کسی عرب کو عجمی (غیر عرب) پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ——— اگر ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ سے کتنا ڈرتا ہے ——— اسے لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟

اس پر لوگوں نے جواب دیا: "ہاں یا رسول اللہؐ" تو حضورؐ نے خطبہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"جو لوگ یہاں ہیں وہ یہ تمام باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

اے لوگو! خدا نے ہر وارث کا حصہ وراثت متعین کر دیا ہے۔ کسی ایک وارث کے لیے وصیت کرنا خلافِ قانون ہے۔ ورثا کے سوا کسی کے حق میں جائداد کی ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنا قانون کے منافی ہے۔ بچے بستر کے مالک (شوہر) کی ملکیت ہیں۔ اور زانی کے لیے صرف سنگساری کی سزا ہے۔ جو کوئی اپنے والد کے سوا کسی اور سے نسب ظاہر کرتا ہے یا اپنے سرپرست کے سوا کسی اور سے اظہارِ تعلق کرتا ہے اس پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی۔ اس سے نہ تو معاوضہ طلب کیا جائے گا نہ اس سے اخراجات قبول کیے جائیں گے۔

اَلسّلامُ علیکم (تم پر اللہ کی رحمت ہو)۔"

۱۷۷۔ ابن سعد کے مطابق حضورؐ کے خطبہ میں یہ دو جملے بھی شامل تھے:

"لوگو! سنو اور عمل کرو، اگر تمھارا کمانڈر کسی پھٹی ہوئی ناک والے حبشی کو بھی مقرر کر دیا جائے، اور صرف اس وقت تک جب تک وہ تم پر اللہ کی کتاب کے مطابق احکام نافذ کرے۔"

اور:

"تمھارے غلام، تمھارے غلام، انھیں وہی کھانے کو دو جو تم خود کھاتے ہو، انھیں ویسا ہی لباس فراہم کرو جیسا تم خود پہنتے ہو، اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے جسے تم معاف کرنا نہ چاہو تو انھیں فروخت کر دو مگر ان پر تشدد نہ کرو۔"

۱۷۸۔ اپنے خطبہ میں، رسولِ خدا نے جن نکات پر بحث کی ہے ان میں دو ——— سُود (ربٰو) اور قمری کیلنڈر ——— کو اکثر غلط طور پر سمجھا گیا ہے۔

۱۷۹۔ اسلام اپنے قوانین کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور باہمی اشتراک و امداد سے اس پر عمل کرانا چاہتا ہے رسولِ خدا کی طرف سے امتناعِ سُود کے چودہ سو سال بعد اب جدید سائنس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سُود تمام اقتصادی برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے معاشرہ کا اقتصادی توازن درہم برہم رہتا ہے۔ ربٰو کی بدولت چند لوگ لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور بعض

کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کمیونزم بھی سُود کی اس بُرائی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ روس میں بالشویکی انقلاب کے بعد کام کی ابتدا سود پر پابندی سے ہوئی تھی۔ لیکن جلد ہی انقلابیوں کو قرضے جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چونکہ انھوں نے سود پر پابندی کی ضرورت سے لوگوں کو پوری طرح آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے کوئی بھی شخص قرضے دینے کو تیار نہ ہوا، چنانچہ بالشویکیوں کی یہ اہم اقتصادی اصلاح اسی طرح ناکام ہُوئی جس طرح امریکہ میں امتناعِ شراب کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ امریکی حکومت نے شراب پر پابندی عائد کی مگر دو سال سے زاید اس پر عمل درآمد نہ کرا سکی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے (دیکھیے پیرا ۱۷۱) مالیاتی اصلاحات کے تحت بنکوں کو قومی تحویل میں لینا ضروری ہے اور کسی بنک کو خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، سُودی کاروبار کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ سرکاری تحویل میں لیے گئے بنک بلا سُود قرضے جاری کریں۔ تجارتی اداروں میں بنکوں کو حصہ دار بنایا جانا چاہیے، اور وُہ ان اداروں کے نفع اور نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ یہی خلیفہ عمرؓ نے کیا تھا۔ وہ تاجروں کو بھی اسی طرح قرضے دیتے تھے جس طرح عام شہریوں کو غیر پیداداری ضروریات کے لیے قرض مہیا کرتے تھے۔

۱۸۰۔ جہاں تک کیلنڈر (تقویم) کا معاملہ ہے اہلِ مکہ قمری اور شمسی دونوں کیلنڈر استعمال کرتے تھے۔ مہینہ نئے چاند کے طلوع سے شروع ہوتا تھا مگر قمری سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے شمسی سال سے مطابقت پیدا کر لی جاتی تھی۔ رسولِ خداؐ نے قمری سال میں ایک ماہ کا اضافہ بند کر دیا اور خالصتاً قمری تقویم کو رواج دیا۔ زرعی فصلوں پر جو ٹیکس موسم کے اعتبار سے عاید کیا جاتا تھا اسے نہیں چھیڑا گیا، اور یہ ٹیکس فصل کی برداشت پر وصول کیا جاتا رہا۔ مگر دوسرے تمام ٹیکس قمری سال کے مطابق ادا کیے جاتے تھے۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہُوا کہ حکومت ۳۳ شمسی سالوں میں ۳۴ بار سالانہ ٹیکس وصول کرتی تھی۔ بھلا وہ کون سا وزیرِ خزانہ ہے جو ایسا کرنے سے احتراز کرے گا؟ اس طرح سرکاری ملازموں کو ۳۳ شمسی سالوں میں ۳۴ بار سالانہ تنخواہ ادا کرنے کے باوجود سرکاری خزانہ کو معقول بچت ہو گی۔ شمسی (زراعت کے لیے) اور قمری سال کے اعتبار سے ٹیکسوں کے نفاذ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سال کے اختتام پر سرکاری خزانہ کبھی خالی نہیں رہتا تھا کیونکہ دونوں اقسام کے ٹیکسوں کی وصولی کا موسم مختلف ہوتا تھا۔

حج کے معانی

۱۸۱۔ رسولِ خداؐ نے آخری خطبۂ حج ۹ ذوالحجہ ۱۰ ہجری (۶ مارچ ۶۳۲ء) کو ارشاد فرمایا تھا۔ اسی روز قرآنِ حکیم کی یہ عظیم الشان آیہ مبارکہ نازل ہوئی (القرآن ۵/۳):

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا احسان پُورا کر دیا اور میں نے تمھارے واسطے اسلام ہی کو (بطور) دین پسند کیا ہے۔"

اگر یہ بات تاریخی لحاظ سے درست ہے کہ اسلام کے چار ارکان ——— نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں سے "حج" سب سے آخر میں آتا ہے تو حج کا روحانی مرتبہ کیونکر متعین ہو گا۔

۱۸۲۔ خانۂ خدا کی زیارت ادیان کی تاریخ میں نادر ترین عمل ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں "حج" کا تصوّر

ملتا ہے مگر اسلام کے سوا ہر مذہب میں اس کی حیثیت فرض کی نہیں محض نیک عمل کی ہے۔ صرف اسلام میں ہر مسلمان کے لیے —— خواہ وہ مرد ہو یا عورت —— زندگی میں ایک بار حج بیت اللہ (بشرطِ استطاعت) فرض ہے۔ پھر دوسرے مذاہب میں "حج" کی جگہ یا تو کسی برگزیدہ ہستی کا مقبرہ ہے، یا فطرت کا کوئی مظہر، مثلاً کسی بڑے دریا کا منبع، دریاؤں کا سنگم وغیرہ جسے دیکھ کر خوف یا توصیف کے جذبات پیدا ہوں اور جو روحانی تسکین کے بجائے محض سیاحت کے لیے زیادہ کشش کا موجب ہو۔ اسلام میں حج کے لیے خدائے واحد کے گھر کی زیارت کو جاتے ہیں جو صرف مکّہ میں واقع ہے۔ (رسولِ خدا کا روضہ مبارک مدینہ میں ہے مگر روضہ کی زیارت کا ارکانِ حج سے کوئی تعلق نہیں)

۱۸۳۔ لفظِ "کعبہ" کے لغوی معنی چوکور اور مدوّر کے ہیں۔ درحقیقت کعبہ چوکور بھی ہے اور مدوّر بھی ( ) اور مجموعی طور پر کعبہ کی شکل انسانی دل سے مشابہ ہے۔ ایک معروف حدیث قدسی ہے:

"میری زمین اور میرے آسمان کی وسعتوں میں میرا سمانا ممکن نہیں، میرا امکان اگر ہو سکتا ہے تو وہ قلبِ مومن ہے۔"

تو اللہ کے گھر کی شکل دل کی شکل سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۸۴۔ بہشت سے نکالے جانے کے بعد بابا آدم (علیہ السلام) مائی حوّا کو کھو بیٹھے۔ طویل تلاش اور اللہ کے فضل وکرم سے ان کی ملاقات میدانِ عرفات میں ہوئی، جہاں انھوں نے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور دوبارہ مل جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ آدم اور حوّا کی اولاد ہونے کے ناطے بھی ہمارے لیے میدانِ عرفات برکتوں کا مقام ہے۔ ہم بھی جب میدانِ عرفات میں (دورانِ حج) پہنچتے ہیں، تو اپنے گناہوں کو یاد کر کے ربّ العزّت سے معافی کے طلبگار ہوتے ہیں۔

۱۸۵۔ ہمارے روحانی اسلاف میں سے ایک اور حضرت ابراہیمؑ نے بھی دعویٰ کیا تھا کہ وہ ہر چیز سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی آزمایش کے لیے خدا نے انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو جو ان کے بڑھاپے کی اولاد تھا، قربان کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے بلا تأمل بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ بیٹے کو لے کر گھر سے دور جا رہے تھے تو شیطان بھیس بدل کر ان کے پاس آیا اور انھیں اپنے ارادے سے باز رہنے کی ترغیب دی۔ حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو پہچان لیا۔ انھوں نے شیطان کا پیچھا کیا اور اس پر پتھر برسائے۔ چند قدم جانے کے بعد شیطان کسی اور بھیس میں آ گیا، حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ماجدہ کو بہکانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بھی شیطان کو بھگانے کے لیے پتھر مارے۔ بالآخر وہ حضرت اسماعیلؑ کے سامنے آیا اور انھیں ورغلانے کی کوشش کی۔ حضرت اسماعیلؑ نے بھی شیطان کی پتھروں سے تواضع کی جس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے چھری اس کی گردن پر رکھ دی۔ انھوں نے چھری چلائی مگر بیٹے کی جگہ ایک دنبہ قربان ہو گیا اور ان کا بیٹا صحیح وسالم پاس کھڑا تھا۔ خدا نے جبرائیلؑ کو یہ معجزہ دکھانے کے لیے بھیجا تھا۔ ابراہیمؑ کو خلیل اللہ (اللہ کا دوست) کا خطاب ملا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بچے کے عوض بھیڑوں کی قربانی دیں۔ ابراہیمؑ اور ان کے اخلاف قربانی کی سنّت پر عمل کرتے رہے اور چار ہزار سال گزر جانے کے باوجود اہل اسلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنّت کی یاد میں شیطانوں کو کنکریاں مارتے ہیں اور منیٰ میں جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ ابراہیمؑ نے

خدا سے محبت کا ثبوت پیش کر دیا تھا جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک اور فرزند سے نوازا، جس کا نام اسحاق تھا۔

۱۸۶۔ قبل ازیں ابراہیمؑ اپنے خالق سے وفاداری کا ایک اور ثبوت پیش کر چکے تھے۔ وہ اپنے پہلوٹھی کے بیٹے اور اس کی ماں حاجرہ کو فلسطین سے مکہ کے صحرا میں لائے اور انھیں خدا کے سپرد کر کے اس جگہ چھوڑ دیا۔ جلد ہی ان کا کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا اور بچے نے مارے پیاس کے چلّانا شروع کر دیا۔ ماں نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ شفقتِ مادری میں وہ مایوس نہیں ہوئیں۔ چنانچہ خدا نے چشمہ زم زم جاری فرمایا اور یوں صحرا میں زندگی کے تحفظ کا سامان کر دیا۔ چنانچہ دورانِ حج صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی (اِدھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے آنا جانا) حضرت حاجرہ کی یاد میں کی جاتی ہے، اور یوں ایک ماں کی بیٹے کے لیے بے پایاں محبت کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے جو مخلوق کے لیے خالقِ حقیقی کی محبت کا مظہر ہے۔

۱۸۷۔ طوافِ کعبہ اور حج کے دیگر ارکان غور کرنے والوں کے لیے روحانی بالیدگی کا بہت بڑا سرچشمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا بندہ جتنے بھی ناموں سے یاد کرے "بادشاہ" سے بہتر کوئی خطاب اللہ اور بندے کے رشتے کو بیان نہیں کرتا۔ یعنی خدا بادشاہ اور بندہ اس کا غلام ہے۔ (انسانی زبان و بیان اور انسانی تصور میں اس سے بہتر لفظ آ ہی نہیں سکتا) اگر خدا ہمارا بادشاہ ہے (دیکھیے قرآن ۱/۶۲) تو پھر اس کے پاس نہ صرف خزانے ہوں گے (قرآن ۶۳/۷) اس کا تخت بھی ہوگا (۹/۱۲۹) اور فوج ہوگی (۴۸/۴) بلکہ اس کی ایک وسیع مملکت بھی ہوگی (۲/۱۰۷) اور اس وسیع سلطنت میں ایک بین الاقوامی شہر بھی ضرور ہوگا۔ اور ایک شہر جس کا نام مکہ ہے قرآن نے اسے اُمّ القریٰ (شہروں کی ماں) قرار دیا ہے (۶/۹۲) اس اُم البلاد میں ایک شاہی محل بھی ہوگا (۵/۹۷ الکعبۃ البیت الحرام) جدید انسانی معاشرہ فرمانروا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ذاتی طور پر اظہارِ وفاداری و اطاعت کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے رُوبرو اظہارِ اطاعت و وفاداری کے لیے کعبۃ اللہ میں جاتا ہے۔ حدیثِ رسولؐ ہے کہ:

"حجرِ اسود دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔"

مسلمان اپنے دونوں ہاتھ "اللہ کے دائیں ہاتھ" کے سامنے پیش کرتا ہے اور پھر خدا کے گھر کی حفاظت اور ہر دشمن سے اس کی مدافعت کے عزم کے اظہار کے طور پر بیت اللہ کا طواف شروع کرتا ہے۔ وہ سات مرتبہ طواف کرتا ہے۔ سات کا عدد غیر محدود وقت کی علامت ہے (وقت ہفتہ کے سات دنوں کی مدد سے شمار کیا جاتا ہے جو ازل سے بار بار خود کو دُہرا رہے ہیں)

۱۸۸۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اگر نماز بندے کی خدا کے حضورِ اقدس میں مانند حاضری کے ہے۔ اور خدا کے گھر کا حج اطاعت و فرمانبرداری کی معراج ہے۔

باب ۷

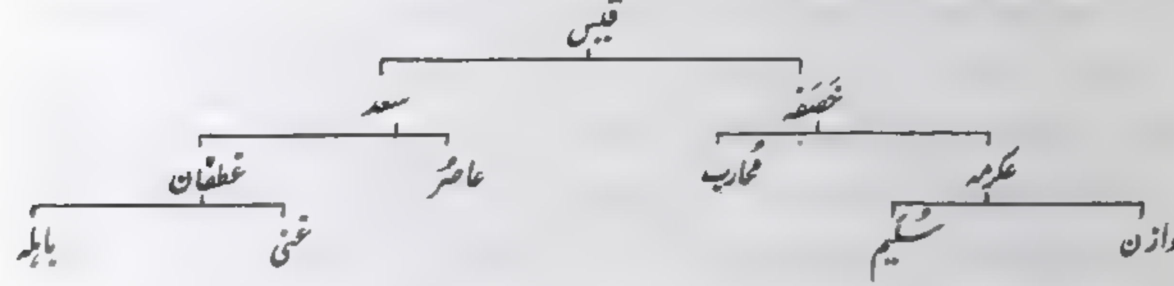
عرب قبائل سے تعلقات

۱۸۹۔ کفارِ مکہ اسلام کے بدترین دشمن تھے، اُنہی سے اپنے دفاع کے لیے رسولِ خدا نے مدینہ کے اردگرد کئی بفر ریاستیں قایم کی تھیں —— ہر قبیلہ ایک آزاد ریاست کی مانند تھا —— یوُں اُنھوں نے آہستہ آہستہ مکہ کے گرد بھی گھیرا ڈال لیا اور اہلِ مکہ کو نہایت شرافت سے مسلم حکومت کی رضا کارانہ اطاعت پر مجبور کر دیا۔ مدینہ کے اردگرد دوست قبائل کا سلسلہ قایم کیا گیا مگر یہ سلسلہ ہر طرح سے مکمل نہ تھا کیونکہ تھوڑے فاصلے پر ہی آبادی ختم ہو جاتی تھی۔ عرب میں اور بھی قبائل آباد تھے جو قریش مکہ سے کم طاقت ور تھے۔ یہ تمام قبائل بت پرست تھے لیکن یہ امر ناقابلِ تشریح ہے کہ ان قبائل نے مسلمانوں کی مزاحمت کیوں نہ کی۔ فتح مکہ کے لیے اکیس سال کا عرصہ صرف ہوا اور دس ہزار سپاہ پر مشتمل فوج کی ضرورت پیش آئی مگر دوسرے قبائل کے خلاف جو مہیں روانہ کی گئیں ان میں زیادہ سے زیادہ چند سو فوجی شامل ہوتے تھے۔ بیشتر قبائل نے فوراً ہی مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ یہاں تک کہ نہایت ترقی یافتہ علاقے مثلاً یمن، بحران (بحرین)، عُمان اور دُومۃ الجندل وغیرہ نے جتنی آسانی اور تیزی سے اسلام قبول کیا مورخ بھی اس پر حیران و ششدر رہیں۔ جہاں تک ساحلی علاقوں کا تعلق ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ علاقے غیر ملکی قبضے اور نوآبادیاتی نظام کے جوئے تلے پس رہے تھے اور اسلام ان کے لیے آزادی کا پیغام لایا تھا۔ اسلام نے انھیں حکمرانی دی، خود مختاری سے نوازا اور اس کے عوض ان سے ماسوائے اس کے کچھ طلب نہ کیا کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے بتوں کی پُوجا کی احمقانہ رسم ترک کر دیں۔ دوسرے علاقوں کے قبائل میں غالباً اتحاد اور یک جہتی مفقود تھی اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے مناسب قوت مجتمع نہ کر سکے۔ مسلمانوں نے ان علاقوں کے بُت خانے تباہ کر دیے اور بتوں کو پاش پاش کیا لیکن بُت شکنوں پر "خدا کا غضب" نازل نہ ہوا، جو ان بتوں کی بے مائگی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

۱۹۰۔ قبائل کو مشرف بہ اسلام کرنے کی مھموں میں ہلاک ہونے والوں کے اعداد و شمار کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان مھموں میں اسلحہ کا استعمال اور خونریزی برائے نام ہی ہوئی تھی۔ رسولِ خدا نے مدینہ میں آمد کے بعد ہی دشمنوں کے خلاف جنگ کی پالیسی پر عمل شروع کیا تھا۔ اس کے دس سال بعد ان کا وصال ہو گیا۔ اس دہائی میں مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ تیس لاکھ مربع کلومیٹر تک پھیل گیا۔ گویا مسلمانوں نے دس سال تک اوسطاً نو سو مربع کلومیٹر علاقہ روزانہ فتح کیا۔ ان جنگوں میں ہر ماہ دشمن کے دو افراد بھی ہلاک نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کا جانی نقصان تو اس سے بھی کم تھا۔ تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر فتح حاصل کرنے کے دوران دو تین سو افراد کا میدان میں کام آنا تاریخ عالم کے لیے ناآشنا اور غیر معمولی واقعہ ہے۔ انسانی خون کی حرمت کا یہ تصور جو رسولِ خدا کی حیاتِ طیبہ کے دوران موجود تھا، ان کے خلفا کی حکومتوں کے دوران بھی جاری و ساری رہا۔

۱۹۱۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسولِ خداؐ نے کس طرح مدینہ کو کفارِ مکہ کے حملوں سے محفوظ بنانے کے لیے شہر کے اردگرد بفر ریاستوں کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ مسلمانوں کے ان حلیف قبیلوں کی ریاستوں سے پرے کئی اور قبائل آباد تھے۔ ان میں بعض قبائل بلاوجہ اسلام سے عناد رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں، ان میں کوئی زیادہ خون نہیں بہایا گیا۔ اب ہم ان کا مختصر حال بیان کریں گے۔

۱۹۲۔ مدینہ کے شمال مشرق میں بنو غطفان اور بنو فزارہ، مشرق میں بنو سُلیم اور جنوب مشرق میں بنو ہوازن آباد تھے۔ یہ سب قبائل ایک ہی مورثِ اعلیٰ قیس کی اولاد تھے اور عم زاد قبائل تھے۔



قدیم مورخوں مثلاً ابنِ حبیب کے نزدیک تین قبائل (۱) سُلیم — ہوازن، (۲) غطفان اور (۳) عاصر — محارب کو ایک ہی نام —— اثافی[1] —— سے پکارا جاتا تھا۔ ان کا یہ نام حالات کے مطابق بلا جواز نہیں تھا۔ یہ قبائل مدینہ کی مسلم مملکت کے قریب ترین ہمسائے تھے۔ جو قبائل دور انتہائی شمال، انتہائی جنوب یا جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان سے مسلم ریاست کا رابطہ دوسرے مرحلہ میں ہی ہو سکتا تھا۔ اور اس رابطہ کا مطلب بازنطین اور ایران کی بیرونی سلطنتوں سے چھیڑ چھاڑ تھی کیونکہ ان ملکوں نے عرب میں نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ آیئے ہم پہلے گروپ سے ابتدا کریں۔

بنو سُلَیم

۱۹۳۔ بنو سُلَیم کے مکہ سے انتہائی قدیم اور قریبی تعلقات تھے۔ رسولِ خداؐ کے اسلاف کی تیسری سے چھٹی نسل تک حضورؐ کی تین دادیاں جن کا ایک ہی نام —— عاتکہ —— تھا، بنو سُلَیم سے تعلق رکھتی تھیں تاہم اس سے پیغمبر (صلعم) کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ غالباً رسولِ خداؐ کے بنو سُلَیم سے تعلقات ظہورِ اسلام سے قبل ہی بگڑ چکے تھے۔ اہلِ مکہ اور بنو قیس کے قبیلوں کے درمیان جنگ الفجار لڑی گئی تھی۔ یہ طویل جنگ کئی لڑائیوں پر مشتمل تھی۔ رسولِ خداؐ نے بھی عالمِ نوجوانی میں ایک یا دو معرکوں میں بنو قیس کے خلاف حصہ لیا تھا۔ روایت ہے (دیکھیے علامہ الحازمی کی الاماکن فصل بُرزا) کہ بنو سُلَیم نے مالک ابنِ خالد ابن صخر ابن الشارد کو تاج پہنایا اور اسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس کا عرف ذوالتاج تھا۔ مگر وہ ایک قبائلی جنگ یوم بُرزا میں مارا گیا۔ جب رسول اللہؐ نے جو مکی تھے نبوت کا دعویٰ کیا تو غالباً بنو قیس نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ مکی اس نبی کی بدولت اُن پر بالادستی قایم کر لیں گے اور پھر عرب میں بنو قیس کی حکومت کبھی قائم نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ انہی تصورات اور حسد کی بنا پر

---

[1] عربی میں اثافی ان پتھروں کو کہتے ہیں جو چولھا تیار کرنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ (مترجم)

وہ مسلمانوں کے مقابلے پر آگئے۔ فریقین کے درمیان کشیدگی بیؐ کی ہجرت سے قبل ہی شروع ہوگئی۔ مشہور بت العزّٰیؑ بنوسُلیم کا بت تصور ہوتا تھا۔ بنوغطفان بھی اس بت کی پُوجا کرتے تھے۔ یہ نخلہ کے بُت خانہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس بُت خانہ کا متولی افلح السُّلیمی بسترِ مرگ پر تھا کہ ابولہب اس کی بیمارپرسی کے لیے گیا۔ افلح نے ابولہب کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد عزّٰی کو نقصان پہنچے گا" افلح نے کہا۔ مگر ابولہب نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف عزّٰی کی مدافعت کرے گا۔

۱۹۴۔ بنوسُلیم کے خودغرض عناصر کو اس وقت مزید نقصان اٹھانا پڑا۔ جب رسولؐ اللہ نے ہجرت کے بعد ایک گشتی دستہ بھیجا جس سے بنوسُلیم بھڑک اُٹھے۔ اسلامی فوج کے گشتی دستے نے اہلِ مکہ کے ایک تجارتی قافلے کو جو واپس مکہ جارہا تھا، نخلہ کے مقام پر روک کر لوٹ لیا اور اہلِ قافلہ کو قیدی بنا لیا۔ رسولِ خدا نے فوجی دستے کے کمانڈر کی اس کارروائی پر اظہارِ پسندیدگی نہ کیا مگر بنوسُلیم کی خوشنودی کے لیے بھی کچھ نہ کیا۔ دو ماہ بعد جب جنگِ بدر پیش آئی تو رسولِ خدا کو بنوسلیم کی مخاصمت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد پیغمبر قرقرۃ الکدر گئے تاکہ بنوسُلیم کے ایک ذیلی قبیلہ کو سزا دے سکیں۔ اسلامی فوج نے ان کے پانچسو اونٹوں پر قبضہ کر لیا اس سے بنوسلیم اور مسلمانوں کے تعلقات مزید بگڑ گئے۔ بنوسُلیم اور بنوغطفان دونوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے دفاعی اقدام کے طور پر ذُوامر اور بحرانؑ (بحرین) کو دو مہمیں بھیجیں جن میں علی الترتیب ۴۵۰ اور ۳۰۰ رضاکار شامل تھے۔ بحُران کی مہم کے دوران رسولِ خدا خود دو ماہ تک موقع پر موجود رہے اور مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔ بنوسُلیم کے معمر اور دانشمند افراد صلح کے حق میں تھے جبکہ نوجوان طبقہ اس کے خلاف تھا اور بالآخر نوجوانوں کی بات ہی مانی گئی اور رسولِ خدا مصالحت میں ناکام رہنے کے بعد واپس آگئے تاہم رسولؐ اللہ نے مصالحانہ کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر وہ بنوسُلیم کے عم زاد قبیلہ بنوکلاب سے خوشگوار تعلقات قایم کرنے میں کامیاب ہوگئے اور رئیس قبیلہ نے ۴ھ ہجری میں اپنی ذاتی حفاظت کے تحت اسلام کے مبلغین طلب کیے۔ مسلمان مبلغوں کا چالیس سے ستر افراد پر مشتمل وفد وہاں گیا مگر اس پر دھوکہ سے بئرِ معونہ کے قریب حملہ کر دیا گیا۔ پورا وفد شہید کر دیا گیا۔ رسولؐ خدا کو اس واقعہ سے بڑا دکھ ہوا مگر ان دنوں مکہ اور خیبر کی صورتِ حال خراب تھی۔ اور نبیِّ خدا کی ساری توجہ اس پر مرکوز تھی۔ لہٰذا مبلغینِ اسلام کا خون بہانے والوں سے بازپرس نہ کی جا سکی۔ بنوسُلیم کے سرداروں کی ہٹ دھرمی کے باوجود قبیلہ کے افراد اسلام قبول کرتے رہے اور رسولؐ اللہ کی طرف سے اعزاز بھی حاصل کرتے رہے۔ حضورؐ نے انھیں تحفہ میں اراضی بھی دی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوالعوجاؑ السلیمی کو ۷ھ ہجری میں مبلغوں کے وفد کے ساتھ بنوسُلیم کے علاقہ میں بھیجا گیا مگر یہ مبلغ بھی قتل کر دیے گئے۔ اس کے باوجود ایک سال بعد مسلمانوں کی جس فوج نے فتح مکہ میں حصہ لیا اس میں بنوسلیم کے بہادروں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بھی شامل تھا۔ خصوصاً

لہ یہ سعودی عرب کا ہی ایک علاقہ ہے جسے ماضی میں بحُران یا بحرین کہا جاتا تھا۔ اس کا موجودہ بحرین سے کوئی تعلق نہیں۔
(مترجم)

بنو سُلَیم کے گھڑسواروں کا دستہ رسولِ خدا کے ہم رکاب تھا۔ مورخ بنو سُلَیم کے بڑی تعداد میں اسلام لانے کا سبب دریافت نہیں کر سکے، البتہ امکان ہے کہ مادی فوائد کی کشش انھیں دائرۂ اسلام میں لے آئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ شروع شروع میں اسلام کے زیادہ وفادار نہ تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح مکّہ کے بعد جب رسولِ خدا بنو ہوازن (جو بنو سُلَیم کا عم زاد قبیلہ تھا) سے جنگ کے لیے نکلے تو بنو سُلَیم کے دستے اسلامی فوج سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے نہ صرف شکست خوردہ بنو ہوازن کا تعاقب کرنے سے انکار کر دیا بلکہ دُوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ تاہم رسولُ اللہ ان سے مایوس نہ تھے۔ اُنھوں نے مالِ غنیمت سے بنو سُلَیم کے دستوں کو وافر حصہ دیا۔ آہستہ آہستہ پرانی عداوت فراموش کر دی گئی۔

بنو ہوازن

۱۹۵۔ نبیٔ خدا کی رضاعی والدہ بی بی حلیمہ کا تعلق بنو ہوازن سے تھا۔ فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن مسلمانوں سے سخت خوفزدہ ہو گئے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ مسلمان اب ان کے شہر طائف پر بھی فوج کشی کریں گے۔ طائف بت شکن مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے گا جس کے بعد طائف کے عظیم بُت لات کا بھی وہی حشر ہو گا جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں کعبہ میں بتوں کا ہو چکا تھا۔ مگر اب وقت گزر چکا تھا اور بنو ہوازن اسلامی فوج کی پیش قدمی روکنے کی قوت سے عاری تھے۔ جنگِ حنین میں شکست کے بعد بنو ہوازن نے طائف کے محاصرے میں مسلمانوں کی شدید مزاحمت کی۔ لیکن طائف والے مکّہ کی منڈی اور اپنے دوستوں سے کٹ چکے تھے۔ ایک سال بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم انھوں نے بعض دینی معاملات میں (رسولِ خدا سے) کچھ مراعات حاصل کر لیں۔ اسلام کے طریقۂ تبلیغ کے نقطۂ نظر سے مراعات کے حصول کا یہ واقعہ بیحد اہم ہے، اس لیے اس کی کچھ تفصیل بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

۱۹۶۔ بنو ہوازن کے اشراف کا ایک وفد مدینہ آیا اور درخواست کی کہ ان کے بُت لات کو نہ چھیڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اللہ کی وحدانیت اور محمد (صلعم) کی نبوت پر ایمان لانے کو تیار ہیں لیکن انھیں نماز کی ادائیگی، زکوٰۃ اور جہاد کے فرائض سے سبکدوش سمجھا جائے۔ مزید بر آں انھیں حُرمتِ شراب، امتناعِ زنا اور سُود کی ممانعت سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ طائف شہر کو حرام علاقہ قرار دیا جائے جہاں جنگلی جانوروں کا شکار اور جنگلی درختوں کی کٹائی ممنوع ہو۔

۱۹۷۔ رسولِ خدا بنو ہوازن کو زکوٰۃ، جہاد کے لیے رضاکاروں کی فراہمی اور طائف شہر کو حرام علاقہ قرار دینے پر رضامند ہو گئے (ہم اس کا ذکر آگے کریں گے) نماز کی معافی کے بارے میں رسولُ اللہ نے فرمایا: وہ مذہب تو مذہب کہلانے کا مستحق ہی نہیں جس میں بندے کے خالق کی عبادت کا تصور ہی نہ ہو۔ جنسی اختلاط کی بے محابا آزادی کے بارے میں نبیٔ خدا نے ان سے سوال کیا، "کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کی بیوی، ماں، بہن یا اس کی بیٹی کی عصمت کوئی اجنبی لُوٹ لے؛ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو جس عورت کے ساتھ تم کُھل کھیلو گے وہ بھی تو کسی کی بیوی، بہن یا بیٹی ہو گی، اور وہ اس صورتِ حال کو کیسے برداشت کرے گا!" اس پر وفد کے ارکان اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو گئے۔ سُود کے سلسلے میں نبیؐ نے انھیں چند ماہ کی مہلت دے دی تاکہ وُہ اپنے پُرانے قرضے سُودی نظام کے مطابق نمٹا سکیں۔ لیکن رسول نے واضح کر دیا کہ جو نئے قرضے دیے جائیں گے ان پر سُود وصول کرنا حرام ہوگا۔ بنو ہوازن کے بُت لات کے بارے میں رسولِ خدا نے بڑے

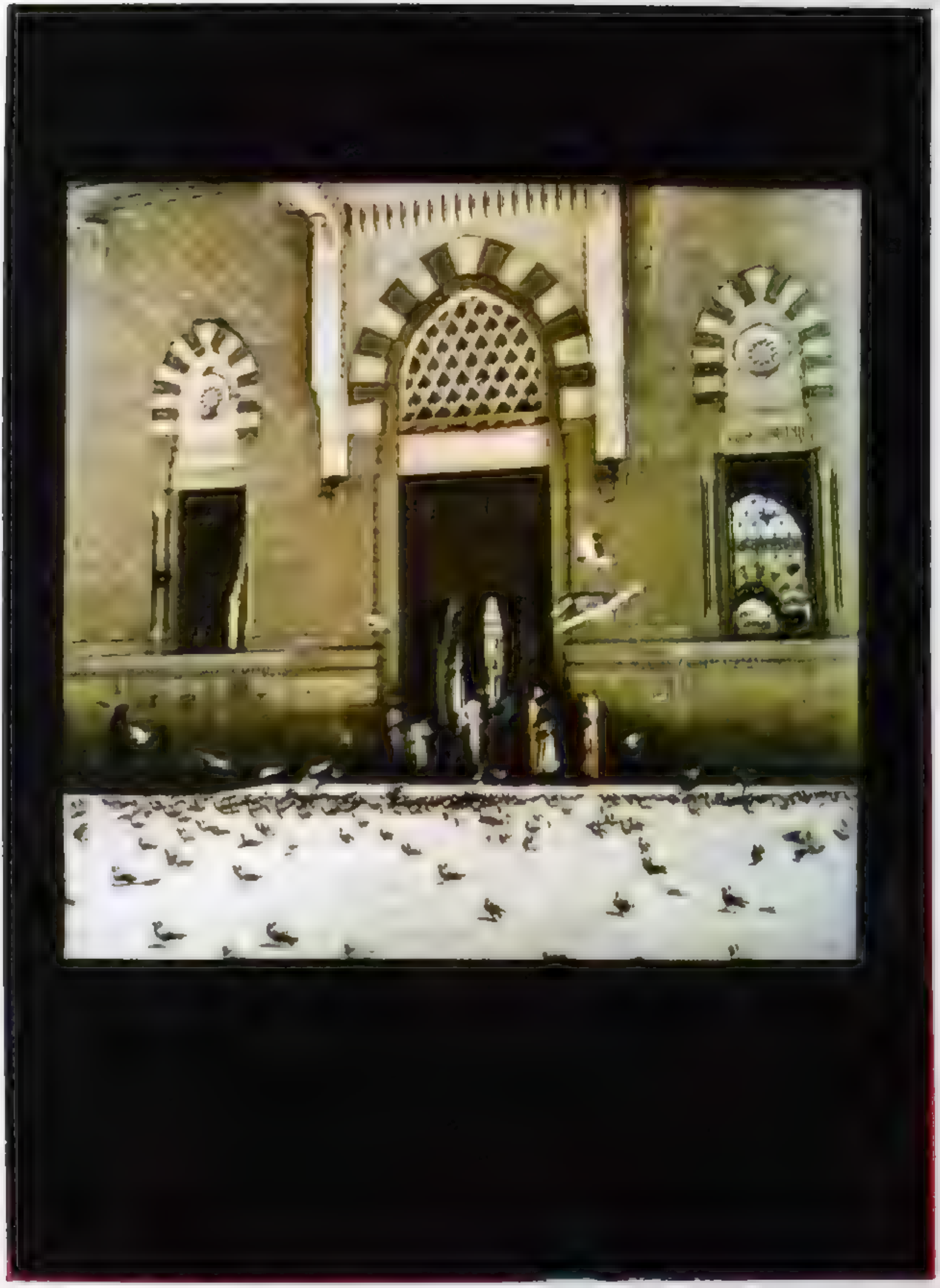
سکون سے فرمایا : "تمہیں لات یا اس کے بُت خانہ کو خود توڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں سے اپنے آدمی بھجوائیں گے جو لات کو پاش پاش کر دیں گے اور یوں بت کا غضب ان لوگوں پر ہی نازل ہوگا۔" رسول اللہؐ نے امتناعِ شراب کے سلسلے میں بھی کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ اس ضمن میں نبیؐ نے جو جواب دیا اس کی تفصیل میسر نہیں ہے، لہٰذا سوچا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے یہ کہا ہوگا کہ شراب کا نشہ انسان کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔

۱۹۸۔ جب بنو ہوازن کا وفد واپس چلا گیا تو اہلِ مدینہ نے جو اہلِ طائف کو یوں مراعات دینے پر برافروختہ تھے، رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ اور جہاد کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ رسولِ خداؐ نے جواب دیا: "نہیں، مگر جب ان لوگوں کے دلوں میں اسلام راسخ ہو جائے گا تو وہ خود ہی ان مراعات سے اظہارِ بریت کر دیں گے۔" رسولِ خداؐ کا فرمانا صحیح تھا۔ یہ مراعات حاصل کرنے کے بعد دوسرے لوگ طائف والوں کو دوسرے درجے کا مسلمان کہہ کر ان کا تمسخر اڑاتے تھے تاہم دو سال بعد رسول اللہؐ کے وصال سے قبل ہی طائف کے لوگوں نے دُوسرے مسلمانوں کی طرح اسلامی حکومت کو زکوٰۃ کی ادائیگی شروع کر دی۔ رسولِ خداؐ کی وفات پر انھوں نے اپنے مسلح دستے مدینہ بھیجے تاکہ علاقہ کے بعض حصّوں میں مرتدوں کی شورش کو کچلنے میں اسلامی حکومت کی مدد کر سکیں۔

۲۰۰۔ لات کی تباہی ایک قابلِ دید منظر تھا۔ رسولِ خداؐ نے طائف کے ایک مسلمان المغیرہؓ ابنِ شُعبہ کی قیادت میں ایک دستہ طائف بھیجا، اس میں ابوسفیانؓ بھی شامل تھے۔ المغیرہ نے اہلِ طائف کو جمع کیا تاکہ وہ بُت کی تباہی کا تماشا کر سکیں۔ پھر اس نے بُت پر پہلی ضرب لگائی اور یوں ظاہر کیا جیسے اسے کچھ ہو گیا ہے، چیخ ماری اور "بے ہوش" ہو کر زمین پر گر گیا۔ المغیرہ کی یہ "گت بنتے" دیکھ کر ناپختہ ایمان افراد بڑے خوش ہوئے، اچانک المغیرہ ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر چند زوردار ضربیں لگا کر بُت کو پاش پاش کر دیا۔ اس سے ان لوگوں کے ایمان میں بھی پختگی آگئی جو ابھی تک ڈھلمل یقین تھے۔

بنوغطفان

۲۰۱۔ بنوغطفان کُلّی طور پر خانہ بدوش قبیلہ تھا۔ کسی شہر میں ان کی کوئی آبادی نہ تھی۔ وُہ اپنی اقتصادی ضروریات کے سلسلے میں کسی اور شہر یا علاقہ کے بجائے خیبر پر ہی انحصار کرتے تھے۔ مسلمانوں اور بنوسُلیم (جو غطفان کا عم زاد قبیلہ تھا) کے درمیان کشیدگی نے بنوغطفان کو مسلمانوں کے خلاف اُکسایا اور اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف قزاقی، لوٹ مار اور چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ مگر پیغمبرِ اسلام نے وسیع القلبی کی پالیسی اختیار کی جس نے سادہ دل بدوّوں کو اسلام کی کسی فلسفیانہ یا عالمانہ تشریح سے زیادہ متاثر کیا۔ مثال کے طور پر اسلامی فوج کی ایک تعزیری مہم ذوامر بھیجی گئی مگر دشمن نے راہِ فرار اختیار کی اور وہاں مسلمانوں سے لڑنے والا کوئی نہ تھا۔ اسی اثنا میں بارش آگئی۔ رسولِ خداؐ نے بارش بند ہونے کے بعد اپنا لباس اتارا اور سُوکھنے کے لیے ایک درخت سے لٹکا دیا۔ وُہ خود سائے میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ ان کے صحابہ نے بھی ایسا ہی کیا اور صحرا میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ پیغمبرِ خداؐ کو اکیلے دیکھ کر دشمن کا ایک سردار جس نے قریبی پہاڑی کی چوٹی پر پناہ لے رکھی تھی، چپکے سے نیچے اترا اور رسولِ خداؐ کی تلوار پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ چلّا کر بولا: "اب تجھے کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟" رسول اللہؐ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے



مسجد نبوی کا ایک دروازہ

اورجواب دیا: "میرا خدا"۔ رسولِؐ خدا کے اعتماد نے سادہ دل بدوی کو ہلا کر رکھ دیا۔ وُہ کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب رسولؐ اللہ نے شمشیر سنبھالی اور بدوی سے پُوچھا: "اب تمھیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" بدوی سردار ذُوالثور نے جواب دیا: "کوئی نہیں"۔ مگر نبیؐ نے اسے معاف کر دیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی، وُہ رسولؐ اللہ کی رحم دلی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے نہ صرف فوری طور پر اسلام قبول کر لیا بلکہ اپنے قبیلہ میں اسلام کا سرگرم مبلّغ بھی بن گیا۔

۲۰۲۔ بنو غطفان کی بعض اور شاخیں ——— اشجاع اور عامر ابن عکرمہ ——— مدینہ کے نواح میں آباد تھیں۔ ان کی روزی کا دارو مدار علاقہ سے گزرنے والے کاروانوں پر تھا۔ وہ ہجرت کے فوراً بعد ہی ایمان لے آئے اور مسلمانوں کے نہایت سُود مند حلیف ثابت ہوئے۔

۲۰۳۔ جب تک اہلِ مکّہ اور اہلِ خیبر مسلمانوں کے دشمن تھے۔ بنو غطفان کا سردار عُیینہ بن حسن الفزاری بھی مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف رہا۔ مگر اس کے بعد اسے بھی عقل آگئی اور اس نے مسلمانوں سے صلح کر لی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بنو غطفان کے علاقہ میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ نبیؐ کے وصال کے بعد عُیینہ مرتد ہو گیا مگر جلد ہی اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے معذرت کی تو خلیفہ ابوبکرؓ نے اسے معاف کر دیا۔ اِس غیر متوقع رہائی سے اکھڑ بدو پکا مسلمان بن گیا۔

باب ۸

یہود سے تعلقات

۲۰۴ - اُن دنوں یہود کی بستیاں شام سے یمن اور عُمان تک پھیلی ہوئی تھیں مگر ان کا گڑھ خیبر کا علاقہ ہی تھا۔ مدینہ میں وہ مجبوراً قیام پذیر تھے کیونکہ رسولؐ اللہ نے اسلامی مملکت مدینہ کے لیے جو آئین نافذ کیا تھا اس میں یہودیوں کا ایک الگ قبیلہ یا کنفیڈریشن کے خودمختار یونٹ کے طور پر ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہ دو عرب قبائل اوس یا خزرج کے حلیف کے طور پر تسلیم کیے گئے تھے۔ یہودیوں کا تعلق تین بڑے قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے تھا۔ چونکہ ان تینوں یہودی قبائل میں باہمی مناقشت تھی اس لیے ان کے حلیف بھی جدا جُدا تھے۔ بعض نے خود کو بنو اوس سے اور دوسروں نے بنو اوس کے دشمنوں سے خود کو وابستہ کر رکھا تھا۔

۲۰۵ - بنو قینقاع کے زرگر نہایت پست اخلاق تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک مسلمان خاتون کو محض شرارت سے ننگا کر دیا۔ اس پر یہودیوں اور مسلمانوں میں فساد ہوگیا۔ چنانچہ نبیؐ نے پُورے بنو قینقاع کو تو نہیں بلکہ قصوروار خاندانوں کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور وہ مدینہ سے نکل کر شام چلے گئے۔

۲۰۶ - کہا جاتا ہے کہ بنو نضیر نے اس وقت رسولؐ اللہ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی جب اللہ کے نبی انتظامی امور کے سلسلے میں ان یہودیوں کی بستی کا معاینہ کرنے گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور انھیں بھی مدینہ سے اخراج کا حکم دیا گیا۔ تاہم انھیں اپنی تمام املاک ساتھ لے جانے اور شہر میں دیے گئے قرضے وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ انھوں نے اخراج کے حکم پر بدنیتی سے عمل کیا اور رسولِ خدا کی نرمی اور تحمل کو ان کی کمزوری پر محمول کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے اہلِ مکہ، بنو سُلَیم، بنو غطفان اور دیگر قبائل کے کرائے کے فوجیوں کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی سازش کی جس کے نتیجے میں جنگِ خندق رونما ہوئی۔ بنو قریظہ کے یہودی ابھی تک مدینہ میں مقیم تھے، رسولِ خدا نے ان پر بڑے احسانات کیے تھے اور ان کی حالت سدھارنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ مدینہ کے دوسرے یہودی بنو قریظہ کو خود سے کمتر تسلیم کرتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی یہودی بنو قریظہ کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو اس کا خون بہا مقررہ رقم کا نصف ادا کیا جاتا تھا۔ یہ رسولِ خدا ہی تھے جنھوں نے بنو قریظہ کی عزت اور انسانی حرمت بحال کی اور انھیں دوسروں کے مساوی قرار دیا۔ لیکن ان تمام احسانات کے باوجود جب بنو نضیر کے ایجنٹوں نے انھیں ورغلایا تو وہ غداری کر کے حملہ آوروں سے مل گئے اور اہلِ اسلام کے دفاعی منصوبوں کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچا لیا۔ جنگِ خندق کے خاتمہ پر مسلمانوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب انھیں زیر کر لیا گیا تو رسولِ خدا نے پھر بھی نرمی کا سلوک کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اپنے جرم کی سزا کے تعین کے لیے خود ہی کسی حکم کا انتخاب کر لیں[1]۔ ایک سال بعد اہلِ مکہ سے مسلمانوں کی صلح (صلحِ حدیبیہ) ہو گئی۔ اہلِ مکہ

[1] بنو قریظہ نے ایک یہودی سعد بن معوذ کو حکم مقرر کیا جس کے فیصلہ کے مطابق تین چار سو یہودیوں کو موت کی سزا دی گئی۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نیلام کر دیا گیا اور ان کے مال و اموال پر مسلم فوج نے قبضہ کر لیا بعد میں وہ شام چلے گئے۔ (مترجم)

اب یہودیوں کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو گئے، اس کے فوراً بعد ہی رسولِ خداؐ نے پندرہ سو سپاہ پر مشتمل فوج سے خیبر پر فوج کشی کی جو یہودیوں کی سازشوں کا مرکز تھا۔ یہودیوں نے بیس ہزار فوج سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے دوسرے اسلحہ کے علاوہ منجنیق بھی استعمال کیے لیکن اسلامی فوج نے چند ہفتوں کے اندر خیبر کے قلعہ بند شہر کو تہس نہس کر دیا۔ صلح حدیبیہ کو جس میں رسولِ خداؐ نے اہلِ مکہ کی تمام شرائط قبول کر لی تھیں جن میں سے بعض بظاہر توہین آمیز معلوم ہوتی تھیں۔ امام السرخسی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "خیبر اور مکہ کے درمیان فوجی معاہدہ تھا (ایک مدینہ کے شمال میں اور دوسرا جنوب میں ہے) اگر رسول اللہؐ ان میں سے کسی ایک کے خلاف کارروائی کے لیے نکلتے تو دوسرا مدینہ پر حملہ کر دیتا۔" (دیکھیے مبسوط ۱۰/۸۶ شرح السیر الکبیر ۱-۲۰۰) پیغمبرِ اسلام دو دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان کے پاس اتنی فوجی قوت نہیں تھی کہ دونوں محاذوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہو سکیں۔ چنانچہ وہ ہر قیمت پر ان میں سے ایک کے ساتھ معاہدہ صلح کرنا چاہتے تھے تاکہ دوسرے سے نمٹ سکیں۔ انھوں نے اہلِ مکہ سے معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک زائر کی حیثیت میں وہاں گئے۔ قرآن حکیم نے بلا مبالغہ صلح حدیبیہ کو توہین آمیز کے بجائے صریح فتح (فتحِ مُبین) اور طاقتور امداد (نَصرِ عزیز) قرار دیا ہے۔

۲۰۷۔ جب اہلِ خیبر نے ہتھیار ڈال دیے اور مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تو رسولِ خداؐ نے ان کے ساتھ نہایت نرمی کا سلوک روا رکھا۔ اسلامی فوج کے سپاہیوں کو بھی اہلِ خیبر سے اچھے سلوک کی ترغیب دینے کے لیے رسولِ پاکؐ نے اشرافِ یہود میں سے ایک خاتون سے عقد کر لیا۔ اس خاتون نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر رکھا تھا (اس خاتون نے خواب میں دیکھا تھا کہ چاند آسمان سے اتر کر اس کی گود میں آگیا ہے، اور یہودی کاہنوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کی شادی عرب کے فرمانروا محمد (صلعم) سے ہوگی) اب خیبر کے یہودی پیغمبر کے رشتہ دار بن گئے تو فطری طور پر اسلامی سپاہ کے دلوں میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ نبیؐ نے یہودیوں کو سرکاری اراضی کے مزارعوں کی حیثیت سے خیبر میں آباد رہنے کی اجازت دے دی۔ مدینہ میں بنو اُریض کے جو یہودی رہ گئے تھے ان سے بھی رسولِ اسلامؐ نے فیاضانہ سلوک کیا۔ انھیں سالانہ وظائف دیے گئے۔ جب تک وہ خود پُرامن رہے کسی نے ان کے ساتھ کوئی تنازعہ کھڑا نہیں کیا۔ انھیں مذہبی، قانونی (عدالتی) اور اقتصادی معاملات میں خود مختاری حاصل تھی اور انھوں نے خوب ہی ترقی کی۔ اہلِ کتاب اُمت ہونے کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ بت پرستوں کی نسبت ترجیحی سلوک کیا جاتا تھا۔ لیکن "اللہ کے بندوں" کو دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر یہ علم ہونا چاہیے کہ حقوق کا حصول یک طرفہ معاملہ نہیں ہے۔ اگر وہ اللہ کے احکام اور فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کریں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں اتنی ہی سخت سزا دے گا، اور بالآخر اسی کی (اللہ کی) مرضی ہی پوری ہوتی ہے۔

۲۰۸۔ رسولِ خداؐ نے ۹ھ میں بعض مالیاتی اصلاحات نافذ کیں جن کے تحت ٹیکسوں کی ادائیگی کے معاملہ میں مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے درمیان کچھ فرق رکھا گیا۔ مسلمان دوسری چیزوں کے علاوہ اپنی بچت پر ٹیکس ادا کرتے تھے اور روپیہ جمع کرنا ان کے لیے قابلِ تعزیر تھا تاکہ روپیہ گردش میں رہ کر بار آور ثابت ہو۔ غیر مسلموں پر یہ ٹیکس نافذ نہیں کیا گیا۔ اس کے بجائے وہ جزیہ ادا کرتے تھے مگر بچوں، خواتین، ناداروں اور متعدد دیگر زمروں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔

قرضوں پر مسلمانوں کے لیے تو سود لینا حرام تھا مگر غیر مسلم سُودی کاروبار کر سکتے تھے۔ لیکن غیر مسلموں کو مسلمانوں کی نسبت درآمدی ڈیوٹی (کسٹمز[1]) دوگنا ادا کرنا پڑتی تھی۔ زرعی زمین پر ٹیکس کی صورت میں مسلمان فصل کا دسواں حصہ ادا کرتے تھے جبکہ غیر مسلم معاہدہ کے مطابق یا پھر نقد ادائیگی کرتے تھے، تاہم زرعی ٹیکس کے ضمن میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔

---

[1] اُس دور کی عربی اصطلاح میں اس ڈیوٹی کو مُجروک کہا جاتا تھا۔ (مترجم)

باب ۹

خارجہ تعلقات

بازنطین ۲۰۹۔ پیغمبرؐ اسلام نے صرف دفاع کی خاطر اور وُہ بھی بڑے تامل کے ساتھ ہتھیار اٹھائے تھے۔ جب اسلام کے پُرانے دشمنوں کی احمقانہ معاندت ختم ہوگئی تو ان کا صرف ایک ہی کام اور ایک ہی مقصد رہ گیا کہ عرب اور دیگر ممالک میں پُر امن طور پر اسلام کی تبلیغ کی جائے۔

۲۱۰۔ الحدیبیہ سے واپسی کے بعد جہاں وہ اہلِ مکہ سے پُرامن بقائے باہمی پر مفاہمت میں کامیاب رہے اور خیبر فتح کیے بغیر ——— فتح مکہ کا تو ذکر ہی کیا ——— پیغمبرِ اسلام نے بیرونی ممالک میں قاصد روانہ کرنا شروع کر دیے۔ ۷ھ ہجری میں انھوں نے بازنطینی فرمانروا، والیِ مصر، شاہِ حبشہ اور شاہِ ایران کے نام مراسلے ارسال کیے جن میں ان فرمانرواؤں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان ممالک کو بھیجنے کے لیے نبیؐ نے ایسے افراد کا انتخاب کیا جو پہلے ہی ان ممالک کا دورہ کر چکے تھے اور وہاں کی زبان کسی حد تک سمجھ سکتے تھے۔

۲۱۰ الف۔ رسولِ خداؐ نے جن فرمانرواؤں کو خطوط ارسال کیے ان میں ہرقل معمولی گھرانے کا فرد تھا جو قسطنطنیہ میں ایک فوجی انقلاب کے نتیجہ میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس نے انھی دنوں ایرانیوں پر زبردست فتح حاصل کی تھی اور انھیں اپنی مملکت کے ان حصوں سے مار بھگایا تھا جس پر انھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ فطری طور پر شہنشاہ ہرقل حقیر عرب کے کسی باشندے کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہوسکتا تھا جبکہ عرب کا ایک حصہ خود اس کی سلطنت کی ایک نوآبادی تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے ہرقل نے اپنے ایک سردار کو محض اس لیے پھانسی دے دی تھی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے مسلم سفیر کو قتل کرنے والے گورنر کو پناہ دی جس نے بین الاقوامی قوانین اور اصول و قواعد کی صریح خلاف ورزی کی تھی۔ جب پیغمبرؐ نے سفیر کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے فوجی مہم موتہ بھیجی تو ہرقل نے ایک زبردست فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اس کا رویہ ایک بے اصول ظالم اور جابر بادشاہ کا تھا۔ مسلمان مورخوں کے مطابق ایک بڑے پادری نے اسلام سے رغبت کا اظہار کیا تو لوگوں نے اس کی تکا بوٹی کر دی۔ ممکن ہے اس واقعہ کے باعث ہی ہرقل نے اسلام کے متعلق بے توجہی برتی ہو، حالانکہ انھی دنوں اس توہم پرست بادشاہ نے بعض ڈراؤنے خواب دیکھے تھے اور اس نے علمِ نجوم کی بعض کتابوں میں جو اس کے کتب خانہ میں موجود تھیں اور جن کا وہ اکثر مطالعہ کرتا تھا، سوّل اکرم کے بارے میں بعض پیشگوئیوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ پیغمبرؐ نے ہرقل کو جو خط لکھا اس کا اصل مسودہ کئی صدیاں سپین میں رہا۔ اب یہ خط دوبارہ نمودار ہوا ہے مگر یہ دیکھنا باقی ہے کہ جو خط اب منظرِ عام پر لایا گیا ہے وہ جعلی تو نہیں۔

۲۱۱۔ رسولِ خداؐ کے خطوں کے جواب کم وبیش نرم زبان میں انکار کے مترادف تھے۔ انسانی معاشرہ میں مذہب

اور ماورائے طبیعیات اعتقادات کے بارے میں سب سے زیادہ قدامت پرستی اور تعصب کار فرما رہتا ہے۔ لیکن ایسا داعی جسے اپنے دعوے پر مکمل یقین ہو کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اگر شروع میں اسے کامیابی نہ بھی ہو تو وہ براہِ راست یا بالواسطہ ذرائع سے بار بار اپنی کوشش بروئے کار لاتا ہے۔ ایرانیوں اور بازنطینیوں دونوں نے عرب کے اندر اور گرد و نواح میں اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انھوں نے عربوں کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا اور وہ ان سے دوسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ وہ عربوں کو کمتر نسل تصور کرتے تھے۔ رسولؐ خدا نے براہِ راست یونانیوں (رومیوں) سے رابطہ پیدا کرنے سے قبل ان سے رابطہ کا فیصلہ کیا۔

۲۱۲۔ سینٹ پال کے دور میں عرب نہ صرف دور دور تک آباد تھے بلکہ انھوں نے دمشق کے شمالی علاقہ میں چھوٹی موٹی سرداریاں بھی قائم کر رکھی تھیں۔ اس وقت اس علاقے کا حکمران حارث (ارٹیس) نامی ایک شخص تھا۔ رسول اللہؐ کے دور میں اس علاقے میں عرب قبیلہ غسان آباد تھا جس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ رسول اللہؐ نے اس قبیلہ کے مختلف سرداروں کے نام بھی خط بھجوائے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی؛

۲۱۳۔ نبیؐ نے پہلا خط حارث ابن شمیر کو لکھا۔ مگر اس نے رسولؐ خدا کی دعوت مسترد کر دی۔ جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا یہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔ پھر اس کے جانشین جبلہ الایہم کو بھی اسی طرح کا نامہ بھیجا گیا۔ اس کے قبولِ اسلام کے بارے میں متضاد روایات ملتی ہیں۔ رسولِ خدا نے حاکمِ بصرہ کے نام بھی اسلام کا دعوت نامہ ارسال کیا۔ یہ خط حارث ابن عمیر الازدی لے کر گئے مگر عیسائی سردار شرحبیل ابن عمرو الغسانی نے رسولِ خدا کے سفیر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ عیسائی سردار کا یہ فعل تمام بین الاقوامی اصول و قواعد کی کھلی خلاف ورزی تھا۔ رسولؐ خدا نے سفیر کے قتل کا تاوان طلب کیا اور مطالبہ کیا کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ لیکن شہنشاہ ہرقل نے مسلمانوں کی چھوٹی سی مہم کے مقابلہ میں ایک لاکھ سپاہ پر مشتمل وہ فوج روانہ کر دی جو اس نے ایران کی مہم کے لیے بھرتی کی تھی اور ابھی اسے فارغ نہیں کیا گیا تھا۔ رسولِ خدا نے اس مہم کے لیے تین ہزار افراد پر مشتمل فوج خشکی کے راستے اور کچھ کمک سمندر کے راستے بھجوائی تھی، مسلم فوج کا ہرقل کی فوج سے موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا، مسلمان دشمن کی تعداد سے خائف نہیں تھے، جنگ شروع ہوئی مسلمانوں کے دو سینئر جرنیل، کمانڈر انچیف، زید بن حارثہ (رسولِ خدا کا لے پالک بیٹا) اور ان کا نائب جعفر الطیار ابن ابو طالب (رسول پاکؐ کا عم زاد) شہید ہو گئے۔ اس کے بعد فوج نے خالد ابن ولید کو سپہ سالار منتخب کیا۔ انھوں نے دشمن کو بھاری جانی نقصان پہنچایا اور اسلامی فوج کو بتدریج پیچھے ہٹا لائے۔ دشمن کو مسلم فوج کا تعاقب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسلامی فوج مدینہ میں وارد ہوئی جس کے بعد رسول پاکؐ نے جنگِ تبوک کی تیاری شروع کر دی۔ ۹ھ ہجری میں رسولِ خدا خود تیس ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر نکلے۔ راستے میں اسلامی فوج جس جگہ پڑاؤ ڈالتی، وہاں ایک مسجد تعمیر کر دی جاتی۔ انھوں نے پورے شمالی عرب اور جنوبی فلسطین پر مسلمانوں کی بالادستی قائم کر لی۔ اسلامی فوج نے دُومۃ الجندل، مقنہ، ایلہ، جربا اور اذرُح پر قبضہ کر لیا۔ یہ تمام شہر بازنطینیوں نے خالی کر دیے تھے۔ ان میں ایلہ کی بندرگاہ زبردست اہمیت کی حامل تھی۔ علاقہ کی عرب آبادی نے جو عیسائیت تو قبول کر چکی تھی، ظالم بازنطینیوں کے

خلاف بغاوت کر دی تھی، وُہ روا دار اور اصول پرست مسلمانوں کے سائے میں زندگی بسر کرنے پر خوش تھے۔ ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہوگیا اور اب رومی شہنشاہ ان میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا تاہم ابھی اسلامی مملکت کی سرحدوں کی صورت حال مستحکم نہ تھی چنانچہ ڈیڑھ سال بعد ایک اور فوجی مہم روانہ کی گئی۔ یہ فوج عین اس روز روانہ ہوئی جس روز رسولِؐ خدا کا وصال ہوا۔ اس فوج کو بھیجنے کا فیصلہ رسول اللہؐ نے کیا تھا۔ چنانچہ خلیفہ ابوبکرؓ نے پیغمبرؐ کا فیصلہ برقرار رکھا۔ فوج کا کمانڈر اُسامہؓ ابن زید کو مقرر کیا گیا۔ زید جنگِ موتہ میں اسلامی فوج کی کمان کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ اس فوج نے اسلامی مملکت کی حدود کو مزید شمال میں وسعت دی اور جلد ہی فلسطین مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگیا۔

۲۱۴۔ معان کے عرب گورنر کو بھی رسولِؐ خدا نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور اس نے اسلام قبول کر لیا مگر ہرقل کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔

مصر

۲۱۵۔ مصر سلطنت بازنطین کا ایک حصہ تھا جب ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے قبطیوں سے فیاضانہ سلوک کیا جو بازنطینی حکومت کے "مذہبی مظالم" سے تنگ آچکے تھے۔ ایرانیوں نے قبطیوں میں سے ایک شخص کو ان کا حکمران بنا دیا جسے مقوقس کا خطاب دیا گیا ——— مقوقس کا لفظ ایرانی الخزج معلوم ہوتا ہے ——— ایرانیوں کو جب نینوا کے مقام پر ہرقل کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی تو وہ مصر بھی خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غالباً یہی دَور تھا جب رسولِؐ خدا نے قبطیوں کے سردار کو خط لکھا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ قبطی سردار نے رسول اللہؐ کے خط کا نہایت مودبانہ جواب دیا، تاہم مقوقس کے قبولِ اسلام کا مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ مقوقس نے اسلامی سفیر کو متعدد تحائف دیے جو وہ اپنے ساتھ مدینہ لے آیا ان میں دو سے چار کنیزیں بھی شامل تھیں۔ ان میں سے ایک جس کا نام ماریہ تھا رسولِؐ خدا کے بیٹے ابراہیم کی ماں بنی۔ ماریہ کی بہن کا نام شیریں بتایا گیا ہے جو خالص ایرانی نام ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں بہنیں ایرانی النسل ہوں۔ ماریہ نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا والد ایرانی اور ماں قبطی ہو۔ ہمیں زیادہ تفصیل اس کے سوا معلوم نہیں کہ ماریہ نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا تھا جس کی بنا پر رسولِؐ خدا نے اسے اپنی زوجہ ہونے کا اعزاز بخشا۔

۲۱۶۔ رسول اللہؐ نے مقوقس کو جو خط لکھا تھا اس کا اصل مسودہ اب تک محفوظ ہے اور ان دنوں استنبول (ترکی) کے مشہور کتب خانہ توپ کاپی میں موجود ہے۔

حبشہ

۲۱۷۔ حبشہ کا علاقہ یمن کے قریب تھا اور باب المندب کی تنگ کھاڑی اسے یمن سے جُدا کرتی تھی۔ ظہور اسلام سے بہت پہلے مکہ سے حبشہ کے نہایت قریبی اقتصادی تعلقات قائم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی حکمران ذُونواس نے عیسائیوں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر اتنے مظالم کیے کہ حبشہ کے عیسائیوں نے یمن پر حملہ کر دیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن فاتح عیسائیوں کے جرنیلوں کے درمیان حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے۔ اس خونریزی اور جنگ و جدل کے بعد ابرہہ حبشہ کے بادشاہ کی طرف سے یمن کا گورنر بن گیا۔ وہ مذہب کے معاملے میں بڑا کٹر اور ہٹ دھرم تھا۔ یہ وہی ابرہہ ہے جس نے کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے لیے مکہ پر

حملہ کیا تھا کیونکہ وہ کعبہ کو عرب میں عیسائیت کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا تھا۔ اس کی فوج میں ایک ہاتھی تھا جو اس نے مکّہ پر حملہ میں استعمال کیا۔ وہ فوج لے کر طائف سے گزرا مگر اس نے لات کے بُت خانہ کو نہیں چھیڑا کیونکہ اہلِ طائف نے مکہ کی راہ بتانے کے لیے اسے رہنما فراہم کیے تھے۔ قرآن پاک کی سورہ الفیل (۱۰۵) اس وقت نازل ہوئی تھی جب ان لوگوں میں سے بہت سے بقیدِ حیات تھے جنھوں نے مکّہ پر ابرہہ کا حملہ بچشم خود دیکھا تھا۔ گو یہ لوگ اسلام کے مخالف تھے مگر انھیں سورہ فیل کے نفسِ مضمون کی تردید کی جرأت نہیں ہوئی۔ سورۂ فیل میں بتایا گیا ہے کہ "اصحاب فیل کو جانوروں (ابابیل) کے جھنڈ نے مکمل تباہی سے ہمکنار کیا جنھوں نے ان پر کنکریاں برسائیں۔" یہ واقعہ اسی سال رونما ہوا تھا جس سال رسولِ خدا تولد ہوئے تھے۔

۲۱۸۔ اس کے بعد جلد ہی ایرانیوں نے یمن پر فوج کشی کی اور حبشہ کی حکومت کے مخالف یمنیوں کی مدد سے حکمرانوں کو مار بھگایا۔

۲۱۹۔ حضورِ اکرمؐ نے جن مختلف حکمرانوں کو خطوط لکھے ان میں حبشہ کا شاہ نجاشی بھی شامل تھا۔ مسلمانوں سے نجاشی کے تعلقات اس خط سے بہت پہلے سے قایم تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ حضورؐ کے اعلانِ نبوت سے کوئی پانچ سال بعد مکہ میں چند اہلِ اسلام پر اتنے مظالم ڈھائے گئے کہ انھوں نے مادرِ وطن سے ہجرت کر کے سمندر پار کے ملک حبشہ میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ایک خط کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو غالباً رسولِ خدا نے اپنے عم زاد جعفر ابن ابو طالب کو دیا تھا۔ یہ خط شاہِ حبشہ کے نام ایک طرح کا تعارفی رُقعہ تھا۔ اگلے سال اہلِ مکّہ نے دو سفارتیں حبشہ بھیجیں تاکہ مسلمانوں کو حبشہ سے نکال کر اہلِ مکہ کے حوالے کیا جائے۔ مگر دونوں سفارتیں ناکام رہیں۔ جب مکّہ والوں کا دوسرا وفد حبشہ گیا تو رسولِ خدا نے بھی اپنا ایک سفیر حبشہ بھیجا تاکہ اہلِ مکہ کی سازش کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس دور کی حبشہ کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، جس کے باعث یہ قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ حبشہ کے جس شاہ نجاشی نے مکی مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور دس سال بعد جس نجاشی نے اہلِ مکّہ کے دوسرے وفد سے ملاقات کی تھی وہ ایک شخصیت تھی یا دو مختلف افراد تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت تھی اور پیغمبرِ اسلام سے اس کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہؐ نے اسے خط لکھا تھا جس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ (نبیؐ کے اس خط کا اصل مسودہ ہم تک پہنچا ہے اور اس وقت دمشق میں موجود ہے) کہا جاتا ہے کہ شاہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم وہ اپنی رعایا کو قبول اسلام کی ترغیب نہیں دے سکا تھا۔ نجاشی کا قبول اسلام اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کے مطابق نجاشی کی وفات کی خبر ملنے پر رسولِ خدا نے مدینہ میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا تھا۔ رسولِ خدا نے شاہ نجاشی کے جانشین کو بھی خط لکھا تاہم اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ مگر حبشہ کے بہت سے شہری مشرف بہ اسلام ہوئے جن میں شاہ نجاشی کا ایک بیٹا بھی شامل تھا۔ وہ بعد میں مدینہ آ گیا اور رسولِ خدا کے خاندان کے زیرِ کفالت فرد کی حیثیت سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

۲۲۰۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حبشہ کو بازنطینی سلطنت کی نو آبادی نہیں بلکہ دوست ملک اور حلیف ظاہر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہم مذہبیت کی بنا پر کیا گیا ہو کیونکہ دونوں ملک عیسائیت کے پیروکار تھے۔

۲۲۱ - عرب میں حبشہ کے کئی شہری بھی ملتے ہیں۔ موذنِ رسولؐ حضرت بلالؓ کو حبشی اسی بنا پر کہا جاتا تھا کہ وہ حبشہ کے رہنے والے تھے۔ ایک اور شخص یاسر تھا جس کا تعلق نوبیا سے تھا۔ رسولِ خدا نے اسے آزاد کر دیا تھا جس کے بعد وہ نبیؐ کا خادم بن کر مدینہ میں جاگزین رہا۔ مگر یہ افراد عرب میں کیسے اور کہاں سے آئے، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ کیا انہیں حبشہ سے اغوا کر کے عرب میں بطور غلام فروخت کیا گیا تھا یا کوئی اور ماجرا تھا۔ اب ہمارے لیے اس ضمن میں کچھ کہنا محال ہے۔

ایران

۲۲۲ - بازنطینی سلطنت کی طرح ایران نے بھی عرب میں نوآبادیاں قایم کر رکھی تھیں۔ گو عربوں کے درمیان باہمی اختلافات تھے، وہ ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے مگر ان میں انا اور عزتِ نفس کا احساس بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہترین وفادار حلیف ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ بنو غسان بازنطینیوں کے نہایت وفادار حلیف تھے۔ اسی طرح حیرہ (موجودہ کوفہ) کے لوگوں کے ایران سے تعلقات تھے اور وہ ایران کے حلیف تھے۔ ایک وقت تھا کہ حیرہ کے حکمرانوں نے اپنے وتیرہ سے ایران کے شاہی خاندان میں اتنا اعتماد پیدا کر لیا کہ ولی عہد شہزادہ بہرام گور کو بچپن میں مدائن کے شاہی محل میں رکھنے کے بجائے حیرہ بھیج دیا گیا تاکہ یہاں اس کی پرورش اور تربیت کی جا سکے۔ لیکن بعد کی نسلوں کے زمانے میں صورت حال بالکل بدل گئی۔ ایک شہنشاہ ایران نے خواہش ظاہر کی کہ والیِ حیرہ کی بیٹی شاہی حرم میں بھیجی جائے۔ مگر حیرہ کے گورنر نے انکار کر دیا۔ چنانچہ شہنشاہ نے گورنر کو مدائن طلب کیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس پر عربوں نے حکومت ایران کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ شہنشاہِ ایران نے عربوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا اور حیرہ پر فوج کشی کر دی۔ عربوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور شاہی فوج کو جنوبی عراق میں ذوقار کے مقام پر تہس نہس کر دیا۔ یہ واقعہ انہی دنوں رونما ہوا۔ جب کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگِ بدر لڑی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ذوقار کی جنگ کے دوران عربوں نے "یا محمد" کے نعرے بلند کیے۔ جب جنگِ ذوقار کی خبر مدینہ پہنچی تو رسولؐ خدا نے پکار کر کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ عربوں نے ایرانیوں سے انتقام لیا ہے۔ اور انھیں میری وجہ سے یہ فتح نصیب ہوئی ہے۔" رسولِ خدا ایران کے آں جہانی شہنشاہ نوشیرواں کی عادلانہ حکومت کے معترف تھے۔ لیکن وہ ایرانیوں کی آتش پرستی اور زرتشت کی طرف سے مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی بدعتوں کے سخت خلاف تھے۔ ہمیں اس کی صدائے بازگشت قرآن حکیم (۳۰/۲-۴) میں بھی سنائی دیتی ہے۔ پیغمبر کی مدینہ کو ہجرت سے قبل ایرانیوں نے بازنطینی سلطنت پر حملہ کر کے شام، فلسطین، اور مصر پر قبضہ کر لیا تھا قرآن میں کہا گیا ہے، "رومی (بازنطینی) ہمسایہ ممالک میں شکست سے دوچار ہوئے ہیں مگر چند سالوں کے اندر وہی فاتح ہوں گے۔" عیسائیوں کو نسبتاً مسلمانوں کے قریب تصور کیا جاتا تھا اور زرتشتی (ایرانی) کفارِ مکہ کے ہم مشرب تصور ہوتے تھے۔ غالباً اسی لیے یہ ردِ عمل ظاہر کیا گیا ہے۔

۲۲۳ - ۷ھ ہجری میں جب پیغمبرِ خدا نے خسرو پرویز کو اسلام کی دعوت دی اور اسے خط لکھا ——— اس خط کا اصل مسودہ ہم تک پہنچا ہے ——— یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا رسولِ اسلام کا یہ خط خسرو پرویز نے وصول کیا تھا، یا اس کے کسی جانشین کو ملا تھا۔ کیونکہ بالکل انہی دنوں ایرانیوں کو نینوا کے مقام پر مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شہنشاہِ ایران کو خود اس کے بیٹے نے قتل کر دیا تھا اور پایۂ تخت مدائن (تیسفون) میں وارثانِ تخت جلد جلد بدل رہے تھے۔ بہر حال اسلامی سفیر سے

نہایت توہین آمیز سلوک کیا گیا اور اسے بے عزتی کر کے ایرانی دربار سے نکال دیا گیا۔ ترمذی کی ایک حدیث کے مطابق ایران کی ایک ملکہ نے مدینہ میں ایک سفارت بھیجی۔ ایرانی سفیر تحفے لے کر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا مقصد سابق شہنشاہ کی طرف سے مسلمانوں کو پہنچائی جانے والی اذیت کا مداوا کرنا تھا۔ ایران کی یہ ملکہ غالباً پُوران دُخت تھی جو مختصر عرصہ کے لیے تختِ ایران پر جلوہ گر رہی، وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ عرب میں ایرانی نو آبادیات تختِ ایران کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے ہوئے ہیں۔

۲۲۴۔ دراصل شہنشاہ ایران سے مایوس ہو کر رسولِ خدا نے اپنی تمام تر توجہ عرب میں ایرانی مقبوضات پر مرکوز کر دی تھی ——— جیسا کہ انھوں نے بازنطینی سلطنت کے ضمن میں کیا تھا ——— کیونکہ ان ایرانی مقبوضات کی نہ صرف رعایا بلکہ حکمران طبقہ کا بڑا حصہ بھی عرب تھا۔ یمن، عُمان، بحران[1] (یہ موجودہ بحرین نہیں ہے بلکہ یہ وہ علاقہ ہے جو سعودی عرب کے مشرقی سرحدی صوبہ الحسا پر مشتمل ہے) اور جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی شمال مشرقی علاقے ایرانی مقبوضات پر مشتمل تھے۔

یمن

۲۲۵۔ یمن میں صورتِ حال خاص طور پر بڑی سنگین تھی۔ یمن ثقافتی اعتبار سے نہایت ترقی یافتہ علاقہ تھا اور انتہائی شاندار ماضی کا حامل تھا۔ یمن میں روم اور ایتھنز سے بھی پہلے مہذب حکومتیں قایم تھیں۔ رسولِ خدا کے ظہور سے صرف ایک نسل قبل یمن میں عظیم الشان سلطنت قایم تھی جس کی حدود میں نہ صرف پورا جزیرہ نما عرب بلکہ وہ وسیع علاقے بھی شامل تھے جو بعد میں بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کا حصہ بنے۔ اب یہی یمن ایرانیوں کی غلامی کے خلاف نبرد آزما تھا۔ یمنی ایرانیوں کی غلامیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے یمن میں آباد تمام ایرانیوں، ایرانی النسل حکام اور فوجیوں کو قتل کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ اس موقع پر رسولِ خدا کی طرف سے اہلِ یمن کو قبولِ اسلام کی دعوت کامیابی سے ہمکنار ہُوئی۔ پہلے خالدؓ ابن ولید اور پھر حضرت علیؓ کو اس علاقے میں بھیجا گیا۔ چنانچہ جہاں یمن کے بہت سے قبائل آسانی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، وہاں نجران کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر کے امن سے رہنے کو ترجیح دی۔ یمن کا دانشمند ایرانی گورنر باذان بھی آتش پرستی سے توبہ کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ رسولِ خدا نے باذان کو گورنر کے عہدے پر برقرار رکھا اور کچھ عرصہ بعد جب وہ وفات پا گیا تو رسول اللہؐ نے اس کے بیٹے شہر کو گورنر مقرر کر دیا۔ رسولِ خدا کے اس اقدام سے یمن میں مقیم بہت سے ایرانیوں کو تحفظ کا احساس نصیب ہوا ہو گا۔ رسولِ خدا نے یمن کی انتظامیہ کے لیے مدینہ سے بہت سے لوگوں کو بھیجا۔ یہ سب لوگ نہایت پرہیزگار اور صالح مسلمان شمار ہوتے تھے اور ان میں سے بعض مثلاً ابو موسیٰ الاشعری، یمنی النسل تھے۔ انھوں نے یمن میں بطور جج، اُستاد، ٹیکس کلکٹر اور عام انتظامی افسروں کی حیثیت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ معاذ ابنِ جبل جن کی مسجد آج بھی قصبہ جند میں موجود ہے، انسپکٹر جنرل تعلیم کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ انھوں نے یمن کے ایک ایک علاقے کا دورہ کیا اور ہر جگہ دینی تعلیم کے انتظامات کیے۔ رسولِ خدا نے چند فوجی دستے یمن کے اس بُت خانہ کو مسمار کرنے کے لیے بھی بھیجے

---

[1] بحران کو بیشتر کتب میں بحرین ہی لکھا گیا ہے۔ مگر قدیم عربی کتب اور حوالے کی کتابوں کے مطابق قدیم عرب اس علاقے کو "بحران" کہتے تھے۔ (مترجم)

جسے کعبہ کا ہمسر تصور کیا جاتا تھا۔ جب اس بُت خانے کو گرایا گیا اور بُت شکنوں پر بُتوں کا کوئی غضب نازل نہ ہوا، تو یمن کے سادہ لوح عوام کے دلوں میں موجود موہوم خدشات بھی دُور ہو گئے۔ جلد ہی عملی طور پر پُورا یمن اسلام لے آیا، صرف نجران کا عیسائی قبیلہ اور اکا دُکا یہودی خاندان باقی رہ گئے جو اپنے اپنے مذہب پر قائم تھے۔

۲۲۶۔ نجران کے عیسائی مذہبی معاملات میں بے حد منظم تھے۔ ظہورِ اسلام سے قبل وہاں غیر ملکی مسیحی مبلّغ تک آتے تھے ایسا ہی ایک مبلّغ اٹلی کا گریگنتس تھا جس نے بنو نجران میں مسیحیت کو راسخ کیا۔ یہودی بادشاہ ذونواسؓ نے مذہبی اختلاف کی بنا پر بنو نجران پر جو مظالم توڑے ان کی بنا پر اپنے مذہب پر ان کا اعتقاد اور بھی راسخ ہو گیا۔ انھوں نے اپنا ایک وفد بھی مدینہ بھیجا جس کی قیادت ان کا بشپ اور اس کا نائب کر رہے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجران میں کلیسا کی مضبوط تنظیم قائم تھی۔ وہ مدینہ اس امید پر گئے تھے کہ پیغمبر کو تثلیث وصلیب کے عقیدہ کا قائل کر لیں گے۔ چنانچہ انھوں نے مدینہ میں عقاید پر بحث و مباحثہ بھی کیا۔ رسولِ خدا سے مذاکرات کے دوران ان کی اجتماعی عبادت کا وقت ہو گیا۔ مذاکرات مسجد نبوی میں ہو رہے تھے۔ چنانچہ عیسائی وفد عبادت کے لیے واپس اپنے کیمپ میں جانا چاہتا تھا مگر رسولِ خدا نے مہمان نوازی کے ارفع جذبہ کے تحت کہا "اگر آپ لوگ پسند کریں تو آپ مسجد میں ہی عبادت کر سکتے ہیں"۔ مورخوں کا بیان ہے کہ عیسائی وفد نے مشرق کا رُخ کر کے عبادت کی۔ غالباً انھوں نے اس مقصد کے لیے صلیبیں بھی نکال لیں (جو وہ لباس کے اندر گلے میں پہنے ہوئے تھے) مسلمان تجسس کے گہرے جذبات کے ساتھ انھیں عبادت کرتے دیکھتے رہے۔ عبادت کے بعد عیسائی وفد نے پھر مذاکرات شروع کر دیے۔ رسولؐ اللہ نے انکے سوالوں کے مسکت جواب دیے اور مزید کہا "اگر تمھارا اطمینان نہ ہوا ہو تو آئیے ہم خدا سے رجوع کرتے ہیں۔ آئیے ہم دونوں (فریق) اللہ سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور ہم دونوں میں سے جو جھُوٹا ہو اس پر، اس کے خاندان اور بال بچوں پر اپنا غضب نازل کرے"۔ (دیکھیے قرآن ۳/۶۱) اس پر عیسائی وفد نے غور کرنے کی مہلت مانگی، انہوں نے تنہائی میں باہم مشورہ کیا۔ انھوں نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے سوچا: اگر محمد (صلعم) واقعی اللہ کے رسولؐ ہیں تو ان کی بددعا ہمیں دونوں جہانوں میں تباہ کر کے رکھ دے گی۔ بہتر ہے کہ ان سے معاہدہ صلح کر لیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے رضاکارانہ طور پر مسلم حکومت کی بالادستی تسلیم کر لی اور رسولِ خدا سے تحریری معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کے تحت نجران کے عیسائیوں کو انتظامی اور مذہبی معاملات میں مکمل آزادی دی گئی۔ انھیں اختیار تھا کہ وہ جسے چاہیں بشپ وغیرہ منتخب کر لیں اور اس انتخاب کی توثیق اسلامی حکومت سے کرانا لازم نہ تھا۔ رسولِ خدا نے حکم دیا کہ نجران کے عیسائی قرضوں پر سُود ادا نہ کریں بلکہ صرف اصل زر ہی ادا کریں۔ فطری طور پر رسولِ خدا نے انؐ سے یہ بھی کہا کہ وہ بھی مستقبل میں قرضوں پر سُود وصول نہ کریں۔ یہ تحریری معاہدہ بھی ہم تک پہنچا ہے۔

۲۲۷۔ یمن کے متعدد دوسرے قبائل نے بھی اپنے وفود مدینہ بھیجے اور اسلام قبول کیا۔ یمن کا وسیع و عریض علاقہ تین سال کے اندر کسی جنگ کے بغیر اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں آ گیا۔

لہ قرآن پاک میں اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡد (۸۵/۴) کا اشارہ اسی طرف ہے۔ (مترجم)

عُمان

۲۲۸۔ عمان عرب کے جنوب مشرق میں ایک ریاست تھی جہاں جلندی کے دو بیٹے جیفر اور عبد مشترکہ طور پر حکومت کرتے تھے۔ رسولِ خدا کی دعوت پر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اپنے وعدہ کے مطابق دونوں کو عُمان کی حکومت پر برقرار رکھا۔ اس طرح پیغمبر نے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ اسلام میں مشترکہ حکومت روا ہے ، تاہم رسولِ خداؐ نے عمان میں اپنا ایک نمائندہ مقرر کردیا جو مسلمانوں کی تعلیم وغیرہ کی نگرانی کرتا تھا۔

۲۲۹۔ عمان کا علاقہ اقتصادی اعتبار سے بڑا اہم تھا اس کی بین الاقوامی بندرگاہیں اور وہاں کے تجارتی میلے اسلامی مملکت کے لیے وقار اور قوت کا باعث بنے۔

۲۳۰۔ عبد القیس کا قبیلہ جیفر کی حکومت کے تحت نہ تھا بلکہ آزاد تھا کیونکہ انھوں نے اپنا وفد الگ سے رسول اللہؐ کی خدمت میں روانہ کیا جس نے مدینہ میں پیغمبر سے براہِ راست مذاکرات کیے۔ وفد کے ارکان یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ رسولِ خدا ان کے ملک کا وسیع دورہ کر چکے ہیں اور (ظہورِ اسلام سے قبل) کافی عرصہ عُمان میں گزار چکے ہیں۔ رسولِ خدا عمان کے بہت سے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے تھے انھوں نے اہلِ وفد سے عمان کی تازہ خبریں بھی دریافت کیں۔ بات چیت نہایت خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔ امام بخاریؒ کے مطابق مسجد نبوی کے بعد جس مسجد میں پہلی بار نماز جمعہ ادا کی گئی وہ عبد القیس کے علاقہ کی مسجد جواثا تھی۔

۲۳۱۔ یہ علاقہ زبردست اقتصادی اہمیت کا حامل تھا۔ دبا اور مقشر کے مقامات پر سالانہ تجارتی میلے منعقد ہوتے تھے، جن میں کئی ممالک کے تجار شریک ہوتے۔ دبا عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی۔ اس کے تجارتی میلہ میں عرب کے کونے کونے سے ہی نہیں بلکہ "چینی، ہندی، سندھی اور مشرق و مغرب سے تاجر اپنا مالِ تجارت لے کر شریک ہوتے تھے۔" چینی تاجر بڑی بڑی کشتیوں میں اپنے ملک سے سیدھے دبا آتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاندار مصنوعات کی وجہ سے یہاں ایسا تاثر قایم کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے۔"

جب یہ علاقہ غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوگیا تو رسولِ خداؐ نے دبا کا الگ گورنر مقرر کیا۔ یہ گورنر دبا کا رہنے والا ایک مسلمان تھا۔ اس کے فرائض میں دبا کی بندرگاہ، شہر اور منڈی کی دیکھ بھال شامل تھی۔

بُحران

۲۳۲۔ موجودہ بحرین جو خلیج عرب و فارس میں جزیرہ نما عرب کے مشرق میں واقع ہے ان دنوں اُوال کہلاتا تھا۔ ان دنوں جس علاقے کو بحرین[1] (بحران) کہتے تھے (بحرین کا لغوی ترجمہ "دو سمندر" ہے) وہ سعودی عرب کا موجودہ ضلع الحساء ہے جو سعودی عرب کا ایک حصہ ہے۔ غالباً ظہورِ اسلام کے وقت اس علاقے میں موجودہ قطر بھی شامل تھا۔ قطر خلیج کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور یُوں دو سمندروں کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ بہرحال اس علاقے (بحران یا بحرین) کے

---

[1] بیشتر عربی کتب میں اس علاقہ کو بُحران لکھا گیا ہے تاہم اسے بحرین بھی کہا اور لکھا جاتا تھا۔ (مترجم)

عرب گورنر المنذر ابن ساوہ نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ اسلامی حکومت کا نہایت پُرجوش منتظم ثابت ہوا۔ تاریخ میں رسولِ خدا کے نام اس کے نصف درجن سے زاید خطوط کا ذکر آتا ہے ان میں سے ایک خط کا اصل ہم تک پہنچا ہے۔ یہ خط پہلی بار برلن کے ایک پبلشر ZDMG نے شایع کیا تھا۔

سماوہ

۲۳۳۔ شمالی مشرقی عرب کے قبیلہ بنو تمیم نے نہایت آسانی سے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے مزید شمال میں جنوبی عراق کا علاقہ بھی عربوں کا گہوارہ تھا۔ اس علاقے میں حیرہ (موجودہ کوفہ) کی ریاست سمیت عرب قبائل آباد تھے۔ ایرانی حکومت کی جنوبی اور مشرقی عرب میں جو نو آبادیات تھیں ان پر دار الحکومت مدائن کے قُرب وجوار کی آبادیوں کی نسبت حکومت کی گرفت کمزور تھی تاہم حیرہ کے حکمران قبیلہ بنو لخم کے متعدد ذیلی قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ رسولِ خدا کی طرف سے انھیں جو اسناد فراہم کی گئیں تاریخ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

۲۳۴۔ حیرہ (کوفہ) کے جنوب مشرق میں سماوہ کا علاقہ ہے۔ رسولؐ اللہ کے ایک خط کا ذکر ملتا ہے جو حضورؐ نے سماوہ کے فرمانروا نُفاثہ الدیالی کے نام لکھا تھا تاہم اس خط کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ یہ بادشاہ بھی عربی النسل تھا اور اس امر کے قوی امکانات ہیں کہ اس نے ایرانیوں کی باجگزاری سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کر لیا ہو تاہم اس سلسلے میں کوئی یقینی بات کہنا ممکن نہیں۔

ہندوستان

۲۳۵۔ کیا رسولِ اسلام کے ہندوستان سے کوئی تعلقات تھے؟ اس ضمن میں کچھ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اسے ناممکن بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عرب تجار ظہورِ اسلام سے قبل ہی سندھ اور مالابار کی بندرگاہوں پر بکثرت آتے جاتے تھے۔ ہندی تاجر بھی جنوب مشرقی عرب کی بین الاقوامی بندرگاہ دبا کے تجارتی میلے میں شرکت کرتے تھے (دیکھیے ابنِ حبیب کی المحبّر، صفحہ ۲۶۵) اس امر کا بھی قوی امکان ہے کہ ہندی تاجر یمن بھی جاتے تھے (دیکھیے ابنِ ہشام صفحہ ۲۶۵) کیونکہ یمن کے حکمران سیف ابن ذی یزن نے ایک بار ایرانی شہنشاہ کو اطلاع دی کہ اس کے ملک پر "کوّوں" نے قبضہ جما لیا ہے اور اس کی امداد کی جائے۔ "کون سے کوّے؟" کسریٰ نے وضاحت طلب کی "یہ ہندی کوّے ہیں یا حبشہ سے آئے ہیں؟" شہنشاہِ ایران کے ذہن میں یہ سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اگر یمن اور ہند کے درمیان مستحکم تعلقات نہ ہوتے۔ جہاں تک دبا کا تعلق ہے رسولؐ پاک خود وہاں جا چکے تھے (دیکھیے ابنِ حنبلؒ جلد ۴ صفحہ ۲۰۶ "میں نے تمھارے ملک کا وسیع دورہ کیا ہے" مصنف رسولؐ اللہ کی دو احادیث کا تذکرہ کرتا ہے جن کے مطابق رسولؐ اللہ نے مشقّر اور بعض دُوسرے علاقوں کا نام لیا جہاں کا وہ سفر کر چکے تھے) چنانچہ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ جب یمن کے قبیلہ بل حارث کا وفد مدینہ گیا تو رسولؐ اللہ نے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں جو ہندی معلوم ہوتے ہیں" (دیکھیے ابن ہشام صفحہ ۹۶۰ — ابنِ سعد ۱/۲ صفحہ ۷۲۔ نسائیؒ ۲۵/۴۱) ابنِ حنبلؒ (۲ - ۲۲۹) کے مطابق ابو ہریرہؓ جو یمنی النسل تھے اکثر کہا کرتے تھے "رسولِ خدا نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان کی طرف ایک مہم بھیجی جائے گی اگر میں وہاں (ہند میں) ہلاک ہو جاؤں تو میں بہترین شہدا میں سے ہوں گا اور اگر میں صحیح وسالم واپس آ جاؤں تو میں وہی آزاد شدہ

غلام ابوہریرہ رہوں گا۔" رسول پاکؐ سے ایک اور حدیث بھی منسوب کی جاتی ہے، فرمایا: "مجھے ہندوستان کی طرف سے تازہ ہوا آتی ہے۔"

۲۳۶۔ رسولِ خدا کی زندگی میں صرف ہندی لوگوں کا ہی نہیں ان کے مذہب کا بھی ذکر آیا تھا۔ قدیم مسلم مورخ عبدالکریم الجیلی اور دورِ حاضر کے پروفیسر مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۳۷۔ چنانچہ پیغمبر ذوالکفل (جو کفل سے آیا ہو) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کفل دراصل کپل وستو کی عربی شکل ہے، وہ ریاست جس میں گوتم بدھ پیدا ہوا تھا۔ ایک اور توضیح اس طرح ہے کہ "کفل" کے لفظی معنی "خوراک" کے ہیں۔ اور گوتم بدھ کے والد کے نام سدودھن کے معنی بھی "خوراک" کے ہی ہیں۔ قرآن حکیم کی سورہ التین میں ہے:

"انجیر اور زیتون کی قسم اور طور سینا کی اور اس شہر (مکہ) کی، جو امن والا ہے......"

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیہ مبارکہ میں شہر سے مراد مکہ ہے۔ کوہ سینا سے مراد موسیٰؑ کا سینائی پہاڑ ہے اور زیتون حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں تک انجیر کے درخت کا تعلق ہے اس کا اشارہ بڑ کے درخت کی طرف ہے جو جنگلی انجیر ہے۔ بدھ کو بڑ کے درخت کے نیچے ہی نروان حاصل ہوا تھا کسی اور پیغمبر کی زندگی میں بڑ کے درخت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔

۲۳۸۔ برہمنیت کا جہاں تک تعلق ہے قرآن میں (۲۰/ ۸۵۔ ۹۷) ایک زرگر سامری کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں اچھوت (لامساس) کی طرف واضح اشارہ ہے۔ راجہ سامری (جسے یورپ والے زمورین (ZAMORIN) لکھتے ہیں) کالی کٹ اور مالابار کے علاقوں میں آج بھی معروف ہے جہاں اس کا خاندان برطانوی راج کے دوران حکمرانی کرتا تھا۔ اس سامری کا انجیل کے سامری سے کوئی تعلق نہیں جو موسیٰؑ کے بعد کے دَور میں ہوا ہے، جبکہ سامری سُنار یہودیوں کا حلیف تھا اور وہ حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی ہارونؑ کے عہد میں موجود تھا۔

۲۳۹۔ میں اس تعارف کو متبحر عالم مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی دو تصانیف اوّل ان کی سوانحی لغت "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" کا مقدمہ اور دوسری "شمامۃ العنبر فی ماورد عن الہند عن سید البشر" کے ذکر پر ختم کرتا ہوں۔

۲۴۰۔ ہندوستان کے جنوب مغربی ساحلی علاقہ مالابار میں یہ روایت مشہور ہے کہ اس علاقہ کے ایک بادشاہ چکرورتی فرماس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔ یہ رسول اللہؐ کا معجزہ تھا جو مکہ مکرمہ میں ظہور پذیر ہوا، بادشاہ چکرورتی فرماس نے اس سلسلے میں جب تحقیقات کیں تو اسے علم ہوا کہ عرب میں ایک پیغمبر کے ظہور کی پیشگوئیاں موجود ہیں اور شق القمر کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیغمبرِ خدا ظاہر ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود رسول اللہؐ سے ملاقات کے لیے عرب روانہ ہو گیا۔ اس نے رسول اللہؐ کے رُوبرو اسلام قبول کیا اور پھر ان کے حکم پر واپس ہند روانہ ہو گیا۔ راستے میں یمن کی بندرگاہ ظفار میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یہاں آج بھی "ہندی بادشاہ" کا

مزار مرجع خاص وعام ہے۔ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ایک پُرانا مسودہ (نمبر عربی ۲۸۰۷ ص ۱۵۲-۱۷۳) ہے جس میں اس کی تفصیل درج ہے۔ زین الدین المعبری کی تصنیف "تحفۃ المجاہدین فی بعد اخبار البرتگالیین" میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے (اس کتاب کا پرتگیزی ترجمہ انگریزی سے کہیں بہتر ہے مگر اس کا اردو ترجمہ نامکمل ہے)۔

۲۴۱۔ ہم رتن ہندی (دیکھیے ابن حجر، اصابہ ۲۷۵۹) اور سرباتک ہندی کا جو علی الترتیب چوتھی اور آٹھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں زیادہ تذکرہ نہیں کریں گے۔ ان دونوں کا دعوٰی تھا کہ وہ رسولِ اسلام کے صحابی ہیں اور انھوں نے کئی سو سال عمر پائی ہے مگر اُن کے معاصرین ان کے اس دعوے کو محض فراڈ قرار دیتے ہیں۔

ترکستان

۲۴۲۔ ترکی کے لوگوں کے بارے میں تو بہت ہی کم مواد موجود ہے۔ علامہ بلاذری اپنی کتاب انساب الاشراف (۱-۴۸۵) میں روایت کرتے ہیں کہ اسلام کی پہلی شہید خاتون سمیہ عمار ابن یاسر کی والدہ تھیں۔ انھیں ابوجہل نے شہید کیا تھا۔ ان کا اصل نام پامیخ تھا اور ان کا تعلق ایران کے علاقہ کسگر سے تھا۔ پامیخ کو جدید ترکی میں "پاموک" کہتے ہیں جس کے لغوی معنی کپاس کے ہیں۔ اور یہ کسی ترک خاتون کا نام ہی ہوسکتا ہے۔ خدا اس خاتون کے درجات بلند کرے۔ ہندوستان کی طرح ترکی میں بھی ایک شخص مقلاب ابن ملکان الخوارزمی گزرا ہے جس نے یکے از صحابہؓ رسول ہونے کا دعوٰی کیا تھا۔ (دیکھیے ابن حجر، اصابہ۔ ۲۱۲۶)

چین

۲۴۳۔ چین کے بارے میں حضورِ اکرم کی ایک معروف حدیث ہے: "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے"۔ یہ یقین کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں کہ رسول اللہؐ کی چینیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ حضورِ اکرمؐ نہ صرف ان کی استقامت سے متاثر ہوئے کہ وہ کئی ماہ تک سمندر میں سفر کرکے آئے تھے بلکہ ان کی مصنوعات کی عمدگی نے بھی رسولِ خداؐ کو متاثر کیا تھا۔ ایک طرف تو مسعودی لکھتے ہیں (دیکھیے علامہ مسعودی کی "مروج الذہب" ۱-۳۰۸) کہ چینی ظہورِ اسلام سے قبل بڑی بڑی کشتیوں میں ہُجران (بحرین) اور عُمان آتے تھے اور دُوسری طرف ابن حبیب دبا کے تجارتی میلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ (دبا) عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی اور اس کے سالانہ تجارتی میلے میں ہند، سندھ، چین اور مشرق و مغرب سے تجار آتے تھے ....."

۲۴۴۔ چینی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ رسولِ خدا نے شاہِ چین کے دربار میں سفیر بھیجا تھا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس سفیر کا نام ابوعبیدہؓ تھا۔ وُہ بعد میں دوبارہ چین گئے اور اسی جگہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا مقبرہ سنگان فو میں ہے۔ (ان کے مقبرے میں تحریروں کے سلسلے میں ملاحظہ کیجیے وین لینگ وُو کی "مذہبی کتبات" پیکنگ، ۱۹۵۱ء اور بروم ہال مارشل کی "چین میں اسلام" ص ۶۶، ۸۳-۹۰)

باب ۱۰

اسلامی معاشرہ کی تنظیم

۲۴۵۔ رسولِ خدا کی جائے پیدائش مکہ ظہورِ اسلام سے قبل ہر طرح سے منظم شہری ریاست تھی۔ مکہ میں حکمران کونسل (پارلیمنٹ) قائم تھی جس میں دس "وزرا" تھے۔ یہ وزرا ریاست کے دس بااثر اور طاقتور قبیلوں سے موروثی طور پر لیے جاتے تھے۔ یہ وزرا شہر کے اندرونی نظم ونسق کے ذمہ دار تھے۔ چند وزرا نامزد کیے جاتے تھے جن کے سپرد بین الاقوامی اور خصوصاً حج کے انتظامات ہوتے تھے جو خالصتاً مقامی مسئلہ نہیں تھا۔

۲۴۶۔ ظہورِ اسلام سے قبل شہر کی مقامی انتظامیہ کی صورت حال یہ تھی:

۱۔ بنو ہاشم کے العباس (رسول اللہؐ کے چچا) چاہ زمزم کے نگران تھے اور ایامِ حج میں لوگوں کو پانی کی فراہمی ان کے ذمہ تھی وہ حرمِ کعبہ میں نظم وضبط کے بھی ذمہ دار تھے تاکہ کعبۃ اللہ کے احاطہ میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو اللہ کے گھر کے شایانِ شان نہ ہو۔

۲۔ بنو تیم کے ابوبکر (صدیقؓ) اشناق کے سربراہ تھے، ان کا کام دیوانی اور فوجداری معاملات میں ہرجانہ کا تعین تھا جو مظلوم کو ادا کیا جاتا تھا۔

۳۔ بنو عدی کے عمرؓ بن خطاب "سفارہ۔ منافرہ" کے انچارج تھے۔ یہ ایک طرح کا سفارتی عہدہ تھا جس کا مقصد امورِ خارجہ میں مملکت کی نمائندگی اور متنازعہ معاملات میں دوسرے ممالک سے بات چیت کی ذمہ داری شامل تھی۔ یوں کہیے کہ حضرت عمرؓ ایک طرح کے وزیرِ خارجہ تھے۔ کہ جب کسی ملک کو سفارت بھیجنے کا فیصلہ کرتے تو عمرؓ بن خطاب بھیجے جاتے، اور جب کسی بیرونی معاملہ میں اہلِ مکہ کی اولیت کو چیلنج درپیش ہوتا تو مذاکرات کے لیے عمرؓ کا انتخاب کیا جاتا۔

۴۔ بنو امیہ کا ابوسفیان مملکت کے فوجی پرچم "عقاب" کا نگران تھا۔ جنگ کے موقع پر وہ مملکت کا پرچم تھامتا جب تک کسی کو متفقہ طور پر سپہ سالار منتخب نہ کر لیا جاتا۔ عموماً ایسا اس وقت ہوتا جب اہلِ مکہ کی فوج کسی حلیف سے مل کر جنگ میں شامل ہوتی۔

۵۔ بنو عبدالدار کے عثمان ابن طلحہ قبائلی پرچم "لوا" کے نگران اور محافظ تھے۔ ("عقاب" اور "لوا" کے درمیان فرق یہ ہے کہ عقاب بڑی جنگوں کے موقع پر اور لوا عام معمولی معرکوں کے موقع پر لہرایا جاتا تھا) عثمانؓ دارالندوہ (پارلیمنٹ ہاؤس) کے بھی انچارج تھے جہاں ریاست کے تمام معمر اور تجربہ کار افراد کو کسی بھی معاملے پر صلاح مشورہ کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس مشاورت میں چالیس سال یا اس سے زائد عمر کے شہری ہی شریک ہوتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار خصوصی طور پر کسی نوجوان کو بھی مدعو کر لیا جاتا تھا۔ یہ مجلسِ مشاورت ایک طرح سے پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں تھا۔

۶ - بنو اسد کے یزید ابن زمعہ (جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے والد تھے) مشورہ کے انچارج تھے۔ یہ پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا تھا کیونکہ جب کوئی قرارداد منظور کی جاتی تھی وہ اس عہدہ دار کو توثیق کے لیے پیش کی جاتی تھی۔

۷ - بنو مخزوم کے خالد ابن ولید قبہ کے انچارج تھے (یہ ایک قسم کا سائبان تھا، جب بڑے بُت لات وغیرہ کا جلوس نکالا جاتا تھا تو یہ سائبان بُت پر تانا جاتا تھا وہ عینہ کے بھی ذمہ دار تھے اور اس حیثیت میں بُت کے جلوس کے وقت اس گھوڑے کی لگام تھامتے تھے جس پر بُت رکھا جاتا تھا۔ وُہ جنگ کے دوران گھڑ سوار دستوں کی قیادت بھی کرتے تھے۔ ان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا وہ دونوں گھڑ سوار دستوں کی اس طرح قیادت کرتے تھے کہ ایک میمنہ میں اور دوسرا میسرہ میں ہوتا تھا۔

۸ - بنو نوفل کے الحارث ابن عامر رفادہ (عطیات اور ٹیکس) کے شعبہ کے سربراہ تھے۔ وُہ ایک طرح کے وزیر خزانہ اور خزانچی تھے جو لوگوں سے عطیات جمع کرتے اور اس رقم کو ایام حج میں ایسے زائرین پر صرف کرتے جو کسی وجہ سے مشکل میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

۹ - بنو جُمح کا صفوان ابن اُمیہ ازلام (فال کے طور پر استعمال ہونے والے تیر) کا انچارج تھا۔ جب کوئی شخص کسی مشکل معاملہ میں خود فیصلہ نہ کر پاتا تو وہ یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد تیروں سے فال نکالی جاتی۔ چنانچہ "ہاں" یا "نہ" جیسا بھی تیر آتا اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔ فال نکلوانے کے لیے فیس ادا کرنا پڑتی تھی۔

۱۰ - بنو سہم کا الحارث ابن قیس ثالثی اور کعبہ میں پیش کی جانے والی نذروں کا انچارج تھا۔ وُہ دیوانی مقدمات میں گویا جج کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ مقدمات ان فوجداری وغیرہ مقدمات سے الگ ہوتے تھے جن کا ذکر اوپر (نمبر ۲) آیا ہے۔

۲۴۷ - نامزد وزیروں میں سے ایک انجینئر اور ماہرِ تعمیرات ایک شخص حالہ ابن عوف ابن عامر کی اولاد میں سے ہوتا تھا جس کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ اَزد شنوہ سے تھا۔ مگر یہ شخص مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔

۲۴۸ - ایک اور نامزد وزیر کیلنڈر (تقویم) کا انچارج تھا اور وہ اس بات کا تعین کرتا تھا کہ کون سے قمری سال پر تیرھواں مہینہ ایزاد کیا جائے تاکہ شمسی سال سے مطابقت پیدا کی جا سکے، اور مختلف موسم ایک ہی قمری مہینے میں آئیں۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ایامِ حج ایک ہی موسم میں آئیں (یعنی موسم بہار کے ابتدا میں) رسول پاکؐ کے دور میں یہ کام مالک ابن کنعان کے سپرد کیا گیا تھا (اور اس عہدیدار کو قلمس کہا جاتا تھا)

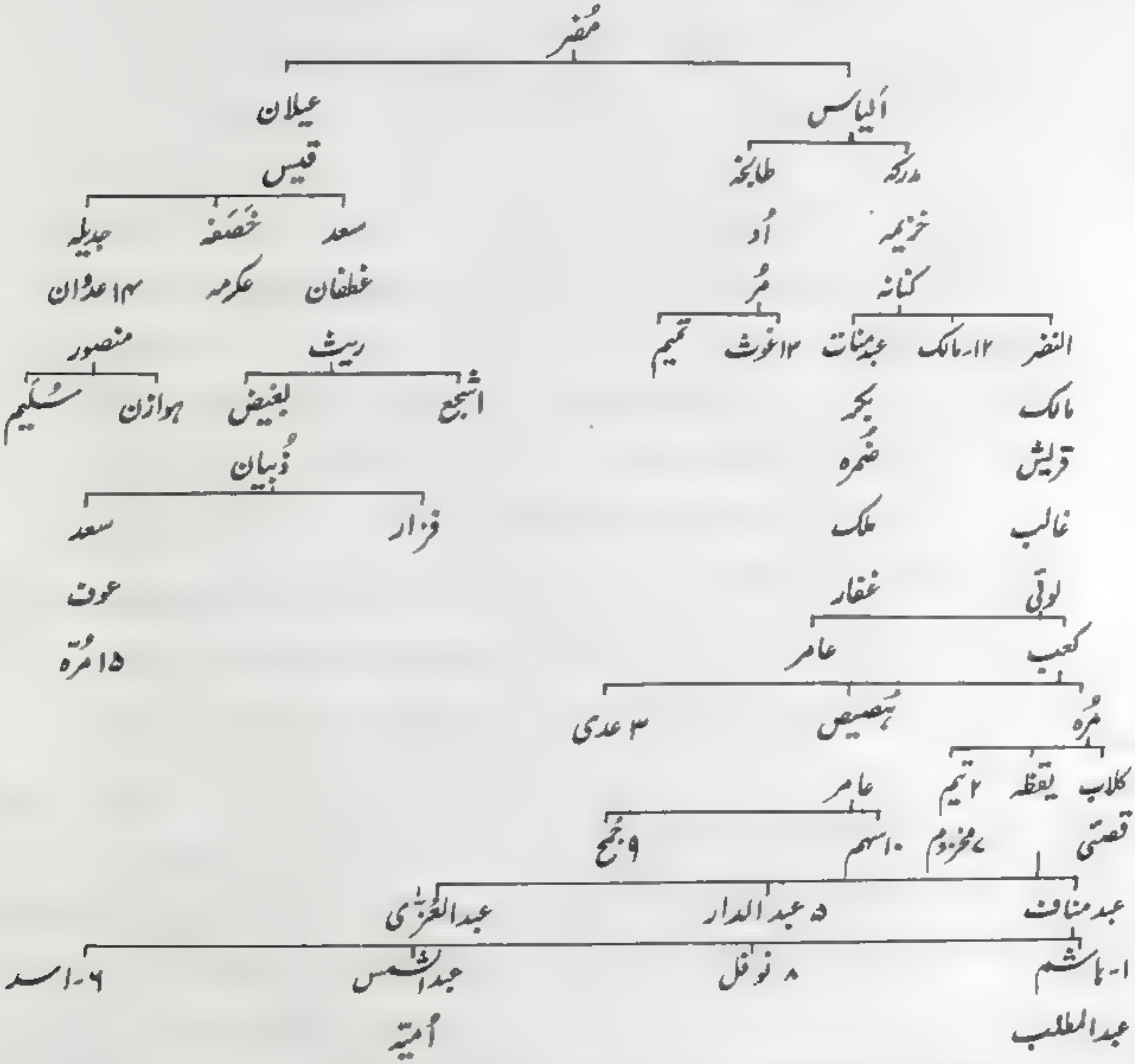
۲۴۹ - ایک اور وزیر کے ذمہ عرفات میں لوگوں کی رہنمائی کرنا تھا۔ یہ عہدہ بھی موروثی تھا اور اس پر ہمیشہ بنو غوث ابن مُر کا رُکن ہی فائز ہوتا تھا۔

۲۵۰ - مزدلفہ میں حجاج کے نظم و ضبط اور وہاں سے منیٰ تک ان کی رہنمائی ایک اور شخص کی ذمہ داری تھی جو بنو عدوان ابن جندیلہ سے ہوتا تھا۔

۲۵۱ - بنو مُرّ ابن عوف کا ایک فرد بھی وزارت کے منصب پر فائز ہوتا تھا مگر مورخوں نے اس کے فرائض کی صراحت نہیں کی۔

۲۵۲۔ ذیل میں ایک شجرہ نسب دیا جا رہا ہے جو مختلف قبائل کے ایک دوسرے سے رشتہ داری کو سمجھنے میں مدد ہوگا۔ (صرف ماہر تعمیرات وزیر کے خاندان کا اس شجرہ میں ذکر نہیں کیونکہ اس کا تعلق جنوبی عرب سے تھا)

ارکانِ حکومت کا شجرۂ نسب



۲۵۳۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو یہ ریاست کے اندر ایک ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ مسلمان یوں تو ریاست مکہ میں رہتے تھے مگر وہ اپنے تمام امور میں صرف پیغمبر اسلام سے رہنمائی حاصل کرتے تھے جو حاکمِ وقت تو تھے البتہ ان کے زیرنگیں ابھی کوئی علاقہ نہ تھا۔

۲۵۴۔ جب رسول اللہ نے ۶۲۲ء میں مدینہ کو ہجرت کی تو محض مٹھی بھر افراد انھیں خدا کا رسول تسلیم کرتے تھے۔ ان میں بھی کچھ مکی تھے اور باقی کا تعلق مدینہ سے تھا۔ اس وقت نہ تو یہ سارا علاقہ مشرف بہ اسلام ہوا تھا اور نہ ہی پیغمبر کو کوئی سیاسی قوت

حاصل تھی۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ اس پُورے علاقہ میں نہ تو واحد ریاست تھی اور نہ ہی وہاں کوئی موثر حکومت قائم تھی۔ نہ صرف عرب بلکہ مدینہ میں بھی ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ پھر ان قبائل میں باہمی رقابتیں اور دشمنی تھی۔ مدینہ کا علاقہ زرخیز تھا۔ اس کا زیرِ زمین پانی میٹھا تھا جو زراعت اور باغات کے لیے نہایت مفید تھا۔ جب رسولؐ خدا مدینہ کے قبائل کو منظم کر کے شہری ریاست کا رنگ دینے میں کامیاب ہو گئے، تو مدینہ مکہ سے بھی زیادہ طاقت ور ہو گیا کیونکہ یہ علاقہ مکہ کی نسبت زیادہ خود کفیل تھا۔ اگرچہ صحیح اعداد و شمار موجود نہیں مگر قرائن سے ظاہر ہے کہ سنِ ہجری کے آغاز پر مدینہ کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی ان میں عرب اور ان کے یہودی حلیف بھی شامل تھے۔ ہجرت کے فوراً بعد رسولِ خدا نے حکم دیا کہ مدینہ کے تمام مسلمانوں، خواتین سمیت کی فہرست تیار کی جائے اور انھیں پیش کی جائے۔ امام بخاریؒ کے مطابق مسلمانوں کی اس مردم شماری سے جو فہرست مرتب ہوئی اس میں ڈیڑھ ہزار نام شامل تھے۔ فتح مکہ تک جو ۸ھ ہجری میں ہوئی، رسولؐ خدا کی پالیسی یہ تھی کہ وہ عام مسلمانوں کو فرداً فرداً اور گروہوں کی صورت میں بھی مدینہ کو ہجرت کی تلقین کرتے تھے تاکہ وُہ کفار سے محفوظ رہ سکیں۔ ۶۳۲ء میں جب پیغمبر کا وصال ہُوا یہودیوں کی اکثریت مدینہ کا علاقہ خالی کر چکی تھی اور نئے مہاجر مدینہ آتے رہتے تھے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت مدینہ کی آبادی پندرہ سے بیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

۲۵۵۔ اس دوران، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، رسولِ خدا مدینہ میں ایک ایسی شہری ریاست کی مضبوط بنیادیں قایم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے جو جلد ہی ایک مملکت بلکہ وسیع سلطنت میں تبدیل ہو گئی جس کی سرحدیں پُورے عرب، عراق اور فلسطین سمیت جنوبی علاقوں تک پھیل چکی تھیں۔ چونکہ قبل ازیں علاقہ میں کوئی مملکت قایم نہ تھی لہٰذا ضرورت کے مطابق ہر انتظامی شعبہ قایم کرنا پڑا۔ اور پھر تجربات کی روشنی میں اسے بہتر بنایا گیا۔ مدینہ شہر کی انتظامیہ اس وسیع سلطنت کی مرکزی حکومت تھی اور ہر قبیلہ اسلام قبول کرنے کے ساتھ اپنے علاقہ میں اس سلطنت کا صوبہ بن جاتا تھا۔ حضور اکرمؐ کی پالیسی یہ تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر قبیلہ میں کسی مقامی شخص کو حکومت کا سربراہ مقرر کر دیتے۔ اگر قبیلے کا رئیس بھی مسلمان ہو جاتا تو اسے ہی حکومت کا سربراہ مقرر کیا جاتا اور اس کی امداد کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک کونسل تشکیل دی جاتی۔ یہ انتظام مرکز سے تنخواہ دار گورنر اور دُوسرے عُمال بھیجنے کی نسبت زیادہ سستا پڑتا۔ پھر نفسیاتی طور پر بھی یہ انتظام بہتر رہتا کیونکہ اس طرح لوگوں میں یہ تصور پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ان پر کوئی غیر ملکی حکومت کر رہا ہے۔ قبائل کے سربراہوں کے لیے باقاعدہ فرمان جاری کیے جاتے جن میں انھیں ان کی سابق جاگیر ——— زمین اور پانی وغیرہ ——— پر برقرار رکھا جاتا یا علاقہ میں انھیں نئی جاگیر عطا کی جاتی۔ گو یہ نظام جاگیردارانہ سا محسوس ہوتا ہے مگر بالواسطہ حکومت ناگزیر تھی کیونکہ علاقہ کے لوگ خانہ بدوش فطرت کے مالک تھے۔ لیکن عرب کے زیادہ آباد اور زرخیز علاقوں کے علاوہ یمن، بحران (بحرین) اور عمان وغیرہ کو جہاں پہلے ہی حقیقی ملکیتیں قایم تھیں، رسولِ خدا نے جُوں کا تُوں قایم رکھا۔ رسولِ خدا کے تحت جہاں قبائل کے سردار تھے وہاں بادشاہ بھی ان کے باجگزار تھے جو رسولِ اسلام کو خراج ادا کر کے آزادی، امن اور چین سے حکومت کر رہے تھے۔

۲۵۶۔ رسولِ خدا کی مملکت جس کے وُہ حکمران تھے اپنی ہیئت کے اعتبار سے بڑی پیچیدہ تھی اور اس کے مختلف علاقوں میں کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ حکومت کا نظام رائج تھا۔ اس مملکت کے نظام کو وحدانی قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ اسے وفاقی یا نیم وفاقی (کنفیڈریشن) کہا جا سکتا ہے۔ مملکت کی مرکزی حکومت گو فردِ واحد کی حکومت تھی مگر اسے مطلق العنانی سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔ مسلسل اور بار بار مشاورت کا طریقہ رائج تھا، گو انتخابات کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا مگر قبائل کے سردار اپنے اپنے عوام کے فطری نمائندہ تھے۔ مشاورتِ عام کے دوران عوام بھی موجود ہوتے تھے کیونکہ عموماً رسولِ خدا نماز کے بعد مسجد میں موجود حاضرین کے سامنے ہی مسئلہ پیش کر دیتے تھے۔ اس پر قبائل کے سردار ہی نہیں عام لوگ بھی رائے دے سکتے تھے۔ خفیہ مشاورت نہ ہونے کے برابر تھی، البتہ جنگ یا جنگ کے خطرہ کے پیشِ نظر خفیہ صلاح مشورہ کیا جاتا تھا البتہ کسی مسئلہ پر رائے شماری کا موقع تو شاید ہی آتا تھا۔ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ اس بات پر رائے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ آیا مالِ غنیمت ——— دشمن کے وُہ افراد جو غلام بنا لیے گئے تھے ——— جو تقسیم ہو چکا تھا اس کی تقسیم منسوخ کر کے اسے اصل مالکان کو واپس کر دیا جائے یا نہیں، کیونکہ جس قبیلہ سے جنگ ہوئی تھی اس نے اپنے فعل پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا۔ رائے عامہ منقسم معلوم ہوتی تھی، چنانچہ رسولِ خدا نے چند افراد کو یہ فرض سونپا کہ وُہ باہم مشورہ اور سوچ بچار کے بعد اس مسئلہ پر فوج کے ہر سپاہی کی رائے کے بارے میں رپورٹ پیش کریں۔ بھاری اکثریت کی رائے غلاموں کو آزاد کرنے کے حق میں تھی مگر چند افراد نے مالِ غنیمت واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسولِ خدا نے حکم دیا کہ تمام مالِ غنیمت واپس کر دیا جائے تاہم جن سپاہیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا انھیں بیت المال سے نقد معاوضہ ادا کیا گیا اور وُہ بھی دشمن کے غلام بنائے گئے افراد کو واپس کرنے پر رضامند ہو گئے۔ یہ حقیقت کہ رسولِ خدا کسی قبیلہ، کسی ریاست یا علاقہ کا حکمران نامزد کرتے تھے یا اسے تسلیم کرتے تھے، اس امر کی غماز ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت کسی بھی حکمران کو معزول کر سکتے تھے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر عمل میں لا سکتے تھے۔ اس طرح گو ملک کے مختلف حصّے متضاد عناصر کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان میں ذاتی نوعیت کا گہرا اتحاد موجود تھا۔

۲۵۷۔ ہم دورِ خلافت کی مسلم مملکت کا تذکرہ نہیں کر رہے بلکہ یہ پیغمبرِ اسلام کے دَور کی اسلامی مملکت ہے جو ہمارے زیرِ بحث ہے۔ رسولِ خدا کی ذات والا صفات بے مثال تھی۔ ہر مسلمان کا ایمان تھا کہ حضورؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ جب رسولِ خدا فرماتے تھے کہ یہ خدا کا حکم ہے تو اس حکم کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ نتیجتاً زندگی کے تمام شعبوں دین، سیاست، اخلاق، سماجی اقدار اور دیگر امور میں پیغمبر کو قطعی اختیار حاصل تھا۔

۲۵۸۔ رسولِ خدا نے جب مدینہ کی شہری ریاست کی بنیاد رکھی تو وہ اسے بظاہر مکّہ کی جلاوطن حکومت تصور کرتے تھے وُہ جب فوج لے کر نکلتے تو اپنا لِوآ (پرچم)، بنو عبد الدار کے کسی مسلمان کے سپرد کرتے، جب اہلِ مکّہ سے مذاکرات کا مرحلہ درپیش ہوتا تو حضرت عمرؓ کو طلب کیا جاتا، اور جب خالدؓ ابنِ ولید اسلام لے آئے تو انھیں اسلامی فوج کے گھڑ سوار دستوں کا سالار مقرر کیا گیا۔ چاہ زمزم کی نگہبانی کا فرض بدستور حضرت عباسؓ (رسولؐ کے چچا) کے سپرد رہا۔ یہ سب لوگ مکّہ میں موروثی طور پر انہی امور کے وزیر تھے، حضورؐ کے ان اقدامات کی اس کے سوا اور کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ وہ مدینہ کی حکومت کو مکّہ کی جلاوطن حکومت تصوّر کرتے تھے۔

۲۵۹۔ جُوں جُوں اسلامی مملکت کی سرحدوں میں وسعت ہُوئی اور قبائل کی بڑی تعداد کے ساتھ اسلامی مملکت کے تعلقات قائم ہوئے، انتظامی کام میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ کام نمٹانے کے لیے باقاعدہ تنخواہ دار سیکرٹری مقرر کیے گئے۔

۲۶۰ - مدینہ میں مسجد نبوی مرکزی مسجد تھی جس میں اقامتی یونیورسٹی صُفّہ بھی قائم تھی۔ رسولِ خدا کے علاوہ متعدد دیگر اصحاب بھی مبتدیوں اور اعلیٰ درجوں کے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ مسجد نبوی میں ایک سے زاید موذن بھی تھے جن کے ذمے رات کے وقت مسجد میں لیمپ روشن کرنا اور مسجد کی صفائی وغیرہ کا کام بھی تھا۔ مسجد نبوی مدینہ کی واحد مسجد نہ تھی۔ رسول اللہؐ کی زندگی میں ہی مدینہ میں تو مزید مساجد تعمیر ہو چکی تھیں۔ رسول اللہؐ کی اس حدیث کہ :

"ہمسایوں سے علم حاصل کیجئے"

سے ظاہر ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی مساجد میں مکتب بھی قایم تھے۔

۲۶۱ - ابتدا میں جب رسولِ خدا کو مسلمانوں کی طرف سے تحائف یا صدقات موصول ہوتے تو وہ انھیں فوراً ہی لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ بعد میں ایک سٹور قائم کیا گیا جہاں یہ صدقات وغیرہ جمع کیے جاتے۔ اس سٹور کے محافظ اور نگران بلالؓ حبشی تھے جو رسولؐ کی منشا کے مطابق صدقات وغیرہ صرف کرتے تھے۔ یہی سٹور آگے چل کر بیت المال کی شکل اختیار کر گیا۔ جب زکوٰۃ فرض کی گئی اور باقاعدگی سے اس کی وصولی ہونے لگی تو بیت المال میں نہ صرف نقد رقوم بلکہ اُونٹ اور بھیڑ بکریاں، کھجوریں اور دُوسری زرعی اجناس بھی موصول ہونے لگیں۔ چنانچہ بیت المال کے ملازموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہُوا۔ نہ صرف یہ کہ چرواہے ملازم رکھے گئے بلکہ آمد اور خرچ کا حساب کتاب رکھنے کے لیے کلرک بھی بھرتی کیے گئے۔ جنگِ تبوک کی تیاری کے اخراجات کے لیے رسولِ خدا نے مسلمانوں کو زکوٰۃ پیشگی ادا کرنے کا بھی حکم دیا۔

۲۶۲ - مملکت کی بڑھتی ہُوئی دفاعی ضروریات کے پیشِ نظر مسلمانوں پر جہاد فرض کیا گیا (فرض کفایہ) مگر کسی مہم کے لیے اگر زیادہ تعداد میں فوج درکار ہوتی تو رضاکاروں کے لیے اپیل کی جاتی۔ اس طرح فوج کی مطلوبہ تعداد پُورا ہونے تک انتظار کرنا پڑتا۔ یُوں نہ صرف کافی وقت گزر جاتا بلکہ زحمت بھی اٹھانا پڑتی۔ چنانچہ رسولِ خدا کے زمانے میں ہی مستقل فوج کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ امام محمد الشیبانی نے اپنی تفسیر "السیر الکبیر" میں لکھا ہے :

"۔۔۔۔ رسول اللہؐ کی زندگی میں ہی زکوٰۃ کی آمدنی الگ رکھی جاتی تھی۔ اس شعبہ کے ملازم بھی الگ تھے اور مالِ غنیمت کا حساب کتاب رکھنے کے لیے علٰحدہ لوگ متعین تھے۔ رسولِ خدا زکوٰۃ فنڈ میں سے یتیموں، معمر افراد اور نادار خاندانوں کی امداد کرتے تھے۔ جب کوئی یتیم سنِ بلوغ کو پہنچ جاتا اور اس پر جہاد واجب ہو جاتا تو اسے زکوٰۃ فنڈ کے بجائے مالِ غنیمت سے امداد ملنا شروع ہو جاتی۔ اگر یہ نوجوان فوجی فرائض ادا کرنا پسند نہ کرتا تو پھر اسے زکوٰۃ فنڈ سے کوئی امداد نہ دی جاتی اور اسے حکم دیا جاتا کہ وُہ اپنی روزی خود کمائے۔"

۲۶۳ - مدینہ کی آبادی میں اضافہ کی وجہ سے شہر میں نہ صرف نئی منڈیوں کا قیام ناگزیر ہو گیا بلکہ منڈیوں کی نگرانی اور معاینہ کا مستقل انتظام بھی ضروری تصور کیا جانے لگا۔ چنانچہ ایک پڑھی لکھی خاتون شفاء بنت عبداللہ (عمرؓ کے والد) کو منڈیوں کے ضمن میں بعض فرائض سونپے گئے۔ چونکہ ان کے عہدے کا ٹھیک ٹھیک تعیّن نہیں ہو سکا۔ لہٰذا قیاس

کیا جاتا ہے کہ انھیں یا تو منڈیوں کی انسپکٹر جنرل یا تاجروں پر کسٹم ڈیوٹی کی کلکٹر یا کم از کم خاتون تاجروں کے لیے انسپکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ تاجروں پر درآمدی ڈیوٹی میں بعد ازاں اصلاحات کی گئیں جیسا کہ وینس میں بھی بہت بعد میں کیا گیا، تاجروں کے زمرہ کے مطابق درآمدی ڈیوٹی کی شرح مختلف تھی۔ مقامی تاجروں، غیر ملکیوں جو مملکت میں رہائش پذیر ہوں اور غیر ملکوں سے جو آتے جاتے رہتے ہوں علی الترتیب ۲½ ، ۵ اور ۱۰ فیصد کے حساب سے کسٹم ڈیوٹی وصول کی جاتی تھی۔

۲۶۴۔ ابتدا میں اسلامی حکومت کا کوئی مستقل سیکرٹریٹ نہ تھا تاہم بعد میں خطوط اور فرمانوں پر ثبت کرنے کے لیے رسول اللہ کی مُہر بنوائی گئی۔ غیر ملکی زبانوں کے ماہر افراد کو بطور مترجم اور سیکرٹری متعین کیا گیا۔ قرآن پاک کی ترتیب و تدوین، رسول اللہ (صلعم) کے لیے خطوط نویسی، حکومت کی آمدنی اور اخراجات کے حسابات رکھنے اور فوجی نظم و نسق وغیرہ کے لیے الگ الگ شعبے قائم کیے گئے اور ان میں مطلوبہ اہلیت کے افراد ملازم رکھے گئے۔

۲۶۵۔ فوجی تربیت کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ رسولِ خدا بہ نفس نفیس گھڑ دوڑ کے میدان میں جاتے اور جیتنے والوں میں انعامات تقسیم فرماتے۔ تیر اندازوں کو نشانہ بازی کی مشق کرائی جاتی۔ پتھر پھینکنے کی تربیت دی جاتی اور اسی طرح کے دوسرے فنونِ حرب میں نوجوانوں کو مہارت دلائی جاتی۔ رسولِ خدا ایسے مواقع پر اکثر موجود ہوتے جس سے نوجوانوں کی زبردست حوصلہ افزائی ہوتی۔

۲۶۶۔ اسلامی مملکت کے شعبہ اطلاعات کو خاص طور پر فروغ دیا گیا۔ ملک کے اندر اور باہر نامہ نگار مقرر کیے گئے جو مکہ، نجد، طائف اور متعدد دوسرے مقامات کے اسلام کے زیرِ نگیں آنے سے قبل بھی رسولِ خدا کو پل پل کی خبریں ارسال کرتے رہتے تھے۔

۲۶۷۔ مملکت کی مرکزی اور صوبائی انتظامیہ ضرورت اور تجربہ کے تحت قائم کی گئیں اور ان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح ہوتی چلی گئی۔ دونوں حکومتیں نہ صرف پرسکون طور پر کام کرتی رہیں بلکہ روز بروز مکمل تر ہوتی چلی گئیں۔ انسانی کمزوریاں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ ظالم و جابر فرمانرواؤں کے لیے روپیہ پیسہ ہی سب سے بڑی کمزوری ہوتا ہے۔ اور اُن دنوں زکوٰۃ کی آمدنی حکومت کا سب سے بڑا وسیلہ تھی۔ رسولِ خدا کی یہ حدیث کتنی رُوح پرور ہے کہ:

"زکوٰۃ کا مال مجھ پر اور میرے خاندان پر حرام ہے۔"

اگر کسی حکومت کا سربراہ دیانت دار ہو تو بھلا اس کے عُمال کیسے غبن اور بددیانتی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ترغیب و تحریص اور بوالہوسی کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک تحصیلدار (ٹیکس کلکٹر) ایک صوبہ سے واپس آیا اور بتایا کہ "یہ تو حکومت کے محاصل کی آمدنی ہے اور یہ مجھے لوگوں نے بطور تحفہ پیش کیا ہے۔" رسولِ خدا نے مسجد نبوی میں ایک اجلاس عام طلب کیا اور لوگوں سے خطاب کیا، رسولِ خدا نے فرمایا، کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ "یہ وہ چیزیں ہیں جو لوگوں نے مجھے ذاتی طور پر تحفہ دی ہیں۔" انھیں اپنی ماں کے گھر میں بٹھا دیجئے پھر دیکھیے کہ لوگ انھیں تحائف دینے آتے ہیں؟ ایک اور موقع پر رسول اللہ نے فرمایا: اگر تم کوئی ملازمت کرو ہر شخص یہ توقع کرے گا کہ تم اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک ادا کرو، اور تم کسی بھی معمولی سی کوتاہی کے لیے ذمہ دار بھی ٹھہرائے جاؤ گے۔ اس کے برعکس اگر دوسرے تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم فلاں کام کرو اور تمھارے مسلسل انکار کے باوجود کام تمھارے سپرد کر دیا جائے تو وہ سب اس کام کی تکمیل میں تمھارے معاون بھی ہوں گے اور اس کام میں اگر کوئی سقم رہ جائے تو بھی ان کی ہمدردیاں تمھارے

ساتھ ہوں گی۔ رسولِ خدا بعض افراد کو ان کی نااہلیت یا اہلیت کی بنا پر کسی خاص کام کی تکمیل پر مامور کرنے یا کوئی خاص کام ان کے سپرد نہ کرنے کے احکام بھی بلا تأمل جاری کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے چچا العباسؓ کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں ٹیکس جمع کرنے کا فرض نہ سونپا جائے۔ ابوذرؓ کے متعلق آپ نے یہ پابندی عاید کی کہ اسے یتیموں کی املاک کا منصرم مقرر نہ کیا جائے۔ وہ لوگوں کی صلاحیتوں کو سراہتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ رسولِ خداؐ تعلیم کے فروغ کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے بعض جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ منسوخ کر دیا اور ان سے کہا کہ وہ زرِ فدیہ کے بجائے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، تاہم نلخواندگی کسی کی ترقی میں سدِّ راہ نہ تھی۔ ابوموسیٰؓ اشعری کو جج بنا کر یمن بھیجا گیا حالانکہ وہ اَن پڑھ تھے۔ انھوں نے حضورؐ کے وصال کے بعد لکھنا اور پڑھنا سیکھا (ابنِ سعد ۴/ا ص ۸۳) غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ عمرؓ نے ابوموسیٰؓ اشعری سے کہا تھا کہ وہ کسی عیسائی کو اپنا سیکرٹری مقرر نہ کریں۔

۲۶۸۔ رسول اللہؐ کی زندگی کے مطالعہ کے دوران ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اوّل و آخر اللہ کے رسولؐ تھے انھوں نے پوری زندگی اس مشن کی تکمیل میں صرف کی جو اللہ تعالیٰ نے انھیں سونپا تھا۔ وہ ایک خاص نظریہ کے علمبردار تھے۔ حکومت اور مملکت بھی اسی نظریہ کے فروغ کے لیے وقف تھی جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا ہی اصل حاکم و مالک ہے۔ انسان کو اس کے ماتحت (نائب) کا رویہ اپنانا چاہیے اور اُس کے احکام بجا لانے چاہئیں۔ چونکہ خدا انسانی محسوسات سے ماورٰی ہے لہٰذا بندہ کو اس کے منتخب انسان ——— رسولؐ ——— پر نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسلام کا اقرار "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اسی نظریہ کا ہی مظہر ہے۔ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر اور قادرِ مطلق ہے اس کے بندوں ——— انسانوں ——— کو اس کے رسول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ خدا کے اور بھی رسول مثلاً حضرت عیسیٰؑ ——— ہو سکتے ہیں جنھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کا زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق نہیں ہے بلکہ صرف چند گوشوں سے ہے۔ لیکن رسولِ اسلام نے "دنیا اور آخرت میں نیکی" کا ارفع تصور پیش کیا۔ چنانچہ انفرادی یا معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو ان کے احکام کے دائرہ سے باہر نہیں۔

۲۶۹۔ رسول اللہؐ کی تعلیمات کے مطالعہ سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رسولؐ کی تعلیمات گردشِ زمانہ سے محفوظ کیسے رہیں اور پھر ہم تک کیسے پہنچیں۔

رسول اللہؐ کی تعلیمات کا تحفظ

۲۷۰۔ کسی بھی نبی کی تعلیمات ان کے اقوال (احادیث) ان کے اعمال اور ان کے امتیوں کے وہ اعمال ہوتے ہیں جن کی نبی نے واضح طور پر توثیق کی ہو۔

۲۷۱۔ محمد (صلعم) نے اپنی احادیث (اقوال) کے مختلف زمرے متعین کیے ہیں۔ بعض اقوال کے بارے میں انھوں نے کہا: "یہ خدا کا پیغام ہے، اسے لکھ لیجئے، حفظ کیجئے اور نماز میں اسے پڑھیے" یہ قرآن ہے۔ دیگر اقوال میں سے

بعض کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے مگر انھوں نے یہ حکم نہیں دیا کہ اس قول یا اقوال کو قرآن میں شامل کیا جائے - یہ حدیث قدسی ہے - رسول اللہ کے اعمال یا ان کے پیروکاروں کے وہ اعمال جن کی رسولؐ نے توثیق کی اصحاب رسول کے توسط سے ہی ہم تک پہنچ سکے تھے - یہ سُنّت ہے - آئیے دیکھیں کہ یہ مختلف عناصر ہم تک کیسے پہنچے!

قرآن حکیم ۲۷۲ - مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے - خدا زبان و بیان سے ماوریٰ ہے - ہم اسے ایک تشبیہ کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں - خدا کا کلام بجلی کی رَو کے مانند ہے جو بے رنگ ہے اور اسے دیکھنا بھی ممکن نہیں - رسولِ خدا مانند بلب کے ہیں جو اس تار کے ساتھ منسلک ہیں جس میں بجلی کی رَو دوڑتی ہے - یہ بلب اسی رَو کی وجہ سے روشن ہوتے ہیں - بلب کا رنگ پیغمبر کی مادری زبان ہے - بجلی کی رَو جو اللہ کا کلام ہے' اسی رنگ کی روشنی بکھیرتی ہے جس رنگ کا بلب ہو - یہ خواہ سفید ہو ، سرخ ہو ، زرد ہو یا سبز وغیرہ ، بجلی کی رَو کا خود کوئی رنگ نہیں ہوتا - پھر روشنی کی کمی بیشی بلب کی قوت پر منحصر ہوتی ہے یوں اللہ کا کلام جو زبان و صدا سے ماوریٰ ہے ہم تک بلب ——— رسولؐ خدا ——— کی زبان اور آواز میں پہنچتا ہے جس پر اس کا نزول ہوتا ہے -

۲۷۳ - قرآن حکیم کا عام نسخہ پانچ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے - یہ زبور[1] اور انجیل کے عہد نامہ جدید دونوں سے زیادہ ضخیم ہے - تاریخی اعتبار سے قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہوا بلکہ اس کا نزول ۶۰۹ سے ۶۳۲ ء تک ۲۳ سال میں مکمل ہوا - ابتدا میں جب رسولؐ اللہ پر ایمان لانے والا کوئی نہ تھا تو جو آیات بھی نازل ہوتیں انھیں لکھے بغیر رسولِ خدا اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتے - درحقیقت ابتدائی آیات نہ تو طویل تھیں اور نہ ہی ان کی تعداد کچھ زیادہ تھی - ان کے ضائع ہونے کا بھی خطرہ نہ تھا کیونکہ رسولِ خدا نزولِ وحی کے بارے میں لوگوں سے بات چیت کرتے وقت روزانہ ان آیات کو دُہراتے تھے غالباً وہ عبادت کے وقت بھی انہی آیات کی تلاوت کرتے - وہ صبح و شام دوبار نماز ادا کیا کرتے تھے (پانچ نمازوں کی ادائیگی تو کافی عرصہ بعد شروع ہوئی تھی)

۲۷۴ - جلد ہی جب حضورؐ پر ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھی اور آیاتِ قرآنی کے نزول میں بھی اضافہ ہو گیا تو اللہ کے کلام کو تمام مسلمانوں تک پہنچانا ضروری تھا - ابنِ اسحاق نے رسولِ خدا کی جو سوانح سپردِ قلم کی ہے - اس کے کچھ حصے ہم تک پہنچے ہیں - ایک مسودے میں جو ان دنوں رباط (مراکش) میں ہے یہ اہم روایت بیان کی گئی ہے کہ " جب کبھی قرآن کی کسی آیت کا نزول ہوتا تو رسولؐ اللہ پہلے مردوں کے اجتماع میں اور پھر مسلم خواتین کے اجتماع میں آ پڑھ کر سناتے " (حضورؐ کو خواتین کی تعلیم سے بھی گہری دلچسپی تھی) چونکہ ہر شخص کی یادداشت کم و بیش ہوتی ہے چنانچہ یہ بات فطری معلوم ہوتی ہے کہ بعض صحابہؓ آیات لکھ لیا کرتے تھے تاکہ فارغ اوقات میں اسے بار بار دُہرا کر حفظ کر سکیں - قرآنی آیات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا کام کب شروع ہوا ، ہمیں قطعیت کے ساتھ اس کا علم نہیں - لیکن ہم جانتے ہیں (دیکھیے اسی کتاب کا پیراگراف ۱۰۵) کہ جب حضرت عمرؓ ایمان لائے قرآن کے پاروں کی تحریری نقول موجود تھیں - عمرؓ رسولؐ اللہ کے دعویٰ نبوت کے پانچویں

---

[1] زبور کی پانچ کتابیں جن کا تعلق حضرت موسیٰ سے بیان کیا جاتا ہے - (مترجم)

سال اور تبلیغِ رسالت کے دوسرے سال دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے جو ہجرت سے کوئی آٹھ سال پہلے کا وقت بنتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے دو سورتوں ۱۸ ویں اور ۲۰ ویں کا مطالعہ کیا تھا جو نزول کے اعتبار سے ۶ ویں اور ۴۵ ویں سورتیں ہیں۔ اس اطلاع کی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ہجرت سے قبل نازل ہونے والی متعدد سورتوں میں قرآن پاک کی تحریری نقول کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ سورت ۲۵ (جو نزول کے اعتبار سے ۴۲ ویں ہے) کی آیت ۵ اور سورۃ ۵۶ (جو نزول کے اعتبار سے ۴۶ ویں ہے) کی آیت ۹، اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قرآن حکیم میں خود قرآن کے لیے لفظ "کتاب" کئی بار استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب تحریری دستاویز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت (۹۶/۱) میں حکم دیا جاتا ہے، "پڑھو"۔ اس حکم سے بھی قرآن کو ضبطِ تحریر میں لانے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲۷۵۔ رسول اللہ نے فیصلہ کیا کہ قرآن کریم کی مختلف سورتوں کو ان کی ترتیب نزول کے مطابق مشیتی انداز میں مدون نہیں کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن پاک کی تمام سورتوں کو خود ترتیب دیا (سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی جس میں قلم کی تعریف کی گئی ہے اور اسے انسانی علم کا نگران قرار دیا گیا ہے اب قرآن حکیم کی ۱۱۴ سورتوں میں ۹۶ ویں نمبر پر ہے) ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ قرآن پاک کی کوئی بھی سورت ایک ساتھ نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں۔ مورخوں کے مطابق بسا اوقات متعدد سورتوں کی آیات بیک وقت بھی نازل ہوتی تھیں۔ جب کبھی کوئی نئی آیت نازل ہوتی تو رسولِ خدا بتا دیتے کہ اسے متعلقہ سورت میں کس مقام پر رکھا جائے۔ انھوں نے نہ صرف آیات کی ترتیب بتائی بلکہ قرآن پاک میں مختلف سورتوں کی ترتیب بھی متعین کی۔ یوں سورتوں اور آیات کی ترتیب و تدوین مسلسل نظرثانی اور سخت نگرانی کی متقاضی تھی۔ چنانچہ ہر سال ماہِ صیام میں اس وقت تک نازل ہونے والا پورا قرآن عام لوگوں کے سامنے تلاوت کیا جاتا تھا۔ اصحابِ رسولؐ اپنے قرآن پاک کے نسخے بھی لے آتے تھے اور وہ رسولؐ پاک کی تلاوت سے موازنہ کرنے کے بعد ان نسخوں میں غلطیاں وغیرہ (اگر کوئی ہو) درست کر لیتے تھے۔ اپنی دنیاوی زندگی کے آخری سال میں حضورؐ نے قرآن پاک کا دو بار دَور کیا۔ یہ موازنہ اور عام لوگوں کے درمیان قرآنِ حکیم کی تلاوت "عَرضَۃ" کہلاتی تھی۔ اور عَرضَۃ الآخر تو قرآنِ حکیم کی تاریخ میں ایک یادگار ہے۔

۲۷۶۔ رسولِ کریمؐ نے قرآن کی صحت کے سلسلے میں دو اور موثر اقدام کیے۔ انھوں نے حکم دیا کہ روزانہ نماز کے دوران قرآن حکیم کی تلاوت کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کو قرآن کی آیات حفظ کرنا پڑیں اور یوں قرآن پاک پر کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری قائم نہ ہو سکی۔ رسولِ خدا نے یہ حکم بھی دیا کہ مسلمان اوّل تو رسولؐ اللہ سے یا پھر اُن اصحابؓ سے جنھیں حضورؐ نے خود اس کام پر مامور کیا تھا قرآن حکیم کا درس لیں۔ قرآن حکیم کی صحت کے سلسلے میں یہ جو تہرا طریقہ —— قرآن کو ضبطِ تحریر میں لانا، حفظ کرنا اور کسی سند یافتہ استاد سے درسِ قرآن لینا —— رسولؐ اللہ نے نافذ کیا تھا آج تک مسلمان اس پر ہی عمل پیرا ہیں۔

۲۷۷۔ چونکہ رسولِ خدا پر زندگی کے آخری وقت تک نزولِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا، لہٰذا ان کے دَورِ حیات میں قرآن پاک کا کوئی سرکاری ایڈیشن شائع نہ کیا جا سکا۔ پیغمبر کے وصال کے بعد جب نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور

قرآن میں کسی اضافہ یا تنسیخ کا کوئی امکان نہ رہا تو خلیفہ ابوبکرؓ نے ایک کمیٹی قایم کی جس کے سربراہ رسولؐ اللہ کے چیف سیکرٹری زیدؓ ابن ثابت تھے۔ اس کمیٹی کو قرآن پاک کا ایک کتاب کی شکل میں قطعی مسودہ تیار کرنے کا فرض سونپا گیا۔ زید خود حافظِ قرآن تھے لیکن مزید احتیاط کی غرض سے خلیفہ نے انھیں حکم دیا کہ وُہ جو آیت بھی ضبطِ تحریر میں لائیں انھیں دو گواہوں سے اس کی توثیق کرانی چاہیے اور پھر قرآن پاک کے دو ایسے مسودوں سے اس کی تصدیق کر لینی چاہیے جن کا موازنہ خود رسولؐ اللہ کی تلاوت (عَرْضَ) کے دوران کیا جا چکا ہو۔ خلیفہ نے عام لوگوں کو بھی حکم دیا کہ وُہ اپنے اپنے مسودے مسجد نبوی میں لا کر زید اور ان کے رفقا کو دکھائیں۔ جب کام ختم ہو گیا اور قرآن حکیم کا مکمل مسودہ تیار کر لیا گیا تو زید نے خود دو بار اس کی تلاوت کی اور (کتابت میں) جو کمی رہ گئی تھی اسے پُورا کیا۔ اس طرح جو قطعی مسودہ تیار ہوا وہ خلیفہ ابوبکرؓ کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کے بعد یہ مسودہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ ان کے بعد یہ مسودہ حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس آ گیا جو رسولؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے تھیں۔ کچھ مدت کے بعد جب حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم مقرر ہوئے تو اُنھوں نے یہ نسخہ حاصل کر کے ایک اور کمیشن کے سپرد کیا جس کے سربراہ زیدؓ بن ثابت ہی تھے۔ انھوں نے کمیشن کو ہدایت کی کہ وہ قرآنِ حکیم کی آیات کے ہجے اُس زمانے کے مطابق کر کے سات نسخے تیار کریں۔ یہ نسخے جب تیار ہو گئے تو مسجد نبوی میں عام لوگوں کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی۔ جب سب لوگوں نے اظہارِ اطمینان کیا تو ایک ایک نسخہ وسیع اسلامی سلطنت کے صوبائی مراکز کو بھیج دیا گیا۔ ان دنوں (۲۶ ہجری) اسلامی سلطنت مدینہ سے مغرب میں اُندلس (جنوبی سپین) اور مشرق میں ماوراٗ النہر (چین میں دریائے جیحوں کے دوسری طرف) تک پھیل چکی تھی۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ آئندہ صرف ان قطعی نسخوں کے مطابق مزید قرآن حکیم کتابت کرائے جائیں اور جو نسخے ان قطعی نسخوں سے ذرا بھی مختلف ہوں انھیں تلف کر دیا جائے۔

۲۷۸۔ دورِ عثمانؓ میں تیار کیے جانے والے قرآن حکیم کے ان قطعی نسخوں میں سے دو اب بھی موجود ہیں، ایک ترکی کے میوزیم توپ کاپی (استنبول) میں اور دُوسرا تاشقند کی لائبریری میں ہے۔ اس کے بعد کی صدیوں اور مختلف مسلم ممالک میں قرآن حکیم کے جو نسخے بعد ازاں تیار ہوئے وہ بھی ہم تک پہنچے ہیں۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ برائے قرآن' نے دنیا بھر سے قرآن پاک کے ۴۲ ہزار مکمل اور نامکمل نسخے جمع کیے، ان پر کوئی پچاس سال تک تحقیق کے بعد اعلان کیا گیا کہ ان میں کوئی قابلِ ذکر اختلاف موجود نہیں۔ اور اگر کوئی غلطی ملی ہے تو وہ کتابت کی غلطی نکلی۔ یہ عظیم ادارہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکی بمباری سے تباہ ہو گیا تھا۔

۲۷۹۔ یہ تو ہے اُمت تک قرآن حکیم کی ترسیل کی حکایت۔ اب قرآنی مندرجات کے بارے میں چند الفاظ:
قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، احکام، امتناع، وعدے، وعید، قصص اور تاریخی روایات ہیں۔ اللہ تعالیٰ بسا اوقات صیغہ متکلم ——— مَیں یا ہم ——— میں کلام کرتا ہے اور بعض اوقات اپنے لیے صیغہ واحد غائب ——— وہ ——— کا استعمال کرتا ہے۔ قرآن پاک کا اوّلین مخاطب نبی یعنی خدا کا پیغمبر ہے۔ کلام اللہ میں بعض جگہ تلمیح اور استعارے سے کام لیا گیا ہے جو اللہ کا رسولؐ، اللہ کا مقرب ترین خادم ہی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اسے ہی لوگوں تک کلام اللہ کی

ترسیل کا فرض سونپا گیا ہے۔ اور غالباً یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بادشاہ کا طرزِ تکلم عام لوگوں کی طرح نہیں ہوتا۔ بادشاہ دورانِ کلام "میں کہتا ہوں" یا "بدولت فرماتے ہیں"، "شاہ کہتا ہے"، "تمہارا مالک فرماتا ہے"، وغیرہ جملے بدل بدل کر استعمال کرتے ہیں۔ بلاشبہ قرآن کا طرزِ تکلم دلربا اور پرشکوہ ہے۔ اس سے کسی کو حتیٰ کہ رسولؐ کے دشمنوں کو بھی مجالِ انکار نہیں۔ قرآن نثر میں ہے مگر اس میں شاعری کی تمام رعنائیاں حتیٰ کہ ردیف قافیہ وغیرہ تک موجود ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی آیت کے کسی لفظ سے ایک حرف تک ساقط ہو تو اس کی موسیقیت درہم برہم ہو جاتی ہے اور فوراً غلطی کا پتہ چل جاتا ہے۔ مسلمانوں نے تجویدِ قرآن کا فن ایجاد کیا جو موسیقی کی ایک شاخ ہے، اور دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ فن آج بھی زندہ ہے اور اسے ہر طرح سے سراہا جاتا ہے۔

۲۸۰۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں کی کتاب مقدس عہد نامہ قدیم بلکہ اس کا اہم ترین حصہ زبُور بھی ایک نسل کی تاریخ پر مشتمل ہے جس میں کہیں کہیں اللہ کے احکام بھی دیے گئے ہیں۔ دوسرے انبیا کی کتابوں میں بھی یہودیوں کی عصری تاریخ ہی بیان کی گئی ہے۔ انجیل (عہد نامہ جدید) حضرت عیسیٰؑ کی سوانح پر مشتمل ہے جو ان کے حواریوں اور ان کے پیروکاروں نے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد محض اپنی یادداشت کے سہارے تیار کی ہے۔ لیکن قرآن کا معاملہ اس طرح نہیں بلکہ قرآن خود رسول اللہؐ نے جو دین متین کے بانی ہیں، نزول کے ساتھ ہی اپنے سیکرٹریوں کو لکھوایا اور اس کی صحت اور بصحت ترسیل کے لیے موثر اقدامات کیے۔ ہم تک یہ بالکل اصلی شکل میں پہنچا ہے۔ گزشتہ چودہ سو سالوں میں اس کے الفاظ اور گرامر تو کیا اس کا ایک حرف بھی بدلا نہیں جا سکا۔ اس کا یہ خوشگوار نتیجہ ہے کہ جو لوگ آج عربی کے اخبارات پڑھ سکتے ہیں وہ قرآن پاک کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ترکی میں پانچ لاکھ حافظِ قرآن مرد اور خواتین موجود ہیں۔ موریطانیہ کی اسّی فیصد مسلمان آبادی حافظِ قرآن ہے اور دُنیا بھر میں کروڑوں حفّاظ موجود ہیں۔

حدیث اور سُنّہ

۲۸۱۔ رسولِ خدا کے اقوال جو انھوں نے خود قرآن میں شامل نہیں کرائے 'حدیث' کہلاتے ہیں۔ اگر رسول اللہؐ نے یہ کہا ہو کہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" تو اسے 'حدیث قدسی' کہیں گے۔ قولِ رسولؐ کو صرف 'حدیث' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کے افعال و اطوار سنّت کی بنیاد ہیں۔ لیکن بسا اوقات حدیثِ رسولؐ اور سُنّہ باہم یُوں مل جاتے ہیں کہ انسان 'حدیث' اور 'سُنّہ' کو ہم معنی تصور کرنے لگتا ہے۔ 'حدیث' رسول اللہؐ کے افعال و اقوال دونوں پر محیط ہے۔ اسی طرح سنّتِ رسولؐ بھی آپ کے افعال و اقوال کا احاطہ کرتی ہے۔ حضورؐ کے افعال سے مراد وہ کام ہیں جو نبیؐ نے خود کیے۔ صحابہؓ کے ایسے افعال بھی جو رسول اللہؐ کے علم میں آئے اور حضورؐ نے ان کی توثیق کی 'سُنّتِ نبوی' میں شامل تصور ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبیؐ کے صحابہ کرامؓ میں جو امور مروّج تھے وُہ بھی سنّت سے کم نہیں، جیسا کہ ایک قانونی مقولہ ہے: "جب بات ناگزیر ہو، اور اگر کوئی خاموش رہے تو اس کی خاموشی کو رضا تصور کیا جانا چاہیے۔"

۲۸۲۔ رسولؐ کی احادیث اور سنّت کی ترتیب و تدوین ایک الگ باب ہے۔ احادیث کا ایک حصہ تو خود حضور اکرمؐ کے حکم سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ ان میں رسولِ خدا کے خط، معاہدے، مدینہ سے دُور موجود عمّال کے لیے ہدایات اور رسولِ خدا کی جاری کردہ اسناد وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں، اور ان میں رسولؐ کے ذاتی ملازم حضرت انسؓ کی مثال واضح ترین ہے کہ لوگوں نے حضورؐ کی احادیث ضبطِ تحریر میں لا کر رسولِ خدا کو پیش کیں اور حضورؐ نے خود ان کے مندرجات کی تصیح فرمائی۔ تقریباً ایک

درجن صحابہ کرامؓ ایسے ہیں جنھوں نے نبیؐ کی زندگی میں ہی اُن پر اپنی یادداشتیں مرتب کیں۔ اس سے بھی زیادہ ـــــ کم از کم پچاس ـــــ اصحابؓ ایسے ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کے وصال کے فوراً بعد وہ سب کچھ تحریر کیا جو رسول اللہؐ کے بارے میں ان کے علم میں تھا۔ ایسے لوگ تو بے شمار ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کی زیارت نہیں کی تھی مگر انھیں اصحابِ رسولؐ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے صحابہؓ سے رسول اللہؐ کے متعلق سوالات دریافت کیے اور ان کے جوابات کو ضبطِ تحریر میں لاکر اس عظیم علمی خزانہ کو مدون کیا۔ حدیث پاک کے ایک مسلّمہ ماہر بیان کرتے ہیں کہ ایسے صحابہؓ کی تعداد جنھوں نے کم از کم ایک حدیثِ رسولؐ بیان کی ہے، ایک لاکھ سے زاید ہے۔ اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ رسولِ خداؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار فرزندانِ توحید کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا تھا۔

۲۸۳۔ پہلی نسل میں تو صرف اصحابِ رسولؐ کی یادداشتیں ہی سامنے آسکتی تھیں۔ البتہ دوسری نسل میں اگر کسی طالب علم نے ایک سے زاید صحابہ کرام سے تحصیلِ علم کی ہو تو وہ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ علم کو زیادہ جامع انداز میں مرتب کرسکتا تھا۔ تیسری نسل میں تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کیا جاسکتا تھا اور حدیث و سنّت کی تدوین و ترتیب میں بالکل یہی ہوا ہے۔

۲۸۴۔ چونکہ قرآنِ حکیم کی طرح احادیثِ نبویؐ کی ترتیب و تدوین پر موثر کنٹرول ممکن نہیں تھا لہٰذا غلط فہمی، اغلاط بلکہ اس سے بھی بدتر امکانات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ان امکانات کے پیشِ نظر ہی مسلمانوں نے احادیث کی انفرادی روایت کے نقد و جرح کے لیے سائنسی انداز ایجاد کیا جس کی ابتدا اصحابِ رسولؐ کے زمانہ میں ہی ہوچکی تھی۔ احادیث کے راویوں کی سوانح بڑی محنت سے تیار کی گئیں جن میں راوی کی شہرت، دیانت یا ضعیف ہونے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے اساتذہ اور شاگردوں کی مکمل تفصیل اور دوسری معلومات فراہم کی گئیں ـــــ تیسری اور بعد میں آنے والی نسلوں کا تو ذکر ہی کیا ـــــ صرف دوسری نسل میں بھی محض یہ کہنا کافی نہ تھا کہ "رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے" بلکہ راوی کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ "میں نے اپنے فلاں استاد سے جو اصحابِ رسولؐ میں سے ہیں سُنا ہے کہ . . . . . " تیسری نسل میں یہی بات یوں کہنا پڑی "میں نے اپنے فلاں استاد سے سنا ہے جس نے اپنے فلاں استاد کو جو صحابیؓ تھے کہتے ہوئے سُنا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا . . . . " فطری طور پر کسی بھی روایت کے لیے راویوں کی فہرست نسلاً بعد نسلٍ طویل تر ہوتی چلی گئی۔

۲۸۵۔ حدیث کی صحت پر کنٹرول کا ایک اور طریقہ بھی تھا: اگر کوئی حدیث رسولِ پاکؐ کے ایک سے زاید صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور سبھی نے ایک ہی بات کہی ہے، تو ایسی حدیث کسی ایک صحابی کی روایت کردہ حدیث کے مقابلے میں زیادہ معتبر تصور کی جائے۔

۲۸۶۔ تدوین کے دوسرے طریقوں کے علاوہ احادیث کو راویوں یا پھر موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا جاسکتا تھا لیکن ہر صورت میں ایک ایک حدیث کے ذرائع کا تفصیلی ذکر ناگزیر تھا۔

۲۸۷۔ مختلف راویوں سے مروی احادیث میں تضاد بھی ممکن تھا۔ یہ تضاد مختلف نسلوں کے راویوں کے سہو سے

رونما ہوسکتا تھا یا پھر رسول اللہؐ نے کسی امر پر اپنے رویّہ میں تبدیلی پیدا کرلی ہو اور اپنا سابق حکم کالعدم قرار دے دیا ہو ایسے اور اسی نوع کے دیگر امور سے "علم الحدیث" کی کتب میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ رسولِ خداؐ کی احادیث و سنّت کے بارے میں جتنی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں تاریخِ عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سیرتِ رسولؐ

۲۸۸۔ رسولِ خداؐ پر کتابوں کی تیسری قسم اُن کی سوانح پر مشتمل ہے جو ان کے بعد تحریر کی گئیں۔ اس زمرہ کی اوّلیں کتب آنحضورؐ کے صحابہؓ کے بیٹوں نے لکھی ہیں' ان میں عُروہ ابن الزبیر بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے بعض حصّے ہی ہم تک پہنچے ہیں جن کا ذکر بعد کی نسلوں کے مصنّفوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ رسولِ خداؐ کی قدیم ترین سوانح جس کے قلمی نسخے کے بعض حصّے ہم تک پہنچے ہیں ایک تابعی (جس نے صحابہ رسولؐ اور ان کے پیروکاروں کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی ہے) کی تحریر کردہ ہے۔ یہ مصنّف ابنِ اسحاق ہے جس کا انتقال ۷۶۸ء (۱۵۱ھ) میں ہوا تھا۔ ایسی کتب کو "سیرت" کہا جاتا ہے۔ وہ ان کتابوں سے ملتی جلتی ہیں جن میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے حالات ان کے حواریوں نے بیان کیے ہیں۔ چونکہ پیغمبرؐ کے ان سوانح نگاروں نے اپنے ماخذ تفصیل سے بیان کیے ہیں، لہٰذا ان کی صحت اور ان کتب میں مذکور حقائق کی صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

وثیقہ جات نبویؐ

۲۸۹۔ وثیقہ جاتِ دورِ نبویؐ دو قسم کے ہیں:
پہلی قسم کتبوں پر مشتمل ہے، خصوصاً جو مدینہ، مکہ اور طائف وغیرہ میں دستیاب ہوئے ہیں، بعض ایسے کتبوں پر تاریخیں بھی ملی ہیں۔ مثلاً طائف کے نزدیک ایک بند ہے جس پر حضرت معاویہؓ جو خود ایک صحابی تھے کے گورنر کا نام معوسَن کے کندہ ہے۔ کئی کتبے خصوصاً جو ابتدائی دَور کے ہیں تاریخ سے محروم ہیں۔ ان میں سے بعض تو رسولِ خداؐ کے دَور کے ہیں۔ (میں نے ایسے بعض کتبوں کے عکس شائع کئے ہیں اور بعض کا مطالعہ کیا ہے جو میرے خیال کے مطابق ۵ ہجری میں جنگِ خندق کے وقت کے ہیں۔ مصنّف)

۲۹۰۔ وثیقہ جاتِ نبویؐ کی دُوسری قسم خطوط پر مبنی ہے۔ پانچ ایسے خطوط کے جو نبیؐ سے منسوب کیے جاتے ہیں، اصل مسودے ہم تک پہنچے ہیں' ان میں سے ایک خط جو مقوقس[1] کے نام ہے استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں موجود ہے۔ مصر کے قدیم مخطوطوں میں خلیفہ عمرؓ کے دور کے متعدد خطوط ملے ہیں، جو ۲۲ھ اور اُس کے بعد لکھے گئے تھے۔ چونکہ ان پر تاریخیں درج ہیں لہٰذا ان میں جعل سازی کا امکان معلوم نہیں ہوتا۔

۲۹۱۔ رسولِ خداؐ کی بعض ذاتی استعمال کی اشیا بھی ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مُوئے مبارک تو متعدد ممالک میں موجود ہیں استنبول، ہندوستان اور بعض دیگر ممالک میں رسولِ خداؐ کا جُبّہ یا دُوسرے لباس موجود ہیں، تاہم ان اشیا کے حقیقی ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ رسولِ خداؐ کی تلوار ——— ذوالفقار ——— اسلام کے اوائل میں ہی ٹوٹ گئی تھی مگر استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں یہی ذوالفقار بالکل درست حالت میں موجود ہے۔ رسولِ پاکؐ کے

---

[1] مقوقس مصر میں قبطیوں کا سردار تھا اور رسولِ خداؐ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ (مترجم)

منسوب یہ اشیا اگر واقعی اصلی ہوں تو ان سے اس دور کی صنعتی تاریخ پر کسی حد تک روشنی پڑ سکتی ہے۔ مگر جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے یہ کچھ زیادہ وقعت کی حامل نہیں۔

عقل اور فوق الفطرت

۲۹۲۔ انسانی تاریخ میں برگزیدہ انسانوں کی، خواہ وہ نبی ہوں یا ولی یا کسی مذہب کے بانی ہوں، زندگی ما فوق الفطرت باتوں سے خالی نہیں ہوتی۔ ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، زرتشت اور بدھ وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ رسولِ اسلام کی زندگی بھی ما فوق الفطرت واقعات سے خالی نہیں۔ رسول اللہؐ کے بعض عظیم معجزے بیان کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مُردے کو زندہ کیا۔ انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر جُڑ گیا۔ خوراک کی معمولی سی مقدار لاتعداد لوگوں کے لیے کافی نکلی۔ انھیں حظیرۃ القدس[1] کے بلند ترین مقام پر لے جایا گیا اور وہ خدا کے حضور جا کر واپس زمین پر تشریف لائے۔ اسی طرح کے کئی اور معجزوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اہلِ ایمان نبیؐ کے ان معجزات پر بجا طور پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

۲۹۳۔ تاہم چند باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ قرآن کے مطابق معجزہ پیغمبر نہیں خدا دکھاتا ہے۔ رسولِ خدا ہمیشہ کہا کرتے تھے: میں خود کچھ نہیں کر سکتا، اللہ کے لیے جو اس کائنات کا خالق ہے، کوئی بات بھی معجزہ نہیں، وہ کہتا ہے کُن (ہو جا) فیکون (پس وہ ہو جاتا ہے)۔ اللہ کے لیے علت اور معلول کا کوئی سوال نہیں، نہ ہی کسی مثال کی حاجت ہے۔ وہ جب چاہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے بعض نبیوں نے حیرت انگیز کام کیے ہیں، اور بعض نبیوں کو ان کے رفقا نے ہی قتل کر ڈالا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی بھی نہیں بچائی۔

۲۹۴۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ معجزوں کی اصل احادیث ہمیشہ اضافی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا اس بات پر ہمیشہ اتفاق رہا ہے کہ کسی رسولِ خدا کے لیے معجزے ناگزیر نہیں ہیں۔ پھر معجزات سے ہر کسی کو قائل نہیں کیا جا سکتا[2]۔ حضرت ابوبکرؓ نے

---

[1] واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے جہاں رسولِ اکرمؐ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے۔ (مترجم)

[2] معجزہ کسی ما فوق الفطرت چیز کے معنوں میں کسی دعوے یا اصول کی صداقت کا مسلمہ ثبوت قرار نہیں پا سکتا۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص کہتا ہے: "دو اور دو پانچ ہوتے ہیں کیونکہ میں ننگے پاؤں آگ پر یا پھر پانی پر چل سکتا ہوں"۔ ان دونوں باتوں میں کوئی معقولیت نہیں، دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں پانچ نہیں۔ یہ بات ریاضی کے اصولوں سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ آگ پر ننگے پاؤں چلنا یا ڈوبے بغیر پانی پر چل کر کھانا، اگر کبھی ایسا ہو ہی جائے، قانونِ فطرت میں اس کا ضرور کوئی سبب اور وجہ ہوگی کیونکہ ہماری یہ دنیا علت و معلول سے عبارت ہے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار آتا ہے کہ (۱۷/۷۷، ۳۳/۶۲، ۳۵/۴۳، ۴۸/۲۳) اللہ قانونِ فطرت کو تبدیل نہیں کرتا (گو وہ پسند کرے تو ایسا کرنے پر بالکل قادر ہے) اگر کسی ما فوق الفطرت واقعہ کی وجوہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتیں تو وہ اسے معجزہ قرار دیتا ہے، خواہ یہ واقعہ کسی رسول، ولی یا کسی شیطانی ذہن کے حامل انسان سے ہی کیوں نہ سرزد ہوا ہو۔ کوئی سوچ و سمجھ سے عاری ذہن ہی ایسے کسی واقعہ کو (باقی بر صفحہ آیندہ)

کسی معجزہ کے بغیر اسلام قبول کر لیا مگر ابوجہل جیسے تو معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ بعض افراد خارق عادات واقعات کو دیکھ کر اچھل پڑتے ہیں اور وہ معجزہ دکھانے والے کی ہر بات فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔

۲۹۵ ۔ مزید برآں یہ ممکن ہے کہ کوئی عجیب وغریب فطری واقعہ محض تجسس اور تعریف کے معمولی جذبات پیدا کرنے کے سوا کسی غیر معمولی توجہ کا مستحق نہ ٹھہرے مگر یہی واقعہ اس وقت زبردست اہمیت اختیار کر سکتا ہے جب کسی کو اس کی "ضرورت" ہو۔ فرض کیجئے کہ چاند کے مادوں میں اندرونی احتراق کی وجہ سے دھماکہ ہوتا ہے اور چاند دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے مگر اس کی کششِ ثقل کی وجہ سے دونوں ٹکڑے دوبارہ باہم مل جاتے ہیں، تو ہم کہیں گے کہ یہ ایک عجیب مگر فطری واقعہ ہے لیکن اگر یہی واقعہ اس وقت رونما ہو جب ایک پیغمبر کے دشمن اسے کہہ رہے ہوں کہ "اگر صرف ایک خدا ہے اور وہ ہر شے پر قادر بھی ہے تو اسے کہو کہ وہ چاند کے دو ٹکڑے کرے۔" اور پھر یہ واقعہ رونما ہوتا ہے تو ہم اسے معجزہ ہی کہیں گے۔ معجزہ محض عجیب وغریب واقعہ نہیں بلکہ یہ کفار کے مطالبہ پر رونما ہوا ہے۔ ورنہ خدا کے لاشریک ہونے اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ایک سے زاید "خدا" ہوتے اور چاند کا "خدا" اسے سزا دینا چاہتا تو بھی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔

۲۹۶ ۔ ایک اور نکتہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ غیر معمولی واقعات محض نبیوں تک محدود نہیں ہیں۔ اگر ایسا واقعہ کسی نبی کے ہاتھوں رونما ہو تو ہم اسے معجزہ قرار دیتے ہیں (معجزہ کے لغوی معنی ایسے واقعہ کے ہیں جس کے سامنے دوسرے عاجز ہوں یعنی وہ اس نوع کا کام نہ کر سکیں) اگر ایسا کسی ولی سے رُونما ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔ شر پسندوں کو بھی خلافِ عادت واقعات کی قوت سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اگر کسی "شیطان" سے ایسا واقعہ منسوب ہو تو اسے استدراج (دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے خفیہ طریقہ سے کوئی کام کرنا) کہا جائے گا۔ تو پھر کسی سچے نبی اور جھوٹے مدعی کے درمیان نشانِ امتیاز کیا چیز ہوئی؟

۲۹۷ ۔ ان وجوہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ قرآن کبھی رسولِ اسلام کے معجزات پر اصرار نہیں کرتا بلکہ بار بار اہلِ ایمان کو غور و فکر، تدبر، تعقل، دلیل اور استنباط کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کے مطابق ایمان تصدیقٌ بالقلب کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دو اور دو پانچ کے اصول کی تصدیق تسلیم کرے گا۔ دو اور دو کو چار ثابت کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت نہیں بلکہ ریاضی کے ذرا سے فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح دعوئ نبوت، خدا کی توحید، موت کے بعد زندگی اور یوم حساب وغیرہ پر ایمان لانے کے لیے معمولی فہم و دانش کے حامل انسان کے لیے بھی کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ نبیوں کے معجزے تاریخی حقائق ہیں مگر میرے ناقص فہم کے مطابق یہ معجزے ان نبیوں کی تعلیمات کی صداقت کا کوئی منطقی ثبوت نہیں ہیں، یہ تعلیمات ان معجزوں کے بغیر بھی سچی اور برحق ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ اس طرح کے معاملات میں قرآن نے لفظ "معجزہ" استعمال نہیں کیا بلکہ اسے "آیات" (نشانیاں، عظیم واقعات) قرار دیا ہے۔ (مصنف)

نام ہے محض جذباتیت نہیں کیونکہ قرآن ترقی یافتہ انسانیت کے لیے ہے۔ قدیم وحشی اور غیر مہذب انسانوں کے لیے نہیں جن کی عقل و دانش ابھی ابتدائی مراحل میں تھی اور وہ فطرت کے ان عظیم قوانین کو دریافت نہیں کر پائے تھے جو بعد میں روبہ عمل آئے۔ وہ تو صرف خواب میں ہی چاند پر جانے کا تصور کر سکتے تھے۔

۲۹۸۔ چنانچہ رسول اللہ سے منسوب معجزے ان کی کتاب زندگی کے حاشیہ میں درج واقعات ہیں، ان کی زندگی کا نچوڑ تو ان کی تعلیمات ہیں۔

باب ۱۱

رسولِ اسلامؐ کی تعلیمات

۲۹۹ - ہندوستان کے ایک برہمن ماہر الٰہیات کے مطابق "معاشرے کا رسم و رواج بہترین قانون ثابت ہوتا ہے"چنانچہ مذہبی احکام میں کوئی تبدیلی جو عوام کے لیے قابلِ قبول ہو، خواہ یہ کسی ایک علاقے تک ہی محدود کیوں نہ ہو، مذہبی قانون کی خلاف ورزی متصور نہیں ہوگی۔ یہودیوں میں ربی (یہودی عالم) کی رائے کو زبور کے قوانین و احکام کے الفاظ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ عیسائی تو اس سے بھی آگے چلے گئے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ پادریوں کا اجلاس روح القدس کے سائے میں منعقد ہوتا ہے۔ قبل ازیں منحرفین کو پادریوں کی کونسل سے نکال دیا جاتا تھا مگر اب (کسی معاملہ پر) محض کثرت رائے کو ہی کافی تصور کیا جاتا ہے اور پوری کونسل کا اتفاق رائے بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اور یوں کسی بھی عقیدہ یا رواج کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

۳۰۰ - صرف اسلام ہی دین کی حرمت کو زبردست اہمیت دیتا ہے۔ دوسرے ادیان کے برعکس اسلام وہ واحد دین ہے جو بڑے فخر سے اعلان کر سکتا ہے کہ اس کے عقاید اور طریقِ عبادت کے ضمن میں دینی قوانین آج بھی وہی ہیں جو رسول اللہ کے زمانے میں تھے۔ انفرادی بھول چوک ممکن ہے مگر ایسا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا عمل عین اسلام ہے۔ اسلام میں بعض ایسے فرقے یقیناً موجود ہیں جنھوں نے ابھی تک زمانہ جاہلیت کے بعض رواج، خصوصاً وراثت کے بارے میں، سینے سے لگا رکھے ہیں تاہم وہ رضا کارانہ طور پر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا رواج اسلام کے مطابق نہیں ہے۔

۳۰۱ - ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی بنیادی دستاویزات خصوصاً قرآن نہایت قابلِ اعتماد ذرائع سے اپنی اصلی زبان اور اصلی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ جاننا نہایت سہل ہے کہ رسولِ اسلامؐ نے کیا تعلیم دی ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات کو کوئی شخص قبول یا مسترد تو کر سکتا ہے مگر وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات وہی ہیں جو محمد (صلعم) نے ودیعت کی ہیں۔

۳۰۲ - کسی علاقائی یا قومی مذہب اور آفاقی دین میں بڑا فرق ہے۔ پھر عارضی اور دائمی مذہب پر بُعد المشرقین ہوتا ہے، قرآن اور حدیث میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ محمد (صلعم) اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۳۰۳ - مذہبی عقاید پر ایمان اور قوانین کی پابندی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ایک روح اور دوسرا جسم کے لیے ہے۔ قرآن اور حدیث نے ناگزیر اصول و قواعد بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جبکہ باقی انسان کی صوابدید اور استطاعت پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ پر ایمان ناگزیر ہے مگر ایک عام آدمی اور ایک فلاسفر کے ذہن میں خدا کا یکساں تصور ممکن

نہیں۔ خوش قسمتی سے خدا ہم پر ہماری استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جیسا کہ قرآن حکیم (۲۸۶/۲) میں آیا ہے۔

۳۰۴۔ ایک روز رسولِ خدا نے خود ہی اپنی تعلیمات کا خلاصہ بیان فرمایا۔ اس ضمن میں جو حدیث ہم تک پہنچی ہے وہ احادیث کی معتبر ترین کتب بخاری اور مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ اس حدیث کا ایک ایک لفظ قرآن پاک پر (۲۸۵/۲، ۱۳۶/۴) مبنی ہے۔ حدیثِ رسولؐ یہ ہے:

ایک روز ایک اعرابی نے رسول اللہ سے دریافت کیا: "ایمان کیا ہے؟" رسولؐ نے جواب دیا: ایک اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یومِ حشر اور اس حقیقت پر ایمان کہ اچھائی یا برائی سب اللہ کی طرف سے ہے۔

پھر اس اجنبی نے پوچھا: "اسلام کیا ہے؟" رسول اللہؐ نے جواب دیا: نماز قایم کرنا، رمضان میں روزے رکھنا، بشرطِ استطاعت حج کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔

اجنبی نے پھر سوال کیا: "احسان (ان سب عقاید کی زینت) کیا ہے؟" جواب ملا: تم اس طرح نماز ادا کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو خیر اتنا تو خیال رکھو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

جب یہ اجنبی چلا گیا تو رسول اللہ نے حاضرین سے فرمایا: "دیکھو وہ کون ہے؟" مگر اجنبی تو غائب ہو چکا تھا۔ اس پر پیغمبرؐ نے کہا: وہ جبرائیل تھا جو تمھیں اسلام سکھانے آیا تھا۔

یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ایک عظیم الشان عمارت کی مانند ہے جس کی چھت ہمارا ایمان ہے۔ یہ چھت چار ستونوں ــــ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ــــ پر قایم ہے۔ اس عمارت کی تزئین و آرائش اسلام کے عقاید اور طریقِ عبادت پر دل و جان سے عمل پیرا ہونا ہے۔

۳۰۵۔ حضورِ اکرمؐ کی تعلیمات کا دلفریب، قابلِ فہم اور منطقی خلاصہ یہ ہے: انسان کو اپنے خالق خدائے واحد پر ایمان رکھنا چاہیے اور اس کے احکامات کی پابندی کرنی چاہیے۔ وہ اعلیٰ و برتر اور ماورائے ادراک ہے۔ اس کے احکام ہم تک ایک فرشتہ اور پھر نبی کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔ پھر یومِ قیامت ہے جو یومِ حساب بھی ہے۔ کوئی چیز بالذات اچھی یا بُری نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہے جو کسی چیز کو بُری اور کسی کو بھلی ٹھہراتا ہے۔

۳۰۶۔ اسلام کے نہایت سادہ عقیدے میں جو چیز دل کو لگتی ہے اور روحانی تحریک کا باعث بنتی ہے وہ اس دین کی آفاقیت اور تسلسل ہے جس میں تحمل اور رواداری رچی بسی ہے۔ اسلام کا خدا اِس یا اُس خاندان کا "خدا" نہیں بلکہ وہ پوری دُنیا کا، پوری کائنات کا خدا ہے۔ مسلمان کے لیے تمام الہامی کتب پر ایمان ناگزیر ہے صرف ایک کتاب یعنی قرآن پر نہیں۔ اسے تمام رسولوں پر بھی ایمان کا اعلان کرنا پڑتا ہے محض محمدؐ رسول اللہ پر نہیں۔ حالانکہ اگر اسلام محض قرآن اور رسولؐ اللہ پر ایمان تک بھی محدود ہوتا تو اس کی معقولیت میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن نہیں! اسلام میں وسیع القلبی اور عالی ظرفی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جس کی ادیانِ عالم کی تاریخ میں

کوئی مثال نہیں ملتی۔ آدمؑ سے محمدؐ تک تمام انبیا جو کسی بھی زمانہ میں کسی بھی قوم یا نسل کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں اور تمام کتابیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی زبان میں کسی بھی پیغمبر پر نازل کی ہیں، سب اسلام کے انبیا اور اسلام کی کتابیں ہیں۔ قرآن بار بار فرماتا ہے کہ اللہ نے ہر دور میں تمام قوموں کے لیے انبیا مبعوث کیے ہیں۔ قرآن میں متعدد انبیا کے نام بھی آئے ہیں اور غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی پیغمبر بھیجے گئے ہیں۔

۳۰۷۔ یہ کہنے کی غالباً کوئی ضرورت نہیں کہ جب کوئی ایک قانون ساز ایک ہی موضوع پر بار بار قوانین کا نفاذ کرتا ہے تو سب سے آخر میں نافذ کیا جانے والا قانون ہی موثر تصور ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سابق قانون سے ہی چمٹا رہے اور رائج الوقت قانون سے پہلو تہی کرے تو اسے قانون کا پابند شہری قرار نہیں دیا جا سکتا اگرچہ تمام قوانین ایک ہی قانون ساز نافذ کرتا ہے مگر ایک قانون دوسرے کی جگہ لیتا ہے اور بعد میں نافذ شدہ قانون ماقبل کو منسوخ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت مسلمان تمام الہامی کتب اور اللہ کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر وہ اللہ کی جدید ترین الہامی کتاب (قرآن) پر عمل کرتے ہیں۔

۳۰۸۔ عام لوگوں کی اطلاع اور موازنہ کے لیے مسیحی عقیدہ کا متن یہاں درج کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا جو یہ ہے:

"[1]میں اعتقاد رکھتا ہوں قادرِ مطلق باپ پر جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور اس کے اکلوتے بیٹے ہمارے خداوند یسوع مسیح پر کہ وہ رُوح القدس سے مجسم ہو کر کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پنطُس پلاطُس کی حکومت میں دُکھ اٹھایا، صلیب پہ کھینچا گیا، مر گیا اور دفن ہوا۔ تیسرے دن مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ آسمان پر چڑھ گیا اور خدا باپ قادرِ مطلق کے داہنے ہاتھ بیٹھا ہے، جہاں سے وہ زندوں اور مُردوں کے انصاف کرنے کو آئے گا۔ میں اعتقاد رکھتا ہوں رُوح القدس پر، پاک کلیسیائے عام پر، مقدسوں کی رفاقت، گناہوں کی معافی جسم کے جی اُٹھنے اور ہمیشہ کی زندگی پر۔ آمین"

۳۰۹۔ ہمارے دَور کے ان دو بڑے مذاہب کی دُعا کا معلوماتی موازنہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

رسولِ خدا نے فرمایا: سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بغیر کوئی نماز روا نہیں۔ سورہ فاتحہ یہ ہے: اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا	پہاڑ پر اپنے وعظ میں حضرت عیسیٰؑ نے کہا: اور دعا کرتے وقت غیر قوموں (کفار) کے لوگوں کی طرح بک بک نہ کرو..... کیونکہ تمہارا باپ تمہارے مانگنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ تم کن کن چیزوں کے محتاج ہو۔ پس تم اس طرح دعا کیا کرو: اے ہمارے باپ تُو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے، تیری

[1] مسیحی عقیدہ کے متن کا یہ اُردو ترجمہ پادری فلپ جان ایکٹن ڈائرکٹر لٹریچر متحدہ میتھوڈسٹ کلیسیائے پاکستان کی مرتب کردہ "عبادت کی کتاب" مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ یوم جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا، نہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے۔ آمین (القرآن ۱/۱-۷)

بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض معاف کر، اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ بُرائی سے بچا کیونکہ بادشاہی، قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہیں۔ (متی ۶/۷-۱۳)

۳۱۰۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق "نیکی اور بدی کے تعین" پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کیا اس فارمولا کا تعلق قضا و قدر سے ہے؟ یہ یقینی نہیں۔ نیکی اور بدی کا تعین خدا کا معاملہ ہے۔ یہی اس کے لغوی معنی ہیں۔ اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ ایک ہی بات کسی کے لیے بُری اور کسی کے لیے اچھی ہو سکتی ہے۔ بھیڑیا خرگوش کو ہضم کر لیتا ہے، یہ ایک کے لیے غذا (لہٰذا بھلائی) ہے اور دوسرے کے لیے موت (برائی) ہے۔ کسی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ فاتح کے حق میں اچھا ہوتا ہے مگر شکست خوردہ فریق کے لیے تباہ کن (بُرائی) ثابت ہوتا ہے۔ قتل تک بھی ہمیشہ بُرائی نہیں ہوتا۔ کوئی تمنچہ کسی پر فائر کر دے، پاگل کسی کو گولی مار دے، کوئی شکاری پرندے پر فائر کرتے وقت کسی انسان کی جان لے لے، سرکاری جلاد مجرم کو گولی کا نشانہ بنا دے، کوئی سپاہی دورانِ جنگ دشمن کے سپاہی کا صفایا کر دے ——— ان مختلف افراد کی طرف سے کسی کی جان لینے میں کتنا فرق ہے! کس کے لیے کوئی کام اچھا ہے اور کس کے لیے وہی کام بُرا، عام سادہ معاملات میں تو عقل سلیم اور ضمیر کی رہنمائی کافی ہونی چاہیے مگر پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے معاملات میں، انسان کو یہ بات اللہ پر چھوڑ دینی چاہیے۔ کیا "نیکی اور بدی کا تعین خدا کا کام ہے" کے فارمولا کی رُوح یہی ہے؟ میں اس کی تصدیق کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آئیے ہر قاری کو خود ہی اس کا تعین کرنے دیں۔

۳۱۱۔ مگر میں "فعل مختاری" اور قضا و قدر کے مسئلہ پر چند الفاظ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔ ہر شخص پوچھنا چاہتا ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے ہر بات کا پہلے سے تعین کر رکھا ہے تو پھر مجھے سزا کس بات کی دی جائے گی؟" لیکن کوئی یہ پوچھنے پر آمادہ نہیں کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے (قضا و قدر کے تحت) ہر بات کا تعین پہلے سے کر دیا ہے تو پھر مجھے نیکی کی جزا کیوں دی جائے گی؟" دونوں صورتوں میں ہمارا عمل میکانکی ہوگا۔ رسولِ اسلام نے اس بحث کو سختی سے منع فرمایا ہے اور اس کی معقول وجوہ ہیں۔ درحقیقت یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اگر ہم کہیں انسان فعل مختار ہے اور اپنے افعال کا ذمہ دار ہے تو اس سے یہ ملحدانہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت کامل نہیں، حالانکہ اس کی مرضی کے بغیر درخت کا پتہ تک نہیں ہلتا بھلا ہم اللہ کی مرضی اور رضا کے بغیر کوئی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر ہم کہیں کہ خدا قادر مطلق ہے اور ہم تمام کام اس کے پہلے سے متعین پروگرام کے مطابق کرتے ہیں تو انسانی منطق پہلو بدل کر سوال کرتی ہے: تو پھر مجھے کسی فعل کے لیے ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یا تو خدا قادرِ مطلق ہے یا پھر انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ تو نہیں ہو سکتیں۔ یہ وہ پیچیدہ صورتِ حال ہے۔

۳۱۲۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اسی ذہنی انتشار اور الجھاؤ سے بچنے کے لیے ہی رسولِ خدا نے جبر و قدر کے

مسئلہ پر بحث سختی سے منع کی ہے۔ آئیے ہم ایک بنیادی نکتہ پر غور کریں، خدا کا قادرِ مطلق ہونا ایک ملکوتی معاملہ ہے جبکہ انسان کا فعل مختار ہونا دنیاوی اور انسانی مسئلہ ہے۔ دونوں ایک ہی سطح پر نہیں، اس لیے ان میں تصادم کا بھی کوئی امکان نہیں، جس طرح زمین سورج کا تصادم خارج از امکان ہے حالانکہ دونوں ہی خلا میں محوِ سفر ہیں مگر ان کا مدار جدا جدا ہے۔ کسی کو اس عقیدہ پر ذرا سا شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا خالق و مالک قادرِ مطلق ہے۔ وہ ہمارے افعال کا پہلے سے تعین کرنے پر قادر ہے، اس کے باوجود ہم اپنے افعال کے لیے خود ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم نے یومِ ازل کو یہ ذمہ داری رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔ اُس روز اللہ تعالیٰ نے پیشکش کی مگر انسان کے سوا کسی نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

"ہم نے زمینوں اور آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کی پھر انھوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اٹھا لیا بیشک وہ بڑا بھولنے والا اور بڑا نادان تھا۔"

(۳۳/۷۲)

یہ کون سی امانت تھی انسان نے جس کا بار اٹھانا قبول کیا ماسوائے اس رضامندی کے کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری تقدیر میں لکھ دینا چاہیے جو وہ پسند کرتا ہے اور جو اس کی رضا ہے۔ ہمیں اس کی رضا کو بلا چون و چرا قبول کر لینا چاہیے اور وہ جو کچھ ہمیں دینا چاہتا ہے بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ شکایت کا تو ذکر ہی کیا، کوئی وفادار غلام یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ آقا نے دوسرے غلام کو کیا دیا ہے؟ اسے یہ کیوں دیا ہے؟ مجھے کیوں نہیں عطا کیا؟ اگر کوئی مصور کوئی تصویر بناتا ہے اور پھر اس میں ترامیم کر دیتا ہے یا اسے بالکل مٹا کر کوئی نئی چیز بنا دیتا ہے۔ کیا یہ ڈیزائن یا تصویر وغیرہ شکایت کا ذرا سا بھی حق رکھتے ہیں؟ کیا خدا کے سامنے ہم کسی فن کار کی تصویر سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں

۳۱۲۔ جبرائیل کی آمد کے ضمن میں حدیث کا دوسرا حصہ عبادت کے بارے میں ہے۔ ہم نے رسولِ خدا کی سوانح کے بیان کے سلسلے میں کافی بحث کی ہے۔ اب اس بحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم آئیے ہم ایک عام غلط فہمی کو دور کریں۔ "احسان" جس کا ذکر رسول اللہؐ نے کیا ہے کہ یہ اسلام کی عظیم عمارت کی زینت ہے، یہ احسان عقیدہ کے سلسلے میں ہو یا عبادت کے سلسلے میں، اسے بسا اوقات تصوف، سلوک اور طریقہ بھی کہتے ہیں۔ سائنس تو ایک علم ہے۔ اگر کسی کو پورا علم نہ ہو مگر وہ سائنس دان ہونے کا دعویٰ کرے یا کسی کو سائنس پر عبور تو ہو مگر وہ اس کا بے جا اور غلط استعمال کرے، دونوں صورتوں میں سائنس (علم) کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ رسولِ پاکؐ نے اسے نہایت مختصراً یوں بیان فرمایا ہے: "خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور راسخ کیجئے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے، اگر کوئی اسے محسوس کر لے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ کے امین (پیغمبر) کو جھٹلانے کی جرأت کرے۔" اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کے تصور کو راسخ کرنے کے بعض اصول اور طریقے ہیں۔ اللہ کی یاد میں محو ہونے کے علاوہ ایک بنیادی ضرورت سچ بولنا اور حلال کھانا بھی ہے جسے صوفیہ کی زبان میں "صادق المقال و اکل الحلال" کہا جاتا ہے۔ جہاں تک طریقوں کا تعلق ہے وہ ہر فرد کے لیے جدا جدا ہیں۔ احسان پر خانقاہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ احسان کسی خدا ترس بادشاہ کے تختِ شاہی پر بھی پایا جا سکتا ہے۔ بھلا خانقاہ کا باسی کون سا صوفی عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ پرہیزگار ہو سکتا ہے (جو اُندلس سے چین تک

وسیع اسلامی سلطنت کے حکمران تھے) ہم خلفائے راشدین کا ذکر نہیں کرتے جنھوں نے نبیؐ کی نگرانی میں تربیت حاصل کی تھی۔ ایک دلچسپ مگر بامقصد کہانی ہے:

ایک روز کسی خانقاہ میں ایک درویش نے اپنے شیخ سے کہا: کیا آپ سے بہتر کوئی ہستی ہے جس کی میں زیارت کرسکوں؟ شیخ نے اثبات میں جواب دیا اور درویش کو اُس ہستی کی طرف تعارفی خط دے کر بھیجا۔ جب درویش خط پر لکھے گئے پتہ پر پہنچا تو اس کی حیرت کی حد نہ رہی۔ شیخ کا مکتوب الیہ ایک بادشاہ تھا۔ درویش نے بادشاہ کو اپنے شیخ کا خط دیا۔ بادشاہ درویش کی الجھن کو پا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ دودھ کا ایک کٹورہ لایا جائے جو لبالب بھرا ہوا ہو۔ پھر اس نے یہ کٹورہ درویش کو تھماتے ہوئے کہا "لو اور اسے ہاتھ میں لے کر پُورے شہر کا چکر لگاؤ مگر احتیاط رکھنا دُودھ کی ایک بُوند بھی گرنے نہ پائے" بادشاہ نے ایک سپاہی کو درویش کے ساتھ کر دیا اور اسے حکم دیا" اگر دُودھ کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرے تو فی الفور اس درویش کی گردن مار دینا۔" تھوڑی دیر بعد درویش دوبارہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے دریافت کیا: "کیا آپ نے ہمارے خوب صورت دارالحکومت کی سیر کی اور ان دنوں جو تقریبات اور میلے ٹھیلے منعقد ہو رہے ہیں ان سے حظ اٹھایا؟" درویش نے جواب دیا: "میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکا کیونکہ میری ساری توجہ دُودھ کے کٹورے پر مرکوز تھی۔" بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بولا "میرے لیے بادشاہت دودھ کا کٹورہ ہے۔ میں خوفِ خدا کی وجہ سے ایک لمحہ بھی اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔"

اسلامی قوانین

۳۱۴۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایمان، عبادت اور احسان (تصوّف) اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہیں لیکن یہ دُنیاوی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے۔ چنانچہ دنیاوی زندگی کے مختلف پہلو اسلامی قوانین کے دائرہ میں آتے ہیں جسے ہم "فقہ" کہتے ہیں۔ فقہ نہ صرف عبادت کی تفصیل بیان کرتی ہے بلکہ اس میں باہم لین دین، جُرم وسزا، آئین و دستور، بین الاقوامی قوانین و اصول، پرسنل لاز اور حقِ وراثت وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مسلم قانون میں مستور حکومت قابلِ غور ہے کیونکہ اسلامی قانون کی یہی حکمت ہے جس میں اس کے فروغ کے امکانات مضمر ہیں۔ قرآن نے قانون کو دو حصّوں معروف (نیکی) اور مُنکر (برائی) میں تقسیم کیا ہے۔ نیکی ہر مسلمان پر فرض اور واجب ہے، جبکہ بدی سے مکمل پرہیز کا حکم دیا گیا ہے اور اسے قرآن کی زبان میں "حرام" قرار دیا گیا ہے۔ جن معاملات میں نیکی اور بدی کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ممکن نہ ہو، ان میں اگر نیکی غالب ہو تو ان پر عمل کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے، واجب نہیں ٹھہرایا گیا۔ اور اگر ایسے کاموں میں بدی غالب ہو تو اس سے گریز کی تلقین کی گئی ہے اور اسے مکروہ قرار دیا گیا ہے، حرام نہیں کہا گیا۔ اس کے علاوہ جو معاملات فرد کی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے ہیں اور انھیں مباح قرار دیا گیا ہے (یعنی فرد چاہے تو ایسے معاملات میں عمل کر سکتا ہے اور چاہے تو گریز اختیار کر سکتا ہے) قطب نما کی طرح اس میں بھی درمیانی درجے مقرر ہیں (جس طرح قطب نما میں چار سمتوں کے علاوہ شمال مشرق، شمال مغرب وغیرہ بھی ظاہر کیے جاتے ہیں) مثال کے طور پر مکروہ کے دو درجے مکروہ تنزیہی اور مکروہ تحریمی مقرر کیے گئے ہیں۔ (ان کی تفصیل ہمیں ہمارے اصل موضوع سے دُور لے جائے گی)

۳۱۵ - ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں فرائض کی تعداد محدود ہے ۔ البتہ مستحب اور مکروہ نسبتاً زیادہ تعداد میں ہیں ۔ تاہم یہ بھی لاتعداد نہیں ہیں ۔ تمام معاملات میں ضمیر کو بہترین رہنما تصور کیا جاتا ہے ("خواہ ماہرِ قانون آپ کو (کسی کام کا) اختیار بھی دے ، اپنے ضمیر سے ضرور مشورہ کیجئے" یہ رسول اللہؐ کا فرمان ہے) ایک اور معروف حدیث میں ہم اسلامی قانون کے فروغ کی نہایت ابتدا دیکھتے ہیں ، معاذ ابن جبل کو جب گورنر کے عہدے پر فائز کیا گیا تو وہ روانگی سے قبل رسول اللہؐ سے الوداعی ملاقات کے لیے آئے ۔ اس موقع پر اُن کے اور نبیؐ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی :

"معاذ ! جب کوئی مسئلہ تمہارے پیش ہو گا تو تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے ؟"

"یا رسول اللہ ! میں اللہ کی کتاب (قرآن) کو سامنے رکھوں گا ۔"

"اور اگر کتاب اللہ میں اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہ دیا گیا ہو تو ؟" حضورؐ نے پھر پوچھا

"تو پھر میں اللہ کے نبیؐ کی سنت سے رجوع کروں گا ۔" معاذ نے جواب دیا

"لیکن اگر سنت بھی اس معاملے میں خاموش ہو تو ؟"

"تو پھر میں اپنی رائے دوں گا ۔" معاذؓ بن جبل نے ادب سے کہا

"تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے پیغمبرؐ کے ایلچی کو اس امر کی طرف ہدایت فرمائی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے ۔" رسول اللہؐ نے بے ساختہ کہا

ظاہر ہے اس صورتِ حال میں اسلامی قوانین نہ صرف بنیادی طور پر مستحکم ثابت ہوں گے بلکہ ان میں مطابقت پذیری کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہو گی ۔

۳۱۶ - کسی فرد کی رائے کو کسی دُوسرے فرد کی بہتر رائے سے بدلا جا سکتا ہے ، مگر قوم (یا کسی گروہ) کی متفقہ رائے فرد کی رائے سے زیادہ وزنی ہوتی ہے ۔ تاہم انسانوں کی متفقہ رائے کو بھی خطا سے پاک اور دائمی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ چنانچہ ماہرینِ فقہ تسلیم کرتے ہیں ایک اجماع (متفقہ رائے) دوسرے اجماع کے ذریعے منسوخ کیا جا سکتا ہے ۔ اس میں یہ بنیادی اصول کارفرما ہے کہ جو مجاز اتھارٹی کوئی قاعدہ نافذ کرتی ہے وہ یا اس سے بالائی مجاز اتھارٹی اس قاعدے پر خطِ تنسیخ بھی پھیر سکتی ہے ۔ اس طرح قرآن پاک کے الفاظ ایک اور وحی کے ذریعے تبدیل کیے جا سکتے ہیں ۔ کوئی شخص قرآن میں تنسیخ و ترمیم کا ہرگز مجاز نہیں ۔ اسی طرح حدیث (رسولؐ کا کلام) میں صرف رسولؐ یا اللہ تعالیٰ کے احکام سے ردّ و بدل ممکن ہے ، علما کی رائے سے قرآن یا حدیث میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ۔ البتہ ایک عالم کی رائے (فتویٰ) دوسرے عالم کی رائے کی جگہ لے سکتی ہے ، کیونکہ تمام مسلمان مساوی درجہ رکھتے ہیں ۔ تاہم اس حقیقت کی نفی ممکن نہیں کہ عوام کی نظروں میں علما کے بھی درجے ہوتے ہیں ، کیونکہ تمام افراد کو اللہ تعالیٰ نے یکساں صلاحیتوں سے نہیں نوازا ۔

۳۱۷ - عامۃ المسلمین کے زیادہ فائدہ کی خاطر مماثلات سے استنباط وغیرہ ایسے طریقے ہیں جن سے رسولؐ اللہ کے بعد نہ صرف اسلامی قانون کو فروغ نصیب ہوا ہے بلکہ اس کی یہ لچک بھی قائم رہی ہے کہ : قانون انسان کے لیے ہے ،

انسانی قانون کے لیے نہیں۔

نکتہ چینی ۳۱۸۔ ہمارے اور رسولِ خدا کے دور میں چودہ سو سال کا فصل ہے۔ موجودہ دور میں زندگی یکسر بدل چکی ہے۔ کیا چودہ سو سال پرانے قوانین وضوابط اب بھی بنی نوع انسان کی رہنمائی کے قابل ہیں؟ اس ضمن میں امریکہ کے ایک مشنری کی کتاب (" اسلام فہمی کی طرف " از ایچ۔ جی۔ ڈورمن) کو ایک غیر جانبدارانہ رائے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

اسلامی ضابطہ اخلاق میں طلاق اور تعددِ ازدواج کے سوا کوئی بات قابلِ گرفت معلوم نہیں ہوتی (میں نکتہ چینیوں کی خاطر اس میں تصورِ جہاد اور چوری کی سزا (قطعِ ید) کو بھی شامل کر لیتا ہوں)۔

چونکہ ایک غیر مسلم کو بھی اسلامی اخلاقیات میں کوئی دُوسری قابلِ گرفت بات نظر نہیں آتی۔ آیئے ہم ان اصولوں (جو قابلِ گرفت گردانے گئے ہیں) پر غور کریں:

اگر دوسری شادی ممنوع قرار دے دی جائے اور طلاق کا امکان نہ ہو تو بسا اوقات گھر جہنم کا نمونہ بن سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی طرف سے انجیل میں طلاق کی قطعی ممانعت کے باوجود پوری مسیحی دنیا میں پارلیمانی قوانین کے تحت طلاق کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اسلام نے اس سماجی ضرورت کو روزِ اول سے ہی محسوس کر لیا تھا مگر عیسائیت کو اسے سمجھنے میں پورے دو ہزار سال لگ گئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام میں طلاق " اللہ کی نظر میں مباح چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔" جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ پھر طلاق کی اجازت کے باوجود مسلمانوں میں طلاق کے واقعات کوئی زیادہ نہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ مہر بھی ہے جو شادی کے وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بغیر شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ مہر بیوی کی ملکیت ہوتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی صورت میں شوہر مہر ادا کرنے کا پابند ہے۔

۳۱۹۔ اب تعددِ ازدواج کو لیجئے۔ دُنیا کے کسی مذہب حتیٰ کہ عیسائیت میں بھی تعددِ ازدواج کی ممانعت نہیں کی گئی۔ انجیل مقدس کے مطابق حضرت سلیمانؑ کی ایک ہزار بیویاں (۷۰۰ بیویاں اور ۳۰۰ کنیزیں) تھیں۔ حضرت داؤدؑ ایک سو بیویوں کے شوہر تھے۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور انسانی تاریخ کے دوسرے تمام برگزیدہ افراد ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر تھے۔ اسلام درحقیقت وہ پہلا دین ہے جس نے:

۱۔ تعددِ ازدواج کی تحدید کی ہے (جو چار ہے)

۲۔ خُلع کا حق تسلیم کیا ہے۔

اسلام کے مطابق شادی زندگی میں کیے جانے والے دوسرے معاہدوں کی مانند ایک معاہدہ ہے اور اس کے جاری رہنے کا انحصار فریقین کی رضامندی پر ہے۔ اس معاہدہ میں حق مہر ہی نہیں بلکہ عائلی زندگی کے دُوسرے پہلو بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یک زوجگی (ایک وقت میں ایک بیوی) کی شرط شادی کی شرائط میں عین قانون کے مطابق ہے: کوئی خاتون شادی کے وقت یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ شادی کے بندھن کے دوران دوسری شادی نہیں کرے گا۔

اگر دُولھا یہ شرط قبول کرلے تو پھر اسے اپنے وعدے پر پورا اترنا ہوگا۔ لیکن اگر دُولھا یہ شرط قبول نہ کرے اور دُلھن اسی پر مُصر ہو تو ان کی شادی جائز نہیں۔ اس سلسلے میں خاندانِ عباسیہ کے خلیفہ المنصور کا قصہ تاریخ میں بے حد مشہور ہے۔ خلیفہ المنصور نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شادی کے وقت دوسری شادی نہ کرنے کی شرط منظور کی تھی۔ چنانچہ اس کے دور کا کوئی فقیہ اس شرط کو غیر قانونی یا غیر اسلامی قرار دینے کا فتویٰ جاری نہ کرسکا۔

۳۲۰۔ اسلام میں جہاد کے تصور کو دشمنانِ اسلام نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔"

ہم کسی کو اسلام قبول کرنے پر بذریعہ طاقت مجبور نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی کسی ملک کے خلاف صرف اس لیے اعلانِ جنگ کیا جاسکتا ہے کہ اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سلسلے میں قرآنی احکام واضح اور غیر مبہم ہیں۔ (۲/ ۱۹۰-۱)

"اور اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور انھیں قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ اور انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے۔۔۔"

گویا جہاد کے لیے دو پیشگی شرائط عاید کی گئی ہیں۔ جہاد صرف اللہ کی راہ میں کیا جانا چاہیے۔۔۔۔ اور یہ ان کے خلاف ہونا چاہیے جو (مسلمانوں پر) حملہ کریں۔ گویا مسلمانوں کے لیے دوسروں کے خلاف جنگ محض دفاعی کارروائی ہوسکتی ہے۔ پیغمبرِ خدا کی زندگی میں دفاع کے سوا کسی دوسری نوع کی جنگ کا وجود نہیں ملتا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ رسولِ خدا نے جو لڑائیاں لڑیں وہ خونریزی سے کیسے پاک اور انسانی ہمدردی کے مظاہرہ سے پُر تھیں۔ تیس لاکھ مربع کلومیٹر علاقہ کی فتح کے دوران دشمنوں کے تین سو سے بھی کم افراد ہلاک کیے گئے۔ خلفائے راشدین نے بھی تین براعظموں کو اسلامی مملکت کے دائرہ میں شامل کیا اور وُہ بھی رسولِ خدا کے نقشِ قدم پر ہی چلتے رہے۔

۳۲۱۔ جہاں تک اسلام کے تعزیری قوانین کا تعلق ہے میں شراب کی خرابیوں کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن کوڑوں کی سزا کے آغاز کے ساتھ ہی اس بُرائی کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ قتلِ عمد کے لیے موت کی سزا دی گئی ہے مگر اس پر عمل کرنا فرض نہیں۔ ملزم کو یہ سہولت حاصل ہے کہ اگر مقتول کے وارث مان جائیں تو وہ دیت ادا کرکے سزا سے بچ سکتا ہے۔ زانی کی سزا سنگساری ہے مگر اس سزا پر عمل صرف ایسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ چار چشم دید گواہ موجود ہوں جنھوں نے ملزم کو یہ فعل بد کرتے دیکھا ہو۔ اگر عینی شاہد موجود نہ ہوں عدالت ملزم کو سزا دے ہی نہیں سکتی۔ (انجیل کے عہد نامہ قدیم میں بھی اسی نوع کی سزا مقرر کی گئی ہے) رہ گئی چوری جس کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکوں نے حجاز خالی کردیا تو شریف حسین کی بادشاہت کے دوران کوئی حاجی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس گھر جاسکے گا۔ بعض عربوں نے جنھوں نے ترکوں اور پھر شریف حسین کا دور دیکھا ہے مجھے بتایا کہ شریف حسین تو ڈاکوؤں سے لوٹ مار کے مال کا حصہ وصول کرنے سے بھی نہیں چُوکتا تھا۔ جب ابنِ سعود نے شریف حسین کی فاسد حکومت کا خاتمہ کیا تو اس نے اسلام کے تعزیری قوانین نافذ کردیے۔ میں نے مکہ کے اخبارات و رسائل میں پڑھا ہے کہ چند افراد کو قطعِ ید کی سزا ملنے کے بعد پُوری سلطنت سعودی میں کئی کئی ماہ تک چوری کی کوئی واردات

نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں خود میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ میں اونٹوں کے ایک قافلہ کی معیت میں مکّہ سے مدینہ جا رہا تھا، ایک پڑاؤ پر پہنچ کر قافلے میں شامل ایک خاتون نے شکایت کی کہ اس کا سُوٹ کیس کھو گیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس کی پُوری پوری تفتیش کریں گے۔ تین ہفتے بعد ہم مدینہ سے واپس مکّہ جاتے ہُوئے جب اُسی جگہ سے گزرے تو پولیس افسر نے پُوچھا سُوٹ کیس میں موجود اشیا کی مالیت کیا تھی؟ ہم چور پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے آپ اپنے سامان کی قیمت وصول کر لیں۔ یہ رقم حکومت نے آپ کے نقصان کے عوض دی ہے۔ اس بات پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ آیا کوئی سخت قانون جس کے نفاذ کی ضرورت شاذ ہی پیش آتے اس نرم قانون سے بہتر ہے یا نہیں جو برائی (جرم) کے استیصال میں ناکام رہے۔ یہ نہیں بھُولنا چاہیے کہ اسلام میں سزا کے دو مواقع ہیں۔ اگر کوئی مُجرم عدمِ شہادت کی بنا پر دنیاوی حکومت کے ہاتھوں سزا سے بچ بھی جائے تو روزِ حشر اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہو گی، اور عام حالات میں آخرت میں سزا کا تصور نہایت موثر ثابت ہوتا ہے۔ حکومتوں کو اُخروی سزا کا خوف لوگوں کو دلانا چاہیے جو پولیس اور تعزیراتی قوانین سے بہرحال زیادہ موثر تحذیر ہے۔

باب ۱۲

رسولؐ کی عائلی زندگی

۳۲۲ - ہم نے محمد (صلعم) کو عوامی زندگی میں اللہ کے ایک رسولؐ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انھوں نے ایک دین کی بنیاد رکھی تاکہ اللہ نے انھیں جو فرض سونپا ہے اسے پُورا کر سکیں اور اللہ کا پیغام جو ان پر نازل ہوا ہے لوگوں تک موثر طور پر پہنچا سکیں۔ ہم نے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ رسولِ خدا نے کس طرح ایک ریاست (مملکت) کی بنیاد رکھی جو ان کی منزل یا مقصد نہ تھی بلکہ وہ ان کے اُلوہی مشن کی تکمیل اور ان کی قایم کردہ تنظیم (دین اسلام) کی بقا و فروغ کا ایک ذریعہ تھی۔ اب ہم رسولِ خدا کی نجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ کس طرح عبادت کرتے تھے، روزے کیسے رکھتے تھے، اہلِ بیت اور اپنے بچوں سے کس طرح پیش آتے تھے، اپنے مہمانوں، ملازموں اور غلاموں سے ان کا سلوک کیسا تھا اور وُہ اپنے گھر میں کیسے رہتے تھے۔

اللہ سے معاملہ

۳۲۳ - اُمت کے سربراہ ہونے کے ناطے یہ ان کا قطعی اختیار اور حق تھا کہ وہ امامت کے فرائض انجام دیں اور نماز باجماعت ادا کرائیں۔ اگر وہ دوسروں کو دن میں پانچ وقت نماز ادا کرنے کا حکم دیتے تھے تو انھوں نے کئی سنت اور نفل نمازیں خود پر واجب کر رکھی تھیں جو وہ اپنے گھر میں ہی ادا کرتے تھے۔ ان کی اس عادت کا بھی سبب تھا۔ پیغمبر کا عمل مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے اور رسولِ خدا نہیں چاہتے تھے کہ وُہ اپنے اُمتیوں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالیں۔ اگر وہ نوافل بھی مسجد میں ادا کرتے تو مسلمان سمجھتے کہ یہ نوافل بھی نماز کا ناگزیر حصہ ہیں۔ اس سے دین پر عمل مشکل ہو جاتا اور اُمت کی مادی زندگی کو نقصان پہنچتا۔ مزید برآں گھر میں نوافل کی ادائیگی نمود و نمائش سے بھی مبرا تھی، گویا یہ صرف خدا اور اس کے بندے کا معاملہ تھا جو ان دونوں کے درمیان ہی رہا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ تہجد رسولؐ کی ذات پر فرض ہے۔ اور اس فرض کا اطلاق دوسرے مسلمانوں پر نہیں ہوتا۔ نمازِ عشا کے بعد رسولؐ اللہ کچھ آرام فرماتے اور پھر تہجد کے لیے اُٹھ جاتے بسا اوقات وہ نوافل میں اتنی دیر اقامت کرتے کہ اُن کی ٹانگیں متورم ہو جاتیں۔ وہ عام سربراہانِ مملکت کی طرح عیش و آرام سے بہت دُور رہتے تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں نفس کشی اور ترکِ دُنیا کا نمونہ تھے۔ وُہ اپنے اہلِ بیت کے تمام حقوق پُورے کرتے مگر کسی بھی اور نفس سے زیادہ ان کی لَو اللہ سے لگی ہوئی تھی وہ صحیح معنوں میں اللہ کے بندے تھے۔

۳۲۴ - رسولِ خدا نے اپنے اُمتیوں کو ہر سال رمضان کا پُورا مہینہ روزے رکھنے کا حکم دیا۔ مگر وہ خود رمضان کے دنوں کے علاوہ بھی اکثر روزے سے ہوتے تھے۔ وہ ہر پیر اور جمعرات کے علاوہ ہر قمری مہینہ کی ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ تاریخ کو بھی روزہ رکھتے تھے (غیر مسلموں میں روزہ کا صحیح تصور نہیں پایا جاتا۔ عام آدمی ہی نہیں عیسائی پادری اور راہبوں کو بھی پوپ نے بتایا ہے کہ روزہ محض خیالی عمل ہے اور ترکِ خوراک سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حال ہی میں ہمبرگ کے ایک پادری نے میرے سوال پر

مجھے بتایا کہ مسیحی روزہ کا مطلب ہلکا سا ناشتا، پیٹ بھر کر ظہرانہ اور ہلکا سا عشائیہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے نزدیک روزہ کا مطلب ہے صبح صادق سے شام تک کھانے پینے، تمباکو نوشی اور متعدد دوسری باتوں سے مکمل پرہیز ، خواہ شدید گرمی ہو یا شدید سردی، اس عمل میں کوئی کمی بیشی ممکن نہیں۔ معترضین کہہ سکتے ہیں کہ روزہ مضرِ صحت ہے۔ درخت سردیوں میں روزہ رکھتے ہیں، انھیں پانی نہیں دیا جاتا اور ان کے پتّے گر جاتے ہیں۔ جب موسم بہار آتا ہے تو وہ پتوں، پھولوں اور پھلوں سے لد جاتے ہیں۔ جنگلی پرندے اور درندے بھی سخت سردی میں روزہ (سوئے رہتے ہیں) رکھتے ہیں، وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور جب بہار کا گجر بجتا ہے تو وہ نئے دلکش پروں اور نئی جلد کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ نئی قوت سے دوبارہ زندگی شروع کرتے ہیں اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ جو روزہ نہیں رکھتے ان کی صحت عموماً کچھ اچھی نہیں ہوتی۔ نپولین بڑی حسرت سے کہا کرتا تھا: اگر میری فوج میں تُرک (مسلمان) ہوتے تو میں چٹکی بجاتے پوری دنیا فتح کر لیتا کیونکہ تُرک کھانا پینا ترک بھی کر دیتے ہیں مگر ان کی جنگی صلاحیت متاثر نہیں ہوتی) رسولِ خداؐ سال کے متعدد دوسرے دنوں میں بھی روزہ رکھتے تھے، مگر ہمیشہ ایک ہی دن کا انتخاب نہیں کرتے تھے۔

۲۲۵۔ رسول اللہؐ اپنے پیروکاروں کو اپنی بچت اور بے کار پڑی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ مگر وہ خود اتنے سخی تھے کہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔ جب آنحضرتؐ کا وصال ہوا ان کے گھر میں کوئی درہم و دینار نہ تھا۔

ملازم اور غلام

۲۲۶۔ اسلام نے (شروع میں) انجیل کی طرح غلامی کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن انجیل میں تو غلاموں کو آزاد کرنے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جبکہ اسلام نے عملی طور پر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اب ہم اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت جبکہ دنیا بھر میں غلامی کا رواج تھا دشمن مسلمانوں کو بھی غلام بنا کر فروخت کر سکتے تھے۔ غلامی کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ نبیؐ نے حکم دیا: دشمن کا کوئی بھی غلام جو مسلمانوں سے پناہ طلب کرے اور مسلمانوں کی پناہ میں آجائے خود بخود آزاد تصور ہوگا۔ جس لونڈی کے بطن سے کوئی بچہ پیدا ہو، اس کے مالک کی وفات پر وہ لونڈی از خود آزاد ہو جائے گی تا آنکہ لونڈی کا مالک اس سے قبل ہی اسے آزاد نہ کر چکا ہو۔ قرآن کریم میں (۹۰/۱۱) آیا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنا بہترین خیرات ہے۔ پھر مختلف گناہوں کے لیے مثلاً اتفاقی قتل (۴/۹۲) مجبوراً حلف شکنی (۵/۸۹) اور طلاق جس میں شوہر نے بیوی کو اپنی ماں کے برابر قرار دے دیا ہو (۵۸/۳) غلام کی آزادی کو کفارہ قرار دیا گیا ہے۔ مزید برآں اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ (۹/۶۰) اپنے سالانہ بجٹ میں معقول رقم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کے لیے مختص کرے۔ اسلام میں غلام کے لیے یہ سہولت (۲۴/۳۳) بھی رکھی گئی ہے کہ وہ خود مالک کو اپنی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر سکے۔ وہ رقم کے حصول کے لیے کسی جگہ ملازمت کر سکتا ہے اور ملازمت کے اوقات میں مالک کے لیے کام کرنا اس پر فرض نہیں۔ قرآن حکیم کے مطابق (۴۷/۴) جنگی قیدی ——— جو نئے غلاموں کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ تھا ——— فدیہ لے کر یا صلہ رحمی کے طور پر رہا کرنا ضروری[1] ہیں۔ امام سرخسی نے ایک حدیث نقل کی ہے:

[1] بظاہر متعلقہ پیراگراف کا یہی مطلب ہے۔ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد ۱/ ۳۵۱ (تدوین مصطفیٰ البابی قاہرہ) (باقی بر صفحہ آئندہ)

"عرب غلام کے بغیر عرب نہیں ہوتا۔"[۱]
کوئی غلام اسلام قبول کر سکتا ہے اور کسی آزاد مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا خواہ اسے بغاوت کے جرم میں گرفتار ہی کیوں نہ کر لیا جائے۔ (اسلام کا یہ قانون انجیل کے قانون کے بالکل برعکس ہے، انجیل کے مطابق ایک یہودی دوسرے یہودی کو غلام بنا سکتا ہے)

۳۲۷۔ غلامی کا فائدہ صرف یہ تھا کہ جنگوں میں گرفتار ہونے والے جو افراد بے یار و مددگار رہ جاتے تھے، انھیں رہنے کا ٹھکانہ میسر آجاتا تھا۔ انھیں اچھا ماحول میسر آتا وہ دوسری قوم کی ثقافت سے بہرہ ور ہوتے اور بہتر انسان بن کر معاشرے کا مفید تر رکن ثابت ہو سکتے تھے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسلام میں آزاد شدہ غلام اور پیدائشی آزاد شہری میں کوئی تفریق نہیں تاریخ اسلام میں آزاد شدہ غلام فرمانروا گزرے ہیں اور انھوں نے شاہی خاندانوں کی بنیاد رکھی ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں مملوکوں اور ہندوستان میں خاندان غلاماں کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

۳۲۸۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اسلام کے قانون کے پیشِ نظر رسولِ خدا کے پاس جب بھی کوئی غلام ——— بطور تحفہ یا بطور مالِ غنیمت ——— آتا، وہ اس وقت اسے آزاد کر دیتے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اگر کسی لونڈی کے ہاں اس کے مالک کے نطفے سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ مالک کی وفات پر خود بخود آزاد تصور ہوگی۔ پھر مالک کو صاحبِ اولاد لونڈی کو فروخت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے اور لونڈی کو مالک کے گھر اس کی منکوحہ بیوی کی طرح کے حقوق حاصل ہوں گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں لکھا ہے کہ صحابۂ رسولؐ کے درمیان اسی بات پر اتفاق رائے تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جانا چاہیے۔ گو اس سے قبل نازل ہونے والی ایک آیت ۳۳/۵۰ میں جنگ کے دوران قیدی بنائے جانے والی عورتوں کو لونڈی بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔ ان دونوں آیات میں مطابقت کے لیے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ آیت ۴۷/۴ میں جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ "متبادل" ہے، خصوصی نہیں یا دوسری آیت کے حکم کی تنسیخ نہیں کرتی۔ چونکہ خود رسولِ خدا نے بھی ۵ھ میں بنو المصطلق کے لوگوں کو غلام بنایا تھا (دیکھیے ابنِ ہشام ص ۷۲۹)، بلکہ ۸ھ میں بنو ہوازن (ابن ہشام ص ۸۷۷) اور ۹ھ کے اواخر میں بنو العنبر کے لوگوں کو غلام بنایا گیا تھا (ابن ہشام ص ۹۸۳) تاہم بعد میں یہ تمام غلام آزاد کر دیے گئے تھے۔

[۱] مبسوط ۱۰/۴۰ اور ۱۱۸۔ شرح السیر الکبیر II ۲۶۵، ۲۶۹ (طبع حیدر آباد) اور بنو ہوازن کے لوگوں کو غلام بنائے جانے کے بارے میں حوالہ جنگِ حُنین کے سلسلے میں ہے۔ یہ جنگ ۸ھ میں طائف کے علاقہ میں ہوئی تھی۔ یہاں رسولِ خدا نے غیر مبہم الفاظ میں حکم دیا تھا کہ دشمن قبیلے کی چھاؤنی میں موجود عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور انھیں اسلامی فوج میں بطور مالِ غنیمت تقسیم کر دیا جائے۔ تاہم جب بنو ہوازن کے شکست خوردہ قبیلے کے معززین کا ایک وفد آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اپنے فعل پر اظہارِ ندامت کیا اور اسلام قبول کر لیا تو رسول اللہؐ کی سفارش پر غلام بنائے جانے والے تمام افراد کو رہا کر دیا گیا تھا۔ اس سے نومسلم بنو ہوازن کا ایمان مستحکم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

البتہ وہ مالک کے ترکہ میں حصہ دار نہ ہوگی۔ ان احکام کو عملی طور پر مستحکم کرنے کے لیے رسولِ خداؐ نے مصری سردار مقوقس کی طرف سے بطور تحفہ بھیجی جانے والی لونڈی ماریہ کو گھر میں ہی رکھا اور بعد میں وہ پیغمبر کے بیٹے ابراہیم کی ماں بنی جو دو سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے امام الزہری کے مطابق رسول اللہؐ نے نہ صرف یہ کہ ماریہ کی آزادی کا حکم دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ "اگر ابراہیم زندہ رہتے تو میں تمام قبطی عیسائیوں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیتا۔"

ازواجِ مطہرات

۳۲۹۔ قرآن حکیم (۳۳/۶ اور ۵۳) نے نبی کی ازواجِ مطہرات کو اُمّ المومنین قرار دیا ہے نبی کے بعد کوئی مسلمان ان سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تو اس کی مائیں ہیں۔ کسی مسلم خاتون کی کیا شان ہے، وہ نبی کی زوجہ ہو تو تمام مسلمانوں کی ماں ہوتی ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ خواتین رسولِ خداؐ کے عقد میں آنے کی خواہشمند رہتی تھیں۔ میں نے یورپ کی متعدد فیشن ایبل مگر مذہبی خیالات کی حامل عیسائی دوشیزاؤں سے دریافت کیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ مسیح دوبارہ دنیا میں آجائیں اور وہ ایک سے زاید بیویوں کی موجودگی میں تم سے نکاح کرنا چاہیں تو کیا تم انکار کر دوگی؟ ایک بھی مسیحی دوشیزہ نے اس کا نفی میں جواب نہیں دیا۔

۳۳۰۔ رسولِ خداؐ نے متعدد مواقع پر فرمایا، مجھے بیوی کی ضرورت نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے عائلی زندگی کا بار اٹھا کر بڑی قربانی دی ہے۔ لیکن انھیں تو اُمت کے لیے ایک سے زاید بیویوں سے نکاح کی صورت میں مثالی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنا تھا۔ ایک بیوی کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر غیر معمولی حالات میں بھی تعددِ ازواج کو برداشت کیا گیا ہے تو اس سے رسولِ خداؐ عملی طور پر بتانا چاہتے تھے کہ ایک سے زاید بیویوں سے کس طرح سلوک کیا جانا چاہیے۔ وہ خواتین کو بھی یہ سکھانا چاہتے تھے کہ تعددِ ازواج کی صورت میں شوہر سے اور ایک دوسری سے ان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔

۳۳۱۔ قرونِ اوّل میں بھی کسی پیغمبر نے تعددِ ازواج کی ممانعت نہیں کی اور نہ ہی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ تعداد کی حد مقرر کی ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں ایسا ہی رواج تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے قرآن آیات کی صورت میں وقتاً فوقتاً نازل ہوا ہے اور بیویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی حد کے بارے میں قرآنی حکم اس وقت آیا تھا جب رسولِ خداؐ نے آخری بار شادی کی ہے۔ عام طور پر قانون موثر بہ ماضی نہیں ہوتے۔ مگر جونہی یہ حکم آیا رسولِ خداؐ نے ایسے مسلمانوں کو جن کی چار سے زاید بیویاں تھیں حکم دیا کہ وہ زاید بیویوں کو طلاق دے دیں۔ اس وقت رسولِ خداؐ کی نو بیویاں تھیں۔ مگر انھوں نے اس قانون پر خود کیوں عمل نہ کیا؟ بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے، رسولِ خداؐ نے درج ذیل انداز میں اس حکم پر عمل کیا تھا۔

۳۳۲۔ رسولِ خداؐ نے اپنی تمام بیویوں کو ایک جگہ جمع کیا اور انھیں تعددِ ازواج کے سلسلے میں قرآن کے نئے حکم سے آگاہ کیا۔ رسولِ خداؐ نے اپنی تمام ازواج سے کہا: مجھے تم میں سے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا تم سب کا کام ہے کہ تم میں سے کون طلاق حاصل کرنا پسند کرتی ہے اور کون میری اہلیہ کے طور پر زندگی بسر کرنا

چاہتی ہے۔ بھلا کونسی مُسلم خاتون نبی کی زوجہ ہونے کے شرف کو کھونا چاہتی فطری طور پر کوئی بھی طلاق حاصل کرنا اور مطلقہ کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ احکامِ خداوندی کی بنیاد پر رسولؐ اللہ نے انھیں بتایا: میں تم سب کو اپنی بیوی کی طرح رکھنے کو تیار رہوں مگر ایک شرط پر کہ میں ازدواجی تعلقات صرف چار سے رکھوں گا۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ رسولِ خدا نے آیت کے الفاظ کی تعبیر اسی طرح کی جیسا کہ قرآن بتاتا ہے (۳۳/۵۱) کہ "ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمزدہ نہ ہوں"۔ دراصل نبیؐ جن چار بیویوں سے ازدواجی تعلقات رکھتے تھے ان میں وہ ردّوبدل کرتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پہلی چار کی جگہ دُوسری چار لے لیتی تھیں۔ لیکن قرآنی آیات کی یہ تفسیر و تعبیر اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے اگلی آیت نازل ہُوئی (۳۳/۵۲) کہ "اس کے بعد آپ کے لیے عورتیں حلال نہیں، اور نہ یہ کہ آپ ان سے اور عورتیں تبدیل کریں، اگرچہ آپ کو ان کا حُسن پسند آئے۔ اِلّا جو آپ کی مملوکہ ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔" چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود رسولؐ کی ذات شادی کے معاملہ میں بھی قانون سے بالاتر نہیں۔

۳۳۳۔ کئی باتیں ایسی ہیں جو کوئی خاتون مارے شرم کے کسی مرد سے پُوچھ نہیں سکتی۔ وہ کسی دوسری عورت سے وہی سوال آسانی سے کر سکتی ہے۔ چنانچہ مسلم معاشرہ میں پڑھی لکھی خاتون کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ بھلا رسولِ خدا کی ازواجِ مطہرات سے زیادہ عالِم کون سی خاتون ہو سکتی تھی جو ہر وقت اللہ کے نبی کے ساتھ رہتی تھیں اور انہی سے (اسلام کے اصول و قوانین) سیکھتی تھیں۔ اگر رسولؐ کی صرف ایک زوجہ مطہرہ ہوتیں تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ طویل عمر پاتیں۔ کسی شخص کی جتنی زیادہ بیویاں ہوں گی اتنا ہی یہ امکان بھی زیادہ ہو گا کہ ان بیویوں میں سے بعض زیادہ عرصہ زندہ رہیں گی۔ رسولؐ کی جتنی احادیث پیغمبر کی ازواجِ مطہرات سے مروی ہیں اور جتنے فتوے اُنھوں نے دیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات کتنی ذہین اور عقل سلیم کی مالک تھیں۔ پھر اُنھوں نے پاکیزہ اور انسانی ہمدردی سے پُر زندگی کی عملی مثالیں پیش کی ہیں۔

۳۳۴۔ رسولؐ اللہ کی ایک اور ضرورت اسلام کا استحکام اور اہم افراد سے پائیدار دوستی تھی۔ کسی طاقتور قبیلہ کے سردار کی بیٹی سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے والا یقیناً نفع میں رہتا ہے اور رسولِ خدا کے معاملہ میں ایسی شادی کا مقصد ذاتی جاہ و اقتدار نہیں تھا بلکہ اللہ کی خاطر اور اسلام کا مفاد مقصود تھا۔

۳۳۵۔ بعض اور مفاد بھی تھے جن کا ذکر ہم ازواجِ مطہرات کے مختصر سوانح میں کریں گے۔

۱۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ

۳۳۶۔ رسولِ خدا کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ تھیں جن سے حضورؐ نے ظہورِ اسلام سے کافی عرصہ پہلے نکاح کیا تھا۔ وہ مکہ کی رہنے والی تھیں اور ایک متمول قبیلہ اسد کی اہم فرد تھیں۔ وہ بیوہ تھیں، یکے بعد دیگرے اُن کے دو شوہر وفات پا چکے تھے۔ وہ نہایت دانشمند اور عقل سلیم کی مالک تھیں۔ انھیں ورثہ میں جو کچھ ملا اسے ضائع کرنے کے بجائے انھوں نے تجارت میں سرمایہ کاری کی اور اپنے سرمایہ کو خوب فروغ دیا۔ وہ نوجوان خاتون تھیں چنانچہ وہ تجارتی کاروانوں کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا وہ

اپنا مالِ تجارت مکہ کے دیندار تاجروں کے سپرد کر دیتیں جو بیرونی ممالک میں خرید و فروخت کے لیے جاتے تھے۔ یوں جو منافع ہوتا مورخوں کے مطابق اس میں مالِ تجارت کی مالکہ اور فروخت کنندہ (ایجنٹ) کا نصف نصف حصہ ہوتا۔ محمدؐ بھی تجارت کے سلسلے میں ہی پہلی بار خدیجہؓ سے ملے تھے۔ حضرت خدیجہ ان کی دیانت اور امانت سے بے حد متاثر ہوئیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کرنے لگیں بتدریج یہ احترام بڑھ کر پسند اور پھر محبت میں تبدیل ہوگیا اور بالآخر دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس وقت نبیؐ کی عمر صرف ۲۵ سال تھی جبکہ حضرت خدیجہ ۲۸ سال (بلکہ معروف روایات کے مطابق ۴۰ سال) کی تھیں۔ ان کے بطن سے کوئی نصف درجن بچے تولد ہوئے جن میں سے صرف چار بیٹیاں بقیدِ حیات رہیں۔ جب ان بیٹیوں کی شادی ہوئی تو پیغمبرِ خدا کی خواہش تھی کہ ان کے داماد ایک ہی بیوی پر قناعت کریں (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ عام حالات میں کس طرح کی عائلی زندگی پسند فرماتے تھے) حضرت خدیجہؓ بڑی فیاض، مخیر اور کریم النفس خاتون تھیں وہ آنحضورؐ کی رضاعی ماں (حلیمہ) سے نہایت حُسنِ سلوک روا رکھتیں جو اکثر اپنے پیارے رضاعی بیٹے سے ملنے مکہ آتی تھیں، حضرت خدیجہؓ یتیموں، بیواؤں، شہر کے نادار افراد، غیر ملکی مسافر حاجت مندوں جو مکہ سے گزرتے تھے اور دوسرے مستحق افراد سے بھی مہربانی کا سلوک کرتیں۔ حضرت خدیجہؓ کا دو منزلہ خوب صورت مکان تھا۔ چنانچہ مورخوں کا بیان ہے: جب نبیؐ فلسطین سے واپس آئے خدیجہ نے اپنے گھر کی دوسری منزل سے ان کے کاروان کو مکہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ جس جگہ حضرت خدیجہ کا مکان تھا مکہ میں وہ جگہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ انھوں نے بُرے اور بھلے وقت میں اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ وہ سب سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئیں اور اپنے شوہر کی نبوت کا اقرار کیا۔ نبوت کے ابتدائی دور میں جب حضورؐ کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ انھیں واقعی اللہ کا رسول منتخب کیا گیا ہے اور وہ سخت غمگین رہتے تھے حضرت خدیجہؓ ان کا حوصلہ بڑھاتیں۔ مورخوں نے ایک دلچسپ واقعہ سپردِ قلم کیا ہے:

نبوت کے ابتدائی دنوں میں ایک روز حضرت خدیجہؓ نے نبیؐ کو بتایا "کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ جبرائیل کب آپ کے پاس آتا ہے؟" رسولِ خداؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ ایک روز رسولؐ اللہ نے حضرت خدیجہؓ سے کہا: "لو جبرائیل آگیا"۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے اپنے شوہر کو اپنی دائیں طرف کر لیا اور پوچھا: "کیا آپؐ کو اب بھی فرشتہ نظر آرہا ہے؟" رسولِ خداؐ نے کہا: "ہاں"۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ اپنی جگہ بدل لیں، پھر انھوں نے رسولؐ پاک کو اپنے بائیں، سامنے اور عقب میں کھڑا کر کے پوچھا "کیا وہ اب بھی نظر آرہا ہے؟" ہر بار رسولِ خداؐ کا جواب اثبات میں تھا۔ پھر انھوں نے اپنے شوہر کو بازوؤں میں بھر لیا تو رسولِ خداؐ نے فوراً کہا: "اب وہ غائب ہوگیا ہے"۔ اس پر حضرت خدیجہؓ بولیں: "یقیناً یہ خدا کا فرشتہ ہی تھا۔ کیونکہ اگر وہ شیطان ہوتا تو یوں بے تکلف پا کر بھی وہ ہمیں گھورنے سے باز نہ آتا"۔ رسولِ خداؐ کے قبیلے کو کفارِ مکہ کی طرف سے تین سال تک خوفناک بائیکاٹ کا سامنا رہا۔ حضرت خدیجہؓ ابتلا کے اس دور میں اپنے شوہر کے ساتھ تھیں۔ اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ عسرت نے ان کی صحت تباہ کر دی تھی۔ انھیں مکہ قبرستان المعلاۃ میں سپردِ خاک کیا گیا اور ان کی قبر آج بھی موجود ہے۔

۲۔ حضرت سَودہؓ ۳۲۷۔ سودہؓ بنت زمعہ مکہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کا تعلق بنو عامر ابنِ لوئی سے تھا۔ پہلے ان کی شادی ایک شخص السکران ابن عمرو سے ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے شوہر سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اور وہی اپنے شوہر کے اسلام لانے کا سبب بنی تھیں۔ دونوں پر مکہ میں اہلِ کفار نے مظالم توڑے جس کے بعد وہ دونوں حبشہ کو

ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد متضاد روایات سامنے آتی ہیں؛ کہا جاتا ہے حبشہ پہنچ کر سکران مرتد ہوگیا اور اس نے عیسائیت قبول کر لی مگر بعض روایات اول الذکر کی نفی کرتی ہیں۔ جو راوی سکران کے قبول عیسائیت کا ذکر کرتے ہیں وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ اس نے کیوں اور کیسے اسلام سے روگردانی کر کے مسیحی مذہب قبول کیا۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سکران کی موت کے بعد سودہؓ مکہ واپس آگئیں۔ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی۔ رسولِ خدا کے متعدد بچے تھے اور کم از کم ان کی دو بیٹیوں کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی چنانچہ انھوں نے کسی نوجوان خاتون پر معمر عورت سے شادی کو ترجیح دی، غالباً اسی لیے کہ نوجوان خاتون غالباً سنِ بلوغ کو پہنچنے والے بچوں سے زیادہ عزت نہ کرا سکتی۔ وہ مورخ جو سکران کے قبولِ عیسائیت کی نفی کرتے ہیں اس کے قبیلہ کی شہرت کو داغدار کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اس کا پورا قبیلہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو سودہؓ سے رسولِ خدا کی شادی کا مقصد بھی مشکل حالات میں اسلام پر استقامت کے لیے انھیں اعزاز بخشنا تھا۔ مورخوں کے مطابق حضرت سودہؓ رسولِ خدا کے بچوں سے بےحد محبت کرتی تھیں۔ انھوں نے بچوں کو حقیقی ماں کا پیار دیا۔ معمر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ سماعت کمزور ہو گئی اور بالآخر وہ بالکل بہری ہو گئیں۔ رسولِ خدا نے ان کے معاملہ میں ہی طلاق رجعی کی ذاتی مثال پیش کی۔ مگر انھوں نے رسول اللہؐ سے کہا: "میرے لیے متاہلانہ زندگی میں کوئی کشش نہیں، میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں یوم نشور میں آپ کی زوجہ کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں۔ چنانچہ رسول اللہؐ انھیں فوراً گھر لے آئے۔ انھوں نے طویل عمر پائی۔ ان کا انتقال خلیفہ عمرؓ کے زمانہ میں ۱۹ھ میں ہوا۔ انھیں مدینہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ

۲۲۸۔ عائشہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں اور ان کا تعلق مکہ کے قبیلہ بنو تیم سے تھا۔ رسولِ خدا کے تعددِ ازواج میں وہ پہلی بیوی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کے دور میں آنحضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت سودہؓ سے انھوں نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے رسول اللہؐ کی شادی ہجرت سے دو سال قبل مکہ میں ہوئی۔ اس وقت وہ ابھی نابالغ تھیں۔ مگر ان کی رخصتی کئی سال بعد ان کے سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد مدینہ میں عمل میں آئی۔ آخر رسولِ خدا نے حضرت عائشہؓ کا رشتہ کیوں طلب کیا؟

۲۲۹۔ ظاہر ہے اس میں کوئی نفسانی خواہش کارفرما نہیں تھی کیونکہ مستقبل قریب میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہؐ کے لیے یہ بڑی مشکلات اور مصائب کا دور تھا۔ جناب ابو طالب انتقال کر چکے تھے اور قبیلہ کی سرداری ابولہب کو مل گئی تھی جو آنحضورؐ کا جانی دشمن تھا۔ اس نے نبیؐ کو قبیلہ کا "باغی" قرار دے دیا تھا۔ رسول اللہؐ کی طرف سے طائف میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کی کوشش بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اور ان دنوں رسولِ خدا مکہ کے ایک غیر مسلم کی پناہ میں دن گزار رہے تھے۔ اس شادی کی وجہ کسی طاقتور حلیف سے ربط بھی نہیں تھی کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ بنو تیم مکہ کے قبائل میں کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے بلکہ ایک شاعر نے تو یہ کہہ کر بنو تیم کا مذاق اڑایا تھا کہ "مکہ میں اہم فیصلہ کرتے وقت بنو تیم کو مشاورت میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔"

۲۴۰۔ ابوبکرؓ ظہورِ اسلام سے قبل بھی رسولِ خدا کے گہرے دوست تھے اور دونوں کا ایک دوسرے کے

گھروں میں آناجانا تھا۔ یُوں رسولِ خدا حضرت عائشہؓ کو ان کی پیدائش کے وقت سے ہی جانتے تھے ۔ وہ دیکھتے تھے کہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ عائشہؓ کتنی ذہانت اور فطانت کا مظاہرہ کر رہی ہیں ۔ وہ اس عظیم دور کے ان بچوں میں سے تھیں جو مسلمان والدین کے گھر تولد ہوئے تھے ۔ گویا وہ پیدائشی مسلمان تھیں ۔ ان سے شادی کر کے رسولِ خدا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اپنے تعلقات مستحکم تر کرنا چاہتے تھے ، پھر وہ نوعمر عائشہ کو اسلامیات اور فقہ کی عظیم عالِم بنانے کے خواہاں تھے ۔ چونکہ ان کی عمر ابھی بہت کم تھی اس لیے یہ باور کرنے کی خاص وجوہ تھیں کہ وہ رسولِ خدا کے بعد کافی دیر زندہ رہیں گی (اُن کا انتقال رسولؐ پاک کے وصال کے ۴۸ سال بعد ہوا) چنانچہ ان سے وابستہ تمام اُمیدیں بر آئیں ۔ وہ نہایت متقی خاتون تھیں جن کے شب و روز نوافل اور روزے میں گزرتے تھے ۔ وہ اتنی فیاض تھیں کہ جب انھیں دربارِ خلافت سے ششماہی پنشن موصول ہوتی وہ اسی روز تمام رقم ناداروں اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتیں ۔ ان کی ایک خادمہ سے روایت ہے : ایک روز انھیں پنشن موصول ہوئی جو خلیفہ عمرؓ نے بھجوائی تھی ۔ انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ اُس میں سے فلاں فلاں کو اتنی اتنی رقم دے دی جائے ۔ چنانچہ اسی طرح ساری پنشن ختم ہوگئی ۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ محترمہ آپ آج روزہ سے ہیں اور شام کو افطاری کے لیے گھر میں کچھ نہیں ، تو انھوں نے جواب دیا : تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ، خیر کوئی بات نہیں ، اللہ سب سے بڑا ہے ۔

۱۴۳ ۔ جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے انھیں اپنے دَور میں اسلامی قانون ——— جو ان کا خاص میدان تھا ——— عربی شاعری ، زمانہ قبل از اسلام کی تاریخِ عرب ، ریاضی ، علم الادویات اور متعدد دیگر علوم کی ماہر تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اُس دَور کے عظیم ترین مسلم ماہرینِ قانون کو جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ حضرت عائشہؓ سے رجوع کرتے اور عموماً ان کے جواب سے مطمئن ہو جاتے ۔ روایات میں آیا ہے کہ بسا اوقات جب کسی مسئلہ پر ماہرینِ قانون کی رائے ان کے سامنے پیش کی جاتی تو وہ سنتے ہی اس کے نقائص بیان کر دیتیں جو یہ ماہرینِ قانون بھی تسلیم کر لیتے ۔ بلاشبہ وہ رسولؐ اللہ کی حدیث اور سنّت کی ایک بہترین عالم تھیں اور انھیں اس دور کا عظیم محدث تصوّر کیا جاتا ہے ۔ ہم نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ نہایت ذہین اور سکالر خاتون تھیں ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسلمان خواتین کے لیے پردہ کا حکم ابھی نہیں آیا تھا ۔ ایک روز ایک عرب سردار عُیینہ بن الحسن الفزاری رسولؐ اللہ سے ملاقات کے لیے آیا ۔ رسولؐ پاک اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تھے ۔ چنانچہ مہمان کو اسی گھر میں بُلایا گیا جس نے حضرت عائشہ کی بے حد تعریف کی ۔

۱۴۴ ۔ حضرت عائشہؓ نہایت دُبلی پتلی خاتون تھیں ، ان کے دُبلا پتلا اور کمزور سا ہونے کے باعث ایک مرتبہ نہایت سنگین اُلجھن پیدا ہوگئی ۔ یہ ۵ ھ کا واقعہ ہے ، وہ بنو المصطلق کے خلاف فوجی مہم میں نبی کے ہم رکاب تھیں ۔ جب مہم سے لشکرِ اسلام واپس آ رہا تھا ایک روز علی الصبح وہ حوائج ضروریہ کے لیے پڑاؤ سے دُور چلی گئیں ، وہ جب واپس آئیں تو دیکھا کہ اسلامی فوج کوچ کر چکی ہے ۔ جس ملازم کو حضرت عائشہؓ کے اُونٹ پر محمل رکھنے کا فرض سونپا گیا تھا اس نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ ام المومنین محمل میں نہیں ہیں کیونکہ وہ بہت ہی دُبلی پتلی تو تھیں ۔ لشکرِ اسلام کو نہ پا کر حضرت عائشہ بے حد گھبرائیں اور مایوسی کے عالم میں انھوں نے اپنے سراپا پر چادر لپیٹ لی اور زمین پر لیٹ گئیں ۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسلمان سپاہی جو اتفاق سے پیچھے

رہ گیا تھا ادھر سے گزرا، اس نے حضرت عائشہؓ کو پہچان لیا۔ انھیں یُوں لیٹا دیکھ کر اسے سخت صدمہ ہوا اور وہ ڈر گیا کہ ام المومنینؓ کے ساتھ یقیناً کوئی سنگین حادثہ رونما ہوا ہے۔ اس نے حضرت عائشہ کو آواز دی جب اسے ام المومنینؓ کے اتفاقاً پیچھے رہ جانے کا علم ہوا تو اس نے اپنا اونٹ زمین پر بٹھا دیا۔ پھر وہ اونٹ سے کچھ پرے چلا گیا تاکہ ام المومنینؓ آزادی سے اُونٹ پر سوار ہو سکیں۔ جب آپؓ سوار ہو گئیں تو اس نے مہار پکڑ لی اور اُونٹ کے آگے آگے پیدل روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ اسلامی لشکر سے جا ملا۔ اس وقت لشکرِ اسلام یا تو راستے میں تھا یا دوپہر سے قبل اگلے پڑاؤ پر پہنچ کر لشکری اُونٹوں پر سے اپنا سامان اتار رہے تھے۔ فطری طور پر ام المومنین کے پیچھے رہ جانے کی اطلاع پڑاؤ میں پھیل گئی تاہم کسی کو اس میں کوئی مشکوک بات نظر نہ آئی۔ ہمیں ابن اُبَیّ تو یاد ہو گا جو مدینہ کا بادشاہ مقرر کیا جانے والا تھا مگر یہ منصوبہ اس وقت تبدیل کر دیا گیا جب مدینہ کے لوگوں نے رسولِؐ خدا کی صورت میں بہتر تبادل پا لیا۔ ظاہر ہے ابن اُبَیّ اس واقعہ کو نہیں بھولا تھا۔ اس نے نبیؐ کو کبھی معاف نہ کیا اور پُوری زندگی ان کے لیے مسائل و مشکلات کھڑی کرتا رہا۔ اسی ابنِ اُبَیّ کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے حضرت عائشہ صدیقہ کے بارے میں فضول بکواس شروع کر دی، اس پر بعض دوسرے لوگ بھی باتیں بنانے لگے۔ بالآخر ان افواہوں کے بارے میں مدینہ میں رسولؐ خدا کو رپورٹ پیش کی گئی۔ نبیؐ نے اپنی زوجہ سے تو کچھ نہ کہا مگر حضرت عائشہؓ نے رسولِ خدا کے رویّہ میں سرد مہری کو محسوس کر لیا جس نے محبت کی گرمی کی جگہ لے لی تھی۔ ام المومنینؓ کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہؐ سے اپنے میکے جانے کی اجازت طلب کی تاکہ چند روز اپنے والدین کے ساتھ گزار سکیں۔ رسولِ خدا نے اِدھر اُدھر سے پُوچھ گچھ کی۔ حضرت عائشہ کی خادمہ اور بعض دوسرے افراد سے بھی سوالات کیے گئے مگر کسی نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی تھی جس کے لیے حضرت عائشہؓ کو ہدفِ ملامت بنایا جا سکے۔ رسول اللہؐ نے دیکھا کہ واقعات کے اصل حقائق معلوم کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی لوگوں کی زبان تھامنا ممکن ہے تو وہ برہم ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے گھر گئے تاکہ عائشہؓ اور ان کے والدین سے بات کر سکیں۔ وہاں اُنھوں نے حضرت عائشہ کے والدین کی موجودگی میں اپنی زوجہ سے کہا: اگر تم نے کوئی غلطی کی ہے تو بہتر ہے اس کے لیے خدا سے معافی طلب کرو۔ خدا سے کوئی بات ڈھکی چُھپی نہیں، پھر روزِ حشر کے بجائے اس دُنیا میں معافی طلب کرنا بہتر ہے۔ حضرت عائشہ اپنے شوہر محترم کی باتیں سُن کر جذباتی ہو گئیں، اُنھوں نے والدین سے کہا: "انھیں جواب دیجیے۔" مگر انھوں نے کہا "ہماری عزیز از جان بیٹی! بھلا ہم ایسے معاملہ میں کیا جواب دیں جس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔" حضرت عائشہؓ جذباتی صدمہ سے سنبھل گئیں، خود پر قابو پایا اور نہایت مختصر مگر انتہائی پُر اثر بات کی۔ انھوں نے رسولِ خدا کو بتایا کہ وہ معصوم ہیں اور اپنی معصومیت کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتیں، بلکہ انھوں نے سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے جو حاضر و ناظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے، اور وہ اس ضمن میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتیں۔ اچانک سب لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ پر وہ مخصوص حالت طاری ہو گئی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی۔ جلد ہی یہ حالت ختم ہو گئی تو رسول اللہؐ نے حضرت عائشہؓ کو مبارکباد دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پاک دامنی کی تصدیق کی ہے (قرآن ۲۴/ ۱-۲۰) اس پر حضرت عائشہؓ واپس رسول اللہؐ کے گھر میں آگئیں اور انھیں حسبِ سابق نبیؐ کی شفقت اور محبت حاصل ہو گئی۔

۳۴۳ - ہم آگے چل کر دوبارہ حضرت عائشہؓ کا ذکر کریں گے اور دیکھیں گے کہ ام المومنینؓ کو عدل و انصاف سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔ زندگی کے اولیں دور میں وہ کھیل کود کو پسند کرتی تھیں۔ اور روایت ہے کہ ایک بار انھوں نے رسولؐ اللہ کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ بھی کیا تھا اور وہ نبیؐ سے تیز دوڑنے والی ثابت ہوئیں۔ اس کے کئی سال بعد بھی حضرت عائشہؓ نے ایک بار پھر رسولِ پاک کے ساتھ دوڑ لگائی مگر عمر کے ساتھ اب وہ نسبتاً فربہ ہوگئی تھیں۔ لہٰذا وہ ہار گئیں۔ رسولؐ پاک نے پیار سے کہا: "یہ اُس وقت کا بدلہ ہے۔"

۴ - حضرت حفصہؓ

۳۴۴ - حضرت حفصہؓ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ وہ مکی تھیں اور ان کا تعلق بنو عدی سے تھا۔ ان کی شادی ایک پرہیزگار مسلمان سے ہوئی تھی جو جنگِ اُحد میں شہید ہو گئے۔ ابھی وہ جوان ہی تھیں لہٰذا ان کے والد ان کے نکاح ثانی کے لیے اچھے سے بر کی تلاش میں تھے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے گہرے دوست ابوبکرؓ سے نکاح کے لیے کہا مگر وہ خاموش رہے۔ پھر انھوں نے حضرت عثمانؓ کو پیشکش کی جو رسولِ پاک کے داماد تھے مگر حال ہی میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ انھوں نے بھی معذرت کرلی کیونکہ وہ رسولؐ اللہ کی دُوسری بیٹی سے شادی کی توقع لیے بیٹھے تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ کے جذبات مجروح ہوئے اور انھوں نے رسولؐ اللہ سے شکایت بھی کہ ان کے بہترین دوستوں نے ان کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کردیا ہے حالانکہ وہ بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ رسولِؐ خدا عمرؓ کی باتوں سے متاثر ہوئے اور بولے: "پروا نہ کرو، میں عثمانؓ کے لیے تمھاری بیٹی سے بہتر بیوی کا انتظام کردوں گا اور تمھاری بیٹی کو عثمانؓ سے بہتر شوہر ملے گا۔" رسولؐ خدا عثمانؓ کے عقد میں اپنی دوسری بیٹی دے کر انھیں اعزاز بخشنا چاہتے تھے اور حضرت عمرؓ کی بیوہ بیٹی سے خود شادی کر کے عمرؓ کے وقار میں اضافہ کے خواہشمند تھے۔ اس فیصلہ پر ہر شخص نے اظہارِ مسرت کیا۔ بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضرت عمرؓ کو اپنی خاموشی کی وجہ بتادی۔ انھوں نے کہا: میرا خیال تھا کہ رسولؐ خدا آپ کی صاحبزادی سے عقد کرنا چاہتے ہیں مگر میں قبل از وقت اس کا انکشاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حضرت عمرؓ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے اور دونوں میں پرانی دوستی از سرِ نو زندہ ہوگئی۔ نبیؐ سے نکاح کے وقت حضرت حفصہؓ کی عمر ۲۲ سال تھی۔ وہ عقل و دانش میں کسی سے کم نہ تھیں۔ وہ عرب کی ان معدودے چند خواتین میں سے تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ اُنھوں نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ ان سے حضورؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں۔ رسولِ پاک کے بعد خلیفہ عمرؓ ان سے قانون سازی، خصوصاً خواتین کے متعلق امور میں مشورہ لیا کرتے تھے۔

۵ - حضرت زینبؓ اُم المساکین

۳۴۵ - زینب بنت خُزیمہ کا تعلق نجد کے بہت بڑے قبیلہ عامر ابن صعصعہ سے تھا۔ ان کی شادی مکہ میں رسولؐ اللہ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ ۲ھ میں ان کے شوہر عبیداللہ ابن الحارث ابن المطلب نے جنگِ بدر میں جامِ شہادت نوش کیا۔ چنانچہ حضرت زینبؓ نے مدینہ میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مسلمان تھیں اور نجد میں اپنے قبیلہ میں جانا نہیں چاہتی تھیں جو اسلام نہیں لایا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں اور نجد کے اس طاقتور قبیلہ کے درمیان تعلقات کس حد تک بگڑ چکے تھے۔ اس قبیلہ کے

لوگوں نے دھوکے سے بئرِ معونہ کے مقام پر مسلمان مبلغوں کے ایک وفد کو شہید کر دیا تھا۔ بعد میں اس قبیلہ کے دو مسلمان افراد کو بئرِ معونہ کے قتلِ عام میں زندہ بچ جانے والے ایک مسلمان نے قتل کر دیا تھا ـــــ یہ مسلمان اس قتلِ عام کے وقت موقع پر موجود نہیں تھا بلکہ وہ اپنے رفقا کے اونٹ چرانے کے لیے چراگاہ میں گیا ہوا تھا ـــــ اس نے جن دو مسلمانوں کو قتل کیا ان کے قبولِ اسلام کا بھی اسے علم نہیں تھا۔ ان حالات کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ضروری تھا۔ پیغمبرؐ نے خیال کیا کہ اگر وہ زینبؓ سے نکاح کر لیں تو ہو سکتا ہے اسلام کے متعلق اس قبیلے کی معاندانہ روش میں نرمی پیدا ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے قبیلہ میں زینب کی بڑی عزت کی جاتی تھی، وہ اتنی فیاض تھیں کہ قبولِ اسلام سے قبل ہی انھیں "اُمّ المساکین" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا تاہم ان کی صحت ٹھیک نہ تھی اور شادی کے صرف تین ماہ بعد مدینہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف تیس سال تھی۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینبؓ کی وفات کے بعد اب رسولِ خدا کی صرف تین بیویاں سودہؓ، عائشہؓ اور حفصہؓ رہ گئیں۔

۶۔ اُمِّ سلمہ ہند

۳۴۶۔ اُمِّ سلمہ بنت ابو اُمیہ مکّی تھیں۔ ان کا تعلق اہم قبیلہ بنو مخزوم سے تھا اور وہ خالد ابن ولید کی قریبی عزیزہ تھیں۔ حضرت اُمِّ سلمہ اور ان کے شوہر ظہورِ اسلام کے ابتدائی دور میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور انھوں نے اسلام کے لیے بیحد کام کیا۔ اپنے خاندان کے ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کے لیے دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، وہاں سے واپسی پر وہ مدینہ جانا چاہتے تھے کہ ام سلمہ کے والدین نے اسے زبردستی روک لیا، تاہم ان کے شوہر ابو سلمہ مدینہ چلے گئے۔ ام سلمہ کے والدین نے ان کے بچّے کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی مگر ام سلمہ کو بچّے کی جدائی گوارا نہ تھی، بچّے کے لیے والدین سے ام سلمہ کی جدوجہد کے دوران بچّے کا ایک بازو اکھڑ گیا اور عمر بھر کے لیے بیکار ہو گیا۔ ام سلمہ کے والدین اسے مدینہ جانے سے روک سکتے تھے مگر وہ اسے زبان بند رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ام سلمہ روزانہ کعبۃ اللہ میں جا کر اپنے خاندان کے لیے بلند آواز سے بددعا کرتیں:

"خدا کرے گدھ آسمانوں سے اُتریں اور پُورے خاندان کو ہضم کر جائیں۔"

ان کے اہلِ خاندان تنگ آ گئے اور بالآخر اُنھوں نے کہا: "جاؤ، جہاں چاہو چلی جاؤ۔" اور ام سلمہ اکیلی مدینہ روانہ ہو گئیں اور اپنے خاوند سے جا ملیں۔ مگر ابھی ان کے مصائب کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ جلد ہی جنگِ اُحد (۳ ہجری) میں ان کے شوہر نے جامِ شہادت نوش کیا۔ بدقسمت خاتون کے پاس آہوں اور نوحوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ گو ان کی عمر کافی ہو چکی تھی اور ان کے متعدد بچّے بھی تھے تاہم رسولِ خدا نے جو بنو خزیمہ کی بڑی عزّت کرتے تھے، ام سلمہ سے نکاح کرنے اور ان کے زخمی دل پر پھاہا رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُمِّ سلمہ کے لیے یہ غیر متوقع اعزاز تھا۔ گو وہ اپنے مرحوم شوہر سے بے حد محبت کرتی تھیں مگر وہ رسولِ خدا کی پیشکش کو مسترد نہ کر سکیں۔ خالد ابنِ ولید اُس وقت اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ مگر جب رسولِ خدا نے ام سلمہؓ سے نکاح کر لیا اور یُوں خالد کے قریبی رشتہ دار بن گئے تو

ان کی دشمنی میں ٹھہراؤ آ گیا۔ کوئی دو سال بعد وہ بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ام سلمہؓ بھی عرب کی ان چند خواتین سے تھیں جو پڑھنا جانتی تھیں۔ انھوں نے طویل عمر پائی، ان کا سنِ انتقال ۶۱ ہجری ہے۔ وہ رسولِ خدا کے وصال سے پچاس سال بعد تک زندہ رہیں۔ وہ عمدہ شاعرہ تھیں۔ انھوں نے حضورؐ کی بہت سی احادیث و روایات آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑی ہیں۔ ان کے پہلے شوہر سے ایک بیٹی زینب تھیں جو آگے چل کر اسلام کی نامور ماہر فقہ قرار پائیں۔ زینب حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں اس لیے حبشہ کی زبان بھی جانتی تھیں۔ ام سلمہ نے حبشہ کے متعدد گرجا گھروں کا مطالعہ کیا تھا اور وہ بتایا کرتی تھیں کہ کس طرح ان گرجا گھروں کو عیسائی شخصیات کی تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔

۷۔ زینب بنت جحش

۳۴۷۔ رسولؐ کی یہ زینب نام کی دوسری زوجہ مطہرہ تھیں۔ ان کے والد شمالی عرب کے رہنے والے تھے جو بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر مکہ میں بس گئے تھے۔ انھوں نے رسولِ خدا کی ایک پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب سے شادی کی تھی۔ جحش کا پورا خاندان ابتدا ہی میں اسلام قبول کر چکا تھا اور پورا خاندان ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آ گیا تھا۔ ان کی عمر ۳۶ سال تھی مگر یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آیا وہ کنواری تھیں، بیوہ تھیں یا مطلقہ تھیں۔ رسولِ خدا اسلامی معاشرہ میں، جو وجود میں آ رہا تھا، غلاموں کی حیثیت بہتر بنانا چاہتے تھے اور ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ کر دینا چاہتے تھے کہ آزاد پیدا ہونے والے شہری اور کسی غلام کے درمیان اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تعصبات کے خاتمہ کے لیے ضرب کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نبیؐ نے اپنی پھوپھی زاد زینب سے کہا کہ وہ زید بن حارثہ سے شادی کر لیں۔ زید رسولِ پاکؐ کا غلام تھا جسے حضورؐ نے آزاد کر کے متبنّٰی بنا لیا تھا۔ زینب خود رسولؐ سے شادی کی خواہش رکھتی تھیں اور اُنھوں نے منت مان رکھی تھی کہ اگر ان کا یہ ارمان پورا ہو جائے تو وہ چھ ماہ تک روزے رکھیں گی۔ فطری طور پر وہ کسی سے اپنی خواہش یا منت بیان نہیں کر سکتی تھیں۔ ان حالات میں وہ زید ابن حارثہ سے شادی کی تجویز پر خوش نہیں تھیں لیکن پارسا مسلمان ہونے کی حیثیت میں زینب اور ان کے والدین نے رسولِ خدا کی تجویز قبول کر لی۔ مورخوں کے مطابق زینب کا تعلق ایک متمول خاندان سے تھا اور وہ زبان کی بھی ذرا تیز تھیں۔ چنانچہ زید سے ان کا ساتھ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان اکثر ناگوار حالات پیدا ہو جاتے اور رسولِ خدا ہمیشہ مداخلت کر کے ان میں مفاہمت کراتے۔ وہ فریقین کو اعتدال کی تلقین بھی کرتے۔ زید نے ایک حبشی خاتون ام ایمن سے بھی شادی کر رکھی تھی جو رسولِ پاکؐ کی والدہ محترمہ کی خادمہ تھیں۔ ان کے بطن سے زید کا ایک بیٹا اسامہ بھی تھا جس سے رسولِ خدا بڑی محبت کرتے تھے اور جو آگے چل کر اسلامی افواج کا سپہ سالار بھی بنا۔ رسول اللہؐ ایک روز حسبِ معمول زید بن حارثہ کے گھر گئے۔ میاں بیوی میں پھر جھگڑا ہوا تھا جس پر زید نے نہ صرف زینب کے رویہ کی شکایت کی تھی بلکہ یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ وہ زینب کو طلاق دے دیں گے۔ رسول اللہؐ نے زید کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر میاں بیوی کے درمیان مفاہمت کرانے کی خاطر ان کے مکان پر گئے۔ اس وقت زید گھر پر نہ تھے۔ زینب نے جب گھر کے دروازے پر نبیؐ کو بتایا کہ زید گھر پر نہیں ہیں تو وہ یہ کہتے ہوئے دروازہ پر سے ہی لوٹ آئے "اللہ اکبر، وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔"

مورخوں کا بیان ہے کہ گو زینب کی عمر ۳۶ برس ہو چکی تھی، وہ نہایت خوش رو تھیں اور زرد رنگ کے لباس میں بہت خوبصورت

دکھائی دیتی تھیں۔ اُنھوں نے بھی دروازہ کے اندر رسولؐ پاک کے مُنہ سے نکلنے والا کلمہ سُن لیا۔ زید گھر آئے تو زینب نے اپنے شوہر سے رسولؐ اللہ کی آمد اور ان کے جملہ کا تذکرہ کیا۔ زید نے رسولؐ اللہ کی بات کا مطلب غلط سمجھا۔ دراصل رسولِؐ خدا کا مطلب یہ تھا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ زید اپنی بُوڑھی حبشی بیوی کے ساتھ تو خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہے مگر اس خوبصورت خاتون سے اس کی بَن نہیں آتی۔ زید تیر کی طرح رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور بولے "اگر آپ پسند کریں تو میں زینبؓ کو طلاق دیئے دیتا ہوں"۔ رسولِؐ خدا نے زید کو پھر ٹھنڈا کیا اور اسے اعتدال کی تلقین کی۔ کچھ عرصہ بعد جب زید کے لیے زینب کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہ رہا تو انھوں نے زینب کو طلاق دے دی۔ رسولِ خدا کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ انھیں اس بات کا بیحد افسوس تھا کہ اُنھوں نے زینب کو زید سے شادی پر مجبور کیا تھا۔ اب وہ اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ عدت کی میعاد ختم ہونے کے بعد رسولِؐ خدا نے حضرت زینبؓ سے شادی کی پیشکش کی۔ زینبؓ کو اتنی والہانہ خوشی ہوئی کہ اُنھوں نے رسولؐ کا پیام لے کر آنے والے کو چند منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور اندر جا کر نوافلِ شکرانہ ادا کیے۔ پھر رسولؐ پاک کی تجویز پر اثبات میں جواب دیا۔ ان کی زندگی بھر کی خواہش پُوری ہوگئی تھی۔ انھوں نے پیام بر کو قیمتی تحفوں سے بھی نوازا۔ رسولِ خدا کے اس اقدام سے کافروں کے اس قدیم عقیدہ پر کاری ضرب لگی کہ لے پالک بیٹا (متبنیٰ) حقیقی بیٹے کی مانند ہوتا ہے اور اس کی مطلقہ سے باپ کی شادی روا نہیں۔ اگرچہ قرآن نے کفار کے اس رواج کو ختم کر دیا تھا بلکہ اسے ابدی نیند سُلانے کے لیے کسی ذی وقار مثال کی ضرورت تھی۔ یہ مثال خود رسولؐ اللہ نے پیش کر دی۔ اگرچہ زید ابن حارثہ سے زینب کی شادی تھوڑا عرصہ قائم رہی لیکن اس کے اسلامی معاشرے پر دُور رس اثرات مرتب ہوئے کہ اس کے بعد معاشرے میں آزاد شدہ غلاموں کو کسی تعصب کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انھیں اسلامی معاشرہ میں اتنا بلند مقام حاصل ہوا کہ تاریخ میں شاہی خاندانوں کی بنیاد رکھی۔ حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ ہجری میں ہوا۔

۸۔ حضرت جویریہؓ ۳۴۸۔ جویریہ بنت الحارث کا تعلق بنو المصطلق سے تھا۔ یہ قبیلہ اسلام کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ جب بنو نضیر کے یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا تو بنو المصطلق ان کے حامی بن گئے اور ان کی کرایہ کی فوج میں شامل ہوگئے۔ وہ جنگِ خندق کے دوران مدینہ کے محاصرہ میں بھی شامل ہونا چاہتے تھے۔ رسولؐ اللہ مدینہ کے شمال کی طرف دُومۃ الجندل کے باسیوں کی سرکوبی کے لیے گئے ہوئے تھے جو مدینہ کی طرف آنے والے رسد کے قافلوں کو خیبر کے یہود کے ایما پر ہراساں کرتے تھے۔ دراصل دشمنوں کی چال یہ تھی کہ جب رسولؐ خدا مُٹھی بھر مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے دور انتہائی شمال میں چلے جائیں تو مدینہ پر اجتماعی حملہ کر دیا جائے۔ اس سازش میں بنو غطفان، اہلِ مکہ، بنو سُلیم اور دوسرے دشمنانِ اسلام شامل تھے۔ ان کے منصوبے میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مدینہ پر حملہ کے ساتھ رسولِؐ خدا کو بھی شمال میں ہی گھیر لیا جائے، اس وقت وہ اپنے ہیڈ کوارٹر سے بھی دُور ہوں گے۔ لیکن رسولؐ اللہ کو اس ناپاک منصوبے کا علم اس وقت ہوگیا جب وہ بنو غطفان کے علاقہ میں تھے۔ چنانچہ وہ تیزی سے پلٹے اور مدینہ پہنچ کر شہر کے گرد خندق کی کھدائی اور دوسرے دفاعی انتظامات میں مصروف ہوگئے۔ دفاعی اقدام کے طور پر اسی دوران میں انھوں نے اسلامی فوج کا ایک دستہ لے کر بنو المصطلق پر چھاپہ مارا جو مدینہ پر

حملہ کے لیے لشکر اکٹھا کر رہے تھے۔ بنو المصطلق مسلمانوں کی طرف سے اچانک حملہ پر گھبرا گئے، انھیں رسول اللہؐ سے ایسے اقدام کی توقع نہیں تھی، ان کے قدم نہ جم سکے اور قبیلہ کے مرد افراتفری کے عالم میں فرار ہو گئے۔ اسلامی فوج نے ان کی عورتوں، بچوں، گھوڑوں اور دوسرے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ رسولؐ پاک اس قبیلہ کے ساتھ دشمنی میں اضافہ نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ بنو المصطلق کے دل جیتنا چاہتے تھے۔ قبیلہ کے جنگی قیدیوں کو اسلامی لشکر میں بطور مالِ غنیمت تقسیم کر دیا گیا۔ مگر رسولِ خداؐ چاہتے تھے کہ اسلامی فوج کے ارکان از خود یہ مالِ غنیمت اس کے اصل وارثوں کو لوٹا دیں۔ اس مقصد کے لیے محض سفارش کے بجائے کسی بڑے اقدام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ رسولؐ نے قبیلہ کے سردار کی نوجوان بیٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اُس کے تمام رشتہ دار پیغمبر کے رشتہ دار بن گئے۔ اس کے فوراً بعد اسلامی لشکر نے سارا مالِ غنیمت واپس کر دیا۔ چنانچہ جب بنو المصطلق کی عورتیں اور بچے رہا ہو کر واپس پہنچے تو اُنھوں نے نبیؐ کی رحم دلی کی داستان مردوں کو سنائی۔ چنانچہ بنو المصطلق کے مرد مدینہ آئے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد یہ قبیلہ اسلام کا زبردست حلیف ثابت ہوا۔ حضرت جویریہؓ نہایت متقی خاتون تھیں وہ رات نوافل میں اور دن روزے سے گزارتیں۔ انھوں نے طویل عمر پائی۔ ان کا انتقال ۵۰ھ میں ہوا۔ ان سے بھی متعدد احادیث مروی ہیں۔

۹۔ حضرت اُمِ حبیبہؓ ۳۴۹۔ وہ مکی تھیں، ان کا تعلق قبیلہ بنو اُمیہ سے تھا، وہ ابو سفیان کی بیٹی تھیں (ان کا ایک بھائی معاویہ آگے چل کر خلیفہ بنا) اُمِ حبیبہ اور ان کے شوہر نے اوائل میں ہی اسلام قبول کیا تھا وہ ان مسلمانوں میں شامل تھے جنھوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ ان کا شوہر شراب کا رسیا تھا ——— ان دنوں ابھی اسلام میں شراب پر پابندی نافذ نہیں ہوئی تھی ——— حبشہ جانے کے بعد ان کا شوہر عیسائیت کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے اپنی رفیقہ حیات کو بھی اپنے نقشِ قدم پر چلنے پر مجبور کیا مگر اُمِ حبیبہؓ نے مزاحمت کی اور اسلام کا دامن استقامت سے تھامے رکھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اُمِ حبیبہ کا شرابی شوہر حبشہ میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ چنانچہ رسولِ خداؐ اُمِ حبیبہؓ کو اسلام پر استقامت کا صلہ دینا چاہتے تھے اور اُنھوں نے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ اس وقت اُم حبیبہ حبشہ میں تھیں۔ چنانچہ شاہِ نجاشی نے وہاں شادی کی تقریب منائی اور پھر دُلھن کو تحائف دے کر اسلامی سفیر کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا۔ وہ رسول اللہ کے ساتھ اپنی شادی سے اس قدر خوش تھیں کہ جب نجاشی کی ایک کنیز نے اُنھیں یہ خوشخبری سنائی تو انھوں نے اپنے کنگن اور دُوسرے تمام زیورات جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھیں اتار کر کنیز کو بطور تحفہ دے دیے۔ یہ شادی ۶ ہجری میں ہوئی، اس کے فوراً بعد ہی صلح حدیبیہ کا معاہدہ عمل میں آیا جس کی اہلِ مکہ نے خلاف ورزی کی۔ ان دنوں ابو سفیان مکہ میں نہیں تھے بلکہ تجارتی قافلہ لے کر شام گئے ہوئے تھے۔ جب وہ مکہ لوٹے اور انھیں معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کے بارے میں اہلِ مکہ کی حماقت کا علم ہُوا تو وہ فوراً مدینہ پہنچے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی رسول اللہؐ سے بات کرے اور نبیؐ کو اہلِ مکہ کے حق میں ہموار کرے تاکہ معاہدہ کو نئی زندگی مل سکے۔ مگر حضرت اُمِ حبیبہؓ اسلام کی اس قدر شیدائی تھیں کہ ان کی نظر میں خاندانی تعلقات ہیچ تھے۔ یہاں تک کہ جب ابو سفیان ان سے ملنے گئے تو اُنھوں نے اپنے باپ کو اس

بوریے پر بیٹھنے کی اجازت نہ دی جس پر رسولؐ اللہ بیٹھا کرتے تھے۔ اُنھوں نے کفارِ مکہ کے لیے کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آخری فیصلہ صرف رسولؐ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب ابُوسفیان نے نبیؐ سے بات کی تو وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ ابوسفیان یہ جانے بغیر واپس چلا گیا کہ مسلمان اب اہلِ مکہ سے جنگ کریں گے یا صلح پر قایم رہیں گے (ہم اُوپر بتا چکے ہیں کہ مکہ پر رسولِ خدا نے کس طرح قبضہ کیا تھا) اُمِ حبیبہ کی زندگی زُہد و تقوٰی سے عبارت تھی۔ اُنھوں نے بھی طویل عمر پائی، ان کا انتقال ۹ د ہجری میں ہُوا۔ اُنھوں نے احادیث اور سنّتِ رسولؐ کے بارے میں نہایت قابلِ قدر روایات کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

۱۰۔ صفیہ بنت حیی

۳۵۰۔ ان کا تعلق یہود سے تھا۔ ۷ھ ہجری میں جب رسولِ خدا نے خیبر فتح کیا تو وہ مالِ غنیمت میں لشکرِ اسلام کے ہاتھ لگیں۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ رسولِ خدا نے ان سے شادی کر لی تھی۔ وہ خود بھی رسولِ خدا سے شادی کی خواہشمند تھیں کیونکہ انھوں نے خواب میں ایسا ہوتے دیکھا تھا ——— اور ہمس سے خیبر فتح کرنے والی مُسلم فوج کی مشکلات میں بے حد کمی ہو گئی ——— رسولؐ اللہ نے صفیہ کو بتایا کہ انھیں خیبر کے یہودیوں پر حملے کا افسوس ہے، مسلمان جنگ نہیں چاہتے۔ انھوں نے وضاحت سے بتایا کہ مسلمان اسلامی مملکت اور اسلام کے دفاع کے لیے خیبر کے خلاف فوج کشی پر مجبور ہوئے ہیں۔ رسولِ خدا کی دُوسری ازواجِ مطہرات نے تصدیق کی ہے کہ حضرت صفیہ نہایت متقی اور پارسا مسلمان تھیں۔ رسولِ خدا کے خاندان میں حضرت صفیہؓ کے دستر خوان کی بڑی شہرت تھی۔ وہ فیاض مگر مُسرف نہ تھیں۔ وہ ۵۰ھ ہجری تک زندہ رہیں۔ انھوں نے خاصی دولت پس انداز کی تھی۔ ان کا ایک بھتیجا تھا جو یہودیت سے چمٹا رہا۔ اسلام نے والدین سے ——— خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں ——— حُسنِ سلوک کی جو تلقین کی ہے، اور اس رعایت سے کہ ترکہ میں حصہ دار افراد کے سوا دُوسروں کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے، فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت صفیہ نے اپنی جائداد کا تیسرا حصہ اسی بھتیجے کے نام ہبہ کر دیا۔ اس پر بعض مسلمانوں نے شدید اعتراض کیا مگر حضرت عائشہ آڑے آئیں اور انھوں نے اصرار کیا کہ صفیہ کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت عایشہؓ کا یہ اقدام ان کی انصاف پسندی پر دال ہے حالانکہ رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ کے دوران حضرت عایشہؓ اور حضرت صفیہؓ کے درمیان کئی بار تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ ایک روز حضرت عائشہؓ نے کسی کام سے حضرت صفیہ کو آواز دی: "او یہودن کی بیٹی! ذرا سُننا۔" اس پر حضرت صفیہؓ کو سخت رنج ہوا اور اُنھوں نے رسولؐ اللہ سے شکایت کی۔ رسولؐ پاک نے انھیں مستقبل میں (حضرت عائشہؓ کو) یہ جواب دینے کے لیے کہا: "میرا باپ اللہ کا رسول ہارون ہے، میرا چچا پیغمبر مُوسٰی اور میرا شوہر محمدؐ رسول اللہ ہے، بھلا تم میں کون ایسی جامع صفات ہے۔" مگر حضرت عائشہؓ کو بھی خاموش کرنا آسان نہ تھا۔ انھوں نے فوراً کہا: "او یہودن کی بیٹی! یہ جواب تیرے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔" تاہم بعد میں وہ دونوں پکّی سہیلیاں بن گئیں۔ جب حضرت صفیہؓ بسترِ مرگ پر تھیں تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا اگر میری کسی بات سے تمھیں کبھی دُکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف کر دو۔ حضرت صفیہؓ نے بھی موت سے قبل رسولؐ اللہ کی ان ازواجِ مطہرات سے جو اُس وقت بقیدِ حیات تھیں اپنے کہے سُنے کی معافی طلب کی۔ صفیہؓ بھی متعدد احادیث کی راوی ہیں۔ ان کا انتقال ۵۰ ہجری میں ہوا۔

۱۱۔ حضرت میمونہؓ ۳۵۱۔ میمونہؓ بنت الحارث کا تعلق نجد کے قبیلہ امیر ابن صعصعہ سے تھا۔ وہ حضرت زینبؓ ام المساکین کی سوتیلی بہن تھیں۔ وہ نو بہنیں تھیں اور سبھی کی شادی مختلف قبائل کے سرداروں سے ہوئی تھی۔ حضرت میمونہؓ بیوہ تھیں اور مکہ میں تھیں۔ جب رسول اللہؐ ۷ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے وہاں گئے۔ ان دنوں حضرت زینبؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ممکن ہے رسول اللہؐ قبیلہ امیر ابن صعصعہ اور ان تمام قبائل سے قریبی تعلقات قایم کرنا چاہتے ہوں جن کے سرداروں سے حضرت میمونہؓ کی بہنیں بیاہی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے ان دنوں اہلِ مکہ سے مسلمانوں کی صلح ہو چکی تھی۔ صلح نامہ کے مطابق رسول اللہؐ کو مکہ میں صرف تین دن قیام کرنا تھا۔ چنانچہ مقررہ مدت ختم ہونے کے بعد کفارِ مکہ کا ایک وفد رسول اللہؐ کے پاس آیا اور مطالبہ کیا کہ رسولِ خدا مکہ سے چلے جائیں۔ رسول اللہؐ نے اہلِ مکہ سے کہا" اگر میں کچھ دیر اور قیام کروں تو تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ میں نے ابھی شادی کی ہے اور میں پورے شہر کو دعوتِ ولیمہ میں مدعو کرنا چاہتا ہوں۔" مگر کفارِ مکہ نے کہا کہ وہ ضیافت کھانا نہیں چاہتے، رسول اللہؐ نے اپنی سی کوشش کی مگر وہ کفارِ مکہ کو قائل نہ کر سکے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ خدا پندرہ سو مسلح سپاہیوں پر مشتمل فوج کے ساتھ مکہ پر قابض تھے اور اہلِ مکہ اپنے گھر چھوڑ کر شہر سے باہر نواحی پہاڑیوں اور وادیوں میں جا چکے تھے۔ کوئی اور جرنیل ہوتا تو شہر پر مستقل قبضہ جما لیتا اور شہر کے سابق باسیوں کو واپس اپنے گھروں میں آنے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن وہ اللہ کے رسولؐ تھے جنھیں قرآن نے رحمۃ للعالمین کا لقب عطا کیا ہے، وہ بنی نوعِ انسان کے لیے کوئی معمولی مثال قایم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضرت میمونہؓ کا انتقال ۵۱ ہجری میں ہوا، وہ بھی متعدد احادیث کی راوی ہیں۔

۳۵۲۔ یہ رسولؐ پاک کی گیارہ ازواج مطہرات تھیں۔ دو کا قبل ازیں انتقال ہو چکا تھا تاہم ایک وقت میں نبیؐ کی ازواج کی تعداد نو سے زیادہ نہیں رہی۔

رسولِ خدا کی عادات

۳۵۳۔ مختلف روایات متفق ہیں کہ رسولِ خدا جسم اور لباس کی طہارت و صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی، کبھی کبھار وہ بال بھی بڑھا لیتے تھے مگر وہ بالوں کو نہایت صاف ستھرا اور کنگھی سے سنوار کر رکھتے تھے۔

۳۵۴۔ وہ تیز تیز چلتے تھے حتّٰی کہ ان کے صحابہ کو ان کے ساتھ قدم ملانے میں دقت پیش آتی تھی۔ مگر وہ گفتگو نہایت آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ ایک راوی کے مطابق " نبیؐ اتنا ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے کہ ان کے ہر لفظ کا ایک ایک حرف بآسانی گنا جا سکتا تھا۔" چونکہ رسولؐ کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ قانون تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ کہیں سننے والے اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ وہ سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے تھے، خواہ وہ کسی فرد سے گفتگو کر رہے ہوں یا مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے ہوں، ان کا طرزِ تکلم ہر طرح کے تصنّع سے پاک ہوتا تھا۔

۳۵۵۔ حضورؐ نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے جوتوں کی خود مرمت کرتے، اپنی بکریوں کا دودھ

دوہتے اور اس کام کے لیے اپنے خادم کو تکلیف دینا بھی گوارا نہ کرتے۔ ان کے ذاتی خادم حضرت انسؓ کا کہنا ہے: "میں نے دس سال رسول اللہؐ کی خدمت اقدس میں گزارے، انھوں نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا یا کیوں کیا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے نہایت شفقت فرماتے تھے۔"

۲۵۶۔ رسول اللہؐ ننھے منّے بچوں سے بڑا پیار کرتے تھے اور جہاں کہیں بچّوں کو دیکھتے خوش ہو جاتے اور بچوں کو ہنسانے کے لیے ان سے مذاق بھی کرتے۔ فطری طور پر وہ اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بھی بےحد محبت کرتے۔ بسا اوقات وہ نماز کے دوران بھی ان میں سے ایک کو بازوؤں میں اٹھا لیتے۔ جب وہ سجدہ میں جاتے تو نواسے کو پاس کھڑا کر لیتے اور سجدہ سے اُٹھ کر اسے پھر گود میں لے لیتے۔ جب دونوں بچے ذرا سیانے ہوئے تو وہ مسجد نبوی میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے، نماز باجماعت کے دوران کبھی کبھار وہ رسول اللہؐ کی ٹانگوں میں سے گزر جاتے، رسولِ خدا انھیں کچھ نہ کہتے۔

۲۵۷۔ اللہ کے رسولؐ ہر ایک سے مشفقانہ برتاؤ کرتے، حتیٰ کہ معمر خواتین ان سے لمبی لمبی بے سروپا باتیں بھی کرتیں مگر رسولِ خدا کوئی اکتاہٹ محسوس نہ کرتے۔ یہ خواتین اُنھیں بازو سے پکڑ کر ٹھہراتیں اور رسولِ خدا نہایت شفقت سے ان کی باتیں سنتے اور اپنا بازو بھی نہ چھڑاتے۔

۲۵۸۔ سفر کے دوران وہ قافلہ کے ہر فرد کے ساتھ رابطہ رکھتے اور بار بار لوگوں کے پاس جاتے تاکہ وہ خوش رہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر وہ اپنے پرانے دوست حضرت جابرؓ کے پاس گئے جو اپنے بوڑھے اونٹ پر سوار جا رہے تھے۔ حضورؐ نے خود پر اس طرح سنجیدگی طاری کر لی کہ کوئی بھی دیکھنے والا سمجھ سکتا تھا کہ نبیؐ مذاق فرما رہے ہیں ——— پھر انھوں نے جابرؓ سے پُوچھا "کیا تم اپنا اونٹ میرے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، مگر ایک شرط پر کہ میں اُونٹ مدینہ واپس جا کر آپ کے سپرد کروں گا" جابرؓ نے جواب دیا

"پر لوگے کیا؟"

"آپ بتائیے۔"

"ایک درہم میں بیچو گے؟" رسولِ خدا نے کہا

"اے اللہ کے نبی! آپ مجھے لُوٹنا چاہتے ہیں۔" جابرؓ پکارا

"تو چلو دو درہم لے لو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تو تین، چار، پانچ۔" رسول اللہؐ نے قیمت بڑھائی اور بالآخر چالیس درہم تک پہنچ گئے اور حضرت جابرؓ رضا مند ہو گئے۔ پھر رسولِ خدا نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور قافلے میں کسی اور شخص سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔ مدینہ واپس پہنچ کر جابرؓ نے اپنی زوجہ سے تمام ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ کس طرح دورانِ سفر رسولِ خدا سے خوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نیک بخت کچھ زیادہ ہی محتاط تھی اور اس نے حضرت جابرؓ سے اصرار کیا کہ وہ رسول اللہؐ کی بات کو مذاق تصور نہ کریں بلکہ

اونٹ رسولؐ اللہ کے گھر لے جائیں۔ جب رسولؐ اللہ کو اطلاع ملی تو وہ مسکرائے اور انھوں نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ جابر کو چالیس درہم ادا کر دیے جائیں۔ رسولؐ اللہ نے وہ اونٹ بھی بطور تحفہ دوبارہ جابر کے حوالے کر دیا۔ یہ اونٹ اس کے بعد بھی کئی سال تک حضرت جابرؓ کے پاس رہا۔ جب بھی جابر کو اس واقعہ کی یاد آتی اور وہ رسولؐ پاک کے اس یادگار تحفے کو دیکھتے تو نبیؐ کی یاد میں کھو جاتے۔

۳۵۹۔ اللہ کے نبی جانوروں پر بھی بڑی شفقت فرماتے۔ ایک روز حضورؐ فوجی دستے کی معیت میں جا رہے تھے کہ ایک صحابی حضورؐ کے پاس کسی پرندے کے چند چھوٹے چھوٹے بچوں کو لایا، ان کی ماں بھی ساتھ تھی، رسولِ خدا نے اس سے پوچھا تو صحابی نے بتایا "میں نے ان بچوں کو ایک گھونسلے میں دیکھا، جونہی میں ان کے قریب گیا ان کی ماں پرواز کر گئی، میں نے تمام بچوں کو اپنے رومال میں لپیٹ لیا، جب میں چلا تو ان کی ماں بھی میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے رومال کو زمین پر کھول کر رکھ دیا تو ماں بھی بچوں کے پاس آ گئی اور میں نے اسے بھی بچوں کے ساتھ رومال میں لپیٹ لیا۔ اب یہ سب آپ کے سامنے ہیں۔" رسولِ خدا نے صحابی کو حکم دیا کہ وہ فی الفور واپس جائے اور بچوں کو ان کی ماں سمیت ان کے گھونسلے میں چھوڑ کر آئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ رسولؐ پاک نے فوج کے ہمراہ جاتے ہوئے ایک کُتیا کو دیکھا جس کے بچے ماں کا دودھ پی رہے تھے حضورؐ نے ایک سپاہی کو کُتیا کے پاس کھڑا کر دیا، اسے حکم دیا گیا کہ وہ ساری فوج گزرنے تک کُتیا کے پاس کھڑا رہے اور کسی کو اسے پریشان نہ کرنے دے۔

ایک روز مدینہ میں ایک اُونٹ بھاگتا ہوا آیا اور رسولؐ اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی چند افراد بھی وہاں پہنچ گئے جو اُونٹ کو پکڑنا چاہتے تھے۔ رسولِ خدا نے ان سے ماجرا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ "اُونٹ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور اب وہ کنوئیں سے پانی کھینچنے کا کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہم اسے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔" رسولؐ اللہ کو اُونٹ پر رحم آ گیا۔ انھوں نے کہا "اسے چراگاہ میں چھوڑ دو، اس نے تمھاری طویل عرصہ تک خدمت کی ہے، اسے اب "پنشن" پر جانے کا حق ملنا چاہیے۔" اُونٹ کے مالک رسولؐ اللہ کی بات سے متفق ہو گئے اور اونٹ کو واپس لے گئے۔

۳۶۰۔ ایک اور سفر کے دوران حضورؐ چند دوستوں کی معیت میں تھے۔ اُنھوں نے صحرا میں ملنے والے ایک گڈریے سے بھیڑ خریدی۔ حضورؐ کے ایک رفیقِ سفر نے کہا "میں بھیڑ کو ذبح کر لیتا ہوں۔" تو میں اس کی کھال اتار دوں گا۔" دوسرے صحابی نے ذمہ داری لی۔ تیسرے صحابی نے گوشت پکانے اور کھانا تیار کرنے کی حامی بھر لی۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کام اپنے ذمے لے لیا۔ تو رسولؐ خدا نے کہا "میں جا کر خشک لکڑیاں اکٹھی کرتا ہوں۔" تمام صحابہؓ نے جو موجود تھے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! یہ کام بھی ہم سب کیے لیتے ہیں مگر رسولِ پاک نے فرمایا: "میں لکڑیاں ضرور لاؤں گا، یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ آپ سب لوگ تو کام کریں اور میں کوئی مدد نہ کروں۔"

۳۶۱۔ رسولؐ اللہ صحابہؓ سے مذاق بھی فرمایا کرتے تھے اور صحابہ اس سے لطف اٹھاتے۔ حضورؐ کا ایک سادہ لوح سا صحابی تھا جو کوئی زیادہ خوش رُو نہ تھا۔ ایک دن رسولؐ اللہ نے اسے مدینہ کے بازار میں جاتے دیکھا حضورؐ دبے پاؤں پیچھے سے اس کے پاس گئے، اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور بولے: "کیا کوئی یہ غلام خریدنا چاہتا ہے۔" صحابی نے گردن موڑ کر دیکھا کہ اسے

کس نے بازوؤں میں لے رکھا ہے۔ رسولؐ اللہ کو دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے اپنی پشت حضورؐ کے سینے کے ساتھ زور سے لگاتے ہوئے کہا "یارسولؐ اللہ! اِس غلام کی فروخت سے آپ کو کچھ زیادہ رقم نہیں ملے گی"۔ رسولؐ اللہ نے اسے چھوڑ دیا اور بولے "مگر خدا کی نظروں میں تمھاری قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔"

۲۶۲ - ایک روز ایک اجنبی رسولؐ اللہ کے پاس آیا۔ رسولِ خدا نے اسے کھلایا پلایا اور رات گزارنے کے لیے بستر بھی دیا۔ وہ کوئی نادان دشمن تھا، اس نے بستر خراب کر دیا اور علی الصبح چلا گیا۔ یُوں وہ اللہ کے رسولؐ سے اپنی تصوراتی دشمنی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ کچھ دُور جا کر اسے احساس ہوا کہ وُہ اپنی تلوار تو رسولؐ اللہ کے گھر میں ہی چھوڑ آیا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آیا اس نے دیکھا کہ اللہ کا رسولؐ اسی بستر کو اپنے دستِ مبارک سے دھو رہا ہے۔ جب رسولِ پاک نے "مہمان" کو دیکھا تو انھوں نے اس کی تلوار اٹھا کر اس کے حوالے کر دی، انھوں نے اجنبی کو ملامت تک نہ کی۔ الغرض بدو پر حضورؐ کے اس اخلاق کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے رسولؐ اللہ سے معافی طلب کی اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

۲۶۳ - ایک روز مسجد میں رسولِ خدا نے ایک شخص کو دیکھا جس کی ڈاڑھی اُلجھی ہوئی تھی اور سر کے بالوں میں کنگھی تک نہیں کی گئی تھی۔ رسولؐ اللہ نے اسے مسجد سے باہر جا کر ہاتھ مُنہ دھونے اور بالوں میں کنگھی وغیرہ کرنے کو کہا۔ جلد ہی وہ حجام کی دکان سے واپس آیا تو رسولؐ پاک نے کہا "کسی خوفناک شیطان کی مانند نظر آنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے؟" ایک اور موقع پر رسولؐ پاک نے ایک مسلمان کو نہایت خستہ حالت میں دیکھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوُئے تھے اور بدن پر جھول رہے تھے۔ جب رسولؐ اللہ نے اس سے ایسی حالت کا سبب پُوچھا تو اس نے بتایا "یارسولؐ اللہ! میں کوئی غریب شخص نہیں اللہ نے مجھے کافی دولت دی ہے مگر میں سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیتا ہوُں اور خود جھوٹے موٹے پر اکتفا کرتا ہوُں"۔ اس پر رسولؐ اللہ نے کہا "یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو جن نعمتوں سے نوازا ہے وہ بندے کو ان نعمتوں سے مستفید ہوتے دیکھنا بھی پسند کرتا ہے۔"

۲۶۴ - رسولؐ پاک کی ایسی بامعنی اور روحانی اصلاح کرنے والی باتوں پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر اوپر جو بیان ہوا ہے اس سے رسولِ خدا کی بہترین انسانی صفات اور ان کے مثالی معاشرتی رویہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

باب ۱۳

دورِ نبویؐ کا معاشرہ

۲۶۵ - آج کی اقوام دراصل ماضی کے قبائل ہیں ۔ رسولِ خدا کے دور میں قبیلہ ہی معاشرہ کا فیصلہ کن عنصر تھا جسب نسب انسان کی شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ پاسپورٹ اور قانونِ وقت تھا ۔ ہر جگہ ، ہر محفل میں قبیلہ ہی تسلیم شدہ حقیقت تھی اور فرد اپنے رہائشی علاقہ کے بجائے قبیلہ کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا تھا ۔ ان کی سوچ بالکل منطقی تھی ، وہ سمجھتے تھے کہ زمین انسان کے لیے ہے ، انسان زمین کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا ۔

۲۶۶ - قبائل دو قسم کے تھے : ایک وہ جو مختلف علاقوں میں آباد تھے اور دُوسرے وہ جو خانہ بدوش تھے ۔ آباد قبائل تہذیب یافتہ تھے جبکہ خانہ بدوش ابھی تہذیب کی روشنی سے آشنا نہیں تھے ۔ شروع میں تو تمام قبائل خانہ بدوش ہی رہے ہوں گے تاہم جن قبائل کو ایسے خطے میسر آ گئے جہاں وافر مقدار میں پانی اور سدا بہار چراگاہیں موجود تھیں ، تو انھیں مزید صحرا نوردی کی ضرورت نہ رہی ۔ کیونکہ یہی دو چیزیں ——— پانی اور چراگاہ ——— ان کی بنیادی ضرورت تھیں سانہی پر ان کی زندگی کا انحصار تھا ، وہ خانہ بدوش اسی لیے تھے کہ جب ایک جگہ سے پانی یا چراگاہ ختم ہو جاتی تو وہ قُوتِ لایموت کی تلاش میں چل نکلتے ۔ جن قبائل کو صحرائے عرب میں پانی اور مستقل چراگاہ نصیب نہ ہوئی ، وہ صحرا نوردی پر مجبور رہتے ۔ سرسبز وادیوں میں آباد اور صحراؤں کی خاک چھاننے والے دونوں قسم کے قبائل کے پاس مویشیوں کے گلّے تھے ، ان میں بالعموم اونٹ اور بھیڑ بکریاں شامل ہوتی تھیں ۔ مگر وادیوں میں آباد قبائل نسبتاً زیادہ خوشحال تھے ۔ وہ پانی کی بدولت کھیتی باڑی کرتے ، اناج اگاتے اور کھجوروں کے درخت بھی لگاتے تھے ۔

۲۶۷ - یہ ضروری نہیں کہ ایک قبیلہ ہی کسی جگہ آباد ہو یا سارا قبیلہ ہی خانہ بدوش اور صحرا نورد ہو بلکہ ایک ہی قبیلہ کے بعض خاندان تو آباد تھے اور بعض صحرا نوردی کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ میں خود ۱۹۴۶ء میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دورِ نبویؐ کا مشہور قبیلہ قریش (جو مکہ میں آباد تھا) آج بھی مکہ کے گرد و نواح میں موجود ہے اور ابھی تک خانہ بدوش اور بدوی زندگی گزار رہا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ممتاز مورخ علامہ البلاذری (صاحب انساب الاشراف) نے اپنی کتاب میں بنو قریش کی جو دو اقسام قریش البطا (وہ قریشی جو نخلستانوں میں آباد ہو گئے تھے) اور قریش الظواہر (خانہ بدوش) بیان کی ہیں وہ بالکل درست ہیں ۔

۲۶۸ - کسی بھی قبیلہ میں خواہ وہ آباد ہو یا خانہ بدوش ، تمام افراد ایک ہی جد امجد کی اولاد نہیں ہوتے تھے ۔ ان میں غلام اور لونڈیاں اور دیگر قبائل سے بیاہ کر لائی جانے والی لڑکیاں بھی شامل ہوتی تھیں ۔ ان " فطری بیگانوں " کے علاوہ قبائل میں کچھ اور لوگ بھی آ شامل ہوتے تھے ، عرب فطرۃً بڑے مہمان نواز ہیں ۔ چنانچہ کوئی عرب اپنے مہمان کو یا کسی ایسے شخص کو

جو اس کی پناہ میں آجائے اُس (پناہ گزین) کے دشمنوں کے سپرد کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کی انا یہ گوارہ نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی پناہ میں آنے والوں کو نکال باہر کرے۔ چنانچہ "سیاسی پناہ" صحرائے عرب میں ایک مقدس اقدام تھا جسے واپس نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اور عرب اپنی پناہ میں آنے والوں پر جان قربان کرنا فخر تصور کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے "غیر قبائلی" بھی اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے کسی قبیلہ میں سیاسی پناہ حاصل کر لیتے تھے اور پھر اُسی قبیلے کے ہو جاتے تھے۔ یہ سیاسی پناہ گزین، حلیف یا قبیلہ کی پناہ میں آنے والے دوسرے لوگ ہر قبیلہ میں ——— خواہ وہ خانہ بدوش تھا یا آباد ——— پائے جاتے تھے۔ وہ اپنے میزبان قبیلے میں شادی بھی رچا سکتے تھے اور یُوں بتدریج اسی قبیلہ کا حصہ بن جاتے تھے۔ مکہ اور طائف میں ایسے پناہ گزینوں کی تعداد کافی تھی مگر مدینہ بھی اس شعبہ میں دوسرے شہروں سے پیچھے نہ تھا۔

۳۶۹۔ یہ عجیب بات ہے کہ مدینہ صحرائے عرب کے شمال میں واقع ہے مگر مدینہ کے باسیوں کی اکثریت کا تعلق جنوبی عرب سے تھا اور وہ یمن سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے جبکہ مکہ اور طائف میں آباد قبائل اپنے اسلاف کو شمالی عرب کا باسی بیان کرتے تھے۔ اگرچہ شمالی اور جنوبی عرب کے ان باشندوں کے درمیان اختلافات اور قبائلی تعصبات موجود تھے مگر وہ سب ایک ہی زبان ——— عربی ——— بولتے تھے۔ پھر دونوں فریقوں میں باہم شادی بیاہ اور رشتے ناطے عام تھے جن کی وجہ سے قبائلی رقابتوں میں کمی ہو رہی تھی۔

۳۷۰۔ صحرائے عرب میں مقامی بولیاں بھی تھیں مگر ان کا تعلق الفاظ کے تلفظ سے تھا۔ چونکہ عام عرب اَن پڑھ اور جاہل تھے لہٰذا ظہورِ اسلام سے قبل کے دور میں دستاویزات ناپید ہیں۔ البتہ اس دور کی بعض پتھروں پر کُھدی ہوئی عبارتیں ملتی ہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد کے مورخوں نے قبل از اسلام کی بعض نادر تحریریں فراہم کی ہیں جو اگرچہ تقریباً مبہم اور ناقابلِ فہم ہیں۔ میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں: عظیم شاعر امراۃ القیس جس نے بازنطینی شہنشاہ جسٹنین کے پاس پناہ حاصل کر رکھی تھی اور جس کا انتقال[1] انقرہ میں ہوا تھا، اس زبان سے نابلد تھا جو سبعہ معلقات[2] کعبہ میں استعمال کی گئی ہے۔ امراۃ القیس یمن کے علاقہ کندہ کے حکمران کا بیٹا تھا۔ کندہ پر جب حبشہ والوں نے فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا تو امراۃ القیس فرار ہو کر انقرہ پہنچ گیا۔ یمن کے گورنر ابرہہ نے جو شاہِ حبشہ کا ماتحت تھا، مآرب کے بند پر ایک تحریر چھوڑی ہے جو یمنی زبان میں ہے جبشہ کی زبان میں نہیں اب یہ شائع بھی ہو چکی ہے۔ یہ تحریر اس عربی میں ہرگز نہیں جو عربی سبعہ معلقات میں استعمال کی گئی ہے جو امراۃ القیس کے قصائد تصور ہوتے ہیں۔

---

[1] ایک معروف روایت کے مطابق امراۃ القیس کو انقرہ میں قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ شہنشاہ جسٹنین کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ شاہ اس بات کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے عظیم شاعر کو قتل کرا دیا۔

[2] "سبعہ معلقات" سات قصیدے تھے جو انتہائی فصیح عربی میں لکھے گئے تھے۔ روایت ہے کہ یہ قصیدے امراۃ القیس نے لکھے تھے۔ انھیں کعبہ میں لٹکایا گیا تھا تاکہ کوئی اور ان کا جواب پیش کر سکے۔ (مترجم)

۲۷۱ ۔ عربوں میں ثقافت کے تمام فطری آثار موجود تھے ، وہ شاعری سے آشنا تھے ۔ ضرب الامثال ان میں عام تھیں ، لوک کہانیاں ، مقامی تاریخ کے واقعات جو زبانی بیان کیے جاتے اور ایسی ہی دیگر چیزیں ان میں موجود تھیں ۔ تحیر خیز بات یہ ہے کہ ظہور اسلام سے قبل ہی گرام اور شعروں میں ردیف و قافیہ مکمل طور پر ترقی یافتہ شکل میں موجود تھے اور گزشتہ چودہ سو سال میں ان میں عملی طور پر کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی ۔ قرآن حکیم نے عربی زبان ، گرامر ، ہجوں اور تلفظ کو ایک معیار بخشا ۔ قرآن کی زبان بالکل ویسی ہے جیسی زبان ہم عربی اخبارات و جرائد میں پڑھتے ہیں یا عالم عرب کے ریڈیو کی نشریات میں سنتے ہیں ۔ یہ بات اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ عربی جاننے والا ہر شخص قرآن حکیم کی زبان سمجھ سکتا ہے اور دوسری قدیم یا جدید زبانوں یونانی ، عبرانی ، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کی کتابوں کی طرح قرآن پاک کے معانی کو سمجھنے کے لیے دُور از کار مفروضوں یا قیاس آرائیوں پر انحصار کی ضرورت نہیں ۔ ظاہر ہے ایک ابدی دین اور ایک ایسے رسولؐ کی تعلیمات کے لیے جس کے بعد کوئی اور نبی پیدا نہیں ہوگا ، ایسی ہی ابدی اور مستقل زبان کی ضرورت تھی ۔

معاشرتی آداب

۲۷۲ ۔ اُس وقت کوئی تربیتی سکول تو تھے نہیں ، چنانچہ خاندان کی بڑی بوڑھیاں ہی بوقتِ ضرورت دایہ کا کام انجام دیتی تھیں اور یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتیں ۔ جونہی بچہ تولد ہوتا گھر کا کوئی مرد ——— بسا اوقات خود رسولِ خدا ——— اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہتا (ان دونوں میں توحید و رسالت کے اعلان کے ساتھ دونوں جہانوں میں فلاح کے لیے اللہ کی عبادت کی تلقین کی گئی ہے) اس طرح جو پہلی آواز نومولود کے کان میں پڑتی ہے ، ایک اچھا مشورہ ہوتا ہے ۔ ممکن ہے یہ رسم زمانہ جاہلیت کی کسی اسی نوع کی رسم کی برگزیدہ شکل ہو تاہم اس سلسلے میں کوئی روایت نہیں ملتی ۔

۲۷۳ ۔ مدینہ میں نومولود کو ماں کے دُودھ سے قبل کھجور چبا کر بھی دی جاتی تھی اور کبھی شہد چٹایا جاتا تھا ۔

۲۷۴ ۔ بچّے کا نام رکھنے کے ضمن میں بھی ایک مختصر سی تقریب منعقد ہوتی ۔ گو اس موقع پر رکھا گیا نام بعد میں تبدیل کیا جا سکتا تھا یا اس کے آگے پیچھے اضافہ کیا جا سکتا تھا ۔ بالعموم ہر عرب بچے یا بچی کو اس کے باپ کے نام پر پکارا جاتا تھا ، مثلاً اے فلاں کے بیٹے ، یا او فلاں کی بیٹی ۔ بچّے کا اصل نام شاذ ہی استعمال کیا جاتا تھا ۔ پھر عربوں میں کنیت کا رواج تھا ، مثلاً اے فلاں کے والد ، یا اے فلاں کی ماں ۔ ضروری نہیں تھا کہ شادی کے بعد یا اولاد ہونے کے بعد ہی کسی کو فلاں کے باپ یا فلاں کی ماں کہہ کر پکارا جائے ، بلکہ اوائل عمر میں بچّوں کو بھی اسی طرح پکارا جاتا تھا ۔ عموماً کنیت پہلے بیٹے کے نام سے رواج پاتی تھی ۔ لڑکی کے نام پر کنیت خال خال تھی ۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ کو ابو حفصہؓ کہہ کر پکارا جاتا تھا (حفصہؓ ان کی بیٹی تھیں جو رسول اللہؐ سے بیاہی ہوئی تھیں) گو حضرت عمرؓ کے لڑکے بھی تھے مگر ان کی کنیت ان کی ذی قدر بیٹی کے نام پر رواج پائی ۔ بعض فرضی کنیتیں بھی موجود تھیں ۔ مثلاً حضرت علیؓ کو بُوتراب (مٹی کا باپ) کی کنیت خود حضورؐ پاک کی طرف سے ودیعت ہوئی ۔ رسول اللہؐ نے ایک روز حضرت علیؓ کو زمین پر سوتے دیکھا ۔ ان کا بدن مٹی سے لتھڑا ہوا تھا ۔ اس پر رسولؐ نے انھیں " بوتراب " کہہ کر پکارا تھا ۔ اسی طرح رسول اللہؐ کے ایک صحابی کو ابوہریرہؓ

(بلی کا باپ) کہا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ ابوہریرہ ایک روز جنگل سے ننھی مُنّی سی بلی پکڑ لائے اور اسے پالنے لگے۔ ان کے اہلِ خاندان، دوستوں یاروں اور ملنے والوں نے انھیں ابوہریرہ کہنا شروع کر دیا۔ یہ کنیت اتنی مقبول ہوئی کہ بالآخر خود ابوہریرہ بھی اپنا اصلی نام[1] ترک کر کے خود کو ابوہریرہ ہی کہنے لگے۔ اگر کسی کو کسی دوسرے شخص کے باپ کا نام معلوم نہ ہوتا تو اسے بلانے کے لیے وہ اس کے قبیلہ کا نام استعمال کرتا، مثلاً "اے قریش کے بیٹے" یا "اے قریش کی بیٹی"۔ کبھی کبھار "اے قریش کے بھائی" یا "اے قریش کی بہن" کہہ کر بھی پکارا جاتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مخاطب کسی قبیلہ کے جدِ امجد کا کوئی حقیقی بھائی یا بہن ہے۔ قرآن پاک میں کنواری مریم کو "عمران کی بیٹی" اور "ہارون کی بہن" کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ ہارون عمران کا بیٹا تھا اور وہ حضرت مریم کا بھائی نہیں بلکہ ان کے اسلاف میں سے تھا۔

۳۷۵۔ عرب میں بچوں کے نام محض خیالی یا مادی اجسام کے نام پر بھی رکھے جاتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی گو اس دستور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تاہم دینی وجوہ کی بنا پر بعض نام متروک قرار پائے۔ ظاہر ہے اسلام میں عبدالشمس (سورج کا پجاری) عبدالکعبہ (کعبہ کا پجاری) عبدالجن (جن کا پوجنے والا) جیسے نام برداشت نہیں کیے جا سکتے تھے حتیٰ کہ عبدالمحمد جیسا نام بھی رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ رسول اللہؐ نے ناموں میں معاشرتی اور جمالیاتی حس کی بنا پر تبدیلی کی سفارش کی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں میں ظالم، غاوی، کلیب (کُتّا) وغیرہ نام جو ان دنوں عام تھے، رکھنے کی سختی سے ممانعت کر دی (نبی خدا نے اسی بنیاد پر بعض علاقوں کے نام بھی تبدیل کر دیے تھے) درختوں، پتھروں اور جنگلی جانوروں کے نام پر رکھے جانے والے نام مباح قرار پائے، جو زمانہ قبل از اسلام میں بھی مروّج تھے۔ ان ناموں میں طلحہ، سمورہ، عوسجہ، ثمامہ اور ہرملہ مختلف درختوں اور پودوں کے نام ہیں۔ اسد، بکر، ثعلبہ اور ارقم جانوروں کے نام ہیں۔ اور حجر کے معنی پتھر ہیں۔

عقیقہ

۳۷۶۔ بچہ تولد ہونے کے چند روز یا چند ہفتے بعد اس کا سر پہلی بار منڈوایا جاتا۔ اس موقع پر خاندان والوں کی دعوت بھی کی جاتی تھی۔ ایک بھیڑ ذبح کی جاتی اس کا کچھ گوشت تو مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا اور باقیماندہ دعوت کے لیے استعمال ہوتا۔ بچے کے بالوں کے برابر چاندی (بعض صورتوں میں سونا) خیرات کی جاتی۔ ظہورِ اسلام سے قبل اس موقع پر ذبح کیے جانے والے جانور کا خون بچے کے سر پر ڈالا جاتا مگر اسلام میں اس کی ممانعت کر دی گئی، تاہم اس کی جگہ بچے کے سر پر کوئی خوشبو خصوصاً زعفران مل دی جاتی۔ (دیکھیے ابوداؤد اور مالک)

۳۷۷۔ بچوں کی ایک اور رسم جو صرف لڑکوں کے لیے ہے ختنہ ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں تاہم یہ رسم اوائل عمر میں ہی ادا کی جاتی ہے جب بچے کو ابھی برہنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ انجیل کے مطابق یہ رسم حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی اطاعت و رضا کے معاہدہ کی علامت کے طور پر جاری کی تھی۔ مگر اسلام تو کیا ظہورِ اسلام سے ماقبل کی

---

[1] حضرت ابوہریرہ کا اصل نام عبداللہ اور کنیت ابوعمر تھی۔ مگر ان کا لقب ابوہریرہ اس قدر مشہور رہا کہ ان کا نام اور کنیت اس کی شہرت کی گرد میں دب گئے اور ابوہریرہ ہی ان کی کنیت ٹھہری۔ (مترجم)

عربی لوک کہانیوں میں بھی اس کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ اسے صحت و صفائی کے ضمن میں ایک اقدام تصور کیا جاتا ہے۔

۳۷۸ ۔ دور اسلامی میں بعض دوسری رسوم بھی موجود تھیں ۔ مثلاً جب بچہ لکھنا پڑھنا شروع کرتا یا پہلی بار قرآن پاک ختم کرتا یا بچہ پہلی بار روزہ رکھتا اور دیگر ایسے ہی مواقع پر خاندان میں تقریبِ مسرت منعقد کی جاتی (فطری طور پر ختمِ قرآن وغیرہ کی تقریب رسولِ خدا کی حیاتِ طیبہ کے بعد ہی شروع ہوئی ہو گی کیونکہ رسول اللہ کے دور میں تو قرآن پاک کا نزول تقریباً آخر وقت تک جاری رہا ہے)

۳۷۹ ۔ شادی نہ صرف متعلقہ خاندان بلکہ معاشرہ کے لیے سب سے اہم تقریب ہوتی ہے۔ زمانہ ماقبل اسلام کے عرب میں بھی شادی کی پُرمسرت تقریب منائی جاتی تھی ۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی یہ تقریب بدوؤں اور شہری خاندانوں میں بدستور رائج رہی ۔ اس ضمن میں خود رسولِ خدا کی زندگی کے بعض واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں : ایک روز طائف سے ہجرت کر کے آنے والے ایک مسلمان المغیرہ ابن شعبہ نے رسول اللہ کو بتایا کہ اس نے مدینہ کی ایک لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ رسول اللہ نے مُغیرہ سے پوچھا : "کیا تم نے لڑکی کو دیکھ رکھا ہے ؟" مغیرہ نے نفی میں جواب دیا تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا " شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لو کیونکہ بعد میں پچھتانے کی نسبت یہ (لڑکی کو دیکھنا) کہیں بہتر ہے۔" رسولؐ کے ایک صحابی نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ اس صحابی نے ایک لڑکی کو چوری چھپے دیکھ لیا تھا مگر لڑکی کو اس کا علم نہ تھا اور بعد میں صحابی نے اس لڑکی سے شادی کی تجویز پیش کی۔

۳۸۰ ۔ مدینہ میں پیشہ ور گانے والی لڑکیاں (غالباً لونڈیاں) موجود تھیں جو دف اور جھانجھ بھی بجاتی تھیں ۔ ایک روز ایک گانے والی لڑکی نے رسول اللہ کو آتے دیکھ لیا تو اس نے وہ نظم جو وہ گا رہی تھی ——— یہ نظم کسی جنگ کے سورماؤں کے بارے میں تھی ——— چھوڑ دی اور بولی : " اور ہم میں ایک پیغمبر موجود ہے جو بتا سکتا ہے کہ کل کیا ہو گا۔" اس پر رسول اللہ نے لڑکی سے کہا : " یہ نہیں وہی گاؤ جو تم پہلے گا رہی تھیں۔"

روایت ہے کہ دُلہن کے دُولہا کے گھر جاتے وقت رات کو مشعل بردار جلوس نکالا جاتا تھا ۔ ایک روز رسولِ خدا نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ کو بتایا " میں تمہارے عم زاد کی شادی میں شریک تھا مگر وہاں موسیقی نہ تھی ، کیا بات ہے ! مدینہ کے باسی تو موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔"

۳۸۱ ۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دُلہنوں کا میک اپ کیا جاتا تھا ، اُن کے ہاتھ پاؤں پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے اور انھیں خوشبو میں بسایا جاتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دارِم کا پودا رسول اللہ کے دور میں مکہ یا مدینہ میں متعارف ہو چکا تھا یا نہیں ۔ ماہر نباتیات الدینوری کے زمانے میں خواتین اپنے ہونٹوں کو سُرخ کرنے کے لیے دارِم کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی مسواک استعمال کرتی تھیں ۔ چنانچہ متعدد عشقیہ نظموں میں دارِم سے سُرخ کیے گئے لبوں کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں ۔ دُلہنوں کی طرح دُولہوں کو بھی سنوارا اور سجایا جاتا تھا اور انھیں بھڑکیلے رنگوں کا لباس پہنایا جاتا تھا ۔ بہت سے لوگ ، رشتہ دار ، دوست اور احباب شادی میں شریک ہوتے اور دعوتِ ولیمہ میں شرکت کرتے جو شادی کے بعد ہوتی ۔ شادی عموماً دُلہن کے گھر میں ہوتی

اس تقریب کے ضمن میں مسجد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ گو دُلہن شادی کے وقت سامنے نہیں آتی تھی مگر اس کے قریبی رشتے دار باپ، چچا، ماموں یا بھائی اس کی رضامندی حاصل کرتے تھے۔ اس موقع پر نکاح خواں خطبہ پڑھتا۔ وہ دُلہن اور اس کے اہل خاندان کی رضامندی بھی حاصل کرتا۔ وہ دُولہا کی رضامندی (ایجاب و قبول) بھی حاصل کرتا۔ اس موقع پر کم از کم دو گواہوں کی موجودگی ناگزیر تصور کی جاتی۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اُن دنوں مدینہ میں شادی کی کوئی تحریری دستاویز تیار کی جاتی تھی۔ رسولِ خدا نے مسلمانوں کی شادی کے لیے مہر ضروری قرار دے دیا تھا جو صرف اور صرف دُلہن کا حق ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام میں بیوی کی جائداد علیحدہ رہتی ہے اور شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ لہٰذا مہر کسی حد تک بلا جواز طلاق کی راہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ نکاح خواں کی طرف سے نکاح کے خاتمہ اور نئے جوڑے کے لیے دعائے خیر کے بعد یہ رسم تھی کہ دُولہا کے اُوپر سے اور آس پاس چھوہارے، مصری کی ڈلیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ رسولِ خدا کی موجودگی میں جب چھوہارے وغیرہ پھینکے گئے تو بعض لوگوں نے اُنھیں "لُوٹنے" میں حصہ نہ لیا۔ چنانچہ رسول اللہ نے خود بڑھ کر چھوہارے "لُوٹے" اور یُوں ذاتی مثال پیش کر کے اس پُرمسرت تقریب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ رسولِ خدا نے شادی کے بعد دُولہا کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کی پُرزور سفارش کی ہے۔ ولیمہ عموماً دُلہن کے شوہر کے گھر پہنچنے کے بعد اگلی صبح کو منعقد ہوتا ہے۔

۳۸۲۔ فطری طور پر بچّے کی پیدائش بھی پُرمسرت تقریب کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس موقع پر بچّے کے لیے اس کی جنس کی مناسبت سے کھلونے بطور تحفہ دیے جاتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی جب شادی ہُوئی اور وہ رسول اللہ کے گھر آئیں تو اپنے کھلونے بھی ساتھ لائیں۔ ان میں پروں والے گھوڑے بھی تھے۔ جب کبھی لڑکیاں حضرت عائشہؓ سے ملنے آتیں تو وہ یہ گھوڑے ان کو دکھایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ رسولِ پاک نے حضرت عائشہؓ کو یہ گھوڑے لڑکیوں کو دکھاتے ہوئے دیکھ لیا اور پوچھا "کون سے گھوڑوں کے پر ہوتے ہیں؟" حضرت عائشہؓ نے فوراً جواب دیا "آپ تو رسولؐ ہیں، آپ کو علم نہیں کہ سلیمان کے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے۔" —— غالباً مٹی سے اشیا بنانے کی صنعت اس دور سے پہلے بھی موجود تھی —— لڑکوں کو تحفے میں چھوٹی چھوٹی کمانیں اور تیر دیے جاتے تھے۔ مدینہ میں کرک —— ایک قسم کا گیند جو کپڑے وغیرہ سے بنایا جاتا تھا —— کا ذکر ملتا ہے۔ اس دور کا ایک مقبول کھیل درکالہ (نیزہ بازی) تھا۔ کشتی، پیراکی، مردوں کی دوڑ، گھڑ دوڑ، اونٹوں اور غالباً گدھوں کی دوڑ بھی اُس دَور کے مقبول کھیل تھے۔ عیدین کے موقع پر حبشی لڑکوں کا ناچ جو وہ نیزے پکڑ کر کرتے تھے، اتنا مقبول تھا کہ خود ازواجِ مطہراتؓ بھی یہ ناچ دیکھا کرتی تھیں۔

۳۸۳۔ حضورِ انور اپنی خوراک میں ثرید (ایک طرح کا حلیم) بیحد پسند فرماتے تھے۔ وہ بُھنا ہوا گوشت بھی رغبت سے کھاتے۔ اُس دور کے کھانوں میں شُترمرغ کے انڈوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو جنگل میں ملتے تھے۔ ساحلِ سمندر پر آباد افراد مچھلی بھی کھاتے تھے مگر خشک مچھلی کے سوا مدینہ جیسی اندرونِ ملک آبادی میں تازہ مچھلی کا ذکر نہیں ملتا۔ خشک گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ قربانی کے موقع پر اگر پُورا گوشت استعمال میں نہ آتا تو باقی ماندہ گوشت دُھوپ میں خشک کر لیا جاتا۔ اور یُوں یہ کافی عرصہ تک استعمال کے قابل بن جاتا۔ نبیؐ سرکہ بھی پسند فرماتے تھے۔ رسول اللہ کی زندگی میں زیتون اور پنیر کے استعمال کا

ذکر بھی کیا گیا ہے۔

۲۸۴۔ معمر افراد کے بالوں کو رنگنا ظہورِ اسلام سے قبل ہی عربوں میں رائج تھا۔ یمن کی زرخیز سرزمین ایک طرح کا سیاہ رنگ پیدا کرتی تھی جو رسولؐ اللہ کے دادا حضرت عبد المطلب کی زندگی میں زیرِ استعمال تھا۔ ایک پودے کُتم کے پتوں سے سُرخ رنگ پیدا ہوتا تھا۔ ان پتوں سے بال رنگے جا سکتے تھے۔ خواتین حنا سے اپنے ہاتھوں پر نقش و نگار بناتی تھیں۔ انگوٹھیاں، بازو بند، نکلس (ہار)، بُندے اور متعدد دوسرے زیورات خواتین میں مستعمل تھے۔

۲۸۵۔ مدینہ میں ایک ریس کورس تھا جہاں عام طور پر بیرونجات سے آنے والے قافلے قیام کرتے تھے۔ جس مقام پر بیٹھ کر رسولِ خدا یہاں گھڑ دوڑ دیکھا کرتے تھے اس جگہ اب مسجد السباق موجود ہے۔

۲۸۶۔ عرب میں جو سالانہ میلے ہوتے تھے وہ محض تجارتی منڈیاں نہ تھے بلکہ ان میں عوامی دل چسپی کے متعدد پہلو بھی تھے مکہ کے قریب عکاظ میں جو سالانہ میلہ لگتا تھا وہ خاص طور پر پورے عرب میں مشہور تھا۔ اس میلہ میں بڑے بڑے شعرا شریک ہوتے تھے جو اپنی برجستہ اور فی البدیہہ نظموں سے سامعین کو مسحور کرتے۔ شعلہ بیان مقرر لوگوں کو اپنی شعلہ نوائی سے محظوظ کرتے اور زبان دانی کے جوہر دکھاتے۔ اس میلہ میں اُس دَور کی بین الاقوامی عدالت کا اجلاس بھی ہوتا جس میں دُور دراز علاقوں سے آنے والے لوگ اپنے مقدمات پیش کرتے تاکہ ان کا غیر جانبدارانہ فیصلہ ہو سکے۔ کاہن اور نجومی لوگوں کی قسمت کا حال بتا کر اپنی روزی کماتے۔ وہ دوسروں کے مستقبل کا حال بیان کرتے، گو انھیں اپنی قسمت اور اپنے مستقبل کے بارے میں خاک علم نہ ہوتا۔

۲۸۷۔ موت کے موقع پر بھی بعض رسوم منائی جاتیں۔ اس روز لوگ ہمیشہ کے لیے جُدا ہونے والے عزیز یا دوست کو آخری خراجِ عقیدت پیش کرتے۔ میت کو کئی بار نہایت احتیاط سے غسل دیا جاتا۔ کپڑے کے متعدد ٹکڑوں پر مشتمل کفن پہنایا جاتا اور نمازِ جنازہ ادا کی جاتی۔ اگر مرنے والا قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوتا اور اس کا ترکہ اتنا نہ ہوتا کہ اس سے قرض بے باق ہو سکے تو رسولِ خدا ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیتے۔ وہ ہر مسلمان کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، نمازِ جنازہ خود پڑھایا کرتے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد میت زمین میں دفن کی جاتی۔ تدفین کے بعد قبر پر دعا مانگی جاتی جس میں مرنے والے کو تلقین کی جاتی کہ اسے دُوسری دنیا میں نئی زندگی کا کیسے سامنا کرنا ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جونہی کسی مسلمان کو مرنے کے بعد قبر میں دفن کیا جاتا ہے دو فرشتے (مُنکر نکیر) قبر میں آتے ہیں اور مرنے والے سے مذہب اور یومِ قیامت کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ چنانچہ مرنے والے کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ان فرشتوں کو بتائے کہ خدائے واحد اس کا معبود ہے، محمدؐ اس کا رسول ہے، قرآن اس کی کتاب ہے، کعبہ اس کی سمتِ نماز ہے، وہ یومِ حشر پر یقین رکھتا ہے، اُس کا یومِ قیامت، دوزخ اور جنت پر بھی ایمان رہے۔

۲۸۸۔ مکہ اور مدینہ میں چند سال بعد قبریں ہموار کر دی جاتی ہیں اور پھر اسی جگہ از سرِ نو تدفین عمل میں لائی جاتی ہے۔ چنانچہ قبرستان زیادہ پھیلنے نہیں پاتے۔ گزشتہ چودہ صدیوں سے ان دونوں مقدس شہروں میں ایک ایک قبرستان ہی چلا آ رہا ہے۔ جب سے کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کے لیے نماز کی سمت قرار دیا گیا ہے، دنیا بھر میں مسلمان مُردوں کو دفن کرتے وقت بائیں شانے کی طرف سے ذرا بلند کر کے لحد میں رکھتے ہیں تاکہ مرنے والا قبلہ رُو رہے۔ چنانچہ مختلف ممالک میں قبروں کے لیے

رخ سمت مختلف ہے۔ مدینہ کے قبرستان میں قبر مشرق سے مغرب کو کھودی جاتی ہے کیونکہ یہاں سے کعبۃ اللہ جنوب میں ہے۔ لیکن اس قبرستان میں پہلی صدی ہجری کے اوّلیں دنوں کی چند قبریں موجود ہیں، جب کعبہ کو ابھی نماز کی سمت متعین نہیں کیا گیا تھا جو شمالاً جنوباً ہیں (تاکہ مرنے والے کا رُخ مشرق میں چڑھتے سورج کی طرف رہے۔)

۳۸۹ ۔ رسول اللہؐ کی تجویز کے مطابق ہی جس خاندان کا کوئی فرد فوت ہو جائے اسے ایک یا دو روز تک کھانا ہمسائے (عزیز و اقارب) فراہم کرتے ہیں۔ اُس دور میں مرنے والے پر رونے کے لیے پیشہ ور ماتمی مل جاتے تھے جو عام طور پر خواتین ہوتی تھیں۔ رسولِ خدا ان پیشہ ور ماتم کرنے والیوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ شکنی کرتے تھے۔

معاشرے کی خصوصیات

۳۹۰ ۔ ظہورِ اسلام کے وقت اور اس کے بعد کا معاشرہ عام انسانی معاشرہ تھا، جس میں اچھے اور بُرے ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہ حقیقت کہ اُس دَور میں بھی جرائم ——— خواہ ان کی تعداد کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو ——— قتل، قانون کی خلاف ورزی اور چوری وغیرہ کا ارتکاب کیا جاتا تھا، اس امر کی غماز ہے کہ وہ معاشرہ عام انسانوں سے عبارت تھا اور اس میں صرف فرشتے یا صرف شیطان نہیں بستے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر شخص کے ذہن پر یہ نقش تھا کہ وہ نیکی کو نیکی اور بُرائی کو برائی سمجھے۔ کوئی شخص اپنے جرائم پر فخر نہیں کرتا تھا۔ معاشرہ اور رائے عامہ کا دباؤ ہر شخص کو حسنِ عمل کی توقیر پر مجبور کرتا تھا۔ پولیس کا کوئی وجود نہ تھا مگر لوگ از خود پیش ہو کر ایسے جرائم کا بھی اقبال کر لیتے تھے جن کی سزا موت تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جُرم کی تعزیر برداشت کرنا آخرت میں سزا سے بہتر ہے۔

۳۹۱ ۔ شراب مکمل طور پر منع تھی اور اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ لوگوں کے گھروں اور بازاروں میں امن کا راج تھا انسان جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور نشے میں جنگلی درندوں کی سطح تک کبھی نہیں گرتا تھا۔ سُور کا گوشت نہیں کھایا جاتا تھا چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ بے حیائی بھی معاشرہ میں موجود نہ تھی۔

۳۹۲ ۔ جوا نہیں کھیلا جاتا تھا اور نہ ہی سُود کی لعنت معاشرے پر مسلط تھی۔ سُود لینا اور دینا دونوں حرام تھے۔ بلا سُود قرض حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے غیر مسلم سُود خوروں کو سود کی ادائیگی بھی ممنوع تھی۔ چنانچہ مسلمان قرضے لینے سے باز رہتے تھے اور اپنے اخراجات پر کنٹرول رکھتے تھے۔ حُرمتِ سود کے دانشمندانہ قانون نے سب سے پہلے ان مٹھی بھر انسانی جونکوں کا خاتمہ کر دیا جو سُود کے ذریعے لوگوں کا خون چوس رہی تھیں اور یُوں بددیانتی کی کمائی پر پل رہی تھیں۔ بلاشبہ جوئے اور سُود کے ذریعے لوگ بڑی تیزی سے دولت کماتے تھے۔ مسلمانوں کو اس "امکان" سے تو محروم کر دیا گیا تھا مگر اس سے مسلمانوں کے قرضوں میں جکڑے جانے کی رفتار بھی تو انتہائی سُست ہو گئی تھی۔ چنانچہ مسلمان اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے زندگی گزارنے کی عادت اختیار کر رہے تھے۔ اس طرح سرکاری افسروں اور عمّال کو بدعنوان بنانے والی قوتیں مفلوج ہو گئیں اور یُوں انتظامیہ کو صاف ستھرا رکھنے میں زبردست مدد ملی۔

۳۹۳ ۔ ایسی ہی اصلاحات کی بدولت معاشرہ میں پولیس فورس کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ان اصلاحات کی ضرورت کے لوگ قائل تھے اور یہ ان کے ذہنوں میں نقش ہو چکی تھیں۔

باب ۱۴

رسولُ اللہ کے کام پر ایک نظر

۲۹۴ - دُنیا میں لاتعداد مذاہب ہیں۔ ان میں کئی توحید پرستی پر مبنی ہیں۔ متعدد مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ اسلام ان تمام مذاہب میں سب سے کم عمر ہے۔ ممکن ہے اسلام اپنے پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے سب سے بڑا مذہب نہ ہو مگر یہ ایک زندہ اور فروغ پذیر مذہب ہے۔ دُنیا کے تمام مذاہب اور لادینی عناصر اس کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔ کیونکہ یہ ایک آفاقی دین ہے اور کسی خطے یا نسل تک محدود نہیں۔ اسلام میں کسی بھی قومیت میں سرایت کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ تاہم ہمارا موضوع اسلام نہیں بلکہ اس عظیم دین کا بانیؐ ہے۔

۲۹۵ - ادیان کی تاریخ عالم میں یہ کلیہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کے بانی کی زندگی اور جدوجہد کے بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کو اپنی دنیاوی زندگی کے دوران زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، ان کے لائے ہوئے دین کو ان کی موت کے بعد ہی وسعت ملی اور ترقی حاصل ہوئی۔ ادیان کے ان بانی حضرات کی تعلیمات اپنی اصل شکل میں نہیں بلکہ جستہ جستہ ہم تک پہنچی ہیں۔ ان مذاہب کے پیروکاروں نے تاریخ کے عمل کے دوران اپنے ادیان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے زعم میں ان کے اصولوں اور عملی پہلوؤں میں کئی تبدیلیاں کر دیں۔

۲۹۶ - محمد (صلعم) اس قاعدہ کے تمام اصول وضوابط میں ایک استثنا ہیں۔ ان کی زندگی کے بارے میں آنکھوں دیکھے احوال پر جلدوں کی جلدیں موجود ہیں جن میں ان کی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے کی تفصیل درج ہے۔ ان کے ذاتی اعمال، ان کے دور اور معاشرہ کی ذرا ذراسی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے۔ رسولِؐ اسلام اپنی زندگی میں ہی عظیم ترین کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ جب حجۃ الوداع کے موقع پر انھوں نے ایک لاکھ چالیس ہزار سے زاید مسلمانوں کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا جو مختلف علاقوں سے حج کا فریضہ ادا کرنے مکہ معظمہ آئے تھے ان سے کئی گنا مسلمان اپنے گھروں میں موجود تھے کیونکہ مسلمانوں پر ہر سال حج کرنا فرض نہیں۔ نہ ہی ان پر یہ فرض تھا کہ وہ کسی خاص سال کے موقع پر ضرور ہی حج کعبہ کو جائیں۔ بلاشبہ رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد بھی اسلام کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی مگر اسلام کے بانیؐ کی زندگی میں ان کی تعلیمات کو جو کامیابی حاصل ہوئی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں تک رسولِؐ اسلام کی تعلیمات کا تعلق ہے قرآنِ حکیم لفظ بلفظ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جس میں وہ نازل ہوا تھا اور یہ جس انداز میں ہم تک آیا ہے وہ قابلِ اعتماد ہے۔ چودہ صدیاں گزر گئیں، اس دوران رسولؐ اللہ کی جائے پیدائش یا دنیا میں کسی اور جگہ قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی۔ ہم جانتے ہیں کہ محمدؐ کس طرح نماز ادا

کرتے تھے، روزہ کیسے رکھتے تھے، اور انھوں نے حج کس انداز میں کیا تھا۔ چنانچہ تمام مسلمان آج بھی ان روحانی فرائض کو عین اسی طرح انجام دیتے ہیں جس طرح رسولِ اسلامؐ نے انجام دیے تھے۔ دوسرے متعدد مذاہب کے پیروکاروں کی طرح ایسے مسلمانوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے دین پر عمل نہیں کرتے بلکہ بعض تو محض نام کے مسلمان ہیں۔ اس کے باوجود کسی مسلمان نے خواہ وہ محض نام کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو دینِ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خود ہمارے دور میں تمام مذاہب میں اصلاح کی تحریکیں سرگرمِ عمل ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے مذاہب کو تو جدید دور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لیے ان میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے مگر مسلم مصلحین بیک زبان محمدؐ کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کی تلقین کر رہے ہیں۔ کسی مذہب کے بانی کو اس سے بڑا خراجِ عقیدت بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی تعلیمات آج بھی زندہ و متحرک ہیں اور ان میں ذرہ برابر تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی۔

۲۹۷۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں بانیٔ اسلام کی سوانح پر ہزاروں کتب موجود ہیں۔ ان کے مصنفوں میں اسلام کے دوست اور دشمن سبھی شامل ہیں۔ تمام مصنف خواہ وہ رسولِ اسلامؐ کو پسند کریں یا محض اس بات پر ناپسند کریں کہ ان مصنفوں کا تعلق اسلام کے مخالف مذاہب سے ہے، اِس بات پر متفق ہیں کہ محمدؐ ایک عظیم انسان تھے۔ جن مصنفوں نے جان بوجھ کر رسولِ اسلامؐ کی زندگی اور تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے ——— اور ایسے مصنفوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے ——— دراصل وہ بھی انھیں بالواسطہ طور پر خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ وہ رسولِ اسلامؐ کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر انھوں نے اسلام کی صحیح تصویر پیش کر دی تو ان کے ہم مذہب "گمراہ" ہو جائیں گے جنھیں وہ قبولِ اسلام سے روکنے کے لیے بانیٔ اسلام کے متعلق بے سر و پا کہانیاں گھڑ کر سناتے رہتے ہیں اس طرح کی ذہنی بددیانتی آج بھی جاری ہے۔ یہ بات حیرت خیز ہے کہ جدید مغرب کے زبردست مادی اور دوسرے وسائل کے باوجود حضرت محمد رسول اللہؐ کی ذات کے خلاف پراپیگنڈہ کوئی نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن کی توقع اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کی اشاعت، ریڈیو، ٹی وی نشریات اور فلموں کی نمائش کے بعد کی جا سکتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جتنے وسائل عیسائی مشنریوں اور کمیونسٹوں کو حاصل ہیں، اگر اسلام اتنے ہی وسائل سے بہرہ ور ہوتا تو دنیا کا رُخ کیا ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ مسیحی اور کمیونسٹ مغرب دونوں میں اسلام نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد تیس سال کے دوران انگلستان میں کوئی ایک سو سے زاید مساجد تعمیر ہوئی ہیں۔ جرمنی اور فرانس بھی اس میدان میں انگلستان سے پیچھے نہیں۔ امریکی سفید فاموں میں بھی قبولِ اسلام کے واقعات کی کمی نہیں۔ چنانچہ اسلام کو گلے لگانے والوں میں سفرا، پروفیسر اور دیگر معزز پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ ہر سال سیکڑوں سیاح استنبول میں مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں جہاں اناطولیہ کی نسبت مذہبی جوش و خروش زیادہ نہیں ہے۔

۳۹۸ - محمد (صلعم) کی تعلیمات کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رشتہ زندگی کے ہر شعبہ سے قایم ہے۔ وہ محض ما فوق الطبیعات عقاید تک محدود نہیں - وہ انسان کی روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ دُنیوی زندگی کے لیے بھی اصول و قواعد بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ سیاسیات بھی ان کی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام انسان کی پُوری زندگی کی تعمیر میں مدد دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح محض روحانی پہلو پر نظر نہیں رکھتا اور نہ ہی سیاست کو محض حکمرانوں کے رحم وکرم پر چھوڑتا ہے۔

۳۹۹ - ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے پیروکاروں کی زندگی اور ذاتی رویّہ پر دینِ اسلام کے اثرات دوسرے مذاہب کی نسبت نہایت گہرے ہیں۔ یہ مذاہب آفاقیت کے دعویدار تو ہیں مگر وہ اپنے پیروکاروں میں نسل اور رنگ کا تعصب تک ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں انگلستان کی ایک مسجد میں ایک انگریز مؤذن دیکھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنا نام بلال رکھا ہوا تھا جو رسولِ اسلام کے حبشی نژاد مؤذن کا نام بھی تھا۔ یہ کتنی نرالی بات ہے کہ فن لینڈ کے ایک شخص عقیل نے جو سویڈن میں آباد ہے محض مطالعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا حالانکہ قبل ازیں کسی مسلمان سے اس کا تعارف تک نہ تھا۔ پھر فرانسیسی نژاد گینن کو بھی اس نے مشرف بہ اسلام کیا۔ گینن کے پیروکار فرانس، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور سیکڑوں افراد کو حلقۂ اسلام میں داخل کر چکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مغرب والوں کو صرف فخر الدین رازی نے ہی نہیں محی الدین ابن عربی نے بھی زبردست متاثر کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کافر ہلاکو خاں نے عالمِ اسلام کو فتح کر لیا اور عباسیوں کے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مگر چند درویشوں نے اُس کے پوتے غزن خاں کو مشرف بہ اسلام کیا اور عالمِ اسلام کو تباہ و برباد کرنے والوں کو اسلام کا عظیم علمبردار بنا کر رکھ دیا۔

۴۰۰ - اگر دیگر مذاہب کے بانیوں نے ایک دوسرے پر بعض انسانی خُوبیوں میں سبقت حاصل کی ہے تو بانیِ اسلام نے اتنے شعبوں میں فضیلت حاصل کی ہے کہ طالبِ علم حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ وُہ ایک عظیم اور جامع صفات قانون ساز تھے جنھوں نے تمام قانونی سوالات کے جواب میں قواعد مرتب کیے ہیں۔ وہ بہت بڑے منتظم تھے جنھوں نے مُشتِ خاک سے ایک عظیم مملکت قایم کی۔ وہ خود اس کے منتظمِ اعلیٰ تھے۔ انھوں نے فوجوں کی کمان کی اور بسا اوقات اپنی رضاکار فوج سے تین سے پندرہ گنا بڑی فوج تک کو شکست فاش دی۔ اُن کی اخلاقی تعلیمات پُر مغز ہیں اور ان تعلیمات کو محض مثالی مگر ناقابلِ عمل بنانے کے لیے کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی تمھارے دائیں گال پر چپت رسید کرے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو۔ بلکہ وہ کہتے ہیں " اگر تم ادلے کا بدلہ لو تو یہ بالکل درست اور جائز ہے لیکن اگر تم معاف کر دو تو یہ اللہ کے نزدیک مستحسن ہے "۔ یُوں ان کی تعلیمات عام آدمی کے لیے بھی اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح کسی ولی، رِشی یا مُنی کے لیے۔ یہ تعلیمات عام آدمی کو ارتکابِ گناہ سے روکتی ہیں اور اسے معقول حدود کے اندر رکھتی ہیں۔ ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق " بندہ خدا کا اور خدا بندے کا ہے "۔ یُوں اُنھوں نے خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست رابطہ قایم کرا دیا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ کسی کی اجارہ داری ہے۔ محمدؐ کی تعلیمات میں خدا کی وحدانیت، اُس کی لاتعداد صفات،

اپنی مخلوق کے لیے اس کی محبت اور رحم کا کوئی اور مذہب ثانی پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام میں خدا "رب العالمین" ہے۔ وہ ودود (محبت) ہے، رحیم (رحم کرنے والا) اور غفور (عفو کرنے والا) ہے۔ وہ قیامت کو سزا دینے میں حق بجانب ہے مگر اس کی رحمت اس کے غضب سے سوا ہے (سبقت رحمتی علیٰ غضبی ——— حدیثِ رسولؐ)

۱۰۴۔ محمدؐ نے نسلِ انسانی کو تمام اخلاق سکھایا اور جب وہ مطمئن ہو گئے کہ انھوں نے اپنا مشکل ترین مشن بحسن و خوبی تمام کر دیا ہے تو انھوں نے اس کی بلند رفاقت کو ترجیح دی (مع الرفیق الاعلیٰ)۔

اللّٰھم صل علیٰ سیدنا محمد و علیٰ آل سیدنا محمد و اصحاب
سیدنا محمد و بارك وسلم و صل علیہ۔

باب ۱۵

رسولِ خدا کا وصال

۴۰۲ - اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے سپرد جو کام کرتا ہے وہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ محمد (صلعم) کا مشن اس لحاظ سے اور بھی محال تھا کہ اس میں انسان کی پوری شخصیت کو "نشانہ" بنایا گیا تھا۔ اُس کے پُرانے معتقدات، طریقِ عبادت، خاندانی زندگی، اخلاقی اصول، معاشرتی آداب، سیاست، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا تھا۔ گویا اس مشن کا مقصد مکمل تبدیلی اور انقلاب تھا۔ خوش قسمتی سے اعلانِ نبوت کے بعد رسولِ اسلام کافی دیر تک بقیدِ حیات رہے، اگرچہ انھوں نے اپنے مشن کا آغاز چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کیا تاہم ان کے پاس ۲۳ پُرجوش سال موجود تھے جن کے دوران اُنھوں نے پُوری توجہ اپنے مشن پر مرکوز رکھی۔ نبی مرتے نہیں وہ دنیاوی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایسے لوگوں کے ذریعے جو ان کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں، معاشرہ میں اپنا اثر و نفوذ برقرار رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی موت کسی دوسرے نبی کی بعثت پر ہی واقع ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت نوحؑ کا مشن ختم کیا، حضرت موسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ کے اور حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ کے مشن کے خاتمے کا سبب بنے۔ اور بالآخر حضرت محمد صلعم کی بعثت پر دینِ عیسوی بھی تمام ہوا، محمدؐ اللہ کے آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی دینِ اسلام کے بعد کوئی شخص پیدا نہیں ہوا جس نے اسلام سے بہتر عقاید پیش کیے ہوں اور رسولؐ اللہ کی تعلیمات سے کوئی بہتر تعلیم دی ہو۔

۴۰۳ - رسولؐ اللہ کی عمر ۶۳ سال ہوگئی۔ تبلیغِ اسلام کے لیے ۲۳ سال کی زبردست جد و جہد میں وہ تھک گئے تھے۔ زندگی کی حرارت کے آخری شرارہ کے بل پر اُنھوں نے مکہ کا طویل سفر اختیار کیا ——— اُونٹ کی پشت پر بارہ دن مکہ جانے میں اور اتنی ہی مدت واپسی میں صرف ہوتی تھی ——— تاکہ حجِ بیت اللہ کا فریضہ ادا کر سکیں۔ دورانِ حج رسولؐ اللہ کی مسرت کی انتہا نہ رہی جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان پر نازل کی:

> "آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا۔ میں نے تم پر اپنی نعمتوں (احسان) کی بھی تکمیل کر دی اور میں نے تمھارے واسطے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے۔" (۵/۳)

یہ نبیؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کا اعلان تھا جو نبیؐ کے لیے باعثِ مسرت و اطمینان تھا۔ وہ اس مادی دنیا کو چھوڑنے پر خوش تھے، انھیں کوئی ملال نہ تھا۔ اسی وقت ان پر یہ آیات بھی نازل ہوئیں۔ (۱۱۰/۱-۳):

> "جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھا، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے، اس سے عفو طلب کیجئے، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

کیا ہی معقول تعلیم ہے، خود رسولِ خدا کو بھی اللہ سے مغفرت اور عفو طلب کرنا چاہیے۔ محمدؐ اللہ کا بندہ ہونے پر فخر کرتے تھے۔ انھوں نے خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

۴۰۴۔ اس فاتحانہ حج کے بعد جب نبیؐ مدینہ پہنچے تو جلد ہی انھیں مرض الموت نے آلیا۔ مرض کا آغاز سر میں درد سے ہوا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے کیسے کیا ہے۔ چنانچہ ایک رات شدید علالت کے باوجود وہ گھر سے نکلے اور قریبی قبرستان میں پہنچے جسے جنت البقیع کے خوب صورت نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے ان صحابہؓ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی جن کی مدد اور تعاون سے انھوں نے بنی نوع انسان کو ایک نئی منزل اور زندگی کو ایک نئی جہت سے رُوشناس کرایا تھا۔ نبیؐ کی علالت میں شدت آگئی اور جلد ہی وہ اس قابل نہ رہے کہ نماز با جماعت کی امامت کا فریضہ ادا کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے حکم دیا کہ ان کے وفادار اور قریبی دوست ابوبکرؓ نماز با جماعت میں امامت کے فرائض سنبھالیں۔ پھر ایک روز نبیؐ کی طبیعت سنبھل گئی، وُہ اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور نماز کی امامت کی تاہم انھوں نے نماز بیٹھ کر ادا کی۔ پھر ان کے مرض میں شدت عُود کر آئی۔

۴۰۵۔ انھی دنوں رسولؐ اللہ نے ایک مقامی کہاوت کے مطابق اپنا علاج بھی کیا۔ اُنھوں نے سات مختلف کنوؤں کا پانی منگوایا اور اس سے غسل کیا۔ اس سے انھیں کافی افاقہ محسوس ہُوا۔ چنانچہ وہ دو افراد کی مدد سے مسجد نبویؐ میں تشریف لائے اور منبر سے پُراثر خطبہ دیا جسے سُن کر صحابہؓ گریہ زاری کرنے لگے۔ اُنھوں نے جنگِ اُحد کے شہدا کے لیے اللہ کی رحمت کی دعا کی اور یُوں دین پر ان کی استقامت اور اللہ کے دین کے لیے جدوجہد میں شرکت پر ان کے لیے اظہارِ تشکر کیا۔ پھر انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس دنیاوی زندگی سے کنارہ کشی کرنے والے ہیں۔ اُنھوں نے کہا:

"اللہ کا ایک بندہ تھا جسے اللہ نے انتخاب کا اختیار دیا اور اس نے "مع رفیق الاعلیٰ" کا انتخاب کرلیا۔"

پھر اُنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی شاندار الفاظ میں تعریف کی۔ اُنھوں نے ابوبکر صدیقؓ کی خدمات اور اسلام کے لیے نبیؐ سے تعاون کا تفصیلی تذکرہ کیا، انھوں نے ابوبکرؓ کو اپنا بھائی اور قابلِ ترجیح دوست قرار دیا (یہ رسولؐ اللہ کی طرف سے اشارہ تھا۔ وہ یہ حکم نہیں دے سکتے تھے کہ ان کے بعد ابوبکرؓ کو ان کا جانشین منتخب کیا جائے تاکہ وہ نبیؐ کے کام کو جاری رکھ سکیں) پھر رسولؐ اللہ مکّی مسلمانوں سے مخاطب ہُوئے اور ان پر مدنی مسلمانوں کے فضائل واضح کیے جن کی میزبانی اور امداد و تعاون کے بغیر اسلام یُوں تیزی سے ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ رسولِ خدا نے باصرار کہا کہ اسلام کے لیے مدنی مسلمانوں کی خدمات کو فراموش نہ کیا جائے۔ پھر اُنھوں نے ایک مثال قایم کی۔ انھوں نے ہر شخص کو جو موقع پر موجود تھا یا نہیں، اجازت دی کہ اگر کسی کا ان پر حق ہے تو وہ بیان کرے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ اگر میں نے کسی کو رنج پہنچایا ہو تو میں اس سے معافی کا طلبگار ہوں۔ اُنھوں نے اپنی ان باتوں پر اس قدر اصرار کیا کہ ایک دو افراد کھڑے ہوئے، ایک نے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ نے اس سے تین درہم قرض لیے تھے مگر وہ واپس کرنا بھُول گئے۔ فوراً ہی اس شخص کی تسلی کر دی گئی۔ رسولِ خدا نے پھر اپنی بات پر اصرار کیا اور کہا کہ کسی کا جان و مال اور عزت کے ضمن میں مجھ پر کوئی حق ہو تو بلا تامل طلب کیا جائے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ کسی بھی شخص، حکومت

یا مملکت پر کسی کا کوئی حق ہو جو اسے نہ ملا ہو وہ بھی پیش کیا جائے۔ پھر اُنھوں نے قبروں کو پُوجنے کی سختی سے ممانعت کی اور بولے:

"جو لوگ پیغمبروں کی قبروں کو پُوجتے ہیں ان پر خدا کی مار ہے۔ میرے بعد میری قبر کو بُت میں تبدیل نہ کر دینا جس کی لوگ پرستش کریں۔"

انہی دنوں اسلامی فوج کی ایک مہم اسامہؓ بن زیدؓ بن حارثہ کی قیادت میں روانہ ہونے والی تھی۔ رسول اللہؐ نے کہا:

"میری موت کی صورت میں بھی یہ مہم ملتوی نہ کی جائے۔"

(اس فوجی مہم میں بعض جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔ بعض لوگوں نے تجویز پیش کی کہ اس مہم کی قیادت اسامہ کو نہ سونپی جائے مگر رسول اللہؐ نے یہ تجویز سختی سے مسترد کر دی)

۴۰۶۔ نبیؐ واپس اپنے بستر پر چلے گئے، وہ تھک گئے تھے، ایک دن اور ان کی طبیعت بہتر محسوس ہوئی، وہ پھر بستر سے اُٹھے اور حجرہ سے باہر گئے۔ یہ نماز کا وقت تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بیحد مسرور ہوئے کہ مسجد نمازیوں سے بھری ہوتی ہے اور وہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں ——— مسلمان بھی اپنے پیارے رسولؐ کی علالت میں افاقہ دیکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھے۔ مگر انھوں نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جو خدا کی عبادت (نماز) کے وقار کے منافی ہو ——— مگر رسول اللہؐ آگے نہ جا سکے وہ مسکرائے اور پلٹ کر اپنے بستر پر چلے گئے۔ لوگ دھوکا کھا گئے۔ ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ کئی روز سے اپنے اہل خانہ میں نہیں گئے تھے۔ چنانچہ وہ مدینہ کے نواحی علاقہ میں چلے گئے۔ کچھ اور صحابی بھی رسول اللہؐ سے ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں کسی نے رسولِ خدا سے کہا کہ وہ اپنی وصیت تحریر کرا دیں، چنانچہ رسول اللہؐ نے کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ پھر صحابہ میں بحث چھڑ گئی کہ آیا رسولِ پاک کو وصیت تحریر کرانے کی زحمت دی جائے یا نہیں جبکہ وہ پہلے ہی ہر بات اُمت کو بتا چکے ہیں۔ (درحقیقت صحابہ کو جنگِ اُحد کے واقعات یاد تھے جب اُنھوں نے رسولِ خدا کو برہم کر دیا تھا اور انھیں وہ کام کرنے کو کہا تھا جو رسول اللہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ جنگ میں ہزیمت کی شکل میں برآمد ہوا تھا۔ حضورؐ نے مسجد نبویؐ میں اپنی تقریر کے دوران جنگِ اُحد کا تفصیلی تذکرہ کیا تھا) جب رسولِ خدا نے صحابہؓ میں بحث ہوتے سُنی تو اُنھوں نے سب کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔

۴۰۷۔ چند گھنٹے بعد بیماری زور پکڑ گئی۔ رسولِ خدا بیہوش ہو گئے مگر جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ اب وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایک صحابی کے ہاتھ میں مسواک دیکھی۔ انھوں نے مسواک کی طرف اس طرح دیکھا کہ لوگ سمجھ گئے کہ نبیؐ دانت صاف کرنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہؐ کے دانت صاف کرائے گئے جس کے بعد ان کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ ذرا توقف کے بعد اُنھوں نے تین بار کلمہ پڑھا اور کہا: "موت کتنی اذیت ناک ہے۔" ان کی زبان سے جو آخری الفاظ نکلے وہ یہ تھے:

"نہیں لیکن مع الرفیق الاعلیٰ۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رسولِ خدا کو انتخاب کرنے کو کہا گیا تھا۔ ان کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ جن کی آغوش میں حضور صلعم کا

سر مبارک تھا، سے مروی ہے: "یہ حضورؐ کا آخری لمحہ تھا، مگر میں بہت چھوٹی تھی اور مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ جب دوسرے گریہ زاری کرنے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ کیا گزر گئی ہے۔ میں نے ان کا سر آہستہ سے تکیے پر رکھ دیا اور خود بھی گریہ زاری کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔"

۴۰۸۔ رسولؐ اللہ کی پشت پر (دونوں شانوں کے درمیان) ایک نشان تھا جسے رسولؐ اللہ مُہرِ نبوت تصور کرتے تھے۔ سوانح نگاروں کے مطابق رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد کسی نے دیکھا یہ نشان غائب ہو چکا تھا۔

باب ۱۶

تدفین اور جانشینی

۴۰۹۔ اللہ کا پیغمبر، اسلامی ریاست اور دین اسلام کی رفیع الشان عمارت کا معمارِ اعظم، کیا اس کا سچ مچ انتقال ہو چکا تھا؟ کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ ناقابلِ تصور اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ ہر مسلمان رنج والم میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اور ایک نے تو تلوار میان سے نکالی اور اعلان کیا "نہیں اللہ کا رسولؐ مرا نہیں، زندہ ہے، اسے موت نہیں آسکتی۔ اگر کسی نے کہا کہ نبیؐ مر گیا ہے تو میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔" نبیؐ خدا کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح مسلم ریاست کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ معتبر ترین روایات کے مطابق اس روز پیر تھا، ربیع الاول کی ۲ تاریخ اور ۱۱ سن ہجری (۲۵ مئی ۶۳۲ عیسوی) رسولؐ اللہ کا وصال دن کے وقت ہوا (تاہم ۱۲ ربیع الاوّل حضورؐ کے یومِ وصال کے طور پر زیادہ مشہور ہے)

۴۱۰۔ ابوبکرؓ کو بھی رسولؐ اللہ کے وصال کی اطلاع ملی اور وہ فوراً ہی آستانۂ نبوت پر پہنچ گئے۔ وہ تیزی سے رسولؐ اللہ کے گھر میں داخل ہُوئے، ان کی لختِ جگر عائشہ صدیقہؓ نے جو رسولِ پاک کی زوجہ مطہرہ تھیں وہ کپڑا اٹھا دیا جس سے نبیؐ کا جسدِ مبارک ڈھانپا گیا تھا۔ ابوبکرؓ نے فرطِ عقیدت سے رسولؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کپڑا حضورؐ کے جسدِ مبارک پر ڈال دیا۔ پھر وہ سیدھے مسجد نبویؐ میں آئے۔ جونہی وہ منبرِ رسولؐ پر بیٹھے مسجد میں خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص کے کان ابوبکرؓ کی آواز سننے کے لیے بے چین تھے۔ اُنھوں نے اپنی تقریر کا آغاز قرآن حکیم کی اس آیت سے کیا:

"اور محمدؐ تو رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول گزرے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائے یا مارا جائے تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو (وہ) اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ شکرگزاروں کو ثواب (اجر) دے گا۔" (۳/۱۴۴)

پھر انھوں نے کہا:

"جو کوئی محمدؐ کی پُوجا کرتا تھا تو اسے کہنے دو کہ محمدؐ چل بسے ہیں مگر جو خدا کی پرستش کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔"

اُنھوں نے اپنی تقریر اس تجویز پر ختم کی کہ اُمت کے اولوالامر کی جگہ خالی نہیں رہنی چاہیے اور مسلمانوں کو رسولؐ اللہ کے جانشین کا فوراً انتخاب کر لینا چاہیے۔

۴۱۱۔ ہر شخص نے ابوبکرؓ کی تجویز پر صاد کیا اور بولے: ہم اس پر کل (رسولِ خدا کے جسد کی تدفین کے بعد) بات کریں گے۔ اس کے بعد غم واندوہ میں ڈوبے ہُوئے لوگ ادھر ادھر چلے گئے۔ اب کوئی دھوکا نہ تھا، کوئی پردہ نہ تھا،

یہ سانحہ عظیم تھا جو اُمت پر گزر گیا۔ مگر صدیق اکبرؓ کی طاقت ور شخصیت نے ہر فرد کو سہارا دیا اور لوگ بھی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اُن سے ہی ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے لگے۔ اُمت کو ڈھیروں مسائل کا سامنا تھا۔

۴۱۲۔ اولین مسئلہ جو درپیش تھا وُہ یہ تھا کہ رسولِ خدا کی تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ ابو بکرؓ نے یہ مسئلہ نہایت آسانی سے حل کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ "ایک روز رسولؐ اللہ نے کہا تھا" اللہ کے پیغمبر اسی جگہ مدفون ہوتے ہیں جہاں وہ آخری سانس لیتے ہیں۔" تو پیغمبر کی قبر کس طرح کی ہو گی؟ یہ دُوسرا مسئلہ تھا۔ مکّہ میں قبر کھودنے کا طریقہ اور تھا جبکہ مدینہ میں یہی کام کسی اور انداز سے کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: "مکّی طرز کی اور مدنی طرز کی قبریں کھودنے والے دو افراد بلا لو اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دو، ان دونوں میں سے جو بھی پہلے موقع پر پہنچے اسے اپنے مخصوص انداز میں قبر کھودنے کی سعادت نصیب ہوگی۔ اس کے بعد خواتین کو ایک طرف کر دیا گیا اور رسولِ خدا کے عم زادوں نے حضورؐ کی میّت کو غسل دیا۔ دورانِ غسل بھی حضور صلعم کا جسد مبارک ڈھانپ کر ہی رکھا گیا۔

۴۱۳۔ اسی دوران ایک نہایت سنگین واقعہ رُونما ہوا جس نے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔

۴۱۴۔ رسولؐ اللہ کی بیماری کے آخری دنوں میں رسولؐ کے چچا العباسؓ ایک روز اپنے بھتیجے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے پاس آئے اور بولے: "رسولؐ خدا کی صحت یابی کی کوئی زیادہ امید نہیں، مگر اُنھوں نے ابھی تک اپنے جانشین کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں کہی، آؤ ہم رسولؐ اللہ سے پُوچھ لیں اگر ان کے خاندان میں سے کسی کو جانشینی کا اعزاز ملنا ہے تو ہمیں اس کا علم ہو جائے گا، اور اگر نہیں تو ہم دونوں رسولؐ اللہ کی خواہش کے شاہد ہوں گے۔" اس پر حضرت علیؓ نے کہا: "نہیں میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا، کیونکہ اگر رسولؐ اللہ نے اس وقت ہمیں اپنی سیاسی جانشینی کے لیے منتخب نہ کیا تو ان کے بعد کوئی ہمیں رسولؐ اللہ کا جانشین تسلیم کرنے پر تیار نہ ہو گا۔" جب رسولِ خدا کا وصال ہوا تو حضرت عباسؓ پھر حضرت علیؓ کے پاس گئے اور بولے: "ہم رسولؐ اللہ کے سب سے قریبی عزیز ہیں (میں اُن کا چچا اور پہلا وارث اور تم عم زاد ہو) میری مدد کرو میں تمھیں رسولِ خدا کے جانشین کے طور پر پیش کروں گا اور تمھاری بیعت کر لوں گا۔ دُوسرے لوگ میری تقلید کریں گے اور کسی کو اعتراض کا یارا نہ ہو گا، اگر تم نے انکار کیا تو یہ موقع ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائے گا۔" مگر حضرت علیؓ نظم و ضبط کے اتنے پکّے اور بااصول تھے کہ وُہ دوسروں کے سامنے کسی بھی بات کو طے شدہ امر کے طور پر پیش کرنا پسند نہیں کر سکتے تھے، اُنھوں نے کہا: "نہیں، ایسا نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ عام مشاورت کے دوران کوئی بھی ہمارے حق جانشینی سے انکار نہیں کرے گا۔"

۴۱۵۔ رسولؐ اللہ کے وصال کے اگلے روز مدینہ کے بنو خزرج نے اپنی مجلسِ مشاورت طلب کی۔ یہ ایک طرح کا خفیہ اجلاس تھا اور خاص طور پر کسی مکّی کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اغلباً وہ کوئی فیصلہ کرنے کے خواہشمند نہ تھے بلکہ وہ باہم مشاورت کے دوران اپنا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتے تھے۔ بنو خزرج کی مجلسِ مشاورت میں اس رائے کا

اظہار کیا گیا کہ چونکہ مدینہ میں ان کی بھاری اکثریت ہے اس لیے نبیؐ کا جانشین ان کا کوئی نمایندہ ہونا چاہیے۔ (حقیقت تو یہ ہے کہ مدینہ کا دُوسرا قبیلہ اوس بنوخزرج سے تعداد میں صرف ایک تہائی تھا) ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنوخزرج کی مشاورت میں شامل ہر شخص کا اس بات پر اتفاق تھا کہ بنوخزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو رسولِ خدا کا جانشین مقرر کیا جانا چاہیے۔

۴۱۶۔ بنو اوس کے کسی آدمی کو بنوخزرج کی اس خفیہ مشاورت کی بھنک پڑی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اوس کو یاد دلانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے باہم جو فیصلہ کیا تھا اُن کی یہ خفیہ مشاورت اس فیصلے کے منافی تھی اور یہ کہ دوسروں کی عدم موجودگی میں اس طرح مجلسِ مشاورت منعقد کرنا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ پھر اُنھیں یہ خوف بھی دامنگیر ہوا کہ اگر انھوں نے کوئی اقدام نہ کیا اور کوئی فیصلہ کر لیا گیا تو پھر اس فیصلے کو کالعدم کرنا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ وُہ اپنے دو رفقا حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ (دونوں مکّی تھے) کے ساتھ بنوساعدہ کے ڈیرے (ثقیفہ) پر پہنچے جہاں یہ خفیہ مجلسِ مشاورت منعقد ہو رہی تھی۔ انھوں نے بآوازِ بلند السلامُ علیکم کہا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ کسی نے مجلسِ مشاورت میں ان کی شرکت پر اعتراض نہیں کیا۔ ان کے بعد کچھ اور مکی صحابہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔

۴۱۷۔ ان کی آمد کے فوراً بعد بنوخزرج کے ثابت ابن قیس کھڑے ہُوئے اور اُنھوں نے انصارِ مدینہ کی خُوبیاں اور اسلام کے لیے ان کی خدمات بیان کیں۔ اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ ان خدمات کے پیشِ نظر رسول اللہؐ کی سیاسی قوت و سیادت کا جانشین انصار میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔ پھر اُنھوں نے اہلِ مکہ (مہاجرین) سے مخاطب ہو کر اپنی تجویز پر ان کا ردِ عمل دریافت کیا۔ رسولؐ کے سیاسی جانشین کے سوال پر غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا اور اب اس معاملہ سے پہلوتہی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ابوبکرؓ اُٹھے اور بولے: "میری رائے میں کوئی مکّی ہی پُورے عرب کے لیے واجب احترام ثابت ہو سکتا ہے۔" اُنھوں نے حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہ (ابن جراح) کی خوبیوں اور عظیم صلاحیتوں کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے حاضرینِ مجلس کو تجویز پیش کی کہ ان دونوں اصحاب میں کسی کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے امیدوار بننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس معاملہ پر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ مجلسِ مشاورت کی فضا جذبات سے مملو ہو گئی۔ اس موقع پر بنوخزرج کے الحباب ابن المُنذر اُٹھے اور انھوں نے تجویز پیش کی کہ آئیے دو امرا کا انتخاب کر لیں، ایک مکی اور دُوسرا مدنی۔

۴۱۸۔ مندرجہ ذیل تفصیلات اس وقت کی اُلجھی ہُوئی صورتِ حال پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں:

ابنِ سعد (۱۱۱/۱ ص ۱۵۱) کے مطابق اس ضمن میں جو تجویز پیش کی گئی تھی اس کے الفاظ یہ تھے: "رسولِ خدا نے جب کبھی تم (مکی) میں سے کسی کو گورنر (عامل) مقرر کیا تو انھوں نے ہم (مدنی) میں سے بھی کسی کو ضرور اس کے ساتھ کر دیا۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اب مسلمانوں کی اُمارت بھی دو افراد کے سپرد ہی کی جانی چاہیے جن میں سے ایک تم میں سے اور ایک ہم میں سے ہو۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر یہ کہا گیا تھا کہ اگر دو امیر مقرر کر دیے جائیں اور کسی معاملہ میں ان کے درمیان اتفاق رائے پیدا نہ ہو سکے تو اُمت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

الدیار بکری (۱۱/ ۱۶۸ - ۹) کی روایت دُوسری اور ترمیم شدہ تجویز معلوم ہوتی ہے۔ اس روایت کے مطابق

انصار نے کہا "اگر آج تم (مکی) اپنے میں سے کسی کو امیر نامزد کرتے ہو تو اس کی وفات پر ہم (مدنی) انصار میں سے کسی کو امیر مقرر کریں گے اور جب یہ امیر چل بسے تو پھر مہاجرین میں سے امیر کا انتخاب کیا جائے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک مسلم مملکت قائم رہے۔" امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق (باب ۶۲، حصہ ۵، حدیث نمبر ۹) ابوبکرؓ نے یہ تجاویز مسترد کر دیں اور جوابی تجویز پیش کی "نہیں امیر ہم میں سے ہوگا اور وزیر تم میں سے لیے جائیں گے۔" ابنِ حنبل (۱، ۵ نمبر ۱۸) کی روایت کے مطابق ابوبکرؓ نے خاص طور پر بنو خزرج کے امیدوار سعد بن عبادہ سے مخاطب ہو کر کہا: "کیا تمھیں یاد نہیں سعد! کہ ایک روز جب تم بھی رسول اللہؐ کی مجلس میں بیٹھے تھے، نبیؐ نے کہا تھا: سیادت کے سزاوار قریش (مکی) ہی ہیں اور عوام میں اچھے لوگ قریش کے اچھے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور عوام میں سے برے لوگ قریش میں سے بُروں کا ساتھ دیتے ہیں۔" سعد نے ابوبکرؓ کی بات کو تسلیم کیا اور کہا: "یا ابوبکر! تم نے سچ کہا، ہم وزیر ہوں گے اور تم امیر ہو گے۔"

۴۱۹۔ ابھی خلافت کے لیے کسی فرد کا انتخاب نہیں ہُوا تھا، لوگ خاموش خاموش تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ اُٹھے اور معاملہ نمٹا دیا۔ اُنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور بولے: "ابوبکرؓ سے بہتر کوئی امیر نہیں ہو سکتا۔" وہ حضرت ابوبکرؓ سے رسمی طور پر بیعت کرنے والے تھے کہ بنو خزرج کا بشیر ابن سعد اُٹھا ——— جو واقدی کے مطابق بنو خزرج کے ان افراد میں شامل تھا جنھوں نے اپنے عم زاد الحباب کی دو امیروں کے تقرر کی تجویز کی مخالفت کی تھی ——— اور بولا "ٹھہرو، ہم ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق ہیں مگر مجھ سے پہلے کسی کو ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے۔ (یہ اللہ کا نیک بندہ چاہتا تھا کہ ایک مکی کے خلیفہ منتخب ہونے پر اہلِ مدینہ قلق محسوس نہ کریں۔ چنانچہ اس نے اہلِ مدینہ کی طرف سے بیعت کرنے میں پہل کی۔ یہ اسلام سے لگن اور بے لوثی کی ایک شاندار مثال ہے) چنانچہ بشیر ابن سعد نے سب سے پہلے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد دوسرے صحابہ بڑھ بڑھ کر بیعت کرنے لگے۔ اور یوں مقررہ وقت سے پہلے ہی جو عام مشاورت کے لیے متعین کیا گیا تھا یہ اہم معاملہ نمٹ گیا۔

۴۲۰۔ چونکہ یہ فیصلہ عجلت میں کیا گیا تھا ——— گو اس کا انجام نہایت حُسن و خوبی اور پرسکون انداز میں ہوا ——— اس لیے رسول اللہؐ کے دیگر جلیل القدر صحابہ اور حضورؐ کے اہلِ خاندان کو جو تدفین کے انتظامات میں مصروف تھے مجلسِ مشاورت میں شریک نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ ابوبکرؓ اس فیصلہ کو قطعی تصور نہیں کرتے تھے اور وہ اس سلسلے میں مزید مشاورت کے خواہاں تھے۔ بہر حال بنو ساعدہ کے ڈیرے (ثقیفہ) سے لوگ رسول اللہؐ کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ جس حُجرے میں رسول اللہؐ نے آخری سانس لیے تھے وہیں ان کا جسدِ مبارک قبر کے قریب رکھا تھا جو اسی اثنا میں تیار کر لی گئی تھی۔ اس حُجرے میں اتنی گنجایش نہیں تھی کہ تمام مسلمان ایک ساتھ نمازِ جنازہ ادا کر سکیں، اور رسول اللہؐ کے جسدِ مبارک کو کُھلی جگہ لے جانے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں حُجرے میں داخل ہوں اور انفرادی طور پر دعا کریں۔ چنانچہ اس طرح کافی دیر لگ گئی اور پُوری رات گزر گئی۔ جب آخری مسلمان بھی حُجرے میں سے ہو کر باہر آ گیا تو تدفین عمل میں آئی۔

۴۲۱۔ پھر ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع ہونے کے لیے کہا۔ اُنھوں نے اجلاس عام میں بتایا کہ وہ ثقیفہ کے فیصلہ کو قطعی تصور نہیں کرتے اور اب ہر شخص خلافت کے مسئلہ پر رائے دینے میں آزاد ہے، وہ جسے چاہیں خلافت کے لیے منتخب کر لیں

مگر کسی نے ثقیفہ کے فیصلے کی مخالفت نہیں کی اور حاضرین نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا اقرار کیا۔ اس موقع پر ابوبکرؓ نے ایک مختصر مگر نہایت پُر مغز تقریر کی:

"لوگو! میں تمہارا سردار منتخب کیا گیا ہُوں گو میں تم سے افضل نہیں ہوں، اس لیے اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں غلط چلوں تو مجھے درست کردو، صداقت (درست مشورہ) سربراہ مملکت سے وفاداری کا اظہار ہوگا اور سچ کو چھپانا غداری کے مترادف ہوگا۔ آپ میں سے کمزور (مظلوم) میری نظر میں اس وقت تک طاقت ور ہوگا جب تک میں اُس کا حق نہ دلا دوں اور طاقتور (ظالم) میری نظر میں اس وقت تک کمزور ہوگا جب تک میں اس سے دوسروں کا حق چھین نہ لُوں، یہ سب کچھ اللہ کے حکم کے مطابق ہوگا۔ سُنو! ایسی کوئی قوم نہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد سے احتراز کرے اور ذلیل نہ ہوتی ہو۔ کسی قوم میں جب بداخلاقی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر قہر نازل کرتا ہے۔ اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے (بتائے ہوئے) راستے پر گامزن رہوں، جُونہی میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے راستے سے بھٹک جاؤں تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ آؤ اب نماز ادا کریں۔ اللہ تم سب پر رحمت کا نزول کرے۔"

نماز کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

وحی

مولانا محمود حسن

وحی لغتِ عرب میں اشارہ، کتابت، مکتوب، رسالت، الہام، القا کو کہتے ہیں اور اصطلاح اور عُرف میں اُس کلام اور پیام کا نام ہے جو حضرت رب العزت کی طرف سے انبیا علیہم السلام پر نازل ہو۔ ہر چند واسطہ بلا واسطہ کے تفاوت اور وسائط کے اختلاف سے اُس کی متعدد اقسام ہوں مگر کلامِ الٰہی ہونے میں سب شریک ہیں۔ زید کا کلام بلا واسطہ سُنو یا بواسطہ ہیلو گراف یا کتابت یا پیغام زبانی ہر حال میں اس کو کلام زید کا کہنا درست ہو گا گلستان کوئی پڑھے کوئی لکھے کلامِ شیخ ہی سمجھا جائے گا بلکہ صرف مضمون جس کا ہوتا ہے اسی کا کلام شمار کیا جاتا ہے الفاظ خواہ دوسرے کے ہوں اگر ہم کوئی مضمون کسی کو بتلادیں اور وہ اس کو زبانی اپنے الفاظ میں یا تحریراً اپنی عبارت میں بیان کرے اور دُوسرے کو پہنچاوے تو وہ ہمارا کلام اور ہمارا پیام ضرور سمجھا جائے گا گو دوسری وجہ سے اس کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا بھی غلط نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اصل کلام مضمون و معنی ہیں الفاظ و حروف اس کے لیے عنوان اور اس پر دال ہیں۔ اب ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بات بھی بسہولت سمجھ میں آجائے گی کہ قرآن شریف اور احادیثِ قدسیہ اور دیگر احادیث و اقوال نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم سب کلامِ الٰہی اور وحی من اللہ ہیں عوارض خاصہ اور بعض احکام میں گو اُن میں باہم امتیاز ہو اور ضرور ہونا چاہیے، مگر کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی خفا نہیں۔ چنانچہ جملہ اکابر کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ احادیثِ رسول علیہ السلام حتیٰ کہ ان کا خواب بھی وحی ہی سمجھا جاتا ہے۔

جب وحی کا مفہوم اور اُس کا مصداق اور اُس کے اقسام معلوم اور معین ہو چکے تو اب اُس کی عظمت اور صداقت میں کون کلام کر سکتا ہے جو دلیل کی حاجت ہو جب کسی کو حاکم یا سُلطان مان لیا جاوے تو گنوار سے گنوار بھی اُس کا یہی مطلب سمجھتا ہے کہ اُس کے احکام واجب التسلیم ہیں ہاں اگر کوئی سلطان اور حاکم کے معنی ہی نہ سمجھے یہ دوسری بات ہے۔ یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ کوئی خدا کا تو قائل ہو اور اُس کے احکام کو واجب التسلیم نہ سمجھے اور بالفرض کوئی ایسا ہو تو اس کو ایمان کے ساتھ آدمیت سے بھی نکالنا پڑے گا بلکہ نکالنے سے پہلے خود نکل جائے گا کہ وہ حقیقت میں خدا ہی کا منکر ہے اُس کے بعد یہ التماس ہے کہ وحی کے واجب التسلیم ہونے کے ساتھ یہ امر بھی ضروری اور بدیہی ہے کہ جملہ ذرائعِ علم میں وحی کے برابر کوئی نہیں جہل و خطا و نسیان کا اُس میں شائبہ تک نہیں۔ اُس کے مقابلہ میں افلاطون و بقراط کے کلام کو کسی جاہل کودن طفل مکتب کے کلام پر ہرگز فوقیت نہیں کون نہیں جانتا کہ کلام کی عظمت اور اُس کی متابعت فصاحت و بلاغت واقعیت و صداقت تطابق حکمت و مصلحت کا مدار اُس کے متکلم پر ہوتا ہے جس درجہ کا متکلم ہو اُس درجہ کا کلام و قدر الشہادۃ قدر الشہود چنانچہ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلامِ الٰہی کو تمام مخلوقات کے کلام پر وہی فضیلت حاصل ہے جو حق جل و علا شانہ کی ذات پاک کو تمام مخلوقات پر کلام الملوک ملوک الکلام کے

قاعدے سے تو کلام الالٰہ اللہ الکلام کہنا ضرور ہوگا پھر کلامِ الٰہی کے برابر یا اس سے زاید مخلوقات کا کلام کیسے ہو سکتا ہے بلکہ جیسے اس کے مقابلہ میں کسی کی کچھ حقیقت نہیں ایسے ہی اس کے کلام کے مقابلہ میں کسی کے کلام کی کچھ حقیقت نہ ہوگی سقراط اور ارسطو کے کلام کے روبرو کسی پاگل دیوانہ کے کلام کی جتنی وقعت ہو سکتی ہے رب العزّت کے کلام مقدس کے روبرو تمام مخلوقات کے کلام کی اتنی وقعت بھی نہیں ہو سکتی بالجملہ یہ امر بدیہی ہے کہ کلامِ الٰہی کے برابر ہرگز ہرگز کسی کا کلام قابلِ تسلیم اور واجب التعمیل نہیں ہو سکتا اور اس پر کوئی حجتی بہت سے بہت کہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم کو وحی الٰہی بلاواسطہ تو پہنچتی نہیں بیچ میں وسائط ضرور ہیں تاوقتیکہ اُن وسائط کی طرف سے اطمینان تام نہ ہو کلامِ الٰہی ہونے پر کیسے وثوق ہو سکتا ہے صرف قائل کی صداقت کافی نہیں ہو سکتی اس کے ساتھ ناقل کا سادق ہونا بھی ضرور ہے تو وسائط کل دو ہیں ایک وحی لانے والا یعنی فرشتہ۔ دوسرے جس پر وحی لے کر آیا، یعنی نبی اور رسول۔ سو ان دونوں فریق کی صداقت اور عصمت باتفاق اہلِ عقل و نقل ایسی ظاہر و مسلّم ہے کہ اصلاً حاجت بیان نہیں کون نہیں جانتا کہ ملائکۃ الرحمٰن اور انبیائے کرام مقربین بارگاہِ الٰہی سے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مقرب اور خواص بننے کے لیے سراپا اطاعت ہونا ضرور ہے اپنے مخالفوں کو اپنی بارگاہ میں کون گھسنے دیتا ہے اور مسندِ قرب پر کون قدم رکھنے دیتا ہے اس لیے ضرور ہے کہ وہ مقرب جن پر اپنے اسرار اور مافی الضمیر آشکارا کیے جاویں اور منصبِ سفارت پر مقرر فرمائے جائیں اور سلسلہ ہدایت عالم ان کے ساتھ وابستہ کیا جاوے اور لا یعصون اللہ ما امرھم اور ما اٰتٰکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا فرما کر حق تعالیٰ نے اس کی صداقت کی کفالت فرمائی ہو معصوم اور ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار ضرور ہوں گے سو اب ملائکہ اور حضرات انبیا کی شان میں کوئی بیہودہ خیال کرنا ہرگز انہیں تک نہ رہے گا بلکہ اُس کی نوبت دُور تک پہنچے گی۔ علاوہ ازیں حضرات ملائکہ کی طرف سے بدظنی تو اتنا بعید امر ہے کہ عاقل سے متوقع نہیں جو اُن کی اصلیت اور اُن کی حالت سے مطلع ہوگا جان لے گا کہ اُن میں رذائل کا مادہ ہی نہیں اُن کی طرف کذب کا خیال ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی ناواقف اُن کی طرف اکل و شرب و توالد و تناسل کا خیال خام پکانے لگے البتہ حضرات انبیاؑ کے بشر ہونے کی وجہ سے شاید ان کی نسبت کسی کو یہ خیال ستائے تو اس ضرورت سے جواب اوّل کے علاوہ دوسرا امر قابلِ التماس یہ ہے کہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کو اور تم کو جو کسی کے بہادر یا سخی یا باحیا یا عقلمند یا راستباز یا امانتدار وغیرہ ہونے کا بسا اوقات یقین ہوتا ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اُس کے تجربہ اور مشاہدہ احوال و اقوال سے ہم کو بسا اوقات ایسا یقین ہو جاتا ہے کہ جانب مخالف کا خیال بھی نہیں رہتا تو اب حضرات انبیا کے بارہ میں یہ قاعدہ مسلّمہ کہاں جاتا رہا اور حضرات علیہم السلام کو رہنے دیجئے۔ حضرت رسولِ عربی اُمّی سیّد الانبیاءؑ والمرسلین کے احوال و افعال و اقوال کو ملاحظہ فرمایئے کہ موافق و مخالف جو ان کی حالت نقل کرنے میں برتتے انصاف اس سے کیا نکلتا ہے کوئی دلیل جس سے اُن کی عقل و فہم و فراست و صداقت دیانت و امانت سخاوت و شجاعت حیاؑ و متانت وغیرہ میں کمی بھی معلوم ہوتی ہو، اگر ہو تو پیش کیجئے گا یا ہم آپ کو یہ دکھلاتے ہیں کہ ان کے مخالف اور دشمن ان کے کمالات کے کس قدر مداح ہیں یقیناً آپ کا کمالات حسنہ میں کامل ہونا اُس سے زیادہ قابلِ تسلیم ہے جیسے کہ رستم کی شجاعت و حاتم کی سخاوت مسلّم ہو رہی ہے مگر تعصب و عناد کے علاج سے سب مجبور ہیں کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ ایسا شخص جو صداقت و دیانت جملہ کمالات میں نظیر نہ رکھتا ہو وُہ وحیِ خداوندی میں ایسا کرے اور جس نے مدت العمر کسی کے ساتھ کذب کا

استعمال نہ کیا ہو وہ نعوذ باللہ خداوندِ عالم پر جھوٹ لگائے اسی کے ساتھ بشرطِ فہم یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی کیا صورت ہوئی اور کیا کیا اسباب اور اہتمام اُس کے متعلق پیش آئے تاکہ اس پر غور کرنے سے اہلِ فہم کو بالبداہت یہ معلوم ہو جائے کہ وحی الٰہی میں کسی قسم کے خلجان کی گنجائش نہیں اور وحی من اللہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ اور عظیم الشان امر ہے جس کے قابل کوئی ہی نکلتا ہے اور پھر اس پر نزول کی بھی خاص ہی شان ہوتی ہے اور پھر فرقِ مراتب کی وجہ سے ہر ایک وحی کا اہتمام اُسی کی شان کے موافق کیا جاتا ہے دیکھیے حضرت رسولِ اکرم نبی الانبیا والامم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی جس کو اعلیٰ درجہ وحی کا کہنا چاہیے اُس کے حالات اور کیفیات کو ملاحظہ فرمایئے اور پھر جس کا جی چاہے انصاف سے کہہ دے کہ اس میں کسی کوتاہی یا نقصان کی گنجائش ہو سکتی ہے ہرگز نہیں اس کی تفصیل کے لیے جو امام المحدثین امیر المومنین فی الحدیث نے صحیح بخاری میں بواسطہ احادیث بیان فرمایا ہے اس کو بہت کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت امام بخاری نے یہ کیا کہ اپنی کتاب میں سب سے اول باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منعقد فرمایا جس سے معلوم ہو گیا جملہ اصول و فروع حتیٰ کہ ایمان اور علم سب کا ماخذ و منشأ وحیِ الٰہی ہے اور تمام اصول و فروع وہی معتبر ہو سکتے ہیں جن کا ماخذ وحی ہو اور اس کتاب میں جو مذکور ہو گا اصول ہوں یا فروع عبادات ہوں یا معاملات اُس کا ماخذ وحی ہو گی۔ اور اس کی کیفیات اور اُس کے حالات بیان فرمانے سے حضرت امام رضی اللہ عنہ و ارضاہ کی یہ بھی غرض معلوم ہوتی ہے کہ اُن کو سمجھ کر ہر کوئی سمجھ جاوے کہ بیشک وحی ہی اصل اصول ہے اور اُس کے روبرو کوئی مستحکم سے مستحکم دلیل بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ترجمہ بیان کرکے اس کے بعد چند آیات و احادیث امام رحمہ اللہ نے بیان فرمائیں جس سے کیفیاتِ بدءِ وحی کی توضیح ہو جائے اور اُس کی عظمت اور مفترض الطاعت ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہے مگر صرف دو باتوں کا خیال ضرور رہے۔ اول یہ کہ لفظ وحی میں جملہ اقسام مذکورہ بالا داخل ہیں وحی متلو یعنی قرآن شریف ہی مقصود نہیں۔ دوسرے یہ کہ ابتدا اُسے کوئی خاص ابتدا منظور نہیں بلکہ عام ہے خواہ بلحاظِ زمانہ ہو یا مکان یا باعتبار احوال خاصہ ہو یا اوصاف ترجمہ کے متصل ہی یہ آیۂ کریمہ انا اوحینا الیك کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ بیان کی جس سے معلوم ہوا کہ مبدءِ وحی یعنی جہاں سے یہ کلام صادر ہو وہ حق جل و علیٰ شانہ ہے اور اسی طرح یہ انبیائے سابقین پر وحی آئی جس سے معلوم ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کو اس کا ماننا ایسا ہی پڑے گا جیسے اپنے انبیا کی وحی کو تسلیم کرتے ہیں اس کا انکار گویا سب کا انکار ہے اور جن کو علم و عقل عنایت ہوا ہے وہ اس پر قناعت نہ فرمائیں بلکہ اس رکوع کو صراحاً مستقیماً تک غور سے ملاحظہ کریں کہ وحی کی عظمت اور اس کی تاکید کس کس طرح سے کی گئی ہے۔ شاید کسی دوسرے موقع پر اتنی تاکیدات نہ ملیں جس سے امام بخاری رحمہ اللہ کی فہم و تتبع کا پورا پورا پتا لگتا ہے۔ اس کے بعد چند روایات اور آیات کو بیان فرمایا جن کی تفصیل سے اس وقت بالکل قاصر ہوں۔

ہاں بالاجمال یہ عرض ہے کہ اُن سے یہ معلوم ہوا کہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نیت اعلیٰ اور خالص ہو نسب بہت اعلیٰ اور اخلاق و اعمال کامل ہوں نقضِ عہد اور کذب سے مبرا ہو مخالفین تک اُس کی صدق و دیانت و عمدگیِ اخلاق و افعال کو تسلیم کرتے ہوں اور خاص جناب سید المرسلین کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ آپ کو ابتدا سے وحی نہیں عنایت ہوئی بلکہ بڑے ہو جانے اور کامل العقل ہونے کے بعد یعنی چالیس سال کے بعد آپ کو وحی عطا ہوئی اور فرشتوں میں بھی خاص حضرت جبرائیل علیہ السلام جو

افضل الملائکہ ہیں اس خدمت پر مامور ہوئے اور بہت سے مجاہدات وخلوات اور کثرت عبادات کے بعد اور ابتدا میں یہ حالت ہوئی کہ کلمات عربی جو آپ کی زبان تھی اس کو نہ کہہ سکے مکرر سہ کرر جدوجہد کے بعد اُن چند کلمات کو کہہ تو لیا مگر نہ دل قابو میں نہ ہاتھ پیر۔ اُس کی عظمت وہیبت سے آپ کو یہاں تک اندیشہ ہوا کہ شاید مر جاؤں اور یہ نوبت بھی اول نہیں بلکہ کچھ عرصہ تک خواب میں اوّل آپ کو یہ حالاتِ صادقہ پیش آ چکے تھے اور یہ حالت تو آپ کی اخیر تک رہی کہ نزولِ وحی کے وقت شدتِ سرما میں پسینہ بہنے لگتا تھا سوار ہوتے تھے تو سواری بیٹھ جاتی تھی، کسی کے گھٹنے پر آپ کا گھٹنا ہوتا تو وہ یہ خیال کرتا کہ شاید میری ہڈی چُور چُور ہو جائے گی۔ انھیں روایات سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ غارِ حرا جو آپ کی عبادت گاہ اور اعتکاف کی جگہ تھی وہاں اوّل وحی آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام مہینوں میں رمضان شریف کے مہینہ کو وحی سے زیادہ اختصاص ہے۔ اور انھیں روایات سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ چالیس برس کے بعد اور خوابوں کے بعد جب فرشتہ وحی لانے لگا تو پھر بھی متصلاً نہیں آئی بلکہ آکر ایک عرصہ تک آنا بند رہا پھر جو آئی تو علی الاتصال آتی رہی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وحی کے محفوظ رہنے اور بجنسہٖ اُس کے لوگوں تک پہنچوا دینے کی حق تعالیٰ نے کفالت اور ذمہ داری فرمائی اور صاحبِ فہم کو اور امور بھی اُن روایات سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جن سے عظمتِ وحی ہویدا ہے اور ان کے سوا دیگر روایات سے ایسے حالات بکثرت اہلِ فہم کو معلوم ہوتے ہیں جن سے دو باتیں ضرور سمجھ میں آتی ہیں اوّل تو وحی کی عظمت، دوسرے یہ کہ اس میں کسی طرف سے اندیشہ سہو و خطا وغیرہ نہیں ہو سکتا لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ کے اس طرز سے ہمارا مدعا ایک قسم کی وضاحت کے ساتھ ثابت ہو گیا کہ وحی جو بواسطہ رسول ہم کو پہنچتی ہے متلو ہو یا غیر متلو، وہ ہمارے لیے ایسی کافی حجت ہے کہ اس کے ہوتے دوسری طرف نظر ڈالنی اور وہ بھی کیف ما اتفق بیشک خدا کی بندگی سے نکال کر شیطان کی بندگی میں داخل کر دیتی ہے اور آپ کا ارشاد نہ فقط اہلِ اسلام پر بلکہ تمام اہلِ زمین پر بروئے انصاف ایسی حجت ہے کہ اس کا ماننا ہر متنفس کو ضروری ہے اور اس کے مقابلہ میں اِدھر اُدھر جانا بالکل خام خیالی ہے اور مسلمانوں میں گو اس کو سب مانتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے زور میں آکر ذرا اِدھر اُدھر ہو کر بہت دُور نکل جاتے ہیں الحذر الحذر اگر مقدر ہے تو شاید کسی وقت کچھ تفصیل کی بھی نوبت آ جائے ؎

یکے از عقل می لافد یکے طامات می بافد
بیا کیں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ؎

صحرائے مغیلاں ہوس طے شدنی نیست — در دامنِ تجرید شکستیم قدم را
شادم کہ قضا ساختہ محراب جبینم — درگاہ شہنشاہ عرب را و عجم را
آں شمعِ رسالت کہ کند نور جبینش — ہم منصب پروانہ براہینِ حِکَم را

پیشتر یہ مضمون کچھ بسط سے معلوم ہو چکا ہے کہ مدار جملہ احکام وحیِ خداوندی پر ہے کسی کی بات کو بمقابلہ وحی قابلِ قبول سمجھنا خالق و حاکم پر مخلوق و محکوم کی فوقیت و برتری کا اقرار کر لینا ہے جس کے ابطال کے لیے نام کی عقل بھی کافی ہے۔ علم و ایمان کی بھی چنداں احتیاج نہیں یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو ایمان و علم کے بدلے میں بھی عقل ہی مل گئی تھی وہ بھی وحی کے تکیہ گاہ بے حجت

ہونے کو بلا حجت مان گئے۔

شکلِ انسانی میں ایسے افراد تو کچھ نہ کچھ ضرور پائے گئے کہ سرے سے وجودِ باری کے ہی منکر ہو گئے اور وجودِ مخلوقات کے لیے وجودِ خالق کی ضرورت اُن کی عقل میں نہ آئی۔ مگر ایسا ایک شخص بھی نہ ہوا ہو گا کہ وجودِ خالق کائنات اور اس کی صنعت کما یہ کا قائل ہو کر اس کے احکام کو واجب التسلیم نہ سمجھے یا کسی دُوسرے کے حکم کو اس کے احکام پر ترجیح دینے کی جرأت کرے۔

ایسا تو ہو جاتا ہے کہ سلطانِ وقت یا حاکم با اختیار کی حکومت کو کوئی سینہ زوری یا حماقت سے تسلیم نہ کرے اور بغاوت پر کمر بستہ ہو جائے۔ مگر ایسا دیکھا تو کیا سُنا بھی نہ ہو گا کہ کسی کی سلطنت اور حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد پھر اس کے احکام کے واجب الاتباع ہونے کا انکار کرے یا رعایا میں سے کسی کے احکام کو اُس کے احکام کے مقابلہ میں واجب التسلیم خیال کرے اور بالفرض کوئی ایسا کرے تو اُس کو آدمیوں میں شمار کرنا آدمی کا تو کام نہیں یہ تو صریح اجتماع ضدین ہے جس سے بڑھ کر غلط اور باطل کوئی امر نہیں ہو سکتا۔

بالجملہ وحی یعنی کلامِ الٰہی اور کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ وُہ بھی حسبِ بیان سابق حقیقۃً میں کلامِ الٰہی ہے ایسی مستحکم اور قوی حجت ہے جیسی خدا کی خدائی۔ اس کے مقابلہ میں کسی دلیل کی اتنی بھی وقعت نہیں ہو سکتی جیسے آفتاب کے مقابل ذرہ اور دریا کے سامنے قطرہ۔ اور ایسا عام حکم ہے کہ عرب، عجم، مسلم، غیر مسلم، عالم، جاہل، جملہ بنی آدم پر اُس کی متابعت بلا تخصیص و استثنا یکساں فرض ہے۔ اُس کے کسی حکم سے انکار اور سرتابی کرنے والا انھیں خطابات کا مستحق ہے جو ابلیس کو ہمیشہ کے لیے دیے گئے۔

اُس کے واجب التعمیل ہونے میں کسی کو اتنی بھی گنجایش نہیں کہ تسلیم عقل کی انتظاری کی جاوے یا اس کے لِم اور اغراض و مصالح کے معلوم ہونے کی یا کسی خدشہ کے رفع کرنے کی راہ دیکھی جائے۔

اس مضمون مسلم و بدیہی کے بعد ہر کوئی یقین کر سکتا ہے کہ اگر فہم و حق پرستی، انصاف و ایمان سے کام لیا جاتا تو وحیِ الٰہی کے ہوتے مذاہبِ مختلفہ کی نوبت آنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ جب سلطانِ وقت تمام رعایا کے لیے ایک عام قانون تجویز اور معین فرما دے اور اسی کے مطابق تمام معاملات و نزاعات فیصل کیے جاویں تو پھر اختلافات کے چلنے اور بڑھنے کی صورت کیا ہے۔

اب اس پر یہ اختلاف مذاہب اور تعارض عقاید و خیالات جو بحر مواج کی صورت میں نظر آتا ہے کس چیز کا ثمرہ ہے اور اس اختلاف کے اسباب کیا ہیں؟

ظاہر ہے کہ علیٰ سبیل منع الخلو[1] اس اختلاف کا باعث کل دو امر ہیں۔ جہل و بد فہمی یا ناحق پرستی اور بے انصافی۔ کیونکہ اس خرابی کا منشا یا نقصان علم ہو گا یا نقصان عمل سو اوّل اوّل ہے اور ثانی ثانی۔ آگے جو کچھ اسباب اختلاف نظر

---

[1] یعنی دونوں سببوں میں سے ایک تو ضرور رہتا ہے اور اگر دونوں سبب موجود ہوں تب بھی مضائقہ نہیں ۱۲

آویں گے جیسے خود رائی، خود پسندی اپنے سلف جاہلین کا اتباع، اپنی رسوم اور اغراض و مصالح کی پابندی، اپنے خیال میں تشدد و تعصب سہل انگاری و تساہل عناد و دشمنی، توسع اور مطلق العنانی، بیباکی و آزادی وغیرہ وہ سب انھیں دو کے شعبے ہیں۔

انصاف سے دیکھ لیجئے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین چونکہ علوم شرعیہ میں کامل اور حق پرستی میں طاق تھے یعنی اُن کے علم و عمل دونوں جز نقصان مذکور سے پاک وصاف تھے اس لیے ان میں وہی ایک مذہب حق جو حضرت سید العرب والعجم کے زمانہ مسعود میں موجود تھا اُسی ہیئت و صورت پر قایم رہا۔ کسی دوسرے طریقہ کو اتنی بھی گنجایش نہیں ملی کہ ان نفوس مقدسہ میں سے ایک فرد پر بھی اپنا ادنیٰ اثر پہنچا سکے اور یہ اختلاف مذموم اُن کاملین فی العلم والعمل میں سے کسی ایک کو بھی اپنا منہ دکھلا سکے۔ اللہ اکبر۔

البتہ ان کے بعد اور طبقات میں جب جہل و ناحق پرستی کا اثر رفتہ رفتہ آنا شروع ہوا تو اسی کے ساتھ ساتھ اختلاف منحوس کو بھی اسلام میں قدم بڑھانے کی گنجایش ملی۔

اور آج غلبہ جہل و ناحق پرستی کے باعث اُس اختلاف کی یہ نوبت ہے کہ یہود و نصاریٰ کا اختلاف بھی گرد نظر آتا ہے۔ بنی اسرائیل وغیرہ اُمم سابقہ کو جو جو موجبات اختلاف پیش آئے تھے جن کے باعث اُن کے مذہب اصلی کا پتا لگانا عنقا کی سراغ رسانی سے کم دشوار نہیں وہ جملہ اسباب زور شور کے ساتھ آج مدعیانِ اسلام میں موجود ہیں جن کی اصل وہی دو مرض ہیں جو ہم ابھی عرض کر چکے ہیں۔

اگر ارشادِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق ظاہرین لا یضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ[1] کی جلوہ افروزی اور فرمان لن تجتمع امتی علی الضلالۃ[2] کی کارسازی نہ ہوتی تو آج اس افضل الادیان کی بالیقین وہی حالت ہوتی جو ادیان سابقہ کی یا اُس سے بھی بدتر اور خیر الکتب یعنی قرآن پاک کی وہ گت ہوتی جو کتب سماویہ تورات وانجیل وغیرہ کی یا اُس سے بھی ابتر۔ نعوذ باللہ والحمد للہ۔

بالجملہ احکام وحی تو فی نفسہ ایسی حجت قطعی اور فرمان عام ہیں کہ ہرقل و کسریٰ و نجاشی سے لے کر شاہانِ یورپ تک اور سُکانِ حرمین سے لے کر جرمن و لندن و فرانس تک کسی کا کوئی عذر، حیلہ، دلیل بروئے فہم و انصاف اس کے مقابلہ میں قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔ تمام عالم پر اُس کی اطاعت فرض ہے۔ مگر صرف اُن بے اصل خیالات کے باعث جو جہل و ناحق پرستی پر مبنی ہیں یہاں تک نوبت آئی کہ مدعیانِ اسلام بھی بکثرت اُن احکام کی پابندی سے آزاد و سبکدوش ہو بیٹھے دُوسروں کا تو ذکر کیا ہے۔

---

[1] یعنی میری امت میں سے قیامت تک ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی جو دُوسروں پر غالب ہوگی اور مخالفین کی مخالفت اُس کو کچھ ضرر نہ دے گی۔

[2] میری اُمت گمراہی پر جمع نہ ہوگی ۱۲

صرف اتنا فرق ہے کہ دیگر اقوام تو اُسی جہل و تعصب کے باعث آپ کی رسالت، مذہبِ اسلام کی حقیقت، قرآن و حدیث کے وحی الٰہی ہونے کا سرے سے انکار کر کے اپنے نزدیک فارغ البال ہو بیٹھے۔ بہت ہُوا تو اصول و فروعِ اسلام پر کچھ اعتراض بھی کر دیا اور مدعیان و محبان اسلام اتنی جرأت تو کیسے کر سکتے تھے انھوں نے یہ کیا کہ اپنی رائے کو بزور دخل دے کر خیالی گھوڑے دوڑانے شروع کیے اور اپنی فہم اور اغراض و اوہام کو اصل قرار دے کر کلامِ الٰہی اور کلام جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کھینچ کھینچ کر اُس پر منطبق کرنا شروع کر دیا اور خود رائی کے جوش میں سلف صالحین حتیٰ کہ اصحابِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے خلاف کی بھی کچھ پروا نہ کی فضلوا و اضلوا[1] حالانکہ اہلِ علم و ایمان خُوب جانتے ہیں کہ حضرات صحابہ کی کیا شان ہے اور قرآن مجید اور حدیث شریف میں اُن کے کمالات اور مناقب کیا کچھ مذکور ہیں اور اُمتِ مرحومہ کو ان کی تعظیم اور متابعت کی بابت کیا کیا وصیتیں ہیں۔ خیر یہ قصہ تو لمبا چوڑا ہے جس کی تفصیل سے اس موقع پر ہم معذور ہیں۔

اہلِ فہم ہمارے بیان سے اتنا ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ جس جماعت نے وحی کو اپنا قبلہ اور حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اپنا امام بنایا وہ نہ تو اُس طریقہ کے مخالف ہوئے جو اوّل سے چلا آتا تھا اور نہ اُن میں باہم اس اختلاف مضر کی نوبت آئی جس کے بانی جاہل ہوا پرست ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب سب کا مقصود ایک ہے خود رائی اور خود غرضی کا لگاؤ نہیں علم کامل ہے پھر اس اختلاف فاحش کے پیش آنے کے کیا معنی۔

بس اسی ایک فرقہ کو اہلِ حق اور اہل سنّت کا خطاب ملا اور ارشاد ما انا علیہ واصحابی[2] کا یہی مصداق ہوا۔

البتہ جن صاحبوں نے بوجہ نقصان فہم یا غلبۂ اغراض و ہوا اپنی رائے اور توہمات کو امام بنایا اور احکامِ وحی کو اُس کے موافق کرنے میں سعی کی وہ لوگ طریقۂ حق سے بھی اپنے اپنے جہل اور اوہام کے مطابق دُور ہوتے گئے اور حسبِ ارشادِ رسول علیہ السلام اختلاف مذموم اور تعدد مذاہب کو بھی اُن میں پُورا دخل ملا۔

کون نہیں جانتا کہ عقل عقلا خود از حد متفاوت ہے۔ پھر بیوقوفوں کی سمجھ اور اُن کے اوہام و اغراض کا تو پوچھنا کیا ہے۔ اُن کی بدولت تو جس قدر اختلاف اور تعددِ مذاہب پیش آوے وہ تھوڑا ہے۔

یہ تمام فرقے اہلِ اہوا کہلاتے۔

ادیانِ سابقہ میں جو کچھ خلل آیا اس کی بڑی وجہ یہی ہوئی کہ جب کسی نبی کا زمانہ ختم ہُوا تو اُن کے خلفا و اصحاب نے دین کو سنبھالا اور اُن کی ہدایت کے موافق خلق اللہ کی اصلاح میں کوشش کی مگر رفتہ رفتہ کہیں جلد کہیں دیر میں یہ ہوا کہ ناقص الفہم خود رائے، مختلف الخیال مداہن، ہوا پرست لوگوں نے آکر حدودِ شرعیہ کو ضائع اور احکامِ دین میں تحریف و تغیّر کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دین اصلی مخالفوں سے تو کیا خود اہلِ ملت سے ایسا رُوپوش ہو گیا کہ قیامت تک اُس کی صورت سے محرومی اور اُس کے

---

[1] خود بھی گمراہ ہوئے اور دُوسروں کو بھی گمراہ کیا ۱۲

[2] جس طریقہ پر میں ہوں اور میرے صحابہ ۱۲

دیدار سے یاس کلّی ہو چکی۔

ملّتِ ابراہیمی اور ملّتِ موسوی اور ملّتِ عیسوی وغیرہ سب میں یہی مرض مہلک اپنا پورا اثر دکھلا چکا ہے اور حسبِ ارشادِ فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ تمام مفاسد و اختلافات آج مذہب اسلام میں نہایت شدت و کثرت کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔

وحی الٰہی یعنی قرآن و حدیث کہ جن کے ساتھ دین اسلام کا وجود و عدم وابستہ ہے دانا دشمن اور نادان دوستوں نے یا یوں کہو کہ دشمنان اعیانی اور پنہانی نے طرح طرح سے اُس کے ساتھ وہ سفاکانہ اور بیباکانہ کارروائی کی ہے کہ جس پر اسلام کا اصلی صورت پر باقی رہنا ایک حیرت ناک قصہ ضرور ہے۔

انصاف سے ایک تحریفِ معنوی ہی کی کیفیت کو ملاحظہ فرمایئے جو اس وقت میں وبا کی طرح پھیل رہی ہے کہ اُس کے مقابلہ میں یہود کی وُہ تحریف کہ جس کی بُرائی کلامِ الٰہی میں جگہ جگہ مذکور ہے کم نظر آتی ہے۔

توراۃ میں جو تحریف کرتے تھے وہ کسی وجہ سے عالمِ توراۃ تو سمجھے جاتے تھے۔ الفاظ توراۃ کی تلاوت سے متنفر اور اُس کی عبارت کے ترجمہ لفظی سے تو بےخبر نہ تھے یہ تو نہ تھا کہ محض بضرورتِ تحریف ہی توراۃ کو دیکھتے ہوں۔ اب تو یہاں تک نوبت آ گئی کہ کتبِ تاریخ دیکھ لو اور کلامِ الٰہی اور کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریف شروع کر دو، یا جغرافیہ پڑھ لو اور تحریف کرنے لگو، یا زبان انگریزی یا ڈاکٹری یا ریاضی و ہیئت یا کوئی معزز عہدہ یا وکالت یا مختارکاری وغیرہ کا پاس حاصل کر لو اور وحی الٰہی میں تحریف و خودرائی کی سند دبا بیٹھو۔ قرآن و حدیث کو کبھی نہ دیکھو بلکہ دُوسروں کو بھی تضیع اوقات کا فتویٰ سُنا دو اور جب کوئی ضرورت یا جدید خیال پیش آئے تو نہایت آزادانہ رائے زنی کرو خالق و مخلوق کسی کی موافقت کا انتظار اور مخالفت کی پروا نہ کرو۔ زبان عربی سے ناواقفیت ہو تو ترجمہ دیکھ لو یا کسی سے پُوچھ لو ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علاوہ ازیں جہاں تک دیکھا جاتا ہے تو اہلِ کتاب اپنی کتابوں میں انھیں مواقع میں تحریف کی نجاست میں ملوث ہوتے تھے جہاں اپنی اغراض فاسدہ کی وجہ سے کوئی بڑی دقت نظر آتی تھی جیسے زنا کی سزا رجم، اور پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور اُن کے اتباع کا حکم۔

اور اب ہم اہلِ اسلام کے اندر یہ مرض مہلک ایک دریائے شور کی طرح ایسا پھیلا ہوا ہے کہ عقاید سے لے کر اعمال تک اور اوضاع سے لے کر عادات تک کوئی اس کی تلخی سے بدشواری خالی رہ سکے گا گویا وحیِ الٰہی میں اُسی آزادگی کے ساتھ رائے زنی کرنا مدار لیاقت اور معیارِ عقل و کمال ٹھہر گیا ہے ضرورت کی بھی ضرورت نہیں ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اور اسی پر بس نہیں بلکہ مقامِ ترقی میں احادیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات پر ایک طرف سے غیر معتبر ہونے کا فتویٰ

لگایا جاتا ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ارشاد أنتم اعلم بامور دنیاکم[1] کی وجہ سے تمام احکام متعلقہ معاملات کو امور دنیا میں شمار کرکے ہر ایک خود رائے ہوا پرست، خاتم المرسلین اور قائل اوتیت علم الاولین والآخرین[2] کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اعلم کہنے کو تیار ہے۔

حضرات صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین اور جملہ صلحا وصدیقین کی تو اب حقیقت ہی کیا رہ گئی۔ افسوس

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

اب انصاف وفہم سے کام لیجئے تو اسلام کی ضرر رسانی میں دونوں فریق مذکور برابر ہیں۔

فریق اول نے جو وحی الٰہی کی صاف صاف تکذیب کی اور فریق دوم نے جو اپنی ہوشیاری اور دینداری سے تاویلات و تحریفات کر کے نصوص کا وہ مطلب نکالا جو اغراض شارع کے بالکل خلاف ہے۔ یہ دونوں امر اسلام اصلی کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ایک دوسرے کی نظیر ہیں ؎

نشاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے

بلکہ چشمِ بصیرت ہو تو دوستوں کی یہ عنایات دشمنوں کے ستم سے بدرجہا زاید ہیں اور گوش حقیقت نیوش ہو تو اسلام زبانِ حال سے باوازِ بلند کہہ رہا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نمی نالم کہ بر جانم
بلاہائے کہ شد نازل ز دستِ دوستاں آمد

منصف فہیم بالبداہت سمجھتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں تعلیم زبان ولغات کے لیے تشریف نہیں لائے بلکہ اقیوں کو اُنھیں کے محاورات میں ہدایت اور تعلیم احکام فرماتے ہیں جو زبان اُن کے اندر پہلے سے شائع ہوتی ہے اور سیدھے سادے طرز میں جو کہ معمیات اور تکلفات کے اسلوب سے براحل دور ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ خود ارشاد صریح موجود ہے۔ اور قرآن شریف کو مواقع کثیرہ میں "مبین" فرمایا ہے تو اب قرآن مجید کے معنی خلاف لغت واستعمال عرب لینے یا خلاف صحابہ وتابعین اور دیگر عرب العرباء کے اُس کے مطلب کو چیستان بنانا بیشک اُسی نظر سے دیکھا جائے گا جیسے کوئی ہندی، یورپی، کابلی صرف ونحو کے دو چار رسالے

---

[1] تم اپنے دنیا کے کاموں سے خوب واقف ہو ۱۲

[2] مجھ کو اولین وآخرین کا علم عطا کیا گیا ہے ۱۲

دیکھ کر امراؤالقیس[1] اور لبید کو اصلاح دینے کے لیے بیٹھ جائے بلکہ اُس سے بھی کمتر۔

اہلِ اہوا کو اس خطاب کا مستحق صرف اتنی ہی بات نے بنایا ہے کہ انھوں نے اپنی رائے کو امام بنا کر اور اپنی اغراض کو نصب العین رکھ کر احکامِ وحی کو اُس کے ساتھ کھینچنا چاہا اور کسی کے وفاق و خلاف کی پروا نہ کی اور نقل و عقل میں جب کشمکش پیدا ہوئی تو اُنھوں نے بزورِ عقل اپنی ناقص عقل کو سب پر مقدم رکھا اور نصوص یقینیہ میں تاویلات ناروا اور طرح طرح کی حیلہ سازی سے کام لیا۔

مثال مطلوب ہے تو سُنیے انھیں حضرات نے مخالفت نصوص کے طعن سے بچنے کے لیے ایک قاعدہ عامۃ الورود اور ایک چلتی ہوئی تدبیر جگہ جگہ یہ پیش کی کہ خدائے برتر اور رسولِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی جملہ کوئی کلام ہرگز ہرگز خلافِ حقیقت خلافِ واقع خلافِ عقل نہیں ہو سکتا۔ یہ قاعدہ فی حد ذاتہ ضرور قابلِ تسلیم ہے۔ مگر اُنھوں نے اس سے یہ کام لینا شروع کیا کہ جب کوئی حکم وحی اُن کے نام کی عقل بلکہ اُن کے وہم کے بھی خلاف نظر آیا اور حسبِ حکمِ الٰہی سے اُن کو جان بچانی منظور ہوئی وہاں اپنے توہمات سے خلافِ واقع اور خلافِ عقل کا فتویٰ دے کر اُس حکم سے سبکدوش ہو بیٹھے اور نہایت بے فکری بلکہ سرکشی کے ساتھ انکار محض یا تحریف و تاویل جس سے چاہا کام لیا۔

چنانچہ رویۃ جناب باری، ثبوت تقدیر، تعذیب قبر، وزن اعمال، پلصراط، دوزخ جنت کا بالفعل موجود ہونا اور دیگر جزئیاتِ کثیرہ قطعیہ کا خُون اسی شمشیر کے بھروسے اپنی گردن پر لینا بڑے اطمینان کے ساتھ منظور کیا گیا۔

افسوس اُن مدعیانِ عقل و اسلام کو اتنا بھی نہ سُوجھا کہ کلامِ خداوندی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مخالف حقیقت اور مخالف واقع نہیں ہو سکتے ایسی ہی واقع کے دریافت کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف رجوع کیا جاوے جو کوئی طریقہ دربارہ اخبار واقع مخالف کلام اللہ اور احادیث صحیحہ ہوگا تو کلام اللہ اور احادیث کے ذریعہ سے اُس کی تغلیط کر سکیں گے پر کلام اللہ اور احادیث کی تغلیط اس طریقہ کے بھروسا ہرگز نہیں کر سکتے۔

الغرض عقل کی بات تو یہ تھی کہ کلام اللہ اور احادیث صحیحہ نمونۂ صحت و سقم دلائل عقلیہ سمجھی جاتیں نہ برعکس۔

علیٰ ہٰذا القیاس کلام اللہ اور حدیث کے مضمون متبادر و مطابق محاورۂ عرب کو جو باعتبار قواعد صرف و نحو بدلالت مطابقی سمجھ میں آتا ہو اُس کو اصل قرار دے کر دلائل عقلیہ کو اُس پر منطبق کرنا چاہیے اگر کھینچ کھینچا کر بھی مطابق آ جاوے تو فبہا ورنہ کالائے زبون بریش خاوندیہ اُن کی عقل کا قصور سمجھا جاوے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ اپنے توہمات و معقولات کو اصل سمجھ کر

---

[1] امراؤالقیس عرب کا مشہور فصیح و بلیغ شاعر اسلام سے چالیس سال پہلے گزرا ہے اور لبید بھی جاہلیت کا مشہور شاعر ہے جس کی نسبت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اُس کا یہ قول نہایت ہی سچا ہے: ع

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

(یعنی خوب سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کے سوا تمام چیزیں باطل ہیں) ۱۲

کلامِ الٰہی اور احادیثِ صحیحہ کو ترک کیا جاوے یا ان کو کھینچ تان کر اپنی عقل کا تابع بنایا جاوے۔

اگر آج کوئی جنگلی، دیہاتی، وحشی، بے عقل، بے خبر ریل اور تار وغیرہ صنائع عجیبہ کے افسانے سُن کر ان کو دُور از عقل بتانے اور ان کی تغلیط پر زور دے تو کیا اُس کا یہ انکار اہلِ عقل کے نزدیک قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے یا اس کا قصورِ عقل سمجھا جاوے گا۔

انصاف کیجئے تو خداوندِ عالم کے علم کے سامنے تمام حکماء و عقلاء کی عقل و فہم کی حقیقت اُس وحشی بیوقوف کی عقل کے برابر بھی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

پھر اس کے کلام کے مقابلہ میں ایسی جرأت معلوم نہیں کس چیز کا نشہ ہے ؎

آنانکہ ز روئے تو بجائے نگرانند
کوتہ نظرانند چہ کوتہ نظرانند

اس تمام خامہ فرسائی سے ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ وحی الٰہی کے واجب التسلیم ہونے پر ہر چند کہ تمام اہلِ ادیان متفق ہیں اور اس وجہ سے تمام اہلِ عالم پر قرآن و حدیث کا ماننا ضروری اور اُن کے احکام کا اتباع واجب ہے مگر مخالفین تو اس کے کلامِ الٰہی اور احکامِ خداوندی ہونے کے منکر ہو کر بے فکر ہو گئے۔

حالانکہ اُن کا یہ انکار محض ہٹ دھرمی ہے۔ چنانچہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے آیات قرآنی اور روایات حدیث سے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ جو وحی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ ہر پہلو سے قابلِ اطمینان اور واجب الاتباع ہے کسی طرح سے اُس میں تردد اور انکار کی گنجایش نہیں۔ اس سے قبل کسی قدر تفصیل سے اس کو عرض کر دیا گیا ہے جس طریقہ سے حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت کسی کو مسلّم ہے اُسی طریقہ سے آپ کی رسالت کی تصدیق کرنی پڑے گی۔ پھر کوئی یہودی یا نصرانی یا کسی ملت کا تابع یا کسی رسول کا اُمتی اُس کا انکار کیونکر کر سکتا ہے اور اُس کا انکار بروئے انصاف کیونکر مسموع اور مقبول ہو سکتا ہے۔

اور سوائے اہلِ حق اور اہلِ سنّت کے جتنے فرقے مدعیانِ اسلام ہیں ان سب نے یہ کیا کہ خیالات و اغراض مذکورۂ بالا کی وجہ سے تاویل و تحریف انکار و تغلیط طرح طرح کے حیلوں سے کام لیا اور احکام وحی کو بزورِ عقل جس سانچے میں چاہا ڈھال لیا جس کی وجہ سے وہ قصرِ دین کہ جس کی تکمیل تمام آپ کے مبارک ہاتھوں سے ہو چکی تھی اور جس کی حفاظت ہم پر فرض تھی آج اُس کی چاردیواری اور اُس کے دروازے کا پتا لگانا ہر ایک کا کام نہیں۔

اور وہ شاہراہ شریعت جس کی بابت ملّتِ بیضا اور جس کی توصیف میں لیلہا و نہارہا سواء ارشاد ہو چکا تھا اس میں سے چاروں طرف قدم قدم پر اتنی سڑکیں نکالی گئیں کہ اُس شریعت بیضا کی برابر تمام عالم میں کوئی بھول بھلیاں نظر نہ آئیں گی ؎

گوئیا باور نمیدارند روز داورے
کایں ہمہ قلب و دغل در کار داور میکنند

جب دوستوں کی طرف سے یہ حُسنِ سلوک ہے تو پھر دُوسروں کی شکایت کیا۔

لیکن اہلِ فہم پر روشن ہو چکا ہے کہ اس تمام اختلال و خرابی کی جڑ اور ان تمام مفاسد کا تخم وہی خودرائی ہے جس نے ادیان سابقہ کو اپنے دست بُرد سے تہ و بالا کر کے صفحۂ ہستی سے اُن کا نام و نشان مٹا چھوڑا۔

یہی وجہ ہے کہ اِس خانہ برانداز خودرائی کو کلام الٰہی اور احادیث اور اقوال علماؑ و اولیاؑ میں نہایت شد و مد سے روکا گیا ہے۔

کلامِ الٰہی میں ارشاد ہے:

اِنِ[1] الحکم الاّ للّٰہ۔

دوسرے موقع پر اللہ اکبر خاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے:

و[2] لو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین فما منکم من احد عنہ حاجزین۔

اور موقع پر حضرات صحابہ کو خطاب ہے:

و[3] اعلموا ان فیکم رسول اللّٰہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم۔

اور لیجئے جملہ اہلِ ایمان کی نسبت حکم ہے:

فلا[4] و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما۔

دُوسری جگہ دھمکایا جاتا ہے:

یٰۤا[5] یہا الذین اٰمنوا لا تقدموا بین یدی اللّٰہ و رسولہ و اتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ سمیع علیم۔

---

[1] خدا تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم معتبر نہیں ۱۲

[2] اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف سے کچھ باتیں گھڑ کر بیان کرتے تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ کر گردن اُڑا دیتے اور تم میں سے کوئی ان کو بچا نہ سکتا۔

[3] اے مسلمانو! خوب سمجھ لو کہ تم لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اگر وہ اکثر باتوں میں تمہاری اطاعت کرتے رہتے تو تم لوگ مشقت میں پڑ جاتے ۱۲

[4] یعنی خدا کی قسم ہے کہ وہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے جھگڑے میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور آپ کے فیصلہ سے دل میں ذرا بھی دلتنگی نہ لاویں اور پوری طرح تسلیم نہ کر لیں ۱۲

[5] یعنی اے ایمان والو! خدا اور رسول سے پیش قدمی نہ کرو اور خدا سے ڈرتے رہو وہ تمہارے سب اقوال کو سنتا ہے اور تمہاری سب باتوں کو جانتا ہے ۱۲

ان آیات واضحہ کو تدبر و انصاف سے ملاحظہ فرما لیجئے کہ صاف یہ حکم ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو منصب حکم نہیں اُس کے سوا حقیقت میں کوئی حاکم نہیں اور خود فخر الانبیا علیہ السلام کو بھی یہ اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے حکم دے سکیں اور اللہ کے ذمہ اپنی طرف سے کوئی بات لگاویں اوروں کی تو حقیقت کیا ہے۔

افضل و اعلم اُمت یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو ارشاد ہے کہ تم میں رسول اللہ موجود ہیں اُن سے اپنی رائے کی متابعت کی کوئی توقع نہ رکھیے بالفرض ایسا ہو تو تم ہلاک ہو جاؤ۔

تم مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ جب تک ارشادات و احکام رسول کو خوشدلی اور اطمینان سے تسلیم نہ کرو گے ایمان نصیب نہ ہوگا اور تم کو یہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول کے حکم معلوم ہونے سے پہلے ہی اپنی رائے سے حکم لگانے بیٹھ جاؤ۔

اس کے سوا آیات و احادیث و اقوال اکابر اس بارہ میں اس کثرت سے ہیں کہ ہم کو تو سب کا جمع کرنا بھی محال نظر آتا ہے اور نہ اُس کے جمع کرنے کی حاجت۔

جب یہ امر محقق و مسلم ہے کہ احکام الٰہی ہر امر میں واجب التعمیل ہیں تو اوّل کلام الٰہی سے اسی بات کو طے کر لینا چاہئے کہ دُوسروں کو بالخصوص ہم جیسوں کو اُن احکام میں رائے زنی اور خود رائی کی کہاں تک اجازت ہے۔

اور احکام مذکورہ میں کسی حد تک کسی کو اگر رائے زنی کا منصب بھی ہو تو اس کے لیے کسی نصاب کسی سند کسی لیاقت کی ضرورت ہے یا صرف اپنی خوشی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے اُس مجلس شوریٰ کا رکن بن جائے اور خدا اور رسول کو مشورہ دینے کو تیار ہو جائے۔

حتیٰ کہ وُہ لوگ جو اپنی معمولی جزئیات میں دُوسروں کی رائے کے محتاج ہیں وُہ بھی احکام خداوندی کی ترمیم و اصلاح کرنے کو بلکہ احکام قطعیہ منصوصہ کو نظر بر مصالح و اسباب اس زمانہ میں واجب الترک کہنے کو نہایت استقلال اور اطمینان کے ساتھ کمر بستہ ہو جاویں۔

اگر یہ دریافت کیا جاوے گا کہ حکم خداوندی کے مقابلہ میں اوّل کس نے خود رائی کر کے خطاب رجیم اڑایا تو اُس کا جواب شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ ہر کوئی اس کا جواب جانتا ہے خواہ اُس خود رائی کے وجود کو بھی مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔

اگر ہم خدا کے قائل ہیں اور وُہ حاکم بلکہ احکم الحاکمین اور ہم محکوم محض ہیں اگر ہمارا وجود و عدم اور جملہ منافع اور مضار اُس کے قبضہ میں ہیں اگر اس کا کوئی خاص سفیر اور رسول ہم کو اس کے قوانین و احکام بغرض تعلیم پہنچا چکا ہے بلکہ کر کے دکھلا گیا ہے اگر ہم کو اس کے ساتھ کسی تعلق کے قائم رکھنے کی حاجت ہے۔ اگر ہم سے کسی وقت ہمارے خیالات اور معاملات کی باز پرس فرمانے کا اُس کو استحقاق حاصل ہے تو پھر بروئے انصاف ہم کو کیا کرنا چاہیے اور ہمارے موجودہ اقوال و افعال کہاں تک ان امور کے موافق یا مخالف ہیں۔

اور اس پُر اختلاف وقت میں ہم کو منجملہ فرقہائے مذکورہ بالا کس فریق کا اتباع اور کس جماعت میں داخل ہونا چاہیے

یا سب سے یکسو ہو کر اپنا آئین و دین مقرر کرنا چاہیے۔

جس کے دل میں کچھ خیر اور دماغ میں کچھ عقل اور عقل میں کچھ انصاف ہو گا وہ تو واللہ یہی کہے گا کہ بندہ کو خدا اور اس کے رسول کے سامنے کالمیت فی ید الغسال[1] ہونا ضروری ہے۔

ہاں جن کو اپنی عقل و کمالات پر ناز اور اپنے نفس کی تابعداری ضروری ہے وہ بے شک اپنے آپ کو مثلِ جمادات سمجھ لینا ہرگز گوارا نہ کریں گے۔

لیکن وہ تعلق قوی جو خالق و معبود اور اس کی مخلوق و عبد میں محقق ہے اور وہ ربط مستحکم جو علت تامہ اور اس کے معلول تام میں ثابت ہے اُس پر جس کی نظر ہوگی اُس کو تو اپنے کسی کمال کا خیال اس موقع میں ہرگز ہرگز سدِّ راہ نہیں ہو سکتا مگر ہم اس نزاع کو فضول سمجھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ اچھا صاحب یہ نہ سہی مگر اُس کو حاکم مطلق اور اپنے آپ کو اس کا محکوم محض سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں اور جو کوئی حاکم ہو گا وہ تو ظاہری اور عارضی ہو گا اور اُس کی حکومت بھی محدود ہو گی حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین اس کی حکومت اصلی اور حقیقی اور غیر محدود۔

تو اب کسی کو اس کی گنجائش ہے کہ اُس کے احکام کا خلاف کر سکے یا اپنی رائے سے دُوسرا قانون اُس کے قانون کے خلاف مقرر کرکے یا اُس کے قانون مقررہ کو اُس کے خلاف منشا اپنی طرف سے متغیر و محرف کر کے اُس کی ہی مملکت میں پھیلا کر اس کی رعایا کو باغی بنانے لگے۔

اور کوئی ایسا کرے تو بروئے انصاف وہ کس خطاب کے لایق اور کس سزا کا مستحق ہے واللہ الہادی وھو الموفق۔

کیا اچھا ہو جو ہم راستبازی کے ساتھ وحی کی متابعت کریں اور اپنے توہمات و خیالات کو اُس میں دخل نہ دیں اور عقاید و اقوال میں تو اُس کے پُورے مقید رہیں ایک اعمال ہی میں نقصان رہے تو رہے باقی اپنی رائے زنی اور آزاد خیالی کے لیے بہت میدان وسیع آنکھوں کے سامنے ہے اور اس میں جولانی سے کون روکتا ہے ؎

قدم بڑھاؤ ترقی کرو ضرور و لے
رسول کے رہے قدموں پہ سر خدا کیلئے

اپنی پریشانی تقریر سے معذرت کے بعد دو امر قابلِ عرض ہیں، ایک تو یہ کہ ہم نے جو کچھ وحی الٰہی کے متعلق عرض کیا اُس کے باعث دو امر ہیں اوّل یہ کہ اسلامی عقاید، اعمال، اخلاق، اوضاع، عبادات، معاملات، سب کا منشأ اور سب کے لیے قانون صرف وحی الٰہی ہے جملہ امور میں اُس کی متابعت اور اُس کی مخالفت سے اجتناب ضروری ہے حتیٰ کہ توحید جو اصل الاعمال اور راس الطاعات ہے اُس کا بھی وحیِ الٰہی کے مطابق ہونا ضروری ہے جو توحید ارشادِ وحی کے خلاف ہے وہ وسوسہ نفسانی سے زیادہ اعتبار نہیں رکھتی۔

---

[1] جیسے غسل دینے والے کے ہاتھ میں مُردہ ۱۲



مسجد قبا کا بیرونی منظر

دیکھیے فلاسفہ، معتزلہ، یہود، نصاریٰ سب ہی موحد ہونے کے مدعی ہیں مگر بذریعہ وحیِ الٰہی جو توحید ہم کو بتلائی گئی چونکہ ان فرقوں کی توحید اس کے خلاف ہے اس لیے ہم نے توحید بیان فرمودہ وحی قبول کر کے اُن سب کی توحید کو غلط اور باطل سمجھا۔

پچھلے دو فرقوں نے تو اتنا توسیع کیا کہ شرک کو توحید کے ساتھ جمع کر دیا جو صریح کفر ہے اور اول دو فرقوں نے توحید میں اتنی تنگی کی کہ کمالات خداوندی اور اس کی صفات ذاتیہ کا بھی انکار کر بیٹھے ہم نے وحی کے مقابلہ میں کسی کی نہ مانی اور افراط و تفریط مذکورہ چھوڑ کر توحید فرمودہ وحی کو اپنا ایمان بنایا۔

جب ایمان و توحید جس کو اصل الاصول کہنا چاہیے اُس کا مدار وحی پر ہے تو اور اعمال و فروعات کا تابع وحی ہونا تو بدیہی ہے اس کے سوا اسلام کی مخالفت اور مذاہب اسلامیہ کی کثرت جو وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے اُس کا بڑا منشا یہی ہے کہ پابندی احکام وحی میں طرح طرح سے خلل اندازی اور تساہل سے کام لیا جاتا ہے اس جڑ کے درست ہو جانے سے بہت سے اختلافات تو خود بخود ان شاء اللہ ایسے ختم ہو جائیں گے کہ مشعل لے کر بھی نظر نہ آویں گے اور یہی وجہ ہے جو حضرت امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب میں ایمان سے بھی مقدم وحی کا باب منعقد فرمایا۔

دُوسرے اس کا التزام کیا گیا ہے کہ ان شاء اللہ حتی المقدور ہر کلی جزوی امر میں مطابقت احکام شرعیہ یعنی وحی الٰہی کی متابعت کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

ان دُو ضرورتوں سے مناسب معلوم ہوا کہ اوّل وحی الٰہی کے متعلق بطور تنبیہ عرض کر دیا جائے بلکہ علم وحی کے علاوہ جو دیگر فنون، فصاحت، بلاغت، تاریخ، کلام وغیرہ کے متعلق مضمون شائع ہوں گے اُن میں بھی اُس فن کے ائمہ اور محققین کے حُسنِ اتباع اور اُن کی عظمت کو ملحوظ رکھ کر تحقیق سے کام لیا جاوے گا ان شاء اللہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ بلا وجہ وجیہ اور بلا تحقیق کسی فن کے ائمہ اور محققین کو ملعون بنا کر اپنی سُرخروئی اور کمال علمی کو دُوسروں کی نظر میں موجہ اور مدلل کرنے کی طمع کی جاوے۔

دُوسری بات قابلِ عرض یہ ہے کہ حاشا و کلا جو ہم کو اس تحریر سے کسی پر طعن یا کسی کی توہین مدِنظر ہو محض اہلِ اسلام کہ جن میں یہ ننگ اسلام بھی شمار ہوتا ہے اُن کی اصلاح و تنبیہ کی غرض سے اس عرض کی نوبت آئی۔

ہم اپنی سادہ معمولی تحریر کی حقیقت اور ابنائے زمانہ کے مذاق کی کیفیت سے کچھ واقف ضرور ہیں اثنائے تحریر میں بار بار خیال آتا تھا ؎

کس زبانِ مرا نمی فہمد
بعزیزاں چہ التماس کنم

مگر شفیق خیر اندیش کو مریض کی رغبت اور لذت کا اتنا خیال نہ ہونا چاہیے جس قدر اس کی صحت و راحت کا اور مریض انجام بین کو بھی اُبالی کھچڑی کی وہ قدر و منزلت کرنی چاہیے جو بریانی اور تنجن کی بھی نہ ہو صرف اسی قسم کے خیالات اس غرض کے باعث ہوئے۔

؎ گو نالہ نارسا نہ ہو آہ میں اثر   میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

وما توفیقی الّا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(۲)

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ

پہلے یہ مضمون توضیح اور تفصیل کے ساتھ معروض ہو چکا ہے کہ عقاید و اعمال عبادات و معاملات اخلاق و اوضاع کی برائی بھلائی صحت و سقم کا دار و مدار وحی الٰہی ہے بدون اتباع وحی ایمان اور دیگر اعمال حسنہ حقہ کا میسر آنا ایسا ہے جیسے بدون قوت باصرہ دیکھنے کی اور بغیر قوت سامعہ کوئی سننے کی توقع رکھے۔ اب یہ عنوان جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یعنی لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ جو بعینہٖ ارشادِ رسولؐ یعنی وحی الٰہی ہے اس کو دیکھ کر شاید یہ خدشہ ہو کہ وحیِ الٰہی پر تو ایمان کا موقوف ہونا سمجھ میں آتا تھا لیکن امانت پر ایمان کا موقوف ہونا اور امانت کے موجود اور معدوم ہونے پر ایمان کے وجود اور عدم کا متفرع ہونا کیسے قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے اس لیے اوّل تو یہ عرض ہے کہ تمام اہلِ عقل بالبداہتہ جانتے ہیں کہ ہر چیز اپنے وجود میں جیسے علۃ فاعلہ کی محتاج ہے ایسے ہی علۃ قابلہ کی دست نگر ہے دیکھیے وجودِ زراعت جیسے تخم ریزی پر موقوف ہے ایسے ہی زمین کی جو قابل زراعت ہو محتاج ہے ورنہ پتھر لوہے آگ پانی وغیرہ سب پر زراعت کر لیا کرتے تعلیم میں جیسی فاعل یعنی معلّم کی ضرورت ہے ایسی ہی جس کو تعلیم دی جائے اس کا قابل العمل ہونا لابدی ہے ورنہ جمادات و نباتات و جملہ حیوانات کو بھی مثل انسان تعلیم دینا ممکن ہوتا۔ جب یہ مضمون دلنشین ہو گیا کہ ہر امر ممکن کا موجود ہونا جیسا کہ وجود فاعل اور مؤثر پر موقوف اور اس کا محتاج ہے ایسا ہی اس امر کو اپنے تحقق میں قابل اور متاثر کی بھی احتیاج ہے اور جب تک یہ دونوں موقوف علیہ یعنی فاعل اور قابل متحقق نہ ہوں گے اُس وقت تک کوئی امر ممکن الوجود موجود نہ ہو سکے گا تو اب یہ سمجھ لینا بھی کوئی دشوار نہیں کہ ایک چیز کے لیے اگرچہ قابل ہوں تو اُن میں باہم فرق مدارج قابلیت بھی ہوا کرتا ہے دیکھ لیجئے تمام قطعات زمین قابلیت زراعت ہیں اور تمام افراد انسانی قابل العلم ہونے میں ہرگز ہرگز یکساں نہیں بلکہ از حد مختلف ہیں۔ اب اس کے بعد یہ التماس ہے کہ اگر ایمان کے لیے وحیِ الٰہی کو بمنزلہ علۃ فاعلہ مانا جائے اور امانت کو اس کے لیے بمنزلہ علۃ قابلہ کہا جائے تو اُس کا واجب التسلیم ہونا ایسا ہی بدیہی ہو گا جیسا کہ زراعت کے لیے تخم ریزی کو علۃ فاعلہ اور زمین کو علۃ قابلہ کہنا یا تعلیم کے لیے معلّم کو علۃ فاعلہ اور فہم متعلّم کو علۃ قابلہ کہنا بدیہی امر تھا اس کے بعد عاقل منصف اگر کہہ سکتا ہے تو صرف اسی قدر کہہ سکتا ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ ایمان کے لیے بھی علۃ فاعلہ اور علۃ قابلہ دونوں کا ہونا ضروری امر ہے۔ اور ایمان کے لیے وحیِ الٰہی کا بمنزلہ علۃ فاعلہ ہونا بھی درست ہے جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے لیکن امانت کو ایمان کے لیے علۃ قابلہ کہنا اس کی وجہ کوئی معلوم نہیں ہوتی تو صرف اتنے خدشہ کا ازالہ بہت آسان ہے۔ امانت کے معنیٰ اور مراد سمجھ لینے کے بعد ان شاء اللہ یہ خلجان پیش ہی نہ آئے گا بلکہ امانت کا ایمان کے لیے علۃ قابلہ اور موقوف علیہ ہونا ضروری التسلیم سمجھا جائے گا جو حدیث مذکورۂ بالا کا عین مطلب ہے۔

سو سُنیے کہ لغت عربی میں امانت ضد خیانت کا نام ہے اور خیانت اس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص کو کسی امر میں کسی وجہ سے ہم تو قابلِ اطمینان سمجھیں اور اس سے خیر خواہی اور راستبازی کی توقع کریں مگر وہ ہم سے بدخواہی اور دھوکہ بازی اور بدعہدی

اور بد معاملگی کر جائے کچھ مال کی ہی تخصیص نہیں مال ہو خواہ عہد و پیمان ہو خواہ کوئی معاملہ یا راز یا کوئی مشورہ وغیرہ ہو جب خلاف اطمینان و توقع کسی بات میں بدخواہی اور بد معاملگی کی جا دے گی وہی خیانت ہو گی تو اب بالضرور امانت کے یہ معنی ہوں گے کہ فعل یا قول یا عہد و پیمان یا روپیہ پیسہ وغیرہ میں کوئی امر خلاف خیر خواہی اور راستبازی نہ ہو جو کچھ ہو عین سلوک عین ایمانداری اور حق پسندی کے ساتھ ہو۔ جب امانت کے معنیٰ معلوم ہو گئے تو اب سنیے کلام اللہ میں مذکور ہے کہ جب حق تعالیٰ نے مضمون امانت کو مخلوقات میں سے کسی کے ذمہ لگانے کی تجویز ظاہر فرمائی تو آسمان و زمین و پہاڑ سب اس بارِ گراں کے تحمل سے گھبرا گئے اور کانوں پر ہاتھ دھر گئے مگر انسان گھڑی کے پورے مت کے ہیٹے نے اپنے سر لے لیا جس کا نتیجہ اہل ایمان کے لیے نہایت مفید اور دوسروں کے حق میں نہایت مضر ہونے والا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے وہ آیہ کریمہ یہ ہے :

انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولاً لیعذب اللہ المنٰفقین والمنٰفقٰت والمشرکین والمشرکات ویتوب اللہ علی المؤمنین والمومنات وکان اللہ غفوراً رحیماً۔

اہل علم واقف ہیں کہ لیعذب میں جو لام ہے یہ لام تعلیلیہ ہے اور لام عاقبۃ کہلاتا ہے۔ یعنی انسان کے حق میں تحمل بار امانت کا انجام اور نتیجہ یہ ہُوا کہ اہل ایمان کو مستحق تنعیم اور دوسرے لوگ مستوجب تعذیب ہو گئے جیسے ضربتہ تادیباً میں تادیب کو غرض کی علۃ غائی اور اُس کا نتیجہ کہا جاتا ہے اور یہی لعینہٖ انسان کے مکلف ہونے کا مطلب ہے سب جانتے ہیں کہ انسان کے مکلف ہونے کا ماحصل صرف یہی تو ہے کہ احکامِ خداوندی بجالانے میں مستحق ثواب اور خلاف کرنے میں موردِ عقاب ہو گا۔ تو جب تحمل بارامانت انسان کے حق میں موجب تعذیب و تنعیم ہُوا تو صاف معلوم ہو گیا کہ مدار تکلیف اور اس کا منشأ صرف امانت ہے جس میں صفت امانت اور ملکہ امانت محقق ہو گا وہی تعمیل احکام خداوندی کا مکلف ہو گا اور جس میں یہ ملکہ اور استعداد نہ ہو گی وہ بیشک غیر مکلف ہو گا۔

حضرت امام غزالی اور قاضی بیضاوی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ امانت سے یہی مراد ہے کہ تکلیفِ احکامِ خداوندی کو اپنے ذمّے لے لینا اور اپنے آپ کو طاعت کی صورت میں مستحق ثواب اور در صورتِ معصیت مستحقِ عذاب تسلیم کر لینا۔

اس تقریر سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ جیسا دیکھنا بصارت پر اور سننا سماعت پر موقوف ہے اسی طرح انسان کا ایمان اور جملہ احکام متعلقہ ایمان کا مکلف ہونا صفت امانت پر متفرع ہے اور صفت امانت ان جملہ تکلیفات شرعیہ کے لیے منشأ اور موقوف علیہ ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ امانت ایمان کے لیے موقوف علیہ اور ضروری ہے بدون تحقق امانت تحقق ایمان ممکن نہیں اگر ممکن ہو تو پھر امانت کا ایمان کے لیے موقوف علیہ ہونا بھی غلط ہو جائے گا اور جمادات و حیوانات کو بھی مثل انسان مکلف احکام شرعیہ کہنا پڑے گا کہ کچھ فرق ہی نہ رہے گا وہو باطل"۔

اگر توضیح و تفصیل مطلوب ہے تو سُنیے حسب ارشادات نقلیہ و دلائل عقلیہ و محسوسات بدیہیہ جن کی تفصیل میں تطویل ہے

جاننے والوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ مخلوقات عالم میں انسان سب سے اشرف اور افضل ہے خصوصاً جمادات و نباتات و حیوانات وغیرہ اشیائے معلوم محسوسہ پر تو اُس کی افضلیت اسی طرح روشن ہے جیسے خوبصورتوں کا بدصورتوں پر صورت میں افضل ہونا اور خوش فہموں کا بدفہموں سے افضل ہونا ظاہر و باہر ہے اور اسی وجہ سے منصب خلافت احکم الحاکمین بھی اسی نے اڑایا اور بار امانت جس کے اٹھانے سے آسمان زمین پہاڑ سب عاجز ہو گئے وہ بھی اسی ظلوم جہول کو اٹھانا پڑا، حافظ شیرازؒ اسی مضمون کی طرف اشارہ فرماتے ہیں : ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اب جیسا انسان کا اشرف المخلوقات اور افضل الموجودات کہنا عقلاً اور نقلاً ضروری ہے۔ ایسا ہی دو امر اور بھی ضروری الشلیم مجمع علیہ عقلا ہیں :

اوّل یہ کہ خداوند عالم علیم وحکیم نے اپنی مخلوقات میں جس کو جیسا بنایا اور جو مرتبہ ادنیٰ یا اعلیٰ اس کو عنایت فرمایا وہ سراسر حکمت کے مطابق ہے اور ایسا ہی ہونا مناسب تھا اگر کسی موقع خاص میں کسی کو کوئی خلجان پیش آدے یا حکمت کے خلاف نظر آئے تو یہ بالیقین اس کے فہم کا قصور ہوگا حکم خداوندی کے مطابق حکمت ہونے میں اس سے اصلا اشتباہ نہو سکے گا۔ جب ملائکہ مقربین کے اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك ونقدس لك عرض کرنے کا قال انی اعلم مالا تعلمون جواب کافی ہوگیا جس پر ملائکۃ الرحمٰن کو بھی بجز سکوت کوئی گنجایش باقی نہیں رہی اور بالآخر سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحکیم ۝ عرض کر کے اپنے قصور سے معترف ہوئے تو آج وہ کون ہے کہ اُس کے قوی سے قوی خدشہ اور اعتراض کے مقابلہ میں ہم اس کو یہی جواب دیں اور کافی نہ سمجھا جاوے۔ پہلے ہم صاف عرض کر چکے ہیں کہ تمام حکمأ و عقلأ بلکہ جملہ عالم کے عقل وعلم کی حق تعالیٰ کے علم کے سامنے ہرگز ہرگز اتنی بھی وقعت نہیں ہو سکتی جیسے جملہ حکماء کی عقل کے سامنے کسی جاہل گنوار کی عقل کی حقیقت۔

دُوسرے یہ کہ مثل دیگر صفات کمالیہ حق تعالیٰ کی رحمت بھی غیر متناہی اور تمام مخلوقات کو حاوی ہے وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ خود اس کا ارشاد صریح موجود ہے۔

دُوسرے موقع پر کلامِ الٰہی میں مذکور ہے :

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔

یعنی خالق عالم خبیر وحکیم رحیم وکریم نے جملہ مخلوقات کو اُن کے مناسب شان و مطابق حال اوّل تو صورت و شکل و دیگر اوصاف و قویٰ عنایت فرمائے اُس کے بعد ہر ایک مخلوق کو ان اوصاف و قویٰ سے جو کہ خالق حکیم نے ان میں ودیعت رکھ دیے تھے کام لینے اور نفع اٹھانے کے طریقے سمجھا دیے (فسبحانہ جل جلالہٗ ما اعم رحمتہ و نوالہ) وما احسن ما قال العارف ؎

جلوہ کرد رخش روزِ ازل زیرِ نقاب ‏ ‏ ‏ ‏ عکسے از پرتوِ آں بر رخِ افہام افتاد

اینہمہ عکسِ مے و نقشِ مخالف کہ نمود — یک فروغِ رُخِ ساقیست کہ در جام افتاد
پاک بیں از نظرِ پاک بمقصود رسید — احول از چشمِ دوبیں در طمعِ خام افتاد

جب حکمت و رحمتِ الٰہی دونوں کا عموم و شمول بہ نسبت جملہ مخلوقات معلوم ہو چکا تو ہر ایک سلیم الطبع خود معلوم کرلے گا کہ انسان جس کا کہ اشرف المخلوقات ہونا مسلّم ہو چکا ہے اس کے برابر نہ کوئی مظہرِ حکمت ہو سکتا ہے نہ مظہرِ رحمت، اور یہ بات یُوں بھی تو ظاہر اور بدیہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بادشاہِ وقت کو کوئی مہم یا بھاری کام پیش آتا ہے مثلاً کسی ولایت کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے یا کسی ملک کو کسی مخالف سرکش کی دست بُرد سے بچانا چاہتا ہے یا اہلِ ظلم و اہلِ فساد و اہلِ بغاوت کے اثر سے ملک کو پاک کرنا اور پاک رکھنا مطلوب ہے اور اس مہم عظیم کا کام لینا اپنے خلیفہ اور نائب سے مقتضائے مصلحت ہوتا ہے تو اوّل تو بادشاہ بیدار مغز اپنے مقربین اور خواص میں سے اُس کو اس مہم کی انجام دہی کے لیے منتخب اور مقرر کرتا ہے جو ہر طرح سے لایق اور قابلِ اطمینان اور جماعت مقربین میں سب پر افضل و ممتاز سمجھا جائے۔ دُوسرے اس مہم عظیم کی انجام دہی کے لیے جس قدر لشکر اور سامان اور نقد و جنس وغیرہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے بے تامل خزائن شاہی سے وہ چیزیں امیر مذکور کو عطا فرمائی جاتی ہیں اور جملہ لشکر اور تمام انتظامات پر اُس کو اختیارات کُلی دے کر اور سب کو اُس کا محکوم اور ماتحت بنا کر بعد عطائے سند و خطاب مہم عظیم کی انجام دہی کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

جب خالق علیم حاکم علی الاطلاق نے حضرت آدم کو اپنا خلیفہ اور نائب مقرر فرما کر عالمِ دنیا کی اصلاح اور درستی کے لیے اور اُس میں احکام و قوانین احکم الحاکمین اور سلسلۂ ہدایت جاری کرنے اور پھیلانے کے لیے اس عالم میں بھیجا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس خلیفہ خاص کے حق میں ہر دو امر مذکورۂ بالا کی رعایت نہ کی گئی ہو۔

سلطانِ وقت بوجہ اقتدارِ کلی گو اپنے ماتحتوں اور غلاموں میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کو بھی منصبِ نیابت دے سکتا ہے مگر اپنی عقل اور بیدار مغزی کی وجہ سے ہرگز کسی نالائق اور ناقابل کو یہ اعلیٰ منصب عطا نہ کرے گا۔

اسی طرح پر خالق قدیر اپنی قدرت سے جس کو چاہے منصب خلافت عطا کر سکتا ہے کون دم مار سکتا ہے مگر چونکہ جیسی اُس کی قدرت غیر متناہی ہے ایسی ہی اس کی حکمت بھی بے حد و بے پایاں ہے اس لیے ضروری ہے کہ جس کو اس نے تمام عالم پر اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر ایک امرِ عظیم کی انجام دہی کے لیے مقرر فرمایا اُس میں اوّل تو امتیاز و افضلیت اور ہر طرح کی لیاقت کی رعایت کُلی کی گئی ہے۔ دوسری کار خلافت میں جن کمالوں اور سامانوں کی حاجت تھی وہ تمام مہما اس خلیفہ خاص کو ضرور خدا کے غیر متناہی خزانہ سے حسبِ حاجت عطا فرمائی گئی ہیں جس کی تفصیل کی اس موقع پر حاجت نہیں معلوم ہوتی صرف ارشاد خلق اللّٰہ اٰدم علٰی صُوْرَتِہٖ اللہ اکبر ایک اتنی بڑی بات ہے جو اہلِ علم کے سمجھنے کے لیے قدر کفایت سے بھی بدرجہا زاید ہے۔

جب یہ بات خُوب دلنشیں ہو چکی تو اب سُنیے کہ جس قدر کمالات خلیفہ موصوف کو عنایت فرمائے گئے ان سب میں اول و افضل و ضروری کمال علمی ہے اور سب کمالات اس کے بعد ہیں حق سبحانہٗ تعالیٰ کی جملہ صفات کمالیہ جن کو مخلوقات سے کوئی تعلق ہے جیسے قدرۃ۔ ارادہ۔ کلام وغیرہ ان میں بھی سب سے اقدم اور افضل صفۃ علم ہی شمار ہوتی ہے ادھر دیکھیے کہ جب ملائکہ علیہم الصلوٰۃ

والتسلیم کو حضرت آدم کی خلافت میں خلجان پیش آیا جس کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے تو حضرت آدم اور ملائکہ علیہم السلام کا امتحان علم ہی میں تو لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرات ملائکہ علیہم السلام پر کمال علمی میں ایسے فائق رہے کہ ملائکہ بھی ان کی افضلیت اور مستحق خلافت ہونے کے معترف ہو گئے آیہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا سے لے کر تین چار آیتیں پڑھ جائیے۔ یہ مضمون بوضاحت مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ علم افضل الصفات ہے اور مدار خلافت الٰہی اس پر ہے اور حضرت آدم اس کمال میں سب سے فائق اور ممتاز ہیں۔ علاوہ ازیں عالم سے جاہل تک سب کو معلوم ہے کہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک ہمارا کوئی فعل اختیاری بدون علم ہم سے صادر نہیں ہوتا ہر فعل اختیاری کرنے کے لیے ضرور ہے کہ پہلے اس کا علم حاصل ہو تو پھر فعل مذکور کی نوبت آوے تو اب انصاف فرمائیے کہ خلافت خداوندی جیسی عظیم الشان خدمت بدون کمال علمی کیونکر انجام پذیر ہو سکتی ہے۔

الحاصل خلیفہ مذکور کے لیے علم اور علم کا بھی کامل ہونا ضروری ہے بدون اس کمال کے کہ جس کو اصل الکمالات کہنا چاہیے کار خلافت پورا تو کیا ادھورا بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر ظاہر ہے کہ صرف کمال علمی سے خدمتِ خلافت کیونکر انجام پذیر ہو سکتی ہے۔ علم کے ساتھ ایسی قدرت و قوت کی بھی ضرورت ہے جس کے ذریعہ سے امور ضروریہ متعلقہ خلافت کی خود بھی تعمیل کر سکے اور دوسروں سے بھی تعمیل کرا سکے۔ بدون ان دونوں کمالوں کے کارِ خلافت انجام دینا ممکن نہیں۔

دیکھیے اگر علم ہی نہ ہو تو پھر کرنا تو درکنار کرنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اگر صرف علم ہو اور قدرت نہ ہو تو ہر چند عمل کا ارادہ تو کر سکتا ہے مگر عمل کیونکر کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ قوتِ علمیہ اور قوتِ عملیہ کے بدون کار خلافت کی انجام دہی ممکن نہیں۔ اس لیے بمقتضائے رحمت و حکمت اور حسب ارشاد اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ اور نیز بباعث اشرفیت و افضلیت انسان ضرور ہوا کہ انسان ضعیف البنیان کو کمال علمی میں سب سے فائق و برتر بنا کر اس قدر قدرت عطا فرمائی جائے کہ کار خلافت کو بسہولت انجام دے سکے اور سلسلۂ ہدایت کو عالم میں پھیلا سکے اور انتظامِ عالم کو پورا کر سکے جو کہ اس کی آفرینش سے مقصود ہے۔

اب ان ہر دو کمال کے بعد بظاہر کار خلافت کی انجام دہی میں کوئی حالت منتظرہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ علم سمجھنے کے لیے اور قدرت عمل کے لیے کافی ہیں اور واقع میں بھی یہی بات ہے۔

مگر غور سے کام لیجئے تو علم و قدرت کے بیچ میں ایک چیز کہ جس کو اقتضائے نفس و فطرت یا رغبت و نفرت طبعی سے تعبیر کیجئے ایسی حائل و حاجب ہے کہ باوجود علم یقینی قدرت کو بسا اوقات علم کے موافق کام کرنے سے روک دیتی ہے بلکہ یہی اقتضائے نفسانی علم یقینی کے بالکل خلاف قدرت سے کام لے لیتا ہے۔

چور، رہزن، باغی، قاتل وغیرہ جملہ بدمعاشوں کو دیکھ لیجئے کہ بسا اوقات اُن کو اس بات کا علم اور ظن غالب ہوتا ہے کہ اس کام کا انجام جیل خانہ، عبور دریائے شور، جلا وطنی، پھانسی اور طرح طرح کی مصیبت اور روسیاہی و ذلت ہے مگر وہی مقتضائے نفسانی و طبعی ان کے علم کو بالکل معطل و بیکار بنا کر ان کی قوت و قدرت سے بڑے بڑے سنگین کام لے لیتا ہے اور علم و قدرت طبیعت کے سامنے مغلوب و مجبور ہو کر اس کے ساتھ ہو لیتی ہیں۔

ہم کو احکام خداوندی پر ایمان ویقین ضرور ہے حساب کتاب ثواب عقاب سب چیزوں کو دل سے مانے ہوئے ہیں۔ مگر طبیعت کی وہی بیہودہ رغبت ونفرت اکثر اوقات ہم کو احکم الحاکمین کے اوامر کی تعمیل سے مانع اور اس کے نواہی پر مستعد اور دلیر بنا دیتی ہے اور ہم ہیں کہ اپنے علم وقدرت سب کو بالائے طاق رکھ کر اقتضائے طبیعت کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے ہیں نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

اور اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ خالقِ کائنات اور حکیم علی الاطلاق نے اپنی قدرت قاہرہ اور حکمت باہرہ سے انسان کے اندر قوۃ ملکیہ اور قوۃ بہیمیہ دونوں رکھ دی ہیں اور ان دونوں متضاد قوتوں میں برابر باہمی تخالف اور تزاحم رہتا ہے انسان کو اول قوت خیر کی طرف کھینچتی ہے تو دوسری قوت طرح طرح کی خرابیوں اور فسادات میں مبتلا ہونے پر اس کو مجبور کرتی ہے اسی وجہ سے کوئی اعلیٰ علیین تک پہنچ جاتا ہے تو کوئی اسفل السافلین میں جا پڑتا ہے۔ اہل عقل وانصاف کو اس سے زاید بیان کی حاجت نہیں معلوم ہوتی۔

سو جب انسان پابند ہوا وہوس کا یہ حال ہے کہ رغبت ونفرت طبعی کے مقابلہ میں علم وقدرت جیسے کمالات کو خاک میں ملا دیتا ہے اور جس علم وقدرت کی اعانت ومدد سے اُس رغبت مذمومہ اور نفرت قبیحہ سے اپنا بچاؤ کر سکتا تھا اسی علم وقدرت کو اُس رغبت ونفرت کی تحصیل میں صرف کرنے سے اصلاً باک نہیں کرتا تو اس لیے احکم الحاکمین ارحم الراحمین نے جہاں اپنے خزانہ خاص سے اور کمالات انسان کو عطا فرمائے تھے ان کمالات کی اعانت اور تکمیل اور تقویت کے لیے محض اپنے فضل سے انسان کی اصلی خلقت اور فطرت اور طبیعت میں ایک ملکہ اور ایک خاص صفت ایسی بھی رکھ دی جو انسان کو اپنے مالک کی محبت واطاعت اور عدل وہدایت اور راستبازی وحق پسندی اور جملہ امور خیر کی طرف رغبت دلائے اور بُری خصلتوں اور بُرے کاموں سے اس کو نفرت دلانے میں سعی کرے۔

سو اسی ملکہ اور اسی قوت کا نام حقیقت میں امانت ہے اور یہی فطرت اسلامی ہے جو کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ اوینصرانہ اویمجسانہ الخ اور متعدد آیات واحادیث میں مذکور ہے۔

سو اب یہ دونوں کمال یعنی علم اور امانت ہر انسان کے لیے خاص اور تمام افراد انسانی کے لیے ایسی طرح عام ہیں کہ جس سے کوئی فرد انسان خالی نہیں ہو سکتا۔

صانع رحیم وحکیم نے حسب بیان سابق ہر چیز کو جیسا اس کے مناسب حالات وصفات مختلفہ عطا فرمائیں اسی طرح انسان اشرف المخلوقات کو جہاں اور کمالات لائقہ اور فائقہ دیئے گئے تھے وہیں لیاقت علم وامانت خصوصیت کے ساتھ ذات انسانی کو لازم کر دیئے گئے تاکہ اپنا فرض منصبی یعنی کار خلافت بخوبی انجام دے سکے اور حسب متابعت ہدایات خداوندی اور مطابقت احکام ایزدی تمام مفاسد اور نقصانات ومظالم کا دفعیہ کر کے جملہ عالم کی اصلاح اور درستی میں کوشش کر سکے۔

لیکن یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ زراعت میں گو اصل الاصول تو یہی ہے کہ دانہ کو زمین کے اندر رکھ دیا جائے مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضرور ہے کہ جن چیزوں کو نشو ونما میں دخل ہے جیسے پانی ہوا وغیرہ وہ چیزیں دانہ کو پہنچائی جائیں اور جو چیزیں نشوو نما کو مضر ہوں اُن سب کے اثر سے دانہ مذکور کو بچایا جائے۔ مثلاً پانی کی کثرت یا برف باری کی شدت۔

دیکھیے اگر زمین شور میں دانہ بو دیں یا کھیت کو بو کر حوض کی طرح اس کو پانی سے بھر دیں یا ہزاروں من مٹی دانہ پر ڈال دیں یا تیز آگ پھیلا دیں تو پھر تو زراعت کیسی خود تخم ہی گل سڑ کر پیوند زمین ہو جائے گا یا جل بھن کر رہ جائے گا۔

اب اسی طرح پر خیال فرمالیجے کہ حسب بیان سابق یہ تو ضروری ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ہر ایک آدمی کے اندر جوہر علم اور جوہر امانت دونوں جوہر پیدا فرما دیے ہیں مگر صرف اتنی ہی بات سے ہم عالم بن جائیں اور صاحبِ امانت کہلائیں ایسا خیال کرنا خود اس بات پر دال ہے کہ ابھی عالم ہونے میں بہت دیر ہے۔

بلکہ جیسا دانہ کی نشوونما اور پھولنے پھلنے کے لیے اس کی مؤیدات کا پہنچانا اور مضرات سے اس کو بچانا ضروری ہے ایسے ہی ملکہ علم و امانت کے مثمر و منتج و مفید و کار آمد ہونے میں اس کی ضرورت ہے کہ علم و امانت کے مؤیدات اور متممات و مکملات کے حصول میں کوشش کی جائے اور جملہ مضرات و مفسدات سے احتراز و اجتناب رکھا جائے۔

ورنہ مثل دانۂ مذکورہ قوتِ علم اور قوتِ امانت سے فائدہ تو در کنار خود علم و امانت ہی خراب و فاسد ہو کر نقصان دہ اور مضرت بخش ہو جائیں گے۔

جب یہ بات ضروری ٹھہری کہ کوئی فرد انسانی صفت علم و صفت امانت سے خالی نہیں ہو سکتی اگر خالی ہو سکی تو ضرور ہے کہ مثل دیگر مخلوقات غیر مکلف ہو گی حالانکہ تمام افراد انسانی کا مکلف اور مخاطب احکام الٰہی ہونا ضروری امر ہے۔

اور اسی کے ساتھ یہ امر بھی قرار پا چکا کہ جو صفت علم اور استعداد امانت کہ خالق کائنات نے آدمی میں ایسی طرح رکھ دی ہے جیسے قوتِ بصارت و سماعت و رفتار و گفتار وغیرہ اُسی صفت علم و امانت کا بذریعہ مؤیدات و اسباب ظاہری بڑھانا اور اُن کے مضرات و مفسدات سے پرہیز کرنا ہر انسان کے ذمہ لازم اور ضروری ہے ورنہ بدون اس تائید و تقویت کے ان کمالات کے وسیلہ سے ہم نفع نہیں اُٹھا سکتے۔

اور جو ایسا نہ کرے گا وُہ اپنے مقصود اصلی یعنی اطاعتِ خداوندی اور اپنے کار منصبی یعنی انجام دہی خدمت خلافت سے محروم رہ کر اولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغافلون کا پُورا منظر اور ارشاد لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین کا ایک کامل مظہر بن جائے گا (ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا)

الحاصل اس مضمون کو خوب دلنشین کر لینا چاہیے کہ حق جل و علیٰ شانہٗ نے اپنی قدرت اور حکمت اور رحمت سے بیشک انسان کو عجیب عجیب ملکات اور کمالات کا مخزن و مظہر بنایا مگر ان کمالات کے لیے استعداد اصلی اور استعداد کسبی دو درجے مقرر فرما دیے۔

استعداد اصلی انسان کی حد قدرت و اختیار سے بالکل اوپر اور باہر ہے اور اُس میں کمی و بیشی کی بھی گنجایش نہیں۔

لیکن استعداد کسبی میں انسان کے کسب و اختیار کو پُورا دخل ہے اور ہمارے کسب و اختیار ہی پر اس کی ترقی و تنزل موقوف ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ حواس ظاہرہ ہی کو دیکھ لیجیے کہ بصارت و سماعت وغیرہ کی استعداد اصلی اور قوت جو ہم میں اوّل سے موجود ہے کسی میں قوی اور کسی میں ضعیف اس میں تو ہمارے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں بلکہ اندھا مادر زاد جیسا

اپنے اختیار سے اندھا نہیں ہوگیا بعینہٖ ایسے ہی آنکھوں والا اپنے اختیار سے بصیر نہیں ہوا۔

البتہ ان قویٰ سے جو الوان و اشکال مختلفہ اور اصوات متبائنہ اور ملموسات متفاوتہ اور مشمومات متمیزہ کو ادراک کرتی ہیں اُس میں ہمارے قصد و اختیار کو بیشک دخل ہے۔

اور مدرکات مذکورہ کی مشق و مہارت کے بعد ہم اتنی ترقی کر لیتے ہیں کہ اُن مدرکات کے ایسے باریک و دقیق فرقوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دُوسرا آدمی جس نے یہ مشق و ترقی نہ کی ہو اُس فرق کے دریافت کرنے سے ایسا عاجز ہوتا ہے کہ بسا اوقات بتلانے کے بعد بھی دریافت نہیں کر سکتا۔ گو اصلی استعداد میں وہ ہم سے بڑھا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔

دیکھیے اگر کسی شخص کی قوتِ شامہ اصل سے بہت قوی ہو مگر اس کو عطریات کے تجربے اور استعمال کی نوبت نہ آئی ہو تو وہ شخص عطریات کے باریک فرق تو درکنار موٹے موٹے فرق کے احساس سے بھی بے خبر ہوتا ہے اور دُوسرا شخص کہ جس کی قوت شامہ پہلے کی برابر یا اس سے کچھ کم ہی کیوں نہ ہو مگر عطریات کا تجربہ اور مہارت تامہ رکھتا ہو تو وہ بے تکلف ایسے ایسے باریک فرق بتلا دیتا ہے کہ ناواقفوں کو سُن کر بھی تعجب ہوتا ہے۔

تو اب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ علم و امانت کی استعداد اصلی جو حکیم علی الاطلاق نے ہر ایک انسان میں رکھ دی ہے کسی میں قوی اور کسی میں ضعیف اس سے تو کوئی شخص خالی اور بے بہرہ نہیں ہو سکتا اور وہ استعداد ہر ایک میں بالفعل موجود ہے آدمی کے کسب و قصد کو اس میں اصلاً دخل نہیں۔ آیہ کریمہ انا عرضنا الامانة الخ اور حدیث شریف کل مولود یولد علی الفطرة الخ جن کا ذکر آچکا ہے ان میں امانة و فطرة سے سب جانتے ہیں کہ ان کی استعداد اصلی ہی تو مراد ہے بلکہ اس بارے میں ہمارے مدعائے سابق کے لیے دلیل قطعی ہیں۔

ایسے ہی بعض آیات و احادیث میں استعداد کسبی مراد ہے جس کو جاننے والے بالبداہة جانتے ہیں۔ بالجملہ علم و امانت کی استعداد کسبی کو سمجھ لینے کے بعد اب اِن شاء اللہ ہر ایک صاحبِ فہم بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ جیسا آیہ و علم آدم الاسمآء کلھا الخ میں علم کی استعداد اصلی کی طرف اور آیہ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون میں علم کی استعداد کسبی کی طرف اشارہ ہے۔ بعینہٖ اسی طرح پر آیۃ انا عرضنا الامانة علی السمٰوات والارض والجبال الخ مرقومۂ بالا میں تو امانت کی استعداد اصلی کی جانب اور حدیث شریف مندرجۂ عنوان لا ایمان لمن لا امانة لہ میں امانت کی استعداد کسبی کی جانب ایما ہے۔

کیونکہ ابھی گزر چکا ہے کہ علم و امانت کی استعداد اصلی سے تو کوئی فرد بشر خالی ہی نہیں اور نہ اس کے ہم مکلف ہیں سب کو معلوم ہے کہ تکلیف اُن امور کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور استعداد اصلی میں بندہ مجبور محض ہے۔

تو اب یہ مضمون خوب ہی واضح ہوگیا کہ علم کی استعداد اصلی کے لحاظ سے تو ارشاد لا یعلمون مندرجہ آیت مذکورہ بالا کا مصداق قیامت تک نہیں مل سکتا۔

اور علیٰ ہذا القیاس امانت کی استعداد اصلی کے لحاظ سے فرمان لا امانة لہ مندرجہ حدیث کا مصداق بھی نوع انسانی

میں ہاتھ نہیں آسکتا۔

ہاں علم اور امانت کی استعداد کسبی کے اعتبار سے اور وہ بھی زمانۂ موجود میں ارشاد لا یعلمون اور لا امانۃ لہٗ کی افراد اول نظر میں اتنی نظر آئیں گی کہ ارشاد یعلمون کے مصداق اور متصفین بالامانۃ کی افراد سعی اور تلاش کے بعد ہزاروں میں ایک کے ملنے کی بھی وہی توقع کر سکتا ہے کہ جس کو علم و امانت کی اتنی بھی خبر نہ ہو کہ کس چیز کا نام ہے ؎

گوی توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند — کس بمیداں رو نمی آرد سواراں را چہ شد
حافظ اسرار الٰہی کس نمی داند خموش — از کہ می پرسی کہ دور روزگاراں را چہ شد

ان جملہ مضامین کے ضبط کر لینے کے بعد ان شاء اللہ بخوبی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ نعمتِ ایمان حاصل ہونے کے لیے بیشک ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر دو کمال خداداد یعنی علم اور امانت کی استعداد اصلی جو رحیم و حکیم نے زبردستی محض اپنے لطف و کرم سے مثل قوۃ باصرہ اور قوۃ سامعہ وغیرہ ہماری ذات میں پیدا فرما دی ہیں اُن کے وسیلہ سے اب ہم علم اور امانت کی استعداد کسبی حاصل کرنے میں جدّ و جہد سے کام لیں۔

اور تا وقتیکہ ہم ایسا نہ کریں گے ہرگز ہرگز اس ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہو سکیں گے جس کو تمام مخلوقات سے آگے بڑھ کر ہم نے اپنے ذمّہ لیا تھا۔

اور آیۃ مذکورہ سابقہ میں جو لیعذب اللہ الخ اور یتوب اللہ دو صورتیں مذکور ہیں ان میں سے اوّل صورت میں رستگاری اور دوسری صورت میں شراکت کا کوئی طریقہ بجز اس کے نہیں کہ علم و امانت کی استعداد کسبی مذکورۂ بالا کی تحصیل اور تکمیل اور اس کی تعمیل میں پوری چستی اور مستعدی کی جائے۔

کوئی شخص فرض کر لیجئے کہ تمام فنون کا ماہر بلکہ موجد اور عاقل اور ہفت اقلیم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو مگر علم و امانت مذکورۂ بالا کی استعداد کسبی سے اگر بالکل بے خبر اور بے بہرہ ہے تو وہ اپنے مقصود اصلی اور کار منصبی سے اتنا دُور پڑا ہوا ہے کہ جس کا تدارک وہ کسی طرح نہیں کر سکتا اور ارشاد مذکورہ عنوان لا ایمان لمن لا امانۃ لہ کا پورا مصداق ہے واللہ یؤید بنصرہ من یشاء۔

ہماری معروضات سے خُوب واضح ہوگیا کہ ایمان جو کہ ہر فرد انسان کے حق میں تمام ضروریات سے ضرور تر اور تمام کمالات انسانیہ کی جڑ ہے اور اس کے بدون انسان بالکل ایسا ہے جیسا کوئی گھوڑا قوی ہیکل خوبصورت تیز رفتار ہو کر ایسا سرکش ہو جائے کہ کسی طرح سواری نہ دے بلکہ دیوانے کُتّے اور بھیڑیئے کی طرح مردم دری کرنے لگے۔

اس جوہرِ ایمان کا حصول دو چیزوں پر موقوف ہے:

اوّل احکامِ الٰہی یعنی وحی جس کو حسبِ معروضہ سابق ایمان کے لیے بمنزلہ علّتِ فاعلہ کہنا چاہیے۔

دوسری صفت امانت جس کو ایمان کے حق میں بمنزلہ علت قابلہ سمجھنا چاہیے تا وقتیکہ یہ دونوں کمال نصیب نہ ہوں گے حصولِ ایمان ایسا ہی محال ہوگا جیسے بغیر تخم ریزی یا بدون زمین قابل زراعت کوئی نادان حصول زراعت کی توقع کرے۔

جس سے ارشاد لا ایمان لمن لا امانۃ لہ مرقومۂ عنوان کی حقیقت اور حقیت میں کسی قسم کا خلجان نہ رہا اور جو مضمون ضروری ہم کو عرض کرنا تھا بحمداللہ اس سے فراغت ہو چکی۔

مگر اس کے بعد بغرض توضیح و تنبیہ یہ بتلا دینا بھی مناسب ہے کہ صفت امانت کی اصلاح اور اس میں ترقی کرنے کی صورت کیا ہے اور صفت امانت یعنی کسی کی رغبت و نفرت پر معتبر یا غیر معتبر ہونے کا حکم لگانے کی سبیل کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حسب ارشادات سابقہ جب علم اور امانت پر ایمان کا دارومدار ٹھہرا اور ان دونوں کمالوں کی تحصیل ہم پر ضروری ہوئی تو اب علم وحی اور احکامِ خداوندی کے حاصل کرنے کا طریقہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ بذریعہ تعلیم و تعلم جیسے ہر ایک علم و فن کو ہم حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح پر بذریعہ تعلیم و تعلم علم وحی کو بھی اگر کوئی حاصل کرنا چاہے تو بے تکلف اپنی بساط کے موافق حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن صفت امانت جو ایک کیفیت قلبی ہے اس کو دل میں پیدا کرنے کی کیا صورت ہے اور اس میں کمال اور ترقی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں جب یہ امر مسلّم ہے کہ مضمون امانت اور اس کی استعداد اصلی ہر ایک فرد انسانی میں موجود ہے اور ادھر یہ بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ ہر ایک طبیعت کے ساتھ اس کی مقتضیات مختلفہ یعنی کسی امر کا شوق و رغبت اور کسی امر سے اجتناب و نفرت بھی ضروری لگی ہوئی ہیں اور پھر وہ مقتضیات باہم از حد مختلف ہیں۔

دیکھیے ایک طبیعت شرک و بت پرستی اور خمر و خنزیر کی طرف اس قدر راغب ہے کہ ان اشیاء سے کسی حالت میں رُک ہی نہیں سکتی اور ان کے بدون اس کو چین ہی نہیں آسکتا۔

اور دوسری طبیعت اشیائے مذکورہ سے اس قدر متنفر ہے کہ ان کے نام سے وحشت ہوتی ہے اور کسی طرح ان چیزوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔

علیٰ ہذا القیاس جہاں تک نظر جاتی ہے مرغوبات طبائع میں اس قدر تخالف اور تباین نظر آتا ہے کہ خدا کی پناہ جس کے روبرو آسمان و زمین کا فرق بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا ؎

ویختلف الرزقان والشئ واحد
الیٰ ان یری احسان هذا لذا ذنبا

تو اس حالت میں ہم کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ فلاں طبیعت کی رغبت معتبر اور فلاں طبیعت کی غیر معتبر ہے اور ہمارے پاس کون سا معیار ہے کہ جس کے ذریعہ سے ہم صفت امانت کی نسبت جو کہ بھلی بُری کی شناخت کے لیے ہر انسان کے اندر موجود ہے صحت و فساد کا حکم لگا سکیں۔

سو امر اول کا جواب بقدر کفایت تو یہی ہے کہ امانت جیسے ایک کیفیت قلبی کا نام ہے ایسے ہی علم بھی تو ایک کیفیت قلبی ہی کا نام ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ اعضائے جسمانی کو تو علم ہوتا ہی نہیں علم تو صرف دل کے ساتھ مخصوص ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے ؎

از خواندن علم ھرگز عالم نشوی
شیریں نشود دہاں ز نام شکر

تو پھر بذریعہ تعلیم و تعلم جو اعضائے جسمانی زبان آنکھ کان کا کام ہے علم کو جو کہ امرِ قلبی ہے کیونکر ہم حاصل کر لیتے ہیں۔ بس اسی طرح اعضائے جسمانی مذکورۂ بالا کے وسیلہ سے صفت امانت کو بھی ہم ضرور حاصل کر سکیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کان سے کسی مضمون کا سننا یا آنکھ سے کسی کتاب کو دیکھنا یا زبان سے پڑھنا ہرگز علم میں شمار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو تعلق خاص حکیم علی الاطلاق نے انسان کے حواس ظاہرہ اور اس کے قلب میں رکھ دیا ہے اُس تعلق لطیف کی وجہ سے بذریعہ حواس انسان کو بالبداہتہ علم حاصل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حواس کو ہر چند علم تو حاصل نہیں ہوتا مگر حصول علم کے لیے حواس ظاہرہ واسطہ بیشک ہوتے ہیں اور یہ امر ایسا بدیہی ہے کہ جس کی تسلیم میں کسی صاحبِ فہم کو خلجان نہیں ہو سکتا۔

بس اسی طرح صفت امانت کو خیال فرما لیجئے کہ اسی تعلق لطیف کی وجہ سے جو کہ انسان کے قویٰ ظاہرہ اور قویٰ باطنہ میں موجود ہے اگر ہم چاہیں تو بلا تامل امور ظاہرہ کے ذریعہ سے کیفیت امانت کی تحصیل و تکمیل میں کوشش کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

باقی رہا امر ثانی کہ کس کی رغبت طبعی اور میلان کو صحیح و معتبر سمجھیں اور کس پر غلط اور غیر معتبر ہونے کا حکم لگائیں۔ سو ہر چند اس کا جواب مختصر اور عقل کے مطابق صرف یہ ہے کہ جو طبیعت صحیح اور امراض مفسدۂ فطرت سے پاک ہوگی اس کا اعتبار ہوگا اور جس طبیعت کو امراض نے خراب اور فاسد کر کے اس کی مرغوبات کو کچھ کا کچھ کر دیا ہو اور امور حقہ واقعیہ سے متنفر اور غلط اور بیہودہ امور کی طرف راغب اور مائل بنا دیا ہو ایسی بیہودہ نکمی طبیعت کی رغبت و نفرت کا اعتبار وہی کر سکتا ہے کہ جس کی طبیعت اور عقل دونوں مسخ ہو چکی ہوں۔

معقولات اور محسوسات انسانی دونوں کو ملاحظہ فرمائیے کہ ہر ایک میں کس قدر اختلاف شدید موجود ہے۔

امورِ عقلیہ کے اختلافات کا تو ذکر بھی فضول ہے اور اُن سب کا شمار کرنا بھی ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر ہے محسوسات کہ جن سے زیادہ کوئی چیز ظاہر اور بدیہی نظر نہیں آتی اُن کو ملاحظہ فرمائیے۔

ایک صحیح النظر کسی چیز کو ایک کہتا ہے تو احول اسی چیز کو دو دیکھ رہا ہے۔ ایک صحیح المزاج کو ایک کپڑا سفید نظر آتا ہے وہی کپڑا مریض یرقان کو صاف زرد نظر آ رہا ہے۔

ایک شخص کو مصری شیریں اور لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے کو غلبۂ صفرا میں ایلوہ سے کم محسوس نہیں ہوتی۔ ہم کو نیم کی پتی سخت تلخ معلوم ہو رہی ہیں۔ مار گزیدہ کو اُن میں قند و شکر کا مزہ آ رہا ہے۔ عطر و گلاب کے سونگھنے سے ایک لطیف الدماغ کے گئے ہوئے ہوش لوٹ آتے ہیں۔ گندہ دماغ کے آئے ہوئے ہوش ان کی بُو سے اڑے جاتے ہیں۔

جس لالٹین میں مختلف الالوان آئینے ہوں اُس میں شمع کسی کو سُرخ کسی کو سبز کسی کو زرد محسوس ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ سب کو

معلوم ہے کہ بسا اوقات شدتِ خوف کی حالت میں آدمی کو آنکھوں سے صاف طور پر وہ اشکال نظر آتی ہیں جن کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا اور ایسی آوازیں مسموع ہوتی ہیں کہ جن کا وجود بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔

مگر ان بدیہی اختلافات کے دفع کرنے میں کسی عاقل کو دشواری نہیں ہوتی بلکہ ہر کوئی یہ کہے گا کہ جمیع امثلہ مذکورہ میں اعتبار اسی کی بات کا ہوگا جس کا حاسہ صحیح ہو اور کسی امر عارضی اور مرض خارجی نے اس کے احساس کو خراب اور غلط نہ کر دیا ہو۔ گو ایسا شخص ایک ہی کیوں نہ ہو اور جس کے احساس میں کسی مرض کے باعث فتور موجود ہے اس کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا گو ایسے مریض ہزار دو ہزار یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں بلکہ خود وہ مریض بھی بشرطیکہ عقل کو جواب نہ دے بیٹھا ہو اپنے احساس کو غلط اور صحیح المزاج اور صحیح الادراک کے احساس کو درست اور واقع کے مطابق کہے گا۔

اب مقتضیات طبائع میں اختلاف شدید دیکھ کر ہم کو ہرگز پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ ہم پر لازم ہے کہ اول عقل خداداد اور غور و انصاف اور قرائن و دلائل اکابر اور تجربہ وغیرہ سے طبیعت سلیم اور مریض میں تمیز کریں کہ کون سی طبیعت صحیح اور کون سی بیمار ہے اُس کے بعد حسبِ قاعدۂ مسلّمۂ سابقہ بے تکلف طبیعت سلیمہ کی مقتضا کی تصدیق اور مریضہ کی تکذیب اور تغلیط کریں اور کسی سے نہ ڈریں۔

اور کم سے کم یہ بات تو ہم پر فرض ہے کہ جب تک ہم کو کسی کی نسبت دلائل سے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس کی طبیعت جملہ اُن امراض اور نقصانات سے پاک ہے کہ جن کی وجہ سے طبیعت کی مقتضیات میں خلل اور فساد آ سکتا ہے اُس وقت تک ہم اُس شخص کی رغبت و نفرت کو ہرگز قابلِ اعتماد نہ سمجھیں گو وہ اپنے وقت کا افلاطون اور ارسطو ہی کیوں نہ ہو اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر اگر کوئی عاقل ہم کو جاہل کا خطاب دے تو بروئے انصاف ہم کو بُرا ماننا نہ چاہیے۔

مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ جدت پسند طبائع کیا عجیب ہے جو صرف اتنی بات فرما کر ہماری تمام جانفشانی کو خاک میں ملا دینے کو موجود ہو جاویں کہ ہم کو تو اپنی عقل و انصاف سے فلاں منشی یا فلاں مولوی یا فلاں فلاسفر یا فلاں ڈاکٹر یا فلاں مسٹر یا فلاں پنڈت کی طبیعت و فطرت سلیم و صحیح اور قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہے تو ہر چند اہل عقل و انصاف کے نزدیک یہ کہنا اس سے بھی بدتر ہے کہ کوئی عقل کا دشمن طبیعت کا ہٹی شرم و انصاف کو بغل میں مار کر احول کی نظر اور مریض صفرا کے ذائقہ اور چارد خاکروب کی قوتِ شامہ کو قابلِ اعتماد اور لائقِ اعتبار قرار دے کر صحیح النظر اور صحیح المزاج اور لطیف الدماغ کے احساس کی تغلیط پر کمر بستہ ہو جائے

تاہم یہ عرض ہے کہ ایسی جرأت کرنا واقفِ سلیم الطبع سے تو قیامت تک ممکن نہیں اور ناواقف فاسد الطبع کا اس اہم معاملہ میں کسی درجہ میں اعتبار کرنا اُسی کا کام ہے جو خود فاسد الطبیعت اور ناقابلِ اعتبار ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام تو اُس شخص کا ہے کہ پہلے خود سلیم الفطرت ہو اور اس کی طبیعت جملہ امراض اور ان کے علل و اسباب سے محفوظ ہو بلکہ امراض فطرت کے معالجات سے بھی واقف ہو کیف ما اتفق کسی فن خاص کا ماہر یا کوئی رند بازاری اس منصب اعلیٰ کے لائق کب ہو سکتا ہے ؎

شہپر زاغ و زغن زیبائے صید و قید نیست
کایں کرامت در خور شہباز و شاہیں کردہ اند

اور ہم سے پوچھیے تو وہ حقیقۃً میں کسی کا بھی پیرو نہیں صرف اپنی رغبات فاسدہ اور خیالات بیہودہ کا تابع ہے اور

کسی فلاسفر یا مولوی یا جاہل کا نام لے دینا ایسا ہی ہے جیسا ڈوبتا ہُوا تنکے کے سہارے کو منظور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

لیکن ہم اگر اس وقت اُن امراض اور اُن کے معالجات کے متعلق بحث کرتے ہیں تو اوّل تو ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ اپنے مختصر سیدھے مطلب سے کہ کس قدر دُور جا پڑیں گے اس کے علاوہ جو مطلب ضروری ہم کو یہاں عرض کرنا منظور ہے اس کے لیے اس تفصیل اور تطویل کی حاجت بھی نہیں۔

ان تمام باتوں کے سوا ہم کو اس موقع پر یہ بتلا دینا بھی بہت ضروری ہے کہ کسی شخص کی صفت امانت اور کمال علم و فطرت میں فائق اور معتبر ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کارِ خلافت اور منصبِ ہدایت جو کہ خاص انسان کو عطا ہوا ہے اس کی انجام دہی کیلیے اُس شخص کا علم اور امانت و فطرت کافی ہے اور اُس کو کسی تعلیم و تعلّم کی حاجت نہیں اگر کسی کی نسبت کوئی ایسا خیال کرے تو۔ ع

بالکل غلط غلط غلط اور کس قدر غلط

تمام اہلِ عقل کو معلوم ہے کہ کارخانۂ ہدایت اور منصب خلافت کا انجام دینا تو حق جل جلالہ کے اوامر و نواہی یعنی اُس کی مرضیات و غیر مرضیات کے جاننے اور اُس کی موافقت و متابعت پر موقوف ہے اور اُن سب کا علم بدون کسی کے بتلائے یا تو اُس کو ہو سکتا ہے کہ جس کا علم و عقل نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے علم کے برابر ہو اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کے قائل کو احمق کہنا بھی ایسا عزت کا خطاب ہے کہ جس کا مستحق وُہ قیامت تلک بھی نہیں ہو سکتا اور یا اُس شخص کو اُن امور پر اطلاع ممکن ہے کہ فرض کیجیے اُس کا احساس و انکشاف اس قدر قوی ہو کہ مکنونات علم جناب باری تک اُس کی رسائی ہو مگر ہم بالبداہتہ دیکھتے ہیں کہ انسان سراپا کثافت کے مافی الضمیر تلک تو ہمارا احساس پہنچنے سے عاجز ہے اگر کسی کا سینہ بلکہ دل بھی چیر کر دیکھیں تو اُس کے مافی الضمیر کا نام و نشان بھی معلوم نہیں ہو سکتا پھر حق تعالیٰ شانہ لطیف و خبیر وراء الوراء ثم وراء الورا کی مکنونات علمیہ کی نسبتہً اگر کوئی بے عقل بیباک ایسی بات زبان سے نکالے تو اس کی زبان پر اگر دسترس مشکل ہوگی تو اپنے کانوں کے بند کرنے میں تو کسی کو بھی تامّل نہ ہوگا۔ جس کا خلاصہ یہ ہُوا کہ خدا تعالیٰ کے بدون بتلائے اور اس کے بغیر ظاہر فرمائے کسی کو اس کی مرضیات و غیر مرضیات کا علم ممکن نہیں۔

انصاف تو کیجیے کہ اگر انسان کی فطرت سلیمہ اور امانت صحیحہ اس بارہ میں کافی ہوتی تو حکیم علی الاطلاق مثل دیگر فنون و علوم ضرور اِس بار کو بھی ہمارے ذمہ رکھ دیتا۔ اس علم خاص کے لیے انبیا علیہم السلام کے بھیجنے اور پھر بذریعہ وحی اپنی مرضیات و غیر مرضیات پر اُن کو اطلاع دینے کی حاجت کیا تھی۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ افضل البشر اور اکمل البشر اور اعلم البشر یعنی انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی مرضیات و غیر مرضیات جناب باری عزّ اسمہٗ کی جاننے اور دریافت کرنے میں تعلیم خداوندی اور وحی الٰہی کے محتاج ہیں تو اس پر بھی اگر کوئی زید و عمر کی عقل یا اُن کی رغبت و نفرت طبعی کو اس بارہ میں کافی سمجھے یا علمِ الٰہی جو بذریعۂ وحی ہم تلک پہنچا ہے اُس کے مقابلہ میں اُس کا اعتبار کرے تو اس پر فرض ہے کہ جان دے کر بھی اگر کہیں سے تھوڑی عقل و امانت مل سکے تو ہرگز تامل نہ کرے اور بدقسمتی سے اگر عقل و امانت اس طرح پر بھی میسر نہ ہو تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسی فضول جان کو کیا کرے۔ ہاں ایک مردہ زندہ دل کی یہ

دعا ضرور یاد آتی ہے ؎

خونش بہ تیغ حسرت یارب حلال بادا
صیدے کہ از کمندت آزاد رفتہ باشد

الحاصل جب یہ امر معلوم ہو چکا کہ صفت امانت اور سلامتی فطرت کے خراب کرنے والے امراض اور ان کے علل و اسباب کے بیان میں کچھ طول بھی ہے اور ہمارے مدعی کی تحقیق میں اُن کی حاجت بھی نہیں اور ادھر صرف فطرت سلیمہ اور امانت صحیحہ سے بغیر اتباع وحی الٰہی ہمارا کام بھی نہیں چل سکتا تو ان وجوہ سے اُن کی تفصیل سے قلم کو روک کر بالاجماع اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ فطرت سلیمہ انسانی کو جس قدر امور فاسد و بیمار و مسخ کر دینے والے ہیں ان سب کے اصول کل تین ہیں :

اوّل نقصان و خرابی علم و معرفت۔

دوسرے خواہشات طبعی و نفسانی کی مشغولی اور ان میں انہماک۔

تیسرے پابندیِ رسوم یعنی تحصیل کمال و عزت و جاہ و اوضاع و احوال میں طالبانِ دُنیا کی موافقت کو پسند کرنا اور اُن کی متابعت کو عقل و نقل پر ترجیح دینا۔

اور ان امراض کی تفصیل اور ان کے معالجات کو اہل علم و فہم کے حوالہ کر کے وُہ بات عرض کیے دیتے ہیں جس سے بسہولت یہ بات معلوم ہو جائے کہ کونسی فطرت و امانت کو صحیح و سالم قابلِ اعتبار کہنا چاہیے اور کس کو بیمار ناقص اور بیہودہ سمجھنا چاہیے مگر توضیح مطلب سے پہلے ایک قاعدہ بدیہی جس کی تسلیم میں کسی عاقل کو تامل نہیں ہو سکتا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ خالق کائنات حکیم علی الاطلاق نے جس قدر کمالات ظاہری و باطنی انسان اشرف المخلوقات کو عطا فرمائے ہیں اُن میں ہر ایک کمال سے کوئی نفع خاص مقصود ہے کہ جس کی وجہ سے وہ کمال آدمی کو عطا ہُوا ہے اور ہر کمال کے ساتھ حق سبحانہٗ نے اپنی حکمت و قدرت سے ایسی قیود اور حدود بھی ضرور لگا دی ہیں کہ ہر کمال اپنی تحصیل غرض میں اُن قیود کا محتاج اور اُن حدود کا پابند ہے کوئی کمال انسانی اپنے احاطہ مقررہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اگر رکھے گا تو وہ کمال مبدل بہ نقصان اور باطل اور غیر مفید ہو جائے گا۔ اور جس قدر فائدہ مند تھا اُسی قدر ضرر رساں سمجھا جائے گا۔ اس لیے ہر کمال سے نفع اُٹھانے کے لیے اُن قیود و حدود کا پُورا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

مثلاً آنکھ جو عطا ہوئی ہے ہر چند اُس کو ہمارے جمال میں بھی پُورا دخل ہے مگر سب جانتے ہیں کہ غرض اصلی آنکھ سے مبصرات کا دیکھنا اور بھلے بُرے کی تمیز ہے اور اِسی کے ساتھ آنکھ سے دیکھنے کے لیے متعدد شرائط اور قیود بھی ہیں جن کے بدون آنکھ اپنا کام کرنے سے عاجز و مجبور ہے اگر اپنے اُس احاطہ سے کہ جو قدرت و حکمتِ الٰہی نے اُس کے واسطے مقرر فرمایا ہے ایک قدم بھی باہر رکھیں گے تو آنکھ کا وجود اُس کے عدم سے زیادہ مفید نہ ہوگا۔

دیکھئے آنکھ اُسی چیز کو دیکھ سکتی ہے جو موجود بھی ہو اور مثل اجسام محسوسہ و اشکال و الوان مختلفہ وُہ چیز کثیف بھی ہو۔ ہوا اور نار کی طرح لطیف نہ ہو اور وُہ چیز آنکھ کے سامنے ایک خاص دوری پر بھی ہو آنکھ کے متصل یا بہت بعید نہ ہو اور وہاں روشنی

بھی ہو، تو اب کسی شخص کو اختلال دماغ وحواس کی حالت میں اگر وہ چیزیں نظر آنے لگیں جن کا وجود ہی نہیں تو اس پر سب خلل دماغ کا حکم لگائیں گے اس کی رویہ کو ہرگز معتبر نہ سمجھیں گے یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ مجھ کو ہوا بھی نظر آتی ہے یا میں ہندوستان میں بیٹھے ہوئے تمام یورپ کی سیر کر لیتا ہوں تو کوئی عقل کا اندھا بھی یہ نہ کہے گا کہ اس کی نظر بہت تیز اور قوی ہے کہ اس قدر اشیا سے لطیفہ اور بعیدہ کو دیکھ رہا ہے بلکہ ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ اس کے دماغ وحواس میں خلل ہے یا دیدہ و دانستہ دروغ بے فروغ حماقت سے بک رہا ہے اسی طرح پر جملہ حواس کا حال خیال فرما لیجئے۔

جب یہ قاعدہ واضح ہو چکا تو اب سنیئے کہ صفحات گزشتہ میں مذکور ہو چکا ہے کہ انسان افضل الممکنات کو جو اوّل درجہ کا کمال عطا ہوا ہے وہ علم ہے جو انسان کو ہر چیز کی حقیقت اور حکمت کی شناخت اور بالخصوص حق سبحانہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات کے دریافت کرنے کے لیے عطا ہوا ہے اور اس کمال کا افضل الکمالات ہونا ایسا ہی مسلّم ہے جیسا انسان کا افضل المخلوقات ہونا قابلِ قبول ہے۔

اور اس کمال میں صانع حکیم و رحیم نے اس قدر وسعت عطا فرمائی ہے کہ حواس میں کسی کو نصیب نہیں آنکھ کی طرح نہ روشنی کا محتاج ہے اور نہ رُوبرو ہونے کی ضرورت نہ قربِ مکانی کی پابندی نہ اتحاد زمانی کی حاجت۔

دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے قریب بعید حاضر غائب سب طرف اُس کی رسائی یکساں ہے بلکہ معدومات اور ممتنعات تلک اُس کی دسترس نظر آتی ہے۔

وسعت علم کے مقابلہ میں آسمان و زمین کی وسعت بھی ہیچ نظر آتی ہے امور موجودہ اور گزشتہ و آیندہ سب اُس کے جولانگاہ ہیں۔

مگر باوجود اس قدر پھیلاؤ اور وسعت کے جو کسی احساس و ادراک کو نصیب نہیں سب کو معلوم ہے کہ علم بھی ایک احاطہ میں مقید ہے اور اُس کی رسائی کے لیے بھی ایک شاہراہ مقرر ہے جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ علم انسانی نہ جملہ معلومات کو دریافت کر سکتا ہے اور نہ یہ کر سکتا ہے کہ جس طریقہ سے چاہے کیف ما اتفق کسی امر کو معلوم کر لیا کرے بلکہ بعض معلومات تو ایسی ہیں کہ علم بشری وہاں تلک پہنچنے ہی میں عاجز اور قاصر ہے اور جن امور تلک اس کی رسائی ممکن ہے اُن کے دریافت کرنے میں وسائط مخصوصہ اور اسباب مقررہ کا محتاج ہے کہ بدون اُن وسائل کے علم کا حاصل ہونا ممکن نہیں دیکھیے دخان کے ذریعہ سے تو بیشک ہماری عقل کو آگ تلک رسائی ہو سکتی ہے مگر گرد و غبار کے ذریعہ سے آگ کا علم ہرگز علم نہ ہو گا بلکہ جہل مرکب ہو گا الحاصل جن وسائط اور وسائل سے ہم کسی امر کو دریافت کرنا چاہیں گے تا وقتیکہ وہ وسائل حقیقۃً میں وسائل اور واقع میں معتبر نہ ہوں گے۔ ان سے جو علم حاصل ہو گا وہ سراسر جہل ہو گا کیونکہ واقع علم کا تابع نہیں ہوتا بلکہ علم واقع کا تابع ہوا کرتا ہے چنانچہ علم کا تابع معلوم ہونا اہلِ علم میں مشہور اور بدیہی مسئلہ ہے۔

اگر تمام ماہرانِ ہیئت و ریاضی اپنے معتبر نقشوں اور گھڑی گھنٹوں کے حساب سے اس بات پر متفق ہو جائیں کہ آفتاب اس وقت بالکل غروب ہو چکا ہے اور فرض کیجیے آفتاب کا کنارہ کسی قدر باقی ہے تو یہ ہرگز نہ ہو گا کہ اُن ماہرانِ ہیئت اور ان کے

نقشجات و آلات کے اتفاق کے باعث آفتاب واقع میں غروب ہو جائے گا بلکہ واقع میں اُن کا قول غلط اور ان کا علم سراسر جہل شمار ہو گا۔
اسی طرح پر اگر نفس الامر میں عالم کےلیے کوئی صانع اور خالق ہے یا خالق کائنات کے لیے توحید اور اس کا ایک ہونا ضروری ہے یا یہ صحیح ہے کہ جس قدر امور چھوٹے بڑے ہیں وہ سب اس کے علم میں مقدر اور مقرر ہو چکے ہیں یا عالم کا حادث ہونا واقعی بات ہے تو پھر اگر تمام مدعیان عقل و علم بھی بالفرض وجود صانع کا انکار کریں یا دو تین خدا کے قائل ہو جائیں یا تقدیر کا انکار کرنے لگیں یا عالم کے قدیم ہونے کے معتقد ہو جائیں تو اس اتفاق سے ہرگز ہرگز یہ نہ ہو گا کہ وجود صانع میں ادنیٰ سا ضعف بھی آ سکے یا اس کی توحید میں خلل آ جاوے یا تقدیر کا مسئلہ غلط ہو جائے یا عالم قدیم بن جائے بلکہ اُن تمام مدعیان عقل کا قول محض غلط سفید جھوٹ اور ان کا علم سراسر جہل ہو گا یہ نہ ہو گا کہ اُن کے سمجھنے یا کہنے سے جو امر واقعی ہے وہ بدل کر ان کے علم کے موافق اور اس کا تابع ہو جائے اور یہ بات ایسی بدیہی ہے جس کی تسلیم میں کوئی فہیم متامل نہیں ہو سکتا۔

جب یہ قاعدہ ذہن نشین ہو چکا کہ انسان کے ہر ایک کمال ہر ایک ادراک کے لیے ضرور ہے کہ کوئی امر خاص اور منفعت مخصوص اُس سے مطلوب ہو کہ بہ پابندی قیود معتبرہ و حدود مقررہ وہ غرض اس کمال سے حاصل کی جا سکے۔

تو اب صفت امانت کہ جس کی صحت و فساد کا قاعدہ معلوم کرنا اس موقع پر ہم کو مقصود ہے اُس کو بھی ہم اگر اس قاعدہ کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں تو الحمد للہ کہ کوئی خلجان اور دشواری نظر نہیں آتی بلکہ جیسا تمام حواس ظاہرہ اور عقل و علم کی صحت و سقم میں اس مختصر قاعدہ سے ہم تمیز کر سکتے ہیں اُسی طرح صفت امانت کی صحت و سقم کو بے تکلف قاعدہ مذکورہ کے ذریعہ سے ہم سمجھ سکتے ہیں۔

اوراق گزشتہ میں بالتفصیل گزر چکا ہے کہ جوہر عقل و علم جو انسان کو ہر چیز کی حقیقت شناسی اور مرتبہ دانی کے لیے عطا ہُوا تھا اُس کی تائید و تکمیل کے لیے ہم کو قدرت و اختیار عنایت ہوا تھا تاکہ حسب ہدایت علم اپنے قویٰ و اعضا سے اعمال حسنہ بھی کر سکیں لیکن قوت بہیمیہ جو انسان کی عقل و علم پر غالب آ کر اُس قدرت سے بسا اوقات خلاف عقل و علم کام لینے لگتی ہے تو خالق حکیم نے انسان کو اس مضرت سے محفوظ رکھنے کے لیے عقل و علم کو ایک مددگار خاص مرحمت فرمایا کہ قوت بہیمیہ کے تغلب سے ہم کو بچانے اور ہماری قدرت و اختیار کو عقل و علم کی نافرمانی سے روکے اور اُسی کا نام فطرت اور امانت ہے۔ انتہیٰ

اب اس مضمون مذکورۂ اوراق بالا سے صفت امانت کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے یعنی یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ صفت امانت سے مقصود اصلی کیا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صفت امانت کی کارپردازی کے لیے کون سا احاطہ محدود ہے۔

دیکھ لیجے غرض اصلی صفت امانت کی تو یہ ہوئی کہ ہم کو قوت بہیمیہ کی مضرت سے بچائے اور بُری باتوں سے روکے اور بھلی باتوں پر چلائے اور ان کی طرف کھینچے۔

اور حد اور احاطہ کی بابت یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یہ امر ضروری ہے کہ صفت امانت متابعت علم اور اعانت عقل سے سرِمُو متجاوز نہ ہو اس کے سوا اگر اور حدود و قیود بھی اس کے لیے ہوں تو ان سے ہم کو انکار نہیں ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ اگر صفت امانت متابعت عقل و علم سے ذرا بھی متجاوز ہو گی تو وہ امانت صحیح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جیسا علم اپنے احاطہ سے نکل کر علم نہیں رہتا ضد علم یعنی جہل ہو جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح امانت اپنی حد سے اِدھر اُدھر ہو کر حقیقت میں امانت نہ رہے گی بلکہ ضد

امانت ہو جائے گی جس کو حقائق شناس فتنہ کہتے ہیں۔

کیونکہ جیسا امانت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو امورحقہ واقعیہ کی طرف راغب بناتے اور غلط اور باطل باتوں سے نفرت دلاتے ایسا ہی فتنہ درحقیقت اُس حالت اور کیفیت کا نام ہے جو ہماری نظروں میں سچی باتوں کو غلط اور غلط باتوں کو سچا کر دکھائے اور مرغوبات اصلیہ کو مکروہ اور مکروہات اصلیہ کو مرغوب بنا دے جو سخت مہلک مرض ہے۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظہر منہا وما بطن۔ [1]

اب ان شاء اللہ ہر ایک عاقل منصف بے سمجھائے سمجھ سکتا ہے کہ فطرت سلیمہ اور امانت صحیحہ کی پوری اور بے تکلف یہ شناخت ہے کہ عقل وعلم کی تابع ہو بالخصوص علمِ وحی کہ جس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان بھی نہیں اور اُس کا مطابق واقع یعنی اُس کا علم ہونا قطعی اور یقینی ہے اُس کی پیروی اور موافقت تو امانت صحیحہ کے لیے اور اُس کی مخالفت امانت فاسدہ کے لیے اوّل اور قوی تر شناخت ہے اور جیسا کسی کا علم واقع اور علم واحکام خداوندی کے مخالف ہو کر علم نہیں ہو سکتا بلکہ جہل مرکب بن جاتا ہے اِسی طرح پر وہ فطرت و امانت جو علم اور عقل اور واقع کے خلاف ہو ہرگز امانت ہی نہیں ہو سکتی حقیقت شناس بے تامل اُس کو فتنہ کہیں گے والفتنۃ اشد من القتل۔ (اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے)

ہم کو اُمید ہوتی ہے کہ ہماری تمام معروضات کو سمجھ کر انشاء اللہ اہلِ فہم و انصاف کو حدیث شریف مرقومہ عنوان کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ خلجان میں نہ ڈالے گا اور ایمان کے لیے وحی کو بمنزلہ علۃ فاعلہ اور صفت امانت کو بمنزلہ علۃ قابلہ تسلیم کرنے میں کسی قسم کا تردد پیش نہ آئے گا اور خُوب سمجھ لے گا کہ ایمان کا حاصل ہونا علم وحی اور صفت امانت دونوں پر موقوف ہے جس کو ان دونوں کمالوں سے جتنا حصہ ملے گا اُسی درجہ کا اُس کا ایمان سمجھا جائے گا اور ان ہر دو کمال میں سے اگر ایک کمال سے بھی کوئی محروم ہو گا تو پھر حصول ایمان کی توقع ایں خیال ست ومحال ست وجنوں کا مصداق ہے تمام جہان کے کمالات بھی اگر کسی میں تجویز کر لیے جاویں تو ان ہر دو کمال میں سے کسی ایک کمال کی بھی مکافات نہیں کر سکتے۔

عاقل، عالم، حکیم، موجد، علاّمہ، وحید دہر، مصلح قوم، وسیع الحوصلہ، اولوالعزم، دُور اندیش، محقق، ماہر وغیرہ وغیرہ جس قدر خطابات چاہیے کسی کو دیئے جائیے مگر مومن ہونے کا استحقاق کسی کو جب ہی نصیب ہو سکتا ہے کہ ہر دو کمال مذکورہ بالا سے کافی اور ضروری حصہ حاصل کر لے۔

بلکہ حسبِ ارشاد سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم یقال ما اظرفہ وما اجلدہ وما فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان او کما قال (یعنی قربِ قیامت میں یہ حالت ہو گی کہ بعض لوگوں کی نسبت لوگ کہیں گے کہ نہایت ہی عاقل نہایت ہی ظریف نہایت ہی جری آدمی ہے حالانکہ اُس کے دل میں ذرہ بھر ایمان بھی نہیں ہو گا) بغیر حصول دولت ایمان کوئی کمال اور کوئی خُوبی مستحق تحسین اور قابل اعتبار ہی نہیں ہو سکتی یعنی غیر مومن کی سچی تعریف بھی ناپسند ہے۔

---

[1] ہم خدا تعالیٰ سے ظاہری و باطنی فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دائرۂ ایمانی سے باہر اور احاطۂ احکام خداوندی سے آزاد رہ کر جملہ کمالات انسانی بھی بالفرض حاصل کرے اور عالم کے تمام علوم و فنون پر حاوی ہو جائے تو نظرِ حقیقت شناس اُس کو ایسا سمجھے گی جیسے عمدہ کپڑا بنایا تو گیا تھا پہننے کے لیے مگر کسی کوتہ نظر حریص نے اُس کو جلا کر چائے پکالی یا حقہ بھر لیا نعوذ باللہ من الجھل والغباوۃ[1] اِس پر بھی اگر کوئی علم وحی اور صفتِ امانت کو تمام علوم سے افضل و ضروری اور جملہ کمالات انسانی سے برتر اور لابدنہ سمجھے تو اُس سے زیادہ جاہل امانت سے محروم فتنہ میں مبتلا اور کون ہوگا۔

الحمد للہ ہماری معروضات سابقہ و لاحقہ سے یہ بات تو خوب محقق ہو گئی کہ ایمان یعنی اطاعتِ خداوندی جو کہ ہماری بلکہ تمام دنیا کی آفرینش سے مقصود ہے وہ علم وحی اور ملکۂ امانت پر موقوف ہے اور اس موقع پر ہمارا مطلب ضروری بھی اتنی بات کا عرض کر دینا تھا جس سے فراغت ہو چکی۔

اس کے بعد یہ امر بھی ضرور لحاظ و فکر کے قابل ہے کہ حق سبحانہٗ کی مرضیات و غیر مرضیات تک رسائی کہ جس پر ایمان و عبودیت و انجام وہی کار خلافت و ہدایت کا مدار ہے بالخصوص ہم جیسوں کو یقیناً محال اور اس شعر کا مصداق ہے، ؎

وہی آئے نہ آئے آپ ہم تک
نہ یاں طالع رسا، نے جذبِ کامل

ادھر امانت کی پابندی یعنی اسیرانِ ہوا و ہوس کا تمام مفاسد و مظالم اور جملہ خیانات اور بیجا خواہشوں سے پیچھا چھڑا کر جادۂ عدل و اعتدال اور صراط مستقیم پر قایم رہنا طاقت بشری سے اتنی دُور نظر آتا ہے کہ بجز مایوسی کچھ نظر نہیں آتا، اور بے اختیار یہی کہنے کو دل چاہتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ اند
باز میگوئید دامن تر مکن ہشیار باش

اب ادھر تو یہ دونوں امر اس قدر ضروری کہ اُن کے بدون انسان گدھے اور کُتے سے بدتر اور اولئک کالانعام بل ھم اضل کے لقب کے شایاں اُدھر ان ہر دو کمال تک رسائی۔ ان سے متمتع ہونا ہماری ہمت سے باہر اور طاقت سے دُور پھر کام چلے تو کیونکر چلے۔

اس عقدۂ لاینحل کے حل کرنے کے لیے اور بندگان اسیران جہل و ہوس پر ان تمام مشکلات کی سہولت کی غرض سے حکیم علی الاطلاق جل جلالہٗ و عم نوالہٗ نے اپنے کمال قدرت اور وفورِ رحمت سے یہ کیا کہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی اور ینابیع فیوض غیر متناہی مہبط انوار غیبی مخزن اسرار لاریبی یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو تمام کمالات علمی و عملی میں ممتاز اور تمام ملکات و اخلاق حسنہ سے سرفراز اور اپنے تمام بندوں کی محبت و شفقت سے اُن کے قلوبِ مطہرہ کو مالا مال فرما کر گویا اپنی تمام مرضیات و غیر مرضیات کا اُن کو

---

[1] جہل و غباوۃ سے خدا کی پناہ۔

نمونہ اور نقشہ بنا کر حسب مقتضائے حکمت و ضرورت وقتاً فوقتاً اپنے بندوں کی طرف بھیجا اور کیا عرض کروں کہ کس کس طرح سے بر دہ کمال مذکورہ علم و امانت اور دیگر امور مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل و تکمیل کو اپنے بندوں پر سہل فرما دیا جس کو دیکھ کر مایوسان کم ہمت بھی "نصیبے برم" کہنے کو تیار ہیں فللّٰہ الحمد والثنا ولہ الشکر والفضل والسنا۔

اس کی توضیح اپنی لیاقت کے موافق اور اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ بارگاہِ احکم الحاکمین میں جو قرب و امتیاز محبوبیت و اعزاز مقبولیت و وجاہت کرامت و سیادت حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہے کسی فرد بشر کو نصیب نہیں اور جو کمال علمی و عملی اُن کو عطا ہوا ہے کسی کو میسر ہونا محال تمام حکماٌ و عقلاً کے اخلاق و عقل کو اُن اورنگ نشینان محفل کمال کی عقل و اخلاق کے ساتھ وہی نسبت ہے جو دُھوپ کو آفتاب سے اور پانی کی حرارت کو آگ سے۔ بارگاہِ رب الارباب میں اُن کا وہی درجہ ہے جو بارگاہِ سلطانی میں مقربان شاہی کا ہونا چاہیے کہ حکام ماتحت اور عام رعایا تک جو احکام و انعامات سلطانی پہنچتے ہیں اُنھیں کے ذریعہ سے پہنچتے ہیں رعایا کی عرضداشت وہی مسموع ہو سکتی ہے جو ان کے وسیلہ سے پیش ہو ان کی اطاعت بعینہٖ اطاعت سلطانی اور اُن سے سرکشی و تمرد بغاوتِ بادشاہی شمار ہوتی ہے خلیفہ کامل اور نائب بلا واسطہ ہیں تو وہی ہیں باقی تمام عالم کو (کسے باشد) بعض کو بمنزلۂ حکام ماتحت اور بعض کو بمنزلۂ رعایائے سلطانی سمجھنا چاہیے۔

بالجملہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دربارۂ فیوضات غیبی اور برکاتِ روحانی اور تحصیلِ سعادت و ہدایت اور تسہیل حصول جملہ کمالات بشریت حق سبحانہٗ اور اس کے بندوں کے مابین ایسے ہی واسطہ ہیں جیسے وہ اشیاء کہ آفتاب کے اور ان کے درمیان کوئی چیز حاجب ہو اور اُن تک نورِ آفتاب پہنچانے کے لیے آئینہ مصفّٰی و مجلّٰی واسطہ ہو جاتا ہے۔

اور بعثت انبیاؑ سے غرض اصلی یہی ہے کہ بندگان جاہل و گمراہ علماً و عملاً اپنے اصول و فروع ایمانی یعنی علوم و اعتقادات، اخلاق و حالات، اقوال و افعال، عادات و عبادات، رسوم و معاملات میں ایسے مہذب ہو جاویں کہ دنیا میں انتظام معاش اور آخرت میں فلاح معاد بخوبی و سہولت حاصل کر سکیں جس سے اہلِ انصاف کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اتباع انبیاء کو صرف عبادات کے ساتھ مخصوص سمجھنا اُنہیں صاحبوں کا کام ہے جو بے علمی اور کوتہ نظری کے ساتھ صفت امانت کو خراب و فاسد کرکے من حیث لایحتسب فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں اگر وجوب اتباع انبیاء مسئلہ شرعی اور امر دینی ہے تو پھر ارشاد انتم اعلم بامور دنیاکم کے بھروسے متابعت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صرف عبادات میں منحصر کرنا کس قدر سینہ زوری ہے اور اطاعتِ رسول کو امور دنیوی میں داخل کرنا تو اُسی کا کام ہے جو احاطۂ آدمیت سے بھی خارج ہو چکا ہو۔

سب جانتے ہیں کہ ایک تو امر اور حکم ہوتا ہے اور ایک صلاح و مشورہ۔ سو امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خواہ کسی چیز کے متعلق ہو ہم بیشک اس کے مامور ہیں۔ اور مشورہ آپ کا ہو یا کسی اور کا ہم اس کے مامور ہرگز نہیں۔ یہ امر دیگر ہے کہ بمقتضائے حسن ادب جو بوجہ کمال عقل و مقبولیت انبیاؑ علیہم السلام کے ساتھ ہونا چاہیے اُن کے مشورہ کا اتباع بھی مستحب اور اُن کا مشورہ بھی اوروں کے مشورے سے مقدم ہے مگر یہ استحباب خارجی اور عرضی ہے اس اتباع کی نسبت امر شرعی ہم کو نہیں ہوا جو اس کو امر شرعی کہا جائے ادھر یہ بات ہے کہ مشورہ مذکورہ کی گنجائش ہے تو منافع و مضار دنیوی میں ہے دربارۂ منافع و مضار اُخروی انبیاء کو

مشیر سمجھنا نبوت کا مدعی بنانا یا انبیا کو عوام میں داخل کرنا ہے اور یہ بھی خوب سمجھ لینا چاہیے کہ تحصیل منافع دنیا کے بعض طرق فلاح آخرت کے معارض ہوتے ہیں اور بعض موافق اور بعض نہ معارض نہ موافق پہلے دو طریقوں میں حکم نبوی اور امر شرعی کا اتباع کرنا پڑے گا البتہ تیسرا طریقہ یعنی جو فلاح آخرت کے نہ مخالف ہے نہ موافق صرف اُسی میں ہم کو توسع اور اختیار ہے کہ اُس کے ذریعہ سے ہم منفعت دنیوی حاصل کر سکتے ہیں اُس میں فقط یہ ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ کسی نہج سے فلاح آخرت کے معارض نہ ہو جاوے۔ باقی جس طرح چاہیں طریقۂ مذکورہ سے منفعت حاصل کریں چنانچہ بیوع و اجارات فاسدہ وغیرہ کی ممانعت اسی پر مبنی ہے۔

تو اب جو کوئی اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ کے ارشاد سے (جو آپ نے تابیر نخل کی نسبت فرمایا تھا) خود مختار بننا چاہے اول اس پر یہ لازم ہے کہ یہ سمجھ لے کہ آپ نے تابیر نخل سے جو روکا تھا یہ حکم اور امر تھا یا بتقاضائے خیر خواہی بطور مشورہ منع کیا تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھ لے کہ اقسام ثلثہ مذکورہ میں سے تابیر نخل کس قسم میں داخل ہے۔ جس قسم میں داخل ہے صرف اُسی میں مختار ہے جملہ اقسام میں خود مختاری اس سے حاصل کرنا بالکل یہ کہہ رہا ہے کہ حدیث مذکور کے مورد اور اس کے مطلب سمجھنے کا قصد بھی نہیں کیا۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ درستیِ آخرت چونکہ مقصود بالذات ہے اور انتظام معاش دنیوی بالتبع مطلوب ہے تو اس لیے اگر کوئی چیز معاش دنیوی کے لیے مفید و نافع اور معاد و آخرت کے لیے مضر و نقصان دہ ہو گی تو وہ چیز ضرور قابلِ ممانعت اور واجب الاجتناب ہو گی اور اس کا عکس قابلِ قبول اور واجب العمل ہو گا۔

اِس مختصر قاعدہ کے سمجھ لینے کے بعد ان شاء اللہ جملہ اُن امور سے نجات مل سکتی ہے کہ جن سے وحیِ الٰہی تو روکتی ہے اور ہم کو اپنی عقل سے بڑے بڑے نفع ان میں نظر آتے ہیں یا وحیِ الٰہی تو اس کی طرف شوق و رغبت دلاتی ہے اور ہمارا نفس اس سے ڈراتا ہے۔ چنانچہ فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے کے بارہ میں خود کلامِ الٰہی میں ارشاد ہے:

الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشآء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ و فضلا واللہ واسع علیم۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ جب ہماری عقل و خواہش حکمِ الٰہی کے ناموافق ہوں تو ہم کو امرِ خداوندی کی متابعت چاہیے اور یہی ہمارے لیے موجبِ فلاحِ دارین ہے مگر اسی آیۃ کے متصل یؤتی الحکمۃ من یشآء ارشاد فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ اس کو تسلیم کرنا اُنہیں کا کام ہے جو علم و عمل میں پختہ ہیں جاہل ہوا پرست سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جو نادان اپنی یا کسی دوسرے کی عقل کے بھروسا کہ جس کو حسب الحکم آیۃ سابقہ حقیقت میں اغوائے شیطانی کہنا چاہیے احکام وحی کی مزاحمت اور اُن میں تصرفات کرنے پر آمادہ ہو اُس نادان کو عظمتِ وحی تو درکنار خود اپنی بھی خبر نہیں وہ بیچارہ علم و امانت سے اس قدر اجنبی اور بے نصیب ہے کہ صاحبِ علم و امانت کو اُس کی نسبت "نیستند آدم غلاف آدم اند" کہہ کر بھی صبر نہ آئے گا۔

ارشادِ خداوند فاضلہ اللہ علی علم اور ارشادِ نبوی اتخذوا رؤسا جہالا فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا کے پوری مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ والعیاذ باللہ ؂

اے جذبہ ہمتے کہ دریں دشت پُر فریب گم کردہ ایم قافلہ سالار خویش را

جب یہ مضمون محقق ہوگیا کہ تمام عالم کے لیے سرمنشأ ہدایت اور سرچشمۂ جملہ کمالات بنی آدم اگر ہیں تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ کو جو احکامات و انعامات خداوندی پہنچتے ہیں انھیں کی وساطت سے پہنچتے ہیں تو اب کیسے ہوسکتا ہے کہ علم و امانت جن کو انعاماتِ خداوندی میں اعلیٰ اور کمالات انسانی میں تمام کمالوں کے لیے سرمنشأ کہنا چاہیے وہ انبیاءؑ کے ذریعہ سے ہم کو نہ پہنچائے جائیں بلکہ ضرور ہے کہ ان دونوں کمالوں کی ہم کو جس قدر احتیاج ہے اُسی قدر بذریعہ انبیاء ہم تک پہنچانے میں اہتمام زیادہ فرمایا گیا ہو اور جس قدر ان کی تحصیل میں دشواری تھی اُسی قدر بذریعہ انبیاء ہم پر ان کی تحصیل کو سہل و آسان کر دیا گیا ہو۔

سو الحمد للہ علم و امانت میں یہی قصہ ہے دیکھ لیجئے اوّل تو انسان کو جوہر عقل اور علم عطا فرمایا پھر اس کی تائید کے لیے تو اس ظاہرہ و باطنہ کس قدر عنایت کیے پھر تعلیم و تعلم کے ایسے طریقے بتلا دئے کہ انسان ظلوم و جہول سہولت کے ساتھ تحصیل و تکمیل علم کر سکے بلکہ مختلف علوم و فنون صنائع بدائع اپنی سمجھ اور تجربہ وغیرہ سے ایجاد کر سکے چنانچہ آج جس قدر علوم و فنون ہماری نظر کے سامنے ہیں وہ سب ایسے ہی ہیں صرف ایک علم جس کو علم مرضیات الٰہی اور علم احکامِ الٰہی اور علم وحی کہتے ہیں اور اس کا جاننا مقصود اصلی ہے البتہ اس تک رسائی ہماری طاقت سے باہر تھی اور باوجود کمالات مذکورہ انسان کو اس علم کا حاصل کرنا محالی تھا سو اس کا تکفل و اہتمام حق سبحانہٗ نے خود ایسا فرمایا اور انبیاء کرام کے وسیلہ سے ہم پر اس قدر سہل کر دیا کہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اللہ کے فضل سے علم وحی کی تحصیل میں وہ سہولتیں نظر آتی ہیں جو بہت سے علوم ایجاد کردۂ بنی آدم میں بھی نہیں دیکھتے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ سفراء معصومین یعنی ملائکہ مقربین کی وساطت سے احکامِ الٰہی اور کلام خداوندی انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل فرمائے جاتے ہیں اور کلام الٰہی کا مطلب اصلی اور منشأ واقعی اُن کے قلوب میں خوب راسخ فرما کر تبلیغ و ہدایت خلق اللہ کا عظیم الشان کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے اور انبیاء کرام کے وہ کمالاتِ جلیلہ شریفہ جن کو بالاجمال ابھی عرض کر چکا ہوں ان کمالات پر بھی بس نہیں کی جاتی بلکہ طرح طرح سے احکامِ خداوندی کی تبلیغ اور اُن کی محافظت کا عظیم الشان اہتمام کیا جاتا ہے جس کی کیفیت بخوبی اس آیہ کریمہ سے ظاہر ہے:

عالم الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہٖ احداً الّا من ارتضیٰ من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہٖ رصداً لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم و احاط بما لدیہم و احصیٰ کل شیٔ عددا۔

خلاصہ مضمون آیہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب اپنے بھید کی باتیں پیغمبروں کے سوا کسی پر ظاہر نہیں فرماتا اور اپنے رسول کی حفاظت و حمایت سب طرف سے کرتا ہے تاکہ رسولوں کا احکامِ الٰہی کی تبلیغ کرنا محقق ہو جائے اور کوئی فتور و قصور تبلیغ وحی میں نہ آئے اور اللہ کا علم و قدرت رسولوں کے احوال اور تمام اشیاء کو محیط ہے کوئی امر اس کے علم و قدرت سے خارج نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ احکام بذریعہ وحی خاص انبیاءؑ پر نازل ہوتے ہیں اور لفظ ارتضیٰ سے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ حضرات انبیاء کرام کے تمام ملکات و علم و اعمال و اخلاق و احوال پسندیدۂ جناب باری و اکمل و اعلیٰ ہوتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ وحی الٰہی اور اس کی تبلیغ کا ہر طرح سے ایسا انتظام و محافظت تام منجانب اللہ ہوتا ہے کہ کسی نقصان و

خلل کا اُس میں امکان محال ہے نہ یہ ہو سکتا ہے کہ شیطان کے کسی قسم کے دخل کو وہاں تک رسائی ہو نہ یہ ممکن ہے کہ حضرات انبیاؑ سے اُس کے فہم مطلب میں غلطی اور اس کی تبلیغ میں کسی قسم کی کوتاہی یا بھول چوک ہو جائے۔

اسی کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ منجملہ کمالات گوناگوں عبودیت و عصمت دو کمال عظیم الشان انبیاؑ علیہم السلام کو خاص طور سے عطا ہوتے ہیں۔

عبودیت کا خلاصہ تو یہ ہے کہ اپنے تمام کمالات کو محض انعام و عطائے خداوندی اور اپنے آپ کو تمام کمالات وغیرہ میں اُسی کا محتاج اور دست نگر سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے اتباع احکام الٰہی میں ایسی محبت اور اس کی رضاجوئی میں اس قدر محو اور چالاک کہ ہر ایک امر خداوندی کے بجالانے کو جان و دل سے تیار اور ہر ایک مخالف مرضی سے متنفر اور بیزار بجز اطاعت و فرمانبرداری نہ راحت کا خیال نہ تکلیفات شاقہ کا فکر و ملال نہ عزت سے سروکار نہ کسی کی ایذارسانی کا دل پر بار۔

اور عصمت کا ماحصل یہ ہے کہ انبیاؑ علیہم السلام کے اقوال و افعال عبادات و معاملات حالات و عادات اخلاق و ملکات جو سرتاپا پسندیدہ اور برگزیدہ اور حق سبحانہٗ کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں بعنایت و حمایت الٰہی وہ سب دخل شیطانی اور عوارض نفسانی سے معصوم و محفوظ رکھے جاتے ہیں اُن کے کسی قول و فعل وغیرہ میں دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہو سکتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاؑ کی تعلیم قولی و فعلی وغیرہ سب قابلِ قبول اور واجب الانقیاد ہیں اور اُن کے کسی قول یا فعل یا عادت یا معاملہ سے انحراف موجب خسران دارین ہے۔

پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ کمال علم و عبودیت کے ساتھ حضرات انبیاؑ علیہم السلام کے مقدس قلوب میں تمام امت تمام قوم تمام بنی نوع کی محبت اور سچی خیر خواہی اور ہمدردی اور اُن پر رحمت و شفقت اس قدر القاء فرمائی جاتی ہے کہ اُن کی راحت کو اپنی راحت سے اور اُن کی تکلیف و مضرت کو اپنی تکلیف اور مضرت سے کم نہیں سمجھتے مثل پدر شفیق ان کی تادیب و تعلیم میں جان و مال کسی چیز سے دریغ نہیں فرماتے اُن کی آوارگی اور گمراہی دیکھ کر نہایت بے چین و بیقرار ہوتے ہیں لیکن ان کی ہمت میں فتور اور ان کی سعی میں قصور نہیں آتا نااہلوں کے پتھر اور گالیاں کھا کر بھی اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ہی ان کی زبان پر آتا ہے اور ارشاد حق عزوجل لعلك باخع نفسك ان لا یکونوا مومنین سُن کر بھی ان کی ہمدردی اور دل سوزی کا جوش فرو نہیں ہوتا۔

اس پر زہد و قناعت، استغنا اور استقامت، ہمت و شجاعت، فہم و فراست، فصاحت و بلاغت، فیضِ صحبت وغیرہ اوصاف میں ایسے کامل کہ ہدایت و حق گوئی میں تن تنہا تمام عالم سے نہ جھجکیں اور کسی طمع اور کسی حاجت کے باعث ہرگز ہرگز کسی سے نہ لچیں امر حق میں سب سے بیگانہ خلق اللہ کی مصلحت بینی اور نفع رسانی میں فرد و یگانہ نہ دوستوں پر عاشق دشمنوں کے سچے بہی خواہ اور طالب صادق تعلیم و تفہیم میں وہ کمال کہ مضمون دقیق و طویل کو سہل اور مختصر فقروں میں اُمّی صحرانشین کے دل میں ایسا بٹھلا دیں کہ قیامت تک نکالا نہ نکلے اور جاہل سنگدل ایسا متاثر اور خود رفتہ ہو جائے کہ سنبھالا نہ سنبھلے۔

اب اہلِ فہم ان جملہ امور مذکورۂ بالا کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھ لیں کہ جب علم مرضیات الٰہی بندوں تک پہنچانے میں

اس قدر اہتمام و احتیاط ہر ہر طرف سے فرمائی گئی ہے کہ حفاظت و حمایت الٰہی کا یہ حال ہے اور اس کے لانے والے ایسے مقرب اور معتمد علیہ ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا علم و دیانت، راستی و صداقت، عبودیت و عصمت، اخلاق فاضلہ اور شفقت کاملہ تعلیم و تفہیم عباد میں یہ کمال ہے جو معروض ہو چکا تو اب ان جملہ انتظامات کاملہ کے بعد فرمائیے کہ علم مرضیات الٰہی کی تحصیل و تسہیل میں کون سی دقت اور اس کے معتبر اور ہر طرح سے قابلِ وثوق ہونے میں کون سی کسر باقی رہ گئی۔

کلامِ الٰہی جو فی نفسہٖ ارشاد انا سنلقی علیك قولاً ثقیلا کا مصداق ہے اُس کی نسبت اُن سہولتوں کے بعد جو مذکور ہوئیں صاف صاف اور بار بار ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر فرما دینا ہمارے مدعیٰ کی ایسی دلیل ہے کہ پھر کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

ہمارے بیانات سے جیسا یہ ثابت ہُوا کہ تحصیل علم وحی بذریعۂ انبیاء کرام ہم پر سہل بلکہ اسہل فرما دی گئی جس کا بیان کرنا اس موقع پر ہم کو مقصود تھا ایسا ہی یہ امر بھی خوب محقق ہو گیا کہ وحی الٰہی کے نزول اور اُس کی تبلیغ و حفاظت میں اس قدر اہتمام ہر طرف سے فرمایا گیا ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی اس میں ادنیٰ سا خلل ہرگز نہیں ڈال سکتے۔ چنانچہ اس حفاظت و حمایت کو ادنیٰ اعلیٰ سب پر واضح کر دینے کی غرض سے حق سبحانہٗ نے تاکیدی الفاظ میں یہ وعدہ فرما دیا۔ اِنّا نحن نزّلنا الذکر و اِنّا لہٗ لحافظون۔

اب اہلِ عقل و انصاف اوّل تو نزولِ وحی کے ارکان ضروریہ یعنی وحی نازل فرمانے والے اور وحی کے لانے والے اور جس پر وحی نازل ہوئی ان تینوں کی جلالت و عظمت و رفعت کو حسبِ بیانات سابقہ ملاحظہ فرمائیں۔ ان سب کے بعد حق تعالیٰ کے اس وعدۂ مستحکم کو دیکھیں پھر فرمائیں کہ اِس سنگین بلکہ آہنی قلعہ میں کون خلل ڈال سکتا ہے اور فلسفۂ قدیم کے پٹاخے اور فلسفۂ جدید کی مہتابیاں اس مستحکم قلعہ پر کیا اثر پہنچا سکتی ہیں اور اِنّ مِنَ العِلمِ لجہلاً کے علماء اور بعضُ العقلِ عِقالٌ کے عقلاء اپنی ٹکروں سے اُس کی بنیادوں کو کہاں تک متزلزل کر سکتی ہیں۔ واللہ اتنا بھی اثر نہیں پہنچا سکتے کہ جتنا پیل مست کو مچھر کی لات اور رعد کی آواز کو مکھی کی بھنبھناہٹ۔

جب علمِ وحی کا بذریعہ انبیائے کرام ہم پر طرح طرح سے سہل ہو جانا بالتفصیل معلوم ہو چکا تو اب صفت امانت کو بھی اُس پر قیاس فرمائیے کہ اوّل تو ملکۂ امانت ہمارے قلوب میں مثل دیگر ملکات خلقۃً اور فطرۃً رکھ دیا گیا اُس کے بعد علم و عقل و جملہ ملکات حسنہ اور اخلاق فاضلہ حلم و حیا صدق و صفا سخاوت و شجاعت عفت و دیانت انصاف و مروت وغیرہ کے ذریعہ سے ملکۂ امانت کے کسب و ترقی میں آسانی اور سہولت کر دی گئی کہ ان کی اعانت سے صفتِ امانت کو تقویت پہنچے اور انسان مغلوب ہوا و ہوس جملہ خیانتوں سے اور بیجا خواہشوں سے محفوظ رہ کر صراطِ مستقیم پر بسہولت قایم رہ سکے۔

ان سب سے قوی اور سہل تر ذریعہ امانت کی درستی اور ترقی اور جانچ کے لیے اتباع و فہم علم وحی ہے۔

ان تائیدات کے بعد اب کسی دُوسری تائید کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی مگر مضمون امانت حسب بیان سابق چونکہ امر طبعی ہے اور رغبت و نفرت کا اُس پر مدار ہے اور سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات امور طبعیہ کے مقابلہ میں اور طبیعت کی رغبت نفرت کے سامنے عقل و علم، انصاف و حیا، مروّت و دیانت سب مغلوب ہو جاتے ہیں اور آدمی مرغوب طبعی کے پیچھے کبھی ایسا بیخود ہو کر دوڑتا ہے کہ عقل و علم کی آواز بھی اُس کے کان تک نہیں پہنچتی اور دیانت و حیا پر نظر ڈالنے کی مہلت بھی اُس کو نہیں ملتی۔

بالکل ایسا قصہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ بلّی دربار شاہی میں مشعل مُنہ میں لیے کھڑی تھی چُوہا سامنے سے گزرا تو مشعل کو فرش پر ڈال چُوہے کی طرف بے اختیار دوڑی جس سے قریب تھا کہ تمام مکان میں آگ لگ جاوے۔

اگر تھوڑا سا غور و انصاف کریں تو بلّی کے قصہ سے بدرجہا زاید تعجب خیز اور حیرت انگیز مثالیں اپنے احوال اور افعال میں ہم بے تکلف مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس لیے حق سُبحانہٗ جل سلطانہٗ نے اپنے لطف و رحمت سے ایسی دولت و نعمت ہم کو عطا فرمائی کہ اس دشواری خاص میں ہم کو اُس سے کامل مدد مل سکے اور اِس دشواری میں خاص سہولت پیدا ہو جائے۔

اور وہ انعام یہی ہے کہ حسبِ معروضۂ سابق حضرات انبیاؑ کے واسطے سے جیسے علم مرضیاتِ الٰہی کہ جس تک ہم کو رسائی غیر ممکن تھی ہم پر سہل فرما دیا گیا بعینہٖ اِسی طرح پر انبیائے کرام کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے محض اپنی قدرت و رحمت سے صفت امانت کو قلوب بنی آدم میں ایسا قایم اور قوی کر دیا کہ خواہشاتِ نفسانی اور مقتضیات طبعی کی دستبرد سے ہم کو نجات مل سکے اور اُن کی غارت گری سے دولتِ ایمان محفوظ رہ سکے ؎

فشکراً لہ وابتہاجا بہ

وان قصر الفعل عما وجب

شرح اِس معا کی یہ ہے کہ حضرات انبیاؑ صلوات اللہ علیہم و سلامہ کے وجود سراپا جود کی مثال ایسی سمجھیے جیسے آفتاب عالمتاب کہ جب آفتاب اپنے مطلع کے قریب آتا ہے اُسی وقت سے رات کی تاریکی دُور ہونے لگتی ہے اور جب اُس کا نور عالم میں پھیل جاتا ہے تو ظلمتِ شب بالکل کافور اور محض معدوم ہو جاتی ہے اور ہر ہر جگہ آفتاب کا نور ایسا سرایت کرتا ہے کہ کوئی موقع اس کے فیض سے محروم نہیں رہتا اور تاریکی شب اپنی حالت پر کہیں بھی قایم نہیں رہنے پاتی مکانوں کے اندر ہر چند نور آفتاب نہیں پہنچتا لیکن تاریکی شب وہاں بھی نہیں رہ سکتی البتہ اگر کوئی مکان ایسا ہو کہ اُس میں کوئی دروازہ یا روشندان یا کسی قسم کا سوراخ ہی نہ ہو تو بے شک اُس کو آفتاب سے محرومی ضروری بات ہے اِسی طرح پر یہ مقبولان بارگاہِ الٰہی اور چشم ہائے فیوض غیبی جب عالم نورانی سے اس جہان ظلمانی کی طرف بامر ارحم الراحمین گمراہوں کی ہدایت کے لیے نزول فرماتے ہیں تو ایک خاص برکت اور نورِ ہدایت بھی ان برگزیدگان عالم القدس والجبروت کے ساتھ ساتھ ضرور اس عالم میں آتا ہے اور اپنی اپنی قابلیت کے موافق تمام قلوب بنی آدم میں اس کا اثر پہنچتا ہے اور کوئی اس سے

محروم نہیں رہتا اور خود بخود سب کے دلوں میں طلبِ حق کا جوش اور سب کی زبانوں پر کلمۃ الحق کا خروش ظاہر ہونے لگتا ہے ہر کوئی خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے نقائص علمی اور مفاسد عملی پر خود بخود متنبہ اور خبردار ہو جاتا ہے۔ طلب حق قلوب میں ایسی موجزن ہوتی ہے کہ کسی قسم کی تکلیف و مشقت اور رنج و مصیبت ان کو قبول امورِ حقہ سے مانع نہیں ہوسکتی اطاعت احکم الحاکمین میں ایسے چست ہو جاتے ہیں کہ نفس امارہ کی مرغوبات اور دنیا کی محبت و حب جاہ و مال کو یک لخت پس پشت ڈال کر اور نام و نشان کو خاک میں ملا کر ہر ایک حکمِ الٰہی کی تعمیل کو اپنا منتہائے مطلوب اور غایت مقصود خیال کرتے ہیں ہاں جو کوئی شقی ازلی اور محروم حقیقی ہوتا ہے وہ اِس سعادت و برکت سے بالکل بے بہرہ اور اِس نعمت و دولت سے البتہ بے نصیب رہتا ہے اور اِسی برکت اور نورِ ہدایت کو امانت بھی کہتے ہیں جس کا بیان ہم کو مقصود ہے۔

اب اہلِ فہم انصاف کریں کہ وہ صفت امانت جس کی تحصیل و تکمیل میں ہم کو سخت دشواری بلکہ ایک طرح کی معذوری و مجبوری نظر آتی تھی اُس کو حق سُبحانہ نے انبیاؑ علیہم السّلام کے ذریعہ سے ہم پر کس قدر سہل و آسان فرما دیا جس کی کیفیت دیکھ کر اب تو نہایت مسرت کے ساتھ ہم یہ شعر پڑھنے کو مستعد ہیں ؎

آفتاب اندروں خانۂ ما
دربدر میرویم ذرہ مثال

چنانچہ حدیثِ نبویؐ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے،

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انّ[1] الامانتہ نزلت فی جذر قلوب الرجال ثم علموا من القرآن ثم علموا من السنۃ۔

اہلِ فہم انصاف فرمائیں کہ اِس ارشاد سے ہمارا مضمون مذکورۂ سابق جیسا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے ایسا ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آدمیوں کے قلوب میں اوّل مضمون امانت جاگزین ہوتا ہے اُس کے بعد علمِ قرآن و علمِ حدیث سے ہدایت نصیب ہوتی ہے اور اسی امانت کو آیۃ انما[2] تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن اور ارشاد سیذکر[3] من یخشٰی میں لفظ خشیۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ھدًی للمتقین وغیرہ آیات میں لفظ تقویٰ سے مذکور فرمایا ہے جن کے ملاحظہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بدون خشیت اور بلا تقویٰ یعنی بغیر حصول امانت آدمی کو اتباع احکامِ الٰہی اور ہدایت حاصل نہیں ہوتی بلکہ قرآن و حدیث اُسی کو نافع ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اوّل برکت مذکورہ یعنی امانت موجود ہو۔

اب ہماری اس تمام تقریر پریشان سے صفت امانت کی حقیقت اور کیفیت بھی پوری واضح ہو گئی اور حدیث شریف

---

[1] لوگوں کے قلوب میں پہلے امانت نازل ہوئی پھر اُنھوں نے قرآن و سنت سیکھا ۱۲

[2] آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور خدا سے ڈرے ۱۲

[3] نصیحت وہی قبول کرے گا جس میں خشیہ ہو ۱۲

مذکورۂ عنوان لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ کی تحقیق بھی خوب واضح ہوگئی اور صفت امانت کی تحصیل میں جو دشواری اور دقت نظر آتی تھی اُس کی سہولت اور آسانی کی تفصیل بھی مشرح معروض ہو چکی و الحمد للہ و ما توفیقی اِلّا باللہ ۔

مگر اسی کے ساتھ یہ بھی خوب واضح ہوگیا کہ تمام خوبیوں کی جڑ اگر ہے تو صفت امانت ہے اس کے بدون نہ ایمان حاصل ہو سکے نہ خوف و محبت الٰہی نہ تقوٰی نہ طہارت نہ ہدایت نہ سعادت حتیٰ کہ قرآن و حدیث یعنی علم وحی سے منتفع ہونا جو کہ تمام عقائد و اعمال اصول و فروع اسلامیہ کی اصل ہے وہ بھی بحکم حدیث مذکور صفت امانت پر ہی موقوف ہے۔

مگر جب یہ ہے تو پھر یہ بھی ضرور کہنا پڑے گا کہ قوی ضعیف جس درجہ کی کسی کی صفت امانت تسلیم کی جائے گی اُسی درجہ کا اُس کا ایمان بھی مانا جائے گا۔ بلکہ جملہ امور ہدایت عقاید ہوں یا اعمال عبادات ہوں یا معاملات اخلاق حسنہ ہوں یا احوال اُسی درجہ کے سمجھے جائیں گے کہ جس درجہ کی صفت امانت ہوگی اور اسی کے ساتھ ساتھ اگر کسی کی صفت امانت میں کسی قسم کی کوتاہی یا کسی طرح کا نقصان یا کسی نوع کا خلل مانا جائے گا تو اُسی کے موافق اُس کے ایمان اور تمام اصول و فروع ہدایت میں بھی اس کا تسلیم کرنا ضرور ہوگا۔

جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ تمام خوبیوں کی اصل صفت امانت اور تمام خرابیوں کی جڑ فسادِ امانت ہے جس کو فتنہ کہتے ہیں ۔ کسی صاحبِ امانت نے کیا خُوب فرمایا ہے ؛

س

گر امانت بسلامت ببرم باکے نیست
بیدلی سہل بود گر نبود بیدینی

اس کے بعد اہلِ عقل کو اس امر کو تسلیم کر لینے میں بھی کسی دلیل کی احتیاج نہ ہوگی کہ وصفِ امانت میں جملہ افراد انسانی مساوی نہیں ہو سکتے بلکہ جیسا علم و ایمان وغیرہ امور میں افراد انسانی از حد مختلف ہیں ایسا ہی صفت امانت میں باہم فرق ضروری ہے اور جیسا نورِ آفتاب کو آئینہ اور دیگر اجسامِ لطیفہ و کثیفہ اپنی اپنی قابلیت کے موافق قبول کرنے میں مختلف ہیں اِسی طرح پر قلوب بنی آدم امانت و برکت مذکورۂ بالا کے قبول کرنے میں از حد متفاوت ہیں اور اِسی تفاوت کی وجہ سے مراتب ایمانی میں جملہ مومنین کو متمایز سمجھنا ضروری ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جملہ اُمتِ مرحومہ سے افضل ہونا جو علمائ میں ایک مہتم بالشان مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بجز اکابر اہلِ سنت دیگر فرقوں کو اس کا سمجھنا دشوار ہوا ہے اُس کا بڑا منشا یہی برکت اور یہی امانت ہے یعنی جناب سید المرسلین و خاتم النبیین جب اُس پُر آشوب وقت میں ہدایت خلق اللہ کے بھیجے گئے کہ جس کی نظیر شرک و جہالت میں زمانۂ سابق میں بھی کبھی نہ گزری تھی تو حسبِ قاعدۂ مذکورہ بالا آپ کے ساتھ بھی مثل جملہ انبیائ علیہم السلام اُسی فیض و برکت و امانت مذکورہ کا نزول ہوا مگر یہ فیض و برکت دیگر انبیائ کرام کی برکات و فیوض سے دو وجہ سے بہت فائق اور برتر تھے ۔ بڑی وجہ تو یہی ہے کہ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم افضل الرسل اور تمام انبیائ کے کمالات کے مرجع ہیں کیونکہ آپ کے کمالات اور

دیگر انبیا کے کمالات میں وہی نسبت ہے جو نورِ شمس اور نورِ قمر میں تعلق ہے۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں چونکہ جہل و شرک کو وہ قوت تھی کہ کسی زمانہ میں نہ ہوئی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ایسے ہی اعلیٰ ہادی اور سامان قویہ ہدایت کی ضرورت تھی کہ اس جہل و شرک کو جو کہ تمام عالم میں وبائے عام کی طرح پھیل کر قلوب بنی آدم میں اپنا سکہ جما چکا تھا اس کو نیست و نابود کر کے نورِ ہدایت شرقاً و غرباً پھیلا دے۔ شاہانِ دُنیا کو بھی جب کوئی بغاوت چھوٹی یا بڑی پیش آتی ہے تو اس کی مدافعت کے لیے اُسی سردار اور سپہ سالار کو مامور کرتے ہیں جو اُس کے مناسب حال ہو اور اُس کی مدافعت کے لیے کافی سمجھا جائے بغاوت عظیم کے انسداد کے لیے کم درجہ کے افسروں کو کوئی نہیں بھیجتا یہاں تک کہ اگر بغاوت عام تمام مملکت سلطانی میں پھیل جانے کی نوبت آتی ہے تو ایسے خاص معتمد جلیل القدر سردار کو اپنا قایم مقام بنا کر بھیجنا پڑتا ہے کہ جو تمام خواص سلطانی میں ممتاز اور ہر طرح سے لائق و فائق سمجھا جاوے۔

الحاصل حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اِس برکت و فیض خاص میں جملہ انبیاء علیہم السّلام پر فائق و ممتاز ہونا مثل دیگر کمالات ضروری التسلیم ہے۔

آپ بحکم رب العالمین تمام عالم کی اصلاح و ہدایت کے لیے اس عالم میں بھیجے گئے اور اعلیٰ درجہ کا فیض امانت اور نورِ ہدایت آپ کے ساتھ ساتھ ایسا ہی تھا جیسا آفتاب کے ساتھ نور۔ تو اِس نورِ ہدایت اور اِس برکت و امانت سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وہی حصہ ملا جو نورِ آفتاب سے کواکب اور آئینۂ مجلاّ و مصفّٰی کو ملتا ہے حضرات صحابہ میں باہم فرق مراتب ہو مگر اور کوئی اِس کمال میں اُن کا ہم پلہ نہیں جن لوگوں کی نظر صرف ریاضات و مجاہدات و اعمال صالحہ پر قاصر رہی اُن کو بالبداہتہ ایسے شکوک پیش آئے کہ جن سے افضلیت صحابہ کو کماحقہ' تسلیم نہ کر سکے اور جن کی نظر غائر ان تمام کمالات کے اصل یعنی ملکۂ امانت تک پہنچی اُن کو افضلیت صحابہ کی تسلیم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور جب حضرات صحابہ کو صفت امانت میں سب اُمت سے افضل مانا جائے گا تو حسب معروضۂ سابق اُن کے ایمان کو بھی تمام مومنین کے ایمان سے اعلیٰ اور اکمل کہنا ہوگا ہاں اگر کوئی شخص ریاضات شاقہ یا عبادات بدنی و مالی یا علم جزئیات شرعیہ میں کسی صحابی سے بڑھ جائے تو اُس کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل اور دشواری نہیں۔

مگر یہ فوقیت حضرات صحابہؓ کے کمال کے مقابلہ میں ایسی ہے کہ کسی قوی البصر گوشہ نشین کو تو مشاہدۂ جزئیات مختلفہ کی نوبت کم آئے اور ضعیف البصر سیاح دائر سائر کو جزئیات مختلفہ کثیرہ کا مشاہدہ میسر ہو تو ادنیٰ صاحب عقل بھی مشاہدۂ جزئیات کثیرہ کی وجہ سے اس ضعیف البصر کو ہرگز قوتِ بصر میں اُس قوی البصر پر ترجیح نہ دے گا بلکہ قوۃ بصر میں باوجود قلت مبصرات شخص اوّل ہی کو فائق و افضل سمجھے گا۔

جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ ایمان اور تمام اعمال صالحہ کا وجود و عدم اور کمال و نقصان ملکۂ امانت کے وجود و عدم اور کمال و نقصان کے ساتھ وابستہ ہے تو اب ارباب فہم بلا تامل تسلیم کر لیں گے کہ کفر اور تمام اعمال بد کا وجود و عدم ضد امانت یعنی فتنہ کے وجود و عدم پر اِسی طرح موقوف سمجھا جائے گا جیسے ہدایت کے وجود و عدم کو علم کے وجود و عدم پر موقوف کہنے سے ضلالت کے وجود و عدم کو جہل کے وجود و عدم پر موقوف کہا جاتا ہے۔

اور اسی پر کیا موقوف ہے جن کو عقل سے کچھ بھی لگاؤ ہے وُہ ایک ضد کی حالت سمجھ لینے سے بے تکلف دوسری ضد کا حال معلوم کر لیا کرتے ہیں۔

تو اب کوئی صاحبِ فہم و انصاف حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے افضل الامۃ ہونے میں ان شاء اللہ متأمل نہ ہوگا کیونکہ صفتِ امانت اور برکاتِ نبوت میں جو کہ جملہ امورِ ایمانی کی اصل ہے حسبِ معروضہ سابقہ حضرات صحابہ کا نمبر سب سے اوّل اور افضل ہے۔ اور جب حضرات صحابہ کے افضل الامت ہونے کی لِم اور علت معلوم ہوگئی۔ تو اب یہ بھی واجب التسلیم ہوگا کہ جس کی صفتِ امانت فاسد و خراب ہوگی اُس سے زیادہ ایمان سے محروم اور بدنصیب کوئی نہ ہوگا بلکہ اُس کا ناقص الایمان اور بدترین خلائق ہونا ایسا ہی مسلّم ہوگا جیسا حضرات صحابہ کا افضل الامۃ اور اکمل المومنین ہونا واجب التسلیم ہے گو وہ کیسا ہی صاحبِ کمال و عقل سمجھا جاتے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ امانت سے ضروری اور بہتر اور فتنہ سے زیادہ مضر اور بدتر ہمارے حق میں دُوسری چیز نہیں ہو سکتی اور جس زمانہ میں امانت کا غلبہ ہوگا وہ زمانہ خیر القرون اور جس زمانہ میں فتنہ کا غلبہ ہوگا وہ زمانہ شر القرون کے خطاب کا مستحق ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہمارے مربی اوّل رؤف و رحیم، بشیر و نذیر نے جیسا ہدایت کے دونوں ارکان یعنی علم و امانت کی حقیقت اور ان کی ضرورت و منفعت پر ہم کو طرح طرح سے مطلع فرمایا ایسا ہی ان دونوں ارکان کی ضد یعنی جہل و فتنہ کی اصلیت اور ان کی خرابی و مضرت سے ہم کو آگاہ فرمانے میں ہر قسم کی تاکید اور تنبیہ سے کام لیا۔ جو حضرات کتبِ علمِ وحی کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں اُن کو میری تصدیق میں تأمل نہ ہوگا اُن ارشادات کے ملاحظہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے اُس جہالت و ضلالت کے زمانہ میں کہ جو جہالت و ضلالت میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا اپنی رحمت سے قلوب بنی آدم میں مضمون امانت کو القا فرمایا اور اپنے بندۂ خاص سرآمد جملہ خواص کو بھیج کر اس کے فیض و برکت سے مضمون امانت کو وہ ترقی عطا فرمائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کا کچھ ہوگیا اور زنگ خوردہ قلوب کو ایسا مجلّٰی اور مصفّٰی کر دیا کہ بھلے بُرے کی تمیز گویا آنکھوں سے سب کو محسوس ہونے لگی اور قلوب انسانی کو ہر طرح سے قابلِ قبول ہدایت بنا کر علمِ وحی یعنی قرآن و حدیث سے مالا مال کرنا شروع کر دیا جس کے فیض سے وہی افراد کہ جن کو جاہل، کافر، مشرک، گمراہ کہا جاتا تھا چند روز میں رئیس الموحدین اور راس المتقین اور امام الاصفیاءُ والصالحین نظر آنے لگے اور جن کی وجہ سے شرک و ضلالت میں وُہ زمانہ بے نظیر شمار ہوتا تھا آج ہم اُنھیں کے طفیل سے ہدایت و سعادت میں کسی زمانہ کو اُس کا ہم پلّہ نہیں کہہ سکتے بلکہ آیندہ کو بھی امید نہیں کر سکتے۔ اس کی مثال بالکل ایسی سمجھنی چاہیے جیسے اوّل زمین کو قابلِ زراعت بنایا جاتا ہے پھر اُس میں تخم ریزی کرتے ہیں جس قدر زمین قابل اور تخم ریزی کامل ہوگی اُسی قدر زراعت اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور ان دونوں جزو میں جتنی خرابی اور کمی ہوگی اُسی قدر زراعت میں خرابی و نقصان ظاہر ہوگا ایسے ہی جس زمانہ جس گروہ میں علم و امانت جس قدر کامل ہوں گے اُسی قدر ہدایت و خیریت اُن میں کامل ہوگی اور جس ملک اور جس زمانہ اور جس قوم میں جس قدر علم و امانت میں نقصان ہوگا اُسی قدر اُن میں خرابی اور بُرائی اور گمراہی کا ظہور ہوگا۔

اِسی کے ساتھ اُس بشیر و نذیر عالم علوم اوّلین و آخرین نے خوب سمجھا دیا کہ یہ خیریت جو میرے زمانہ میں ہے

ہمیشہ قایم نہ رہے گی بلکہ کچھ عرصہ کے بعد علم و امانت میں خلل آنا شروع ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ جہل کا غلبہ اور فتنہ کا تسلط قلوب بنی آدم پر پورا پورا ہو جائے گا اور علم و امانت کے خراب ہو جانے کے بعد تمام خرابیں میری اُمت میں عام اور شائع ہو جاویں گی اور تحریف کتاب اللہ اور تغییر احکام خداوندی اور ہر قسم کی بداعمالی اور فسق و فجور میں یہود و نصاریٰ سے کم نہ رہیں گی اور تمام گمراہی اور بداعمالی کی اصل اصول یعنی فتنہ کی تشریح خوب واضح فرمادی اور فتنہ کے جملہ اقسام ظاہری و باطنی خاصہ اور عامہ متعلقہ ملک و ملتہ سب کو ایسا ظاہر فرمادیا کہ آج ہم کو اپنی حالت دریافت کرنے کے لیے اپنے گریبان کی طرف سر جھکانے کی بھی حاجت نہیں اور ابنائے زمانہ کی بڑی بڑی تحقیقات اور سلف صالحین اور علمائے راسخین پر اُن کے کڑے کڑے اعتراضات اور احکام شرعیہ سے اُن کے بڑے بڑے اختلافات اور اس پر اُن کے مداحین کے عظیم الشان عطا کردہ خطابات سب کو دیکھ کر اور سُن کر بجز اس کے کہ ارشادات نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق آنکھوں سے اور کانوں سے محسوس ہونے لگی بحمد اللہ اور کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔

اہلِ علم و فہم کو معلوم ہے کہ جہل مرکب اور علم میں اور امانت و فتنہ میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہے جو ہر ایک کا کام نہیں مگر حسب معروضات سابقہ پیروانِ قرآن و حدیث اور متبعانِ احکام خدا و رسول کو اس میں اس قدر سہولت ہے کہ کوئی دقت ہی نظر نہیں آتی۔ ہمارے اعمال کیسے ہی بُرے ہوں مگر قرآن و حدیث کے ہوتے ہم کو دربارۂ علم و امانت کسی مغلطہ میں مبتلا ہونے کی بحمد اللہ کوئی وجہ نہیں۔

مثلاً ہم جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی مدعی عقل و علم قرآن و حدیث کا کسی امر میں دیدہ و دانستہ خلاف کر رہا ہے یا کوئی ناواقف اپنی خودرائی اور عقل کے زور سے احکام شرعیہ میں دخل دیتا ہے تو ارشادِ رسول علیہ السلام :

ان من العلم لجهلا ۔ — بعض علم تو سراسر جہل ہوتا ہے۔

اور :

اتخذ الناس رؤساً جهالاً فسئلوا فافتوا بغير علم فضلوا واضلوا ۔ — لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے پھر اُن سے مسئلے پوچھے جاویں گے تو وہ بلا علم کے فتوے دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

دیکھ کر ہم بلا تردد اُس کو جاہل اور ضال مضل سمجھنے اور کہنے پر مامور اور مستعد ہوں گے اور اس کے فتوے کو واجب الرد اعتقاد کریں گے۔

اور جب کوئی ہم کو قرآن و حدیث کے متعلق ایسے مضامین سمجھائے گا کہ نہ ہم نے کبھی سُنے نہ ہمارے اکابر نے تو حسب ارشادِ رسول کریم :

يكون في آخر الزمان دجالون كذابون — آخر زمانہ میں بہت سے جھوٹے دجال نکلیں گے۔

یاتونکم من الاحادیث بما لم تسمعوا انتم ولا اٰباءکم فایاکم وایاھم لایضلونکم ولایفتنونکم۔

جو تم کو ایسی باتیں سُنائیں گے کہ نہ تم نے کبھی سُنی ہوں گی نہ تمھارے باپ دادا نے۔ ایسے لوگوں سے بچتے رہنا کہیں تم کو گمراہ نہ کر دیں اور فتنہ میں نہ مبتلا کر دیں۔

ہم بے شک اس کے اقوال سے اجتناب اور نفرت کریں گے اور اُس کو گمراہ کرنے والا اور فتنہ میں ڈالنے والا بالیقین خیال کریں گے اور اس کو صاحبِ علم و صاحبِ امانت تو وہی کہہ سکتا ہے جو خود پُورا جاہل اور پُورا مفتون ہو۔

اور اگر ہم کسی کُرسی نشین کو دیکھیں کہ وہ اپنے عقلی خیالات سے ہم کو متابعت حدیث سے روکتا ہے اور احادیث کو غیر معتبر بنا کر ہم کو صرف کتاب اللہ کی متابعت کی رائے دیتا ہے تو حسبِ ارشاد مخبر صادق:

آلا انی اوتیت القراٰن ومثلہ معہ الا یوشك رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھٰذا القراٰن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ مجھ کو قرآن مجید عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور۔ دیکھنا ایک بہت پیٹ بھرا ہوا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لے لو (اور حدیث وغیرہ کو چھوڑ دو) جو کچھ اس میں حلال پاؤ اُس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو حالانکہ خدا کے رسولؐ نے جس چیز کو حرام بتلایا ہے وُہ بھی ایسا ہی حرام ہے جیسا خدا تعالیٰ کا (قرآن میں) حرام بتلایا ہوا۔

ہم پر فرض ہوگا کہ ہم اُس مالدار مسند نشین کے کلام کو لغو اور باطل سمجھیں اور ہرگز ہرگز سوائے تردید و ابطال کے اُس کی طرف توجہ بھی نہ کریں۔

الغرض اس پُر آشوب وقت میں جس قدر فتنہ ظاہری و باطنی خاصہ و عامہ بڑے چھوٹے عالمگیر نظر آ رہے ہیں ان شاء اللہ ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس کی حقیقت اور حالت مخبر صادق جامع علوم اوّلین و آخرین کی احادیث صادقہ میں موجود نہ ہو۔ احادیث رسولِ امینؐ کو سرسری نظر سے دیکھ کر بھی ہم کو علم و جہل اور امانت و فتنہ میں کوئی التباس کوئی خلجان نہیں پیش آ سکتا بلکہ سہولت سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ امر فتنہ کی کس قسم میں داخل ہے اور وُہ امر کس قسم میں ہاں جس بدقسمت کو احادیث ہی سے استنکاف اور بے خبری ہو وُہ ضرور وَلَلَبَسۡنَا عَلَیۡهِم مَّا یَلۡبِسُونَ کا مصداق ہوگا حتّٰی کہ جہل کو علم اور فتنہ کو امانت سمجھے گا۔ سو ایسے لوگ جو چاہیں کریں وہ جانیں ہم کو تو صرف یہ بتلا دینا منظور ہے کہ جس قدر امانت ضروری اور مفید امر ہے اُسی قدر فتنہ ہمارے حق میں مضر اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور حسبِ ارشاد رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سلف کا زمانہ جیسا امانت و ایمان و علم و

صدق و ہدایت وخیریت کا زمانہ تھا ویسا ہی حسب ارشاد مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ زمانہ ہجوم فتنہ اور فساد امانت اور جہل وضلالت کا زمانہ ہے اور ارشاد حضرت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم :

انی لاری الفتن تقع خلال بیوتکم کوقع المطر۔	میں تمہارے گھروں میں فتنوں کو گرتے ہُوئے ایسا دیکھ رہا ہُوں جیسے بارش گرا کرتی ہے ۔

اور :

یقبض العلم وتظھر الفتن ۔	علم ضبط کر لیا جائے گا اور طرح طرح کے فتنے ظاہر ہوں گے ۔

اور :

ان من اشراط الساعۃ ان یرفع العلم ویکثر الجھل ۔	قیامت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم اٹھا لیا جائے اور جہل کی کثرت ہو

اور :

اذا ضُیّعت الامانۃ فانتظر الساعۃ ۔	جب دلوں سے امانت کھودی جائے تو قیامت کے منتظر ہو بیٹھو ۔

اور :

تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عوداً عوداً الخ ۔	جیسے چٹائی میں ایک ایک تیلی لگاتے ہیں اسی طرح یکے بعد دیگرے فتنے دلوں پر پیش ہوں گے ۔

وغیرہ ارشادات کا پُورا مصداق ہے حتّٰی کہ حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے فرمایا ہے :

لا یعرف معروفا ولا ینکر منکراً الا ما اشرب من ھواہ ۔

یعنی بعض قلوب میں فتنہ اس قدر راسخ ہو جائے گا اور مضمون امانت سے اتنی دُور جا پڑیں گے کہ شریعت و علم و عقل سب سے آزاد ہو کر اپنی خواہشات بیہودہ کے ساتھ جس چیز کو موافق دیکھیں گے اُس کو معروف اور اچھا سمجھیں گے اور جو چیز اُن کی خواہشات کے خلاف ہو گی اُس کو منکر اور بُرا کہیں گے یعنی عقل و نقل و اقوال اکابر سب کو پس پشت ڈال کر صرف اپنی ہوا و ہوس کے مقلد اور تابع ہوں گے اور اُسی کو مفید اور حق سمجھیں گے سو میرے نزدیک اگر چند لمحہ کے لیے ہم گریبان کی طرف سر جھکا کر غور کریں گے تو موجودہ زمانہ میں اس اخبث المراتب کے نظائر ملنے میں بھی غالباً ہم کو دشواری نہ ہو گی والعیاذ باللہ الرحیم ۔

ہمارے مقدس اکابر اسی بدترین حالت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ بعض افراد انسانی اپنی اصل طبیعت سے ملحد مزاج اور ایسی زندیق فطرت ہوتے ہیں کہ ظاہر میں گو کلمۂ اسلام زبان سے کہتے ہیں لیکن خدا اور رسول ، دین و مذہب ، حساب و کتاب ، عذاب و ثواب ، دوزخ و جنت وغیرہ امور کا اُن کے دل میں یقین اور ان امور پر اُن کو وثوق و اعتماد نہیں ہوتا صرف نشیب و فراز

دنیوی ہی میں سعادت وشقاوت کو منحصر سمجھتے ہیں اور حصولِ جاہ اور تحصیل مال کو اصلی کمال اور منتہائے پرواز جانتے ہیں وہ عاقل وفہیم اُسی کو سمجھتے ہیں جو تحصیل جاہ و مال میں مشغول ہو اور حکیم ومصلح قوم حتّٰی کہ ہادی ومقتدا اُسی کو کہتے ہیں جن کو نشیب وفراز دنیوی میں مہارت اور مصروفیت ہو اور جس کو اِن امور سے مجتنب اور یکسو پاتے ہیں اُس کو جاہل اور غبی اور بیوقوف اور نکما خیال کرتے ہیں جو سعی وجانفشانی تحصیل دنیا کا باعث نہ ہو اُس کو بیہودہ اور جو محنت ومشقت وسیلہ حصول اغراض دنیوی نہ ہو اُس کو بے سُود تصوّر کرتے ہیں جو لوگ اتباعِ انبیاؑ اور ہادیان دین میں سرگرم ہیں ان کو بے عقل اور احمق کہتے ہیں اور اقوال وافعال ومعاملات وعادات ہیں مذہب کی رعایت اور پابندی کو حماقت اور سفاہت بتلاتے ہیں۔ طاعت وعبادت ہیں جانکاہی اور مشقت کو نادانی اور صبر وقناعت اور زہد وتوکل کو دلیل کمزوری اور ناتوانی سمجھتے ہیں احکاماتِ شرعیہ کو رسوم بے اصل سے زیادہ نہیں مانتے اور طرح طرح سے طعن وتشنیع اُس پر کرتے رہتے ہیں۔ مضامین شاعرانہ اور دلائل فلسفیانہ وملحدانہ احکام ربانی کے مقابلہ اور معارضہ میں پیش کر کے ہر طرح سے اُن احکام حقّہ کی توہین اور اُن پر طعن اور تشنیع کر کے عوام کی نظروں ہیں اُن کی وقعت واعتبار گھٹانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اُن کی تحریر وتقریر میں چرب زبانی اور شوخ قلمی کے ساتھ امورِ شرعیہ اور پابندانِ شرع پر طرح طرح سے طنز ورمز، طعن وتشنیع، استہزا وتلبیس ہیں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہوتا اور اپنے مخترعات وایجادات کو احکامِ حقّہ شرعیہ پر ترجیح دینے میں مطلق العنانی و بے باکی وچالاکی سے پُورا کام لیتے ہیں دنیا کے جزوی اور احتمالی منافع کی اِس قدر رعایت واہتمام کرتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے احکام مصرحہ قطعیہ شرعیہ کے انکار وتحریف وتاویل کی کچھ بھی پروا نہیں کی جاتی اور خم ٹھوک کر فخر ومباہات کے ساتھ احکام حقّہ کی تکذیب و تردید کی جاتی ہے۔

سو اب یہ تو کیا عرض کروں کہ ایسے لوگوں کے حق میں شریعت کیا حکم دیتی ہے اور ہمارے مقدس اکابر نے کیا فرمایا ہے جو طالبِ حق ہو تحقیق کر لے ہم کو تو اس موقع پر صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ ہمارے مربّیِ اوّل اور اُن کے سچّے جانشینوں نے یہ تمام فتنے اور ان کے تفصیلی حالات واحکام مشرح بیان فرما کر ہم کو ایسا بے نیاز فرما دیا تھا کہ آج ہم کو اپنے یا کسی دُوسرے کی وسعت خیالی اور اختراع عقلی اور رطب اللسانی اور خوش بیانی اور کمال علمی اور دُور اندیشی اور دلائل فلسفی اور شواہد ہیئت وطبعی اور طمع مفاد دنیوی وغیرہ دیکھ کر یا سُن کر سوا اس کے کہ اپنے مقدس ہادی کے ارشادات صادقہ کی تصدیق اور زیادہ ہوتی بشرط فہم وانصاف ان باتوں کا دُوسرا کوئی اثر ہم پر نہ ہو سکتا۔

اِس سے زیادہ تعجب خیز کون سا امر ہوگا کہ مربّی صادق نے جن باتوں کو تفصیلی وتحقیقی طور سے ہم کو بتلا دیا تھا اور اُن کے حالات واحکام پوست کندہ سمجھا دیے تھے کہ زمانہ غلبہ جہل وفتنہ میں ایسا ایسا ہوگا جب آج جو وُہ ناپاک امور ہو بہو ہمارے سامنے پیش آئے تو بجائے تصدیق ہم نے یہ کیا کہ جہل کو علم اور فتنہ کو امانت یقین کر کے ارشادات صادقہ مربّی شفیق ورحیم کے مقابلہ کے لیے بڑی چُستی کے ساتھ کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

فنعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و فساد علمنا و اما نتنا۔	ہم خدا تعالیٰ سے اپنے نفسوں کی شرارت اور علم و امانت کے فاسد ہونے سے پناہ مانگتے ہیں۔

اور اُس غلبۂ جہل وفتنہ نے ہم کو ایسا مسخ کر دیا کہ جملہ احکام و معاملات و رسوم و عادات وغیرہ شرعیہ کو طے کر کے نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ جیسی عبادات محضہ اور ارکان اسلامیہ میں بھی صرف ترک ہی پر ہم کو قناعت نہ ہوئی بلکہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنے علم و عقل کے زور سے ارکان مذکورہ میں بھی کاٹ تراش کرنا اور اُن کی ضرورت اور لزوم میں رخنہ اندازی کرنا شروع کر دیا۔ ؎

نخوت نگر کہ مخلد اندر دلش ز رشک
حرفے کہ در پرستش معبود میرود

جو حضرات مدعیانِ اسلام خدانخواستہ اِس حد تک پہنچ چکے ہوں کہ جن کی کیفیت بذریعہ حدیث شریف اور ارشاد اکابر ابھی عرض کر چکا ہوں اُن کی خدمت میں تو ناصحانہ ہماری صرف یہ عرض ہے: ؎

بہال و پر مرو از رہ کہ تیر پرتابی
ہوا گرفت زمانے ولے بخاک نشست

اور جو حضرات بحمد اللہ اِس حد تک نہیں پہنچے بلکہ اُن کے دل میں اسلام کی صداقت اور محبت اور خیر خواہی باقی ہے مگر اسلام کی صداقت کے ساتھ اپنے علم و عقل ہمت و تدبیر پر بھی پُورا اعتماد ہے اور اِس وجہ سے اپنی عقل و فہم کے موافق اسلام کی اصلاح اور مسلمانوں کی درستی کرنا چاہتے ہیں اُن کی خدمت میں خیر خواہانہ یہ عرض ہے: ؎

چو مردِ دیں نہ بانفس کافر بر نمے آئی
سکندر نیستی اندیشہ از نیروی دارا کُن

ہم مکرر عرض کر چکے ہیں کہ احکامِ الٰہی میں کسی کی عقل کافی تو کیا دخل دینے کی بھی لیاقت اور منصب نہیں رکھتی۔

اس وقت تک جو جو ستم و جفا مدعیانِ اسلام کے ہاتھ سے دین اسلام پر ہو چکا ہے سچّے اسلام کی نیست و نابود ہو جانے کے لیے کافی سے بھی زائد ہے چنانچہ ادیان صادقہ گزشتہ مردہ سب اس کی زندہ نظیر ہیں۔ مگر اُسی مربّی شفیق اور مخبر صادق نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ ہر چند اسلام کے اندر اخیر زمانہ میں سب ادیان سابقہ سے زائد اختلافات و فتنے ظہور پذیر ہوں گے مگر حق تعالیٰ کی رحمت سے یہ ہوگا کہ ایک جماعت ہر قرن میں ایسی بھی موجود رہے گی کہ اسلام کی حمایت اور اس کے احکام کی حفاظت سچّے ذریعہ سے کرتی رہے گی اور دربارۂ دین اسلام وہ جملہ اہلِ باطل پر غالب رہے گی اُن کی وجہ سے احکامِ الٰہی اور دین اسلام اہلِ باطل اور اہلِ فتنہ کے تصرفات سے محفوظ رہیں گے جو جو اختراعات اور غلط باتیں اربابِ جہالت و فتنہ دین میں وقتاً فوقتاً ملاتے رہیں گے۔ اُن کو وہی جماعت قلیل اپنے اپنے زمانہ میں دین حق سے ایسے نکالتے رہیں گے جیسے دُودھ سے مکھی یا خمیر سے بال۔ اور اہلِ فتنہ اور اہلِ ضلالت کا اثر اُن کے متبعین ہی تک محدود رہے گا اسلام کے خط و خال پر اُس کا اثر نہ آنے پائے گا اور اُسی غریب جماعت کی حمایت سے باذن اللہ دین اسلام اخیر تک اپنی اصلی حالت پر محفوظ رہے گا سو یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہے جس کا مشاہدہ برابر ہو رہا ہے اور کسی دین کو نصیب نہیں ہُوا اگر گوش حقیقت نیوش ہو تو غریب اسلام آج اپنے دانا دشمن اور نادان دوست کو (یعنی اُنھیں دونوں قسم کی جماعتوں کو جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے) خطاب کر کے بآواز بلند کہہ رہا ہے: ؎

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود
ورنہ ہیچ از دل بےرحم تو تقصیر نبود

اس پر طرہ یہ ہے کہ اُس غریب باخیر جماعت سے جیسے احکام شرعیہ اور علوم مذہبی اسلامی کی حفاظت اور حمایت کرائی جاتی ہے ویسے ہی اُس جماعت کو اُس فیض و برکت میں سے اپنے اپنے درجہ کے موافق حصہ عنایت کیا جاتا ہے جو حسبِ معروضات سابقہ ہمارے مربّی مقدس اور ہادیِ اوّل کے ہمراہ تھا اور جس فیض و برکت کا اثر قلوب بنی آدم میں پہنچ کر موجب ہدایتِ عامہ خلق اللہ ہوا تھا۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ہدایت کے وہی دو رکن اعظم کہ جن کا نام علم وحی اور صفت امانت تھا اُن دونوں میں سے ہر زمانہ میں اُس جماعت موصوف کو درجہ بدرجہ حصہ عنایت ہوتا ہے اور اُن سے نیابت رسول اور ہدایت مخلوق کا کام لیا جاتا ہے اور جیسے وہ حضرات علم وحی کے عالم ہوتے ہیں ویسے ہی اُن کی مجالست اُن کے قرب اُن کے تعلق اُن کی محبت سے کیفیت امانت دلوں میں ظاہر اور ترقی پذیر ہوتی ہے اور یہی حضرات رسول کے سچے نائب اور علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل کے واقعی مصداق ہوتے ہیں اِنھیں نفوس قدسیہ کی ہمت و برکت سے بقائے دین و ایمان اور اِنھیں کی فیض و حمایت سے جہل و فتنہ کی روک تھام ہوتی رہتی ہے اور یہ حق سبحانہٗ کا اتنا بڑا انعام ہے جس کی قدر وہی جان سکتا ہے جس کو مرتبۂ نبوت کی عظمت اور انبیاءِ کرام کے کمالات کی حقیقت کما حقہٗ معلوم ہو ورنہ جن افرادِ زمانہ کے قلوب میں خود انبیاء کرام ہی کی کل حقیقت یہ ہے کہ نبی مصلح قوم کا نام ہے تو اُن کی آنکھوں میں بیچارے غریب نائبوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے فالی اللہ المشتکی من جور الفتنۃ والھویٰ۔

الحاصل وہ علم وحی اور امانت کہ جو ایمان اور اُس کی تمام اصول و فروع کے لیے مبنی اور موقوف علیہ تھی اُس کی تعلیم و تحصیل میں حسب بیاناتِ سابقہ پوری وسعت اور سہولت فرمائی گئی اور حسبِ ارشادات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام تابقیامت اُس کا ایسا انتظام فرما دیا گیا کہ باوجود غلبہ جہل و ضلالت اور باوجود کثرت فتنہ اور عدم امانت ان ہر دو کمال کا سلسلہ کسی حالت اور کسی وقت میں منقطع نہ ہونے پاوے فالحمد للہ کما ینبغی لجلال وجھہٖ ولعظم سلطانہٖ۔

مگر اسی کے ساتھ اہلِ اذہان صافیہ اس کو بھی تسلیم کر لیں گے کہ جیسا ان نائبانِ رسول کے ذریعہ سے اہلِ عالم کو اپنے اپنے تعلق اور مناسبت کے باعث علمِ وحی اور فیض امانت پہنچتا ہے اسی طرح پر اُن لوگوں کی وجہ سے کہ جن کے وقتاً فوقتاً آنے کی آپ نے خبر دی ہے اور اُن کو امام فتنہ اور دجال اور کذاب فرمایا ہے اُن کی مجالست اُن کی محبت اور مناسبت سے ضرور بہت سے افراد کے قلوب میں اپنی اپنی لیاقت کے موافق جہل و فتنہ اور شر و ضلالت کا اثر ظاہر اور ترقی پذیر ہوگا۔ یضل من یشآء ویھدی من یشآء۔

چنانچہ یہ دونوں اثر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں جن کی تصدیق میں کوئی صاحبِ فہم و انصاف متأمل نہ ہوگا۔

ہم اپنی غفلت اور ہوا و ہوس کے نشہ سے متنبہ ہو کر انصاف سے دیکھ لیں کہ اہلِ علم و امانت اور اربابِ فتنہ وضلالت کے بارہ میں جو حضرت نبی کریم اور مربیِ رحیم نے ہم کو باتیں بتلائی ہیں وُہ آج صاف صاف اپنے اندر اور دیگر حضرات کے اندر آنکھوں سے کھلے طور پر ہم کو نظر آتی ہیں یا نہیں جس کے ملاحظہ کے بعد ہم کو ایمان وکفر، علم وجہل، امانت وفتنہ کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہاں ہم دیکھنا ہی نہ چاہیں یا دیکھ کر بھی اپنی سینہ زوری کیے جاویں تو اس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا لیکن حق تعالیٰ کے یہاں سب کا علاج ہے اور سب کو معلوم ہے جو اُس کا یقین اب نہیں کرتا عنقریب مجبوراً کرنا پڑے گا۔

حضرت فخرالانبیاءؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کسی نے ایمان کی علامت پُوچھی یعنی ایمان ظاہری کی نہیں بلکہ ایمان اصلی حقیقی کی جو کہ قلب کے متعلق ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا:

اذا سرتك حسنتك وساءتك سيئتك فانت مومن۔

یعنی نیک کام کرکے تیرے دل میں مسرت ہو اور بُرا کام کرکے دل بُرا ہو تو تُو مومن ہے۔

اب ہم کم سے کم اپنے ایمان قلبی کو کہ جس کا معلوم کرنا جاننے والے جانتے ہیں کہ کس قدر دشوار ہے اسی کسوٹی پر کھینچ کر دیکھ لیں کہ کھرا ہے یا کھوٹا اور کسی امر میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور اُس کی عبادت کرنے سے ہم کو مسرت ہوتی یا نہیں اور ہوتی تو کس قدر، علیٰ ہذا القیاس گناہ کرکے ہمارا دل بُرا ہوا یا نہیں اور ہوا تو کس قدر، جس کے ذریعہ سے ہم اپنے ایمان کی قوت وضعف وجود وعدم کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اور اِسی ارشاد سے ہماری سمجھ میں بخوبی یہ بھی آگیا کہ اگر کوئی ایسا ہو کہ عبادت اور نیک کام کرکے بجائے مسرت اُس کے دل میں تنگی اور کدورت اور بُرائی پیدا ہو اور بُرا کام کرکے دل میں انشراح اور مسرت وخوشی پیدا ہو یا کوئی شخص ایسا ہو کہ کسی عبادت خاص مثل صوم وصلوٰۃ وحج وزکوٰۃ سے اُس کے دل میں نعوذ باللہ اس قدر تنفر اور وحشت ہے کہ کسی حال اُس کے کرنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اُس کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا تو ایسے شخصوں کو کیا سمجھنا چاہیے اور ہم کیا ہر منصف فہیم بذریعہ ارشاد مذکور اُس کا حکم سمجھ سکتا ہے۔

اور اِس ارشاد مذکورہ کی حقیقت سمجھنا چاہو تو یہی ہے جو بالتفصیل معلوم ہو چکی۔ یعنی جو شخص نیک کام کرکے مسرور اور بُرا کام کرکے مکدر ومغموم ہوتا ہے اُس شخص کی رغبت ومیلان فطرتی یعنی صفت امانت معلوم ہو گیا کہ صحیح ہے جس پر ایمان کا مدار ہے اور جو شخص طاعت سے مکدر اور معصیت سے مسرور ہوتا ہے معلوم ہو گیا کہ اُس کی رغبت اور میلان قلبی یعنی امانت فاسد ہو چکی ہے اور لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ کا مصداق بن چکا ہے۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہاں سے بشرط تدبر وانصاف ہم کو یہ بات خوب دل نشین ہو گئی کہ بہت سے وہ احکام جسدی جو لباس وطعام، رفتار وگفتار، عادات واوضاع، نشست وبرخاست کے متعلق ہیں اور اہلِ اسلام بکثرت اُن امور کو ایک حقیر بات سمجھ کر اُن میں خلاف حکم شریعت کے اصلا پروا نہیں کرتے اُن میں دو امر قابلِ لحاظ ہیں:

ایک تو خلاف حکم شریعت کرنا یہ جس درجہ کا گناہ ہو۔

دوسرے امر مخالف شرع کا استحسان اور اُس پر مسرت۔ یہ نہایت سنگین جرم ہے جس کا ذکر ابھی گزرا۔ مثلاً ٹخنے

سے نیچے پاجامہ پہننا یا داڑھی منڈوانا یہ ایک گناہ ہے مگر ان امور کو کر کے دل میں مسرت ہونی اور ان کے خلاف یعنی شریعت کی موافقت کو کراہیت اور ناگواری کی نظر سے دیکھنا یہ نہایت خوفناک امر ہے جو فساد رغبت یعنی نقصان امانت کی دلیل ہے جس سے اجتناب کل سب پر لازم اور ضروری ہے یا فرض کیجئے کہ کسی کے دل میں نماز یا حج یا کسی اور امر شرعی کے کرنے کا کوئی تقاضا اور اہتمام نہیں اور نہ حکم و تاکید خداوندی کا خیال ہے مگر دبے دبائے شرما شرمائے یا اپنی کسی نفسانی منفعت یا کسی دنیاوی مصلحت کی وجہ سے اُس کام کو اپنے ارادہ سے ادا کر لیا تو اب غور کرنا چاہیئے کہ اُس طاعت مفروضہ کو ادا کر کے اُس کے دل میں کیا کیفیت پیدا ہوئی اگر خدانخواستہ کسی قسم کی کراہیت و نفرت یا انقباض و کدورت پیدا ہوئی تو یہ اس قدر ردی علامت اور سخت امر ہے کہ حقیقت میں اُس فرض کے ترک کرنے کا جرم بھی بہت گھٹا ہوا ہے اور اگر اُس فعل کو ادا کر کے مسرت اور استحسان دل میں آیا تو ارشاد فرمودہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہو گیا کہ اُس شخص کے دل میں بحمداللہ مضمون ایمان اب تلک موجود ہے۔ گو ایک عظیم معصیت یعنی ترک فرض خداوندی میں مبتلا ہے یعنی فاسق ہے کافر نہیں فاعتبروا یا اولی الابصار، والحذر الحذر۔

المرام ہم پر اوّل فرض یہی ہے کہ علمِ وحی اور صفتِ امانت کو اُن طریقوں سے کہ جن کا ذکر ہو چکا ہے حاصل کریں اور اُس کی ترقی میں کوشش کرنے سے نہ رُکیں اور اپنی تمام عبادات و معاملات کی باگ اُن کے ہاتھ میں دے دیں اور تاوقتیکہ ہمارے یہ دونوں جزو پورے نہ ہوں گے ہم کو اپنی درستی مذہب اور اصلاحِ دین و ایمان کی توقع ایک خیال خام سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی دنیاوی ثروت و وجاہت حکومت و عزّت کسی قسم کا کمال یا دولت ان امور سے ہرگز تحصیل ایمان اور ترقی اسلام ممکن نہیں ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بترکستان ست

ہرچند زمانہ غلبہ جہل و ضلالت کا ہے اور فتنہ اپنا سکہ اکثر قلوب پر ایسا جما چکا ہے کہ کوئی خوش قسمت ہی اس موجِ طوفاں خیز سے نکل سکے تو نکل سکے مگر حق تعالےٰ کا فضل و رحمت نہ کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے نہ کسی مکان کے ساتھ نہ کسی جماعت خاص میں منحصر ہے نہ کسی ملک میں۔ اُس کا دروازۂ رحمت ہر وقت اور ہر کسی کے لیے رات دن کھلا ہوا ہے اور بآوازِ بلند یہ کہا جا رہا ہے:

؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و رند و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

التَّائبِ مِنَ الذَّنبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ کا اعلان چار سو عام جو اِس کا مصداق بن سکے سُبْحَانَ اللہ توبہ سے کوئی مانع کوئی اُس سے خارج نہیں کسی قسم کی تنگی نہیں ادھر اسباب علم وامانت برابر موجود ہیں پھر دیر کیا ہے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ۔ وَاللہ ولی التوفیق وما تشاءون الّا ان یشاء اللہ ۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ؕ

خطبہ حجۃ الوداع

ترجمہ: حکیم محمد نعیم الدین زبیری

عربی / اردو

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْحَجِّ أَتَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَفَةَ فَنَزَلَ بِهَا حَتَّى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي فَخَطَبَ النَّاسَ خُطْبَتَهُ الَّتِي بَيَّنَ فِيهَا مَا بَيَّنَ

حج کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ تشریف لائے اور آپؐ نے وہاں قیام فرمایا۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو آپؐ نے قصواء (اپنی اونٹنی) کو لانے کا حکم فرمایا۔ اونٹنی تیار کر کے حاضر کی گئی، تو آپؐ (اس پر سوار ہو کر) بطنِ وادی میں تشریف فرما ہوئے اور اپنا وہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں دین کے اہم امور بیان فرمائے۔

فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ قَائِلًا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَحَزَبَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ

آپ نے خدا کی حمد و ثنا کرتے ہوئے خطبے کی یوں ابتدا فرمائی: خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے کوئی اس کا ساجھی نہیں، خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اس نے اپنے بندے (رسول) کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوتوں کو زیر کیا۔

أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوا قَوْلِي فَإِنِّي لَا أَرَانِي وَإِيَّاكُمْ أَنْ نَجْتَمِعَ فِي هٰذَا الْمَجْلِسِ أَبَدًا بَعْدَ عَامِي هٰذَا

لوگو! میری بات سنو، میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی ہم اس طرح کسی مجلس میں یکجا ہو سکیں گے (اور غالباً اس سال کے بعد میں حج نہ کر سکوں گا)

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللهَ يَقُولُ "يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ" فَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَبْيَضَ وَلَا لِأَبْيَضَ عَلَى أَسْوَدَ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوٰى

لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت و کرامت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے"۔ چناں چہ اس آیت کی روشنی میں نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی

معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔

اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ اَلَا كُلُّ مَاْثُرَةٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ يُدَّعٰى بِهٖ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سَدَانَةُ الْبَيْتِ وَسِقَايَةُ الْحَاجِّ ثُمَّ قَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ لَا تَجِيْئُوْا بِالدُّنْيَا تَحْمِلُوْنَهَا عَلٰى رِقَابِكُمْ وَيَجِيْئُ النَّاسُ بِالْاٰخِرَةِ فَلَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا

انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔ بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات علیٰ حالہٖ باقی رہیں گی پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا، قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں، اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔"

مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ اِلٰى اَنْ تَلْقَوْا رَبَّكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَكَحُرْمَةِ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا۔ وَاِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْئَلُكُمْ عَنْ اَعْمَالِكُمْ۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا۔ اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسی تمہارے اس دن کی اور اس ماہِ مبارک (ذی الحجہ) کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ ضُلَّالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔

دیکھو کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس ہی میں کشت و خون کرنے لگو۔

فَمَنْ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَانَةٌ فَلْيُؤَدِّهَا اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَهٗ عَلَيْهَا۔

اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے۔

اَيُّهَا النَّاسُ! كُلُّ مُسْلِمٍ اَخُو الْمُسْلِمِ وَاِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ اَرِقَّاءَكُمْ اَرِقَّاءَكُمْ اَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَاكْسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو، انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ

دورِ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں سے روند دیا۔

مَوْضُوْعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَإِنَّ أَوَّلَ دَمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيْعَةَ ابْنِ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضَعًا فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ فَقَتَلَهُ هُذَيْلٌ - وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَأَوَّلُ رِبًا أَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَإِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ۔

زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دُودھ پیتے بیٹے کا خُون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔ دورِ جاہلیت کا سُود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سُود جسے میں چھوڑتا ہُوں، عباس بن عبد المطلب کے خاندان کا سُود ہے، اب یہ ختم ہوگیا۔

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ

لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق خود دے دیا۔ اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیت نہ کرے۔

اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

بچہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا پتھر ہے، حساب و کتاب خدا کے ہاں ہوگا۔

مَنِ ادَّعٰى إِلٰى غَيْرِ أَبِيْهِ أَوْ تَوَلّٰى إِلٰى غَيْرِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ

جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا، اس پر خدا کی لعنت۔

اَلدَّيْنُ مَقْضِيٌّ وَالْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَةٌ وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ

قرض قابلِ ادائی ہے۔ عاریتاً لی ہُوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔

وَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِنْ أَخِيْهِ إِلَّا مَا أَعْطَاهُ عَنْ طِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ فَلَا تَظْلِمُنَّ أَنْفُسَكُمْ

کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے، خود پر اور ایک دُوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

أَلَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تُعْطِيَ مِنْ مَالِ زَوْجِهَا شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِهِ

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی بغیر اجازت کسی کو دے۔

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُوْنَهٗ وَعَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ فَإِنْ فَعَلْنَ فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذِنَ لَكُمْ أَنْ تَهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَأَنْ تَضْرِبُوْا ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَإِنْ

دیکھو! تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح اُن پر تمہارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی خیانت نہ کریں تا کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے

انْتَهَيْنَ فَلَهُنَّ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

کہ تم انھیں معمولی جسمانی سزا دو اور وہ باز آجائیں تو انھیں اچھی طرح کھلاؤ پہناؤ۔

وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ عَوَانٍ لَكُمْ لَا يَمْلِكْنَ لِأَنْفُسِهِنَّ شَيْئًا فَاتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَاتِ اللهِ

عورتوں سے بہتر سلوک کرو، کیونکہ وہ تو تمھاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ چناں چہ ان کے بارے میں خدا کا لحاظ رکھو کہ تم نے انھیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کے نام پر وہ تمھارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو! میری بات سمجھ لو، میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا۔

وَإِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابَ اللهِ وَإِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ

میں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے اگر اس پر قائم رہے، اور وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور ہاں دیکھو دینی معاملات میں غُلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ انھی باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے۔

وَإِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ مِنْ أَنْ يُعْبَدَ فِي أَرْضِكُمْ هٰذِهِ أَبَدًا وَلٰكِنْ سَتَكُونُ لَهُ طَاعَةٌ فِيمَا تُحَقِّرُونَ مِنْ أَعْمَالِكُمْ فَيَرْضَى بِهِ فَاحْذَرُوهُ عَلَى دِينِكُمْ

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی، لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنھیں تم کم اہمیت دیتے ہو اس کی بات مان لی جائے۔ اور وہ اسی پر راضی ہے، اسی لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔

أَلَا فَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَصَلُّوا خَمْسَكُمْ وَصُومُوا شَهْرَكُمْ وَأَدُّوا زَكٰوةَ أَمْوَالِكُمْ طَيِّبَةً بِهَا أَنْفُسُكُمْ وَتَحُجُّوا بَيْتَ رَبِّكُمْ وَأَطِيعُوا وُلَاةَ أَمْرِكُمْ تَدْخُلُوا جَنَّةَ رَبِّكُمْ

لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ مہینے بھر کے روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ دیتے رہو، اپنے خدا کے گھر کا حج کرو اور اپنے اہلِ امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

أَلَا لَا يَجْنِي جَانٍ إِلَّا عَلَى نَفْسِهِ أَلَا لَا يَجْنِي جَانٍ عَلَى وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ عَلَى وَالِدِهِ

اب مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمے دار ہوگا اور اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا، نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

أَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ

سنو، جو لوگ یہاں موجود ہیں انھیں چاہیے کہ یہ احکام اور یہ باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔

وَأَنْتُمْ تُسْأَلُونَ عَنِّي فَمَاذَا أَنْتُمْ قَائِلُونَ

اور لوگو! تم سے میرے بارے میں (خدا کے ہاں)

قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ قَدْ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَنَصَحْتَ

سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟
لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ نے امانت (دین) پہنچا دی اور آپ نے حقِ رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا اِلَى السَّمَاۤءِ وَيَنْكُتُهَا اِلَى النَّاسِ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا، "خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا!"

قصیدۂ بردہ شریف

حضرت شیخ امام محمد شرف الدین البُوصیری رح

فارسی ترجمہ : حضرت مُلا محمد عبدالرحمٰن جامی

اُردو ترجمہ : محمد فیاض الدین نظامی بہزاد دکن

۱ اَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمِ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرٰى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

اے زیادِ صحبتِ یاران اندر ذی سلم
اشکِ چشم آمیختی با خوں رواں گشتہ بہم

کیا تمھیں یاد آ گئے ہمسایگانِ ذی سلم
خوں کے آنسو جو آنکھوں سے رواں ہیں دمبدم

۲ اَمْ هَبَّتِ الرِّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ
اَوْ اَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ اِضَمِ

یا مگر از کاظمہ بادے وزید از کوئے دوست
یا مگر در نیم شب برقے جہیدہ از اضم

یا صبا لائی ہے سمتِ کاظمہ سے اک پیام
یا ہوا بجلی سے روشن رات میں کوہِ اضم

۳ فَمَا لِعَيْنَيْكَ اِنْ قُلْتَ اكْفُفَا هَمَتَا
وَمَا لِقَلْبِكَ اِنْ قُلْتَ اسْتَفِقْ يَهِمِ

چیست چشمت را چہ گوئی خشک شو گریاں شود
چیست دل گوئی بہوش آ شیفتہ گردد ز غم

کیا ہوا آنکھوں کو تیری رو رہی ہیں زار زار
کیا ہوا دل کو ترے کیوں اس قدر کھاتا ہے غم

۴ اَيَحْسَبُ الصَّبُّ اَنَّ الْحُبَّ مُنْكَتِمٌ
مَا بَيْنَ مُنْسَجِمٍ مِنْهُ وَمُضْطَرِمِ

اے تو پنداری کہ عشقِ عاشقاں پنہاں شود
با وجودِ آتشِ دل سوز و آبِ چشمِ نم

ہے عبث تیرا گماں چھپتا نہیں ہے رازِ عشق
اس کو افشا کر رہے ہیں سوزِ دل اور چشمِ نم

۵ لَوْلَا الْهَوٰى لَمْ تُرِقْ دَمْعًا عَلٰى طَلَلٍ
وَلَا اَرِقْتَ لِذِكْرِ الْبَانِ وَالْعَلَمِ

گر نہ بودے عشق اشکت بر طلل کے ریختی
کے بدے بے خواب چشمت از غمِ بان و علم

یوں نہ ویرانوں پہ روتا گر نہ ہوتا سوزِ عشق
مضطرب کرتے نہ تجھ کو قصۂ بان و علم

۶ فَكَيْفَ تُنْكِرُ حُبًّا بَعْدَمَا شَهِدَتْ
بِهٖ عَلَيْكَ عُدُولُ الدَّمْعِ وَالسَّقَمِ

چوں کنی انکارِ عشقش چوں گواہی میدہند
بر تو اشکِ چشم دیگر زردیِ روئے سقم

عشق سے انکار کرنا تیرا ممکن ہی نہیں
ہیں گواہِ معتبر صورت تری اور چشمِ نم

۷ وَأَثْبَتَ الوَجْدُ خَطَّيْ عَبْرَةٍ وَضَنًى
مِثْلَ البَهَارِ عَلَى خَدَّيْكَ وَالعَنَمِ

عشق ثابت کرد بر رو خطِّ اشک و لاغری
چوں بہار روئے یار سرخیِ شاخِ عنم

خطِ عشق اور لاغری نے عشق ثابت کر دیا
زرد رخساروں پہ گویا سرخیِ شاخِ عنم

۸ نَعَمْ سَرَى طَيْفُ مَنْ أَهْوَى فَأَرَّقَنِي
وَالحُبُّ يَعْتَرِضُ اللَّذَّاتِ بِالأَلَمِ

چوں خیالِ دلبرم آمد مرا بے خواب کرد
عشق آرد در میانِ خرمی رنج و الم

ہاں خیالِ یار نے مجھ کو جگایا رات بھر
لذتوں کو کر دیا ہے عشق نے رنج و الم

۹ يَا لَائِمِي فِي الهَوَى العُذْرِيِّ مَعْذِرَةً
مِنِّي إِلَيْكَ وَلَوْ أَنْصَفْتَ لَمْ تَلُمِ

اے کہ در عشقم ملامت میکنی معذور دار
گر ترا انصاف باشد عذر آری از کرم

ناصحا تو عشق میں کر معذرت میری قبول
ہے اگر انصاف تجھ میں کر نہ مجھ پر یہ ستم

۱۰ عَدَتْكَ حَالِيَ لَا سِرِّي بِمُسْتَتِرٍ
عَنِ الوُشَاةِ وَلَا دَائِي بِمُنْحَسِمِ

حالِ من وز تو گزشتہ سرِ من از دشمناں
نیست پنہاں درد من زائل نہ گشتہ از دلم

اب تو واقف ہو چکے اغیار بھی تیرے سوا
درد میرا ہو نہیں سکتا کسی صورت سے کم

۱۱ مَحَّضْتَنِي النُّصْحَ لَكِنْ لَسْتُ أَسْمَعُهُ
إِنَّ المُحِبَّ عَنِ العُذَّالِ فِي صَمَمِ

تو نصیحت میکنی نیکو و من می نشنوم
عاشقاں باشند دایم از ملامت در صمم

تھی نصیحت خوب لیکن اس کو سنتا کس طرح
ناصحا عاشق کے حق میں ہے سماعت کالعدم

۱۲ إِنِّي اتَّهَمْتُ نَصِيحَ الشَّيْبِ فِي عَذَلِي
وَالشَّيْبُ أَبْعَدُ فِي نُصْحٍ عَنِ التُّهَمِ

شیب پندم داد و من بردم گمان بد برد
گرچہ شیب اندر نصیحت دور باشد از تہم

تھی ضعیفی کی نصیحت پھر بھی دل بدظن ہوا
گو نصیحت میں ضعیفی ہے بہت دور از تہم

۱۳ فَإِنَّ أَمَّارَتِي بِالسُّوءِ مَا اتَّعَظَتْ
مِنْ جَهْلِهَا بِنَذِيرِ الشَّيْبِ وَالهَرَمِ

نفس فرماں دہ بہ بدہا میکند دیم خراب
وز جہالت پند نہ پذیرد ز پیری و ہرم

نفس امارہ نے نادانی سے کچھ پروا نہ کی
یوں تو پیری کی نصیحت تھی نہایت محترم

۱۴ وَلَا أَعَدَّتْ مِنَ الفِعْلِ الجَمِيلِ قِرَى
ضَيْفٍ أَلَمَّ بِرَأْسِي غَيْرَ مُحْتَشِمِ

ہم نہ کرد او کارِ نیکو بہرِ مہمانیِ او
بر سرم آمد فرود از من نگشتہ محتشم

نیکیوں سے میں نے اس مہماں کی خاطر نہ کی
آن پہنچی جب ضعیفی سر پہ میرے ایک دم

۱۵ لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنِّيْ مَا أُوَقِّرُهٗ
كَتَمْتُ سِرًّا بَدَا لِيْ مِنْهُ بِالْكَتَمِ

گر بدانستم کہ مہماں را نمیدارم عزیز
کردمی تغییر اسفیدیٔ مویم از کتم
کاش میں پہچانتا توقیر اس مہمان کی
پس چھپا لیتا سفیدی سر کی از رنگِ کتم

۱۶ مَنْ لِّيْ بِرَدِّ جِمَاحٍ مِّنْ غَوَايَتِهَا
كَمَا يُرَدُّ جِمَاحُ الْخَيْلِ بِاللُّجُمِ

نفسِ سرکش را ز بے راہی کہ می آرد براہ
چوں لگامے اسپِ سرکش آورد از راہ ہم
کون ہے جو نفسِ سرکش کو مرے یوں پھیر دے
روکتے ہیں جیسے گھوڑوں کو لگاموں سے بہم

۱۷ فَلَا تَرُمْ بِالْمَعَاصِيْ كَسْرَ شَهْوَتِهَا
إِنَّ الطَّعَامَ يُقَوِّيْ شَهْوَةَ النَّهِمِ

پس مجو بر فعلِ عصیاں کسرِ شہوتہائے نفس
زانکہ قوت میدہد شہوت طعام اندر شکم
نفس کی خواہش گناہوں سے نہیں ہوتی ہے دُور
جس طرح جوع البقر میں پُر نہیں ہوتا شکم

۱۸ وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلٰى
حُبِّ الرَّضَاعِ وَإِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

نفس چوں طفل است گر شیرش دہی دائم خورد
ورنہ شیرش باز داری او نہ خواہد ہیچ دم
نفس کی ہیں عادتیں مانندِ طفلِ شیر خوار
دُودھ پیتا جائے گا جب تک چھڑائیں گے نہ ہم

۱۹ فَاصْرِفْ هَوَاهَا وَحَاذِرْ أَنْ تُوَلِّيَهٗ
إِنَّ الْهَوٰى مَا تَوَلّٰى يُصْمِ أَوْ يَصِمِ

باز گیرش از ہوا بر خود ہوا حاکم مکن
چوں ہوا حاکم شود دینت بشد یا گشت کم
خواہشوں کو روک ہرگز نفس کا تابع نہ ہو
تا نہ کر دے ختم یا پھر عیب والا کم سے کم

۲۰ وَرَاعِهَا وَهِيَ فِي الْأَعْمَالِ سَائِمَةٌ
وَإِنْ هِيَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعٰى فَلَا تُسِمِ

نفس را مقہور کن چوں در عمل جولاں کنی
در چریدن انس گیرد باز دارش از ستم
باز رکھ حسنِ عمل کو لذتِ تشہیر سے
اس چراگاہِ ہوس سے دُور رکھ اپنا قدم

۲۱ كَمْ حَسَّنَتْ لَذَّةً لِّلْمَرْءِ قَاتِلَةً
مِّنْ حَيْثُ لَمْ يَدْرِ أَنَّ السَّمَّ فِي الدَّسَمِ

لذتے کاں با مضرت باشد آراید بخلق
آں چناں کو در نیا بداں کہ زہر اندر دسم
لذتیں جتنی غذا کی زہرِ قاتل تھیں مگر
کھانے والے نے نہ جانا اس میں پوشیدہ ہے سم

۲۲ وَاخْشَ الدَّسَائِسَ مِنْ جُوْعٍ وَّمِنْ شِبَعٍ
فَرُبَّ مَخْمَصَةٍ شَرٌّ مِّنَ التُّخَمِ

تو بترس از حیلہ ہائے نفس چوں جوع و شبع
گاہ باشد گشنگی بدتر ز سیری و تخم
مکر سے کر خوف اُن کے شکم سیری ہو کہ بھوک
آفتیں خالی شکم کی کچھ نہیں سیری سے کم

۲۳ وَاسْتَفْرِغِ الدَّمْعَ مِنْ عَيْنٍ قَدِ امْتَلَأَتْ
مِنَ الْمَحَارِمِ وَالْزَمْ حِمْيَةَ النَّدَمِ

پس ببار از دیدگان اشکے کہ چشمت پُر شدہ
از محارم پس ملازم شو بدرگاہِ ندم
ان گناہوں کو جو آنکھوں میں بسے ہیں دُور کر
ہو پشیماں اور بہا اشکِ ندامت دمبدم

۲۴ وَخَالِفِ النَّفْسَ وَالشَّيْطَانَ وَاعْصِهِمَا
وَإِنْ هُمَا مَحَضَاكَ النُّصْحَ فَاتَّهِمِ

برخلافِ نفس و شیطاں باش فرمانش مبر
ور نصیحت میکنندت قولِ شاں داں متہم
نفس و شیطاں کا مخالف بن نہ مان ان کا کہا
اُن کی اچھی بھی نصیحت جھوٹ ہے کیا کچھ ہے کم

۲۵ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْمًا وَّلَا حَكَمًا
فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الْخَصْمِ وَالْحَكَمِ

ترک کن فرمانِ ایشاں خصم باشد یا حکم
زاں کہ میدانی تو مکرِ خصم و ہم مکرِ حکم
تو نہ کر اُن کی اطاعت ہوں یہ حاکم یا عدو
جانتا ہے خُوب تو مکرِ عدو و مکرِ حکم

۲۶ أَسْتَغْفِرُ اللهَ مِنْ قَوْلٍ بِلَا عَمَلٍ
لَقَدْ نَسَبْتُ بِهِ نَسْلًا لِذِي عُقُمِ

میکنم استغفر اللہ از کلامِ بے عمل
بچہ میخواہم ازاں زن گو بود صاحب عقم
مجھ کو قولِ بے عمل سے توبہ کرنی چاہیے
گویا بانجھ عورت سے امیدِ نسل رکھتے ہیں ہم

۲۷ أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ لٰكِنْ مَا ائْتَمَرْتُ بِهِ
وَمَا اسْتَقَمْتُ فَمَا قَوْلِي لَكَ اسْتَقِمِ

امر کردم من بہ خیرت خود نہ کردم ہیچ خیر
راستی در دیں نہ کردم پس چہ سُود از گفتنم
کی نصیحت دوسروں کو اور رہیں خود بے عمل
ہو نصیحت کا اثر کیا بے عمل جب خود ہیں ہم

۲۸ وَلَا تَزَوَّدْتُ قَبْلَ الْمَوْتِ نَافِلَةً
وَلَمْ أُصَلِّ سِوٰى فَرْضٍ وَّلَمْ أَصُمِ

توشۂ ہرگز نہ کردم بہرِ زادِ آخرت
وز نماز و روزہ جز فرضے نیامد در تنم
زادِ راہِ آخرت اک نفل کا بھی تو نہیں
جُز نمازِ فرض و روزہ کچھ نہیں رکھتے ہیں ہم

۲۹ ظَلَمْتُ سُنَّةَ مَنْ أَحْيَى الظَّلَامَ إِلٰى
أَنِ اشْتَكَتْ قَدَمَاهُ الضُّرَّ مِنْ وَّرَمِ

من ستم کردم بسے بر سنّتِ خیر الرسلؐ
آں کہ از احیائے شبہا پائے وے کردے وَرم
سُنّتِ بیداریِ شب پر کیا میں نے ستم
طاعتِ شب کے سبب جن کے قدموں پر ورم

۳۰ وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ أَحْشَاءَهُ وَطَوٰى
تَحْتَ الْحِجَارَةِ كَشْحًا مُّتْرَفَ الْأَدَمِ

سنگ بستے بر شکم آں نازنیں از گُشنگی
صَرف کردے در رہِ حق جملہ دینار و درم
بھوک کی شدت کے باعث اور فاقوں کے سبب
آپ نے پتھر سے باندھا ناز پروردہ شکم

۳۱ وَرَاوَدَتْهُ الْجِبَالُ الشُّمُّ مِنْ ذَهَبٍ
عَنْ نَفْسِهٖ فَاَرَاهَا اَيَّمَا شَمَمِ
کوہ از زر کرد خود را عرض تا گردد قبول
روئے گردانید ازاں زر مصطفیٰ خیر الشیم
زر کے بن کر جب پہاڑ آئے کہ مائل ہوں حضورؐ
کچھ توجہ تک کی تھے آپؐ وہ عالی ہمم

۳۲ وَاَكَّدَتْ زُهْدَهٗ فِيْهَا ضَرُوْرَتُهٗ
اِنَّ الضَّرُوْرَةَ لَا تَعْدُوْ عَلَى الْعِصَمِ
با ضرورت ہا کہ بودش میل بر دنیا نہ کرد
از ضرورت خستہ نہ بود آنکہ او راست از حرم
ایسی حاجت پر بھی تقویٰ کو کیا مضبوط تر
سچ ہے حاجت غالب آسکتی نہیں جب ہو عصم

۳۳ وَكَيْفَ تَدْعُوْ اِلَى الدُّنْيَا ضَرُوْرَةُ مَنْ
لَوْلَاهُ لَمْ تَخْرُجِ الدُّنْيَا مِنَ الْعَدَمِ
چوں تواند خواند بر دنیا ضرورت زاں کہ گر
نامدے دنیا گہے بیروں نگشتے از عدم
کیا کرے مائل ضرورت ان کو دنیا کی طرف
گر نہ ہوتے آپؐ تو دنیا بھی ہوتی کالعدم

۳۴ مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ
وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ
آں محمدؐ سید کونین فخر انس و جاں
بہتر اہلِ دو عالم مہترِ عرب و عجم
ہیں محمدؐ سیدِ کونین شاہِ جن و انس
اور شہنشاہِ دو عالم مالکِ عرب و عجم

۳۵ نَبِيُّنَا الْاٰمِرُ النَّاهِيْ فَلَا اَحَدٌ
اَبَرَّ فِيْ قَوْلِ لَا مِنْهُ وَلَا نَعَمِ
آمر و ناہی پیمبر آں رسولِؐ راست گو
راست گو تر زو نہ بد در قولِ 'لا' و در 'نعم'
امر و ناہی کے پیمبر ہیں نہیں ان کا جواب
ہیں نہایت صاف گو وہ قول لا ہو یا نعم

۳۶ هُوَ الْحَبِيْبُ الَّذِيْ تُرْجٰى شَفَاعَتُهٗ
لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحِمِ
آں حبیبؐ کو بود امید گاہِ مردماں
در شفاعت نزد سختیہائے پیچیدہ بہم
وہ حبیبؐ ایسے ہیں جن سے ہے شفاعت کی امید
ہوں گی نازل آفتیں پیش آئیں گے جب رنج و غم

۳۷ دَعَا اِلَى اللّٰهِ فَالْمُسْتَمْسِكُوْنَ بِهٖ
مُسْتَمْسِكُوْنَ بِحَبْلٍ غَيْرِ مُنْفَصِمِ
مرد را خواند بحق و ہر کہ روئے دست زد
دست زد در حبلِ محکم کاں بریدہ نشندم
دعوتِ حق آپؐ نے دی اور کیا جس نے قبول
اس نے ایسی ڈور تھامی جو نہ ہو گی منفصم

۳۸ فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِيْ خَلْقٍ وَّفِيْ خُلُقٍ
وَّلَمْ يُدَانُوْهُ فِيْ عِلْمٍ وَّلَا كَرَمِ
بہتر پیغمبراں در خَلق و در خُلق آمدہ
کس چو او نامد نہ در علم و نہ در وصفِ کرم
سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے خَلق میں اور خُلق میں
انبیاؑ میں سب سے اکمل آپؐ کا علم و کرم

۳۹ وَكُلُّهُمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ
غَرْفًا مِّنَ الْبَحْرِ اَوْ رَشْفًا مِّنَ الدِّيَمِ

ملتمس از وے ہمہ از انبیاؑ و از رسل
یک کف از دریائے علم و شربتے ز ابر کرم

انبیاؑ سب ملتمس ہیں تاکہ مل جائے انھیں
ایک جرعہ بحر سے یا قطرہ از ابر کرم

۴۰ وَوَاقِفُوْنَ لَدَيْهِ عِنْدَ حَدِّهِمِ
مِنْ نُقْطَةِ الْعِلْمِ اَوْ مِنْ شَكْلَةِ الْحِكَمِ

نزدِ او استادہ جملہ ہر یکے در حدِ خویش
نقطۂ از علم دارد یا نصیبے از حِکَم

اپنے حدِ مرتبہ پر سب کھڑے ہیں رُو برو
جیسے نقطہ لفظ میں اعراب لفظوں میں ہم

۴۱ فَهُوَ الَّذِيْ تَمَّ مَعْنَاهُ وَصُوْرَتُهُ
ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِيْبًا بَارِئُ النَّسَمِ

از خلائق او بود در صورت و معنی تمام
برگزیدش در محبت خالق روح و نسم

صورت و سیرت میں ہیں سرکارؐ عالی مرتبت
اس لیے اُن کو کیا حق نے حبیبِ محترم

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيْكٍ فِيْ مَحَاسِنِهِ
۴۲ فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ

او منزہ از شریک اندر محاسن آمدہ
جوہر حسنِ محمدؐ پارہ نامد در قسم

کوئی عالم میں نہیں ان کا محاسن میں شریک
حسن میں جوہر ہے یکتا جو نہ ہو گا منقسم

۴۳ دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمِ
وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

آنچہ ترسایاں بگفتند در حقِ عیسیٰ مگو
پس بگو در حقِ سید آنچہ خواہی در حکم

جو نصاریٰ نے کہا عیسیٰ کے حق میں تو نہ کہہ
جس قدر ممکن ہو کر مدحِ نبیؐ محترم

۴۴ وَانْسُبْ اِلٰى ذَاتِهِ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ
وَانْسُبْ اِلٰى قَدْرِهِ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ

نسبت اندر ذاتِ او کن ہر چہ خواہی از شرف
نسبت اندر قدر او کن ہر چہ خواہی از عِظَم

جو شرف ہو ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کر
جتنی عظمت چاہیے کر شانِ والا میں رقم

۴۵ فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَيْسَ لَهُ
حَدٌّ فَيُعْرِبُ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمِ

فضل و جاہِ مصطفیٰؐ حدے ندارد در کمال
تا تواند کرد شخصے روشن آں را بیش و کم

حد نہیں ہے کوئی حضرتؐ کے کمال و فضل کی
ہو بیاں کس مُنہ سے توصیفِ شہِ خیر الامم

۴۶ لَوْ نَاسَبَتْ قَدْرَهُ اٰيَاتُهُ عِظَمًا
اَحْيَى اسْمُهُ حِيْنَ يُدْعٰى دَارِسَ الرِّمَمِ

در خورِ قدرِ بزرگش گر نمودے معجزاست
یادِ نامش زندہ کردے استخوانہائے رمم

اُن کی عظمت کے برابر معجزے ہوتے اگر
ہوتے زندہ نام سے سب استخواں ہائے رمم

۴۷ لَمْ يَمْتَحِنَّا بِمَا تَعْيَى الْعُقُولُ بِهِ
حِرْصًا عَلَيْنَا فَلَمْ نَرْتَبْ وَلَمْ نَهِمِ

انچہ او فرمود عقل از فہم آں عاجز نہ شد
بر صلاحِ ما حریص ست بے گمان و بے نہم

بازرکھا امتحاں سے جس سے عاجز ہو سمجھ
مہربانی کی نہ بچتے یوں گماں و شک سے ہم

۴۸ اَعْيَى الْوَرٰى فَهْمُ مَعْنَاهُ فَلَيْسَ يُرٰى
لِلْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْفَحِمِ

عاقلاں از فہمِ معنیِ محمّد عاجز اند
اہلِ عالم جملہ در وصفش کشیدستند دم

سِرِّ باطن کی حقیقت نے کیا خلقت کو دنگ
دُور سے نزدیک سے بس فہم بھی ہے منفحم

۴۹ كَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَيْنَيْنِ مِنْ بُعُدٍ
صَغِيْرَةً وَّتُكِلُّ الطَّرْفَ مِنْ اَمَمِ

مثلِ خورشید است شانش گر بود کوچک ز دور
در برابر چشم ہائے مردم انداز دبہم

وہ ہیں مثلِ شمس جو ظاہر ہو چھوٹا دور سے
اور آنکھیں قرب سے ہوتی ہیں خیرہ ایک دم

۵۰ وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيْقَتَهٗ
قَوْمٌ نِيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

چوں بداند شس حقیقت اہلِ عالم چوں بود
مست خواب و دیدنش در خواب داند مغتنم

اہلِ دنیا کس طرح ان کی حقیقت پا سکے
خوابِ غفلت میں ہیں گویا قوم خوابیدہ ہیں ہم

۵۱ فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِيْهِ اَنَّهٗ بَشَرٌ
وَّاَنَّهٗ خَيْرُ خَلْقِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ

مبلغِ معلومِ مردم آنکہ سیّد آدمی ست
بہترینِ مردماں باشد رسولِ محتشم

انتہائے علم کہتی ہے وہ ہیں خیر البشر
جملہ مخلوقات میں رکھتے ہیں وہ شانِ اتم

۵۲ وَكُلُّ اٰيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا
فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُّوْرِهٖ بِهِمِ

ہر چہ آوردند مجموعِ رسل از معجزات
آں ز نورِ مصطفٰے آمد بایشاں لاجرم

جو رسولانِ جلیل القدر کے تھے معجزے
آپ ہی کے نور سے پایا تھا سب نے یہ کرم

۵۳ فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا
يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

او بود خورشیدِ فضل و دیگراں سیارگاں
روشنی سیارگاں ظاہر کنند اندر ظلم

آفتابِ فضل ہیں وہ سب ستارے انبیا
کرتے ہیں ظلمت میں ظاہر سب پہ انوارِ کرم

۵۴ حَتّٰى اِذَا طَلَعَتْ فِي الْكَوْنِ عَمَّ هُدَا
هَا الْعٰلَمِيْنَ وَاَحْيَتْ سَائِرَ الْاُمَمِ

پیشوائے خلقِ عالم شد چوں آمد در وجود
چوں عدم پوشیدہ شد از نورِ او جملہ امم

ہو گیا خورشید طالع اور ہوا روشن جہاں
آپ کے نورِ ہدایت سے ہوئیں زندہ امم

۵۵ اَکْرِمْ بِخَلْقِ نَبِیٍّ زَانَہٗ خُلُقٌ
بِالْحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالْبِشْرِ مُتَّسِمِ

خلقِ پیغمبر نکو بر خلقِ خوشش آراستہ
مشتمل بر حُسن باشد بر بشارت متسم

کیا عظیم الخلق صورت ہے مزیّن خلق سے
حُسنِ صورت مشتمل ہے خندہ روئی سے بہم

۵۶ کَالزَّہْرِ فِیْ تَرَفٍ وَّالْبَدْرِ فِیْ شَرَفٍ
وَّالْبَحْرِ فِیْ کَرَمٍ وَّالدَّہْرِ فِیْ ہِمَمِ

چوں بہار از تازگی بدہم چوں بدر اندر شرف
ہمچوں دریا در کرم چوں روزگار اندر ہمم

تازگی میں ہیں وہ غنچہ اور شرف میں مثلِ بدر
دہر میں ہمّت میں اور بخشش میں دریائے کرم

۵۷ کَاَنَّہٗ وَہُوَ فَرْدٌ مِّنْ جَلَالَتِہٖ
فِیْ عَسْکَرٍ حِیْنَ تَلْقَاہُ وَفِیْ حَشَمِ

گر کسے بیندش تنہا خود ہمی پنداشتے
کز بزرگی اوست اندر لشکر و خیل و حشم

ہیں جلال و رعب میں سرکارِ عالی بے نظیر
جیسے گرد و پیش رکھتا ہے کوئی فوج و حشم

۵۸ کَاَنَّمَا اللُّؤْلُؤُ الْمَکْنُوْنُ فِیْ صَدَفٍ
مِنْ مَّعْدَنَیْ مَنْطِقٍ مِّنْہُ وَمُبْتَسَمِ

دُرِّ مکنوں در صدف دندانِ او بد گوئیا
واں دہن گویا کہ می افشاند مروارید ہم

ہیں وہ دندانِ مبارک مثلِ موتی سیپ میں
معدنِ نطق و تبسم ہے وہ دہنِ محترم

۵۹ لَا طِیْبَ یَعْدِلُ تُرْبًا ضَمَّ اَعْظُمَہٗ
طُوْبٰی لِمُنْتَشِقٍ مِّنْہُ وَمُلْتَثِمِ

ہیچ بوئے خوش چو بوئے خوابگاہِ او نہ بود
نیک بخت آنکس کہ بوئیدست و بوسیدست ہم

ہے وہ خوش قسمت جو سونگھے اور بوسہ دے اسے
اے خوشا خوشبوئے خاکِ تربتِ شاہِ اُمم

۶۰ اَبَانَ مَوْلِدُہٗ عَنْ طِیْبِ عُنْصُرِہٖ
یَا طِیْبَ مُبْتَدَاٍ مِّنْہُ وَّمُخْتَتَمِ

وقتِ زادن پاکیِ ذاتِ شریفش شد پدید
پاک بودش مبتدا و پاک بودش مختتم

اُن کی پیدائش سے ساری خوبیاں ظاہر ہوئیں
پاک اُن کی ابتدا اور پاک اُن کا مختتم

۶۱ یَوْمٌ تَفَرَّسَ فِیْہِ الْفُرْسُ اَنَّہُمْ
قَدْ اُنْذِرُوْا بِحُلُوْلِ الْبُؤْسِ وَالنِّقَمِ

اہلِ فرس آں روز دانستند کایشاں را نمود
بعد ازیں درد و بلا و خواری و رنج و نقم

اہلِ فارس کو ولادت کی خبر جب مل گئی
ہو گئے دہشت زدہ اور چھا گیا رنج و الم

۶۲ وَبَاتَ اِیْوَانُ کِسْرٰی وَہُوَ مُنْصَدِعٌ
کَشَمْلِ اَصْحَابِ کِسْرٰی غَیْرَ مُلْتَئِمِ

طاقِ کسریٰ شد خراب و کنگرِ کسریٰ شکست
در شکست احوالِ کفار و دگر نامد بہم

قصرِ کسریٰ گر پڑا اور پارہ پارہ ہو گیا
اور پراگندہ ہوئے کسریٰ کے ساتھی ایک دم

۶۳ وَالنَّارُ خَامِدَةُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ
عَلَيْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِي الْعَيْنِ مِنْ سَدَمِ

آتشِ گبراں بمرد از حزن و اندوہ و ملال
چشمۂ آبِ رواں شد خشک در جوئے سدم
آتشِ فارس نے ٹھنڈی سانس لی افسوس سے
نہر بھی چشموں کو بھولی از رہِ اندوہ و غم

۶۴ وَسَاءَ سَاوَةَ اَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا
وَرُدَّ وَارِدُهَا بِالْغَيْظِ حِيْنَ ظَمِي

ساوہ غمگیں شد چو گشتش آبِ دریاچہ خشک
تشنگاں زو باز گشتند جملگی در درد و غم
اہلِ ساوہ تھے پریشاں خشک چشمے دیکھ کر
لوٹتے تھے گھاٹ سے غصے میں پیاسے پُر اَلَم

۶۵ كَاَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بَلَلٍ
حُزْنًا وَّبِالْمَاءِ مَا بِالنَّارِ مِنْ ضَرَمِ

گوئیا بر جائے آتش آب بودے سرد و تر
از غم و بر جائے آب آتش بدے سوزان و گرم
پانی سی ہوگئی تھی آگ مارے رنج کے
اور پانی ہوگیا تھا آتشیں از سوز و غم

۶۶ وَالْجِنُّ تَهْتِفُ وَالْاَنْوَارُ سَاطِعَةٌ
وَالْحَقُّ يَظْهَرُ مِنْ مَّعْنًى وَّمِنْ كَلِمِ

لشکرِ شیطاں فغاں کردہ ز اندوہِ تمام
نورِ حق تاباں ز معنیٰ و کلم شد دمبدم
کی فغاں جنات نے انوار بھی چمکے ادھر
نورِ حق روشن ہوا الفاظ و معنیٰ سے بہم

۶۷ عَمُوْا وَصَمُّوْا فَاِعْلَانُ الْبَشَائِرِ لَمْ
تُسْمَعْ وَبَارِقَةُ الْاِنْذَارِ لَمْ تُشَمِ

کور و کر گشتند نشنیدند بشارت از خدا
ہم ندیدند برقِ بیم از غایتِ رنج و الم
اندھے اور بہرے تھے سنتے کس طرح خوشخبریاں
بلکہ خوفِ برق بھی ان کو نہ تھا از رنج و غم

۶۸ مِنْ بَعْدِ مَا اَخْبَرَ الْاَقْوَامَ كَاهِنُهُمْ
بِاَنَّ دِيْنَهُمُ الْمُعْوَجَّ لَمْ يَقُمِ

پس ازاں کاخبار ایشاں کردہ بودند کاہناں
آنکہ دینِ شاں کژست و نیست خواہد گشت ہم
دی خبر اقوام کے سب کاہنوں نے بعد ازاں
دین اُن کے ہوگئے باطل ہوئے سب کالعدم

۶۹ وَبَعْدَ مَا عَايَنُوْا فِي الْاُفُقِ مِنْ شُهُبٍ
مُنْقَضَّةٍ وَّفْقَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ صَنَمِ

دیدہ بودند ز آسماں آتش بزیر افتادہ بود
در زمیں ہم سرنگوں از خواری افتادہ صنم
بعد ازاں یُوں ٹوٹتے تاروں کو دیکھا چرخ سے
اور منہ کے بل گرے سب سرنگوں ہو کر صنم

۷۰ حَتّٰى غَدَا عَنْ طَرِيْقِ الْوَحْيِ مُنْهَزِمٌ
مِنَ الشَّيَاطِيْنِ يَقْفُوْا اِثْرَ مُنْهَزِمِ

از طریقِ وحی دیوان جملہ آوارہ شدند
دل شکستہ از پئے ہم میرسیدند از ہزم
بھاگتے تھے راستے سے وحی کے شیطان یوں
ایک پیچھے دوسرے کے سر پہ رکھ اپنا قدم

۷۱ كَأَنَّهُمْ هَرَبًا أَبْطَالُ أَبْرَهَةٍ
أَوْ عَسْكَرٌ بِالْحَصٰى مِنْ رَّاحَتَيْهِ رُمِيْ

چوں دلیرانِ یمن بودند گویا در گریز
یا چوں آں لشکر کہ از خاکِ کفش گشتند گم
تھا وہ لشکر ابرہہ کا یا پراگندہ سی فوج
سنگریزے جن پہ پھینکے تھے بدستِ شاہِ اُمم

۷۲ نَبْذًا بِهٖ بَعْدَ تَسْبِيْحٍ بِبَطْنِهِمَا
نَبْذَ الْمُسَبِّحِ مِنْ أَحْشَاءِ مُلْتَقِمِ

اوفگندہ از پئے تسبیح در دستِ رسولؐ
مثلِ تسبیحے کہ یونسؑ را بیفگند از شکم
لے کے نام اللہ کا پھینکا جو کنکر آپؐ نے
حضرتِ یونسؑ کو اگلا جیسے ماہی کا شکم

۷۳ جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْأَشْجَارُ سَاجِدَةً
تَمْشِيْ إِلَيْهِ عَلٰى سَاقٍ بِلَا قَدَمِ

ہم درخت آمد بفرمانش بہ نزد و سجدہ کرد
می دویدے سوئے او دائم بساقِ بے قدم
ہو کے مسجود آپؐ کی دعوت پہ اشجار آ گئے
پیڑ سے چلتے ہوئے رکھتے نہ تھے گو وہ قدم

۷۴ كَأَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا كَتَبَتْ
فُرُوْعُهَا مِنْ بَدِيْعِ الْخَطِّ فِي اللَّقَمِ

گوئیا خطے کہ کردند شاخہا بر ہر درخت
می نوشتندے خطِ نیکو عجب اندر رقم
ان درختوں نے لکیریں خوب کھینچیں اور لکھا
ڈالیوں سے اپنی وسطِ راہ میں با پیچ و خم

۷۵ مِثْلَ الْغَمَامَةِ أَنّٰى سَارَ سَائِرَةً
تَقِيْهِ حَرَّ وَطِيْسٍ لِلْهَجِيْرِ حَمِيْ

ابر بودے بر سرش تا او برفتے بر کجا
تا نگاہش داشت از گرمائے تابستانِ گرم
ابر کے مانند وہ سایہ فگن تھے آپؐ پر
تا بچائے گرم موسم کی حرارت سے بہم

۷۶ أَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ الْمُنْشَقِّ إِنَّ لَهٗ
مِنْ قَلْبِهٖ نِسْبَةً مَبْرُوْرَةَ الْقَسَمِ

میخورم سوگند بہر ماہے کہ منشق شد ازو
نسبتے دارد ز قلبش زاں درست آمد قسم
قلبِ پاکِ مصطفٰے سے چاند کو نسبت ہے خاص
ماہِ منشق کی قسم کھاتا ہوں میں سچی قسم

۷۷ وَمَا حَوَى الْغَارُ مِنْ خَيْرٍ وَّمِنْ كَرَمٍ
وَكُلُّ طَرْفٍ مِّنَ الْكُفَّارِ عَنْهُ عَمِيْ

جمع کردہ غار خیرات و کرامت با بسے
با محمدؐ چشم کا فر گشت زیں شاں کور ہم
کیا نظر آتا انھیں کفار تھے سب کور چشم
غار میں جو ہو گئے تھے جمع با خیر و کرم

۷۸ فَالصِّدْقُ فِي الْغَارِ وَالصِّدِّيْقُ لَمْ يَرِمَا
وَهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا بِالْغَارِ مِنْ أَرِمِ

صدق و صدیق اند در غار و کس ایشاں را ندید
کافراں گفتند کس اینجا نہ باشد منکتم
صدق اور صدیقِ اکبر غار ہی میں تھے چھپے
غار میں کوئی نہیں کفار کہتے تھے بہم

۷۹ ظَنُّوا الْحَمَامَ وَظَنُّوا الْعَنْكَبُوْتَ عَلٰى
خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لَمْ تَنْسُجْ وَلَمْ تَحُمِ
تخم بنہادہ کبوتر بُد بہ بافتِ عنکبوت
کافراں را شد گماں کانجا نیاسودہ نسم
دیکھ کر انڈے کبوتر کے اُدھر مکڑی کا جال
تھا گماں کفار کو اس میں نہیں شاہِ امم

۸۰ وِقَايَةُ اللّٰهِ اَغْنَتْ عَنْ مُضَاعَفَةٍ
مِنَ الدُّرُوْعِ وَعَنْ عَالٍ مِّنَ الْاُطُمِ
چوں خدا اورا ز مکرِ دشمناں محفوظ داشت
بر زرہ حاجت نبودش و بحصن و قلعہ ہم
کی حفاظت آپ کی ایسی خدائے پاک نے
زرہ اور قلعوں سے مستغنی ہوئے شاہِ امم

۸۱ مَا سَامَنِى الدَّهْرُ ضَيْمًا وَّاسْتَجَرْتُ بِهٖ
اِلَّا وَنِلْتُ جِوَارًا مِّنْهُ لَمْ يُضَمِ
رنج اگر دیدم ز دہر و خواستم از وے اماں
در جوارِ او خلوص از ہر بلائے یافتم
جب زمانے نے ستایا میں نے لی اُن کی پناہ
جب ملی اُن کی مدد بس دُور تھا سب رنج و غم

۸۲ وَلَا الْتَمَسْتُ غِنَى الدَّارَيْنِ مِنْ يَّدِهٖ
اِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰى مِنْ خَيْرِ مُسْتَلَمِ
ہر چہ کردم التماس از نعمتِ ہر دو سرا
یافتم بر وجہ بہتر آنچہ از وے خواستم
دستِ اقدس سے طلب کی دین و دنیا جب کبھی
سرفرازی ہوگئی جب مل گیا دستِ کرم

۸۳ لَا تُنْكِرِ الْوَحْىَ مِنْ رُّؤْيَاهُ اِنَّ لَهٗ
قَلْبًا اِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ
پس مکن انکار وحی از خواب پیغمبر از انک
چشمش ار در خواب رفتی دل بُدش بیدار ہم
اس وحی کا تو نہ منکر ہو جو آئے خواب میں
آنکھیں سوتی تھیں مگر رہتا تھا دل بیدار ہم

۸۴ فَذَاكَ حِيْنَ بُلُوْغٍ مِّنْ نُّبُوَّتِهٖ
فَلَيْسَ يُنْكَرُ فِيْهِ حَالُ مُحْتَلِمِ
وحی در خواب اولِ پیغمبری بودی ورا
خوابِ او منکر مشو تو مثلِ خوابِ محتلم
تھا وہ معراجِ نبوت کا زمانہ آپ کے
پس نہ کر انکار ہرگز مثلِ خوابِ محتلم

۸۵ تَبَارَكَ اللّٰهُ مَا وَحْىٌ بِمُكْتَسَبٍ
وَّلَا نَبِىٌّ عَلٰى غَيْبٍ بِمُتَّهَمِ
پس بزرگ است آں خدا و وحیِ او کسبے نہ بود
ہم رسولِ او نہ بُد بر علمِ غیبش متہم
بارک اللہ سعی سے حاصل نہیں ہوتی وحی
اور نہ علمِ غیب پر کوئی نبی رہے متہم

۸۶ كَمْ اَبْرَاَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهٗ
وَاَطْلَقَتْ اَرِبًا مِّنْ رِّبْقَةِ اللَّمَمِ
بس کساں را او شفا داد وے بمالیدن بدست
وا رہانیدے بسے دیوانگاں را از لمم
جب چھوا دستِ مبارک ہوگئی کامل شفا
اور رہا پائی جنوں سے اکثروں نے از کرم

۸۷ وَأَحْيَتِ السَّنَةَ الشَّهْبَاءَ دَعْوَتُهُ
حَتّٰى حَكَتْ غُرَّةً فِي الْأَعْصُرِ الدُّهُمِ

دعوتِ او قحط و تنگی از جہاں برداشتہ
تا چو رو اسپید بودی در سیاہی و نسم

خشک سالی کی سفیدی ہو گئی کافور سب
اک دعا نے آپؐ کی برسا دیا ابرِ کرم

۸۸ بِعَارِضٍ جَادَ أَوْ خِلْتَ الْبِطَاحَ بِهَا
سَيْبًا مِّنَ الْيَمِّ أَوْ سَيْلًا مِّنَ الْعَرِمِ

بر دعائش آمدے بارانؐ وادی پُرشدے
گوئیا دریا بُدے یا گوئیا سیلِ عَرِم

ہوگئی کثرت سے بارش ندیاں بہنے لگیں
مَوج دریا کی نظر آتی تھی سیلابِ عَرِم

۸۹ دَعْنِي وَوَصْفِي آيَاتٍ لَّهُ ظَهَرَتْ
ظُهُورَ نَارِ الْقِرٰى لَيْلًا عَلٰى عَلَمِ

گوش کن تا معجزش گویم کہ آں روشن بود
ہمچوں آتش در شبِ تاریک بر فرقِ عَلَم

چھوڑ دے مجھ کو بیاں کرنے نبیؐ کے معجزات
جو ہے شب میں مثلِ مہمانی کی آگ اوپر عَلَم

۹۰ فَالدُّرُّ يَزْدَادُ حُسْنًا وَّهُوَ مُنْتَظِمٌ
وَلَيْسَ يَنْقُصُ قَدْرًا غَيْرَ مُنْتَظِمِ

دُر اگر در رشتہ باشد حُسنِ او زاید بُود
ورنہ در رشتہ بود قدرش نہ گردد ہیچ کم

حُسن ہوتا ہے دو بالا موتیوں کا ہار میں
یا لڑی سے بھی جدا کر دو نہ ہوگی قدر کم

۹۱ فَمَا تَطَاوَلَ آمَالُ الْمَدِيحِ إِلٰى
مَا فِيهِ مِنْ كَرَمِ الْأَخْلَاقِ وَالشِّيَمِ

ہر چہ کاں گوید مدیحِ مصطفیٰؐ بسیار نیست
کو مزیّن بُد بہ خُلقِ نیک و احسان و شیم

اِس لیے مدّاح ہیں توصیف میں عاجز تمام
فہمِ انساں سے ہیں بالا ان کے اخلاق و شیم

۹۲ آيَاتُ حَقٍّ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَةٌ
قَدِيمَةٌ صِفَةُ الْمَوْصُوفِ بِالْقِدَمِ

آیہ ہائے حق کہ از رحمٰں فرود آمد بہ تو
آں قدیم است و بود وصفش بموصوفِ قدم

مصحفِ رحمٰن کی سب آیتیں ہیں لاجواب
ہے صفت اس کی قدیم اور ہے وہ موصوفِ قدم

۹۳ لَمْ تَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَّهِيَ تُخْبِرُنَا
عَنِ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَّعَنْ إِرَمِ

مقترن نامد بوقتے دائماً ثابت بداں
او خبر داد از معاد و حشر و ز عاد و ارم

ہر زمانہ سے بری ہیں اور سناتی ہیں ہمیں
عاقبت کا حال بھی اور قصۂ عاد و ارم

۹۴ دَامَتْ لَدَيْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ
مِنَ النَّبِيِّينَ إِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

نزد ما باقی بماند بہتر از ہر معجزات
معجزِ پیغمبراں باقی نہ ماندہ در امم

معجزہ قرآں کا برتر رہے گا تا ابد
اس کے آگے معجزاتِ انبیاؑ ہیں کالعدم

۹۵ مُحْكَمَاتٌ فَمَا يُبْقِينَ مِنْ شُبَهٍ
لِذِي شِقَاقٍ وَلَا يَبْغِينَ مِنْ حَكَمِ

محکم است آیاتِ قرآں شبۂ کس را نماند
وز ہمہ الفاظ از و تاباں بُود نورِ حکم

ہیں وہ مستحکم مخالف کو نہیں اس میں جگہ
شبہ و شک کی اس لیے ہیں وہ بجائے خود حکم

۹۶ مَا حُورِبَتْ قَطُّ إِلَّا عَادَ مِنْ حَرَبٍ
أَعْدَى الْأَعَادِي إِلَيْهَا مُلْقِيَ السَّلَمِ

ہر کہ با قرآں بہ جنگ آمد بآخر باز گشت
آں کہ دشمن تر بدے نزدش بیفگندے سلم

جو لڑا قرآں سے آخر وہ عاجز آ گیا
کر دیا دشمن نے بھی اپنا سرِ تسلیم خم

۹۷ رَدَّتْ بَلَاغَتُهَا دَعْوَى مُعَارِضِهَا
رَدَّ الْغَيُورِ يَدَ الْجَانِي عَنِ الْحُرَمِ

از بلاغت دعوئے جملہ معارض کرد رد
چوں غیورے کو کند رد دست جانے از حرم

اس نے سب اپنی بلاغت سے کیا دعووں کو ختم
جیسے ہوں محفوظ غیرت مند کے اہلِ حرم

۹۸ لَهَا مَعَانٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ فِي مَدَدٍ
وَفَوْقَ جَوْهَرِهِ فِي الْحُسْنِ وَالْقِيَمِ

معنیِ بسیار ہمچوں موجِ دریا دارد آں
بہتر است از دُرِّ دریا جملہ در حُسن و قیم

ہے معانی آیتوں کے مثلِ دریا موجزن
گوہرِ دریا سے بہتر ان کا ہے حسن قیم

۹۹ فَمَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصَى عَجَائِبُهَا
وَلَا تُسَامُ عَلَى الْإِكْثَارِ بِالسَّأَمِ

پس عجائب اندران وکس نہ تواند شمرد
وز چہ بسیاری بخواند کس نہ بیند شوق کم

جو عجائب ان میں پوشیدہ ہیں ان کا کیا شمار
خواہ کثرت سے پڑھو ہو گا نہ اس کا شوق کم

۱۰۰ قَرَّتْ بِهَا عَيْنُ قَارِيهَا فَقُلْتُ لَهُ
لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللّٰهِ فَاعْتَصِمِ

چشم خوانندہ بداں روشن شود من گفتمش
یافتی حبلِ خدا محکم بگیر اے معتصم

ہو گئیں آنکھیں جو ٹھنڈی میں نے قاری سے کہا
تھام حبل اللہ کو ہے فتح تیری معتصم

۱۰۱ إِنْ تَتْلُهَا خِيفَةً مِنْ حَرِّ نَارِ لَظَى
أَطْفَأْتَ حَرَّ لَظَى مِنْ وِرْدِهَا الشَّبِمِ

گر بخوانیش ز ترسِ آتشِ دوزخ کنی
سرد بر خود گرمیِ آتش براں من ضامنم

آتشِ دوزخ کے ڈر سے تو اگر ان کو پڑھے
شعلۂ نارِ جہنم اس سے ہو جائے گا کم

۱۰۲ كَأَنَّهَا الْحَوْضُ تَبْيَضُّ الْوُجُوهُ بِهِ
مِنَ الْعُصَاةِ وَقَدْ جَاءُوهُ كَالْحُمَمِ

آں چو حوضے واں کہ دارد روئے خوانندہ سفید
گرچہ عاصی آمدست و روسیہ ہمچوں حمم

ہیں وہ مثلِ حوضِ کوثر جس سے ہوتی ہیں سفید
عاصیوں کی صورتیں جو تھیں سیاہ مثلِ حمم

۱۰۳ وَكَالصِّرَاطِ وَكَالْمِيزَانِ مَعْدِلَةً
فَالْقِسْطُ مِنْ غَيْرِهَا فِي النَّاسِ لَمْ يَقُمِ

چوں صراط است آں چوں میزاں بود در راستی
راستی از غیر آنہا کس ندیدہ بیش و کم
ہیں ترازو عدل کی اور راستی کے ہیں صراط
ہے بغیر ان کے قیام انصاف کا بس کالعدم

۱۰۴ لَا تَعْجَبَنْ لِحَسُودٍ رَاحَ يُنْكِرُهَا
تَجَاهُلًا وَهُوَ عَيْنُ الْحَاذِقِ الْفَهِمِ

گر حسود انکار آں کردہ مدار آں را عجب
کو تجاہل کردہ ورنہ نیک کرد است آں فہم
مت تعجب کر تو حاسد پر جسے انکار سے
ہے تجاہل اس کا گرچہ ہے وہ پکا ذی فہم

۱۰۵ قَدْ تُنْكِرُ الْعَيْنُ ضَوْءَ الشَّمْسِ مِنْ رَمَدٍ
وَيُنْكِرُ الْفَمُ طَعْمَ الْمَاءِ مِنْ سَقَمِ

گر گہے چشم از رمد منکر شود خورشید را
ہم دہن منکر شود طعمِ خوشِ آب از سقم
روشنی سورج کی کیونکر دیکھتی بیمار آنکھ
ذائقہ کیا آبِ شیریں کا ملے جب ہو سقم

۱۰۶ يَا خَيْرَ مَنْ يَمَّمَ الْعَافُونَ سَاحَتَهُ
سَعْيًا وَفَوْقَ مُتُونِ الْأَيْنُقِ الرُّسُمِ

اے مہینِ آں کہ مردم قصدِ درگاہش کنند
پا پیادہ یا بہ پشتِ اشتراں باد دم
اے شہِ والا ترے دربار میں آتے ہیں سب
پا پیادہ اور سوارِ اشتراں تازہ دم

۱۰۷ وَمَنْ هُوَ الْآيَةُ الْكُبْرٰى لِمُعْتَبِرٍ
وَمَنْ هُوَ النِّعْمَةُ الْعُظْمٰى لِمُغْتَنِمِ

اے کہ ہستی آیتِ کبریٰ کہ باشد معتبر
اے کہ ہستی نعمتِ عظمیٰ کہ باشد مغتنم
ہیں وہ برتر اور ذی شان معتبر کے واسطے
اور وہ ہیں نعمتِ عظمیٰ برائے مغتنم

۱۰۸ سَرَيْتَ مِنْ حَرَمٍ لَيْلًا إِلٰى حَرَمٍ
كَمَا سَرَى الْبَدْرُ فِي دَاجٍ مِنَ الظُّلَمِ

در شبے رفتی ز مکہ تا باقصیٰ شریف
چوں کہ ماہِ چار دہ گردد رواں اندر ظلم
بدرِ کامل جس طرح سے رات میں کرتا ہے سیر
مکہ سے اقصیٰ گئے معراج میں شاہِ امم

۱۰۹ وَبِتَّ تَرْقٰى إِلٰى أَنْ نِلْتَ مَنْزِلَةً
مِنْ قَابَ قَوْسَيْنِ لَمْ تُدْرَكْ وَلَمْ تُرَمِ

بر شدی بالا وگشتہ قاب قوسینت مقام
واں نہ دیدست و نہ بیند ہیچ کس در ہیچ دم
طے کیے سارے مدارج اور ملا ایسا مقام
ہے پرے اور اک سے اور قاب قوسین سے نہ کم

۱۱۰ وَقَدَّمَتْكَ جَمِيعُ الْأَنْبِيَاءِ بِهَا
وَالرُّسُلِ تَقْدِيمَ مَخْدُومٍ عَلٰى خَدَمِ

انبیاء و مرسلینت پیشوا کردند دراں
ہمچوں مخدومے کہ گردد پیشوا اندر خدم
مسجدِ اقصیٰ میں بن کر انبیاءؑ کے پیشوا
آپ تھے مخدوم باقی انبیاءؑ سب تھے خدم

۱۱۱ وَاَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ
فِیْ مَوْکِبٍ کُنْتَ فِیْهِ صَاحِبَ الْعَلَمِ

ز آسمان ہا بر گزشتی بر جمیعِ انبیاءؑ
در گروہ کاندر ایشاں تو بدی صاحب عَلَم

طے کیا سات آسمانوں کا سفر با انبیاءؑ
ساتھ افواجِ ملائک کے تھے باشان و حشم

۱۱۲ حَتّٰی اِذَا لَمْ تَدَعْ شَاْوًا لِّمُسْتَبِقٍ
مِنَ الدُّنُوِّ وَلَا مَرْقًی لِّمُسْتَنِمِ

زیفتے از قرب بہرِ ہیچ کس نگذاشتے
جائے بالاتر نہ ہشتی دیگراں را در قدم

مرتبہ باقی نہ رکھا بڑھنے والوں کے لیے
ہر بلند و پست پر تھا آپؐ کا فیض قدم

۱۱۳ خَفَضْتَ کُلَّ مَقَامٍ بِالْاِضَافَةِ اِذْ
نُوْدِیْتَ بِالرَّفْعِ مِثْلَ الْمُفْرَدِ الْعَلَمِ

پست کردی پیشِ قربت ہر مقامِ دیگراں
چوں تُرا بُردند بالا وندراں گشتی عَلَم

کر دیے پست آپؐ نے سب کے مدارج اور مقام
جب ہوئے مدعو بلندی پر یگانہ باحشم

۱۱۴ کَیْمَا تَفُوْزَ بِوَصْلٍ اَیِّ مُسْتَتِرٍ
عَنِ الْعُیُوْنِ وَسِرٍّ اَیِّ مُکْتَتِمِ

تا مقامِ وصل پنہاں یافتی از چشمِ خلق
سِرِّ پنہانی بدانستے ز اوصافِ قدم

تاکہ ہوں اسرارِ پوشیدہ سے واقف بعدِ وصل
حق نے ظاہر کر دیے سب راز از فضل و کرم

۱۱۵ فَحُزْتَ کُلَّ فَخَارٍ غَیْرَ مُشْتَرَكٍ
وَجُزْتَ کُلَّ مَقَامٍ غَیْرَ مُزْدَحَمِ

جمع کردی ہر بزرگی کاں نبودہ مشترک
بر شدی از ہر مقامے کاں نبودی مزدحم

ہر بزرگی غیر شرکت جمع کر لی آپؐ نے
طے کیے سب مرتبوں کو آپؐ غیر مزدحم

۱۱۶ وَجَلَّ مِقْدَارُ مَا وُلِّیْتَ مِنْ رُّتَبٍ
وَعَزَّ اِدْرَاكُ مَا اُوْلِیْتَ مِنْ نِّعَمِ

بس بزرگ است آنچہ دادندت ز فضلِ مرتبت
بس عزیز ست آنچہ بخشیدت خداوند از نعم

ہیں عظیم الشان رُتبے جو ملے سرکار کو
ہیں پرے ادراک سے جو کچھ ہوئے حاصل نعم

۱۱۷ بُشْرٰی لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا
مِنَ الْعِنَایَةِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْهَدِمِ

مژدگانی باد مارا اے مسلماناں کہ ماں
از عنایت ہست رکنے کاں بود دُور از ہدم

اے مسلمانو! یہ خوشخبری ہے اپنے واسطے
اک ستون ایسا ملا مضبوط از فضل و کرم

۱۱۸ لَمَّا دَعَا اللّٰهُ دَاعِیْنَا لِطَاعَتِهٖ
بِاَکْرَمِ الرُّسْلِ کُنَّا اَکْرَمَ الْاُمَمِ

چوں خدا مارا بطاعت خواند بفرستاد داد
بہترِ پیغمبراں گشتیم ما خیر الامم

جبکہ ان کو حق نے خود خیر الرسل فرما دیا
طاعتِ حق کے سبب ہم ہو گئے خیر الامم

۱۱۹ رَاعَتْ قُلُوْبَ الْعِدٰى اَنْبَاءُ بِعْثَتِهٖ
كَنَبْأَةٍ اَجْفَلَتْ غُفْلًا مِّنَ الْغَنَمِ

دشمناں را دل بہ ترسانید اخبارِ رسولؐ
ہمچوں آوازے کہ ناگہ بر جہانید سے غنم

سُن کے بعثت کی خبر تھرا گئے اعدا کے دل
شیر کی آواز سے جیسے ڈرے غافل غنم

۱۲۰ مَا زَالَ يَلْقَاهُمْ فِيْ كُلِّ مُعْتَرَكٍ
حَتّٰى حَكَوْا بِالْقَنَا لَحْمًا عَلٰى وَضَمِ

چوں بہ جنگِ دشمناں رفتے بدے در جنگ گاہ
آں بدنہا بر سرِ نیزہ چو لحم اندر وضم

جنگ کے میدان میں کفّار کی حالت نہ پوچھ
جسم تھے نیزوں پہ ان کے جیسے کندوں پر لحم

۱۲۱ وَدُّوا الْفِرَارَ فَكَادُوْا يَغْبِطُوْنَ بِهٖ
اَشْلَاءَ شَالَتْ مَعَ الْعِقْبَانِ وَالرَّخَمِ

آرزوِ شاں بُد گریز و غبطہ بُردندے بر آں
عضوہائے شاں پریدے با عقابؔ با رخم

جنگ کی دہشت سے ان کو بھاگنا منظور تھا
آرزو رکھتے تھے کھالیں چیل و گدھ ان کا لحم

۱۲۲ تَمْضِي اللَّيَالِيْ وَلَا يَدْرُوْنَ عِدَّتَهَا
مَا لَمْ تَكُنْ مِّنْ لَّيَالِي الْاَشْهُرِ الْحُرُمِ

پس شبے بگزشتؔ آں را کس نہ دانستے عدد
در غزا ہا چوں نہ بُودے از شبِ ماہِ حُرم

ڈر کے مارے یوں گزر جاتی تھیں راتیں بےشمار
ہاں سوا راتوں کے جن کے ہیں مہینے محترم

۱۲۳ كَاَنَّمَا الدِّيْنُ ضَيْفٌ حَلَّ سَاحَتَهُمْ
بِكُلِّ قَرْمٍ اِلٰى لَحْمِ الْعِدٰى قَرِمِ

گوئیا دیں بود مہمانی کہ او آمد فرود
بر سرائے آں کہ بد مشتاقِ لحمِ دشمنم

لشکرِ اسلام تھا مہمان اُن کے صحن میں
چاہتا تھا ہر نفس مل جائے دشمن کا لحم

۱۲۴ يَجُرُّ بَحْرَ خَمِيْسٍ فَوْقَ سَابِحَةٍ
يَرْمِيْ بِمَوْجٍ مِّنَ الْاَبْطَالِ مُلْتَطِمِ

میکشیدے بحرِ لشکر جملہ بر اسپاں سوار
موج میزد از دلیرانے کہ رفتندے بہم

تیز رو گھوڑوں پہ تھا وہ لشکرِ دریا مثال
جنگ کے میدان میں موجیں لگا تا دمبدم

۱۲۵ مِنْ كُلِّ مُنْتَدِبٍ لِّلّٰهِ مُحْتَسِبٍ
يَسْطُوْ بِمُسْتَأْصِلٍ لِّلْكُفْرِ مُصْطَلِمِ

جملہ از بہرِ خدا در کار بودند و غزا
بیخِ کفر از بُن بکندند نیست کردند آں شیم

اجر کی امید والے دعوتِ حق کے مرید
کفر کی بنیاد کو کرتے تھے بالکل کالعدم

۱۲۶ حَتّٰى غَدَتْ مِلَّةُ الْاِسْلَامِ وَهِيَ بِهِمْ
مِنْ بَعْدِ غُرْبَتِهَا مَوْصُوْلَةُ الرَّحِمِ

تا قوی شد ملّتِ اسلام از سعیِ ہمہ
دیں در اوّل بد غریب و شد در آخر محترم

دینِ حق یوں ان کے دم سے آخرش ظاہر ہوا
مل گئے بچھڑے ہوئے اور ہو گئی غربت بھی کم

۱۲۷ مَكفُولَةً أبدًا منهم بخيرِ أبٍ
وخيرِ بعلٍ فلم تيتمْ ولم تئمِ

دیں از ایشاں یافت بہتر شوہر و بہتر پدر
زاں نشد در بیوگی و ہم نماند اندر یتیم
جیسے مل جائے کسی کو نیک شوہر اور پدر
بیوگی کا اور یتیمی کا اسے پھر کیا ہو غم

۱۲۸ هُمُ الجبالُ فسلْ عنهم مصادمهم
ماذا رأى منهم في كلِّ مصطدمِ

کوہ ہا بودند ازاں کو در نبرد آمد بپرس
تا بگویند آنچہ دیدستند از ایشاں در صدم
تھے وہ مثلِ کوہ پوچھو دشمنوں سے اُن کا حال
کچھ اگر دیکھا ہے اُن کو شاملِ جنگ و صدم

۱۲۹ فسلْ حُنينًا وسلْ بدرًا وسلْ أُحُدًا
فُصُولَ حتفٍ لهم أدهى من الوخمِ

از حُنین و بدر دیگر از اُحد مکن سوال
تا بخوانند فصلہائے مرگِ ادہی از وخم
پُوچھ لو بدر و حُنین و اُحد سے بھی ان کا حال
موت کے اقسام ہر گز تھے وبا سے کچھ نہ کم

۱۳۰ المُصدري البيضِ حُمرًا بعد ما وردتْ
من العدى كلَّ مسودٍّ من اللممِ

سُرخ کردندے بخونِ دشمناں شمشیر را
چوں فرو شد در سیاہی ہر سرِ مُو از لمم
یوں سپیدی سُرخ روئی سے بدل جاتی تھی سب
زخم کھا کر جب ہوا کرتے تھے اُن کے سر قلم

۱۳۱ والكاتبين بسمرِ الخطِّ ما تركتْ
أقلامُهم حرفَ جسمٍ غيرَ منعجمِ

می نوشتندے بہ نیزہ خطِ سرخی بر بدن
حرف جسمے بے نقطہ نہ نوشتہ بودے از قلم
دشمنوں کے جسم کو بے زخم چھوڑا ہی نہیں
کارفرما اس طرح تھے ان کے نیزوں کے قلم

۱۳۲ شاكي السلاحِ لهم سيما تميّزهم
والوردُ يمتازُ بالسيما من السلمِ

آں کماں سنجاں کہ سیما شاں بریں ممتاز بود
گل برنگ و بوئے خود ممتاز گردد از سلم
گو مسلح تھے مگر رکھتے تھے سجدے کے نشاں
تھے صحابہؓ مثلِ گل کفار مانندِ سلم

۱۳۳ تُهدي إليك رياحُ النصرِ نشرَهمُ
فتحسبُ الزهرَ في الأكمامِ كلَّ كمي

میرساند بادِ نصرت بر تو بوئے سعیِ شاں
چوں بہار اندر سرِ غنچہ بود ثابت قدم
بوئے نصرت جب صبا لائے تو یہ سمجھے گا تو
مثلِ غنچوں کے غلافوں میں تھے وہ عالی ہمم

۱۳۴ كأنّهم في ظهورِ الخيلِ نبتُ رُبًا
من شدّةِ الحزمِ لا من شدّةِ الحُزُمِ

گوئیا بر پشتِ اسپاں چوں درختِ پشتہ کوہ
ز استواری بود در زین نہ ز کثرت در نسم
تھے وہ گھوڑوں پر سوار ایسے کہ ٹیلوں پر درخت
زین کی پروا نہ تھی اُن شہسواروں کو بہم

۱۳۵ طَارَتْ قُلُوْبُ الْعِدٰى مِنْ بَاْسِهِمْ فَرَقًا
فَمَا تُفَرِّقُ بَيْنَ الْبَهْمِ وَ الْبُهَمِ

لرزہ بر دلہائے کفار او فتاد از ترسِ شاں
چارپائے و آدمی نشناختند از ترس و غم
ہوش غائب تھے عدو کے سختیوں سے جنگ کی
فرق کر سکتے نہیں تھے سُورما ہے یا غنم

۱۳۶ وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ نُصْرَتُهٗ
اِنْ تَلْقَهُ الْاُسْدُ فِيْ اٰجَامِهَا تَجِمِ

ہر کہ او را از رسول اللہ نصرت آمدہ
شیر اگر پیشِ رسد از ترسِ او آید بہم
ہو مدد جس کو رسولِ سیدِ لولاک کی
شیر بھی ان کو ملے جنگل میں گر مارے نہ دم

۱۳۷ وَلَنْ تَرٰى مِنْ وَّلِيٍّ غَيْرَ مُنْتَصِرٍ
بِهٖ وَلَا مِنْ عَدُوٍّ غَيْرَ مُنْقَصِمِ

دوستانش را نہ بینی غیر منصور و عزیز
ہم نہ بینی دشمنش جز خوار بگسستہ بہم
دوست اُن کا ہو نہیں سکتا ہے محرومِ مدد
اور ذلیل و خوار ہو گا دشمنِ شاہِ امم

۱۳۸ اَحَلَّ اُمَّتَهٗ فِيْ حِرْزِ مِلَّتِهٖ
كَاللَّيْثِ حَلَّ مَعَ الْاَشْبَالِ فِيْ اَجَمِ

اُمّتِ خود را نشاندہ در حصارِ ملتش
ہمچوں شیرے کو بُود با بچگاں اندر اَجم
اپنی ملت سے کیا محفوظ امت کو تمام
جس طرح جنگل میں رکھے شیر بچوں کو بہم

۱۳۹ كَمْ جَدَّلَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ مِنْ جَدِلٍ
فِيْهِ وَكَمْ خَصَمَ الْبُرْهَانُ مِنْ خَصِمِ

ہر کہ با قرآں بہ جنگ آمد بیفگندش بخاک
گفتگوئے منکر از برہانِ او گشتست کم
بارہا قرآں نے دشمن کو نیچا کر دیا
اور دلیلوں نے بھی سر کو کر دیا دشمن کے خم

۱۴۰ كَفَاكَ بِالْعِلْمِ فِي الْاُمِّيِّ مُعْجِزَةً
فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالتَّاْدِيْبِ فِي الْيُتُمِ

ایں قدر از معجزہ کافی کہ پیش از وحیِ او
اُمّی پر علم بود و پر ہنر اندر یتم
ہو کے اُمّی تھے وہ عالم ہے یہ کافی معجزہ
جاہلیت اور یتیمی میں ادیبِ ذی حکم

۱۴۱ خَدَمْتُهٗ بِمَدِيْحٍ اَسْتَقِيْلُ بِهٖ
ذُنُوْبَ عُمْرٍ مَضٰى فِي الشِّعْرِ وَ الْخِدَمِ

خدمتش کردم بمدحے تا ببخشندم گناہ
زاں کہ عمرم صرف شد در گفتنِ شعر و خدم
نعت گوئی کی کہ اپنا خاتمہ بالخیر ہو
یُوں تو ساری عمر دنیا کی خوشامد کی نہ کم

۱۴۲ اِذْ قَلَّدَانِيَ مَا تُخْشٰى عَوَاقِبُهٗ
كَاَنَّنِيْ بِهِمَا هَدْيٌ مِّنَ النَّعَمِ

کردہ غل در گردنم عصیاں وہی ترسم ازاں
گوئیا با شعر و خدمت مثلِ ہدیم از نعم
ہے یہ ڈر دونوں نے ڈالا طوق گردن میں مری
ہوں میں گویا اونٹ قربانی کا از قسمِ نعم

۱۴۳ أَطَعْتُ غَيَّ الصِّبَا فِي الْحَالَتَيْنِ وَمَا
حَصَلْتُ إِلَّا عَلَى الْآثَامِ وَالنَّدَمِ

بُردہ ام فرمانِ غیّ کودکی در ہر دو حال
ہیچ ازاں حاصل نہ دارم جز گناہان وندم
ہر دو حالت میں شکارِ گمرہِ طفلی ہوا
کچھ نہ حاصل ہو سکا مجھ کو بجز جُرم وندم

۱۴۴ فَيَا خَسَارَةَ نَفْسٍ فِي تِجَارَتِهَا
لَمْ تَشْتَرِ الدِّينَ بِالدُّنْيَا وَلَمْ تَسُمِ

پس زیاں ہائے کہ نفس اندر تجارت یافتہ
کاں بہ دنیا دیں نہ بخرید و نگفتہ میخرم
حیف میرے نفس نے سودا کیا نقصان سے
یعنے دنیا کو خریدا کر کے عقبیٰ کالعدم

۱۴۵ وَمَنْ يَبِعْ آجِلًا مِنْهُ بِعَاجِلِهِ
يَبِنْ لَهُ الْغَبْنُ فِي بَيْعٍ وَفِي سَلَمِ

ہر کہ عقبیٰ را بہ دُنیا می فروشد خاسر است
غبن او روشن شود البتہ در بیع و سلم
آخرت کو جس نے بیچا صرف دنیا کے لیے
ہے بڑا نقصان اس کے حق میں یہ بیع و سلم

۱۴۶ إِنْ آتِ ذَنْبًا فَمَا عَهْدِي بِمُنْتَقِضٍ
مِنَ النَّبِيِّ وَلَا حَبْلِي بِمُنْصَرِمِ

گر گنہ کردم بسے من عہد را نشکستہ ام
با ہمیں حبلِ دینِ مصطفےٰ نبریدہ ام
ہوں تو عاصی پر نہیں ٹوٹا ہے پیماں آپ سے
دین کی رسّی نہ ہو گی منقطع شاہِ اُمم

۱۴۷ فَإِنَّ لِي ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِيَتِي
مُحَمَّدًا وَهُوَ أَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

عہدِ او دارم کہ نامِ من محمّد کردہ اند
کس وفا چوں او نہ کردہ در ہمہ عہد و ذمم
ہے شفاعت کی مجھے امید میرے نام سے
ہے محمّد اس میں اور ہیں آپ مشفق محترم

۱۴۸ إِنْ لَمْ يَكُنْ فِي مَعَادِي آخِذًا بِيَدِي
فَضْلًا وَإِلَّا فَقُلْ يَا زَلَّةَ الْقَدَمِ

گر ز فضلم در قیامت دستگیرد خرّمم
ورنہ گیرد وائے بر من چوں بہ لغزانم قدم
حشر میں گر دستگیری کی نہ میری آپ نے
پھر تو میری شومیٔ تقدیر سے پھسلے قدم

۱۴۹ حَاشَاهُ أَنْ يُحْرِمَ الرَّاجِي مَكَارِمَهُ
أَوْ يَرْجِعَ الْجَارُ مِنْهُ غَيْرَ مُحْتَرَمِ

دُور باد اگر کند نومید ہر امیدوار
یا کہ از وے باز گردد جار غیرِ محترم
ہے بعید از شان گر محروم مجھ کو کر دیا
اور لوٹوں آپ کی شفقت سے غیرِ محترم

۱۵۰ وَمُنْذُ أَلْزَمْتُ أَفْكَارِي مَدَائِحَهُ
وَجَدْتُهُ لِخَلَاصِي خَيْرَ مُلْتَزِمِ

زاں کہ من مشغول کردم فکرِ خود در مدحِ او
بر خلاصِ خود ورا خوش یافتم من ملتزم
وقف جب سے ہو گیا ہوں مدح میں سرکار کی
پا لیا اپنی رہائی کا مددگارِ نعم

۱۵۱ وَلَنْ يَّفُوْتَ الْغِنٰى مِنْهُ يَدًا تَرِبَتْ
اِنَّ الْحَيَا يُنْبِتُ الْاَزْهَارَ فِى الْاَكَمِ
دستِ درویش از عنایا نعمتش خالی نشد
زاں کہ از باراں بروید گل ببالائے اکم
آپؐ کی بخشش نہ چھوڑے گی کسی محتاج کو
جس طرح گلزار ٹیلوں کو کرے ابرِ کرم

۱۵۲ وَلَمْ اُرِدْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا الَّتِى اقْتَطَفَتْ
يَدَا زُهَيْرٍ بِمَا اَثْنٰى عَلٰى هَرِمٍ
من نمی خواہم متاعِ مال و دنیا چوں زہیر
کو نہ چیدہ دستِ او چوں گفت او مدحِ ہرم
مجھ کو دولت کی نہیں خواہش کبھی مثلِ زہیر
جس نے حاصل کی تھی دولت بن کے مداحِ ہرم

۱۵۳ يَا اَكْرَمَ الْخَلْقِ مَا لِىْ مَنْ اَلُوْذُ بِهٖ
سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمَمِ
اے گرامی تر ز خلقاں من نہ دارم ملجاء
جز تو چوں آید قیامت یا بُوَد مرگِ تمم
اے مکرم تر جہاں سے جز ترے میرا ہے کون
حادثاتِ عام میں جب گھیر لیں رنج و الم

۱۵۴ وَلَنْ يَّضِيْقَ رَسُوْلَ اللّٰهِ جَاهُكَ بِىْ
اِذَا الْكَرِيْمُ تَجَلّٰى بِاسْمِ مُنْتَقِمِ
یا رسول اللہ! جاہت تنگ می ناید بہ من
چوں کریمم انتقام آرد بہ اربابِ نقم
کم نہ ہوگا آپؐ کا رتبہ شفاعت سے مری
جلوہ گر جب ہو بہ اسمِ منتقم وہ ذی کرم

۱۵۵ فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا
وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ
شمۂ از جودِ تو دُنیا بود با آخرت
وز علومت دُر دو عالم علمِ لوح است و قلم
کیوں کہ دُنیا اور عقبیٰ آپؐ کی بخشش سے ہیں
اور علومِ باطنی سے آپؐ کے لوح و قلم

۱۵۶ يَا نَفْسُ لَا تَقْنَطِىْ مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ
اِنَّ الْكَبَائِرَ فِى الْغُفْرَانِ كَاللَّمَمِ
اے دل از رحمت مشو نومید با جرمِ بزرگ
چوں کبائر نزدِ غفرانِ خدا شد چوں لمم
یُوں تو عصیاں ہیں بہت اے نفس مت مایوس ہو
سامنے بخشش کے بیشک ہیں یہ ادنیٰ اور کم

۱۵۷ لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّىْ حِيْنَ يَقْسِمُهَا
تَاْتِىْ عَلٰى حَسَبِ الْعِصْيَانِ فِى الْقِسَمِ
رحمتِ رحمٰن مگر آں دم کہ قسمت میکنند
بر من آید در خورِ جرم و گناہ اندر رقم
رحمتِ حق ہو گی جب تقسیم مجھ کو ہے امید
میرے عصیاں سے سوا ہو گا مرے رب کا کرم

۱۵۸ يَا رَبِّ فَاجْعَلْ رَجَائِىْ غَيْرَ مُنْعَكِسٍ
لَدَيْكَ وَاجْعَلْ حِسَابِىْ غَيْرَ مُنْخَرِمِ
یا رب امیدم بر آور زاں مگرداں باژگوں
در قیامت نزد تو آں کہ حساب آساں کنم
میرے رب امید کو میری نہ رد فرمائیے
تیری رحمت پر بھروسا ہے نہ کر تو کالعدم

۱۵۹ وَالْطُفْ بِعَبْدِكَ فِي الدَّارَيْنِ إِنَّ لَهُ
صَبْرًا مَتَى تَدْعُهُ الْأَهْوَالُ يَنْهَزِمِ

لطف کن با بندۂ خود ہم بہ دنیا ہم بہ دیں
زاں کہ صبرش نزدِ سختی ہا گریزد از سَام
لطف فرما دو جہاں میں اپنے بندہ پر کریم
سختیوں میں ہے بہت بے صبر با رنج و الم

۱۶۰ وَائْذَنْ لِسُحْبِ صَلٰوةٍ مِّنْكَ دَائِمَةٍ
عَلَى النَّبِيِّ بِمُنْهَلٍّ وَّ مُنْسَجِمِ

پس درودِ بے کراں بارانِ ابرِ رحمتت
تا شود ریزاں و پاشاں از نعیم و از نعم
ابرِ رحمت کو ترے دے حکم تا برسائے وہ
تا ابد اپنے نبیؐ پر رحمت و فضل و کرم

۱۶۱ وَالْاٰلِ وَالصَّحْبِ ثُمَّ التَّابِعِيْنَ لَهُمْ
أَهْلِ التُّقٰى وَالنُّقٰى وَالْحِلْمِ وَالْكَرَمِ

بعد ازاں بر آلؑ و اصحابؓ کرام و تابعین
اہلِ علم و حلم و عقل و فضل و تقویٰ و کرم
آلؑ پر اصحابؓ پر اور تابعینِ پاک پر
صاحبِ تقویٰ پہ اور جو ہیں حلیم و ذی کرم

۱۶۲ ثُمَّ الرِّضَا عَنْ أَبِيْ بَكْرٍؓ وَّعَنْ عُمَرَؓ
وَعَنْ عُثْمَانَؓ وَعَنْ عَلِيٍّؓ ذَوِي الْكَرَمِ

یا خدا راضی شو از بوبکرؓ و عثمانِ غنیؓ
از عمرؓ فاروقِ اعظم و ز علیؓ محتشم
اے خدا راضی ہو بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ سے
اور علیؓ مرتضیٰ سے تھے جو اصحابِ کرم

۱۶۳ مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتِ الْبَانِ رِيْحُ صَبَا
وَأَطْرَبَ الْعِيْسَ حَادِي الْعِيْسِ بِالنَّغَمِ

تا بہ جنباند صبا اندر چمن شاخِ درخت
و براند اشتراں را بندگانش در نغم
جب تلک بادِ صبا چلتی رہے گلزار میں
اور اونٹوں کو طرب میں ساربانِ پُر نغم

۱۶۴ فَاغْفِرْ لِنَاشِدِهَا وَاغْفِرْ لِقَارِئِهَا
سَأَلْتُكَ الْخَيْرَ يَا ذَا الْجُوْدِ وَالْكَرَمِ

مغفرت خواہم و بخشش از خداوندِ کریم
از برائے قاریان و از مصنف پاک ہم
مغفرت قاری کی ہو بخشش مصنف کی بھی ہو
بس یہی ہے التجا تجھ سے مرے ربِّ کرم

ہمارے چند نمبر

(۱) افسانہ نمبر (۲) غزل نمبر
(۳) شخصیات نمبر (۴) طنز و مزاح نمبر
(۵) مکاتیب نمبر (۶) لاهور نمبر
(۷) آپ بیتی نمبر (۸) خطوط نمبر
(۹) جنگ نمبر (۱۰) ادبی معرکے نمبر
(۱۱) میر نمبر (۱۲) غالب نمبر
(۱۳) اقبال نمبر (۱۴) انیس نمبر
(۱۵) پطرس نمبر (۱۶) منٹو نمبر
(۱۷) شوکت تھانوی نمبر (۱۸) ادب عالیہ نمبر
(۱۹) عصری ادب نمبر (۲۰) دیگر خاص نمبر

جو

اُردو اَدب کی آبرو ہیں

جن کا

ہر لائبریری میں موجود ہونا ضروری ہے